دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ کراچی
دسمبر 2017
نگران اعلیٰ
معراج رسول

مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

مدیر : لبنیٰ خیال
نائب مدیر : ڈاکٹر نعیم اختر

منیجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن منیجر
سید منیر حسین
0333-3285269

چینی، نکتہ چینی
مدیر اعلیٰ 07
قارئین کی کرم فرمائیاں اور کج ادائیاں
نامہ و پیام، محبتیں، عنایتیں اور شکایتیں

دوسری عورت
پروین زبیر 14
سنسنی تجسس...... اور تحیر میں
ڈوبی ناقابلِ فراموش داستان

خط کا راز
سید زاہد علی شاہ 67
محبت میں خیانت کرنے
والے دیانت داروں کا انجام

حاسد
مظہر سلیم ہاشمی 77
ایک ایسے پروانے کی محبت کا چراغ......
جو دوسروں کے دیے سے جل بجھ رہا تھا

مشکل ہدف
تنویر ریاض 81
ٹھوس بنیادوں پر تخلیق کیے گئے
منصوبوں کے تباہ کن نتائج......

انگارے
طاہر جاوید مغل 92
سطر سطر رنگ بدلتی...
ایک لہو رنگ اور دل گداز داستان

سکے کی چوری
تمکین رضا 131
اس چوری کی رُوداد جس
میں دو پڑوسی ملوث تھے

جاگیر کے اسیر
محمد یاسر اعوان 133
جاگیر کے شیطان صفت اسیروں
کی یکجائی کا عبرت ساماں ماجرا

جلد 47 • شمارہ 12 • دسمبر 2017 • زرِسالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون (021) 35895313 E-mail:jdpgroup@hotmail.com

مجرم شناس
سلیم انور 155

اپنی سوچوں کو حقیقت کا روپ دینے والے مجرم کا گھیراؤ.....

آوارہ گرد
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی 158

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

رقیب
شاکر لطیف 195

جرم و سزا کے موضوع پر دردناک کہانی کے اسرار

زرد کتاب
عکس فاطمہ 207

قتل کی ایک انوکھی واردات جس کی پیشگی اطلاع مل چکی تھی......

ترپ چال
عمران قریشی 217

تجسس سے بھرپور چونکا دینے والے انجام سے مزین ایک چال باز کی چال بازیاں

ہم قدم
روبینہ رشید 224

کٹھن و دشوار گزار راستوں پر ہم قدم رہنے والے ساتھیوں کا پُرتجسس کھیل

ہولناک سائے
ثروت اعجاز 255

لمحہ بہ لمحہ تجسس جگاتی ہوئی ایک پُرفریب داستان

تراش خراش
ادارہ و قارئین **

اقتباسات گدگدیاں مسکراہٹیں اور قہقہے سب کچھ آپ کی تفریح طبع اور تواضع کے لیے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

مدیر اعلیٰ

عزیزانِ من ...... السلامُ علیکم!

سال کا آخری شمارہ پیشِ خدمت ہے۔ گزرے سال کو الوداع...... آنے والے سال کو خوش آمدید کہنے کے ساتھ یہ محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے جیسے وقت گزرتا جارہا ہے، انسانوں کی معروفیات بڑھتی جارہی ہیں۔ چند عشروں پہلے کی بات ہے کہ ہر ملک اور معاشرے میں کرپشن کو ایک قابلِ نفرت جرم سمجھا جاتا تھا۔ یہ نہیں کہ اس وقت سب ہی فرشتہ خصلت تھے مگر یہ ضرور تھا کہ رشوت لینے، خیانت کرنے اور حق تلفیاں کرنے والے ایسے کام چوری چھپے کرتے تھے۔ اب رفتہ رفتہ اسے وقت کا چلن بنالیا گیا ہے۔ ہر غلط کام کسی ندامت یا خفت کے بغیر دھڑلے سے کیا جارہا ہے۔ آئے دن دنیا بھر سے حکومتی سربراہان، عوامی نمائندوں اور اعلیٰ عہدے داروں کی بدعنوانیوں کی نت نئی کہانیاں سامنے آرہی ہیں۔ ہر شخص نے اپنی بساط کے مطابق اپنی زندگی کو اتنا مشکل بنالیا ہے کہ زرپرستی کی دوڑ میں اسے رزقِ حلال سے بہت آگے نکل جانے کی فکر رہنے لگی ہے۔ ہوسِ زر لاکھوں سے بڑھ کر اربوں، کھربوں بلکہ اس سے بھی اوپر کی حدوں کو چھورہی ہے۔ ہماشما اس دوڑ میں شامل ہونے کے قابل نہیں کیونکہ ان کے قبضے میں وسائل ہیں نہ اختیارات۔ سو وہ ہر نئے نرالے شوق سے اپنا دل بہلاتے رہتے ہیں۔ اس ضمن میں تصویر کشی کا ایک بے ضرر سا شوق بسا اوقات بہت سفاکی کی عکاسی کرتا ہے۔ جدید سے جدید تر سیل فون کے طفیل کیمرے ہر ایک کے ہاتھ میں آگئے ہیں۔ آدمی ٹرین سے کٹ گیا ہے، ٹانگیں دھڑ سے الگ ہوگئی ہیں، وہ تڑپ رہا ہے اور سوشل میڈیا کے لیے فلم بندی جاری ہے...... گاڑی نے کسی کو کچل دیا ہو، تصادم میں سر پر پتھر لگنے سے ایک نوجوان بے ہوش ہوکر گر گیا ہو...... ایسے المیوں میں متاثرین کی مدد کرنے کے بجائے تصویر کشی دل کو بہت ملول کرتی ہے۔ قانون کے محافظوں کی قانون شکنی اور اسی نوع کے معاملات کی تشہیر واقعی معاشرے کی ایک اصلاحی خدمت ہے لیکن کسی سسکتے ہوئے زخمی کی عملی مدد اس کی وڈیو بنانے سے بہت زیادہ افضل اور لازمی ہے۔ اس عرضِ تمنا کے ساتھ چلتے ہیں وہاں جہاں دوسروں کی آنکھ نہیں بلکہ قلم کی نوک نشتر و مرہم بنی ہوتی ہے۔

دبئی سے طلعت مسعود کی باتیں ”نومبر کا شمارہ کیونکہ پہلے ہی دو دن کی تاخیر سے دیکھنا نصیب ہوا تھا اس لیے رسالہ ہاتھ میں آتے ہی ٹائٹل کو سرسری نظر سے دیکھا جس پر براجمان سنگ دل حسینہ جو خنجر کی نوک پر اک گھائل شخص کو شاید زبردستی پھول پیش کر رہی تھی۔ اس کے بعد سیدھا چینی کا رخ کیا۔ اداریے میں جن عالمی حالات کی آپ نے نشاندہی کی، وہ یقیناً بہت پُرتشویش ہیں اور ان حالات میں ہماری ساری قیادت کو اپنے اختلافات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اتفاق رائے سے ان سے نمٹنے کا لائحہ عمل تیار کرنا چاہیے۔ ٹاپ آف دی لسٹ توصیف علی صاحب خوب صورت اور بھرپور تبصرے کے ساتھ موجود تھے۔ ان کا تبصرہ اچھا لگا۔ سجاد خان صاحب ڈائجسٹ کی وجہ سے بچپن کی مار کا تذکرہ کرتے نظر آئے۔ میرا خیال ہے سب ہی نے کسی نہ کسی حد تک اس سے ملتے جلتے حالات کا سامنا کیا ہے۔ دل نشین صاحبہ سب کی بے رخی کا رونا رو رہی تھی۔ لیکن اب آپ کو بھی وقتاً فوقتاً حاضری لگاتے رہنا چاہیے۔ ذیشان حیدر کاظمی صاحب کا تبصرہ بھی عمدہ رہا اور امجد رئیس صاحب کے حوالے سے ادارے کی کلیریفکیشن پسند آئی کیونکہ کچھ عرصہ پہلے اسما قادری صاحبہ کے حوالے سے بھی کچھ لوگوں نے اسی طرح کی من گھڑت باتیں پھیلائی تھیں۔ حفصہ طارق صاحبہ گھر والوں کے بعد محفل میں بھی رعب جمانے کی کوشش کر رہی ہیں لیکن یہاں بھی گھر کی طرح لگتا ہے رعب میں کوئی نہیں آنے والا۔ بہرحال تبصرہ عمدہ رہا۔ ایمانے زارا شاہ آپ کے دو تبصروں کے بجائے پچھلے مہینے ہم نے اپنی ہی غیر حاضری کرلی کہ کہیں محفل والے ہمیں بالکل ہی ویلا نہ سمجھ لیں۔ سیف خان کی سب باتوں کی میں پُرزور تائید کرتا ہوں۔ نیٹ پر رسائل کے غیر قانونی اپ لوڈنگ کے حوالے سے ادارے کو یقیناً اقدامات کرنے چاہئیں اس میں کوئی شک نہیں کہ موجودہ دور میں انٹرنیٹ پر رسالے کی دستیابی ہونا بہت ضروری ہے۔ بہتر یہی ہے کہ ادارہ خود اپنی ویب سائٹ بنا کر اس پر اپ لوڈ کرے۔ جس سے ادارے کو بھی فائدہ ہوگا اور ان قارئین کو بھی جو کسی بھی وجہ یا بیرونِ ملک ہونے کی وجہ سے بروقت شمارہ نہیں لے سکتے تاکہ وہ ویب سائٹس سے لے سکیں۔ اقلیم صاحب اور احمد اقبال صاحب سے کوئی سلسلے وار ناول لکھوانے کی تجویز سے متفق ہوں۔ اس کے علاوہ اے آر جٹ، اشفاق شاہین اور شفقت محمود کے تبصرے بھی بہترین رہے۔ کہانیوں میں اس دفعہ تاخیر سے شمارہ ملنے کا باعث تاخیر کم کرنے کے لیے ہم نے سیدھا دوسرے رنگ کا رخ کیا۔ اچھے پلاٹ اور عمدہ کردار نگاری کے ساتھ محنت سے لکھی گئی کہانی تھی جس میں سسپنس بھی آخر تک برقرار رہا۔ مسعود اور روشن جیسے لوگوں کی وجہ سے کئی نوشین اس دلدل میں اس طرح پھنس جاتی ہیں کہ پھر نکلنا مشکل ہوجاتا ہے۔ نوشین تو پھر بھی خوش قسمت رہی کہ اسے آخر میں بیٹی مل گئی، یہ اس کی توبہ کا پھل اسے ملا۔ جاسوسی کے رنگ میں بہترین انٹری پر مظہر سلیم ہاشمی صاحب کو مبارک اور نیک تمنائیں۔ منظر امام صاحب کی عشق زہرناک یوں تو ایک سیدھی محبت کی کہانی تھی لیکن ہندوستان سے نیپال کے سفر اور بہترین منظر نگاری نے انجوائے کرادیا۔ کبیر عباسی کی خطا پر در اس بار حسان دوسروں کے کیس حل کرتے کرتے خود ہی پھنس گیا۔ باقر جیسے لوگوں کا یہی انجام بنتا ہے جو درس گاہوں جیسی مقدس جگہوں کو بھی اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ہلکے پھلکے مزاح کے ٹچ اور سسنی کے ساتھ کہانی پسند آئی۔ انتقام میں عارف حسین تو اسی انجام کا حقدار تھا لیکن اس

کے گناہ کا خمیازہ اس کی بیٹی کو بھی بھگتنا پڑا کہ انسان جو بوتا ہے، وہی کاٹتا ہے۔ اچھی کہانی رہی۔ مرد آہن ابتدا سے پہلے نصف تک تو اچھی رہی لیکن اس کے بعد کرداروں کی بہتات اور تیز رفتار واقعات کی وجہ سے صحیح رنگ نہ جما سکی اور اختتام بھی فلمی سا محسوس ہوا۔ ہماری فیورٹ انگارے میں مغل صاحب نے اس دفعہ تو اتنا بھگایا کہ خیال آنے لگا کہ کہیں اسی قسط میں سب کچھ ختم تو نہیں ہونے لگا لیکن آخر میں ڈ-تھ اسکواڈ کے ساتھ جان ڈیرک کو نہ پا کر اطمینان کا سانس لیا کہ انگارے جلتے رہیں گے۔ باقی کہانیاں ... ابھی پڑھی نہیں۔ ویسے بھی تبصرہ کافی طویل ہو گیا اس سے طویل پر شاید قینچی ہی چل جائے۔“

تحصیل علی پور سے ہارٹ کیچر کا قابل غور نکتہ ”پیر کو ہمارا جاسوسی کی کبوتر پھڑ پھڑاتا ہوا ہمارے ہاتھوں میں آیا۔ دوشیزہ کی شیش ناگ رنگ زلفیں اس کی چاند جیسی کشادہ پیشانی پر بادلوں کی طرح سایہ کیے ہوئے تھیں۔ لہو رنگ لب اور نوک خنجر پر پیوست سسکتا سرخ پھول کے لہو سے لبوں کی سرخی سے حسن حسینہ میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ایم سہیل غالباً مستقبل شناس سسپنس ڈائجسٹ میں شائع ہوئی تھی (جی نہیں۔ یہ جاسوسی میں شائع ہوئی تھی) دل نشین بلوچ ہم نے تو سمجھا تھا کہ نوال ومشال، ماہ تاب گل رانی، ماہا ایمان، تصویر العین اور آپ سمیت سب چوہیاں اپنے اپنے میاؤں جی کے خونخوار پنجوں کی پکڑ میں آ گئی ہیں اس لیے غائب ہیں اور جو چوہیا میاؤں جی کے پنجے میں پھنس جائے وہ بھلا ادھر ادھر جوگی رہتی ہی کب ہے۔ حفصہ طارق نے تو خود پر ہی مضمون لکھ ڈالا بہر حال اچھا لگا۔ دل کے لبوں سے ہم کلام ہونے کے لیے سب سے پہلے دیسی کہانیوں کا چیتل سلیکٹ کیا۔ بھٹی صاحب عابدہ کو یاد کرنے کے معاملے میں چونکہ شہزی کنجوس ہے اور بھلکو بھی لہٰذا شہزادے کو بادام شادام کھلائیں تاکہ شہزادے کو اپنی شہزادی عابدہ یاد آتی رہے۔ آوارہ گردی کے بعد مغل صاحب کی یاد ستانے لگی۔ مغل صاحب آپ خوش خوش ہی میسنی تاجور کا نام بدل کر رنجور ہی رکھ دیں کیونکہ جب دیکھو رنجور میرا مطلب ہے کہ دکھی آتما تاجور کی آنکھوں کے ساون اور ناک کا بھادوں برستا ہی رہتا ہے اب کوئی بھی اللہ کی بندی کتنی روکھی پھیکی سہی کیوں نہ ہو کبھی تو کھی کھی تو کر ہی لیتی ہے۔ ہمایوں اقبال المعروف ایچ اقبال کی یک قسطی مرد آہن کسی .... فلم کی طرح تھی سو فلم کی طرح پڑھی۔ کبیر عباسی اگر ہم بھی ایسی صورت حال سے دوچار ہوتے تو یقیناً خطا پرور کے مرکزی کردار کی طرح کردار ادا کرتے آج تک ہم نے بھی کسی کی مجبوری سے جائز و ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا۔ اے آر راجپوت کی دام کے نمک حرام ریاض نے اپنی چال تو خوب چلی مگر اپنی چال کے جال میں خود چال باز پھنس گیا۔ مشاق ہاتھوں سے تحریر شدہ سرورق کا پہلا عکس منظر امام کی عشق زہرناک عجیب سا ماحول لیے ہوئے تخلیقی کاوش قدرے درست لگی مگر منظر امام نے اس طرح لکھی جیسے کوئی یہ حقیقت ہو۔ پردیسی کہانیوں میں ثبوت نے متوجہ کیا جس طرح امریکا نے مسلمان ممالک میں لہو ریزی کر رکھی ہے اس کے برعکس رالیل کا مثبت کردار پڑھ کر حیرت آمیز بے یقینی سی ہوئی۔ سرورق کا آخری عکس باعث تاخیر نے خوش گوار اور دل پذیر اثر چھوڑا۔ نوشین کی گناہ آلود بے راہ روی ہی اس کی گمشدہ منزل کو پانے کی تاخیر کا باعث بنی ہوئی تھی جیسے ہی نوشین نے عرق ندامت کو آنکھوں سے بہایا، منزل کا سبب شاہد کی شکل میں خود چل کے اس کے پاس پہنچ گیا۔ راہ گناہ کا راہی مسعود رانا نے سائرہ کو نوشین کے بجائے اپنے بھائیوں کے سپرد کر کے احسن فیصلہ کیا ورنہ سائرہ بھی ماں باپ کی طرح مغرب خیالات کی آلائش کا شکار ہو جاتی۔ مرد ذات کی یہی سوچ زن ذات کے لیے جسمانی و روحانی پاکیزگی کا سبب بنتی ہے بقول ہمارے دروازہ اچھائی کا ہو یا برائی کا ہمیشہ مرد کی جانب سے ہی کھلتا ہے۔“

ناظم آباد کراچی سے ادریس احمد خان کی پسندیدگی ”ماہ نامہ جاسوسی برائے نومبر موصول ہوا۔ سرورق ذاکر صاحب کی کاوشوں کا ثمر تھا۔ ان کی سلامتی کی دعائیں۔ اندرونی صفحات پر چینی نکتہ چینی میں توصیف علی صاحب سرفہرست تھے مبارک باد۔ دیگر دوست بھی بھرپور حاضری کے ساتھ نظر آرہے تھے اور اپنی اپنی آرا کا اظہار کر رہے تھے۔ سب سے پہلے ایچ اقبال کی مرد آہن پڑھی۔ آدمی اگر حق پر ہو تو ساری رکاوٹیں دور ہو جاتی ہیں، باطل مٹ جاتا ہے اور سچائی کی جیت ہوتی ہے۔ چارہ کار میں بھی دلچسپی رہی بیلر کو بیٹھے بٹھائے ڈالرز کی دولت ملی بھی اور اس کی قسمت میں نہ ہوتے ہوئے پانی پانی ہو گئی۔ بے بسی بھی اچھی کہانی تھی۔ انتقام میں ایک بھائی نے اپنی بہن کا انتقام اس طرح لیا جس طرح اس کی بہن کے ساتھ کیا گیا تھا۔ عارف نے جرم کیا مگر اس جرم کی سزا اس کی معصوم بیٹی کو ملی۔ اجنبی تحریر بہتر انداز لیے ہوئے تھی۔ انگارے کی قسط میں دلچسپی برقرار رہی اور شاہ زیب مرد میدان بنا ہوا ہے۔ ثبوت میں جو اس نے ڈان کارسن کے ساتھ ظلم کیا تھا، وہ عوام نے اس کو سود سمیت واپس کر دیا۔ سفید لکیر بھی بہتر تاثر دے رہی تھی۔ اس کے بعد ڈاکٹر بھٹی کی آوارہ گرد پڑھی اس کی مقبولیت بدستور اپنی جگہ قائم رہی۔ داؤ پیچ میں خادم نے گڑھا کھودا اپنی بیوی کے لیے تھا مگر وہ خود ہی اس کا شکار ہو گیا۔ خطا پرور کبیر عباسی کی تحریر تھی۔ اپنا اثر قائم کیا۔ نئے لکھنے والے ادبی دنیا میں اپنا مقام اپنی قسمت اور کاوشوں سے بنانے کی اچھی کوششیں کر رہے ہیں اور وہ اس میں کامیاب ہیں کہ قارئین ان کو دلچسپی سے پڑھتے ہیں، یہی کامیابی کی دلیل ہے۔ ناآسودہ عاشق اور دام بھی اچھا تاثر دینے والی کہانیاں تھیں۔ دام میں ریاض نے اپنی سوتیلی بہن کو مارنے کے لیے جال بچھایا مگر وہ خود ہی اس کا شکار ہو گیا۔ آخری صفحات کی خوب صورت کہانی منظر امام کی زہرناک تھی جس میں محبت کی جیت ہوئی۔ جذبے سچے ہوں تو منزل خود راستے ڈھونڈ لیتی ہے۔ باعث تاخیر بھی اچھی کہانی تھی جس کا ثبوت آخری صفحات پر اپنی جگہ بنانے میں کامیاب رہی۔ کترنیں بھی اپنی جگہ پرفیکٹ تھیں۔“

عبدالجبار رومی انصاری کی کہانی ”خوب صورت دوشیزہ میں اس دفعہ سسپنس کا رنگ نمایاں تھا لیکن کسی وجہ سے خود کو بے بس محسوس کر رہی تھی اور خنجر پر پھول انداز شدید جارحانہ لیکن جذبۂ محبت بھی موجود ہے اور مرد کی مکروہ شکل تو دہشت گرد ہی لگ رہی تھی۔ فہرست اپنے عنوانات سے ہی زبردست لگ رہی تھی۔ سو پہلی نظر انتخاب منظر امام کی عشق زہرناک پر ٹھہر گئی۔ آزاد کو آنچل سے محبت کیا ہوئی، اس کو کڑے امتحان میں ہی ڈال دیا لیکن وہ بھی ایڈونچر پسند تھا سو آنچل کے پیچھے نیپال کے دشوار گزار اور برف پوش پہاڑوں کو سر کرنے نکلا مہاراج سے جان چھڑائی، تتلی نگر کی بے ہودہ اصول

پرست لڑکیوں کے نرغے میں آ گیا اور پھر صوفیہ کی مدد سے آنچل کو لیے واپس پہنچا اور شادی بھی کر لی۔ کہانی بہت اچھی اور خوب صورت رہی۔ دلاور اور جنرل اسد بٹ دونوں ہی مردِ آہن تھے۔ باپ قانون کی رو سے ہاتھ ڈالنے والا ثابت قدم اور بیٹا جذبات کے ساتھ سرپھٹ۔ ایکس مین جیسے دہشت گرد سے ٹکرانا آسان نہ تھا لیکن ہر ایکشن فلم کا انجام ہوتا ہے سو برائی کے محور کو یہاں بھی ویسی ہی سزا ملی جو دوسروں کو دیا کرتا۔ خونی مگرمچھوں نے ایکس مین کی بھی تکابوٹی کر دی۔ سعیدہ بھی اپنے باپ کی وجہ سے بڑے امتحان میں پڑی رہی۔ آخر اس نے بھی سکھ کا سانس لیا۔ ایکشن سے بھرپور مردِ آہن عمدہ رہی۔ انگارے بھی خوب رہی۔ شاہ زیب نے ٹیکساری گینگ کے ڈیتھ اسکواڈ کی کچھار میں گھس کر خوب ہلچل مچائی۔ ایسے میں اداکارہ عروشہ بھی نہ بچ سکی یہ لڑکیاں ہی ایسے موقعوں پر جان کی بازی ہارتی ہیں کوئی تو بچ جایا کرے۔ (بالکل، بجا خواہش ہے) باقی شاہ زیب زندہ ہو کے اگلے جہاں سدھار گیا گیا، یہ سین آگے چل کر اور بھی دلچسپ ہوگا اتنی دور سے آکر خورسنہ نے بھی سجاول کو امتحان میں ڈال دیا، لگتا ہے سجاول نہ ہی کرے گا، کہانی زبردست رہی۔ بینکاک میں وزیر جان سے ہاتھا پائی تو درمیان میں ہی رہ گئی اور شہزی ایک شاپنگ مال میں کاسیا کو گینگ سے بھڑ گیا۔ دہشت انگیز مارا ماری کے بعد گھر پہنچا تو کاؤشی کو بھی مردہ پایا گیا ہے۔ ابھی شہزی کے امریکا پہنچنے تک جانے کتنے معرکے ہوں گے لیکن آوارہ گرد اپنا پرچم سربلند ہی رکھے گا، ہر حال میں اور ہر جگہ۔ سرورق کی دوسری کہانی بھی زبردست رہی۔ اسمگلنگ کے بیوپاریوں کے ہاتھوں نوشین بری طرح بے بس رہی اور اپنی بیٹی کے کھو جانے کا دکھ الگ۔ دوسری طرف مفت کا مال اچکنے والا شاہد بھی اپنے فن میں ماہر تھا اور سلمان اپنی جگہ شاطر آدمی لیکن انجام برا ہوا۔ نوشین نے برائی سے توبہ کی اور سائرہ کے ملنے کے نوافل ادا کیے، یہ سب باعث تاخیر سے ہی ہوا مگر کہتے ہیں نا کہ دیر آید درست آید، عمدہ کہانی۔ نہ ایک دوسرے کو چھوڑ سکتے نہ ساتھ رہ سکتے۔ عجیب ہی کہانی ہے بس ایک دوسرے کے خلاف صفیہ اور خادم نے داؤ پیچ چلا دیے۔ کچھ نہلے پہ دہلے والی بات بھی ہو گئی مختصراً اچھی کہانی ہے۔ سائمن کرسٹینا سے محبت کرتا تھا تو کیسے برداشت کرتا کہ کوئی اسے غلط نظر سے دیکھے سائمن نے بار بار کی تنگی کا بدلہ نصر کو قتل کر کے لیا لیکن ایسی منصوبہ بندی کی کہ خود بچ جائے مگر نہ بچ سکا تو خطا پرور تھا جان سے گیا مگر دوسروں کا تو قصور نہیں تھا جو سائمن اور کرسٹینا اور تنویر کو پھنسانا چاہتے تھے مگر تدبیر کام آئی اور سائمن بھی انجام کو پہنچا۔"

لاہور سے انجم فاروق ساحلی کی شمولیت "اس بار جاسوسی ڈائجسٹ کا ٹائٹل خوب صورتی اور سنسنی خیزی کے امتزاج سے خاصا منفرد معلوم ہوا۔ مُجرم کے اوپر سجا ہوا پھول جارحانہ عزائم کی نمائندگی کر رہا تھا۔ خطوط کی محفل بھرپور اور دلچسپ تھی۔ انہماک سے جائزہ لیا۔ کہانیاں سبھی ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ مردِ آہن ایچ اقبال، بہت، بے بسی، داؤ پیچ، خطا پرور، نا آسودہ عاشق، باعثِ تاخیر زیادہ بہتر معلوم ہوئیں۔ انگارے اور آوارہ گرد کامیابی [illegible] چل رہی ہیں [illegible] طاہر صاحب کا اسلوب اپنی مثال آپ ہے۔"

[illegible] سے الور یوسف زئی کی باریک بینی "خطوط کی محفل میں اس بار تقریباً سب نئے لکھنے والے نظر آئے، خوش آمدید۔ ٹیکسلا [illegible] نوشین کا میری اہلیہ کے انتقال پر تعزیت کا بے حد شکریہ۔ اس ماہ کی اولین کہانی ایچ اقبال کی مردِ آہن ایک اچھی تحریر تھی جو صرف مصنف ہی کا طرۂ امتیاز ہے۔ خاصے عرصے کے بعد ان کی واپسی ہوئی۔ سرورق کی دونوں کہانیاں منظر امام کی عشق زہرناک اور مظہر ہاشمی کی باعثِ تاخیر جاسوسی ڈائجسٹ کے معیار کے مطابق تھیں۔ ترجمہ شدہ مغربی کہانیوں میں یاسر اعوان کی ثبوت سب سے بہتر رہی اور دیسی طبع زاد کہانیوں میں سرور اکرام کی داؤ پیچ بہتر تھی۔ سلسلے وار کہانی انگارے کو اب بلا وجہ طول دیا جا رہا ہے اور اس سے دلچسپی اب ختم ہو گئی۔ ہاں دوسری کہانی آوارہ گرد اچھی جا رہی ہے۔ ہلینا کا مختصر کردار اچھوتا تھا۔ شہزی ابھی تک تھائی لینڈ ہی میں پھنسا ہوا ہے، دیکھیں وزیر جان سے اس کا پیچھا کب چھوٹتا ہے۔ اس ماہ پورے شمارے میں کارٹون صرف دو تین ہی تھے اور کترنیں برائے نام۔ البتہ سرورق کی حسینہ ایک دیسی شاہکارِ حسن کی مالک تھی۔ ذاکر صاحب کا شکریہ۔"

فیصل آباد سے منحہ رمشہ کی وضاحت "سب سے پہلے نکتہ چینی کی رنگ برنگی محفل میں جن جن لوگوں نے مجھے ویلکم کیا، ان سب کا ڈھیر سارا شکریہ۔ ایمانے زارا آپ کا تبصرہ مجھے ہمیشہ بہت اچھا لگتا ہے۔ آپ نے اس بار میرے بارے میں لکھا ہے کہ میں ایگزامز کے بعد پورے 40 دن کا چلہ کاٹتی ہوں گی۔ تو دعا تو میں مانگتی ہوں کیونکہ دعا انسان اور اللہ تعالیٰ کے درمیان رابطے کا ذریعہ ہے اور الحمدللہ میں پانچ وقت نماز بھی پڑھتی ہوں لیکن 40 دن کے چلے کی مجھے ضرورت پڑی ہے نہ مجھے شوق ہے کیونکہ ما بدولت کافی ذہین ہیں۔ انٹرمیڈیٹ میں کر چکی ہوں اور تھرڈ ایئر کر رہی ہوں۔ ٹائٹل پر تیکھے نقوش والی نوشین ہی تھی اور مرتا ہوا آدمی مسعود تھا۔ اس ماہ کی سب سے بہترین کہانی مظہر سلیم ہاشمی کی باعثِ تاخیر رہی جس نے واقعی آخری صفحات کا حق ادا کر دیا۔ شاہد کا کردار بہت عمدہ رہا۔ خوب صورتی، ذہانت، چالاکی، مہارت...... سب کچھ اس میں موجود تھا جو میری پسند کے کردار میں ہوتا ہے۔ منظر امام کی عشق زہرناک مجھے متاثر نہ کر سکی۔ پہلے صفحات پر موجود ایچ اقبال کی مردِ آہن بھی کافی اچھی رہی۔ جنرل اسد کی قانون کی پاسداری پسند آئی۔ ایکس مین جیسے انسان نما درندے کا انجام پڑھ کے مزہ آیا۔ دلاور اور سعیدہ کا کپل اچھا لگا۔ عمران قریشی کی چارۂ کار عمدہ رہی۔ لیکن بیلر پر بہت ترس آیا قسمت سے اسے اتنے ڈالرز ہاتھ آ گئے تھے لیکن بدقسمتی سے اسے کچھ ہاتھ نہ آیا۔ اطلس فاطمہ کی بے بسی بہت پسند آئی۔ اعتزاز سلیم وصلی کی انتقام میں جہانزیب کے اوپر شک مجھے پہلے ہی ہو گیا تھا۔ عارف ایک بہت برا انسان تھا لیکن فرحت بے قصور تھی اور جہانزیب نے بھی وہی کیا جو عارف نے کیا تھا۔ جہانزیب نے اپنا مستقبل اور اپنی زندگی دونوں تباہ کر لی۔ سرور اکرام کی داؤ پیچ بھی عمدہ لگی۔ جو سازش وہ اپنی بیوی کے خلاف چل رہا تھا وہی سازش اس کی بیوی خادم کے خلاف چل رہی تھی۔ کبیر عباسی کی خطا پرور میں پہلے شک علیسا پر ہوا پھر عدنان پر پھر کرسٹینا پر شک ہوا لیکن آدھا شک ٹھیک ہوا کیونکہ وجہ قتل تو کرسٹینا تھی لیکن قاتل اس کا شوہر تھا۔ اے آر

راجپوت کی دام بھی عمدہ رہی۔ مجھے پہلے ہی پتا چل گیا تھا کہ ریاض خود ہی دوا ملا پانی پیے گا لیکن کیسے یہ جاننے کے لیے پوری کہانی پڑھ لی۔ (شاباش بیٹا) آخر کار صیاد خود اپنے دام میں آ گیا۔ پڑھ کے مزہ آیا۔‘‘

اسلام آباد سے ایمانے نزار اشاہ کے داؤ پیچ ’’نومبر کے جاسوسی تک ہمیشہ کی طرح تگ و دو کے بعد رسائی حاصل ہوئی۔ مدیر اعلیٰ ٹھنڈ تو آ چکی ہے اور نومبر بھی۔ چینی نکتہ چینی کا پہلا تبصرہ شاندار تھا۔ نہ جانے سب اتنا اچھا کیسے لکھ لیتے ہیں؟ حقصہ آپ نے تو گن سے گولیوں کی برسات کر دی ہے۔ اے آر جٹ نے اس سے پہلے خواتین کے میگزین پر ہاتھ صاف کیے ہیں، جاسوسی میں واقعی پہلی مرتبہ تشریف لائے ہیں۔ یقین کر لیں...... اور اب لپ اسٹک اور لڑکیاں لازم و ملزوم اب تو مرد بھی لگاتے ہیں تو بس برداشت کیجیے۔ شاہد اتنا افسوس نہ کریں کبیر عباسی آپ کے لیے کوئی نیا محاورہ اپنی پٹاری سے نکال لائیں گے۔ بس اب پر اٹھوں کا ذکر نہ کرنا۔ انگارے میں انگاروں نے تو بہت تیزی سے جلنا شروع کیا ہے اور ایک ہی قسط میں ڈیتھ اسکواڈ کا پلان چوپٹ کر کے انہیں موت کی نیند سلا کر شاہ زیب نے تو پھر ہیرو ہی ثابت کر دیا ہے خود کو۔ شاہ زیب کی نقلی موت...... لگتا ہے یہ دیکھ کر قسطینا بھی پاکستان دوڑتی ہوئی آئے گی مگر بے چارے کی فیس سرجری ہو گئی تو ڈاکٹر احرار کے علاوہ کون اس کے زندہ ہونے کی تصدیق کرے گا؟ کبیر عباسی کا تیسرا کیس خطا پر در پہلے دونوں کیسز سے مزید بہتر لگا ہے۔ شک کا دائرہ کافی وسیع تھا۔ گھوم پھر کر لکلا کوئی اور...... کیپ اٹ اپ کبیر سر۔ اعتزاز سلیم وصلی انتقام لیتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ کیونکہ یہ جاسوسی کی پہلی کہانی تھی اس لیے آپ کو مارجن دیتے ہیں۔ ویری گڈ۔ موضوع تو بہت تلخ اور حساس تھا مگر مکالمے نہایت کم اور واقعات زیادہ تھے۔ مزید یہ کہ چوہدری احسان جیسے بااثر لوگ اغوا اپنے کارندوں سے کراتے ہیں تب بھی خود کسی معاملے میں سامنے نہیں آتے...... پھر جہانزیب نے یہ چھوٹا شوشہ چھوڑ کر کہ اس کے پاس چوہدری احسان اور اس کے کارندے کی وڈیو موجود ہے۔ عارف جیسے صحافی کو پھنسا کر فلیٹ پر بلا لیا تو عارف کی عقل کہاں گھاس چرنے گئی ہوئی تھی۔ باعث تاخیر میں مظہر سلیم ہاشمی نے کافی ریسرچ کر کے لکھا ہے۔ نوشین کا نیکی سے بدی اور بدی سے نیکی تک کا سفر بہترین انداز میں پیش کیا ہے۔ نہ جانے کیوں مجھے لگتا ہے نعمان کی بیکری والے کافی غائب دماغ تھے جو نعمان کی جگہ شاہد کو پورا دن دیکھتے رہے اور ذرا سا بھی فرق معلوم نہ ہوا اور سلمان کو وہ مزے سے مزید ارڈشز کھلانے میں مصروف رہا یقینا بنانے کے لیے بیکری کے کچن کا ہی رخ کرتا رہا ہوگا...... یا حیرت۔ دام کے دام کچھ کم ہی دوں گی میں۔ کچھ خاص نہیں لگی ریاض تو اپنے کھودے ہوئے گڑھے میں خود ہی آرام سے محو استراحت ہو گیا۔ داؤ پیچ پڑھ کر ثابت ہو گیا عورتوں کے چلتر باز ہونے میں کوئی شک نہیں۔ سوخادم پر اس کی پاگل بیوی نے پاگل پن میں بازی لے لی۔ شادی کرتے وقت اگر شرائط انسانوں والی رکھتے تو چھٹکارے کے لیے اتنے پاپڑ نہ بیلنے پڑتے۔ عشق زہرناک نے تو انڈیا کی سیر کرا دی۔ کمال لکھا ہے منظر امام نے۔‘‘

داؤد خیل سے سجاول خان کی ہمت ’’نومبر کی ٹھنڈی دوپہر میں فرحت بخش دھوپ کی طرح ملا جاسوسی۔ سب سے پہلے ٹائٹل پر نظر دوڑائی تو حسینہ کو ایک ادائے بے نیازی سے اپنی جانب دیکھتے ہوئے پایا ہم ابھی خوشی سے باہر بھی نہیں نکلے تھے کہ خنجر میں پرویا ہوا گلاب دیکھ کر ارمانوں پر پانی پھر گیا۔ نیچے کونے میں بیٹھا آدمی پتا نہیں کس چیز سے ڈر رہا تھا سمجھ نہیں آئی۔ دوڑتے ہوئے کہانیوں کی فہرست پر پہنچے۔ باعث تاخیر کو بنا کوئی تاخیر کے پہلے جا لیا۔ کہانی بہت زبردست تھی۔ ہیروں کی اسمگلنگ سے لے کر چوری تک کہانی میں آخر تک سسپنس کو برقرار رکھا گیا ہے۔ ویلڈن سلیم ہاشمی اس بہترین کاوش کے لیے۔ اس کے بعد باری آئی مختصر کہانیوں کی۔ انتقام سے انصاف کرنے میں بنا کوئی دیری کیے ہم نے اس کو بھی ختم کر ڈالا۔ کہانی کا ٹیمپو تیز تھا اور بوریت سے محفوظ رکھتے ہوئے وصلی نے بہترین کوشش کی۔ چارہ کار میں کہانی کا آغاز اچھا تھا مگر کہانی میں کوئی سسپنس نہیں تھا۔ سیدھی کہانی شروع ہوئی اور سیدھی طرح ہی ختم ہو گئی۔ ابھی باقی کہانیاں نہیں پڑھیں۔ انشاء اللہ ان کو بھی ضرور پڑھیں گے۔ کب سے تبصرہ بھیجنے کی آرزو تھی مگر وقت پر نہ پڑھ سکنے کی وجہ سے رہ جاتے تھے۔ اس بار سستی کے ریکارڈ کو توڑ کر ہم نے تبصرہ لکھ ہی لیا۔ اللہ کرے اب شائع بھی ہو جائے۔‘‘

راولپنڈی سے عبدالودود عامر کی تجزیہ نگاری ’’اس بار جاسوسی ذرا جلدی مل گیا جو کہ میرے نزدیک معجزہ ہی تھا۔ جاسوسی کھولا تو انگارے جیسے آنکھوں کے سامنے جم گئی اور ارد گرد کی خبر تب ہوئی جب کہانی ختم ہوئی، اس کے بعد اپنا ارادہ بھی یاد آیا بہر حال اب کیا ہو سکتا تھا۔ انگارے اب لگتا ہے کہ اختتام کی جانب بڑھ رہی ہے۔ اس بار ایکشن سے بھرپور تھی اس کے بعد جا پہنچے کبیر عباسی اور سلیم برادران کی جانب۔ کبیر عباسی ایک نیا کیس لے کر آئے ہوئے تھے اور ہیرو کو موقع واردات سے فرار کروا کر اس کے ذریعے کیس حل کروایا۔ کبیر عباسی کی تحریریں اب کافی پختہ رنگ اختیار کر چکی ہیں اور وہ بڑی کامیابی کے ساتھ اپنے قلم کا فسوں بڑھا رہے ہیں۔ اعتزاز سلیم وصلی نے انتقام کے ساتھ بڑی کمال انٹری دی اور چھا گئے۔ ایک بہت مضبوط موضوع کو لے کر اس پر کہانی لکھی۔ بے شک جرم کتنا بھی باریکی سے کیا جائے، وہ اپنا نشان ضرور چھوڑتا ہے۔ مظہر سلیم ہاشمی باعث تاخیر کے ساتھ سرورق کے رنگ میں نمودار ہوئے اور بہترین کہانی لکھی۔ ایک عورت جو جرم کی دنیا میں جتنا مرضی آگے جا چکی ہو لیکن ممتا کے جذبے کے آگے وہ بے بس ہو جاتی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہ جرم کی دنیا کے جال کتنے خطرناک ہوتے ہیں۔ سرورق کا پہلا رنگ عشق زہرناک باقی تو اچھا تھا لیکن اس میں وہ جادو والا سچ اور پھر یہ کہ جب وہ آزاد اس پنڈت کے سامنے جاتا ہے تو وہ اس پر کوئی حربہ کیوں نہیں آزماتا حالانکہ دوسری طرف ہیروئن کی یادداشت گم کر دی مگر بلکہ الٹا آزاد کو پہچاننے کے بعد وہ رات کو کھانا بھی کھاتے ہیں تب بھی وہ پنڈت کوئی گڑبڑ نہیں کرتا اور جس کمرے میں آزاد اور ہیروئن کا باپ ہوتے ہیں وہاں پر نگرانی کا کوئی بندوبست بھی نہیں ہوتا اور جہاں تک میں جانتا ہوں سکھوں کے مذہبی عقائد ہندوؤں سے الگ ہیں تو ایک پنڈت پر اتنا اعتبار اور پھر اپنی بیٹی کو اتنی دور تک لے جانا سمجھ میں نہیں آتا۔ (اچھی بات ہے، ہم منظر صاحب سے سمجھ لیں پھر آپ کو سمجھاتے ہیں) آوارہ گرد اب اچھی جا رہی ہے۔ شہزی

کا کا وہاں پہنچ کر بھی پنگا لے بیٹھا ہے۔ ابتدائی صفحات پر مردِ آہن چھائی ہوئی تھی، بہت زبردست کہانی رہی اگرچہ آخر میں دلاور کی گرفتاری اور سزا والی بات اچھی نہیں لگی۔“

کراچی سے سعدیہ قادری کی دلچسپی ”میں ٹائٹل زیادہ غور سے نہیں دیکھتی لیکن اس مرتبہ تبصرہ کرنے کا ارادہ تھا اس لیے ایک نظر غور سے دیکھ ہی لیا (یہ بہت اچھا کیا) معمول کے برعکس اس مرتبہ ٹائٹل گرل خاصی اچھی تھی اور خنجر کی نوک پہ گلاب کا پھول بھی اچھا لگ رہا تھا۔ فرصت میسر آتے ہی فوراً اپنی پسندیدہ کہانی انگارے کا رخ کیا، اس بار بھی مغل اعظم نے کمال کر دیا۔ ناقدین جو انگارے کو چنگاری سے تشبیہ دے رہے تھے، امید ہے انہیں اب اطمینان ہوگا۔ ایچ اقبال کی مردِ آہن بھی نہایت دلچسپ ثابت ہوئی لیکن کیا ہی اچھا ہوتا اگر آخر میں دلاور کو بجائے سزا کے خفیہ محکمے کا رکن بنا دیا جاتا، اس نے ایک موذی کا خاتمہ کیا تھا اس لیے اس کو سزا سنائے جانے کی منطق سمجھ نہیں آئی۔ کبیر عباسی کی خطا پر ور دلچسپ رہی، آخر تک ذرا بھی اندازہ نہ ہو سکا کہ اصل قاتل کون ہے اور عباسی صاحب اپنی کہانیوں میں ٹیکنالوجی کا جو استعمال دکھاتے ہیں وہ بھی مجھے بہت پسند ہے۔ اب بات کرتے ہیں باعثِ تاخیر کی، جہاں تک میرا خیال ہے یہ ہاشمی صاحب کی جاسوسی میں دوسری تحریر ہے۔ ان کی پہلی تحریر مجھے زیادہ پسند نہیں آئی تھی لیکن اس کہانی میں تو مصنف نے کمال کر دیا۔ کہیں سے بھی نہیں لگ رہا تھا کہ کسی نئے مصنف کی تحریر ہے۔ کہانی پہ گرفت شروع سے آخر تک قائم رہی اور ساتھ ہی بہت اچھا پیغام بھی ملا کہ ہمارا رب ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ نزدیک ہے۔ یہ ہمارا نکما پن ہے کہ ہم اپنے پروردگار کو بھلا کر فانی دنیا کے عارضی سہاروں سے امیدیں وابستہ کر لیتے ہیں۔ امید ہے اب ہاشمی صاحب کی تحاریر تواتر سے پڑھنے کو ملیں گی۔ اعتزاز وصلی کی انتقام بھی مکافاتِ عمل کے موضوع کا احاطہ کرتی ایک اچھی کاوش تھی۔ اسی طرح محنت اور مستقل مزاجی سے لکھتے رہے تو جلد ہی آپ نمایاں مقام حاصل کر لیں گے۔ چارہ کار میں وہی حساب ہو گیا کہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم۔ بے بسی کی پولیس میں پاکستانی نظام کی جھلک دکھائی دی۔ اجنبی تحریر، ثبوت اور سفید لکیر بھی مناسب رہیں۔ دام میں ریاض اپنی نفرت کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچا۔“

خیرپور میرس سے فراز حسین سومرو کی معذرت ”یہ میرا دوسرا خط ہے، پہلے خط کی اشاعت پر ادارے کا تہ دل سے شکریہ اور طویل غیر حاضری پر معذرت اور دوستوں کو آداب۔ فہرست ملاحظہ کر کے اداریہ پڑھا، محفل چین نکتہ چینی کی صدارت توصیف علی کے حصے میں آئی جو مختصر مگر عمدہ تبصرے کے ساتھ رہے۔ دوسرے نمبر پر ایم سہیل اپنی پہلی پیشی کے ساتھ حاضر تھے، بقیہ دوستوں کے تبصرے بھی اچھے تھے۔ آخر میں سیف لالا ادارے سے اپنی مہت ہا تے نظر آئے۔ آغاز انگارے کے مطالعے سے کیا۔ یہ قسط بھی ایکشن سے بھرپور تھی۔ ڈ-تھ اسکواڈ کا خاتمہ اور شاہ زیب کی موت کی افواہ، چلو کچھ مہلا عدل گی شاہ ... ہے کو لیا ماری گینگ نے۔ چارہ کار کوئی خاص تاثر نہ جما سکی۔ ڈاکو، شیرف اور بیلر سب ہی خالی ہاتھ رہ گئے۔ عکس فاطمہ کی بے بسی میں قاتل کی ۹ ناامت کے بعد قانون بے بس ہو گیا۔ چھوٹی مترجم کہانیوں کی جگہ اگر کوئی بڑا مغربی ناول شامل کر دیں تو شاید زیادہ مناسب رہے۔ انتقام ایک مختصر مگر ... ملس سے بھرپور بڑی خوب صورتی سے لکھی گئی تحریر تھی کہیں پر بھی یہ محسوس نہ ہوا کہ اعتزاز سلیم کی یہ پہلی کاوش ہے۔ داؤ پیچ میں دونوں میاں بیوی ایک ہی چال بچھائے بیٹھے تھے آخر میں جیت صفیہ کی ہوئی۔ خطا پر ور پر مزاح انداز کے ساتھ بہت دلچسپ تحریر تھی۔ نصر کا کردار ایک آنکھ نہ بھایا مگر حقیقت یہی ہے کہ ایسے کردار بھی موجود ہیں، کبیر عباسی ایک کڑوے سچ کو کہانی میں پرو کر لائے تھے۔ دام، آپ اپنے دام میں ریاض آ گیا۔ آخری رنگ، باعثِ تاخیر جرائم پیشہ افراد کے مابین لوٹ کھسوٹ کی داستان تھی۔ آخر کار نوشین کی توبہ رنگ لائی اور اپنی بیٹی تک پہنچی۔ کہانی کو بڑے نپے تلے انداز میں بڑی خوب صورتی سے لکھا گیا تھا۔ مظہر سلیم ہاشمی کے انداز نے سرکاشف زبیر کی یاد تازہ کر دی امید ہے آئندہ بھی لکھتے رہیں گے۔“

کراچی سے ڈاکٹر سیما ارشد کی رُودادِ جاسوسی ”سرورق پر ایک حسینہ (اللہ معاف کرے حسینہ کہنے پر) پنکھے کے آگے بیٹھ کر گویا بال اڑانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی اور ایک بونگا انسان اسے دیکھ کر ڈر رہا تھا۔ خنجر پر گلاب کا مقصد جاننے کے لیے ہم نے سوچا کہ سرورق کے رنگوں سے اندازہ لگا لیں گے...... پڑھنے کی ترتیب تو مختلف تھی لیکن تبصرے کا آغاز اپنی محفل سے کرتے ہیں۔ توصیف علی کا تبصرہ بھی اچھا تھا جبکہ ایم سہیل حاضری لگانے تشریف لائے تھے۔ حفصہ طارق کا تبصرہ کھٹا میٹھا محسوس ہوا ساتھ میں اپنا ذکر کرنے کی تاکید بھی کی گئی تھی اور بلاشبہ تبصرہ بھی ایسا تھا لہٰذا...... ویلڈن...... دیگر تبصرہ نگاروں میں کافی جانے پہچانے نام نظر آئے جن میں ایمانے زارا شاہ، کوثر اسلام، اے آر جٹ اور شاہد ذوالفقار کے تبصرے خصوصی توجہ سے پڑھے جبکہ سیف خان کے تبصرے پر تو ایسا لگا کہ آپ نے قینچی سائڈ پر رکھ کر ڈائریکٹ آرے ہی چلا دیے۔ مغل صاحب بھی کیا غضب ڈھاتے ہیں۔ یہ قسط کچھ طوفانی لگی لیکن طوفان بھی آتے جاتے رہنے چاہئیں...... لہٰذا ہم تو خوب محظوظ ہوئے۔ اس دفعہ مار دھاڑ اور سنسنی خیزی نے ایک لمحہ بھی کہانی سے نظر نہ ہٹنے دی، پلاسٹک سرجری سے ہیرو کا شناخت چھپانا اور دشمنوں کی نظر میں مردہ ہو جانا آئیڈیا تو پرانا ہے لیکن دیکھتے ہیں مغل صاحب کس انداز میں لے کر چلتے ہیں۔ اس کے بعد ہم نے آخری رنگ پر دھرنا ڈالا کہ مظہر سلیم ہاشمی کی اولین سرورقی کاوش کا جائزہ لیا جائے۔ تبصرہ نگار کی حیثیت سے اپنا آپ منوا چکے لہٰذا کہانی کے حوالے سے تجسس تھا۔ ویسے اب تک جتنے بھی تبصرہ نگاروں نے بطور کہانی کار جگہ بنائی ہے بشمول کبیر عباسی، زویا اعجاز اور شکیل کاظمی کسی نے بھی مایوس نہیں کیا۔ بلکہ اپنی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ امید ہے ادارہ اسی طرح نئے لکھنے والوں کو مواقع دیتا رہے گا۔ (انشاءاللہ) واپس آ جاتے ہیں باعثِ تاخیر پر جس نے ہمیں مزید قلم اٹھانے پر تاخیر سے روکا۔ ابتدا میں کہانی نے حیرت میں ڈالا۔ ایک نوآموز مصنف کی طرف سے اولین کاوش میں قلم کی بے باکی کی امید نہ تھی کہ اس حوالے سے نئے رائٹر محتاط رویہ اختیار کرتے ہیں کہ ابتدا میں قاری کے ذہن میں رائٹر کے حوالے سے جو امیج بن جاتا تو پھر وہ مشکل سے تبدیل ہوتا ہے اس حوالے سے یہ ہاشمی صاحب کا اپنی ذات پر اعتماد یا دلیری ہی کہوں گی کہ وہ یہ بات خاطر میں نہ لائے۔ کہانی مختلف پیچ و خم لیے بالکل مناسب

رفتار سے آگے بڑھی۔ مصنف کی ہر کردار پر محنت محسوس ہوئی۔ اوورآل کہا جاسکتا ہے کہ ایک لمحے کو ہم مصنف کا نام دیکھے بغیر کہانی کا مطالعہ کریں تو شاید ہی اندازہ لگاسکیں کہ یہ کسی نووارد کی اولین کاوش ہے۔ تنقیدی نکات کے حوالے سے بات کی جائے تو سلمان اور شاہد کا پس منظر واضح نہ تھا۔ شاہد کی تربیت اور اس لائن میں آنے کے حوالے سے کچھ وضاحت ضروری تھی۔ اس کے علاوہ سلمان کو جیسا اسمگلر دکھایا گیا اس سے یہ بے وقوفی کی توقع نہ تھی کہ وہ فون پر مزے سے اپنے دھندے کے بارے بات کرے گا۔ اسمگلنگ میں تو ہر چیز کے کوڈ ورڈز ہوتے۔ اولین صفحات پر اپج اقبال مرد آہن کے ساتھ نظر آئے۔ کافی عرصے بعد ایک سنسنی خیز کہانی پڑھنے کو ملی دلچسپ پیرائے میں ایک تیز رفتار اور جاندار تحریر تھی۔ گو کہ ابتدائی حصے میں ہمیں شاہ رخ خان کی مشہور فلم میں ہوں نا سے کافی حد تک متاثر لگی لیکن اگلے نصف میں وہ تاثر ماند پڑتا گیا۔ لیکن اففففف..... مگرمچھوں کے اوپر جال میں لٹکنا اور فائر ہونے پر اس کو پکڑ کر جھولے کی طرح جھولنا اور پھر اتنا تیز جھولا جھولنا کہ فرش پر جا گرنا اور دھڑا دھڑ دس بارہ آدمی کھڑکا دینا...... رجنی کانت کی انتہائی درجے کی ایکشن فلمیں بھی پانی بھرتی نظر آئیں...... لیکن پھر بھی ہم کہیں گے کہانی وہی اعلیٰ جو قاری کی اول و آخر دلچسپی برقرار رکھے اس حساب سے یہ ایک یادگار داستان تھی۔ کبیر عباسی خطا پرور لے کر آئے۔ ان کی ہلکی پھلکی کہانیاں ہمیں ان کے رنگوں سے زیادہ متاثر کرتی ہیں۔ ہمارے اردگرد سے لیے کرداروں پر مشتمل مزاح کے تڑکے کے ساتھ ان کے کیس ہضم کرنا آسان رہتا ہے لیکن ہر دفعہ موبائل کا کوڈ توڑ لینا اور تُکے لگ جانا یہ ہضم کرنا مشکل ہوتا ہے۔ ایک بندہ غلط کام کرے اور کال ریکارڈ کے طور پر اس کے ثبوت بھی لے کر گھومے......؟ خیر کبیر عباسی کا انداز دلچسپ اور منفرد ہے حنان ایک اُلجھا ہوا سراغ رساں بنتا جارہا ہے۔ اعتراز سلیم وصلی کی انتقام تک پہنچے اور پڑھ کر مزید حیرت میں گم ہو گئے۔ ہماری معلومات کے مطابق تو وصلی برادر نوجوان بلکہ چھوٹے سے جوان ہیں لیکن کافی میچور موضوع پر اسی میچورٹی کے ساتھ لکھا۔ جہانزیب اور عارف کے کردار پسند آئے۔ انتقام پر اتر آئے انسان تو کچھ بھی کرسکتا ہے۔ اس کے بعد ہم پہلے رنگ کی طرف بڑھے جو منظر امام کا عشق زہرناک تھا۔ کہانی مکمل طور پر ایک طلسمی اور خواب ناک سا تاثر لیے ہوئے تھی۔ آج کل کے زمانے میں اس طرح پہلی ملاقات میں کوئی لڑکا فدا ہونے لگے یا ایسے ڈائیلاگ مارے تو لڑکی فوراً سمجھ جاتی کہ لائن ماری جارہی۔ لہٰذا خیالی سی لگی۔ مہم جوئی پر مشتمل حصہ البتہ دلچسپ رہا جسے پڑھ کر ہمیں آتش فشاں یاد آنے لگی کیوں؟ یہ آتش فشاں کے فینز بخوبی سمجھ جائیں گے۔ مجموعی طور پر ایورج سے اوپر داستان رہی۔''

ہری پور ہزارہ سے شاہد ذوالفقار کے سنہرے منصوبے ''جاسوسی بروقت ہی مل گیا۔ سب سے پہلے اپنا تبصرہ ڈھونڈ کے پڑھا۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔ تبصروں میں توصیف علی شاندار تبصرے کے ساتھ حاضر تھے۔ دلنشین بلوچ، حفصہ طارق، اے آر ..... جٹ، اشفاق شاہین، کوثر اسلام، منیر راجہ اور تنویر اختر کے تبصرے بہت اچھے لگے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے ہاشمی بھائی کی باعثِ تاخیر پڑھی۔ بہت ہی شاندار کہانی تھی۔ کہیں سے بھی نہیں لگا کہ یہ ان کی پہلی یا دوسری کہانی ہے۔ کہانی میں الفاظ کا بھی بہت اچھا استعمال کیا اور تجسس بھی عروج پر تھا۔ لکڑ بھگوں والا سین بہت سنسنی خیز تھا، نوشین کی خوب صورتی کو بھی بہت اچھے انداز میں پیش کیا۔ کبیر عباسی نے خطا پرور لکھی۔ اس بار حنان کو کیس حل کرنے کے لیے کافی پاپڑ بیلنے پڑے۔ ہر کردار پر قاتل ہونے کا شک ڈال کے تجسس کو عروج پر پہنچایا گیا۔ قاتل کی دریافت والا پارٹ انتہائی سنسنی خیز تھا مجھے تو عدیل کے قاتل ہونے کا یقین ہو گیا تھا جو ہمیشہ کی طرح غلط نکلا۔ کبیر عباسی نے لگتا ہے کہانی لکھتے ہوئے...... قسم کھائی ہوتی ہے کہ کسی قاری کا اندازہ درست نہیں نکلنے دیں گے۔ اعتراز سلیم وصلی نے انتقام لکھی اور کیا خوب لکھی، مجھے ان کا انداز تحریر کبیر عباسی سے کافی ملتا جلتا لگا۔ اس کہانی کو بھی الجھا کے کافی تجسس پیدا کیا گیا۔ پہلی کہانی اپج اقبال کی مرد آہن بس ٹھیک ہی تھی۔ یہ کہانی کسی فلم سے متاثر لگ رہی تھی۔ خاص طور پر ولن کا نام، حلیہ، ڈائیلاگ اور مگرمچھوں والے سین بالکل فلمی تھے۔ اینڈ لگ رہا تھا خوشگوار ہوگا لیکن تھوڑا سا جھٹکا رائٹر نے لگا ہی دیا۔ پہلا رنگ منظر امام نے لکھا۔ قدرے بہتر لگا لیکن زیادہ پسند نہ آیا۔ انگارے کی تعریف سن سن کے پچھلے شماروں سے انگارے ڈھونڈ ڈھونڈ کے پڑھنا شروع کی ہے۔ چوبیسویں قسط سے اٹھائیسویں قسط تک لگاتار پانچ قسطیں اور کچھ پیچھے سے بیچ بیچ میں سے جو ملی ہیں، وہ پڑھی ہیں، بہت اچھی کہانی ہے۔ ایکشن اور سنسنی سے بھرپور۔ اس کے بعد آوارہ گرد کی بھی پرانی قسطیں پڑھنے کا ارادہ ہے۔ امید ہے وہ بھی اچھی ہوگی۔ باقی ڈائجسٹ ابھی نہیں پڑھا۔''

چکوال سے ممتاز محمود کے دلچسپ انکشافات ''خاکسار کی چینی نکتہ چینی کی محفل میں پہلی حاضری ہے (خوش آمدید)۔ ماہ نومبر کا شمارہ دو نومبر کے دن کھیوڑہ کی ایک شاپ سے خریدا۔ جاسوسی کا ٹائٹل اس بار کچھ زیادہ متاثر کن نہیں تھا۔ سرورق پر موجود حسینہ لپ اسٹک لگائے بڑی ادا سے سامنے دیکھ رہی تھی۔ (سامنے تو دیکھنا تھا...... آپ جو آرہے تھے!) اور نیچے ایک بھائی صاحب بڑے غصے سے گھور گھور کر اس حسینہ کے چہرے کو دیکھ رہے تھے اور حسینہ کے سر پر ایک تلوار بھی لہرا رہی تھی جس میں کسی ظالم نے گلاب کا ایک نازک پھول پرو رکھا تھا۔ (واہ بہت خوب بہت غور سے ٹائٹل دیکھا ہے)۔ کہانیوں میں سب سے پہلے میری نظر انتخاب مغل صاحب کی انگارے پر پڑی، اس بار انگارے میں بہت زیادہ ہلچل نظر آئی، شاہ زیب کی موت کی خبر پھیلنے سے کہانی میں ایک نیا موڑ آتا دکھائی دے رہا ہے۔ مرد آہن بھی ایک زبردست کہانی تھی، کاش حقیقت میں بھی ملک کی جڑیں کھوکھلی کرنے والوں کو عبرتناک انجام سے دوچار کیا جاسکتا، کبیر عباسی کی خطا پرور بہترین اور سنسنی خیز کہانی تھی۔ اعتراز سلیم وصلی کی انتقام بھی بہترین کہانی تھی جس میں صحافی عارف حسین نے اپنا بویا ہوا کاٹا، چارہ کار بھی ایک دلچسپ کہانی تھی، تراش خراش میں موجود کارٹون اور لطیفے بھی دلچسپ تھے۔''

اسلام آباد سے منیر راجہ کی خوشی در خوشی ''اس بار جاسوسی ڈائجسٹ کا جتنی بے چینی سے انتظار تھا اتنی بے چینی سے تو میں نے کبھی یکم تاریخ کا انتظار نہیں کیا، وجہ سادہ سی تھی کہ اس بار میں نے اپنا تبصرہ ارسال کر رکھا تھا۔ اٹھائیس تاریخ کی صبح مبارک ثابت ہوئی جب بہارہ کہو اٹھال چوک میں ایک

اسٹال پر جاسوسی کا شمارہ جگمگا تا دیکھا تو دل دہری خوشی سے بھر گیا، ایک خوشی تو جاسوسی ملنے کی اور دوسری اس بات کی کہ ہفتہ ہونے کے سبب آج آفس سے چھٹی تھی۔ اخبار کے ساتھ ایک شمارہ بھی خریدا اور گھر کی جانب چل پڑا۔ دل میں ایک انوکھا سا تجسس ہلکورے لے رہا تھا کہ جانے میرا تبصرہ شائع ہوا بھی یا نہیں۔ اسی انوکھے سے احساس کو سنگ لیے گھر پہنچا۔ اپنے کمرے میں پہنچتے ہی چشمہ پہنا اور دھڑکتے دل کے ساتھ جاسوسی کھول لیا۔ ایک عرصے کے بعد میرا دل اس لیے یہ دھڑکا تھا۔ اپنا تبصرہ دیکھ کے نوعمر لڑکوں کی طرح دل میں خوشی بھر گئی۔ اس خوشی کے احساس نے احساسِ زیاں سے بھی دو چار کیا کہ میں نے خود کو اتنے طویل عرصے تک اس خوشی سے محروم کیوں رکھا۔ خیر دیر آید درست آید کے محاورے سے دل کو بہلایا۔ اب آتے ہیں شمارے پر تبصرے کی طرف۔ ذاکر صاحب نے اس بار بھی ایک شاہکار قسم کا سرورق تخلیق کیا۔ خنجر کی نوک پر گل۔ اس استعارے کے کیا کہنے۔ اس پر مستزاد سرورق کی چلبلی سی ہیروئن۔ متاثر ہونا بنتا ہی تھا۔ قسط وار کہانیوں کے حوالے سے میری عادت ہے کہ میں کم از کم تین اقساط اکٹھی کر کے پڑھتا ہوں، اس طرح کہانی پڑھنے کا لطف ہی دوبالا ہو جاتا ہے۔ انگارے کی گزشتہ تین اقساط کا میں حالیہ شمارے کی آمد سے پہلے ہی مطالعہ کر چکا تھا، اس لیے سب سے پہلے اسے ہی مطالعے کا شرف بخشا۔ اللہ اللہ کر کے کہانی جاماجی سے نکلی اور پاکستان پہنچی۔ نیکساری گینگ کی آمد انتہائی سنسنی خیز رہی۔ آوارہ گرد کی پانچ چھ اقساط جمع ہو چکیں، اس ماہ وہ پڑھنے کا ارادہ ہے۔ اولین صفحات پر ایچ اقبال مردِ آہن لے کے آئے۔ لگتا ہے یہ موضوع ایچ اقبال کا پسندیدہ ترین موضوع ہے۔ کراچی میں ایک مجرم گروہ اور ایجنسی یا پولیس کی آنکھ مچولی پر اتنی زیادہ کہانیاں لکھ چکے ہیں کہ چند صفحات بعد ہی کہانی واضح ہو گئی۔ اس لیے اس تحریر نے اتنا لطف نہیں دیا جتنا اولین صفحات کی تحریر سے میں توقع رکھتا ہوں۔ رنگوں میں منظر امام کی آمد کوفت کا باعث رہی۔ ان کی مختصر تحاریر تو مجھے از حد پسند ہیں لیکن رنگوں میں آج تک بھی یہ متاثر نہیں کر پائے۔ دوسرے رنگ میں مظہر سلیم کا نام پہلی بار نظر آیا۔ باعثِ تاخیر نے ابتدا ہی میں توجہ حاصل کر لی جو اختتام تک برقرار رہی۔ عمدہ کردار نگاری اور پُرتجسس واقعات کے سبب یہ کہانی ہر طرح سے متاثر کرنے میں کامیاب رہی۔ مختصر تحریروں میں سب سے پہلے کبیر عباسی کی خطاوار کا مطالعہ شروع کیا۔ جانے پہچانے کرداروں کو دیکھ کے از حد خوشی ہوئی۔ میں بھی بہارہ کہو میں رہتا ہوں اس لیے اس تحریر کے کرداروں سے انسیت لازمی امر ہے۔ اس بار کہانی میں بہارہ کہو کا ذکر تک نہ آیا بہرحال مری کی سیر خوب رہی۔ ہلکے پھلکے مزاح نے الجھنوں اور تجسس سے بھری کہانی کا مزہ دوبالا کر دیا۔"

توصیف علی، کراچی سے لکھتے ہیں" ستائیس کی شام کو جاسوسی ہاتھ میں آیا تو اپنا تبصرہ پہلے نمبر پر دیکھ کے حیرت کا ایک خوشگوار جھٹکا لگا گو ا[illegible] نے ہلی کالی ا[illegible]تی بھی ہوئی، بہرحال پہلے نمبر پر آنے کی خوشی کے باعث کٹوتی ناگوار نہیں گزری۔ ٹائٹل پسندیدگی کی سند پا گیا۔ فہرست کا مطالعہ [illegible] بعد نظر انتخاب کبیر عباسی کی خطاوار پر جا ٹھہری کہ ان کا گزشتہ ریکارڈ اس بات کا گواہ تھا کہ کہانی اچھی نہ بھی ہوئی تو کم از کم بری [illegible] ہو گی۔ ہماری توقع درست ثابت ہوئی۔ کہانی معاشرتی و جاسوسی دونوں پہلوؤں کو مدنظر رکھ کے لکھی گئی۔ یونیورسٹیز میں آج کل جو کچھ ہو رہا ہے اس کی عکاسی کہانی میں خوب کی گئی۔ کہانی کو جس انداز میں الجھایا گیا اس سے سسپنس عروج پہ جا پہنچا۔ اینڈ پہ سوال معنی خیز رہا۔ دوسرے نمبر پر مظہر سلیم ہاشمی کی باعثِ تاخیر اپنی طرف توجہ مبذول کرانے میں کامیاب رہی۔ ان کی پہلی تحریر نظر سے گزری اور پہلی ہی تحریر ہمیں ان کا فین بنانے میں کامیاب رہی۔ ان کا اسلوب اور کہانی پیش کرنے کا انداز متاثر کن رہا۔ چھوٹے چھوٹے کرداروں پر بھی کافی محنت کی گئی۔ خوب صورت الفاظ کے استعمال نے تحریر کو چار چاند لگا دیے۔ منظر امام کی عشق زہرناک وقت کا ضیاع ثابت ہوئی۔ معذرت کے ساتھ ہمیں تو اس تحریر میں کچھ بھی نظر نہ آیا۔ اولین صفحات پر ایچ اقبال فلمی سا انداز لے کے آئے۔ ایک تو گھسا پٹا پلاٹ اوپر سے بور کرداروں اور غیر متاثر کن ڈائیلاگز نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ بڑی مشکل سے صفحات گن گن کے یہ تحریر مکمل کی، اینڈ بھی توقع کے مطابق فلمی ہی رہا۔ یاسر اعوان کی ثبوت بہت دلچسپ تحریر رہی۔ سنسنی اور تجسس کا آمیزہ لیے اس تحریر میں ہر وہ چیز تھی جو جاسوسی کہانی کا خاصہ ہوتی ہے۔ فی الحال اتنا ہی ڈائجسٹ پڑھ سکے ہیں امید ہے تنقید ناگوار نہیں گزرے گی۔" (جی بالکل نہیں)

کراچی سے محمد سہیل کا پیام" 29 اکتوبر کو کام سے واپسی پر ایک اخبار والے سے جاسوسی خریدا۔ نکتہ چینی میں اپنی پہلی انٹری دیکھ کر دل پارک پارک ہو گیا۔ اپنے مطالبے کے حوالے سے مثبت جواب پا کر میں بہت مارا مارا پھرا، پھر سوچا اسی منہ سے شکریہ ادا کرتا ہوں، مستقبل شناس کو کتابی شکل میں اپنے ہاتھ میں دیکھ کر ایسا لگے گا جیسے پچھلی سردیوں کے پرانے جیکٹ کی جیب سے 500 روپے کا ملنا۔ سرورق کا قائل نہیں ہوں۔ جیسے بھی ہو، چلتا ہے، ہاں ایک خاص بات تھی سرورق میں اور وہ خاص بات ہے پھول کے ساتھ تلوار، کیونکہ ہم نے پھول کے ساتھ کانٹے تو دیکھے ہیں مگر تلوار کا ہونا خاصا یونیک تھا۔ اولین صفحات کا ناول شاندار تھا۔ پہلا رنگ زبردست تھا مگر اس طرح کا ٹاپک اگر کسی طویل کہانی کا ہو جاتا تو وہ سونے پہ سہاگا ہوتا کیونکہ ایڈونچر والی کہانیاں میری کمزوری رہی ہیں۔ چھوٹی کہانیوں میں انتقام نے معاشرے کی اچھے سے انداز میں منظرکشی کی، کیونکہ یہ ایک تلخ حقیقت ہے۔ ہمارے میڈیا کے حوالے سے کہ ماں یا باپ گھر میں ایک گلاس پانی کے لیے دوسروں کے محتاج ہوتے ہیں اور وہاں چینل میں بیٹا مادر ڈے اور فادر ڈے کے حوالے سے اپنے اپنے چینل کی ریٹنگ کے لیے پروگرام کر رہے ہوتے ہیں۔ کاش ہم اپنے آپ کو سدھارنے کے بعد ہی معاشرے کو سدھارنے کے مشن پر چل پڑیں۔"

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

ایم اے جٹ، کمالیہ۔ (آپ کا بے حد شکریہ جو اتنے خلوص سے ہمیں خط لکھا۔ پبلشر کے پتے پر کہانی ارسال کر دیجیے)۔ محمد اقبال، کراچی۔ آفتاب احمد، حیدرآباد۔ حرا اختار، کراچی۔ عمران ملک، ٹنڈو آدم۔ شہناز اقبال، لاہور۔

دوسری موت

پروین زبیر

کہتے ہیں کہ زندگی کے ریلے میں رنج و غم کے میلے ہیں... دھوپ چھاؤں کے مانند سکڑتی پھیلتی یہ زندگی کبھی پیمانِ وفا بن جاتی ہے تو کبھی ایک بہتان... ایک ایسا امتحان جو کبھی آسان ہوتا ہے... تو کبھی اس کا دورانیہ کرنا پڑ جاتا ہے... آنکھ نم... دل شکستہ اور کچھ یادیں یہ اس کے سفر کا ساماں تھے... منزل کا دور دور تک پتا نہ تھا... مگر لبِ ساحل پہنچنے کی جستجو اور آرزو اسے قائل کرتی تھی کہ کچھ نہ کچھ حاصل ہو کے رہے گا... ملک میں اور ملک سے باہر اس کی ذات سے چمٹے مسائل اور مصائب بغاوت پر کمر بستہ رہے... وہ محبتیں اور رفاقتیں جنہیں وہ پیچھے چھوڑ آیا تھا... یادوں کی صورت قیامتیں ڈھاتی رہیں... تشنگی بڑھتی رہی... خاموشی ٹوٹی... بے خودی کا نشہ ٹوٹا اور خودداری بیدار ہونے لگی... اس کا ظاہر جو برائیوں کی دلدل میں دھنسا ہوا تھا مگر شاید اس کے باطن کی اچھائی زندہ تھی جس نے موت کے تعاقب کے باوجود... زندگی کو روٹھنے نہ دیا... دیارِ غیر میں کھیلی جانی والی خون کی ہولی...

سنسنی...... تجسس...... اور تحیر میں ڈوبی نا قا[illegible] داستان......

اس دھواں دھواں فضا میں وہ جان توڑ کر [illegible] دور دور تک پھیلے اس برف زار میں ٹنڈ منڈ درختوں کی ق[illegible] سڑک کا ہلکا سا نشان دے رہی تھیں اور وہ بھی جان کی ساری جدو[illegible] سڑک کے کنارے کنارے دوڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔

نرم برف کے ڈھیر میں اس کے پاؤں بار بار دھنس رہے تھے، جنہیں وہ کھینچ کر نکالتا اور کوشش کرتا کہ اس کے دوڑنے کی رفتار میں اضافہ ہو ورنہ پیچھے آنے والے دشمن زیادہ دور نہیں تھے۔

موٹی جیکٹ کے ہڈ نے اس کا چہرہ کسی حد تک ڈھکا ہوا تھا لیکن مسلسل گرنے والی برف کے چھوٹے چھوٹے گالے اس کی سانس کی دھونکنی کے ساتھ منہ میں جا رہے تھے اور چہرے کے کھلے حصوں پر جمتے بھی جا رہے تھے جبکہ بھاری بوٹ پیروں میں بیڑیوں کی طرح محسوس ہو رہے تھے۔

فضا کا ٹمپریچر فریزنگ پوائنٹ سے بھی نیچے ہی ہوگا لیکن اس کی بے محابہ دوڑنے والی مشقت اور ہیجان انگیز کیفیت نے اس کے جسم کا درجۂ حرارت اتنا بڑھا دیا تھا کہ اسے موٹے گرم کپڑوں کے نیچے اپنے بدن پر پسینے کی نمی صاف محسوس ہو رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ابھی نہیں تو کبھی نہیں کے مصداق آج اگر وہ

اپنے دشمنوں کے ہتھے چڑھ گیا تو اس کی داستان، یہیں اس برف زار میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی اس لیے لازم تھا کہ وہ دوڑتا رہے، یہاں تک کہ ان کی دسترس سے دور نکل جائے۔

اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دور دور تک پھیلی برف کی سفیدی میں اسے کوئی سیاہ ہیولا نظر نہیں آیا۔ سوائے ایک قطار میں نظر آنے والے اس کے پیروں کے نشان کے۔ ایک خیال بجلی کی طرح اس کے ذہن میں آیا اور وہ رک گیا۔ دور تک میدان صاف دیکھ کر پلٹا اور بڑی مہارت سے برف پر بننے والے اپنے ہی پاؤں کے نشانوں پر پیر رکھتا ہوا واپس چل پڑا۔ یہ سفر نسبتاً آسان محسوس ہوا اور وہ کوشش کر کے تیز رفتاری سے آگے بڑھا۔ کافی دور واپس آنے کے بعد اس نے سڑک کے کنارے لگے ٹنڈ منڈ درختوں کے درمیان چھلانگ لگائی۔ اس احتیاط کے ساتھ کہ اس کے سڑک سے ہٹنے کا کوئی نشان نہ بنے۔

جہاں وہ لینڈ ہوا، وہ نرم برف سے بھرا کوئی گڑھا تھا۔ وہ اس میں دھنستا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اس کا لمبا چوڑا وجود پورے کا پورا اس میں سما گیا۔ اسے بھی اس نے قدرت کی کوئی مہربانی سمجھا اور آس پاس کی برف سمیٹ کر اپنے اوپر ڈال لی۔ سوائے چہرے کے تھوڑے سے حصے کے۔ تا کہ سانس لے سکے۔ اب کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہاں کسی ذی روح کا کوئی وجود ہے۔

برف گرنے کی رفتار میں اضافہ ہو گیا تھا۔ فضا میں ہر طرف برف کے بگولے چکرا رہے تھے۔ فضا اور زیادہ دھندلا گئی تھی۔ اسی لمحے خاموش فضا کو ایک ٹرک کی گھوں گھوں کی آواز نے توڑا۔ اس کے بڑے بڑے پہیوں سے [illegible] دور تک اڑ رہی تھی اور وہ اچھی [illegible] قریب سے گزرا [illegible]

بعد اس وقت ملتا جب برف پگھلتی۔

لیکن بیڑا غرق ہو اس ٹرک کا جس نے ان کی منزل کھوٹی کر دی۔ اس سے اڑنے والی برف نے سارے نشان مٹا دیے تھے۔ صرف کہیں کہیں ان کا ہلکا ہلکا عکس نظر آ رہا تھا اور وہ بھی تیزی سے گرنے والی برف کے باعث معدوم ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اسی طرح چیختے چلاتے آگے نکل گئے۔ وہ دم سادھے ان کی باتیں سنتا رہا۔ انہیں اب بھی امید تھی کہ وہ آگے مل جائے گا۔ جائے گا کہاں، اسے ہر قیمت پر ڈھونڈ کر مارنا ہوگا۔ ورنہ ان کی اپنی جان خطرے میں پڑ جائے گی۔ وہ دم سادھے ان کی باتیں سنتا رہا اور وہ آگے نکل گئے لیکن اسے معلوم تھا کہ جلد ان کی واپسی ہوگی اور اسے واپسی کا انتظار کرنا تھا۔

جلد ہی پھر وہ آوازیں اس کی سماعت سے ٹکرائیں۔ وہ واپس آ رہے تھے۔ اب وہ اسے اور شد و مد سے برا بھلا کہہ رہے تھے اور بہت ہی کچھ ناشنیدہ قسم کی گالیوں سے نواز رہے تھے بلکہ اب وہ اپنی گاڑی اور اسے ڈرائیو کرنے والے موبی کو بھی گالیاں بک رہے تھے۔ گاڑی جس نے فریز ہو کر چلنے سے انکار کر دیا تھا اور موبی جو اسے کنٹرول کرنے میں ناکام رہا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر موبی اس پرانی کھٹارا کار کو صحیح سے کنٹرول کر لیتا تو ابھی تک تو وہ اس کو دس بار قتل کر کے قبر میں دفن کر چکے ہوتے اور اس وقت تک اپنے اپنے گھر پہنچ کر گرم بستروں میں ہوتے۔ سردی میں اتنی مشقت بھی اٹھائی اور وہ بدبخت یقیناً ٹرک والے سے لفٹ لے کر بچ نکلنے میں کامیاب بھی ہو گیا۔ ساری جدوجہد ضائع ہو گئی۔ مایوسی میں وہ تینوں چیختے چلاتے، گالیاں بکتے اور قسمیں کھاتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ اب اگر وہ ہتھے چڑھ گیا تو پہلی نظر ڈالتے ہی اسے گولی سے اڑا دیں گے۔ چاہے وہ کتنے ہی لوگوں کے ساتھ کیوں نہ ہو۔ اب ان کی زندگی، اس کی [illegible] ہو گئی تھی۔ ماسٹر بروس نے [illegible] سامنے آتا ورنہ [illegible] اگلی کئی نسلیں [illegible] گی۔

[illegible] ایک بڑی مافیا کا ڈان تھا [illegible] کام کرتے تھے جو قانونی طور [illegible] اس کی لغت میں معافی نہیں تھی۔ کسی [illegible] صرف موت تھی۔ ماسٹر بروس کو دھوکا [illegible] زندگی عذاب ترین کر لیتا تھا۔ چند گھنٹے...... [illegible] لیکن یہ نہ جانے کیسا ڈھیٹ تھا کہ مارے

جانے کی ساری کوششوں کے باوجود اب تک زندہ تھا۔ ماسٹر نے ان چاروں کو کہہ دیا تھا کہ اب میرے سامنے آؤ تو صرف اس کی لاش کے فوٹو کے ساتھ آنا، ورنہ تم چاروں کی فوٹو کوئی دوسرا لے کر جائے گا۔

☆☆☆

وہ اپنے آفس کی بڑی سی کھڑکی کے شیشے سے باہر کا منظر دیکھ رہا تھا۔ دور ریور واک پر اِکا دُکا لوگ چلتے پھرتے نظر آرہے تھے۔ اس کی دور دور لگی چوبی بینچوں پر برف کے ڈھیر جمع تھے اور ٹنڈ منڈ درختوں کی قطاریں پتوں اور پرندوں سے محروم نظر آرہی تھیں۔ اس سے آگے دریا تھا جس میں ایک ٹگ آہستہ آہستہ حرکت کرتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ کروز شپ کمپنیوں نے اپنے اپنے آفس بند کر دیے تھے۔ کیونکہ اس موسم میں لوگ سیر و تفریح کے لیے نکلتے ہی نہیں تھے۔ وہ بے خیالی میں یہ سب دیکھتے ہوئے چونک پڑا۔ دروازے پر دستک دے کر اندر آنے والے شخص کے چہرے پر ایک کمینگی بھری مسکراہٹ تھی۔

”ہیلو مسٹر علی! آج بڑی خاموشی ہے تمہارے آفس میں۔ سب خیریت ہے نا؟“ اس نے اسی چڑانے والی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

”کام کیا ہے؟“ وہ کھڑکی سے ہٹ کر کرسی پر آکر بیٹھ گیا اور آنے والے کو کینہ توز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”باس کا پیغام لایا ہوں۔“

”ہاں کہو۔“

”مہینا ختم ہو رہا ہے۔ ابھی تک اماؤنٹ پوری نہیں ہوئی ہے۔“

”ہمممم...... مل جائیں گے پیسے...... باس کو بتا دینا کہ اس دفعہ کچھ غلط جگہ ہاتھ پڑ گیا تھا۔ لینے کے دینے پڑ گئے۔ بمشکل جان بچا کر نکلا ہوں۔“

”تمہیں معلوم ہے۔ باس کو ان چیزوں سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ یہ سب تمہارے دردِ سر ہیں۔ تم صرف یہ بتاؤ کہ کب تک تمہاری اماؤنٹ پہنچ جائے گی؟“

”بہت جلد۔“

”او کے! میں تمہارا یہ پیغام بھی پہنچا دوں گا لیکن کیا تمہارے ہاں چائے کافی پوچھنے کا رواج نہیں ہے؟“ وہ مسکرایا۔

”تمہارا میرا خون کا رشتہ ہے، کہو! پیو گے کیا؟“ علی نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا تو وہ کھسیانی ہنسی کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔

”ہممممم...... رشتہ یاد دلانے کا شکریہ...... تم جانتے ہو...... یہ ہم دونوں کی مشترکہ مجبوری ہے، نہ تم اپنی مرضی سے یہ سب کرتے ہو، نہ میں۔“

”ہاں لیکن اس دلدل میں تم نے ہی مجھے دوستی اور محبت سے ہاتھ پکڑ کر اتارا تھا اور اب تک دلدلی جونک بن کر میرے وجود سے چمٹے ہوئے ہو، ناؤ گیٹ لاسٹ!“ علی نے بھنچی ہوئی آواز میں اسے نکل جانے کو کہا۔

”ہاں...... لیکن اس میں تمہاری مرضی بھی شامل تھی...... تم جانتے ہو۔“ اس نے ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”میرے پاس کوئی دوسرا آپشن تم نے چھوڑا کہاں تھا۔ میری بے بسی اور مجبوری کا فائدہ اٹھایا تھا...... اور آج بھی اٹھا رہے ہو۔“

”چھوڑو یار! کب تک اِن سب باتوں کو یاد کرتے رہو گے۔ آج کے دن میں جینا سیکھو، میں اور تم حالات کے قیدی ہیں اور قیدیوں کی اپنی کوئی مرضی نہیں ہوتی۔ میں کہاں کا ڈان ہوں کہ ملینز آف ڈالرز میں کھیل رہا ہوں۔ سب کچھ دوسروں کے لیے ہی کرنا پڑ رہا ہے۔ تمہاری طرح......“ احسان نے سنجیدگی سے کہا تو وہ بھی خاموش ہو کر ہونٹ چبانے لگا۔

ہیورٹ پلازا میں چوتھی منزل پر واقع یہ کنسلٹنگ آفس گاڑیوں کی رجسٹریشن، ٹیکس اور انشورنس کے علاوہ کاروں سے متعلق تقریباً تمام معاملات کی ڈیل کرنے کا خاصا بڑا مرکز تھا۔ علیز کنسلٹنٹ کے نام سے یہ کمپنی پچھلے چند سالوں میں ہی اپنی ساکھ بنا چکی تھی۔

ڈیٹرائٹ شہر فورڈ گاڑیاں بنانے کا مرکز تھا۔ ایک بہت بڑے علاقے میں ان کی فیکٹریاں، گودام اور اسٹورز کے علاوہ شوروم بھی تھے۔ آدھے سے زیادہ شہر فورڈ گاڑیوں سے متعلق مختلف معاملات سے وابستہ تھا۔ زیادہ بڑی تعداد سیاہ فام مزدوروں کی تھی جو کاریں بنانے کی ان فیکٹریوں میں کام کرتے تھے لیکن ان کے علاوہ بھی بہت سارے لوگ کاروں سے متعلق مختلف معاملات میں مصروف تھے۔

علی حمزہ ایک پاکستانی نوجوان تھا جو یہیں علیز کنسلٹنٹ کے نام سے اپنی ایک فرم چلا رہا تھا جو گاڑیوں سے متعلق بہت سے معاملات میں اپنی خدمات فراہم کرتی تھی۔ اس کا شاندار آفس ریور واک روڈ پر واقع ہیورٹ پلازا کے فورتھ

فلور پر واقع تھا۔

اداس آنکھوں والا علی حمزہ لمبا چوڑا، کسرتی بدن رکھنے والا ایک نوجوان تھا جس کی شخصیت کا شاندار تاثر کچھ تو قدرت کی دین تھی اور بہت کچھ اس نے محنت سے بنایا تھا...... جو بھی اسے دیکھتا تو ضرور متاثر ہوتا اور اگر ملتا تو گرویدہ ہو جاتا۔

پانچ سال پہلے وہ اپنا ملک چھوڑ کر یہاں آن بسا تھا لیکن اپنی مرضی اور خواہش پر نہیں بلکہ حادثاتی طور پر۔

☆☆☆

''پھر...... کیا سوچا تو نے؟'' احسان نے زمین کو انگلی سے کریدتے خاموش بیٹھے علی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ دونوں رات کے اس پہر اس کرکٹ میدان کی پچ پر بیٹھے تھے۔ اداس، مایوس اور دل گرفتہ سے۔

''دل نہیں مانتا یار! برائی برائی ہے۔ ایک دفعہ اس دلدل میں اتر گئے تو واپسی مشکل ہو جائے گی۔'' علی کا لہجہ شکستہ تھا۔

''پھر کیا کریں؟ کوئی اور راستہ بھی تو نہیں مل رہا ہے یار!''

''دیکھتے ہیں شاید کوئی راستہ نکل آئے۔''

''کب تک یار! کب تک...... میرا تو اب گھر جانے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ کوئی کچھ کہتا نہیں لیکن ان کی سوالیہ نظریں میرے دل میں تیر بن کر لگتی ہیں۔''

''ہم م م م...... میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہے مگر کیا کروں کوئی آسرا مل نہیں رہا۔ سوچا تھا ٹیکسی چلا لوں لیکن ٹیکسی کرائے پر لینے کے لیے بھی اچھا خاصا زرِضمانت پہلے جمع کروانا پڑتا ہے۔ وہ کہاں سے دوں...... سیلز مین کی جاب کے لیے بھی کسی نہ کسی کا ریفرنس درکار ہوتا ہے اور بھی سب جگہ اسی طرح الجھے ہوئے ہیں معاملات۔''

''میں بھی سب کچھ آزما چکا ہوں۔ فرسٹ کلاس گریجویٹ ہونے کے باوجود ہم دونوں کے لیے کوئی باعزت روزگار نہیں ہے۔ ضرورتیں انتظار نہیں کر سکتیں...... پہلے مجھے اس شدو نے موبائل اور پرس چھیننے کے اس کام کی آفر کی کہ جو کچھ ملے گا آدھا آدھا ہوگا۔ میں نے اسے برا بھلا کہہ کر بھگا دیا تھا۔ اب بھی وہ اس جھگی ہوٹل پر اکثر ملتا ہے اور نظروں ہی نظروں میں پوچھتا رہتا ہے کہ مل گیا باعزت روزگار، میں نے تو جانا ہی چھوڑ دیا...... اب ایک اور ایسی ہی آفر ہے...... اگر تو کہے تو......'' احسان بڑبڑا کر چپ ہو گیا۔ ایسی ہی خونی نظروں سے گھورا تھا علی نے اسے۔ وہ پھر ٹھنڈی سانس لے کر دوبارہ گویا ہوا۔

''ٹھیک ہے یار! میں تیرا حوصلہ توڑنا نہیں چاہتا...... لیکن میں بتا دوں کہ میں نے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔'' احسان کے لہجے میں بے بسی تھی۔

''کیا؟ کیا کیا تو نے؟'' علی نے تیز لہجے میں پوچھا۔

''ایک سیاسی جماعت جوائن کر لی ہے...... ورکر کی حیثیت سے۔''

''اس سے تجھے کیا ملنے والا ہے پاگل؟''

''سب کچھ...... وہ سب کچھ جس سے میری ضرورتیں پوری ہوتی رہیں۔''

''اور کرنا کیا ہوگا؟''

''وہ سب کچھ...... جو وہ حکم دیں گے۔''

''مثلاً؟''

''مثلاً لڑنا بھڑنا...... فائرنگ کرنا، آگ لگانا، بھتے وصول کر کے لانا اور اگر ضرورت ہو تو مخالفین کا قتل کرنا وغیرہ وغیرہ۔''

''اور تو نے یہ سب کرنا قبول کر لیا؟''

''ہاں، کیونکہ لاکھ سر پٹخنے کے باوجود...... باعزت زندگی گزارنے کا کوئی راستہ میں نہیں تلاش کر پایا۔ گھر میں پھیلی تنگدستی، ضرورتوں کے پہاڑ اور مسائل کے انبار نے مجھے مجبور کر دیا۔ اور میں نہ چاہنے کے باوجود اندھیروں کی دنیا میں داخل ہو گیا ہوں۔''

وہ خاموش ہو گیا۔ وہ دونوں دور اندھیرے میں امید کا بجھتا ستارہ ڈھونڈنے کی ناکام کوششیں کرتے رہے۔ پھر وہ دونوں الگ الگ دنیاؤں کے باسی ہو گئے۔ ملتے تھے کبھی کبھی...... اور تھوڑے ہی عرصے میں احسان کے حالات بہترین اور علی کے بدترین ہوتے گئے۔ وہ زندگی کے پُل صراط پر کھڑا چلا رہا تھا کہ احسان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر جہنم میں گھسیٹ لیا۔ وہ دور نظر آنے والی جنت کو دھندلی آنکھوں سے دیکھتا ہوا شعلوں کے جنگل میں اترتا چلا گیا۔

☆☆☆

وہ ایک بڑا فشنگ ٹریلر تھا جو گہرے پانیوں میں مچھلیاں پکڑتا تھا۔ عرشے پر مچھلیوں کا ڈھیر اور پھیلے ہوئے جال۔ نیچے انجن روم، اس کے نیچے ایک اور حصہ جو نمک اور برف سے بھرا رہتا تھا جہاں معمولی طور پر مچھلیوں کی پروسیسنگ ہوتی تھی تاکہ وہ ساحل پر پہنچنے تک خراب نہ ہوں۔ بظاہر اس ٹریلر کے اتنے ہی حصے تھے لیکن اس میں ایک خفیہ دروازہ بھی تھا جو اس کی تہ میں ایک اور خفیہ حصے

میں لے جاتا تھا۔

وہ تقریباً بیس آدمی تھے۔ انتہائی بدحالی کی کیفیت میں بوسیدہ اور بدبودار کمبلوں میں ایک دوسرے سے جڑ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ پھر بھی اوپر کی برف کے سبب اتنی ٹھنڈک تھی کہ بار بار ان کے اکڑ جانے والے جسموں کو بمشکل پہلو بدل بدل کر اعتدال پر لانا پڑ رہا تھا۔ مچھلیوں کی سڑاند نے سفر کے ابتدائی حصے میں انہیں ابکائیاں لینے پر مجبور کیا۔ لیکن آخرکار وہ بھی اب عادی ہو گئے تھے۔ تن بہ تقدیر اس اندھیرے سرد تہ خانے میں زندگی کی آس میں سانس لے رہے تھے۔ آج غالباً انہیں گیارھواں دن تھا۔ یہ بھی محض اندازہ ہی تھا۔ کیونکہ ان لوگوں کے لیے دن و رات کی تخصیص چھت میں رہ جانے والے ایک چھوٹے سے روزن کی محتاج تھی۔ اگر ایک باریک لمبی روشنی کی کرن اس میں سے نیچے آرہی ہے تو دن، ورنہ رات۔ سو اس وقت وہ روزن تاریک تھا اس لیے شاید رات تھی۔ وہ سب اونگھنے اور سونے کی درمیانی کیفیات میں تھے کہ سب ہڑبڑا کر پوری طرح بیدار ہو گئے۔ کیونکہ ان کے زنداں کے دروازے پر کچھ ایسی آوازیں تھیں جیسے اسے کھولا جارہا ہے۔

''کم آن...... کم آن...... گیٹ آؤٹ سائڈ۔'' وہ ایک سیاہ فام تھا اور حلیے سے خلاصی ہی لگ رہا تھا۔ وہ ان سب کو اٹھنے اور باہر آنے کا اشارہ کررہا تھا اور دروازہ پورا کھلا ہوا تھا۔ ان سب کے حواس پوری طرح بیدار ہو گئے۔ وہ اٹھنے کی کوششوں میں لڑکھڑائے مگر ایک دوسرے کا سہارا لے کر کھڑے ہو گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ سب ایک ہوا بھری ہوئی رفٹ بوٹ میں سوار تھے۔ وہ تیزی سے سمندر کے سیاہ پانیوں پر دوڑ رہی تھی۔ گہرے اندھیرے کے سبب وہ کچھ بھی دیکھنے سے قاصر تھے۔ تاہم یہ معلوم تھا کہ وہ تین چار آدمی ہیں جو اس ہوا بھری بوٹ کو نامعلوم منزلوں کی طرف دوڑائے لیے جارہے ہیں۔ دو کے ہاتھ میں لمبی نالوں والی رائفلیں بھی نظر آرہی تھیں۔ وہ سب بہت چوکنا نظر آرہے تھے۔ دوربین سے آس پاس نہ جانے کیا دیکھ رہے تھے بار بار...... ماحول ٹینشن سے بھرا ہوا تھا۔ ان چاروں نے اپنی پیٹھ سے ایسے سلنڈر باندھے ہوئے تھے جیسے اسکوبا ڈائیونگ والے باندھے ہوتے ہیں۔

اچانک ان چاروں نے بوٹ کو انتہائی تیز رفتاری سے دوڑایا اور کچھ دیر بعد انجن بند ہو گئے۔ بوٹ سبک رفتاری سے پانی کی سطح پر دوڑنے لگی اور تھوڑی دیر میں اس کی رفتار بہت کم ہو گئی تو نہ جانے کہاں سے انہوں نے چپو نکال لیے۔ ان کی مدد سے وہ بوٹ کو ایک خاص سمت میں لے جانے میں کامیاب ہو گئے۔

وہ کوئی ویران کھاڑی تھی۔ پہاڑی ٹیلوں کے درمیان۔ جس کے اندر داخل ہو کر بوٹ رک گئی۔ انہیں نیچے اترنے کا حکم ملا تو وہ سب پانی میں اتر کر چھپ چھپ کرتے خشکی پر آ گئے۔ دور افق پر پھیلتی سفید ہلکی روشنی میں زمین، پہاڑی اور سمندر نظر آنے لگا تھا۔ ''یہ کیوبا کا ساحل ہے۔ ہم ہوانا کے آس پاس ہیں۔ امریکا میں فلوریڈا کا ساحل یہاں سے آٹھ دس کلومیٹر سے زیادہ دور نہیں ہے آج کا دن ہم یہاں اسی جگہ گزاریں گے اور رات کے تیسرے پہر میں۔ اسی بوٹ کے ذریعے ہم آپ کو...... آپ کے خوابوں کی سرزمین امریکا لے جائیں گے...... ہیو آنائس ٹائم۔'' ہتھیار بردار سیاہ فام نے خوش دلی سے کہا تو وہ سب بیزاری لیے اِدھر اُدھر بیٹھنے کے لیے جگہ تلاش کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد انہیں برگر ٹائپ چیزیں کھانے کو دی گئیں اور ایک ایک پانی کی بوتل بھی۔

صبح کی روشنی نمودار ہونے کو تھی تب وہ بقول سیاہ فام کے اپنے خوابوں کی سرزمین امریکا کے ایک ویراں ساحل پر اتار دیے گئے۔ بوٹ اسی وقت واپسی کے لیے روانہ ہو گئی اور ان سب کے لیے بڑا سا سوال چھوڑ گئی کہ اب کہاں جائیں؟ پھر یہ ہوا کہ جس کا جدھر منہ اٹھا۔ وہ اس طرف چل پڑا۔

وہ دونوں بھی ساحل کی ریت پر چلتے ہوئے کافی دور آ گئے۔

''یار وہ کہاں آئے گا جس کے لیے ہمیں بتایا گیا تھا کہ ہمیں لینے کوئی آئے گا۔'' ابھرتے ہوئے سورج کی روشنی میں وہ ساحل پر آہستہ خرامی سے بڑھ رہے تھے۔ دور کوئی چھوٹی موٹی بندرگاہ تھی شاید۔ بہت سی کشتیاں اور اسٹیمر چھوٹے چھوٹے کھلونوں کے مانند نظر آرہے تھے۔ جیٹی پر کچھ جھنڈے بھی لہرا رہے تھے جبکہ آس پاس کچھ ویران ساحلی کاٹیجز تھے۔

''احسان! ہمارا حلیہ بہت ہی برا ہو رہا ہے۔ ایسا کرتے ہیں کسی کاٹیج میں چلتے ہیں۔ اگر کھلا مل گیا تو کچھ شاور وغیرہ ہی لے لیں گے کم از کم اپنے انسان ہونے کا یقین تو ہو جائے گا۔ ورنہ پچھلے ایک ڈیڑھ مہینے سے ہم جانوروں والی حالت میں ہیں۔ مجھے تو اپنے آپ سے گھن سی آنے لگی ہے۔''

احسان نے اثبات میں سر ہلایا۔ ان دونوں نے تاڑنے والی نظروں سے قریب ترین کاٹیج کو دیکھا اور اس کی جانب چل پڑے۔ اس کا سامنے والا دروازہ تو لاک تھا لیکن پچھلی جانب ایک کھڑکی سے انہیں اندر داخل ہونے کا موقع مل گیا۔ خوش قسمتی سے وہاں شاور کا بہترین بندوبست بھی مل گیا۔ وہ دل بھر کر نہائے۔ یہاں تک کہ چادریں لپیٹ کر اپنے کپڑے بھی دھو ڈالے۔ کافی دیر آرام کرنے کے بعد اب بھوک لگی تو بڑی تلاش کے بعد وہاں سربند آلو اور مچھلی کے دو ڈبے ملے جو انہوں نے اپنے حلق سے اتارے اور باہر نکل آئے۔

''وہ دیکھ...... وہ نیلی کار نہ جانے کب سے یہاں کھڑی ہے۔ کاٹیج کے بالکل سامنے۔ کہیں اس کا مالک ہی نہ ہو۔ اچھا ہوا جو ہم پچھلی جانب سے نکلے، ورنہ پکڑے جاتے...... اب بھاگ۔'' احسان نے علی کا ہاتھ پکڑ کر تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنا چاہا تو ٹھٹک کر رک گئے۔ گاڑی والے نے انجن کو ریس دی تھی اور اب وہ آہستہ آہستہ ان کی طرف آ رہی تھی۔

''اس کو نیلا رنگ کچھ زیادہ ہی پسند ہے شاید۔ کار نیلی، شرٹ اور کیپ نیلی، کار کے سیٹ کور نیلے...... ہر چیز......'' علی چپ ہو گیا کیونکہ کار ان کے نزدیک رک گئی تھی اور اب وہ ڈرائیور انہیں کار میں بیٹھنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کار کے دروازے کھول کر بیٹھ گئے۔ کار ساحل کے کچے حصے سے کچھ ہی دیر میں پختہ سڑک پر آ گئی۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں...... اور تم کون ہو؟'' علی نے سوال کیا تو اس نے ترچھی نظروں سے اس کی طرف دیکھا پھر گویا ہوا۔

''نام...... علی اور احسان...... غیر قانونی راستوں اور طریقوں سے آج صبح ہی امریکا میں داخل ہوئے ہو۔ اپنے ملک کی پولیس کو موسٹ وانٹڈ ہو۔ یعنی واپسی کی کوئی گنجائش نہیں۔ غیر قانونی طریقے سے یہاں داخل ہونے کے بعد...... یہاں کی پولیس کے لیے بھی وانٹڈ ہو...... اس لیے یہ سوال بیکار ہیں جو تم نے پوچھے ہیں۔'' اس نے ٹھنڈے لہجے میں جواب دیا۔

''کیا تمہارا تعلق پولیس سے ہے؟'' احسان نے پوچھا۔

''نہیں۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور کار میں صرف انجن کی ہلکی آواز آتی رہی اور وہ تن بہ تقدیر ہو کر درختوں کے دو رویہ سایوں میں بچھی طویل سڑک کو گزرتے دیکھتے رہے۔

شام ڈھل رہی تھی جب انہوں نے AIA سے ایگزٹ لیا اور لیک وامن روڈ پر آ گئے۔ شہر کی روشنیاں جل اٹھی تھیں جب وہ پام ایونیو کی پارکنگ میں رک گئے۔

اس اپارٹمنٹ کمپلیکس کی ساتویں منزل پر واقع وہ دو بیڈ کا مختصر اپارٹمنٹ ان کی منزل تھا۔ یہاں سے شہر کی دور تک جلتی ہوئی روشنیاں انہیں بالکل خوب صورت نہیں لگ رہی تھیں۔ کیونکہ بھوک اور تھکن نے انہیں نڈھال کر رکھا تھا۔

''یہاں تمہیں دو دن رکنا ہے۔ میں اس عرصے میں تمہارے کاغذات بنواتا ہوں تاکہ تم آگے سفر کر سکو۔ تمہاری منزل ابھی بہت دور ہے۔ فی الحال کھاؤ پیو، آرام کرو۔ فریج میں بہت کچھ موجود ہے لیکن ابھی میں جاتے ہوئے تمہارے لیے پیزا آرڈر کرتا جاؤں گا۔ فی الوقت مجھے تمہاری تصویریں لینی ہیں تاکہ کاغذات بن سکیں۔'' اس نے ان کی تصویریں لیں اور ہاتھ ہلاتا ہوا دروازہ کھول کر باہر نکلا اور پھر پلٹ کر فوراً ہی اندر منہ ڈال کر بولا۔

''ویسے بائی دا وے...... میرا نام اسحاق ہے اور لوگ مجھے آئزک کہہ کر بلاتے ہیں۔'' وہ دروازہ بند کر کے چلا گیا۔

جب سے انگریزی بول رہا تھا اور اب اردو میں اسحاق سے آئزک بول کر چلا گیا۔'' احسان نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے کہا۔

''اور ٹیبل پر پیسے اور فون بھی چھوڑ گیا ہے۔'' علی نے آنکھوں سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

ایملی! یہ ہمارا نیا ساتھی ہے۔ اس کو اس کی ذمے داریاں اچھی طرح سمجھا دو۔'' سامنے بیٹھے ہوئے بھاری بھرکم شخص نے جسے ایملی کہہ کر مخاطب کیا تھا، وہ ایک سرو قد گوری لڑکی تھی جس کے سنہرے بال اور سبز آنکھیں اس کی خوب صورتی میں اضافہ کر رہی تھیں۔ اس نے باس کا حکم سن کر بڑی ادا سے سر ہلایا اور علی کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

''لک مسٹر ایلی! یہ کرائم کی دنیا ہے اور باس جوناتھن اس دنیا کا خدا ہے۔ اپنی تمام تر طاقتوں اور اختیارات کے ساتھ۔ اس لیے سب سے پہلے تو تمہیں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرنا ہے کہ اس کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہ ہو۔ ورنہ سزاؤں کا معاملہ یہاں سخت اور فوری ہوتا ہے۔'' ایملی

نے سنجیدگی سے اپنی بات شروع کی۔
''لیکن...... میں اس کے حکم کا پابند کیوں ہوں...... میرا اس سے کیا تعلق ہے؟'' علی نے کچھ حیرت سے پوچھا۔
''کیا تم نہیں جانتے؟'' ایملی نے مزید حیرت کے ساتھ پوچھا تو علی نے نفی میں سر ہلا دیا۔
''اوہ! بات دراصل یہ ہے کہ جونی نے تم کو اچھی خاصی رقم دے کر خریدا ہے۔'' ایملی نے انکشاف کیا تو وہ حیرت سے اچھل پڑا۔
''خریدا ہے؟ کس سے خریدا ہے؟''
''تمہارے کچھ ہم وطن ہیں جو یہاں ایک سیاسی ریکٹ چلا رہے ہیں۔ انہوں نے تمہارے وطن میں تمہاری 'کارکردگی' کی کچھ ویڈیوز دکھا کر جونی کو آفر کی کہ وہ چاہے تو اسے اپنے لیے خرید سکتا ہے۔ ایک لاکھ ڈالر اور آئندہ ہر ماہ تمہارے کما کر دیے ہوئے پیسوں کا ففٹی پرسنٹ۔ جونی نے اس شرط پر کہ اگر تمہاری کارکردگی ان کی بتائی ہوئی تفصیل کے مطابق ثابت ہوئی تو ڈیل آگے چلے گی۔ ورنہ وہ تمہیں مار دے گا اور ان سے ایک لاکھ ڈالر واپس لے لے گا۔'' ایملی نے اس کی 'کارکردگی' پر زور دیتے ہوئے وضاحت کی تو وہ غصہ ضبط کرنے کی کوشش میں سرخ ہو گیا۔
''میں انسان ہوں، کوئی چیز نہیں ہوں جسے بیچا یا خریدا جا سکے۔'' وہ برافروختہ ہو کر بولا۔
''یہ محض آپ کا خیال ہے مسٹر ایلی! غلاموں کی خرید و فروخت صدیوں سے جاری ہے اور آج بھی یہ کاروبار ہو رہا ہے۔ ہر طاقتور کمزور کو اپنی مرضی کی قیمت پر آرام سے جب چاہے خرید سکتا ہے اور بیچ بھی سکتا ہے۔'' ایملی نے مدھم لہجے میں کہا تو وہ تاسف زدہ تھا۔
''نو و و و......!'' علی چلایا تو ایملی نے ہاتھ اٹھا کر اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔
''ریلیکس مسٹر ایلی! ریلیکس! یہ تلخ سہی...... مگر ہماری زندگی کی حقیقتیں ہیں۔ ہم ان سے نظریں چرا نہیں سکتے۔ آپ دیکھیں نا...... کس طرح آپ کے ملک میں آپ سے ایسے کام کروائے گئے کہ آپ ایک بڑے مجرم کی حیثیت اختیار کر گئے۔ اب آپ مکمل طور پر ان کے اشاروں پر چلنے پر مجبور ہو گئے پھر انہوں نے آپ کے خلاف سارے ثبوت جمع کر کے...... آپ کی واپسی کے سارے راستے بند کر دیے۔'' ایملی نے تفصیل بتائی تو وہ حیران ہوا۔
''یہ سب تمہیں کیسے معلوم ہوا؟''
''تمہارا کیا خیال ہے...... جونی تم کو اپنی تسلی کیے بغیر اتنے مہنگے داموں خرید سکتا تھا۔ اس نے مکمل معلومات کروائی ہیں۔ تمہاری زندگی کا کوئی پہلو اس سے پوشیدہ نہیں ہے۔ تمہاری شخصیت غیر معمولی ہے اور تمہاری 'کارکردگی' بھی۔ تمہارے اندر ایک ایسا اسپارک ہے جو ہر کسی میں نہیں ہوتا۔
''تمہارے لوگوں کو یہاں بہت سے پیسوں کی ضرورت رہتی ہے۔ وہ یہاں اپنی سیاسی پارٹی کا سیٹ اَپ مضبوط کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں لگا کہ اگر تم یہاں آ کر اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کرو...... تو شاید ان کی ضرورت پوری ہو سکتی ہے۔ بہت زیادہ پیسے ہمیشہ ناجائز ذرائع سے ہی حاصل ہوتے ہیں۔ تم اگر ان سے وابستہ رہتے ہوئے کسی غیر قانونی سرگرمی کے طفیل پکڑے جاتے تو یہاں ان کا ریکٹ بند ہو جانے کے پورے چانسز تھے۔ اس کے لیے انہوں نے تمہیں جونی کی چھتری میں دے دیا ہے۔ اب تم جونی کے آدمی ہو۔ اسی کے ہاتھ میں اب تمہاری موت اور زندگی ہے۔'' ایملی کی وضاحت وہ پورے ہوش و حواس میں سنتا رہا لیکن آہستہ آہستہ رخصت ہو رہے تھے اور غم و غصہ شعلہ بن کر اس سے لپٹ رہا تھا۔ ایملی نے اس کی کیفیت دیکھتے ہوئے پانی کا گلاس آگے بڑھا دیا۔
''ریلیکس مسٹر ایلی! تم پہلے آدمی نہیں ہو۔ یہاں آس پاس نظریں دوڑاؤ۔ یہاں آفس میں جتنے لوگ نظر آ رہے ہیں، سب تمہارے جیسے ہی ہیں۔ ان سب نے اپنی زندگی کے عوض حالات سے سمجھوتا کر لیا ہے کیونکہ ان کے پاس کوئی آپشن نہیں ہے۔''
''اور تم! تم بھی؟'' علی نے جلتی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے سوال کیا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا اور اس کی سبز آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔
''کیوں؟ تمہاری کیا مجبوری تھی؟''
''میرا بوائے فرینڈ...... اس نے ان لوگوں کے ہاتھوں مجھے بیچ دیا اور خود پیسے لے کر غائب ہو گیا۔ اب میں پچھلے تین سال سے جونی کی سیکریٹری کے طور پر کام کرتی ہوں اور تمہارے جیسے لوگوں کی کاؤنسلنگ میری خصوصی ذمے داری ہے۔ کیونکہ جونی کا خیال ہے کہ میرے نفسیات داں ہونے کا کچھ تو فائدہ ہو۔ میں اس کام کے لیے موزوں ہوں۔'' ایملی نے تلخ مسکراہٹ کے ساتھ بتایا۔
''تم بہت اچھی کاؤنسلنگ کرتی ہو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ میں ان کے چنگل سے نکل سکتا ہوں یا نہیں...... اگر نکل سکتا ہوں تو کس طرح؟'' علی نے ہلکی آواز میں پوچھا تو ایملی نے

ٹھنڈی سانس بھر کر اس کی طرف غور سے دیکھا۔
''ایسا کبھی سوچنا بھی مت...... اگر زندگی کی قدر و قیمت جانتے ہو تو اس خیال کو دل سے نکال دو۔ ان کے مضبوط شکنجوں میں ایک بار کوئی پھنس جائے تو رہائی صرف مر کر ہی مل سکتی ہے۔ اگر خدا پر یقین رکھتے ہو...... تو سمجھ لو...... اس نے تمہارے لیے ایسی ہی زندگی رکھی ہے۔ اس سے دعا کرو...... شاید آئندہ کے لیے وہی کچھ بدل دے۔ یہ انسان کے اختیار کی بات نہیں ہے۔ اس لیے جس پر اختیار ہی نہ ہو، اس پر جلنا کڑھنا سمجھداری نہیں ہے۔'' ایملی نے نہایت ٹھنڈے اور متوازن لہجے میں اسے سمجھایا اور ہولے سے اس کا ہاتھ تھپتھپایا تو علی نے اسے سر اٹھا کر دیکھا اور اثبات میں سر ہلایا۔

''میرا ایک اور ساتھی بھی تھا...... احسان...... وہ کہاں ہے؟''

''جونی نے صرف تمہیں خریدا ہے...... ہوسکتا ہے تمہارا وہ دوست اپنے ان سیاسی ہم وطنوں کے ساتھ ہی ہو۔''

''تو اب مجھے کیا کرنا ہے؟'' علی نے شکستہ لہجے میں پوچھا تو ایملی کے ہونٹوں پر ایک بے نام سی مسکراہٹ آ کر معدوم ہوگئی۔

''فی الحال تو تمہیں صرف گھومنا، پھرنا اور آرام کرنا ہے۔ میامی سے یہاں تک پانچ چھ گھنٹے کی فلائٹ تھکا دینے والی ہوتی ہے۔ فی الحال تم آرام کرو...... ایک گھنٹے بعد میری ڈیوٹی آف ہوگی تو میں تمہیں اپنے شہر ڈیٹرائٹ کی سیر کراؤں گی، اگر تم پسند کرو تو......''

''شیور! کیوں نہیں۔''

''یہاں ایک ریٹائرنگ روم ہے۔ چاہو تو وہاں آرام کرو۔ ورنہ اپنے اپارٹمنٹ جانا چاہو تو وہاں بھی جا سکتے ہو۔''

''مجھے نہیں معلوم کہ اپارٹمنٹ کہاں ہے اس لیے... فی الحال میں یہیں آرام کرنا چاہوں گا۔'' تو ایملی نے مسکراتے ہوئے دور ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا جس پر ریٹائرنگ روم کے الفاظ لکھے ہوئے تھے۔

☆☆☆

''اور میں؟ میں کیا کروں گا؟ کیا میری کوئی ضروریات نہیں ہیں؟ میں جو کچھ بھی کماؤں گا وہ سارا کا سارا اگر تم دونوں پارٹیوں میں بٹ جائے گا...... تو میرے ہاتھ کیا آئے گا؟'' اس کے دبے دبے لہجے میں غصے کا آتش فشاں بھڑک رہا تھا اور سامنے بیٹھے دو افراد اسے گھور رہے تھے۔

''تمہیں تمہاری ضروریات کے لیے پیسے مل جائیں گے...... ہم ہیں نہ...... تمہاری ہر ضرورت پوری کرنے کے لیے...... اس لیے تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' گہرے نیلے سوٹ میں ملبوس آدمی کی آنکھوں میں سرد مہری جھلک رہی تھی۔

''بہت خوب! جان پر کھیل کر میں جو کچھ حاصل کروں اس پر تمہارا اور اس خبیث جونی کا حق ہے اور میں بھک منگوں کی طرح اپنی ضروریات کے لیے تمہارے سامنے ہاتھ پھیلاتا رہوں...... تم نے سوچ بھی کیسے لیا کہ میں ایسا کرنے پر ہنسی خوشی راضی ہو جاؤں گا۔ نیور...... اب بہتر ہوگا کہ تم چاہو تو مجھے گولی مار دو...... ورنہ مجھے میرا جائز حق دینے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ بات اسی طرح آگے بڑھ سکتی ہے ورنہ آج اور ابھی...... یہ ڈیل یہیں ختم سمجھو۔'' اس نے سلگتے لہجے میں کہا۔

''تم جانتے ہو کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ ڈیل ختم نہیں ہو سکتی...... ہم تم پر کافی انویسٹمنٹ کر چکے ہیں۔ تم بتاؤ، تم کیا چاہتے ہو؟'' نیلے سوٹ والے نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔ وہ اس سیاسی پارٹی کا ایک جانا پہچانا چہرہ تھا اور اپنی پارٹی سیکریٹریٹ کے سیاہ و سفید کا مالک بھی۔

''تیسرا حصہ...... جو کچھ میں حاصل کروں گا۔ اس کا تیسرا حصہ میرا ہوگا۔ میری ذاتی ملکیت...... اس پر کسی کا... کوئی حق ہوگا نہ ہی سوال۔''

''یہ شاید ممکن نہ ہوسکے۔'' اس نے صاف جواب دیا اور پشت گاہ سے ٹیک لگا کر اسے بغور دیکھا۔

''اوکے! پھر میرا کام کرنا بھی ممکن نہ ہو سکے گا۔ میں جا رہا ہوں۔ اب اپنے آدمیوں سے کہو...... بے شک مجھے گولی مار دیں۔''

''یہ بھی شاید ممکن نہ ہو سکے...... بیٹھو...... اور میری بات سنو۔ تم نے جو کچھ کہا ہے میں اس کے بارے میں جونی سے بات کروں گا۔ تمہارا مطالبہ بھی اس کے سامنے رکھوں گا...... دیکھو...... وہ کیا کہتا ہے۔''

''تم جس سے چاہو بات کرو لیکن میں اپنی شرط سے پیچھے ہٹنے والا نہیں ہوں۔ میں تم لوگوں کے چکر میں اپنا سب کچھ کھو چکا ہوں۔ اب میرے پاس کھونے کے لیے اپنی جان کے سوا کچھ اور ہے نہیں۔ اور اس کی مجھے کچھ اتنی زیادہ پروا نہیں ہے۔''

اپنے ملک میں رہ کر علی جب زندگی کی جنگ لڑنے کی

کوشش کررہا تھا تو ہر طرف کی مایوسی نے آخر کار اسے اس دلدل میں اترنے پر مجبور کردیا جہاں وہ جانا نہیں چاہتا تھا لیکن سخت حالات اور مایوسی نے اسے مجبور کردیا تھا۔

وہ اپنی ذات میں ایک ایسا اسپارک رکھتا تھا جو ہر ایک کو متاثر کرتا تھا۔ اسے سب سے پہلے ایک استاد ذاکر علی کے حوالے کیا گیا جس نے اسے لڑنے بھڑنے کے طریقے سکھائے اور ہر طرح کے ہتھیار استعمال کرنے کا فن بھی سکھایا۔ کچھ مارشل آرٹ کے داؤ پیچ اور گھر جانے کے بعد اپنا دفاع کرنے کے طریقے بھی سکھا دیے۔

''لے بھئی! جو کام دوسرے مہینوں میں نہیں سیکھ پاتے تو نے وہ چند دنوں میں سیکھ لیے۔ میرا تو بس نام ہے۔ ورنہ اصل استاد تو ہے بچے!'' ذاکر نے آخر کار اسے اچھی طرح آزمانے کے بعد چھٹی دے دی۔ اب وہ ایک ٹرینڈ فائٹر تھا۔ حیرت انگیز صلاحیتوں کا ماہر۔ اب وہ پارٹی کے لیے کماؤ پوت تھا۔

پھر نہایت خاموشی سے اس کے بیرونِ ملک بھیجنے کے فیصلے ہوگئے...... کیونکہ بیرونِ ملک پارٹی کو فنڈز درکار تھے جو پہلے یہیں سے بھیجے جاتے تھے اب سختیوں کے سبب کچھ مشکلات پیش آرہی تھیں۔ لہٰذا فیصلہ یہ ہوا کہ فنڈز وہیں سے جنریٹ کرنے کے انتظامات کیے جانے ضروری ہوگئے ہیں۔ اسے معلوم ہوا تو اس نے اپنی فیملی کے سبب باہر جانے سے صاف انکار کردیا۔

پھر ایک دن کچھ ڈاکوؤں نے اس کے گھر پر دھاوا بولا۔ گھر والوں کو گن پوائنٹ پر ایک کمرے میں بٹھا کر پہلے قیمتی سامان لوٹا۔ اس کے بعد اس کے والدین، دو چھوٹے بھائیوں اور ایک بہن کو گولیاں مار کر چلے گئے۔ وہ نیم دیوانہ ہوگیا جن کی خاطر اس نے جرم کی اندھیری دنیا میں چھلانگ لگائی تھی۔ وہ یوں اس طرح اسے چھوڑ گئے کہ وہ دنیا میں بالکل اکیلا رہ گیا۔ اس نے کتنے ہی دن ماتم میں چپ چاپ پڑے پڑے گزار دیے۔ پارٹی کے لوگ اس کے پاس آتے، تسلیاں دیتے اور ان ڈاکوؤں کی تلاش اور شناخت کی کہانیاں سناتے۔ وہ پتھر بنا سب [illegible] رہتا۔

پھر فیصلہ ہوا کہ اب اسے باہر بھجوانا ہی پڑے گا

ایک دن اس کے ساتھیوں میں سے ہی [illegible] اس کے پاس آئے۔

''علی بھائی! علی بھائی! ان لوگوں [illegible] نے...... جنہوں نے آپ کے [illegible]

کو مارا تھا۔'' ایک نے ہیجان انگیز لہجے میں اطلاع دی تو اس نے سرخ آنکھیں اٹھا کر انہیں دیکھا۔ سوال اس کی آنکھوں میں تھا۔

''اس وقت وہ چائے کے ڈھابے پر ہیں۔ ہم ابھی ابھی دیکھ کر آئے ہیں۔''

''چلو!'' وہ فوراً اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ پستول اور اضافی میگزین اٹھایا اور ان دونوں کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر ڈھابے پر پہنچ گیا۔ لڑکے نے اشارے سے ان تین لڑکوں کے بارے میں بتایا جو وہاں بیٹھے ہوئے سگریٹیں پی رہے تھے۔ چائے کے کپ سامنے پڑے تھے اور وہ ٹیبل پر لوڈو پھیلائے کھیلنے میں مصروف تھے۔ علی بائیک کی سیٹ چھوڑ کر ان کی طرف بڑھا۔ پستول پر اپنی گرفت مضبوط کی اور ان تینوں کی کھوپڑیوں میں ایک ایک گولی اتار دی۔

ڈھابے پر فائرنگ سے بھگدڑ مچ گئی۔ لوگ افراتفری میں بھاگ کھڑے ہوئے۔ وہ انہیں جہنم رسید کر کے واپس پلٹا تو پولیس وین اور باہر کھڑے ہتھیار بند پولیس والوں کو دیکھ کر کچھ ہڑبڑایا اور اپنے لڑکوں کی تلاش میں نظریں دوڑائیں تو ایک پولیس والے نے اس کی نظروں کو بھانپ کر کہا۔

''بھاگ گئے وہ...... اب تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہوگا...... چلو۔'' انہوں نے آگے بڑھ کر اسے پکڑا اور کھینچتے ہوئے وین میں لے جا کر ڈال دیا۔

تھانے پہنچ کر ایس ایچ او کے سامنے حاضری ہوئی تو اس نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے بتا دیا کہ ان لڑکوں نے اس کے گھر میں گھس کر ڈکیتی کی اور میرے پورے خاندان کو بلاوجہ مار دیا۔ اس لیے انہیں مرنا پڑا۔

''تو تو... گیا بچو! سیدھا پھانسی گھاٹ پہنچے گا۔'' ایس ایچ او نے اسے گھورتے ہوئے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''جانتا ہوں، میرے خاندان کے قاتلوں کو تو پولیس نے ڈھونڈا نہیں [illegible] پھر مجھے ہی ڈھونڈنا پڑا...... اگر کوئی تمہارے [illegible] کرتا [illegible] تمہارے ماں باپ اور بہن [illegible] تو تم کیا کرتے؟ یہی نہ...... جو میں [illegible] جانے تو کوئی پروا نہیں۔'' اس نے [illegible] اور خاموش ہوگیا۔

[illegible] بھی تو...... اتنا شاندار جوان ہے [illegible] پڑ گیا؟''

[illegible] پولیس عدالت میں اسے پیش کرتی

ایک اندھیری رات میں استاد ذاکر پولیس اسٹیشن آئے اور ایس ایچ او سے نہ جانے کیا ڈیل کر کے واپس لے آئے۔ آتے آتے اس نے ایس ایچ او کا ایک حکم سنا۔

''اوئے! لاک اپ کے پاس دو چار گولیاں شولیاں چلاؤ...... تاکہ پتا چلے کہ اس مجرم کے ساتھیوں نے حملہ کر کے اسے لاک اپ سے آزاد کروایا اور لے کر بھاگ گئے، پولیس پارٹی ان کے پیچھے گئی ہے۔''

علی نے ساری بات سن کر ٹھنڈی سانس بھری۔ ''یہ کیا ہے ذاکر بھائی؟''

''تو اپنی پارٹی کا بندہ ہے۔ تجھے کیسے موت کے حوالے کر سکتے تھے جگر...... لے دے کے بات بنالی۔ اب جو طوفان اٹھے گا، اس سے بچنے کے لیے تجھے روپوش ہونا پڑے گا۔ جہاں میں لے جا رہا ہوں وہاں سے نکلنے کی کوشش بھی مت کرنا۔'' ذاکر نے اسے بتایا اور ایک خالی گھر میں چھوڑ کر چلا گیا۔ پھر کئی دن کے بعد ایک اندھیری رات میں اسے ایک گڈز ٹرک میں بٹھا کر گودی تک پہنچایا گیا۔ وہاں سے ہیلمٹ پہن کر وہ ساحل کے ایک ویران حصے تک لایا گیا پھر ایک موٹر بوٹ نے اسے ایک فشنگ ٹریلر پر پہنچا دیا۔ ایک سے دوسرے فشنگ ٹریلر پر منتقل ہوتا ہوا وہ اپنے ساتھی احسان کے ساتھ ایک طویل اور اذیت ناک سمندری سفر کے بعد آخر کار امریکا کی سرزمین پر پہنچا دیا گیا۔ اب وہ مکمل طور پر پارٹی کے رحم و کرم پر تھا جس کا مطالبہ تھا کہ اب وہ اسے ڈالر کما کر دے۔ کیونکہ اسے بلوایا ہی اسی لیے گیا تھا کہ وہ ان کے لیے ڈالر چھاپنے کی مشین بن جائے اور اسے بننا پڑا۔

☆☆☆

کمرے میں ہوانا کے سگار کی خوشبو دھوئیں کے ساتھ چکرا رہی تھی۔ اس کے سامنے ٹیبل پر ارغوانی مشروب کرسٹل کے گلاس میں موجود تھا جسے وہ عادتاً آہستہ آہستہ گھما رہا تھا۔

''تو تم خود بھی پیسا کمانا چاہتے ہو؟'' اس نے اپنی سرخ آنکھیں اٹھا کر سنجیدگی سے پوچھا۔

''ہم م م م...... میرا حق بنتا ہے۔ میری محنت کا صلہ کچھ نہ کچھ تو مجھے بھی ملنا ضروری ہے۔ کیونکہ جینے کے لیے صرف زندہ رہنا ہی ضروری نہیں ہے اور بھی کچھ نہ کچھ چاہیے ہوتا ہے۔'' اس نے بے خوفی سے اپنی بات اس خوفناک مافیا ڈان کے سامنے پیش کی کہ وہ چند لمحوں تو اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ شاید اندر ہی اندر سراہا بھی ہو لیکن اظہار نہیں کیا۔ کچھ سوچ کر سر ہلایا پھر گویا ہوا۔

''ٹھیک ہے، ہمارے ہاں کبھی ایسا ہوا نہیں لیکن پتا نہیں کیوں میں تمہیں یہ رعایت دینے کے بارے میں سوچ رہا ہوں کہ تم خود اپنے لیے بھی کچھ نہ کچھ کما کھالو۔ لیکن اس کی کچھ حدود ہوں گی اور کچھ شرائط...... تمہیں ان کی پابندی کرنا ہوگی۔ باقی بات تم ایملی سے سمجھ سکتے ہو۔''

اس نے بات ختم کر کے پشت گاہ سے ٹیک لگالی اور یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ میٹنگ ختم ہوگئی۔ وہ اٹھا اور سر کو تھوڑا خم کرتا ہوا آفس سے باہر نکل آیا۔ اب اسے ایملی کی تلاش تھی۔

''ہم م م م...... تم تو بڑے خوش قسمت ہو بھئی! باس نے آؤٹ آف وے جا کر تمہیں یہ رعایت دی ہے اور کوئی تمہارے جیسا خوش نصیب نہیں پایا جاتا ہے یہاں...... خیر، آؤ بیٹھو...... تفصیل میں بتاتی ہوں تمہیں...... دیکھو، ڈیٹرائٹ میں موجود سب سے بڑی انڈسٹری کاریں بنانے کی ہے۔ فورڈ کمپنی کا صرف مینوفیکچرنگ اسٹرکچر ہی نہیں ہے یہاں بلکہ گاڑیوں سے متعلق تقریباً تمام قسم کا بزنس بھی ہے۔ گاڑیوں کا ٹیکس، انشورنس، ان کی کوالٹی انشورنس کے معاملات، نئے نئے ماڈلز کی لانچنگ، پھر ان کی مارکیٹنگ۔ بڑے بڑے آٹو شوز ہوتے ہیں جن میں دنیا بھر سے شوقین لوگ آتے ہیں۔ ان شوز میں خاص ایڈیشن بھی رکھے جاتے ہیں جو صرف ایک دو ہی بنائے جاتے ہیں۔ منفرد گاڑیاں رکھنے کے شوقین یہاں آتے ہیں اور انہیں مہنگے داموں خرید کر لے جاتے ہیں۔ اس طرح موٹر سٹی پرائڈ یہاں کا سب سے بڑا آٹو شو ہوتا ہے۔ تم نے میرے ساتھ شہر کے بڑے حصے کی سیر کی تھی۔ اگر تم نے مشاہدہ کیا ہوگا تو دیکھ ہی لیا ہوگا کہ زیادہ تر انہی معاملات سے متعلق دفاتر ہیں یہاں...... ویسے بائی دا وے...... تمہارا بھی واسطہ رہا ہے ان معاملات سے؟'' ایملی نے اچانک ہی سوال کر دیا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''ہم م م م...... میں نے آٹو موبائل میں ڈپلوما لیا ہے' گاڑیوں سے واسطہ رہا ہے میرا۔''

''اوہ گڈ! پھر تو یہ دنیا تمہارے لیے نئی نہیں ہوگی۔'' ایملی مسکرائی۔

''تمہاری اس لمبی چوڑی تعارفی تقریر میں مجھے اب تک اپنے کام کی کوئی بات محسوس نہیں ہوئی پھر یہ سب بتانے کا مقصد؟''

''اوہ...... سوری...... شاید تم بور ہوگئے۔ خیر تمہارے

کام کی بات یہ ہے کہ تمہیں اسی بزنس سے متعلق پروپوزل دیا جارہا ہے۔ ریورواک روڈ کے قریب ہیورٹ پلازا میں ہمارا ایک آفس ہے۔ یہاں گاڑیوں کے ٹیکس، انشورنس اور رجسٹریشن وغیرہ سے متعلق کام ہوتا ہے ایک اور ایسا ہی آفس رینے مین سینٹر میں ہے جو بیلے آئل پارک کے سامنے ہے۔ قریب ہی وائن اسٹیٹ یونیورسٹی ہے۔ تم ان دونوں آفسز میں سے کوئی ایک اپنے لیے سلیکٹ کر سکتے ہو اور اسے چلا سکتے ہو۔ اس سے تم جو بھی کماؤ گے، وہ صرف تمہارا ہوگا۔''

''تو یہ جو میرا خون پینے والی جونکیں ہیں، کیا یہ مجھے ایسے ہی چھوڑ دیں گی۔ انہیں مجھ سے کچھ نہیں چاہیے ہوگا؟'' اس نے تلخی سے پوچھا تو وہ مسکرائی۔

''ایزی، ایزی مین...... ان دونوں پارٹیوں کو ہر ماہ تم سے ایک مخصوص رقم چاہیے ہوگی۔ جو تم ان کے بتائے ہوئے مواقع سے کما کر دو گے۔''

''اس سے مجھے کیا فائدہ؟ اگر کسی وجہ سے میں وہ رقم ان کے بتائے ہوئے ذرائع سے حاصل کر کے نہ دے سکا تو اپنی جیب سے دینی پڑے گی...... بلاوجہ دو دو محاذوں پر مجھے لڑانے کے لیے پھنسایا جارہا ہے۔''

''ایک باقاعدہ قانونی بزنس...... جس کی ایک فیس ویلیو ہے۔ وہ تمہارا اپنا ہوگا۔ اس کی ساری کمائی جائز اور قانونی ہوگی۔ تم ٹیکس پیئر اور ایک باعزت شہری کہلاؤ گے۔ تم پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکے گا۔ یہ تمہارا اتنا بڑا فائدہ ہے کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔''

ایملی کی بات سن کر اس نے سر ہلایا تو وہ مسکرائی۔

''چلو، میں تمہیں دونوں آفسز دکھا کر لاتی ہوں۔'' وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ پہلے رینے مین سینٹر گئے۔ سامنے بیلے آئل پارک تھا جو سردی کی وجہ سے ٹنڈ منڈ اور ویران نظر آرہا تھا۔ دوسری جانب یونیورسٹی کی طویل و عریض عمارات تھیں۔ کہیں کہیں لڑکے لڑکیاں ہلکے پھلکے بیگ اٹھائے چلتے پھرتے نظر آرہے تھے۔

پھر وہ ہیورٹ پلازا والے آفس میں گئے۔ اس کی بڑی سی کھڑکی کے شیشے کے اس پار نظر آنے والے ماحول کی خوب صورتی نے اس کی بصارت کو جکڑ لیا تھا۔ دور بہتا ہوا دریا اور اس میں آہستہ آہستہ ہلکورے لیتی چھوٹی کشتیاں۔ کنارے پر طویل پختہ راستہ...... جس کے کنارے کہیں کہیں لگی ہوئی بینچیں برف سے ڈھکی ویران پڑی تھیں۔ یہی ریورواک روڈ تھا۔ سفید پرندوں کے جھنڈ دریا کے اوپر اُڑتے پھر رہے تھے اور نیلے پانیوں کے اس پار ایک اور شہر کے آثار نظر آرہے تھے۔ دائیں جانب ایک بڑا طویل پل تھا جو دونوں شہروں بلکہ دونوں ملکوں کو جوڑ رہا تھا۔

''وہ سامنے نظر آنے والا شہر ونڈسر ہے۔ کینیڈا کا سرحدی شہر...... وہ نظر آنے والا پل دونوں ملکوں کو جوڑتا ہے۔ ایک ٹنل بھی ہے۔ کسی وقت ہم بھی کینیڈا گھوم آئیں گے...... جب تم یہاں کے شہری ہو جاؤ گے۔'' ایملی نے اس کی دلچسپی دیکھتے ہوئے تفصیل بتائی تو وہ باہر کے مناظر میں کھویا ہوا تھا۔

''آزادی کا کتنا خوب صورت احساس نظر آرہا ہے نا اس ماحول میں...... ہر چیز نرم روی سے، اپنی اپنی مرضی سے محو سفر ہے۔ پرندے، دریا کا پانی، اس پر تیرتی کشتیاں...... یہ سب کس قدر سکون دینے والا ہے...... کیا مجھے یہ آفس مل سکتا ہے ایملی؟'' اس نے یکلخت سوال کیا۔

''آف کورس، یہ تمہارے لیے ہی ہے۔ جب چاہو تم یہاں کام شروع کر سکتے ہو۔''

''میرا آفس علیز کنسلٹنٹ کے نام سے شروع ہوگا۔

☆☆☆

وہ اکاؤنٹنٹ کے ساتھ مل کر اپنے ٹیکس ریٹرنز کے کاغذات کا جائزہ لے رہا تھا کہ احسان کی آمد ہوئی۔ اس نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور جلدی جلدی اپنا کام ختم کر کے اکاؤنٹنٹ کو فارغ کیا اور اسے اپنے پاس بلالیا۔

''ہاں بھئی! آج کیسے آنا ہوا...... ویسے تو مجھے معلوم ہے کہ تم ہمیشہ کسی منحوس خبر کے ساتھ ہی آتے ہو لیکن پتا نہیں کیوں...... جھوٹی امید کے سہارے پوچھ لیتا ہوں کہ شاید آج تم کوئی اچھی خبر لائے ہو...... ہاں کہو......'' اس نے ٹیبل کے دوسری جانب احسان کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

''سچ کہا تو نے...... منحوس خبروں کے ساتھ آتا ہوں۔ آج بھی اسی لیے آیا ہوں۔ پہلے تو ٹاسک کے بارے میں بتادوں۔ بندرگاہ کے علاقے میں جو پب ہیں، ان میں سب سے بڑا اوشین بار ہے۔ آج سے لے کر تین دن تک وہاں بہت بڑی رقم ہوگی۔ کیونکہ اوشین بار کے مالک جوشوا نے علاقے کے سارے بھتا جمع کرنے والوں کو اپنا مال جمع کروانے کو کہا ہے۔ اسے ایک بہت بڑی رقم ان لوگوں کو دینی ہے جو دو تین دن میں ڈرگز کی ایک بہت بڑی مقدار لانچ کے ذریعے لانے والے ہیں۔ تو تمہیں یہی رقم اُڑانی ہے۔''

''لیکن بندرگاہ کا علاقہ تو بروس کا ہے اور بروس میلکم

''کیسی ہو ایملی! ہم کافی دن بعد مل رہے ہیں۔ آج بھی تم یقیناً اس آدم خور جونی کی طرف سے کوئی نیا ٹاسک لے کر آئی ہوگی، بیٹھو۔''

''ارے نہیں، میں تو یہ بتانے آئی ہوں کہ تمہارے تمام ضروری کاغذات بن گئے ہیں۔ اب تم یہاں کے ایک معزز شہری ہو۔ جہاں چاہو جا سکتے ہو، گھوم پھر سکتے ہو، آزادی سے...... یہ خوشی کی خبر نہیں ہے کیا؟'' ایملی نے مسکراتے ہوئے پوچھا تو وہ بھی مسکرا دیا۔

''بہت خوشی کی خبر ہے۔''

''اچھا تو میرے پاس ایک منصوبہ ہے۔ دیکھو، یہ لانگ ویک اینڈ ہے۔ پیر کو بھی چھٹی ہے اگر ہم آج وہ دور نظر آنے والا پل پار کر کے کینیڈا کی سیر کر کے آئیں...... تو کیسا رہے گا؟''

علی کو اس کے بتائے ہوئے پروگرام سے زیادہ اس کے چہرے پر پھیلے خوشی کے تاثر نے متاثر کیا۔ لگتا تھا کہ وہ طویل عرصے سے کہیں باہر نہیں گئی ہے اور اب شدید خواہش مند ہے کہ وہ اس کے ساتھ دو دن گھومے پھرے...... سو اس نے اسے یہ خوشی دینے کا فیصلہ کیا۔

''او کے، میں تیار ہوں، بتاؤ! کیا کرنا ہے؟''

''کچھ خاص نہیں، ان کاغذات میں تمہارا بلیو پاسپورٹ ہے۔ اپنا سوشل سیکیورٹی کارڈ، ڈرائیونگ لائسنس اور اے ٹی ایم کارڈ رکھ لو۔ کریڈٹ کارڈ تو ہوگا ہی...... شام کو نکلتے ہیں...... ایک گھنٹے میں ونڈسر پہنچ جائیں گے۔ گھومیں گے پھریں گے...... فل تفریح کریں گے۔''

''او کے، ٹھیک پانچ بجے میں اپنی گاڑی میں تمہیں تیار ملوں گا۔'' وہ ہلکے سے مسکرایا۔

''اوور...... ہاؤ سویٹ۔'' ایملی ایک ہوائی بوسہ اچھالتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ دروازے تک پہنچ کر واپس مڑی۔ انگلیوں سے پانچ کا اشارہ کرتی اور مسکراہٹیں بکھیرتی باہر نکل گئی۔

☆☆☆

وہ ایک گھنٹے کا سفر بہت خوب صورت تھا۔ ایک چیک پوسٹ پر ان کے کاغذات چیک ہوئے اور وہ پل پر چڑھ گئے۔ درمیان میں عجیب منظر تھا۔ دونوں جانب دریا کا نیلا شفاف پانی آہستہ روی سے بہہ رہا تھا۔ جارج واشنگٹن پل کمان کی طرح جن دو شہروں کو جوڑ رہا تھا، وہ ڈیٹرائٹ اور ونڈسر تھے۔ دونوں جانب ڈاؤن ٹاؤن کی بلند و بالا عمارتیں تھیں۔ جو اب روشنیاں جل اٹھنے کے سبب جھلملاتی

ہولی میسا ہی طاقتور ڈان ہے۔ یہ کام تو بہت مشکل ہوگا۔'' علی نے آہستہ سے کہا۔

''تجھے مشکل کام ہی دیے جاتے ہیں میری جان! آسان کاموں کے لیے تو اور بہت ہیں...... میرے جیسے۔'' احسان نے مسکرا کر کہا تو علی سوچ میں ڈوب گیا۔

''ہم م م م...... ٹھیک ہے...... دیکھتا ہوں۔''

''ایک اور خبر ہے...... جو تجھے بتانے کے لیے مجھ سے کہا نہیں گیا لیکن جیسا بھی ہوں، تیرا دوست تو ہوں ناں...... اس لیے مجھے لگا کہ تجھے خبردار کرنا ضروری ہے۔''

''اتنا سسپنس پیدا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟'' علی نے اسے گھورا تو وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

''تیرے لیے کوئی بڑا سسپنس نہ ہو جائے اسی لیے بتا رہا ہوں۔ خبر یہ ہے کہ ملک میں حالات بدل گئے ہیں۔ ہماری والی پارٹی آج کل زیرِ عتاب آگئی ہے اس لیے اس پر دباؤ ڈالنے کے لیے بڑے بڑے لیڈر ٹائپ اور سرکردہ لوگوں پر بُرا وقت آیا ہوا ہے۔ کچھ پکڑ لیے گئے ہیں، کچھ غائب کر دیے گئے ہیں اور کچھ پر خطرناک قسم کی چارج فیٹس ہو گئی ہیں۔ بدقسمتی سے ان میں ایک نام تیرا بھی ہے۔ تجھے وہاں موسٹ وانٹڈ ڈکلیئر کر دیا گیا ہے۔'' احسان نے تفصیل بتائی تو وہ چپ چاپ سنتا رہا۔

''سو واٹ؟ میں وہاں کتنا بھی موسٹ وانٹڈ کیوں نہ ہو جاؤں۔ ان کی گرفت میں تو نہیں آسکتا۔ یہاں ہزاروں میل دور وہ میرا کیا بگاڑ لیں گے؟'' اس کے لہجے میں اعتماد تھا۔

''اللہ کرے کہ ایسا ہی ہو...... مگر مسئلہ یہ ہے کہ ہماری پولیس نے تجھے بہت ہائی پروفائل مجرم ڈکلیئر کر کے...... شاید یہاں کی پولیس کو اپروچ کیا ہے۔ شاید تجھے ان کے حوالے کرنے کی استدعا کی ہے۔'' احسان کا لہجہ بجھا بجھا تھا۔

''اور یہاں کی پولیس نے ان کی استدعا مان لی؟''

''یہ مجھے نہیں معلوم۔ بہرحال جتنا مجھے معلوم تھا، وہ تجھے بتا دیا تاکہ تو بے خبری میں نہ مارا جائے۔ اس طرف سے بھی ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے سو! بی کیئر فل۔'' احسان نے اٹھتے ہوئے کہا اور آفس سے باہر نکل گیا۔ شیشے کے دروازے کے اس پار علی اس کو پُرخیال انداز میں جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ اتنے میں بیرونی دروازے سے ایملی کی آمد ہوئی۔

''ہائے علی!'' اس نے آتے ہی گرم جوشی سے ہاتھ ہلایا۔

محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے کہ سامنے سب سے نمایاں نظر آنے والی بلڈنگ کی طرف ایملی نے اشارہ کر کے بتایا۔

''وہ دیکھو ایلی! وہ سیزر زونڈسر کیسینو ہے اور یہ صرف کیسینو ہی نہیں ہے۔ یہاں بڑے بڑے اور شاندار پروگرامز بھی ہوتے ہیں۔ میں نے ایک دفعہ یہاں میڈونا کا کنسرٹ بھی دیکھا تھا۔ ہم ڈنر کے بعد سب سے پہلے یہیں چلیں گے، اوکے۔''

''اوکے۔'' علی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کی خوشی کو محسوس کر رہا تھا۔

ابھی وہ ریور واک روڈ پر آئے ہی تھے کہ سیزرز کے سامنے سے گزرتے ہوئے ایملی نے خوشی سے ہلکی سی چیخ ماری۔

''وہ دیکھو، کل کا پروگرام بلڈنگ ہیڈ پر ہو رہا ہے۔ کل یہاں 'یَنی' کا پروگرام ہے۔ یو نو یَنی؟ امیزنگ، امیزنگ......موسیقار ہے وہ......اس کی کمپوزیشنز غضب کی ہوتی ہیں۔ کل ہم اس کا پروگرام دیکھنے یہاں آ رہے ہیں نا؟'' اس نے سوال کیا تو علی نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔

''اوکے، لیکن ابھی ہمیں کہاں جانا ہے؟ ابھی تو ہم اس ایمبیسڈر برج پر ہی کھڑے ہیں۔''

''ایسا کرو، یہاں سے سیدھا نکلو......وہاں ہائی وے فوراَ اوون پر ہالیڈے اِن ہے۔ ہم وہاں روم بک کرواتے ہیں۔ سامان کے بیگ وہاں چھوڑ کر...... پھر گھومنے نکلتے ہیں۔''

وہ وہاں سے یہ سارے کام کر کے دوبارہ باہر نکلے تو ہائی وے فوراَ اوون پر آگے پیچھے بڑے بڑے ٹریلرز رواں دواں نظر آئے۔ جن پر دس دس بارہ بارہ گاڑیاں لدی ہوئی تھیں اور یہ سلسلہ مسلسل جاری تھا۔

''بس یہاں سے سیدھے ہاتھ کو لے کر میرون چرچ روڈ پر چلو......آدھا شہر تو دیکھ ہی لیں گے۔''

پھر وہ گھومتے رہے۔ ایک لبنانی ریسٹورنٹ میں ڈنر کیا اور پھر دریا کنارے پہنچ گئے۔ جب تک سردی برداشت ہوئی، وہ وہاں ٹہلتے رہے اور جب موٹی جیکٹوں کے باوجود ٹھنڈ نے یخ بستہ کرنا شروع کیا تو واپسی ہوگئی۔ ٹم ہارٹن سے گرما گرم فرنچ ونیلا کافی پی کر واپس ہوٹل آ گئے۔

اگلے دن بھی شہر میں گھومتے رہے۔ پارک اور جنگل کا محفوظ حصہ جس میں ایک چھوٹی سی جھیل تھی، گزرگاہ کے طور پر بنا ہوا لکڑی کا بہت پرانا کمان دار پل، پھر ایک محفوظ شدہ گاؤں جہاں پودے اور بھنورا اپنے قدرتی ماحول میں رکھے گئے تھے۔ سب کچھ بہت اچھا تھا۔

وہ لنچ کرنے ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں چلے گئے۔ کھڑکی کے نزدیک ٹیبل پر بیٹھے وہ کھانے پینے میں مشغول تھے۔ سامنے سڑک کے اس پار ڈلن ہال یونیورسٹی آف ونڈسر کی عمارتیں پھیلی ہوئی تھیں اور ریسٹورنٹ میں لنچ کے لیے آنے والے زیادہ تر طالب علم تھے۔ کھڑکی کے باہر بھی ہر طرف طلبہ ہی گھومتے پھرتے نظر آ رہے تھے جو اپنے اپنے بیک پیک کے ساتھ گروپوں میں گھوم پھر رہے تھے۔

وہ چونک پڑا۔ نوالہ اس کے ہاتھ میں ہی رہ گیا اور پلکیں جھپکائے بغیر وہ سامنے سے آنے والے ایک گروپ کو گھور رہا تھا۔ جس میں ایک لڑکی اور دو لڑکے تھے۔ شوخ گلابی رنگ کی جیکٹ پہنے وہ، وہی تھی۔ جسے وہ لاکھوں میں بھی دور سے پہچان سکتا تھا۔ وہ اسے پوری آنکھیں کھولے دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں سے باتیں کرتی ہوئی اسی جانب آ رہی تھی۔ آخرکار وہ لوگ ریسٹورنٹ میں داخل ہو گئے اور قریب ہی واقع ایک ٹیبل پر بیٹھ گئے۔ اس کی ساری توجہ اسی کی جانب تھی۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ کوئی پروجیکٹ ڈسکس کر رہی تھی۔ وہ سالوں اور میلوں پر مشتمل فاصلوں کو بھول کر یونیورسٹی کے دور میں پہنچ گیا تھا۔ جہاں اس کے دوستوں کا بھی ایک گروپ تھا۔ اسے سب یاد آئے۔ ثاقب، حسیب، سعدی، رمشہ اور یہ......رانیہ۔

رانیہ کی سب سے اچھی دوستی اسی کے ساتھ تھی۔ بڑے بزنس مین کی اکلوتی اولاد ہونے کے باوجود اس کے دماغ میں کوئی خناس نہیں تھا اس لیے سب سے دوستی تھی۔ اس کی خوب صورتی، رکھ رکھاؤ اور سادہ دلی نے علی کے دل کو اس کا اسیر کر دیا تھا لیکن کبھی اس کے اظہار کا موقع نہیں آیا تھا اور اس سے پہلے کہ اس کا موقع آتا، اس کے حالات اس قدر بگڑے کہ اسے یونیورسٹی تو کیا، اس ملک کو بھی چھوڑنا پڑا۔ سارے دوستوں کے ساتھ ساتھ رانیہ سے بھی پھر کبھی کوئی رابطہ نہیں ہوا۔

آج کئی سالوں کے بعد اجنبی ملک کے اجنبی شہر میں اس طرح اسے اچانک سامنے پا کر اس کے دل کی دھڑکنیں بے تاب ہونے لگیں۔ صبر نہیں ہوا تو وہ ایملی کو ایکسکیوزمی کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور اس کی ٹیبل پر پہنچ گیا۔

''اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو تم رانیہ ہو۔'' وہ بولا تو اس نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا، مسکرائی۔

''علی! تم اور یہاں؟ کب آئے؟'' اس کی مسکراتی سیاہ آنکھوں میں گزرے وقت کا احساس ہلکورے لے رہا تھا۔

''یہاں تو میں کل آیا ہوں۔ رہتا ڈیٹرائٹ میں ہوں۔ یہاں تو صرف گھومنے آیا ہوں لیکن لگ رہا ہے قدرت مہربان ہے اسی لیے تم سے ملاقات ہوگئی۔'' وہ بھی مسکرایا۔

''اس میں قدرت کی مہربانی کا ذکر کیوں کررہے ہو؟''

''بھئی! دیارِ غیر میں، اجنبیوں کے درمیان...... کسی اپنے...... بلکہ بہت اپنے سے ملاقات ہونا...... قدرت کی بہت بڑی مہربانی ہوتی ہے۔ میں وہاں بیٹھا ہوں، آؤ لنچ ہمارے ساتھ کرو۔''

''ہمارے ساتھ؟ کوئی اور بھی ہے؟''

''ہاں، میرے آفس کی کولیگ ہے...... آؤ۔'' علی نے اصرار کیا تو وہ اپنے دوستوں سے معذرت کرتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی، وہ اس کے لیے بھی لنچ لے آیا تھا۔ لنچ کے بعد ایملی معذرت کرکے اٹھ گئی۔ اسے سگریٹ پینا تھی اس لیے باہر چلی گئی۔

''یہاں کب سے ہو؟ پرانے دوستوں میں سے کسی سے رابطے میں ہو یا نہیں، کیا کررہی ہو؟'' اس نے بے صبری سے سوال کیے تو وہ ہنس پڑی۔

''آرام سے...... آرام سے...... ایک سانس میں اتنے سارے سوال...... میں ترتیب سے جواب دیتی ہوں۔ دو سال سے یہاں ہوں۔ بزنس مینجمنٹ میں ماسٹرز کررہی ہوں۔ اپنے ملک میں میرے حالات ایسے ہوگئے تھے کہ میں کسی سے بھی رابطہ نہیں رکھ پائی۔ اس لیے نہیں جانتی کہ کون کہاں ہے۔ البتہ اتنا ضرور پتا ہے کہ ہمارے گروپ کے رمشہ اور حسیب نے ایک طوفانی عشق کے بعد شادی کرلی تھی اور وہ لوگ لندن شفٹ ہوگئے تھے۔ باقی کسی کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔''

''تمہارے حالات کو کیا ہوا تھا؟'' علی نے پوچھا تو وہ سر جھکا کر ایک لمحے کے لیے خاموش ہوگئی۔ شاید کوئی جذباتی تغیر رونما ہوا تھا۔

''تمہیں معلوم ہے، پاپا کا بہت بڑا بزنس تھا۔ کنسٹرکشن کا...... میں ان کی اکلوتی اولاد تھی۔ ان کی خواہش تھی کہ تعلیم مکمل کرکے ان کا بزنس جوائن کروں۔ میرا بھی یہی ارادہ تھا۔ اسی لیے میں نے سول انجینئرنگ پڑھی تھی۔

''پاپا کے بڑے بھائی تھے۔ وہ کچھ لالچی اور حاسد قسم کے انسان تھے۔ ان کی نظریں پاپا کی دولت پر تھیں اور اسے حاصل کرنے کا طریقہ جو انہیں آسان لگا۔ وہ یہ تھا کہ میری شادی ان کے نالائق، بدکردار اور غنڈا ٹائپ بیٹے سے ہوجائے۔ پاپا نے انہیں صاف انکار کردیا تھا جس پر وہ دونوں باپ بیٹا بہت سیخ پا ہوگئے۔

''ایک دن آفس سے واپسی پر پاپا کی کار پر نامعلوم افراد نے فائرنگ کی۔ پاپا بچ تو گئے لیکن سمجھ گئے کہ اب وہ لوگ اس حد تک دشمنی پر اتر آئے ہیں۔ کچھ بھی کرسکتے ہیں۔ انہوں نے خاموشی سے ایک بہت بڑی رقم میرے نام سے فکس ڈپازٹ میں رکھی اور مجھے بھی خاموشی سے یہاں بھیج دیا۔ یہاں پاپا کے ایک دوست رہتے تھے، انہوں نے میری ذمّے داری قبول کی۔ انہوں نے ہی یونیورسٹی میں ایڈمیشن کروایا۔ اب میں ڈورم میں ہی رہتی ہوں۔ پڑھتی ہوں۔ وہاں پاپا اور ممی ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں مارے گئے اور گھر اور بزنس پر میرے تایا اور ان کے بیٹے کا قبضہ ہوگیا۔ وہاں میرے لیے اب کچھ نہیں رہا۔'' وہ خاموش ہوگئی۔ شاید گلے میں آنسوؤں نے پھندا ڈال دیا تھا۔

''مجھے بہت افسوس ہوا سن کر۔'' علی نے اسے تسلی دی تو اس نے اپنے آپ پر قابو پایا۔

''تم سناؤ۔'' رانیہ نے پوچھا۔

''کیا سناؤں؟ تمہاری میری ایک ہی کہانی ہے۔ تباہی اور بربادی کی داستان...... لیکن اچھی بات ہے کہ ہم اس سے گزر آئے ہیں۔ اب اس نئی سرزمین پر نئی زندگی ہے اس لیے جو گزر گیا اسے بھول کر...... آج لمحۂ موجود کو جیتے ہیں، لنچ کرو۔'' وہ مسکرایا تو وہ بھی ہنسی۔ ماحول ہلکا پھلکا ہوا تو اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ ایملی بھی آگئی تھی۔ اس نے رانیہ کو سیزنو میں ''یِنی'' کے پروگرام کے لیے بھی انوائٹ کرلیا۔ انہوں نے رات وہ پروگرام مل کر دیکھا اور بہت انجوائے بھی کیا۔ پورے کیسینو میں گھوم پھر کر اسے دیکھتے رہے۔ ڈنر کے بعد انہوں نے رانیہ کو یونیورسٹی چھوڑا اور اگلے دن ڈیٹرائٹ واپسی ہوگئی۔

''تمہاری دوست بہت اچھی ہے، مجھے بہت پسند آئی۔'' ایملی نے جاتے جاتے تبصرہ کیا تو اس نے آہستگی سے سر ہلانے پر اکتفا کیا اور اپنے اپارٹمنٹ کی طرف چلا گیا۔

☆☆☆

''ہے جوزی! بروس نے ٹھیک دس بجے نکلنے کا حکم دیا

ہے۔ تیاری کرلو اور اس کاہل الوجود موبی کو چابی بھر کر تیار کرو۔ گاڑی اسی کو چلانا ہے۔‘‘ لونگو نے جوزف عرف جوزی کو حکم سنایا۔

پانچ ملین ڈالرز کی وہ رقم ایک موٹے کینوس کے بیگ میں بھری ہوئی تھی۔ انہیں وہ بیگ لے کر ساحل کے ایک ویران حصے تک جانا تھا جہاں ٹھیک گیارہ بجے ایک چھوٹی بوٹ کو آنا تھا۔ انہیں رقم والا بیگ انہیں دے کر ایک دوسرا بیگ ان سے وصول کرنا تھا اور واپس آنا تھا۔ یہ ساری کارروائی انتہائی خفیہ رکھی گئی تھی۔ متعلقہ لوگوں کے علاوہ کسی کو اس کی بھنک تک نہیں پڑنے دی گئی تھی۔

مقررہ وقت پر وہ چاروں باہر نکلے تو شدید سردی اور برف باری نے انہیں دوڑ کر کار تک جانے پر مجبور کر دیا۔

’’ہائے موبی! ہیٹر اور تیز کر دو۔ بڑی خطرناک سردی ہے یار!‘‘ لونگو نے ہاتھ رگڑتے ہوئے فرمائش کی۔

’’گیس میں نے اپنی جیب سے ڈلوائی ہے۔ آرام سے بیٹھو، ہیٹر اس سے زیادہ تیز نہیں ہوسکتا۔‘‘ موبی نے بے رخی سے کہہ کر کار اسٹارٹ کی اور آگے بڑھا دی۔ لونگو زیرِ لب دو چار گالیاں سنا کر خاموش ہو گیا۔ کار کے ونڈ اسکرین پر وائپر تیزی سے حرکت کر رہے تھے کیونکہ مسلسل گرنے والی برف اسے بار بار دھندلا رہی تھی۔ اب وہ ساحل پر آ گئے تھے جو دور دور تک ویران نظر آرہا تھا۔ اندر وہ سب حسبِ عادت بلند آواز میں باتیں کر رہے تھے جن میں گالیوں کی بھی خاصی تعداد تھی۔ کبھی کوئی زور سے قہقہہ مار کر ہنستا تو باقی بھی اس کی آواز میں آواز ملاتے۔ پھر ان کا یہ شور و غل یکلخت خاموش ہو گیا۔

’’کیا ہوا موبی؟‘‘ ایک ہلکے سے دھماکے کی آواز آئی اور گاڑی رک گئی۔

’’لگتا ہے ٹائر پھٹ گیا ہے؟‘‘ موبی نے جواب دیا تو ان چاروں سے اسے بے حد و حساب گالیاں پڑنا شروع ہو گئیں۔

’’تجھے پہلے کہا تھا کہ گاڑی کو چیک کر لینا لیکن تو نے......‘‘ پھر گالیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تو موبی نے ہی مشورہ دیا۔

’’یہاں گاڑی میں بیٹھ کر گالیاں بکنے کے بجائے تم چاروں نیچے اترو اور پیدل وہاں پہنچ جاؤ۔ جہاں تمہیں جانا ہے۔ وہ زیادہ دور نہیں ہے۔ میں گاڑی کا ٹائر تبدیل کرتا ہوں۔‘‘ وہ چاروں بکتے جھکتے نیچے اتر گئے اور برف کے ڈھیر پر چلتے ہوئے ویران ساحل کے اس مخصوص حصے کی طرف بڑھنے لگے۔ وہ بھاری بیگ اٹھانا ان کے لیے اور مصیبت بن گیا تھا۔ وہ گالیاں بکتے چلے جارہے تھے کہ اچانک آگے جانے والے جوزی کو لگا کہ اس کے کان کے پاس کسی کیڑے نے کاٹ لیا ہے۔ اس نے گالی بک کر اس کیڑے کو ہٹانا چاہا تو گنگ ہو کر رہ گیا۔ اسے لگا کہ اس کا سارا جسم پتھر کا ہو گیا ہے۔ وہ اپنے جسم کو حرکت دینے سے قاصر ہو گیا تھا اور اس کے ہاتھ سے وہ بھاری بیگ بھی گر گیا جسے اس نے اٹھایا ہوا تھا۔ اب نہ وہ کچھ بول سکتا تھا اور نہ ہی حرکت کر سکتا تھا۔ اس کے باقی ساتھیوں کا بھی یہی حال ہوا تھا۔ پھر نزدیکی درختوں کے جھنڈ سے ایک سیاہ ہیولا برآمد ہوا۔ وہ اطمینان سے چلتا ہوا آیا۔ زمین پر گرا ہوا بیگ اٹھا کر اپنے کاندھے پر ڈالا اور واپس اسی طرف چلا گیا جہاں کچھ دور سڑک کے آثار نظر آرہے تھے۔

ان سب نے اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھا، وہ ایک لمبا تڑنگا سیاہ فام شخص تھا۔ چہرے سے ایسا ہی لگا۔ وہ بھی بھاری جیکٹ کے ہڈ سے تھوڑا سا ہی نظر آرہا تھا۔ وہ تیزی سے قدم بڑھاتا ہوا سڑک پر آگے چلا جارہا تھا اور وہ بے بسی سے اسے جاتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ کیونکہ ان چاروں کو ایک ہی کیڑے نے کاٹ کر بے بس کر دیا تھا اور وہ یقیناً کیڑا نہیں بلکہ اس شخص کی طرف سے چلائی گئی کسی ڈارٹ گن کی کارستانی تھی جس کی سوئیوں نے انہیں بے حس و بے حرکت کر دیا تھا۔ ذہن کام کر رہا تھا لیکن ہاتھ پاؤں ان کے قابو میں نہیں تھے۔

وہ سڑک پر چلتا چلا گیا یہاں تک کہ دور ایک ہیولا ایک سیاہ نقطہ بن کر نظر آیا پھر غائب ہو گیا۔ کچھ ہی دیر میں ان کے جسموں کی بے حسی ٹوٹنا شروع ہوئی۔ ان کے ہاتھ پاؤں کی حرکت بحال ہوئی۔ زبان چلی تو وہ اس سانحے پر چلّا چلّا کر بات کر رہے تھے۔

’’او خبیث جوزی! بیگ وہ ڈاکو چھین کر لے گیا۔ اب کیا کریں۔ باس ہم چاروں کو گولی ماردے گا۔‘‘

’’ہاتھ پاؤں کو جلدی جلدی حرکت دو۔ تاکہ ہم دوڑنے کے قابل ہو جائیں۔ اس کے پیچھے جاتے ہیں۔ وہ پیدل گیا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی کار تک پہنچے...... ہم اس تک پہنچ جائیں گے۔ جلدی کرو...... ہری اپ۔‘‘

پھر ان سب نے ایسا ہی کیا۔ تیزی سے ہاتھ پاؤں ہلا کر...... اور اچھل کود کر کے انہوں نے اپنے جسموں کی حرکت کو بحال کیا اور بکتے جھکتے اس کے پیچھے دوڑ پڑے۔ راستے میں درختوں کے ایک جھنڈ میں انہیں ایک کار نظر

آلی۔ انہوں نے اسے دیکھتے ہی اندازہ کرلیا۔
''ہماری طرح اس خبیث کی کار بھی دھوکا دے گئی۔ اسی لیے وہ پیدل بھاگا ہے۔ جلدی دوڑو۔ ہم پکڑلیں گے اس کو۔ وہ بیگ نہ ملا تو باس ہم سب کی کھال اتار دے گا۔ زندہ رہنا ہے تو دوڑو۔''
وہ سب حتی الامکان تیزی سے اس کے نقشِ قدم دیکھتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ جو نرم بھربھری برف میں ویسے تو کافی نمایاں تھے لیکن مسلسل گرنے والی برف انہیں مدھم بھی کررہی تھی پھر یک دم سب کچھ بگڑ گیا۔ ایک بڑا اور بھاری ٹرک سڑک پر نمودار ہوا اور تیزی سے برف اُڑاتا آگے چلا گیا۔ اس کے تیز چلنے سے بہت زیادہ برف اُڑی اور اس کے سارے نقشِ قدم مٹا گئی۔ وہ اندازے سے آگے بڑھتے گئے۔
''خبیث شاید ٹرک والے سے لفٹ لے کر چلا گیا۔ مارے گئے۔ اب کیا کریں؟'' لنگو نے بال نوچتے ہوئے کہا تو وہ سب بھی رک گئے۔ اب ان پر سکتہ طاری تھا۔ آنے والے وقت میں جوابدہی کے تصور نے انہیں سن کردیا تھا پھر وہ مردہ قدموں سے واپسی کے لیے چل پڑے۔
وہ جو بڑی دیر سے برف اوڑھے لیٹے اس گڑھے میں دبکا ہوا تھا، اس نے سر اٹھایا اور دیکھا۔ بہت دوران چاروں کے ہیولے نظر آرہے تھے جو برف کی سفیدی پر سیاہ دھبوں کی طرح حرکت کرتے ہوئے جارہے تھے۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہوا جسم سے برف جھاڑ کر جیکٹ کی اندرونی جیب سے سیل فون نکالا۔
''ہیلو...... روجر! فاکس تھیٹرز کے سامنے پیچ ووڈ روڈ اور پالمر ووڈ روڈ کے انٹرسیکشن پر گاڑی لے کر آجاؤ۔ پانچ منٹ میں۔'' اس نے فون پر کسی روجر کو ہدایات دیں اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا' برف کو روندتا مطلوبہ مقام کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ وہاں پہنچا ہی تھا کہ ایک فور وہیلر گاڑی وہاں آ کر رکی۔ اس نے دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ گیا۔
''روجر! اس بیگ میں کتنی رقم ہے۔ مجھے معلوم ہے۔ اس جونی کو کہہ دینا کہ اگلے تین ماہ تک میں اس کے لیے کال پر ہوں۔ کیونکہ ہر ماہ مجھے اسے جتنی رقم دینا ہوتی ہے۔ یہ اس سے تقریباً تین گنا ہے۔ اصولی طور پر میں اب اس کے لیے تین ماہ کے بریک پر ہوں۔ اس لیے اس کی طرف سے میرے پاس کوئی ٹاسک نہیں آنا چاہیے، رائٹ۔ بس مجھے یہاں اتار دو۔'' گاڑی رکی اور وہ اتر کر پیدل چل پڑا۔
☆☆☆
''تیرا میرا یہ غم اِک جیسا صنم۔ ہم دونوں کی ایک کہانی...... وقت اور حالات نے ہم دونوں کے ساتھ ایک جیسا سلوک کیا اور زمانے کی ٹھوکروں نے یہاں لا پھینکا۔ ہم دونوں الگ الگ...... تنہا تنہا اپنا اپنا غم لے کر جی رہے ہیں...... تو...... کیوں نہ...... ہم...... مل کر ایک دوسرے کا غم بانٹ لیں...... ول یو میری می رانیہ؟...... مجھ سے شادی کرو گی؟''
علی نے رانیہ کا ہاتھ تھام کر بڑے جذباتی انداز میں اسے پروپوز کیا تو وہ مسکرائی۔
''دو چار ملاقاتوں میں تم نے فیصلہ بھی کرلیا۔''
''نہیں، اس میں چھ سات سال کا انتظار بھی شامل ہے اور اس سے بھی بہت پہلے جب ہم یونیورسٹی میں ساتھ تھے۔ اس وقت کا والہانہ...... لیکن یکطرفہ عشق بھی شامل ہے۔ اپنے اور تمہارے اسٹیٹس کے فرق نے مجھے کبھی اظہار نہیں کرنے دیا لیکن اس وقت بھی میں گلے گلے تمہارے عشق میں ڈوبا ہوا تھا۔ کبھی یہ بات کہنے کی ہمت نہیں کرپایا لیکن یہ حقیقت تھی۔''
آج وہ روانی سے سب کچھ بتا رہا تھا۔
''ہاں، لفظوں میں تو کبھی نہیں کہا لیکن تمہاری آنکھیں ہمیشہ یہی کہتی تھیں اور میں سمجھتی بھی تھی۔'' رانیہ نے بتایا۔
''او مائی گاڈ...... تم جانتی تھیں؟'' علی نے استعجاب سے کہا تو وہ اثبات میں سر ہلا کر خاموش ہوگئی۔
''لیکن پلیز! اب تو میری آنکھوں کے ساتھ ساتھ دل بھی کہہ رہا ہے۔ ہونٹ بھی کہہ رہے ہیں۔ اب تو میری محبت کو قبول کرنے کا اقرار کرلو۔'' علی نے اس کا ہاتھ تھام کر مسکراتے ہوئے کہا تو وہ ہنس پڑی۔
''ہممم...... سوچیں گے۔''
''اب بھی سوچو گی؟ نیور...... مجھے ابھی ہاں میں جواب چاہیے۔ میں اب اور انتظار نہیں کرسکتا۔'' اس نے بے تابی سے کہا۔
''ہاں آں...... لیکن فلموں میں تو لڑکا انگوٹھی یا پھول کے ساتھ پروپوزل دیتا ہے اور تم......'' وہ شرارت سے مسکرائی۔
''انگوٹھیوں اور پھولوں کے ڈھیر سے سجا دوں گا تمہیں۔ تم ہاں تو کرو۔'' اس نے اس کے دونوں ہاتھ تھام کر استدعا کی۔
''او کے...... او کے...... ٹھیک ہے...... خوش۔'' وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے بولی تو علی فضاؤں میں پرواز کرنے لگا۔
پھر چند دنوں میں ہی انہوں نے شادی کرلی اور یہ

ساتھ اس قدر خوب صورت ثابت ہوا کہ وہ دونوں ہی سوچنے لگے تھے کہ اب تک انہوں نے ایک دوسرے کے بغیر کیسے گزار لیا۔ اب تو ناممکنات میں سے لگ رہا تھا۔

طے یہ ہوا کہ وہ اپنا گھر ونڈسر میں ہی بنائیں گے۔ چنانچہ دونوں نے ایک خوب صورت اپارٹمنٹ لیا۔ اسے اپنی اپنی مشترکہ پسند سے سجایا۔ اب وہ ان کے خوابوں کا گھر تھا۔ رانیہ کی یونیورسٹی کا ابھی ایک سیمسٹر باقی تھا۔ اسے وہ پورا کرنا تھا۔ بقیہ کے پلان اس کے بعد۔

علی روزانہ ڈیٹرائٹ جاتا۔ جہاں آفس کے جھمیلوں کے ساتھ ساتھ جونی اور پارٹی کی خون آشام بلاؤں کو اپنا خون بھی پلانا ضروری تھا۔ علی نے رانیہ کو ان چیزوں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ صرف اپنے کنسلٹنگ آفس کے بارے میں بتایا ہوا تھا۔ وہ اس کو کوئی بھی پریشانی، چھوٹا سا بھی دکھ نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ اس کو ایسی ہی زندگی دینے کا خواہشمند تھا جہاں صرف پیار ہو، خوشیاں ہوں، سکون اور آسودگی ہو......

پھر ان کی خوشیوں میں اضافے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک بیٹے سے نوازا۔ اب ان کی زندگی کا محور وہ پھولے پھولے گلابی گالوں والا خوب صورت سا وجود تھا جس کی کلکاریاں گونجتیں تو گھر جنت کا گوشہ لگنے لگتا۔ رانیہ بہت خوش تھی۔ وہ بھی بہت خوش نظر آتا تھا لیکن کبھی کبھی جب وہ بیٹھے بیٹھے گم صم سا ہو جاتا تو رانیہ کو لگتا تھا کہ کچھ ہے جو اس نے چھپایا ہوا ہے۔ کچھ ایسا ہے اس کے بارے میں جو وہ نہیں جانتی۔ اس نے ایک دو بار اس سے پوچھا بھی تو وہ بڑے پیار بھرے انداز میں اس کا ہاتھ تھام کر گویا ہوا۔

''میری زندگی...... میرے سارے وجود پر تم ہی تم ہو...... اگر میں کسی سوچ میں گم نظر بھی آتا ہوں تو تم یقین کرلو کہ وہ سوچ بھی تمہاری ہے۔'' اس کی والہانہ محبت کے احساس سے شرابور...... وہ اس کی بات ماننے پر مجبور ہو جاتی۔

☆☆☆

موٹر سٹی پرائڈ کے نام سے ہر سال موسم بہار میں ایک گرانڈ آٹو شو ہوتا تھا۔ اس کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں فورڈ کمپنی کے علاوہ بھی دوسری کمپنیاں اپنی گاڑیوں کے تازہ ترین ماڈلز متعارف کرواتی تھیں اور اس شو میں اصل توجہ کا مرکز وہ ''اسپیشل ایڈیشن'' ہوتے تھے جو بالکل منفرد اور انوکھے ہونے کے سبب انتہائی مہنگے بھی۔

علیز کنسلٹنٹ کے اور بے شمار کاموں میں ایک یہ کام بھی تھا کہ وہ انتہائی کانفیڈنشل معلومات جو ان اسپیشل ایڈیشن سے متعلق ہوتی تھیں، وہ کچھ رقم کے عوض اپنے بعض خاص گاہکوں کو فراہم کرتے تھے۔ یہ ان کے بلٹ اِن وہ خاص فیچرز ہوتے تھے جو انہیں اسپیشل بناتے تھے اور جس کو جتنی معلومات فراہم کی جاتیں، وہ ان کی اتنی ہی زیادہ قیمت لگاتا تھا۔ چنانچہ یہ منظر عام پر آنے سے پہلے ایک طرح کی خفیہ نیلامی کارروائی ہوتی تھی جس میں خود کمپنی کے ایجنٹ بھی چھپ چھپا کر شامل ہوتے تھے۔

علیز کنسلٹنٹ جیسے درمیان کے لوگ دونوں طرف سے مال کماتے تھے لیکن سب سے آگے علیز کنسلٹنٹ ہی تھے۔ علی کی ظاہری اور خفیہ صلاحیتیں ان معاملات میں بے مثال تھیں اور کیوں نہ ہوتیں وہ جن دنیاؤں کا باسی تھا انہوں نے اسے اتنا کچھ سکھایا تھا جو شاید کوئی استاد کسی کو نہ سکھا سکتا ہو۔

اس سال کا شو منعقد ہونے میں ابھی تقریباً پانچ ماہ باقی تھے۔ فورڈ سے ایک بہت ہی 'خاص الخاص ایڈیشن'، ریئر ایڈیشن نکلنے کی خبریں تھیں۔ علی کو ایجنٹ کی زبانی اس کی کچھ سن گن ملیں تو اس نے اپنے طور پر معلومات حاصل کرنا شروع کیں۔

اس دفعہ جو ریئر ایڈیشن آرہا تھا، وہ واقعی بے مثال تھا۔ کلاسک آرٹ کا نمونہ...... فورڈ کے سب سے پرانے ماڈل کا لک۔ جیڈ بلیک کلر۔ دروازے کھڑکیوں کی آؤٹ لائن، دروازوں کے ہینڈل بائیس قیراط سونے کی چمک والے سنہرے۔ چوڑے سیاہ اور مضبوط اسپیشل گرو والے ٹائرز، لیکن انجن اور اس کے سارے سسٹم بالکل جدید انداز کے۔ شیشے کھولنے بند کرنے، دروازے کھولنے کے لیے اور ڈیش بورڈ پر موجود سارے سسٹمز کے لیے جدید ترین ٹچ سسٹم...... اندر کے ماحول کو گرم اور خنک کرنے کا خودکار نظام۔

''واہ! کیا گاڑی ہے، زبردست!'' علی نے کمپیوٹر پر اس کے سارے فیچرز ڈالے اور جو ماڈل اس کے سامنے آیا، اس نے مسمرائز کر دیا۔

''اس دفعہ بھی یہ ریئر ایڈیشن علیز ہی بیچیں گے۔ اٹس ڈن!'' اس نے مکا دوسرے ہاتھ پر مار کر اپنا ارادہ مستحکم کیا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس ڈیل میں اسے بہت بڑی رقم ہاتھ آنے والی ہے۔

''میری جان! اس دفعہ تمہارا برتھ ڈے گفٹ ایک چابی ہوگا۔ ایک ولا کی چابی۔'' اس نے ٹیبل پر رکھی رانیہ کی

تصویر کو پیار کرتے ہوئے بڑبڑا کر کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔
آج پھر اسے کسی مہم پر جانا تھا۔ مائک آیا تھا اسے یہ بتانے کہ آج رات اسے جانا ہے۔ جاتے جاتے وہ اسے دوبارہ کہہ گیا۔ ''مارٹیز، ٹھیک سات بجے...... اوکے!'' اس نے ہاتھ ہلایا اور باہر نکل گیا۔ مائک، جونی کا آدمی تھا اور اس نے کہا سات بجے ایک ریسٹورنٹ مارٹیز میں جا کر کسی کو چیک کرنا تھا۔ وہاں ایک بھاری بھرکم سودا ہونے والا تھا۔ رقم بھی خاصی بھاری بھرکم تھی اسے وہی اڑانا تھی جو دو افراد یہ سودا کرنے والے تھے، ان کی تصویریں بھی وہ اپنے سیل فون پر اسے دکھا گیا تھا۔
مائک کے جانے کے بعد اس نے گھڑی دیکھی۔ پانچ بجنے والے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ رانیہ اور اعیان اس کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ عموماً وہ چھ بجے تک گھر پہنچ جاتا تھا اور ایسا کبھی نہیں ہوا کہ وہ گاڑی پارکنگ میں چھوڑ کر باہر آیا ہو اور وہ دونوں کھڑکی میں اسے نظر نہ آئے ہوں۔ اعیان تو اس کی جھلک دیکھتے ہی اچھل کود مچانے لگتا تھا۔ ایسے میں اس کا دل چاہتا کہ وہ سیڑھیاں چڑھ کر نہیں بلکہ اڑ کر اس کھڑکی سے ہی گھر میں داخل ہو جائے لیکن یہ ممکن نہ تھا اس لیے وہ دوڑتا ہوا کمپلیکس میں داخل ہوتا اور دو دو سیڑھیاں پھلانگتا ہوا تیسری منزل پر پہنچ جاتا۔ اپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا ہوتا تھا اور وہ دونوں اس کے منتظر ہوتے۔
یہ منظر سوچ کر ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی پھر اس نے رانیہ کو فون ملایا۔
''ہیلو رانو! آج مجھے دیر ہو جائے گی۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ کتنی دیر...... اس لیے میرا انتظار نہ کرنا۔ اعیان کو سلا دینا۔ اوکے جانو، بابائے۔'' پھر وہ اپنے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ ایک کپ چائے بنا کر پی اور کمرے میں گھس گیا۔ کچھ دیر بعد وہاں سے ایک سیاہ فام شخص برآمد ہوا جس نے تھرل سیاہ سوٹ پر ہڈ والی موٹی سیاہ جیکٹ پہنی ہوئی تھی۔ پیروں میں سیاہ اسنیکرز تھے۔ نہ صرف چہرہ سیاہی مائل تھا بلکہ ہاتھ بھی ایسے تھے کہ انگلیوں کے جوڑ خاصے سخت اور زیادہ سیاہ سے نظر آتے تھے۔ اسے دیکھ کر کوئی بھی یقین سے کہہ سکتا تھا کہ وہ ایک مزدور پیشہ سیاہ فام نیگرو ہے۔
جب وہ 'مارٹیز' میں داخل ہوا تو سات بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔ وہ آگے بڑھتا چلا گیا۔ کاؤنٹر پر پہنچ کر رکا تو مختصر لباس میں ملبوس بار گرل نے ایک پیشہ ورانہ سی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے ٹھنڈی چل بیئر کا گلاس اس کے سامنے کھسکا دیا۔

''تھینکس...... آئی نیڈ کافی...... بلیک اینڈ ہاٹ۔''
اس نے کاؤنٹر پر کھڑے کھڑے ایک طائرانہ نظر ہال پر ڈالی تو تھوڑے ہی فاصلے پر اسے ان دو میں سے ایک آدمی تنہا بیٹھا نظر آ گیا جن کی تصویریں اسے دکھائی گئی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا اس کی قریب ترین ٹیبل پر پہنچ کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں دوسرے شخص کی آمد ہوئی اور وہ پہلے کے مدِمقابل بیٹھ گیا۔ وہ حلیے سے ہی مزدور پیشہ سیاہ فام نظر آ رہا تھا۔ ان دونوں کے درمیان گفتگو کا سلسلہ چلتا رہا جسے وہ سن نہیں سکا لیکن آخرکار پہلے والے نے پاؤں سے ایک بیگ ٹیبل کے نیچے بعد میں آنے والے کی طرف کھسکایا اور بعد والے نے اپنا ہاتھ پہلے والے کے ہاتھ پر اس طرح رکھا جیسے کچھ دیا ہو۔ اس نے مٹھی بند کر کے ہاتھ پیچھے کر لیا اور اٹھ کھڑا ہوا...... الوداعی کلمات کہتا ہوا وہ باہر نکل گیا جبکہ بعد میں آنے والا اطمینان سے اپنا مشروب پیتا رہا۔ اس عرصے میں اس نے بھی اپنی کافی ختم کر لی۔
اسے اٹھتا دیکھ کر وہ بھی کافی کے پیسے مگ کے نیچے رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا اور تیزی سے بیرونی دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ اس کا رخ اب پارکنگ کی طرف تھا۔ پارکنگ کے نیم روشن ماحول میں وہ ایک چوڑے ستون کی آڑ میں کھڑا ہو کر داخلی حصے میں دیکھتا رہا۔ اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ وہ پارکنگ میں داخل ہوا تو اس نے ایک لمبا گرم کوٹ پہن رکھا تھا اور بیگ اس کے اندر کاندھے پر لٹکایا ہوا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اسی لین میں آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں وہ آ کر سرخ بوسیدہ سی جیکوار کے قریب رک گیا۔ جیب سے چابی نکال کر گاڑی کھولی اور اس میں بیٹھ کر دروازہ بند کر ہی رہا تھا کہ دوسری جانب کا دروازہ کھلا اور تیزی سے ایک شخص اندر بیٹھ گیا اور پستول اس کی کمر سے لگا دیا۔
''بیگ میرے حوالے کر دو۔ ورنہ بلاوجہ جان سے جاؤ گے۔'' اس نے بھاری اور خوفناک لہجے میں کہا تو پہلے والے کو نہ جانے کیا ہوا وہ دروازہ بند کرنے کے بجائے کھول کر واپس باہر نکل گیا۔ اب وہ نہ صرف دوڑ رہا تھا بلکہ شور بھی مچا رہا تھا۔
اس نے ایک چھلانگ لگائی اور اسے چھاپتا ہوا زمین پر گر گیا۔ اس کا کوٹ ہٹا کر بیگ چھیننے کی کوشش کی تو اس نے جسم و جاں کی پوری طاقت لگا کر ایک بھرپور پنچ حملہ آور کے منہ پر مارا...... اوغ کی آواز کے ساتھ وہ پیچھے ہوا تو نیچے گرے ہوئے نے لوٹ لگائی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اب وہ پھر بھاگ رہا تھا۔ اس نے پھر پکڑنا چاہا تو اس نے بھرپور

مزاحمت کی۔ وہ بھی لڑنے بھڑنے میں کچھ ماہر لگا اُسے۔ اور ایک دفعہ پھر اپنا سر مار کر اس کے منہ پر زخموں میں اضافہ کر دیا۔

حملہ آور کے لیے اب یہ ممکن نہیں رہا کہ وہ کوئی بھی رعایت کرے۔ کیونکہ اس کے شور مچانے سے یہ خدشہ ہو چلا تھا کہ کوئی ان کی طرف متوجہ نہ ہو جائے۔ للہٰذا اس نے آخری علاج کے طور پر پستول کا دستہ اس کے سر پر خاصے زور سے بجایا جس سے وہ اپنے حواس کھو بیٹھا۔ ہاتھ پاؤں ڈھیلے ہوئے اور وہ بے ہوش ہو کر نیچے گر گیا۔ حملہ آور نے اسے گھسیٹ کر دو گاڑیوں کے درمیان زمین پر ڈال دیا۔ بیگ لے کر نارمل رفتار سے قدم بڑھا کر اپنی گاڑی تک پہنچ گیا۔ گاڑی پارکنگ سے نکلی اور اپنی راہ پر روانہ ہو گئی۔

رات گیارہ بج کر سات منٹ پر مائیک کے فون کی گھنٹی بجی۔

''ہیلو مائیک! کل آجاؤ۔ اور اپنی امانت لے جاؤ...... گڈ نائٹ!'' مائیک نے نیند سے بیدار ہو کر کال سنی اور دوبارہ سو گیا۔

☆☆☆

''علی! تمہیں پتا ہے کل میرے پاس کس کا فون آیا تھا؟'' رانیہ نے چائے کا کپ علی کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا تو اس نے ہڑبڑانے کی ایکٹنگ کی۔

''ہائیں، تمہارے پاس فون؟ یقیناً میرے کسی رقیب رُوسیاہ کا ہوگا۔ نام بتاؤ میں ابھی جا کر اس کا گریبان پکڑ کر پوچھتا ہوں کہ تمہاری ہمت کیسے ہوئی...... میری بیوی کو فون کرنے کی؟'' اس نے میز پر زور سے مُکا مارا تو اس پر رکھے سارے برتن جھنجھنا اٹھے۔

''آرام سے میرے ہیرو! آرام سے...... تمہاری ڈرامے بازی ختم ہو گئی ہو تو آگے بولوں۔'' رانیہ مسکرائی۔

''اف! ہمیشہ میرے جذبات پر برف ڈال دیتی ہو۔ خیر بتاؤ کس کا فون آیا تھا۔'' اس نے پراٹھے کا نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

آج سنڈے تھا۔ اتفاق سے موسم بھی بہت خوشگوار تھا۔ باہر دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور پگھلتی ہوئی برف بہار کی آمد کا پیغام دے رہی تھی۔ چھٹی والے دن رانیہ ناشتے کا خصوصی اہتمام کرتی تھی۔ خالص دیسی اسٹائل کا ناشتا جو اکثر طرح طرح کے پراٹھوں پر مشتمل ہوتا۔

''سعدی کا۔'' اس نے انکشاف کیا۔

''کون سعدی؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''دیکھا، میری طرح تم بھی پہچان نہیں پائے نا۔ یونیورسٹی کے دن یاد کرو۔ وہ ہمارے گروپ میں ہوتا تھا۔ پتا ہے اس نے فیس بک پر مجھے ڈھونڈا...... پھر ہم سب کی ایک پرانی گروپ فوٹو شیئر کی اور مجھے میسج بھیجا...... تب مجھے بھی وہ یاد آ گیا۔ وہ تھا نا ایک بھورا سا لڑکا۔ جسے تم ہمیشہ پھیکا شلجم کہتے تھے اور اسے بانس پر چڑھا کر...... اس کے کھاتے سے سموسے اور چائے وغیرہ اُڑایا کرتے تھے...... نہیں یاد۔''

''او ہاں...... یاد آیا...... ایک تھا تو سہی وہ لڑکا...... فیشن کرنے کے چکر میں اپنے بال ہائیڈروجن پرآکسائڈ سے بھورے کروا لیے تھے اور ہم سب نے کس قدر مذاق اُڑایا تھا اس کا۔ ہاں سعدی ہی نام تھا اس کا...... بس یاد آ گیا مجھے...... لیکن تمہیں فون کیوں کیا اس نے...... کیا کہہ رہا تھا؟''

''وہ دراصل یہاں کینیڈا آ رہا ہے۔ اسٹوڈنٹ ویزا پر...... کسی معقول یونیورسٹی کا پوچھ رہا تھا۔ میں نے کہہ دیا کہ میں تو اپنی یونیورسٹی کے سوا کسی اور کے بارے میں اتنا کچھ جانتی بھی نہیں۔ تم چاہو تو یہیں کے بارے میں انفارمیشن لے سکتے ہو۔'' رانیہ نے چائے اس کی طرف بڑھائی۔

''پھر...... پھر اس نے کیا کہا؟''

''کہنے لگا انفارمیشن تو میں لے چکا ہوں بس اب تو فائنل کرنا ہے۔ مجھے تم سے ایک چھوٹی سے مورل سپورٹ چاہیے کہ وہاں آنے پر میری رہائش کا معقول بندوبست کروا دینا۔''

''ہم م م م...... کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ہمارا ایسمنٹ ہے نا، وہ یہاں رہ سکتا ہے جب تک چاہے۔ ویسے بائی دا وے...... تم نے اسے میرے بارے میں بتایا؟''

''نہیں، میں نے سوچا اسے سرپرائز دیں گے۔ وہ ایک دوست کے ملنے پر خوش ہو رہا تھا۔ آنے پر اسے دو دوست ملیں گے تو زیادہ خوشی ہوگی۔''

''ہم م م م...... اِٹس آ گڈ آئیڈیا...... کب آ رہا ہے وہ؟''

''معلوم نہیں...... کہہ رہا تھا آنے سے پہلے فون کرے گا۔''

''گڈ! بھئی یہ اعیان کب تک سوئے گا۔ اٹھاؤ اسے...... مجھے اس کے ساتھ کھیلنا ہے۔''

''اوو و مائی بے بی۔'' رانیہ نے کہا اور دونوں ہنس

ہے۔

پھر سعدی آ گیا۔ رانیہ نے اسے اپنے گھر کا ایڈریس دے دیا تھا۔

وہ وہاں پہنچ کر باہر کھڑا حیران ہو کر اس کا گھر دیکھ رہا تھا۔ وہ باہر نکلی اور اس کی حیرت کو بھانپ کر بولی۔

''کیا ہوا؟ اس طرح کیا دیکھ رہے ہو..... آؤ..... اندر آؤ..... یہ میرا ہی گھر ہے۔''

''بڑا زبردست گھر ہے تمہارا ماشاء اللہ! اکیلی رہتی ہو یہاں؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں..... میرے شوہر اور بیٹا بھی رہتے ہیں۔''

''اوہ..... شادی بھی کر لی۔'' اس کا لہجہ عجیب تھا۔

''ہاں آں..... تین سال ہو گئے۔ آؤ، بیٹھو..... سامان یہیں رہنے دو۔ وہ سامنے واش روم ہے۔ تم فریش ہو جاؤ۔ پھر، ہم لنچ ساتھ کریں گے اور بہت سی باتیں کریں گے..... پرانے دنوں کی..... ویسے تم میں کچھ زیادہ تبدیلی نہیں آئی۔ بہت تھوڑا فرق پڑا ہے اتنے سالوں میں۔'' رانیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''لیکن تم میں کافی فرق پڑا ہے۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

''اچھا! کیسا فرق؟''

''تم خوب صورت تو پہلے بھی تھیں لیکن اب اور بھی زیادہ ہو گئی ہو۔''

''اوہو..... اچھا، اگر یہ کمپلیمنٹ ہے..... تو بے حد شکریہ۔'' وہ ہنسی تو وہ سر ہلاتا ہوا واش روم کی طرف بڑھ گیا۔

پھر وہ لنچ پر بڑی دیر تک پرانی باتیں دہراتے رہے۔ یونیورسٹی کا زمانہ، اپنے دوست، اپنا گروپ..... کون کہاں ہے، کیا کر رہا ہے، کس کی شادی ہو گئی..... کون کس لائن میں لگا ہوا ہے..... وغیرہ وغیرہ۔

شام کو اسے اس سے بھی بڑا سرپرائز ملا۔ جب علی نے گھر میں انٹری دی۔ وہ حیرت سے اسے دیکھتا چلا گیا۔

''یہ میں ہوں میری جان..... علی..... اتنی حیرت سے کیا دیکھ رہے ہو؟''

''تم..... تم زندہ ہو؟ تم تو مر گئے تھے..... پھر وہ..... کیسے.....؟'' اس کے منہ سے جملے شکستہ ہو کر نکل رہے تھے۔

''ہاں..... وہاں اپنے دیس میں مر گیا ہوں..... لیکن یہاں زندہ ہوں، دیکھ لو۔ تمہارے سامنے کھڑا ہوں..... یہ میرا گھر ہے، بیوی ہے، بیٹا ہے اور تم میرے مہمان ہو۔'' علی زور سے ہنسا۔

''تو پھر..... وہ جو تمہاری لاش ملی تھی..... خبروں میں تھا کہ پولیس کسٹڈی میں تمہیں ہارٹ اٹیک ہوا اور تمہاری موت.....'' سعدی سچ مچ بہت حیران تھا۔

''وہ سب بکواس تھی۔ میں اُس تکلیف دہ صورتِ حال کو اب یاد بھی کرنا نہیں چاہتا۔ چھوڑ نا یار! ہم پرانے دوست اتنے عرصے کے بعد ملے ہیں..... اپنی باتیں کرتے ہیں..... مجھے تو کسی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔ تو ابھی آیا ہے وطن سے..... تجھے تو معلوم ہو گا سب وہاں کیسے ہیں؟ کیا کر رہے ہیں؟ تجھ سے تو ملاقاتیں بھی ہوتی ہوں گی ان سب کی۔'' علی کے لہجے میں ہلکا سا تجسس تھا۔

سعدی نے ایک طویل سانس لی۔ اس کی طرف دیکھ کر ہلکے سے مسکرایا۔

''رانیہ تم نے واقعی بہت بڑا سرپرائز دیا ہے علی تم کو دیکھ کر بہت خوشی ہو رہی ہے۔ ہاں، وہاں اکثر پرانے دوستوں کے ساتھ ملنا جلنا رہتا ہے۔ دور والوں سے فون پر بات ہو جاتی ہے۔ سب اپنی اپنی زندگی کی تگ و دو میں لگے ہوئے ہیں۔ کچھ کامیاب ہیں کچھ جدوجہد کر رہے ہیں، میرے جیسے، میں بھی وہاں سے اسی لیے نکلا ہوں کہ کچھ بہتر ہو سکے۔''

پھر وہ تینوں بڑی دیر تک پرانی باتیں کرتے رہے۔ دوستوں اور ساتھیوں کو یاد کرتے رہے۔

☆☆☆

''ارے! یہ کیا ہوا؟ تیرا تو سارا چہرہ زخمی ہو رہا ہے۔ خیریت تو ہے؟'' احسان آج پھر اس کے آفس آیا ہوا تھا اور اس کے زخمی چہرے کو تشویش سے دیکھ رہا تھا۔

''کل رات کی مہم جوئی کا شاخسانہ ہے۔ اُس نے آسانی سے ہار نہیں مانی تھی۔ شاید لڑنے بھڑنے کا فن بھی جانتا تھا اس لیے دو تین جاندار قسم کے پنچ رسید کیے اس نے میرے منہ پر..... میں اگر اس کی کھوپڑی بجا نہ دیتا تو اس نے کم از کم میرے چہرے کا تو بھرکس نکال دینا تھا۔''

''ہم م م م..... اس نے بیان دیا ہے کہ کسی سیاہ فام نیگرو نے پارکنگ میں اس پر حملہ کیا تھا اور اسے لوٹ کر چلا گیا لیکن اس نے پنچ مار مار کر اس کا چہرہ شدید زخمی کر دیا ہے۔ اس لیے پولیس کو ایسے لوگوں کو چیک کرنا چاہیے جن کا چہرہ زخمی ہو۔'' احسان نے بتایا۔

''ہاں، میں نے بھی کل نیوز دیکھی تھیں۔ ایسا ہی بیان

دیا ہے اُس نے...... لیکن اس نے سیاہ فام کہا ہے۔ اور میں سیاہ فام نہیں ہوں اس لیے مجھے کیوں خطرہ ہوگا۔'' علی نے کہا۔ وہ دونوں ہلکی سرگوشیوں میں باتیں کررہے تھے۔

''میں تجھے پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن تو لاعلمی میں مارا جائے، یہ بھی مجھے برداشت نہیں ہے، اس لیے تجھے دوبارہ بتا رہا ہوں کہ ہمارے ملک کی پولیس نے تجھے ایک ہائی پروفائل مجرم ڈکلیئر کر کے...... یہاں کی پولیس کو ریکویسٹ بھجوائی ہے کہ تجھے تلاش کر کے ان کے حوالے کر دیا جائے۔ پہلے تو یہاں کوئی خاص نوٹس نہیں لیا گیا لیکن اب بار بار کی ریکویسٹ کے بعد...... سنا ہے یہاں کی پولیس تیرے بارے میں کچھ ایکٹو ہوگئی ہے اور شاید تیری ریکی کی جارہی ہے۔ اپنے اپارٹمنٹ، آفس یا راستے میں کہیں کوئی وردی والا یا بغیر وردی والا بار بار نظر آنے لگے تو سمجھ لینا کہ تو اس وقت پولیس کی نظروں میں ہے۔''

''تیرے بارے میں میرا اندازہ بالکل درست ہے، تو جب آتا ہے کوئی منحوس خبر لے کر ہی آتا ہے۔'' علی نے جھنجلاتے ہوئے کہا تو وہ مسکرایا۔

''اس لیے کہ نحوست...... تیری اور میری زندگی کی مشترکہ میراث ہے۔ یہ ہمیں ورثے میں ملی ہے۔ اس لیے ہم جب بھی ملتے ہیں۔ یہ ہمارے درمیان ہوتی ہے، کیا کیا جائے۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔

وہ اسے گھورتا رہا پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر گویا ہوا۔ ''خون پیے گا؟'' لہجے میں دبی ہوئی برہمی سی تھی۔

''پلا دے...... ساتھ کچھ کھلا بھی دے، سخت بھوک لگی ہے۔'' احسان نے بے فکری سے کہا تو اس نے انٹرکام اٹھایا۔

''کافی اور کچھ سینڈوچز۔'' وہ دونوں کھاتے پیتے رہے پھر احسان چلا گیا اور وہ سوچوں میں گم اندازے لگاتا رہا کہ ابھی زندگی اس سے اور کتنے امتحان لے گی۔ یہاں اس کی چھتر چھاؤں میں سوراخ ہونا شروع ہوگئے تھے۔ اس سے پہلے کہ سر سے یہ چھت اتر جائے، اسے اپنی فیملی کے ساتھ کہیں اور کسی محفوظ مقام کی طرف نکل جانا چاہیے۔ ایسا ملک، ایسا شہر جہاں دور دور تک کوئی انہیں جاننے والا نہ ہو اور وہ سکھ چین کے ساتھ ایک پُرسکون زندگی گزار سکیں۔ کون سا ملک؟ وہ ٹیبل پر رکھے گلوب کو بے خیالی میں گھماتا رہا۔ اس پر موجود ملکوں کے نام دیکھتا اور سوچتا رہا۔

آج وہ دن بھر آفس سے باہر نکلا اور نہ ہی کسی کو آفس میں بلایا تھا سوائے احسان کے۔ شام ہورہی تھی۔ پانچ بجے تو اسٹاف آہستہ آہستہ جانے لگا اور چند ہی منٹوں میں آفس خالی ہوگیا۔

اس نے بھی اپنی چیزیں سمیٹیں۔ گاڑی کی چابیاں اٹھائیں اور اپنا آفس لاک کرتا ہوا ایلی ویٹر سے سیدھا پارکنگ میں اتر گیا جہاں صرف چند گاڑیاں رہ گئی تھیں۔ اپنی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس نے چور نظروں سے سی سی ٹی وی کیمرے کو دیکھا لیکن چہرہ اس کی زد میں نہیں آنے دیا۔ گاڑی اپنی لین سے نکالی۔ باہر جانے والے راستے پر ڈالی۔ اسپیڈ بڑھائی، پھر اسے ایک زوردار چھینک آئی اور پارکنگ کی خاموشی ایک زوردار چھناکے اور شیشے کے ٹوٹنے کی آوازوں سے گونج اٹھی۔ اس کی گاڑی پارکنگ کے چوڑے پلر سے ٹکرا گئی تھی۔ ونڈ اسکرین کے ٹوٹنے والے شیشے کے ٹکڑوں نے اس کا چہرہ زخمی کر دیا تھا۔

کچھ دیر تو وہ چوٹ کے اثر سے شاک میں آیا پھر ہمت کر کے نیچے اترا۔ گاڑی کی بائیں جانب کی ہیڈ لائٹ اور فینڈر کا اوپر کا حصہ بری طرح اندر دھنس چکا تھا۔ بمپر ٹوٹ کر نکل گیا تھا۔ لائٹس ٹوٹ چکی تھیں اور ٹوٹی ہوئی ونڈ اسکرین کے ٹکڑے پورے ڈیش بورڈ اور اندر تک پھیلے ہوئے تھے۔ اس کا چہرہ مزید زخمی ہوا اور آنکھیں بچانے کے چکر میں ہاتھ بھی زخمی ہوگئے تھے۔

وہ گاڑی کو وہیں چھوڑ کر واپس اپنے آفس میں آیا۔ فرسٹ ایڈ باکس نکال کر خود ہی کچھ طبی امداد لی اور بیٹھ گیا۔ آئینے میں اپنے چہرے کو دیکھ کر مطمئن انداز میں سر ہلایا اور صوفے پر کچھ دیر کے لیے لیٹ گیا۔

رات ہو چکی تھی۔ ہر طرف روشنیاں شہر کے اس ڈاؤن ٹاؤن کو جگمگا رہی تھیں۔ وہ صوفے پر لیٹا تو کچھ دیر کے لیے اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ اب اٹھا تو رات ہو رہی تھی۔ اس نے اپنی چیزیں اٹھائیں اور جانے کے لیے تیار ہوگیا۔ پارکنگ میں جانا بے سود تھا کیونکہ گاڑی اس قابل نہ رہی تھی کہ وہ اسے استعمال کرسکتا۔ اس لیے اپنا لیپ ٹاپ بیگ کاندھے پر لٹکا کر اس نے اوورکوٹ پہنا اور لفٹ کے ذریعے باہر آگیا۔ باہر کافی ٹھنڈ تھی۔ اس نے اوورکوٹ کا سامنے کی طرف کھینچ کر سرد ہوا سے بچنے کی کوشش کی لیکن چہرے کے زخموں پر یہ ٹھنڈی ہوا نمک بن کر لگ رہی تھی۔ اس نے جلدی جلدی قدم بڑھائے تاکہ ٹیکسی حاصل کر سکے۔ ابھی وہ فٹ پاتھ پر تھوڑی دور ہی گیا ہوگا کہ اُسے ایک آواز سنائی دی۔

''مسٹر علی!'' وہ رکا تو ایک یونیفارم میں ملبوس پولیس مین قدم بڑھاتا اس کے سامنے آ کر رک گیا۔
''میں، انسپکٹر وکرم پٹیل...... تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔''
''شیور......لیکن تم نے مجھے نام لے کر مخاطب کیا تھا، کیا تم مجھے جانتے ہو؟''
''ہم م م م...... بہت اچھی طرح مسٹر علی! تم ایک معروف آدمی ہو۔ تمھیں بہت سے ایسے لوگ جانتے ہیں جنہیں تم نہیں جانتے۔''
''اوکے......تم مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہو؟'' علی نے سنجیدگی سے پوچھا۔
''ہاں، تمہارا چہرہ دیکھ کر لگ رہا ہے کہ کچھ ہوا ہے تمہارے ساتھ...... کیا کسی نے تمہیں لوٹنے کی کوشش کی تھی؟''
''نہیں، یہ ایک حادثے کا نتیجہ ہے...... ایکسیڈنٹ۔''
''اوہ، اسی لیے تم پیدل جارہے تھے۔ کہاں ہوا ہے یہ ایکسیڈنٹ؟''
''پارکنگ میں......''
''پارکنگ میں ایکسیڈنٹ؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''
''جب آپ ڈرائیونگ کر رہے ہوں، اسپیڈ اچھی خاصی ہو اور اچانک چھینک آجائے تو گاڑی تھوڑی سی ڈس بیلنس ہو کر...... مڈوے کے پلر سے ٹکرا سکتی ہے...... میرے ساتھ یہی ہوا ہے۔'' علی نے اطمینان سے بتایا۔
''اوہ...... عجیب بات ہے...... اچھا یہ بتاؤ......'' پھر وہ دور تک اس کے ساتھ چلتا ہوا اسی حادثے سے متعلق بات کرتا رہا۔ کب، کیوں، کیسے وغیرہ وغیرہ قسم کے بے شمار سوال پوچھنے کے بعد بھی اس نے آخر میں جب یہ کہا کہ ''تمہیں پورا یقین ہے کہ تمہیں کسی نے لوٹنے کی کوشش نہیں کی تھی؟'' تو علی کا دماغ گھومنے لگا۔
''کتنی بار پوچھو گے یہ سوال؟ اتنی دفعہ جواب دے چکا ہوں اب اگر تمہاری یہ انٹروگیشن ختم ہوگئی ہو تو میں جاؤں؟''
''ضرور، ضرور مسٹر علی...... ویسے بائی دا وے تمہاری گاڑی تو غالباً ابھی تک پارکنگ میں ہی ہوگی۔''
''بالکل...... جب تک کمپنی والے اسے ٹو کر کے لے نہیں جاتے...... وہ وہیں پڑی رہے گی۔ جاؤ...... جا کر دیکھ لو۔'' اس نے چڑ کر کہا۔

''ضرور...... مسٹر علی! ضرور......'' وہ ایک چڑا دینے والی مسکراہٹ اچھالتا ہوا اس کے راستے سے ہٹ گیا اور سیٹی میں کوئی انڈین گانا بجاتا ہوا واپس چلا گیا۔ اپنے رنگ روپ اور لب و لہجے سے بھی وہ ایک انڈین گجراتی معلوم ہوتا تھا۔
'اب یہ منحوس پارکنگ میں جا کر اس کی تباہ شدہ کار کا معائنہ کرے گا۔ اچھا ہوا جو احسان نے قبل از وقت آگاہ کر دیا۔ ورنہ آج پھنسنے کے پورے چانسز تھے۔' وہ سوچتا ہوا ٹیکسی اسٹینڈ تک آیا اور ٹیکسی لے کر اپنے اپارٹمنٹ پہنچ گیا۔
وہاں اس ماسک اور دستانوں سے نجات حاصل کرنا بھی ضروری تھا۔ ورنہ وہی گلے پڑ جاتے۔ اس نے خفیہ خانے سے نکال کر انہیں باتھ روم میں جلا کر فلیش آؤٹ کر دیا۔ پھر فون اٹھا کر رانیہ کا نمبر ملایا۔
''ہیلو رانو! ہاں، آج میں بری طرح پھنسا ہوا ہوں۔ گرینڈ آٹو شو میں تھوڑا وقت رہ گیا ہے اس لیے معاملات جلدی نمٹانا ہے۔ اس لیے آج یہیں رک رہا ہوں۔ کل شام تک آجاؤں گا۔ اعیان کیا کر رہا ہے؟ اچھا، سو گیا، اوہ...... اور وہ سعدی؟ کہیں گیا ہوا ہے۔ اوکے جانو! اپنا اور اعیان کا خیال رکھنا...... اوکے بائے......'' فون رکھ کر وہ ٹی وی کے سامنے صوفے پر آرام سے نیم دراز ہوگیا۔ نیوز دیکھنے لگا۔ لوکل نیوز میں فورڈ کے اس مزدور کا بیان چل رہا تھا جسے کسی نے لوٹا اور زخمی کر دیا تھا۔

☆☆☆

''باس! جیرارڈ آیا ہے۔ تم سے ملنا چاہتا ہے۔ کوئی ضروری بات کرنا ہے۔'' ایک پتلے اور لمبے سیاہ فام نے دروازے سے جھانک کر کہا تو بروس نے سر ہلا کر اجازت دے دی۔ تھوڑی دیر بعد فورڈ کا وہی مزدور اس کے سامنے بیٹھا تھا جس سے ایک بھاری رقم کے عوض انہوں نے اس ڈپارٹمنٹ کی چابیاں حاصل کی تھیں جہاں فورڈ کا نیا ریئر ایڈیشن تشکیل پا رہا تھا۔
''یس جیری! کہو کیسے آنا ہوا۔'' بروس نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے جیری کو دیکھا۔ اس کے سر پر بندھی پٹی اس کی ٹوپی میں سے بھی نظر آرہی تھی اور آنکھوں میں خفگی کے آثار نمایاں تھے۔
''میں نے سنا تھا کہ جرم کی دنیا میں بے ایمانی کے کام نہایت ایمانداری سے کیے جاتے ہیں لیکن میں نے اس کے برعکس پایا۔''
''کیسے؟ تمہارے ساتھ کیا بے ایمانی ہوئی؟ ہماری

ایل کلیئر تھی۔ چابیوں کے عوض وہ رقم تمہیں پوری دی گئی جو ہمارے درمیان طے ہوئی تھی۔'' بروس نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''اور وہ رقم ایک ہاتھ سے دے کر...... دوسرے ہاتھ سے واپس چھین لی گئی۔ مجھے کیا حاصل ہوا...... کنپٹی پر یہ زخم؟'' وہ غصے سے بولا۔

''دیکھو جیری! تم ایک غلط الزام لگا رہے ہو۔ ہم کسی ڈیل کو اس طرح خراب نہیں کرتے۔ ہم نے وہ پیسے تم سے نہیں چھینے...... یہ کسی اور کا کام ہے...... ہمارا نہیں۔'' بروس نے سگار کے دھوئیں کے پیچھے سے اسے سنجیدگی سے گھورتے ہوئے کہا۔

''بہت خوب! اب تم یہ بھی کہو گے کہ اتنے خفیہ طریقے سے ہونے والی ڈیل...... اتنی آسانی سے کسی دوسرے تک پہنچ گئی اور ٹائمنگ دیکھو...... کس قدر پرفیکٹ...... میں لے کر نکلا ہی تھا کہ پارکنگ میں چھاپ لیا گیا۔ نہیں بروس! تمہارے جیسے گھاگ تجربے کار مجرموں سے ایسی غلطی ہو ہی نہیں سکتی کہ تمہاری خفیہ ڈیل کی سن گن کسی باہر کے آدمی کو مل جائے اور وہ ہاتھ دکھا جائے۔ یہ کام صرف اور صرف تمہارا ہے۔ بہتر ہے مجھے میری رقم دے دو...... ورنہ میرے پاس کھونے کو تو اور کچھ ہے نہیں...... لیکن تمہارا میں بینڈ بجوا دوں گا۔''

جیرارڈ عرف جیری نے اپنی بات ختم کی تو بروس کو غصہ آگیا۔ اس نے میز پر زور سے ہاتھ مارا۔

''بکواس بند کرو۔ جب میں کہہ رہا ہوں کہ یہ کام ہمارا نہیں ہے تو نہیں ہے۔ تمہیں جو رقم دی تھی وہ اس سے بڑی ہرگز نہیں ہے جو ہم بقیہ انتظامات کے لیے خرچ کر چکے ہیں۔ ہم نے ہیلی کاپٹر مع پائلٹ کے ہائر کیا ہے جسے اس رات وہ ریئر ایڈیشن ٹیکٹری کے ویئر ہاؤس کے کمپاؤنڈ سے اٹھا کر لانا ہے جہاں ہمارے آدمی تمہاری دی ہوئی چابیوں کی مدد سے...... اس ویئر ہاؤس کے دروازے کھول کر گاڑی کو دھکیل کر لائیں گے...... اس جگہ...... جہاں سے جہاز ہک لگا کر اسے اٹھائے گا اور ہمارے ٹھکانے پر لائے گا۔ تم کیا سمجھتے ہو، تمہیں دی ہوئی اس چھوٹی سی رقم کو چھین کر ہم اپنے سارے مہنگے پلان کو برباد کر دیں گے۔ تمہیں ہمت کیسے ہوئی یہ بات کہنے کی کہ رقم ہم نے چھینی ہے تم سے......'' بروس کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔

''لیکن میں یہ بھی تصور نہیں کر سکتا کہ کسی باہر کے آدمی کو ہماری اس خفیہ ڈیل کا علم ہو گیا ہو اور کوئی نیا دو ٹکے کا چھچھورا چھین جھپٹ کرنے والا...... یہ کارنامہ کر کے دکھائے...... یقیناً یہ خبر تمہارے اندر کے کسی آدمی نے ہی لیک کی ہو گی جس نے اس قدر رقم سے اپنا حصہ بھی لیا ہو گا...... جو بھی ہے...... میرا نقصان تمہاری طرف سے ہی ہوا ہے۔'' جیری نے تلخی سے لفظ چباتے ہوئے کہا تو بروس چلّایا۔

''بکواس بند کرو'' اس نے ہاتھ بزر دبانے کے لیے بڑھایا تو جیری نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔

''بس...... بس...... کسی کو بلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں جا رہا ہوں لیکن تمہیں بتا کر جا رہا ہوں کہ میں نے اپنا بیان وڈیو کی شکل میں ریکارڈ کروا کر...... اپنے ایک قابل بھروسا دوست کے پاس رکھوایا ہے اور ہدایت دی ہے کہ اگر میں کسی طرح بھی غیر قدرتی موت کا شکار ہو جاؤں تو وہ میرے اس بیان کی کاپیاں نیوز چینلز اور اخبارات کو بھجوا دے۔ اگر مجھے کچھ نہیں ملا...... تو تم بھی بہت کچھ کھو دو گے...... پولیس کی نظروں میں تو ہو تم...... اب جب انہیں ثبوت بھی مل جائیں گے تو سمجھ لو کہ تمہارا سارا کھیل ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔ اگر مجھے کچھ نہیں ملا تو تمہیں بھی بہت کچھ کھونا پڑے گا۔ اوکے، بیسٹ آف لک۔''

''اسٹاپ، بیٹھو'' بروس زور سے چلّایا۔ ''کیا بکواس کی ہے تم نے؟ تم جانتے بھی ہو تمہاری حیثیت ایک چیونٹی جیسی ہے میرے لیے...... یوں، یوں مسل دیے جاؤ گے ایک لمحے میں۔'' بروس نے چٹکی مسلتے ہوئے اشارہ کیا تو جیری نے زہرخند لہجے میں کہا۔

''جانتا ہوں...... تم ایسا کر سکتے ہو...... ضرور کروا اور الیکٹرک چیئر پر پہنچ جاؤ...... میں تو 'ڈو اور ڈائے' والی پوزیشن پر کھڑا ہوں۔ میرے لیے تو زندگی ہر صورت...... نقصان کے سوا کچھ نہیں ہے...... اوکے کم آن۔'' جیری نے اسے دعوتِ مبارزت دے ڈالی۔ بروس چند لمحے اسے گھورتا رہا پھر اشارے سے اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔

''تم نے لٹیرے کو دیکھا ہے؟ پہچان سکتے ہو؟'' اس نے سوال کیا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اوکے! تمہیں ڈونلڈ کے پاس بھیج رہا ہوں۔ ڈونی آرٹسٹ ہے۔ اس کو لٹیرے کے چہرے کے خدوخال بتا کر تصویر بنواؤ۔ پھر میں دیکھتا ہوں...... اتنی بڑی جرأت کرنے والا یہ جانباز ہے کون؟''

''اس سے مجھے کیا فائدہ ہوگا؟'' جیری نے سوال کیا۔

''ہم اسے تلاش کریں گے اور جیسے ہی وہ پکڑا جاتا

ہے، اسے رقم دینا پڑے گی۔ وہ تمہیں مل جائے گی۔'' بروس نے مسئلہ حل کر دیا۔

''مجھے بے وقوف سمجھا ہے کیا؟ تمہاری یہ تلاش صدیوں تک چلتی رہے گی۔ نہ تم اُسے ڈھونڈ پاؤ گے، نہ رقم ملے گی...... ہاں ایک دو دن میں تم گاڑی اٹھوا لو گے کیونکہ چابیاں تمہیں مل چکی ہیں...... اس کے بعد میں ٹشو پیپر کی طرح بیکار ہو جاؤں گا۔ تم مجھے گاربیج میں ڈال دو گے بلکہ ہو سکتا ہے کہ خفیہ طور پر کمپنی کو مطلع بھی کر دو کہ تم نے چابیاں مجھ سے حاصل کی تھیں...... تو میں لمبے عرصے کے لیے سلاخوں کے پیچھے پہنچ جاؤں اور تم عیش کرو...... نوپ!'' اس نے حتمی لہجے میں بات مکمل کی تو بروس جھنجلا گیا۔

''آخر تم چاہتے کیا ہو؟''

''مجھے میری رقم چاہیے...... پوری کی پوری...... میں وہ لے کر کہیں اور چلا جاؤں گا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔''

''ہم تمہیں رقم دے چکے ہیں۔''

''وہ تم مجھ سے واپس چھین بھی چکے ہو۔''

''یہ غلط ہے...... الزام ہے میں تمہیں غائب کروا دیتا ہوں...... لے جاؤ اسے...... اور اسے اس وقت تک اچھی طرح ٹھوکتے رہو۔ جب تک یہ اپنے اس دوست کا پتا نہ بتا دے جہاں یہ کچھ ویڈیوز رکھوا کر آیا ہے...... لے جاؤ۔'' بروس نے دہاڑ کر حکم دیا جس کی تعمیل میں اس کے دو گرگے جیرارڈ کو گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ وہ چیختا چلّاتا رہا مگر کسی نے پروا نہیں کی۔

پھر اس نے ڈونلڈ کو بلوا کر یہ ٹاسک دیا کہ جیری سے پوچھ کر وہ لٹیرے کا اسکیچ بنا کر دے۔ تاکہ وہ اسے تلاش کروا سکے۔ بڑا دل جگر ہے بھئی اس بندے کا...... بروس کو للکار دیا۔ اُسے ڈھونڈو...... ہر قیمت پر...... میں جاننا چاہتا ہوں کہ یہاں ایسا کون سا جیدار پیدا ہو گیا ہے جو بروس ''دا ہیزرڈ'' کو اس کے علاقے میں چیلنج کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ تلاش کرو...... گو۔''

☆☆☆

آج بھی وہ گاڑی چھوڑ کر جیسے ہی پارکنگ سے باہر نکلا اور نظر اٹھا کر سامنے دیکھا تو وہ کھڑکی کے بجائے ٹیرس پر کھڑے تھے۔ موسم بہتر ہو جانے کے سبب ٹیرس پر آنا اچھا لگا ہوگا۔ حسب معمول اعیان اسے دیکھتے ہی بے تابی سے اچھل کود کرنے لگا۔ رانیہ نے بھی اسے دیکھ کر خوشی سے ہاتھ لہرایا...... سعدی بھی کھڑا تھا۔ اس نے بھی خیر مقدمی اشارہ کیا۔ وہ بے تابی سے دوڑتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے ہی دروازہ کھلا اور گول مٹول اعیان لڑھکنے کے انداز میں اس کی طرف لپکا۔ اس نے لپک کر اسے اٹھا لیا اور پیار کرنے لگا کہ رانیہ کی ہلکی سی چیخ پر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ دونوں ہاتھ منہ پر رکھے اس کو دیکھ رہی تھی اور آنکھوں میں سرخی اور نمی کی طوفانی کیفیت تھی۔

''یہ...... یہ کیا ہوا؟...... تمہارے چہرے پر...... اتنی چوٹیں...... کیا؟'' وہ ٹوٹے ٹوٹے جملوں میں بمشکل بول رہی تھی۔

اس نے ہنستے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اسے لپٹا لیا۔

''کچھ نہیں، ایک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا لیکن اب سب ٹھیک ہے۔ بس یہ معمولی چوٹیں ہیں۔ ایک دو دن میں ٹھیک ہو جائیں گی۔ ڈونٹ وری ہنی!'' اس نے مسکرا کر اسے تسلی دینے کی کوشش کی لیکن اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے اس نے اپنے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے اور آنکھوں سے آنسو بہنے شروع ہو گئے تھے۔

علی بے چین ہو گیا۔

''رانو! میری جان! معمولی سا ایکسیڈنٹ تھا۔ معمولی چوٹیں ہیں۔ دو تین دن میں بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔'' اس نے اس کے آنسو پونچھے، گلے لگا کر تسلی دی۔

''میں کل اسی لیے گھر نہیں آیا تھا۔ تازہ تازہ ایکسیڈنٹ کے سبب میرے چہرے پر جو لہو رنگ گلزار کھلا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر تو تم شاید بے ہوش ہی ہو جاتیں...... تمہیں اس بے ہوشی سے بچانے کے لیے ہی میں نے سوچا...... علی کے بھوت کو آج رانیہ کے سامنے نہیں جانا چاہیے...... اچھا کیا نا میں نے؟'' اس نے مزاحیہ انداز میں کہا۔

''علی کے بچے!'' رانیہ نے اس کے کاندھے پر دو تین مُکّے برسائے۔

''اعیان! یہ تمہیں کچھ کہہ رہی ہے۔'' وہ ہنستے ہوئے اعیان کو دیکھ رہا تھا کہ سعدی پر نظر پڑی۔ وہ اب تک ٹیرس کے دروازے پر کھڑا انہیں دیکھ رہا تھا۔

''ارے سعدی! تم کب آئے؟ آؤ اندر آؤ۔'' وہ ان دونوں کے ساتھ صوفے کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔

سعدی بڑی دیر سے ان کا جائزہ لے رہا تھا۔ علی کے آنے سے پہلے رانیہ اور اعیان کی بے چینی پھر ان کی بے پناہ محبت...... زندگی کا ہر آرام...... خوب صورت سجا ہوا محل جیسا گھر...... علی کا شاندار بزنس...... خوب صورت بیوی...... پیارا سا بیٹا...... اور پھر ان کا بے پناہ پیار...... اس کے دل میں

عجب سی جلن محسوس ہورہی تھی۔ یہ شاید حسد تھا یا پھر برسوں پرانی محرومی...... جب وہ رانیہ کے لیے اپنے دل میں بہت زیادہ پسندیدگی کے جذبات تو رکھتا تھا لیکن اسٹیٹس کے بہت زیادہ فرق کے سبب کبھی اظہار کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔ آج وہ احساسِ محرومی بہت سے پیروں والے کن کھجوروں کی طرح اس کے وجود کے اندر سرا ٹھار ہا تھا اور اس کو تکلیف دے رہا تھا۔

''آؤ نا یار! کب تک وہاں کھڑے رہو گے...... آجاؤ'' علی نے دوبارہ اسے بلایا تو وہ دل میں اٹھنے والی ٹیس کو دباتے ہوئے بے دلی سے مسکرایا اور اس کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔

''کیسے ہوا یہ ایکسیڈنٹ؟'' اس نے رسمی انداز میں پوچھا تو وہ تفصیل بتاتا چلا گیا۔

''اور اب میں کیونکہ زخمی ہوں اس لیے اپنی پیاری بیوی سے اپنے ناز نخرے اٹھوانے پورے تین دن یہاں رہوں گا...... لانگ ویک اینڈ ہے۔''

''میرا بھی سمسٹر بریک چل رہا ہے۔ ان دنوں میں کوئی جاب تلاش کرنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ ایک دو جگہ سے کالز آئی ہیں۔ وہاں جاؤں گا۔ دعا کرو کہ مجھے جاب مل جائے تاکہ تمہاری جان چھوٹ جائے۔ تمہارے بیسمنٹ پر قبضہ جما رکھا ہے میں نے۔'' اس نے روا روی میں اپنی مصروفیت کا ذکر کیا تو علی نے چونک کر اسے دیکھا۔

''نہیں یار! بیسمنٹ میں ہماری کوئی خاص مصروفیت نہیں ہوتی۔ تم آرام سے رہو کوئی مسئلہ نہیں، رہی جاب کی بات...... دیکھ لو اگر تمہاری پسند کی جاب نہ ملے...... تو مجھے بتانا...... میرا آفس تمہارے لیے کھلا ہے۔ جب چاہو آکر جوائن کرلو...... جاب تمہاری ضرورت اور سہولت کے حساب سے ایڈجسٹ کرلیں گے...... اوکے۔'' علی کی بات سن کر سعدی کو اس کے ضمیر نے ہلکی سی چٹکی لی، وہ کیا سوچ رہا تھا اور علی کس قدر دوست نوازی کر رہا ہے۔ مجھے ایسا نہیں سوچنا چاہیے۔

اگلے دو دن وہ چاروں مل کر خوب گھومے پھرے۔ ان سب نے بھرپور تفریح کی اور پھر آخری دن سعدی نے اپنی دو جابس کے لیے انٹرویو بھگتائے اور ناکامی کا لیبل چہرے پر سجائے واپسی ہوئی۔

''چھوڑ نہ یار! بس جانے آنے کا ایک گھنٹا لگے گا۔ میرے آفس میں کام کر...... تیرے کئی مسئلے حل ہوجائیں گے۔ کیوں اِدھر اُدھر خوار ہو رہا ہے۔''

عملی مظاہرہ

ایک دیوہیکل پہلوان ٹائپ آدمی ایک شراب خانے میں آیا اور بارٹینڈر سے کہنے لگا۔ ''میں نے سنا ہے کہ تمہیں ایک گن کٹے بدمعاش کی ضرورت ہے جو ناپسندیدہ افراد سے نمٹ سکے۔''

''ضرورت تو بڑی شدید ہے مگر تمہیں اس کام کا کوئی تجربہ بھی ہے؟'' بارٹینڈر نے پوچھا۔

''تجربہ تو کوئی خاص نہیں لیکن میں عملی مظاہرہ کر کے دکھا سکتا ہوں۔''

یہ کہہ کر گن کٹے بدمعاش نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ساتھ والے کمرے میں ایک مست شرابی قسم کا آدمی فون پر کسی کو گالیاں دے رہا تھا۔ گن کٹے نے کمرے میں جا کر اس شخص کو دبوچا اور کسی احتجاج کی پروا کیے بغیر اسے شراب خانے سے باہر پھینک دیا اور فاتحانہ انداز سے جھومتا ہوا واپس آکر کہنے لگا۔

''عملی مظاہرہ پسند آیا؟''

''بہت خوب۔'' بارٹینڈر نے کہا۔ ''مگر نوکری کی اجازت تمہیں باس سے لینی پڑے گی۔''

''باس کہاں ہے؟'' بدمعاش نے پوچھا۔

''جسے تم باہر پھینک آئے ہو وہی اس بار کا مالک ہے۔''

سعدی کو خاموش دیکھ کر اس نے خود ہی فیصلہ کر دیا۔

''ٹھیک ہے صبح سات بجے تیار ہو جانا تو میرے ساتھ ڈیٹرائٹ چل رہا ہے۔ میرے آفس میں کل کا دن گزار...... دیکھ وہاں تو کیا کر سکتا ہے پھر فیصلہ کرنا کہ تجھے کرنا کیا ہے...... اوکے! ٹھیک سات بجے...... ملتے ہیں گڈ نائٹ۔'' وہ مسکراتا ہوا اپنے بیڈروم کی طرف بڑھ گیا اور وہ دزدیدہ نظروں سے بیڈ روم کے بند دروازے کو دیکھتا ہوا بیسمنٹ، اپنے ٹھکانے کی طرف چلا گیا۔ اس کے دل کی گہرائیوں میں کہیں کچھ جل اٹھا تھا۔ جس کے دھوئیں کی تلخی نے اس کی آنکھوں میں جلن بھر دی تھی۔ وہ ہونٹ کاٹتا ہوا اپنے بیڈ پر لیٹ گیا۔

اگلے چند دنوں میں سعدی نے علی کے آفس میں باقاعدہ ملازمت کا آغاز کر دیا۔ مارکیٹنگ ڈپارٹمنٹ میں اس کی کھپت ہوگئی تھی مع بہت ساری رعایتوں کے...... تنخواہ بھی اچھی خاصی ملتی تھی۔

''دیکھ بھائی! تو اسٹوڈنٹ ویزا پر ہے اس لیے تیری پڑھائی بے حد ضروری ہے۔ میں دوست ہونے کے ناتے تیری یہ مدد کر سکتا ہوں کہ جب تیری کلاسز ہو رہی ہوں تو تو

آف کرسکتا ہے جتنے دن کام کرے گا، اتنے دن کی سیلری تجھے مل جائے گی۔ چھٹیوں کا کوئی تجھ سے نہیں پوچھے گا، ٹھیک ہے؟ اب تو خوش ہے؟ اب تو مسکرا لے میرے یار۔'' علی نے ہنستے ہوئے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر انہیں مسکراہٹ کے انداز میں کھینچا تو وہ بھی مسکرا دیا۔

گرینڈ آٹوشوز دیک تھا۔ مارکیٹنگ ڈپارٹمنٹ کی مصروفیات میں بے پناہ اضافہ ہوگیا تھا۔ ریئر ایڈیشن کی لانچنگ کے رائٹس لینے کے لیے مختلف کمپنیز ہوتی ہیں جو بہتر طریقہ کار اور زیادہ مواقع فراہم کرنے کا پروگرام دیتا تھا، اسے یہ رائٹس مل جاتے تھے۔ پچھلے سال کا رائٹ علیز کنسلٹنٹ نے حاصل کیا تھا اور کمپنی کا ریئر ایڈیشن بہت ہی اعلیٰ قیمت پر منا کو کی رائل فیملی کے کسی پرنس کو فروخت کروا دیا تھا۔ اس طرح ان کی اچھی ساکھ بن گئی تھی۔ اسی بنیاد پر علی کو امید تھی کہ شاید اس سال بھی یہ رائٹس انہی کو مل جائیں۔ اس کے لیے وہ اور اس کے ساتھی بھرپور کوششیں کررہے تھے۔

علی خود بھی دن رات اسی سلسلے میں مصروفِ کار تھا اور اس کے آفس کے ساتھی بھی دل و جان سے محنت کررہے تھے۔

سعدی کا سیمسٹر بریک چل رہا تھا اس لیے وہ بھی پوری توجہ سے کام کررہا تھا لیکن اس کا زیادہ کام یا محنت علیز کنسلٹنٹ کا بزنس بڑھانے کے لیے نہیں تھی۔ اس کا زیادہ مقصد یہ تھا کہ آفس میں کیا کام کس طرح کیا جارہا ہے۔ وہ سیکھنے کی کوششیں کررہا تھا اور اس کے لیے وہ زیادہ محنت کررہا تھا۔ پتا نہیں کیوں؟ لیکن کہیں نہ کہیں اس کے ذہن میں ایک ہلکا سا خیال شاید یہ تھا کہ ایک دن وہ اس قابل ہو سکے کہ خود اپنا ایسا ہی بزنس کھڑا کرسکے اور اسی شان سے چلا سکے جیسے علیز کنسلٹنٹ چل رہا تھا یا پھر شاید وہ خود علی کی جگہ لے سکے۔

آفس میں اس کا کیوبکل جس جگہ تھا وہاں سے علی کے آفس کا دروازہ صاف نظر آتا تھا۔ جو دن بھر کھلتا اور بند ہوتا رہتا اور بھانت بھانت کے لوگ آتے اور جاتے رہتے تھے۔ وہ ان سب کا بغور جائزہ لیتا رہتا تھا۔ وہ محض شغل کے طور پر ان لوگوں کو دیکھتا رہتا تھا۔ علی نے اس کو ایک گاڑی بھی دلا دی تھی۔ تاکہ وہ اس کے ساتھ جانے اور آنے کی پابندی سے بھی آزاد ہوجائے۔ کیونکہ علی کی مصروفیات آفس ٹائم کے علاوہ بھی بے شمار تھیں۔ جنہیں اسے آفس کے بعد ٹائم دینا پڑتا تھا۔

شام ڈھل رہی تھی۔ روشنیاں جلنا شروع ہو چکی تھیں۔ سعدی باہر نکلا تو اسے یاد آیا کہ اسے اپنے لیے کچھ کپڑے اور ضرورت کی چند چیزیں خریدنا ہیں۔ اس نے ایک نظر ڈال کر شام کے سہانے منظر کو محسوس کیا اور طے کیا کہ وہ قریب ہی واقع گریٹ لیکس مال تک پیدل جائے گا۔ رونقیں عروج پر تھیں۔ موسم اچھا ہونے کے سبب بہت لوگ واک کرتے نظر آرہے تھے۔ اس نے بھی پارکنگ میں جانے کے بجائے سیدھا باہر کا رخ کیا اور فٹ پاتھ پر چلنا شروع کیا۔ 'گریٹ لیکس مال' اگلے ہی بلاک میں واقع تھا۔ زیادہ سے زیادہ دس منٹ میں اسے وہاں پہنچ جانا تھا۔

وہ آرام آرام سے چلتا جارہا تھا کہ اسے محسوس ہوا کہ کوئی اس کے ساتھ چل رہا ہے۔ بائیں جانب توجہ کی تو ساتھ چلنے والے شخص نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

''ہیلو مسٹر سیڈی! میں آفیسر پٹیل! آپ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں...... نہ نہ...... رکیے نہیں...... چلتے رہیے...... ہم چلتے چلتے ہی بات کرتے رہیں گے۔'' وہ پولیس آفیسر تھا اور شکل سے ہی انڈین لگ رہا تھا۔

''مجھ سے کیا بات کرنا ہے آفیسر؟ اور کس سلسلے میں؟'' سعدی نے بغور اسے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''زیادہ کچھ اہم نہیں...... یہ ہمارا روٹین کا چیک اَپ ہوتا ہے۔ تم نہ صرف 'علیز' میں کام کرتے ہو بلکہ مسٹر علی کے شاید اچھے دوستوں میں بھی شامل ہو۔'' اس نے چیونگم چباتے ہوئے سوال کرکے اسے حیران کیا۔

''تم ہم دونوں کو کس طرح جانتے ہو؟ اور تم نے میرا نام لے کر مخاطب کیا تھا اس کا مطلب ہے کہ تم کافی دنوں سے ہم لوگوں پر چیک رکھے ہوئے ہو...... کیا ہم سے کوئی قانونی غلطی ہوگئی ہے؟ ویسے بائی دا وے...... میرا نام سیڈی نہیں...... سعدی ہے...... تم ایشین ہو میرا نام آسانی سے صحیح لے سکتے ہو۔'' سعدی نے کچھ بدمزگی سے جواب دیا۔

''ٹھیک، او کے...... مسٹر سعدی! پولیس کی ناک غیر قانونی معاملات کو سونگھنے میں بہت حساس ہوتی ہے تو جہاں سے ہمیں یہ بُو آتی ہے ہم اس طرف بڑھ جاتے ہیں۔'' وکی پٹیل نے جواب دیا۔

''ہاں، لیکن یہاں تمہاری ناک نے...... میرا مطلب ہے غیر قانونی کام کی بُو سونگھنے والی ناک نے...... تمہاری درست راہنمائی نہیں کی ہے۔ علیز کنسلٹنٹ میں کبھی کچھ غیر قانونی نہیں ہوتا۔ سب کچھ قوانین اور اصولوں کے

مطابق ہوتا ہے۔ اگر تمہیں کچھ شبہ ہے تو آفس میں آ کر چیک کرلو..... تمہیں میری بات کا یقین آجائے گا۔'' سعدی نے جواب دیا۔

''میرا خیال ہے کہ اگر اس شخص کو..... جو اس ادارے کا کرتا دھرتا ہے۔ صرف اس کو چیک کرلیا جائے تو خودبخود معلوم ہو جاتا ہے کہ سب کچھ صحیح چل رہا ہے..... یا کچھ غلط بھی ہے۔''

''میں اس ادارے کا کرتا دھرتا نہیں ہوں جو ہے اسے چیک کرلو..... میرا خیال ہے تمہاری غلط فہمی دور ہو جائے گی۔''

''جب اس کا وقت آئے گا تو یہ بھی ہو جائے گا مسٹر سعدی! آپ سے ایک درخواست ہے کہ آپ آفس میں رہتے ہوئے بس اس چیز پر نگاہ رکھیں کہ مسٹر علی سے ملنے کون کون لوگ آتے ہیں۔ ان چہروں کو یاد رکھیے..... میں آپ کو چند تصویریں دکھاؤں گا، آپ بتایئے گا کہ ان میں سے کوئی ان سے ملنے آتا ہے یا نہیں۔'' وکی پٹیل نے اسے ہدایت دی تو وہ کچھ جھنجلایا۔

''میں یہ کام کیوں کروں آفیسر؟ بلاوجہ اپنے باس کی جاسوسی کرکے آپ کو خبریں دوں..... مجھے بھلا کیا فائدہ ہوگا اگر میں اپنے دوست کو بلاوجہ کوئی نقصان پہنچانے میں حصے دار بنوں..... نوپ..... سوری۔''

''لک مسٹر سعدی! آپ کو فائدہ بھی ہوسکتا ہے۔ کیسے، کتنا اور کیونکر..... اس پر ہم بعد میں بات کریں گے۔ فی الحال تو میں صرف اسٹیٹ کے نام پر..... مدرلینڈ کے نام پر آپ سے تعاون کا خواہاں ہوں۔ امید ہے آپ انکار نہیں کریں گے۔''

آفیسر وکرم پٹیل اپنی بات ختم کرکے سڑک پار کرنے کے لیے سگنل کی طرف مڑ گیا اور سعدی خیالوں میں گھرا مال کی جانب بڑھتا چلا گیا۔ اس دن کے بعد سے وہ ہر لمحہ اسی بارے میں سوچتا رہا کہ اس پولیس والے نے کون سے غیرقانونی کام کی طرف اشارہ کیا ہے۔ بظاہر اسے اس آفس میں ایسا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔

پہلے وہ شغل کے طور پر علی کے آفس میں آنے جانے والوں کو دیکھتا رہتا تھا۔ اب وہ خصوصی طور پر ان چہروں کو ذہن نشین کرنے کی کوششیں کرنے لگا تھا۔ پھر ایک دفعہ علی سے باتوں باتوں میں سرسری طور پر پوچھ بھی لیا۔

''یار! وہاں اپنے وطن میں تو کوئی بھی کاروبار بڑھانے اور چلانے کے لیے کچھ غیرقانونی اور غیر اخلاقی حربے استعمال کیے جاتے ہیں۔ کیا یہاں..... اس ملک میں بھی ایسے ہی حربے استعمال کیے جاتے ہیں۔'' اس نے معصومانہ سوال کیا تو علی ہنس پڑا۔

''ایسا کبھی سوچنا بھی نہیں..... کیونکہ یہاں ایسا کوئی حربہ نہیں چلتا۔ یہاں کے ادارے انصاف فراہم کرنے میں دیر نہیں لگاتے، ایک قدم بھی غلط اٹھایا..... فوراً دھر لیے جاتے ہیں اور فوراً سزا..... کوئی رشوت، کوئی سفارش بچا نہیں سکتی اور پھر جب محنت اور ایمان داری سے بہترین بزنس ہو سکتا ہے تو بندے کو کیا ضرورت ہے کہ وہ کوئی غلط یا غیرقانونی کام کرے۔''

''اوہ..... اس کا مطلب ہے..... تمہیں بھی کبھی ضرورت نہیں پڑی کہ کوئی غلط سلط کام کرو۔'' سعدی نے پھر معصومیت سے سوال کیا۔

''نہیں یار، کبھی بھی نہیں..... بغیر کسی غلط سلط کام کے..... جب اتنا اچھا کام چل رہا ہو..... تو کیا ضرورت ہے بندے کو بلاوجہ پنگا لینے کی۔''

سعدی کا سیمسٹر بریک ختم ہو رہا تھا۔ اگلے ویک سے اس کی کلاسز دوبارہ شروع ہو رہی تھیں۔ اس دن وہ آفس سے نکلا اور پارکنگ میں پہنچا تو انسپکٹر وکی پٹیل اس کی گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

''ہائے مسٹر سعدی! آج مجھے تم سے تھوڑی دیر کے لیے لفٹ چاہیے..... امید ہے تم انکار نہیں کرو گے۔''

سعدی نے ناگواری سے اسے دیکھتے ہوئے گاڑی کھولی اور دوسری جانب اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے گاڑی چلادی۔

''کہاں جانا ہے؟''

''اسی روٹ پر چلتے جاؤ..... آگے ایک ریسٹورنٹ ہے 'ٹسٹ آف انڈیا' ہمیں وہیں تک جانا ہے۔ سوچا آج تمہیں اسپیشل انڈین مصالحے والی چائے پلاؤں۔'' اس کی چڑانے والی مسکراہٹ سعدی کو جھلسا گئی۔

''میں پینا چاہوں..... یا نہ پینا چاہوں۔''

''کوئی بات نہیں..... چائے نہ سہی..... کچھ اور کھا پی لینا..... میری طرف سے ٹریٹ ہے۔''

''کس سلسلے میں ہے یہ ٹریٹ۔''

''برتھ ڈے ہے میرا۔'' سعدی نے ٹھنڈا سانس لے کر اِدھر اُدھر سر ہلایا اور گاڑی ریسٹورنٹ کے سامنے روک دی۔ وہ اندر داخل ہوئے تو پٹیل نے ہانک لگائی۔

''ہری پرساد! ذرا اچھی سی چائے بھجوا..... آجاؤ.....

یہاں بیٹھتے ہیں۔'' شیشے کی بڑی سی کھڑکی کے سامنے وہ دو افراد والی ٹیبل پر بیٹھ گئے پھر پٹیل نے اپنی جیب سے ایک لفافہ نکالا اور اس میں سے کچھ تصاویر برآمد کر کے اس کے سامنے ڈال دیں۔

''ان تصویروں کو ایک ایک کر کے غور سے دیکھو...... کیا ان میں سے کسی کو تم نے مسٹر علی کے پاس آتے جاتے دیکھا ہے؟''

سعدی نے حسبِ ہدایت انہیں ایک ایک کر کے غور سے دیکھا اور آخر میں نفی میں سر ہلا دیا۔

''نہیں، میں نے ان میں سے کسی کو آفس میں آتے...... یا علی سے ملتے ہوئے نہیں دیکھا۔'' سعدی نے صاف الفاظ میں انکار کیا۔

''حالانکہ میں نے کم از کم دو تصویروں کو دیکھتے ہوئے...... تمہاری آنکھوں میں شناسائی کی جھلک دیکھی ہے...... مسٹر سعدی ایک دفعہ پھر غور سے دیکھو۔'' پٹیل کی آنکھوں میں لپک تھی۔

''میں نے دیکھ لیا...... اچھی طرح...... میرا وہی جواب ہے۔'' سعدی نے حتمی لہجے میں جواب دیا۔

''چائے پیو۔'' وکرم پٹیل نے چائے کا کپ اس کی طرف کھسکایا۔

''شکریہ...... میرا کپ بھی تمہارا ہوا...... یہ میری طرف سے تمہارے لیے ٹریٹ ہے...... ہیپی برتھ ڈے ٹو یو...... ویسے بائی دا وے...... یہ تمہارا کون سا برتھ ڈے ہے؟'' سعدی نے مسکرا کر پوچھا۔

''ایک سو پچیسواں۔'' پٹیل کے لہجے میں جلنے کی سی بُو صاف محسوس ہوئی۔

''اچھا...... ویسے یار! بڑا مینٹین کر کے رکھا ہوا ہے اپنے آپ کو...... چالیس سے زیادہ کے نہیں لگتے...... کیپ اِٹ اَپ...... بائے۔'' وہ ہاتھ ہلاتا ہوا باہر نکل آیا۔

واپسی میں وہ تمام راستے یہی سوچتا رہا کہ یہ کیا مسئلہ ہے؟ پٹیل نے ٹھیک کہا تھا ان تصویروں میں دو چہرے واقعی ایسے تھے جنہیں وہ علی کے آفس میں جاتے ہوئے دیکھ چکا تھا لیکن نہ جانے کس مصلحت کے تحت اس نے پٹیل کو بتانا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ سوچ میں ڈوبا ڈرائیونگ کرتا رہا اور ایمبیسڈر برج کراس کر کے سیدھا گھر پہنچ گیا۔ گاڑی پارک کر کے باہر آیا تو غیر ارادی طور پر اس کی نظر سامنے گھر کی کھڑکی اور ٹیرس پر پڑی۔ کھڑکی بند اور ٹیرس ویران پڑا تھا۔ اس کے دل میں پھر کن کھجوروں نے سر اٹھایا۔ کاش میرے آنے پر بھی اسی طرح اس گھر کی کھڑکی کھلے...... رانیہ اور اعیان اس کا بے تابی سے انتظار کرتے نظر آئیں۔ جیسے علی کے آنے پر نظر آتے ہیں۔ کن کھجوروں نے اسے اندر سے اپنے تیز نکیلے پنجوں سے کھرچا تو وہ دل کی جلن پر قابو پاتا ہوا اپنے بیسمنٹ میں چلا آیا اور جوتوں سمیت بیڈ پر ڈھیر ہو گیا۔ بڑی دیر تک اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا...... اس کے دل کی یہ جلن وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی جا رہی تھی اور اسے اس کا کوئی حل...... کوئی علاج مل نہیں رہا تھا...... وہ سوچتا رہا اور سوچتے سوچتے نہ جانے کب نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

☆☆☆

آج مائک پھر علی کے آفس میں موجود تھا۔

''یس مائک! آج پھر تمہارے گوریلے نے تمہیں یہاں بھیج دیا...... کیوں؟''

''جونی نے تمہارے لیے ٹاسک بھیجا ہے۔'' مائک نے سنجیدگی سے کہا۔

''حالانکہ ڈیڑھ ماہ پہلے میں نے اس کو اتنی بڑی رقم کما کر دی ہے کہ اسے کم از کم تین ماہ تک مجھے کوئی ٹاسک نہیں دینا تھا اور یہی میں نے اسے کہلوا بھی دیا تھا پھر یہ ابھی سے نیا ٹاسک کیا معنی رکھتا ہے؟'' علی نے بدمزگی سے پوچھا۔

''یہ اُسے اور تمہیں بہتر معلوم ہوگا۔ میں تو صرف اس کا میسج لے کر آیا ہوں۔ منڈے، رات نو بجے۔ جیکسن جیٹی کے پاس۔ شکار مشی گن گرینڈ سینٹرل اسٹیشن پر آ رہا ہے۔ وہاں سے وہ جیٹی پر جائے گا۔ اس کے پاس بیگ میں بھاری رقم ہے۔ یہ اس کی تصویر ہے۔'' مائک نے ایک تصویر اس کی طرف بڑھا دی۔ وہ بھورے لمبے بالوں اور استخوانی سے چہرے والا کوئی گورا تھا۔

''لیکن میں اس ٹاسک کو پورا نہیں کر سکتا۔ شو سر پر ہے اور مجھے اس کی فائنل تیاری میں دن رات مصروف رہنا ہے...... صرف پندرہ دن کی بات ہے...... اس کے بعد جو وہ ٹاسک دے گا، میں دل و جان سے پورا کروں گا۔ جونی کو میری طرف سے کہہ دینا...... مجھے اس ٹاسک کے لیے معاف کر دے۔'' علی نے مائک کو متاثر کرنے کی کوشش کی تو وہ بے تاثر چہرے کے ساتھ اسے دیکھتا رہا۔

''میرا کام صرف پیغام پہنچانا ہے۔ جونی کا پیغام تم تک پہنچایا تھا۔ تمہارا اُسے پہنچا دوں گا۔'' وہ سپاٹ سے لہجے میں بولتے ہوئے اٹھا اور باہر نکل گیا۔

پھر اسی رات وہ گھر واپسی کے لیے آفس سے نکلا اور پارکنگ میں پہنچا تو اندھیرے نے چار سیاہ ہیولے اُگلے اور اسے چھاپ لیا۔ اس کی اپنی گاڑی کے دروازے تیزی سے کھلے۔ وہ اس سمیت گاڑی میں اسے دبوچ کر بیٹھے اور گاڑی تیز رفتاری سے انجانے راستوں پر سفر کرتی آگے بڑھتی گئی۔ ایک جگہ رکی، انہوں نے اسی طرح اسے گھسیٹ کر باہر نکالا اور کھینچتے ہوئے لے جا کر ایک کمرے کے فرش پر پھینک دیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ سامنے پاؤں چوڑے کیے جونی کھڑا تھا۔ ہونٹوں میں دبا سگار سلگ رہا تھا اور علی دیکھے بغیر بھی اس کی خوشبو سے جونی کی موجودگی کو محسوس کرسکتا تھا۔

''اٹھو! کھڑے ہو جاؤ! جونی کے حکم سے رُوگردانی کرنے والا اس زمین پر...... اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل نہیں رہتا...... تم سے صرف ایک سوال پوچھنا ہے...... جونی نے تم کو جو حکم دیا ہے اس کے جواب میں تمہارے پاس یس ہے یا نو۔'' جونی نے نہایت ٹھنڈے لہجے میں پوچھا۔

علی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ''نہ ناں...... اور نہ ہاں...... بلکہ صرف چند روز کی مہلت چاہیے تھی۔''

''نو آرگیومنٹس! جب جونی کوئی آرڈر دیتا ہے تو اسے جواب صرف یس میں دینا ہوتا ہے۔ اسے یہ بات سکھاؤ...... اور اس طرح سکھاؤ کہ یہ منڈے کو یقینی کل اپنا ٹاسک پورا کرنے کے قابل رہے۔'' جونی یہ کہہ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا کمرے سے نکل گیا۔ اس کے بعد ان چاروں نے اسے گھونسوں اور لاتوں پر رکھ لیا۔ خوب اچھی طرح مرمت کی اور اس مرمت کے نشان چھوڑ دیے۔ کچھ ڈھکے چھپے...... اور کچھ نظر آنے والے جو اس کے چہرے پر تھے۔

''آج کے بعد باس کو یس کے علاوہ کچھ بولنے کی کوشش کی تو زینڈل کے حوالے کر دیے جاؤ گے۔ زینڈل قصائی ہے اور ہڈیاں توڑنے کا ماہر۔ کل سات بجے تیار رہنا، تمہیں اپنی مہم پر جانا ہے۔'' لمبے سیاہ فام نے بھاری لہجے میں اسے ہدایات دیتے ہوئے دروازہ باہر سے بند کر دیا اور وہ فرش پر پڑا سوچتا رہا کہ اب کیا کرے؟

اگلے دن سات بجے دروازہ کھلا اور غوطہ خوری کا ایک لباس اسے دیا گیا کہ اسے پہن کر وہ تیار ہو اور دس منٹ میں باہر کھڑی گاڑی میں آ کر بیٹھ جائے۔ اس نے ہدایات پر عمل کیا اور گاڑی اسے لے کر روانہ ہو گئی اور طویل مسافت طے کر کے دریا کے کنارے ایک ویران جگہ پر رک گئی۔

تھوڑی دور پر ہلکی چاندنی میں وہ چھوٹی سی جیٹی نظر آ رہی تھی۔ جہاں ایک دو کشتیاں لنگر انداز تھیں لیکن آس پاس کوئی انسان نظر نہیں آ رہا تھا۔ سامنے ہی پانی میں آگے تک ایک پلیٹ فارم بنا ہوا نظر آ رہا تھا جس پر لگے لکڑی کے تختوں کو نیلا رنگ دیا گیا تھا۔ ''تمہیں اس پلیٹ فارم کے قریب کہیں پانی میں چھپ کر رہنا ہے۔ جیسے ہی شکار یہاں پہنچے، اسے قابو کر کے اس سے رقم حاصل کرنا ہے۔'' ایک شخص نے آکسیجن سلنڈر اس کی پیٹھ سے باندھا اور وہ ہیلمٹ پہن کر پانی میں اترنے کے لیے تیار ہو گیا۔ پتھروں میں فکس بورڈ جس پر 'جیکسن جیٹی' کا نام لکھا ہوا تھا وہی سب سے مناسب جگہ تھی جہاں سے وہ آسانی سے پانی میں اتر بھی سکتا تھا اور باہر نکل بھی سکتا تھا۔

فضا خاموش تھی۔ آسمان پر آخری تاریخوں کا چاند ملگجی سی روشنی پھیلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ دریا کی ہلکی ہلکی لہریں کنارے کے پتھروں سے ٹکرا کر مدھر قل قل کی آوازیں پیدا کر رہی تھیں۔ وہ نہایت صبر سے پورا پانی کے اندر اترا ہوا صرف سر باہر رکھ کر اس آنے والے کا انتظار کر رہا تھا جو یہاں کوئی بڑی رقم لے کر آ رہا تھا۔ اس رقم کے عوض اسے یہاں آنے والی کسی چھوٹی کشتی سے منشیات کی خاصی بڑی مقدار حاصل کر کے واپس چلے جانا تھا۔

آدھے گھنٹے کے طویل انتظار کے بعد دور سے آتا ہوا کوئی ہیولا اسے نظر آیا۔ عام سی ٹی شرٹ اور بہت سی جیبوں والی پینٹ پہنے وہ تیز رفتاری سے آ رہا تھا۔ اس کے لمبے بھورے بال ہلکی ہوا سے ہلکورے لیتے محسوس ہو رہے تھے۔ علی ہیلمٹ کے شیشے سے اسے غور سے دیکھتا رہا۔ اس کے پاس صرف ایک بیک پیک تھا اور یہی اس کا مقصودِ نظر تھا۔

وہ پلیٹ فارم کے آخری سرے پر آ کر رک گیا۔ سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے وہ دریا پر دور تک نظر ڈال رہا تھا اور یہی وقت تھا جب علی کو ایکشن میں آنا تھا۔ وہ انتہائی خاموشی سے پانی سے نکلا اور ہلکی چاپ کے ساتھ آنے والے کے سر پر پہنچ گیا۔ اسی لمحے اس نے مڑ کر دیکھا اور آنکھوں میں اُلجھن کا سا تاثر ابھرا۔ وہ شاید کچھ تذبذب میں پڑ گیا تھا۔ کیونکہ اس کے حساب سے تو کسی کو مال لے کر کشتی میں آنا تھا لیکن یہ تو......'' وہ اسی تذبذب میں تھا کہ علی نے بجلی کی سی تیزی سے پستول کا بھاری دستہ اس کی کنپٹی پر دے مارا...... وہ گرا تو اس کا بیک پیک اتارنا کوئی بڑا مسئلہ

نہ تھا۔ وہ لے کر وہ دوبارہ پانی میں اترا۔ چوبی پلیٹ فارم کے نیچے ایک مناسب جگہ بیگ چھپا کر...... گلے تک پانی میں اتر گیا......اب پتھروں کے پس منظر میں اس کا ہیلمٹ پہنا سر شناخت کرنا آسان نہ تھا۔

اب اسے صرف انتظار کرنا تھا۔ وہ انتظار کرتا رہا۔ آخر کار دور دریا کی سطح پر ایک چھوٹی سی اسپیڈ بوٹ نمودار ہوئی۔ وہ تیزی سے جیٹی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جیٹی کے نزدیک آکر وہ رک گئی۔ علی نے دیکھا اس میں صرف دو آدمی تھے۔ ان میں سے ایک چھلانگ لگا کر اترا اور سیدھا پلیٹ فارم پر چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں اس کی حیرت زدہ چیخ سنائی دی۔ وہ دوڑتا ہوا واپس آیا اور دور سے ہی بوکھلاہٹ میں دوسرے آدمی کو 'واپس چلو'......'واپس چلو' کا اشارہ کرتا ہوا بوٹ کی جانب آرہا تھا۔ بوٹ کا انجن اسٹارٹ ہوا۔ دوڑنے والے نے اس میں چھلانگ ماری اور بوٹ دوبارہ انہی راستوں پر واپس ہوگئی۔ جدھر سے آئی تھی۔

علی نے زیر لب مسکراتے ہوئے بیگ اٹھایا اور پانی سے باہر آگیا۔ تھوڑی دیر میں وہ سیاہ کار دوبارہ نمودار ہوئی اور وہ اس میں بیٹھ کر روانہ ہوگیا۔ اس پوری کارروائی میں جو بڑی خاموشی سے ہوئی۔ کوئی دیکھنے والا تھا نہ کوئی دخل در معقولات کرنے والا۔ ہاں ماحول میں صرف ایک بے ہوش وجود کا اضافہ ہوگیا تھا جو اس چوبی پلیٹ فارم پر اوندھے منہ پڑا تھا۔ اس کے لمبے بھورے بال ساحل کی نم اور خنک ہوا میں ہلکے ہلکے سرسرا رہے تھے۔

☆☆☆

ساحلی علاقہ میدانِ جنگ بنا ہوا تھا۔ رات گہری اور اندھیری تھی اور اس اندھیرے میں فائر ہونے والی گولیاں چنگاریوں کی طرح فضا میں شرارے پھیلا رہی تھیں۔ دھماکوں سے پورا ماحول زیر و زبر تھا۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ دو گروہوں میں زبردست ٹھنی ہوئی ہے اور دونوں اپنی اپنی طاقت منوانے کے جنون میں پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں ہیں۔ اس حشر والے ماحول میں ہتھیاروں کے دھماکوں کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی انسانی آوازیں بھی سنائی دے جاتی تھیں۔ کبھی کوئی دبی ہوئی سسکی، کبھی غصے کی چیخ اور کبھی چلا کر ایک دوسرے کو کاشن دینے کی آوازیں...... ایک ہنگامہ برپا تھا اور کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ سب کب تک چلے گا۔ کیونکہ کوئی بھی پیچھے ہٹنے یا ہار ماننے کو تیار نہیں تھا۔ کبھی فائرنگ کا سلسلہ سست ہو جاتا اور پھر فوراً ہی زبردست دھائیں دھائیں شروع ہو جاتی۔

رات گزر کر اب سپیدۂ سحری نمودار ہونے کو تھا۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ پولیس کو خبر ہی نہیں ہوگی لیکن ایسے موقعوں پر وہ بھی ذرا مصلحتوں سے کام لیتی تھی۔ ڈیٹرائٹ شہر گینگسٹرز کا شہر ہے۔ ایک دو نہیں...... نہ جانے کتنے گینگ یہاں موجود تھے لیکن ان میں دو نمایاں اور بڑے طاقتور تھے جوناتھن روبو کے ''روبوز'' جو شہر کے شمالی حصے پر اپنا پورا اختیار رکھتے تھے دوسرا بروس میلکم کا گینگ۔ جس کے 'میلکیز' شہر کے جنوبی حصے پر مکمل اختیار رکھتے تھے۔ یہ ساحلی علاقہ تھا اور وہاں جھیل مشی گن کے ذریعے ہونے والی آبی سرگرمیوں کے سبب خاصی گہما گہمی رہتی تھی۔

ہر گینگ اپنے اپنے علاقے تک محدود رہنے کی کوشش کرتا تھا۔ یہ ایک غیر تحریر شدہ ضابطۂ اخلاق تھا لیکن اگر کوئی اپنے علاقے سے نکل کر دوسرے کے علاقے میں کارروائی کر دیتا تو نتیجے میں یہی ہوتا۔ جو اَب ہو رہا تھا۔ 'روبوز' اور 'میلکیز' میں گینگ وار چل رہی تھی۔

آخر کار پولیس نے علاقے میں انٹری دی۔ چیختے ہوئے ہوٹرز اور جلتی بجھتی نیلی اور لال روشنیوں کے ساتھ سفید گاڑیوں کا قافلہ علاقے میں داخل ہوا اور محاذ پر خاموشی چھا گئی۔ ایسے...... جیسے کبھی کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔

جوناتھن اپنے سامنے ٹیبل پر رکھے فون کو گھور رہا تھا۔ سگار کے دھوئیں کے پیچھے اس کی آنکھیں نیم وا سی محسوس ہو رہی تھیں۔ اسے شاید کسی فون کال کا انتظار تھا۔ واقعی تھوڑی دیر میں رِنگ ہوئی۔

''تمہارے آدمی نے میرا بڑا نقصان کیا ہے۔ اب تمہارے حالات اتنے خراب ہوگئے ہیں کہ تم دوسروں کے علاقوں میں وارداتیں کروانے لگے ہو؟'' دوسری جانب سے بروس نے اسے پھٹکارا۔

''کام کی بات کرو۔'' جونی نے ٹھنڈے لہجے میں جواب دیا۔

''او کے! تو کام کی بات یہ ہے کہ تمہارے اس آدمی نے مجھے جتنا نقصان پہنچایا ہے اس کا ڈبل کر کے تاوان کے طور پر ادا کر دو اور اپنا آدمی لے جاؤ...... ورنہ......'' بروس نے واضح طور پر دھمکی دی۔

''رقم بتاؤ۔'' جونی نے کڑوے لہجے میں پوچھا۔

''تین ملین ڈالرز۔''

''آر یو کریزی مین! وہ آدمی اتنا قیمتی نہیں ہے۔ ایک معمولی کارندہ ہے اور اس جیسے میرے پاس سیکڑوں ہیں دو چار لاکھ چاہئیں تو بولو۔''

''نوپ! سنگل پینی بھی کم نہیں۔ تمہارا وہ آدمی تمہارے لیے کس قدر خاص ہے، میں جانتا ہوں میرے آدمیوں نے کل سے اسے بجا بجا کر سب کچھ اگلوا لیا ہے۔ میں نے اسے اپنے ساتھ کام کرنے کی آفر بھی کی لیکن وہ تمہارا صحیح معنوں میں وفادار کتا ہے، نہیں مانا۔ وہ چاہیے...... تو میری ڈیمانڈ پوری کر دو...... ورنہ......'' بروس کے دھمکی آمیز انداز نے جونی کو برافروختہ کر دیا۔

''جہنم میں جاؤ۔'' جونی نے ریسیور پٹخ دیا۔

پھر شہر کے کروڑ پتی کاروباری نے بیچ میں پڑ کر معاملات ٹھیک کروائے۔ ایملی اسے لے کر آئی تو وہ بری طرح زخمی حالت میں تھا۔ آنکھیں سوجی ہوئی اور ان کے نیچے نیل کے نشان۔ ایک بھوں کے اوپر گہرا زخم۔ جس سے خون نکل کر جم گیا تھا۔ ہونٹ جگہ جگہ سے پھٹے اور سوجے ہوئے۔ وہ نیم جان سا سیٹ پر ڈھیر ہوا پڑا تھا۔ اس کے اپارٹمنٹ میں لے جا کر ایملی نے ڈاکٹر کو کال کیا۔ یہ ان کا اپنا ڈاکٹر تھا اور جانتا تھا کہ مارا ماری کے نتیجے میں اس طرح کے ٹوٹے پھوٹے لوگوں کا علاج کس طرح کیا جاتا ہے۔ اس نے خاطر خواہ طبی امداد بہم پہنچائی اور ایک ڈرپ اسے لگا کر چلا گیا۔

''تمہاری بیوی بہت پریشان ہے۔ وہ کئی لوگوں کو فون کر کر کے تمہارے بارے میں پوچھ چکی ہے۔'' ایملی نے اسے اطلاع دی۔

''کسی نے اسے بتایا تو نہیں کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے؟'' علی نے چونک کر پوچھا۔

''کسی کو معلوم نہیں...... تو کیا بتائے گا۔''

''اچھا پلیز ایملی! تم اسے فون کر کے بتا دو کہ وہ...... یعنی کہ میں...... رئیر ایڈیشن کے ایک خریدار سے ملنے کے لیے کہیں باہر گیا ہوا ہوں۔ دو چار دن میں لوٹ آؤں گا۔''

''اسے یقین نہیں آئے گا، بہتر ہے تم خود بتا دو۔'' ایملی نے اپنا فون اس کی طرف بڑھاتے ہوئے مشورہ دیا تو اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میرا منہ اور جبڑا زخمی ہے۔ میں ٹھیک سے بول نہیں پاؤں گا اور وہ سمجھ جائے گی اور آندھی طوفان کی طرح یہاں پہنچ جائے گی۔''

''اوکے، اُسے میسج کرو۔ وہ اسی نمبر پر کنفرم کرنے کے لیے فون کرے گی تو میں بتا دوں گی کہ تم کو اچانک روم جانا پڑ گیا ہے۔''

''اوکے! اپنا خیال رکھنا اور جلد بہتر ہونے کی کوشش کرنا...... ویسے تم اس دفعہ پھنس گئے؟''

''انہوں نے جال بچھا کر مجھے پکڑا تھا۔ ایک بڑی رقم کی اطلاع جونی کے گرگوں کو دی۔ اس نے مجھے بھیجا۔ وہ پیچھے تھے۔ انہوں نے بھاگنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ پچھلی ساری وارداتوں کو بھی اگلوا لیا۔

ویسے میری واپسی کس ڈیل کے تحت ہوئی؟''

''سیون ملین ڈالر...... جونی نے تو انکار کر دیا تھا لیکن لوئیس مارکھم نے بیچ میں پڑ کر...... ایک تہائی حصہ خود دیا۔ ایک تمہاری پارٹی نے اور ایک جونی نے...... اس طرح واپسی ہوئی ہے تمہاری...... اب اپنا بہت خیال رکھنا کیونکہ تمہاری تکلیف سے بہت سے لوگوں کو بہت زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔ ٹیک کیئر۔'' ایملی فوراً ہی چہرہ پھیر کر دروازے کی طرف چلی گئی۔ لیکن اس کی نیلی آنکھوں کی نمی علی سے پوشیدہ نہیں رہ پائی۔

☆☆☆

صبح کے نو بج رہے تھے۔ وہ کافی کا مگ ہاتھ میں لیے فاکس نیوز کا چینل بڑی توجہ سے دیکھ رہا تھا۔ جہاں لوکل نیوز چل رہی تھیں۔ آج اس کی حالت کچھ بہتر تھی۔ جسمانی چوٹوں کے درد میں کمی اور زخمی چہرے کی حالت بھی کچھ بہتر ہو گئی تھی۔ آج کسی وقت اس کے ڈاکٹر کو بھی آنا تھا۔

اطلاعی گھنٹی ڈنگ ڈانگ کی آواز کے ساتھ بجی تو وہ ڈاکٹر کے آنے کے یقین کے ساتھ دروازہ کھولنے اٹھا۔ دروازہ کھولا تو خود حیران رہ گیا۔

''سعدی! تم یہاں؟ تمہیں یہاں کا پتا کس نے بتایا؟ تم اکیلے ہو نا! رانو تو ساتھ نہیں ہے؟'' وہ بوکھلاہٹ میں سوال کرتا گیا۔

سعدی نے نفی میں سر ہلایا۔

''نہیں، وہ میرے ساتھ نہیں ہے لیکن یہ تجھے کیا ہوا ہے؟ اتنی بری طرح زخمی ہے تو؟ کیوں؟ کیسے؟''

''کچھ نہیں یار! ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ معمولی چوٹیں ہیں۔ دو تین دن میں ٹھیک ہو جائیں گی لیکن تو نے بتایا نہیں...... کہ تو یہاں کیسے پہنچا...... کس نے بتایا یہاں کا پتا؟'' علی نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''کیا یہ بات اتنی اہم ہے کہ تو بار بار اس کے بارے میں پوچھے جا رہا ہے جبکہ میں رانیہ کی پریشانی کی وجہ سے یہاں تک پہنچا ہوں۔ وہ تو خود یہاں آنے پر بضد تھی لیکن میں نے اپنی کلاسز چھوڑ کر اس کے کہنے پر تیری تلاش کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اس سے وعدہ کر کے آیا تھا کہ تجھے ڈھونڈ کر ہی آؤں گا۔ سو تجھے ڈھونڈ لیا۔ اب بتا کہ مسئلہ کیا ہے۔ یہ

تیرے اتنے تواتر سے ایکسیڈنٹ کیسے ہو رہے ہیں..... ابھی کچھ عرصہ پہلے ہوا تھا۔ اب پھر دوبارہ؟ میرے خیال میں یہ ممکن نہیں ہے۔ یہ مجھے کچھ مار کٹائی والا معاملہ لگ رہا ہے سچ سچ بتا..... کس سے لڑ رہا ہے آج کل..... اور کیوں؟'' سعدی نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''یہ تیری غلط فہمی ہے۔ ایسا کچھ نہیں ہے یار! میں ذرا رف قسم کی ڈرائیونگ کرتا ہوں۔ ہو جاتا ہے..... تو فکر نہ کر..... میں جلدی ٹھیک ہو جاؤں گا۔ تو واپس جا اور رانیہ سے بہانہ کر دے کہ میں روم میں ہوں۔ دو ایک دن میں آجاؤں گا۔''

''میں اس سے بہانہ کروں گا اور وہ مان جائے گی؟ کبھی نہیں۔ وہ گھر سے نکلے گی اور سیدھا تیرے آفس جائے گی۔ ایک ایک سے پوچھے گی۔'' سعدی نے کہا۔

''آفس میں کسی کو میرے بارے میں نہیں معلوم..... سب کو پتا ہے کہ میں روم میں ہوں..... ٹھیک؟'' علی نے انگلی اٹھاتے ہوئے کہا تو سعدی نے الجھے ہوئے انداز میں سر ہلایا۔

''ٹھیک ہے..... دوست کو بھی کچھ بتانے پر تیار نہیں ہے۔ تو کیا کہہ سکتا ہوں میں۔ سوائے اس کے کہ خوامخواہ مسٹری کیوں بنا رہا ہے مجھ سے بھی اور اپنی بیوی سے بھی غلط بیانیاں کر رہا ہے..... خیر، تیری مرضی..... میں چلتا ہوں۔'' سعدی واپسی کے لیے مڑا تو علی اسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم پُرخیال نظروں سے اسے گھورتا رہا اور وہ چلا گیا۔ دونوں کے درمیان ایک غیر محسوس سا تناؤ ظاہر ہو رہا تھا۔

''یس مسٹر سعدی! ملا وہ؟'' پٹیل نے سوال کیا۔ وہ دونوں اسی ریسٹورنٹ میں اپنی مخصوص ٹیبل پر بیٹھے تھے۔

سعدی نے اثبات میں سر ہلایا۔

''زخمی تھا..... بہت زیادہ؟'' پٹیل نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے دوسرا سوال کیا۔

''تمہیں کیسے معلوم؟'' سعدی نے بوکھلاہٹ میں پوچھ لیا۔

''پولیس کی نظروں سے کچھ چھپا نہیں ہوتا۔ پرسوں دو گینگز کے درمیان دھواں دار جنگ ہوئی تھی جس میں یہ زخمی ہوا ہے۔''

''گینگز سے اس کا کیا تعلق پٹیل؟'' سعدی نے ناراضگی سے کہا تو پٹیل آنکھیں میچ کر ہنسا۔

''تم شاید واقعی کچھ نہیں جانتے۔ وہ زوردار جنگ اسی کی وجہ سے ہوئی تھی۔ یہ ایک گینگ کا بندہ ہے۔ کچھ ایسا کیا اس نے کہ دوسرا گینگ ان سے ناراض ہو کر..... ان پر چڑھ دوڑا..... اسے اٹھا لیا انہوں نے..... اور صبح کا ٹارچ کیا۔ پھر کسی ڈیل کے نتیجے میں اسے چھڑایا گیا ہے سمجھے مسٹر سعدی!'' پٹیل نے سعدی کے چہرے کے سامنے چٹکی بجائی جو اس حیرت انگیز انکشاف پر ہونق بنا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ گڑبڑایا۔

''نہیں..... نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ تمہیں یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی یا پھر انڈین ہونے کے ناتے..... پاکستانی کو دشمن کی آنکھ سے دیکھ رہے ہو۔''

''نوپ..... نو وو..... بالکل نہیں۔ انڈین ضرور ہوں۔ لیکن یہ میری کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے۔ میں حقائق بتا رہا ہوں۔ کیونکہ یہاں میں ایک امریکن پولیس مین ہوں۔ مسٹر سعدی! ہم ایک بار پھر..... وہ پہلے والی پریکٹس کرتے ہیں۔ میں تمہیں کچھ اور تصویریں دکھاتا ہوں۔ اس بار اچھی طرح سوچ سمجھ کر بتانا..... کہ ان میں سے کس کس کو تم نے مسٹر علی سے ملتے دیکھا ہے۔'' پٹیل نے کچھ اور تصویریں نکال کر سعدی کے سامنے ٹیبل پر ڈال دیں اور سعدی الجھی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھتا رہا۔

☆☆☆

گرینڈ آٹو شو کا آج تیسرا اور اہم ترین دن تھا۔ فورڈ بلڈنگ اور اس کے پچھلی جانب ایک طویل و عریض ایریا روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ آج فورڈ کے سب سے زبردست ریئر ایڈیشن کی بڈنگ ہو رہی تھی۔ ہال نمبر 5 میں ہلکی روشنیوں کے درمیان ایک گھومتے ہوئے اونچے پلیٹ فارم پر وہ شاندار ترین ایڈیشن موجود تھا جو سارا کا سارا تیز اسپاٹ لائٹس میں جگمگا رہا تھا۔ ہال میں موجود بڑے بڑے لوگ اس کی ایک ایک چیز کو وارفتگی سے دیکھ رہے تھے۔ اس کا گہرا ترین سیاہ چمک دار رنگ۔ ہر جوڑ پر نظر آنے والا بائیس قیراط کے سونے جیسا سنہرا رنگ' اس کے دروازوں کے ہینڈل، لائٹس کے آؤٹر فریم اور بعض ایکسٹرا خوب صورت پیسز اور ان پر کی گئی کارونگ اس گاڑی کو ایکسٹرا رائل لک دے رہے تھے۔

ایک گوشے میں روشن اسکرین لگی ہوئی تھی اور ساتھ ہی ایک بڑے روسٹرم کے پیچھے گہرے سوٹ میں ملبوس ایک شخص نیلامی کے اس سارے پروگرام کو بڑی خوب صورتی سے آگے بڑھا رہا تھا۔ بڑے بڑے لوگوں کے ایجنٹس اپنے مالکوں کی مرضی کے مطابق قیمتیں لگا رہے

تھے۔

''علی! اس دفعہ بھی اس ریئر ایڈیشن کی بڈنگ کا کنٹریکٹ تمہیں کیسے مل گیا؟ کیونکہ اس دفعہ تو پینکس گروپ لے اُڑا تھا یہ معاہدہ؟'' ایملی نے علی کے کان سے منہ لگا کر پوچھا تو وہ ہلکے سے ہنسا۔

''میں نے اس دفعہ انہیں ایک بڑی قیمتی ٹپ دے کر...... انہیں ایک بہت بڑے نقصان سے بچا لیا تھا...... اس لیے......''

''اچھا آ آ آ...... کیسی ٹپ؟''

''میں نے انہیں بتا دیا کہ ریئر ایڈیشن کے حفاظتی ہال کے گیٹس کی چابیاں غلط ہاتھوں میں جا چکی ہیں۔ بچانا چاہتے ہو تو پہلی فرصت میں سب گیٹوں کے تالے بدل ڈالو۔ انہوں نے پہلے تو میری بات کو دیوانے کی بڑ سمجھا پھر حفاظتی اقدام کے ساتھ خاموشی سے انتظار کیا کہ کیا ظہور پذیر ہوتا ہے اور واقعی جب کچھ مسلح لوگ وہاں داخل ہوئے اور گیٹس پر چابیاں لگاتے پکڑے گئے تو انہوں نے اگل بھی دیا کہ وہ ریئر ایڈیشن چرانے آئے تھے۔ تھوڑی دیر میں ہیلی کاپٹر بھی فضا میں آیا لیکن ناموافق حالات دیکھ کر واپس چلا گیا تو انہیں میری بات کا یقین آ گیا۔ وہ میرے ممنونِ احسان ہوئے اور بڈنگ کا کنٹریکٹ مجھے دے دیا۔'' علی ہلکے سے ہنسا۔

''او مائی گاڈ! یو آر سو اسمارٹ...... علی! اس دفعہ تو تمہارے بڑے وارے نیارے ہونے والے ہیں...... یہ ایڈیشن ریکارڈ قیمت میں بکنے والا ہے...... اور تمہارا کمیشن...... واؤ......'' ایملی بھی ہنسی۔

''فکر نہ کرو...... تمہیں بھی زبردست ٹریٹ دینے والا ہوں میں۔ میں اپنی خوشیوں میں اپنے دوستوں کو ضرور شامل کرتا ہوں۔ سو! تیار رہو۔''

پھر واقعی ایسا ہوا۔ وہ ایڈیشن ناقابلِ یقین قیمت دے کر ایک سعودی رائل فیملی کے شہزادے نے خرید لیا۔

علیز کنسلٹنٹ کو بھی ناقابلِ یقین کمیشن حاصل ہوا۔ اس دن آفس میں کام ایک گھنٹا پہلے ختم کر دیا گیا۔ سب بڑے ہال میں جمع تھے۔ ٹیبل پر ریئر ایڈیشن کی شکل کا کیک سجا ہوا تھا۔ پہلے کیک کاٹا گیا۔ کھانے پینے کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد آفس کے تمام لوگوں کو کمپنی کو ہونے والے بڑے فائدے میں سے اُن کا حصہ...... علی نے خود اپنے ہاتھ سے دیا۔ یہ خاصی بڑی رقم تھی۔ ہر شخص بے حد خوش تھا۔ سعدی کو بھی ایک بڑی رقم ملی تھی۔ نہ جانے کیوں یہ سب اسے خوشی دینے کے بجائے اندر ہی اندر جھلسا رہا تھا۔ وہ بڑی کوششوں سے اپنے آپ کو نارمل رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ عجب احمقانہ سی سوچ اس کے دل و دماغ میں پروان چڑھ رہی تھی کہ وہ ہر جگہ...... علی کے بجائے...... اپنے آپ کو دیکھنے کا خواہشمند ہو رہا تھا۔

آخر یہ بھی تو میرا جیسا ہی تھا۔ وطن میں ہم سب ساتھ تھے تو تقریباً ایک ہی جیسے تھے۔ پھر یہ اتنا آگے کیسے؟ اور میں اتنا پیچھے کیوں؟ ہر جگہ اس نے میری جگہ چھین لی ہے۔ زندگی کا اسٹینس، بہترین کاروبار، دولت حتیٰ کہ رانیہ بھی...... کیا مجھے حق نہیں کہ میرے پاس بھی یہ سب کچھ ہو...... مجھے یہ سب چاہیے...... کسی بھی قیمت پر...... کسی بھی قیمت پر...... کیسے بھی......

''مسٹر علی! میرے دوست! میری جان...... تمہیں یہ سب کچھ مجھے دینا پڑے گا...... میں یہ سب کچھ تم سے چھین لوں گا۔ چھین لوں گا میں......'' وہ دل ہی دل میں اپنے ارادے کو مضبوط کر رہا تھا۔ چہرے پر سنجیدگی اور آنکھوں میں کینہ پروری...... جبکہ ہونٹوں پر جبری تبسم لیے وہ وہاں سے جلد اٹھ گیا۔

☆☆☆

وہ بہت گہری نیند میں تھا۔ کیونکہ رات تک وہ اپنے سارے اثاثوں اور کھاتوں کا حساب کرتا رہا تھا اور آخرکار اس نے یہ فیصلہ بھی کر لیا تھا کہ اب اسے کہاں جانا ہے۔

جونی نے مجھے ایک لاکھ ڈالر میں خریدا تھا۔ میں دو لاکھ ڈالر اس کے منہ پر مار کر اپنے اور اپنی فیملی کے لیے آزادی خرید سکتا ہوں اور پھر جلد ہی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہاں سے کہیں بہت دور دنیا کے کسی پُرسکون گوشے میں اپنی فیملی کے ساتھ ایک اچھی زندگی گزاروں گا۔ ایسی زندگی جس میں جرم کی چھاپ نہ ہو۔ اعیان کا مستقبل روشن اور صاف ستھرا ہو۔'' وہ ایک فیصلے پر پہنچ جانے کے بعد پُرسکون ہو گیا تھا اور سکون کی اسی کیفیت میں وہ گہری نیند سو گیا تھا۔ نہ جانے کتنی دیر سویا ہو گا کہ دھواں دھار بارش نے اسے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں تو کمرے کے نیم روشن ماحول میں چار وردی والوں نے اسے گھیر رکھا تھا اور انہی میں سے ایک نے گلاس بھر کر پانی اس کے چہرے پر پھینکا تھا جس سے وہ بیدار ہوا تھا جس نے پانی پھینکا تھا وہ ہونٹوں پر انگلی رکھے اسے چپ رہنے کا اشارہ کرنے کے علاوہ بستر سے نکل آنے کا بھی کہہ رہا تھا۔ وہ کچھ حیران سا بستر سے باہر نکلا تو وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے کمرے

سے باہر لے آئے۔

''کیا مسئلہ ہے؟ مجھے اس طرح کیوں لے جایا جارہا ہے؟'' علی نے پوچھنے کی کوشش کی تو ایک پولیس والے نے پھرتی سے کالی چوڑی ٹیپ اس کے ہونٹوں پر چپکا دی۔ دوسرے نے ایک جیکٹ اس کے کاندھوں پر ڈالی اور بغیر کوئی جواب دیے اسے گاڑی میں اپنے ساتھ بٹھا کر لے گئے۔ اس ساری کارروائی کی برابر سوئی ہوئی رانیہ کو بھنک بھی نہیں پڑی۔

صبح قیامت خیز تھی۔ رانیہ حیران وہ پریشان تھی۔ اچانک علی غائب ہو گیا تھا۔ اس کا فون اور والٹ ٹیبل پر...... اور چپل بیڈ کے پاس پڑے تھے۔ وہ پورے گھر میں کہیں نہیں تھا۔ باہر کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ وہ بوکھلائی ہوئی پورے گھر میں اسے ڈھونڈ رہی تھی پر وہ کہیں نہیں تھا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کہاں چلا گیا تھا اور وہ اسے کہاں ڈھونڈے۔ کوئی راستہ نہ پا کر وہ روتی ہوئی بیسمنٹ کا دروازہ پیٹنے لگی۔

سعدی گہری نیند سے آنکھیں ملتا ہوا آیا اور دروازے پر رانیہ کو پریشان اور روتا دیکھ کر خود بھی پریشان ہو گیا۔

''کیا ہوا رانیہ؟ سب خیر تو ہے؟ اس طرح کیوں رو رہی ہو؟''

''وہ...... وہ علی...... نہ جانے کہاں غائب ہو گیا ہے؟ سارا گھر ڈھونڈ لیا میں نے...... وہ نہیں ہے۔ میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔ لگتا ہے اس کے ساتھ کچھ بہت غلط ہو گیا ہے۔ سعدی اسے ڈھونڈو...... پلیز! اسے تلاش کرو۔''

''ہاں...... ہاں مگر اتنی صبح؟ ابھی تو روشنی بھی پوری طرح نہیں ہوئی ہے۔ وہ کہاں چلا گیا ہے؟ مارننگ واک؟''

''نہیں، اس کے چپل بیڈ کے پاس پڑے ہیں۔ فون اور والٹ بھی سائڈ ٹیبل پر موجود ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اسے یہ چیزیں اٹھانے کا موقع ہی نہیں ملا ہے۔ کچھ بہت اچانک اور بہت جلدی میں ہوا ہے۔ سعدی! اسے ڈھونڈو...... کچھ کرو...... ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گی۔''

''فکر نہ کرو رانیہ! میں آکر دیکھتا ہوں۔ ہم پولیس کو فون کریں گے۔ وہ مل جائے گا۔ تم جب تک سوچو...... وہ کہاں جا سکتا ہے؟''

''وہ اس طرح اچانک...... مجھے بتائے بغیر...... سب کچھ چھوڑ کر...... خود سے نہیں جا سکتا۔ اسے لے جایا گیا ہے۔ کوئی اسے لے کر گیا ہے۔''

''اسے کون لے جا سکتا ہے رانیہ؟'' سعدی کے کان کھڑے ہوئے۔

''مجھے نہیں پتا۔ مجھے نہیں پتا۔'' رانیہ زور زور سے رونے لگی۔

''رانیہ! رومت پلیز! تمہارے آنسو مجھے تکلیف دے رہے ہیں۔ میں اسے تلاش کرتا ہوں لیکن کیوں نا ہم پولیس کو انفارم کردیں۔ وہ اسے تلاش کرلیں گے۔'' سعدی نے رانیہ کا کاندھا تھپکتے ہوئے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

پھر انہوں نے پولیس کو اطلاع دے دی۔ آفیسر ولیم کوہن اپنی ٹیم کے ساتھ فوراً ہی وہاں پہنچ گیا۔ وہ کافی دیر رانیہ سے سوال پوچھتا رہا۔ بیڈ روم اور گھر کا جائزہ لیتا رہا۔ پیروں کے نشان، انگلیوں کے نشانات، سب کچھ جمع کیا لیکن فی الوقت وہ کچھ بھی کہنے سے قاصر تھا۔

''مسز ایلی! پریشان نہ ہوں۔ ہم آپ کے شوہر کو تلاش کرنے کی پوری کوشش کریں گے لیکن معاملہ کچھ الجھا ہوا ہے۔ ہوسکتا ہے اس میں کچھ وقت لگے۔ لیکن ہم مسئلہ حل کرلیں گے۔ آپ کے شوہر مل جائیں گے۔'' اس نے رانیہ کی آنسو بھری سرخ آنکھوں میں جھانکتے ہوئے تسلی دی اور وہ چلے گئے۔

رانیہ کی سوچوں میں ایک طوفان برپا تھا۔ اسے کسی بھی طرح یقین نہیں آرہا تھا کہ علی اس طرح غائب ہو گیا ہے۔ اگر کہیں خود سے چلا گیا ہے تو کہاں اور کیوں گیا؟ اور اگر کوئی اسے اٹھا کر لے گیا ہے تو یہ کیسے ممکن ہوا؟ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ سوچ سوچ کر اس کی کنپٹیوں میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ کچھ بہت برا ہو گیا ہے لیکن کیا برا ہوا ہے؟ اسے کچھ اندازہ ہی نہیں ہو پا رہا تھا پھر اسے اچانک خیال آیا کہ اس مسٹری کا شاید کوئی سرا اس کے آفس سے مل پائے۔ اسے وہاں جانا چاہیے۔ جلدی جلدی اس نے اعیان کی ضرورت کی چند چیزیں گاڑی میں رکھیں اور ڈیٹرائٹ روانہ ہو گئی۔ ہائی وے فور... او ون پر ڈرائیو کرتی ہوئی وہ چالیس منٹ میں ڈیٹرائٹ ڈاؤن ٹاؤن بلڈنگز میں ہیورٹ پلازا کی پارکنگ میں پہنچ گئی۔

''علیز کنسلٹنٹ'' میں حسب معمول آفس کی سرگرمیاں جاری تھیں۔ وہ اعیان کی انگلی تھامے علی کے آفس کی طرف بڑھی تو مختلف آوازیں سنائی دیں جو اسے مخاطب کررہی تھیں۔

''ہائے، مسز ایلی!'' مگر وہ کچھ بھی سننے اور سمجھنے سے

قامر تھی۔ شیشے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تو علی کی خالی کرسی دیکھ کر اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ وہ لڑکھڑائی مگر اپنے آپ کو سنبھالتی ہوئی صوفے پر بیٹھ گئی۔

پھر ایک ایک کر کے مختلف لوگوں کو اندر بلا کر ملتی رہی اور ان سے پوچھتی رہی کہ کوئی غیر معمولی بات جو انہوں نے نوٹ کی ہو مگر کہیں سے کوئی خاطرخواہ جواب نہ مل سکا۔ وہ مایوسی سے سر پکڑے بیٹھی تھی کہ احسان کی آمد ہوئی۔ رانیہ نے سر اٹھا کر دیکھا تو اس کے چہرے کے تاثرات نے احسان کو چونکا دیا۔

''سب کچھ ٹھیک ہے نا بھابی! آپ اِس وقت یہاں؟ اور علی کہاں ہے؟''

''اسی سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے ہی تو یہاں آئی ہوں۔ سب سے پوچھ پوچھ کر تھک گئی ہوں۔ کوئی نہیں بتا تا کہ علی کہاں ہے؟''

''کیا مطلب؟ کیا وہ غائب ہو گیا ہے؟ آپ کو کچھ بتائے بغیر؟'' احسان نے گھبرا کر پوچھا تو رانیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

''دیکھو احسان! تم اس کے بچپن کے دوست ہو...... بھلا بُرا وقت تم دونوں نے ساتھ کاٹا ہے۔ تمہیں اسی دوستی کا واسطہ...... خدا کے لیے مجھے بتا دو...... کہ علی کہاں ہے...... پلیز۔''

''بھابی! ایسا مت کہیے اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں آپ کو پہلی فرصت میں بتا دیتا۔ میں تو خود بوکھلا گیا ہوں اس کے غائب ہونے کی خبر سن کر۔''

''مجھے پتا نہیں کیوں ایسا لگتا ہے کہ علی کی زندگی کا کوئی حصہ ہے جو اس نے مجھ سے پوشیدہ رکھا ہوا ہے۔ پچھلے دنوں کئی بار اس کو شدید چوٹیں لگیں اگرچہ اس نے انہیں ایکسیڈنٹ کا نتیجہ کہا لیکن مجھے اندازہ ہوا کہ وہ چوٹیں کسی بھاری بھرکم مار پیٹ کا نتیجہ تھیں۔ کس سے اُس کے کیا جھگڑے چل رہے تھے۔ اس نے مجھے کبھی نہیں بتایا۔ کہیں کسی نے دشمنی میں ہی تو اسے نہیں اٹھا لیا۔ اگر ایسا ہوا تو اس وقت وہ نہ جانے کن عذابوں سے گزر رہا ہوگا۔ میرے دل کو قرار نہیں آرہا ہے۔ پلیز احسان! اس کے بارے میں پتا کرو...... کہاں ہے وہ اس وقت...... کس حال میں ہے۔'' وہ روہانسی ہو گئی۔

''بھابی! حوصلہ رکھیں۔ مل جائے گا وہ۔ ہم تلاش کر لیں گے اُسے...... فکر نہ کریں۔'' احسان نے تسلی دینے کی کوشش کی مگر رانیہ کے آنسو آنکھوں میں رک نہ سکے۔

''یتیم''

یتیم لڑکے کے دودھ جیسے اجلے کپڑوں کی طرف دھیان سے دیکھتے ہوئے جگو نے پوچھا۔

''تو اسکول جاتا ہے؟''

''ہاں! یتیم خانے کے سارے بچے جاتے ہیں۔''

''بڑا قسمت والا ہے تو!'' جگو نے اسے حسرت سے دیکھا۔

''یتیم کے ساتھ مذاق نہیں کرتے۔'' لڑکا دکھ سے بولا۔

''تو قسمت والا ہے پیارے! میرے پاس نہ تیرے جیسے کپڑے ہیں نہ میں اسکول جا سکتا ہوں۔'' جگو کی آنکھیں بھر آئیں۔

''تو اسکول نہیں جاتا؟ پھر سارا دن کیا کرتا ہے؟'' یتیم لڑکے نے حیرانی سے پوچھا۔

''ہوٹل میں برتن مانجھتا ہوں۔''

''تو...تو یتیم خانے میں کیوں نہیں آ جاتا؟''

''جی تو بہت چاہتا ہے لیکن وہ لوگ مجھے رکھتے نہیں۔''

''کیوں...؟'' یتیم حیران تھا۔

''میرے ماں، باپ جو زندہ ہیں۔''

(ہندی پنجابی ادب۔ شیام سندر اگروال)

(انتخاب: محمد الیاس چوہان، کراچی)

احسان بھی آزردہ ہو گیا۔

''احسان! سوچو...... ذہن پر زور دو کہ مجھے کس سے علی کے بارے میں کچھ معلوم ہو سکتا ہے، کون بتا سکتا ہے کہ علی کہاں غائب ہو گیا ہے۔ پلیز سوچو...... میرا تو ذہن سوچ سوچ کر تھک چکا ہے۔ مجھے کوئی راستہ سجھائی نہیں دے رہا ہے۔'' رانیہ نے دونوں کنپٹیاں ملیں۔

''بھابی! ایک ہے۔ ایک شخصیت ہے جو شاید آپ کو بتا پائے۔'' احسان نے کچھ سوچتے ہوئے رانیہ سے کہا تو وہ بے چین ہو گئی۔

''کون احسان؟ کون ہے وہ پلیز جلدی بتاؤ۔''

''ایملی...... ایملی شاید جانتی ہو کچھ...... آپ اس سے بات کر کے دیکھیں۔''

''ایملی کا فون نمبر ہے تمہارے پاس؟''

''نہیں، لیکن شاید علی کے فون میں ہو۔ آپ تلاش کر لیں۔'' احسان کی بات سن کر رانیہ نے علی کا فون کھنگال ڈالا۔

''او یس...... ہے نمبر...... میں کال کرتی ہوں۔ ہیلو...... ہیلو ایملی! ہاں میں رانیہ، ابھی اور فوراً تم سے ملنا چاہتی ہوں۔ اِٹس این ایمرجنسی...... پلیز...... نہیں ابھی اور

اسی وقت...... میں انتظار نہیں کرسکتی، پلیز ابھی آجاؤ علی کے آفس میں تمہارا انتظار کررہی ہوں میں۔''

''وہ آرہی ہے۔'' اس نے فون بند کرتے ہوئے احسان کو بتایا۔ پھر پندرہ منٹ کے بعد ہی ایملی آفس میں داخل ہوئی۔

''ہیلو رانیہ! سب ٹھیک ہے نا؟ اعیان ٹھیک ہے؟'' اس نے کچھ پریشان ہوکر پوچھا تو رانیہ کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔

''نہیں کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے۔ علی کل رات سے غائب ہے۔ میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئی ہوں۔ نہ مجھے اس کا کچھ پتا چل رہا ہے اور نہ ہی کسی اور کو کچھ معلوم ہے۔''

''اوہ...... کب اور کیسے غائب ہوا؟''

''رات ہم دونوں سوئے تھے۔ کسی وقت میری آنکھ کھلی تو وہ بیڈ پر نہیں تھا۔ میں نے سمجھا کہ شاید وہ باتھ روم میں ہوگا میں دوبارہ سوگئی پھر تھوڑی دیر بعد ایک بھیانک خواب سے ڈر کر اٹھی تو وہ تب بھی نہیں تھا...... پھر میں نے اٹھ کر اسے ہر جگہ ڈھونڈا مگر وہ مجھے ابھی تک نہیں ملا۔ اس کا فون...... والٹ اور چپل تک ویسے ہی اپنی جگہ پر پڑے تھے لیکن بس وہ نہیں تھا۔'' رانیہ رو پڑی تو ایملی نے آگے بڑھ کر گلے لگایا۔

''اچھا...... گھر کا دروازہ بند تھا یا کھلا ہوا تھا؟''

''بند تھا لیکن اس میں آٹومیٹک لاک ہے۔ تھوڑا ٹرکی ہے۔ لیکن کوئی ماہر اسے کھول بھی سکتا ہے۔ اور بند بھی کرسکتا ہے۔''

''او مائی گاڈ! تم نے پولیس کو اطلاع دی؟'' ایملی نے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''کوئی پروگریس؟'' دوسرے سوال پر رانیہ نے نفی میں سر ہلایا۔

''اوور...... اوکے رانیہ، میں اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ میرے اپنے ذرائع ہیں۔ تم فکر نہ کرو۔ میں بہت جلد اس کا پتا ڈھونڈ نکالوں گی۔ اللہ نے چاہا تو علی بہت جلد ہمارے درمیان ہوگا۔ اچھی امید رکھو...... میں پوری کوشش کروں گی اور تم بھی حوصلے سے کام لو...... سب ٹھیک ہوجائے گا۔

''مجھے ابھی سے اپنے کام کا آغاز کرنا ہے۔ اس لیے میں یہاں زیادہ دیر رک نہیں سکتی۔ ویسے بھی ایک گھنٹے کی چھٹی لے کر آئی تھی۔ واپس پہنچنا ہے اطمینان رکھو۔ میں جلد اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ اطلاع ڈھونڈ نکالوں گی۔

اوکے...... بائے۔'' وہ تسلی دے کر چلی گئی۔

☆☆☆

کئی دن گزر چکے تھے۔ علی کے بارے میں کوئی خبر، کوئی اطلاع اب تک نہیں مل پائی تھی۔ اس کی پریشانیاں، اس کے دکھ بڑھتے جارہے تھے۔ اسے لگ رہا تھا وہ کسی اندھیرے جنگل میں راستہ بھٹک چکی ہے اور لاکھ کوششوں کے باوجود وہاں سے نکل نہیں پارہی ہے۔ پھر زندگی کے بہت سے مسئلے مسائل نے اسے گھیر کر بوکھلا دیا تھا۔ اسے شدت سے احساس ہوا کہ علی نے اسے کس قدر خوب صورت تحفظ دیا ہوا تھا کہ اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ زندگی کے ساتھ کتنے مسئلے ہوتے ہیں۔ گھر کے، آفس کے، بچے کے، اور نہ جانے کیا کیا۔

سعدی نے بہت سہارا دیا تھا۔ بہت خیال رکھا تھا اس کا اور اعیان کا۔ اس کی خود فراموشی کو مختلف طریقوں سے توڑنے کی کوششیں کی تھیں اُس نے۔

''رانیہ! تم پریشان نہ ہو۔ سارے مسئلوں کو میں ہی حل کروں گا۔ تم دونوں نے دوست ہونے کے ناتے مجھ پر بڑے احسان کیے ہیں۔ اب ان کو چکانے کا وقت آیا ہے تو میں پیچھے نہیں ہٹوں گا۔'' وہ اس کے قریب بیٹھا اسے تسلی دینے کی کوشش کررہا تھا تو نہ جانے کیوں اس کا لہجہ، اس کے الفاظ...... وہ تاثر نہیں دے رہے تھے جو اصولی طور پر دینا چاہیے تھا مگر رانیہ نے اپنی پریشان خیالی کے سبب اسے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ یہ بے چارہ تو میرا اتنا زیادہ خیال رکھ رہا ہے۔ مجھے اس پر شک نہیں کرنا چاہیے۔ رانیہ کو خیالوں میں گم دیکھ کر سعدی نے اعیان کو گود میں اٹھایا۔

''چلو بڈی! ہم لان میں فٹ بال کھیلتے ہیں۔'' وہ اعیان کو لے کر باہر نکل گیا۔

''رانیہ! آفس کے معاملات تو میں سنبھال رہا ہوں لیکن سیلری بلز پر اور کچھ اور پیپرز پر علی کے سائن بہت ضروری ہیں۔ وہ تو ہے نہیں۔ میں نے اپنے آفیشل لائر سے پوچھا تھا۔ اس نے بتایا کہ علی کے بعد تم اس کا اختیار رکھتی ہو۔ تو...... یا تو اب تم اس کا آفس آکر سنبھالو...... یا پھر پاور آف اٹارنی دے دو۔'' سعدی نے رانیہ سے کہا۔

''پاور آف اٹارنی؟ کس کو دے دوں؟''

''اگر بھروسا ہو...... تو مجھے...... ورنہ جس کو چاہو......'' سعدی نے نظریں جھکا کر کہا تو اس نے پُرخیال نظروں سے اسے دیکھا۔

''او کے، سوچتی ہوں کہ کیا کرنا ہے؟'' رانیہ نے ٹال دیا۔ اسے دنیا اس قدر ناقابلِ اعتبار لگنے لگی تھی کہ ہر چیز پر شک کرنا اس کی عادت بنتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ سعدی جیسے پرانے دوست کے خلوص پر بھی اسے نہ جانے کیوں شک ہونے لگا تھا۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ سعدی کی کوششوں کا مطمع نظر...... علی کو تلاش کرنے کے بجائے...... اس کے کاروبار کو سنبھالنے...... اس کے گھر کے معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے لینے تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ چیز اب اسے کچھ تکلیف دہ محسوس ہونے لگی تھی۔ ایک دن سعدی نے گھر کے بلز کی پیمنٹ کے بارے میں پوچھا تو رانیہ سے برداشت نہیں ہوا۔

''دیکھو سعدی! میں نے اپنی جس پریشانی کی خاطر تم سے مدد چاہی ہے، وہ علی کی تلاش ہے۔ میں چاہوں گی کہ تمہاری کوششوں کا فوکس اسی پر رہے۔ باقی معاملات اتنے اہم نہیں ہیں۔ وہ میں دیکھ لوں گی۔ پلیز! علی کو تلاش کرو۔''

''رانیہ! وہ کام میں کر رہا ہوں۔ جتنی میری صلاحیت ہے اسی حساب سے میں اس کو تلاش کر رہا ہوں۔ انشاء اللہ جلد اس کا پتا چل ہی جائے گا۔ لیکن اس کی غیر موجودگی میں تمہیں اور اعیان کو بھی کوئی پریشانی نہ ہو، اس کی کوششیں کرتا رہتا ہوں۔'' سعدی نے سنجیدہ لہجے میں کہا اور باہر چلا گیا۔ اسے یونیورسٹی جانا تھا۔

رانیہ نے کچھ سوچتے ہوئے اعیان کو لے کر ڈیٹرائٹ کا رخ کیا۔ وہ اس کے آفس کو اچھی طرح چھان پھٹک کر دیکھنا چاہتی تھی۔ شاید وہاں سے علی کے غیاب کا کوئی سراغ مل سکے۔

موسم بدل گیا تھا۔ بہار کے آثار نظر آنا شروع ہو گئے تھے۔ برف پگھل کر ہٹی تو مٹی سے سبز کونپلوں نے سر اٹھایا تھا اور اب ان میں پیلے پیلے پھول کھل کر فضا کو آراستہ کر رہے تھے۔ ٹنڈ منڈ درختوں کی شاخیں بھی ہرے شگوفوں سے بھر گئی تھیں۔ سارا ماحول نو دمیدہ غنچوں سے کھل اٹھا تھا۔ بس ایک اس کے دل کا نگر تھا جو بدترین خزاں کی لپیٹ میں آیا ہوا تھا۔

وہ آفس میں علی کی ٹیبل کی ایک ایک دراز، ایک ایک الماری اور فائلوں کو دیکھ رہی تھی۔ تین گھنٹے کی محنت کے باوجود جب وہ کوئی سراغ نہ پاسکی تو تھک کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے ابل پڑے تھے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ چیخ چیخ کر رو پڑے۔ اتنے میں اس کا سیل فون گنگنایا۔ ایملی کا فون تھا۔

''رانیہ! ہاں، میں ایملی...... تم سے ملنا چاہتی ہوں۔ کہاں ہو؟ اچھا 'علیز' میں ہو...... ٹھیک ہے میں دس منٹ میں پہنچ رہی ہوں۔''

پھر ایملی آ گئی۔ اس نے رانیہ کی روئی روئی آنکھوں میں دیکھا۔ تسلی کے لیے اس کا ایک ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر تھپتھپایا۔

''رانیہ! تم بہت بہادر اور باحوصلہ ہو لیکن میرا خیال ہے کہ تمہیں اس سے بھی زیادہ بہادر اور باحوصلہ بننا پڑے گا۔ کیونکہ جو خبر میں تمہیں سنانے والی ہوں...... شاید تمہارے لیے زیادہ تکلیف دہ ہو گی۔'' ''رانیہ! علی کے بارے میں معلوم ہو گیا ہے۔ وہ امریکا میں نہیں ہے بلکہ کینیڈا میں بھی نہیں ہے۔''

''تو...... تو پھر...... کہاں ہے؟'' رانیہ کا چہرہ ستّ گیا اور وہ بدترین اندیشوں میں گھری ایملی کو دیکھ رہی تھی۔

''وہ تمہارے ملک میں ہے۔'' ایملی نے بتایا۔

''ہمارے ملک میں؟ وہاں کیا کرنے گیا ہے وہ؟''

''وہ وہاں گیا نہیں...... لے جایا گیا ہے۔ وہاں کی پولیس نے یہاں کی پولیس سے ریکویسٹ کی تھی۔ کیونکہ سنا ہے کہ وہ وہاں بہت ہائی پروفائل مجرم ڈکلیئر کیا گیا تھا اور وہاں سے چوری چھپے فرار ہو کر یہاں آ گیا تھا۔ پولیس کو وانٹڈ تھا۔ چنانچہ یہاں کی پولیس نے خاموشی سے اسے اٹھا کر خفیہ طور پر اسے ڈی پورٹ کروا دیا۔ سنا ہے یہاں بھی وہ غیر قانونی طریقے سے آیا تھا اور ایک معزز شہری بن کر رہ رہا تھا۔ یہ یہاں کی پولیس اور سیکیورٹی کی ناکامی تھی اس لیے انہوں نے بھی اپنی ساکھ بچانے کے لیے اسے خاموشی سے تمہارے ملک کی پولیس کے حوالے کر دیا۔'' ایملی نے رانیہ کے سفید ہوتے چہرے کو غور سے دیکھا اور دوبارہ تسلی دینے کی کوشش کی۔

''رانیہ! علی اسمارٹ ہے۔ وہ کوئی نہ کوئی راستہ نکال لے گا۔ وہ ایسے مسائل سے لڑنے کا فن جانتا ہے۔ وہ اپنے راستے کی ساری مشکلوں کو روندتا ہوا...... ایک نہ ایک دن یہاں ضرور آ جائے گا اس لیے کہ یہاں تم ہو...... اعیان ہے...... اس کی زندگی کی سب سے بڑی ترجیحات۔''

''نہیں...... نہیں...... اب وہ یہاں نہیں آ سکتا۔ نہیں آ سکتا۔ یہاں کی پولیس نے اسے بھیڑیوں کے حوالے کر دیا ہے۔ وہ اس کی بوٹیاں نوچ کر کھا جائیں گے۔ وہ اسے کبھی نہیں چھوڑیں گے، کبھی نہیں۔'' رانیہ بُری طرح سسک اٹھی۔

''رانیہ! پلیز پریشان مت ہو...... ہمت اور حوصلے سے کام لو...... بتاؤ! میں تمہارے لیے کیا کرسکتی ہوں؟'' ایملی نے نم لہجے میں پوچھا۔

''اب کوئی کچھ نہیں کرسکتا...... اب مجھے ہی کچھ کرنا ہو گا۔ میں خود وہاں جاؤں گی اور دیکھوں گی کہ کیا کرسکتی ہوں؟'' رانیہ آنسو پونچھ کر بولی تو اس کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔ وہ کسی فیصلے پر پہنچ چکی تھی۔

ایملی جا چکی تھی۔ رانیہ نے اکاؤنٹس منیجر کو بلوایا۔ کمپنی کے آمدنی اور خراجات کے متعلق مختصراً پوچھا اور اس کے ساتھ ہی باہر نکل آئی۔

''ہیلو ایوری بڈی! مسز علی سب سے کچھ کہنا چاہتی ہیں۔'' منیجر کے اعلان پر سب اپنے اپنے کیوبیکلو سے نکل کر ان کے سامنے آکر کھڑے ہوگئے۔

''میں جانتی ہوں، علی نے اپنے اور آپ لوگوں کے درمیان کبھی مالک وملازم والا رشتہ نہیں رکھا۔ اس نے ہمیشہ آپ سب کو بھی بہت نوازا ہے۔ یہ کمپنی آپ سب کا گھر ہے اور آپ سب اس گھر میں رہنے والے افراد...... اور شاید سب کو معلوم ہوگا کہ گھر پر اگر کوئی مشکل آپڑے تو تمام افراد اسے بچانے کی اپنی سی پوری کوشش کرتے ہیں۔ مجھے آپ سب سے بھی یہی امید ہے۔'' رانیہ نے رک کر سب کے چہروں کی جانب دیکھا۔

''گھر کا سربراہ کسی بہت بڑی مشکل میں گرفتار ہو کر...... فی الحال لاپتا ہو چکا ہے اور میں اس کی تلاش میں جارہی ہوں۔ آپ لوگوں کی تین ماہ کی سیلری کے چیک سائن کر کے...... اکاؤنٹس ڈپارٹمنٹ کو دے کر جارہی ہوں۔ تاکہ آپ سب کو سیلری وقت پر ملتی رہے۔ اگر قسمت نے یاوری کی تو انشاء اللہ...... ہم سب دوبارہ ساتھ ہوں گے۔ علی کے لیے آپ سب سے دعا کی خواستگار ہوں۔'' رانیہ نے آنسو بھرے لہجے میں بات ختم کی تو ان کے آفس بوائے فریڈ نے پوچھ ہی لیا۔

''میم! مسٹر علی کہاں چلے گئے ہیں؟''

''کوئی نہیں جانتا۔'' رانیہ نے جواب دے کر رخصت لی اور اعیان کو لے کر واپس ونڈسر چلی آئی۔ اپنے گھر کے داخلی حصے پر ایک لمحہ گاڑی روک کر اس نے اس خوب صورت پلیٹ پر نظر ڈالی جو ایک چھوٹے سے سنگی ستون پر آویزاں تھی۔

''رانیاز - 147 تھیروِن چرچ روڈ'' خوب صورت سرسبز پس منظر میں ہلکے بھورے رنگ کی وہ ولا نما عمارت اس کے خوابوں کا محل تھا اور یہ محل اس کے خوابوں کے شہزادے نے اس کو خرید کر دیا تھا۔

اس کے برتھ ڈے پر ایک خوب صورت گتے کے ڈبے میں سلک کی پیکنگ میں ایک چابی اسے تحفے کے طور پر دیتے ہوئے علی نے کہا تھا۔ ''میرے دل پر راج کرنے والی ملکہ کے لیے...... اس کا راج محل...... اس کی آمد کا منتظر ہے۔ اگر اجازت ہو تو ملکۂ عالیہ کو وہاں تک لے جانے کا اعزاز حاصل کرلوں۔'' وہ زور سے ہنسی تھی۔

''اتنی گاڑھی اردو...... لفظ بہت بھاری بھرکم ہیں لیکن مطلب بڑا سادہ اور اس میں چھپے جذبات نہایت خوب صورت اور دلربا ہیں۔ اس لیے جواب میں یہی کہا جا سکتا ہے۔ چلو دلدار چلو۔ چاند کے پار چلو۔ ہم ہیں تیار چلو......''

وہ دونوں ہنستے ہوئے اپارٹمنٹ سے نکلے اور اس ولا تک آئے تو رانیہ تو باہر ہی سے اس کی خوب صورتی دیکھ کر مبہوت ہوگئی۔

اندر پہنچ کر اس چابی سے اس نے دروازہ کھول کر اندر قدم رکھا تو ناقابلِ یقین کیفیت میں گھر گئی۔

''علی! یہ تم نے میرے لیے خریدا ہے؟'' اس نے سرسراتے لہجے میں پوچھا تو وہ مسکرا کر اس کی طرف دیکھتا رہا۔ یہ سب کچھ اس کے تصور سے بھی بڑھ کر تھا۔ آج یہ سب یاد کر کے اس کا دل بھر بھر آرہا تھا۔ وہ ٹوٹے ہوئے زخمی دل کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ اعیان کو اس کے کمرے میں سلا کر وہ اپنے بیڈ روم میں آگئی۔ کاؤچ پر بیٹھ کر اس نے حقیقت کی سنگینی کے تحت اپنا لائحہ عمل ترتیب دینے کی کوشش کی۔ پھر اٹھ کر اسٹڈی میں آگئی۔ کمپیوٹر پر اپنا بینک بیلنس اپنے اسیٹس وغیرہ چیک کیے۔ وہ زیادہ سے زیادہ پیسا لے کر اپنے ملک جانا چاہتی تھی۔ تاکہ علی کو بچانے کے لیے اگر اسے سب کچھ خرچ کرنا بھی پڑے تو کہیں کوئی کمی نہ ہو۔

☆☆☆

دوپہر ڈھل رہی تھی اور شام کے سائے گہرے ہورہے تھے۔ جب وہ ایک طویل سفر کے بعد اپنے ملک پہنچی تھی۔ ائرپورٹ سے باہر نکلتے ہی گردآلود گرم ہواؤں نے اس کا استقبال کیا تھا۔ وہ اعیان کا ہاتھ پکڑے کھڑی تھی اور جائزہ لے رہی تھی کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ پھر پورٹر کے مشورے پر اس نے وہیں سے ایک ہوٹل میں کمرا ریزرو کروایا اور ٹیکسی لے کر روانہ ہوگئی۔

اگلے دن وہ اس سیاسی پارٹی کے ہیڈ کوارٹر پہنچ گئی جس سے کبھی علی کا تعلق رہا تھا بلکہ اب بھی یہ تعلق برقرار تھا۔

کیونکہ وہ اسی سے وابستگی کی سزا بھگتنے کے لیے یہاں لایا گیا تھا۔

اس کے سامنے ٹیبل کے اس پار جو شخص بیٹھا تھا، وہ گہری نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ رانیہ کے سوالات ختم ہوئے تو اس نے ٹھہری ہوئی آواز میں بولنا شروع کیا۔

''دیکھیے مسز علی! وہ ہمارا بھی اثاثہ ہے۔ اس کی ہمیں بھی بہت زیادہ فکر ہے۔ بے شک وقت اور حالات بدل چکے ہیں۔ ہم بہت زیادہ آزمائشوں اور سختیوں کا سامنا کر رہے ہیں لیکن پھر بھی ہم نے اسے تنہا نہیں چھوڑا ہوا ہے۔ ہمارا لائرز کا پورا ایک پینل ہے جو اس کی قانونی مدد کر رہا ہے اور جیل میں بھی اس کا خیال رکھا جارہا ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں...... اچھی امید رکھیں۔''

''میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔'' رانیہ نے التجا کی۔

''ہم پوری کوشش کریں گے۔''

''میں آج ہی ان لائرز سے بھی ملنا چاہتی ہوں جو اس کا کیس لڑ رہے ہیں۔ پلیز! میں صورتِ حال جاننا چاہتی ہوں۔''

''اوکے! میں انتظام کروا دیتا ہوں۔'' اس نے ایک دو فون کیے پھر انٹرکام کے ذریعے کسی یاسر کو بلوایا۔

''میم کو یزدانی صاحب کے پاس لے جاؤ۔'' وہ یزدانی صاحب سے بڑی دیر تک علی کا کیس سمجھنے کی کوشش کرتی رہی اور بے انتہا مایوس ہوئی۔ کیونکہ بقول ان کے وہ لاکھ کوششوں کے باوجود علی کے لیے اسے کوئی اچھی امید نہیں دلا سکتے۔

وہ نہ جانے کتنے دن دھکے کھاتی رہی اور اس پر عجیب عجیب حیرت انگیز انکشافات ہو رہے تھے۔ یہاں علی کو... نہ جانے کتنا بڑا دہشت گرد...... مجرم اور قاتل گردانا جا رہا تھا۔ اس پر بے شمار الزامات تھے جن سے بچنے کے امکانات معدوم تھے۔ پچاس لاکھ روپے خرچ کر کے اور نہ جانے کس کس کی منت سماجت کر کے اس نے علی سے ملنے کی اجازت حاصل کی تھی۔

''جس قدر لمبی فہرست میرے حساب میں لکھی گئی ہے۔ مجھے خود علم نہیں کہ وہ مجھ سے کب سرزد ہوئے۔ مجھے ناکردہ جرائم میں پھانسا گیا ہے اور یہ کام میرے کسی بہت ہی قریبی...... میرے اپنے نے کیا ہے۔ وہاں یو ایس میں اس نے میرے بارے میں پولیس کو انفارمیشنز دیں اور انہوں نے مجھے خاموشی سے میرے بیڈ روم سے اٹھایا اور یہاں اس جیل میں لا پھینکا۔ تم یہاں کیوں آگئیں رانیہ؟ میں جانتا ہوں اب میری واپسی کبھی نہیں ہوگی۔ تم اعیان کو لے کر واپس چلی جاؤ۔ اس کو اچھی تعلیم و تربیت دینا اب صرف تمہاری ذمّے داری ہے۔ اسے ایک اچھا بلکہ بہت اچھا انسان تم ہی بناؤں گی۔ واپس جاؤ اور مجھے بھول جاؤ۔''

''علی! تم واقعی بہت بُرے ہو۔ بجائے میری ہمت بندھانے کے مجھے مایوسی کی طرف دھکیلنے کی کوشش کر رہے ہو۔ تمہارے بغیر میں کیسے جیوں گی...... تم نے نہیں سوچا؟'' اس نے بہتے آنسوؤں کے ساتھ غصے کے اظہار کے لیے اس کے بازو پر دو تین مُکّے رسید کیے تو وہ شکستہ دلی سے مسکرایا۔

''میں تمہیں حقائق سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ اندھیروں میں رہو گی تو ٹھوکر لگے گی۔ اس سے بچانا چاہتا ہوں، واپس چلی جاؤ۔''

''نہیں، میں تمہیں اس طرح چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔ میں آخری حد تک کوشش کروں گی۔'' رانیہ نے حتمی لہجے میں جواب دیا۔

''بس تھوڑے ہی دن ہیں...... فیصلہ ہونے والا ہے...... کہانی ختم ہو جائے گی پھر تو جانا ہی ہے۔'' علی نے کہا تو رانیہ سے ضبط نہیں ہوا۔ وہ چیخ چیخ کر رو پڑی۔

☆☆☆

اس دن کورٹ میں پیشی کا امکان تھا۔ امید تھی کہ علی کو بھی لایا جائے گا۔ وہ دس بجے کے قریب ہوٹل سے نکلی۔ وہ اور اعیان فٹ پاتھ پر کھڑے ٹیکسی کا انتظار کر رہے تھے کہ ایک سفید کار ان کے قریب آکر رکی۔

''آیئے میم!'' ایک آواز آئی۔ اس نے حیرت سے دیکھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر سعدی بیٹھا تھا۔

''تم؟ اور یہاں؟'' اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

''ہاں، تم وہاں سے بغیر کچھ بتائے آگئیں۔ میں پریشان ہو گیا تھا کہ یہاں کے اتنے مسئلے مسائل سے تم اکیلے کس طرح نمٹ پاؤ گی اس لیے میں بھی آگیا۔''

''لیکن تم کیا کر پاؤ گے؟'' رانیہ نے بدمزگی سے پوچھا۔

''تمہاری مدد تو کر پاؤں گا ناں...... بس...... میں تمہارا ساتھ دینا چاہتا ہوں۔'' اس کا جواب سن کر رانیہ خاموش ہو گئی۔ وہ کورٹ پہنچ گئے۔ یزدانی صاحب کی ٹیم وہاں موجود تھی۔ وہ سیدھی انہی کی طرف بڑھ گئی۔

''کیا علی کو لے کر آگئے وہ لوگ یزدانی صاحب؟'' اس نے بے تابی سے پوچھا تو انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

''آتے ہوں گے...... تھوڑی دیر میں۔'' یزدانی نے

گھڑی دیکھتے ہوئے سعدی کو گہری نظروں سے گھورا تو رانیہ نے بتایا۔
''علی کا دوست...... سعدی...... میرے ساتھ ہے۔''
یزدانی سر ہلاتے ہوئے فون کی طرف متوجہ ہو گیا جو بجنا شروع ہو گیا تھا۔
''ہاں بھئی! اچھا، مگر کیوں؟ او کے۔'' انہوں نے بات ختم کی اور رانیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''آج ان کی پیشی نہیں ہو گی کیونکہ ان کا آئی او...... یعنی تفتیشی افسر بیمار ہو کر چھٹی پر چلا گیا ہے۔ دیکھیں، اب اگلی تاریخ کب کی ملتی ہے۔'' رانیہ کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی۔ وہ وہاں سے چل دی۔
''میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں رانیہ۔'' سعدی نے پیشکش کی تو اس نے ہاتھ اٹھا کر منع کر دیا۔
''نہیں، میں اور اعیان کچھ دیر کے لیے اکیلے رہنا چاہتے ہیں۔ پلیز۔'' وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ آہستہ بیرونی گیٹ کی جانب چل دی۔
دو دن سے وہ ہوٹل کے کمرے میں بند تھی۔ اس نے علی سے ملنے کی درخواست دی ہوئی تھی جو بوجوہ ابھی تک منظور نہیں ہوئی تھی۔ اسے کوئی راہ سجھائی نہیں دے رہی تھی۔ کچھ اور لائرز سے اس نے اسی سلسلے میں قانونی مشاورت کی تھی۔ لیکن یہ اس قدر ہائی پروفائل کیس تھا کہ دونوں طرف سے ہاتھی لڑ رہے تھے۔ سیاسی پارٹی نے پورا پینل فراہم کیا ہوا تھا اس کیس کے لیے اور دوسری جانب بھی چوٹی کے قانون داں تھے۔
رانیہ کو یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ اس کا اس قدر محبت کرنے والا...... نرم دل اور خوش مزاج شوہر اتنا بڑا مجرم ہو سکتا ہے۔ وہ سب جھوٹ اور بکواس الزامات تھے جو اس پر لگائے جا رہے تھے۔ اس کا دل کہتا تھا کہ علی ایسا نہیں ہے۔ یہ صرف یہاں کی گندی سیاست ہے جس کی پھیلائی ہوئی دلدل میں وہ پھنس گیا ہے لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اس کے دل کی عدالت کے فیصلے کو یہاں کی عدالت نہیں مانتی تھی۔ وہ کیا کرے؟ کہاں جائے؟ اب مایوسی اس کو گھیرنے لگی تھی۔
سعدی نے بھی اسی کے ہوٹل میں کمرا لے لیا تھا اور اکثر و بیشتر وہ اس سے مل کر علی کے کیس کے بارے میں تازہ ترین اپ ڈیٹس پر بات کرتا رہتا تھا۔ اسے اپنی بھاگ دوڑ کے بارے میں بتاتا رہتا کہ وہ کیا کیا کوششیں کر رہا ہے اور رانیہ غائب دماغی اور مایوسی کی کیفیت میں سنتی رہتی۔ لاکھ کوششوں کے باوجود ناامیدی اسے آہستہ آہستہ توڑ رہی تھی۔
ایک دن اسے خیال آیا کہ اس کا اپنا شہر ہے۔ یہاں اس کا پنا ایک گھر ہے۔ تایا کا خاندان تو آباد ہو گا یہاں۔ اسے ایک مرتبہ تو جانا چاہیے وہاں۔ یہ خیال اسے اپنے تایا زاد شہریار خان کی تصویر اخبار میں دیکھ کر آیا تھا۔ اس تصویر سے اندازہ ہوا کہ وہ بھی شاید یہاں کا کوئی بڑا سیاسی لیڈر بن گیا ہے۔
''ہونہہ...... بدمعاشیاں اور چالبازیاں تو تمہاری فطرت تھی شہریار! سیاسی لیڈر بننے کے لیے انہی خصوصیات کی ضرورت ہوتی ہے۔ سو تم نے بالکل ٹھیک انتخاب کیا۔''
پھر وہ سعدی کے ساتھ اپنے پرانے گھر کی طرف گئی۔ جسے چھوڑے سالہا سال گزر چکے تھے۔ وہاں ایک طویل و عریض شاپنگ پلازا اس گھر کی لاش پر کھڑا تھا۔ معلوم ہوا چند سال پہلے تایا تو انتقال کر گئے تھے۔ ان کے بیٹے نے سیاست میں خوب کھیل کھیلا اور کامیاب رہا۔ یہ پلازا اسی کی ملکیت ہے۔ رہائش کہیں اور ہے۔ وہ مایوس ہو کر واپس آ گئی۔
پھر علی کے کیس کی سنوائی تھی۔ وہ بھی اعیان کے ساتھ کورٹ جانا چاہتی تھی لیکن یزدانی صاحب نے اسے نہ جانے کا مشورہ دیا۔ شاید آج فیصلہ سنا دیا جائے۔ بہتر ہو گا کہ آپ یہیں بیٹھ کر فیصلہ سنیں۔ کورٹ میں آپ کا آنا مناسب بھی نہیں اور ممکن بھی نہیں ہو گا۔'' یزدانی صاحب کی بات سن کر اس کے اندر آندھیاں سی چلنے لگیں۔ ان کے لہجے میں خوش امیدی نہیں، کچھ مایوسی تھی۔ وہ خوف زدہ ہو گئی، کہیں اس کے بدترین اندیشے درست نہ ہونے لگیں۔
''یا اللہ! تو ہی بچانے والا ہے۔'' اس نے دل کی گہرائیوں سے فریاد کی لیکن شاید کاتبِ تقدیر ہونی کو لکھ چکا تھا۔
اس دن سارے ٹی وی چینل اور اخبارات کے ضمیمے ایک ہی بات چیخ چیخ کر سنا رہے تھے کہ علی کو عدالت نے سزائے موت سنا دی۔ وہ شاید بے ہوش ہو گئی تھی۔ آنکھ کھلی تو سعدی سامنے بیٹھا اس کے چہرے پر پانی چھڑک رہا تھا۔ وہ تڑپ کر اٹھی۔
''یہ کیا ہو گیا سعدی؟ یہ کیا ہو گیا؟ میں کیسے جیوں گی اس کے بغیر......''
''تمہیں جینا ہو گا رانیہ! اعیان کے لیے...... سنبھالو اپنے آپ کو...... ہمت سے کام لو...... کل ہمیں جانا ہے۔ جیل میں علی سے ملنے...... آخری ملاقات کے لیے۔'' سعدی نے

سپاٹ سے لہجے میں کہا تو رانیہ نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔
''سعدی! پلیز اس وقت میں اکیلے رہنا چاہتی ہوں۔ تھوڑی دیر کے لیے...... اعیان کو تم ساتھ لے جاؤ۔''
وہ شکستہ آواز میں بولی تو سعدی اثبات میں سر ہلاتا ہوا اعیان کو ساتھ لے کر کمرے سے نکل گیا۔ پھر رانیہ تھی اور اس کا ماتم...... رو رو کر اس کے سارے آنسو بہہ گئے اور پھر دل میں سناٹے اتر آئے۔

اگلے دن وہ آخری ملاقات کے لیے جیل پہنچی تو علی کا سامنا کرنا ایک قیامت کا مرحلہ تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر بہت قریب سے دیکھا۔ دیر تک دیکھتی رہی۔ کیونکہ آج کے بعد یہ چہرہ اسے نظر نہیں آنا تھا۔ آنسوؤں کی دیوار کو ہٹا کر وہ بار بار دھندلاہٹ کو کم کرتی کہ اس کے خدوخال ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کے ذہن و دل پر نقش ہو جائیں۔ ایسے کہ یہ چہرہ کبھی اس کے تصور میں دھندلا نہ ہونے پائے۔

''رانیہ! بس ہمارا ساتھ یہیں تک تھا۔ دیکھو! اب تم یہاں رکنا مت...... میری ڈیڈ باڈی...... میری سیاسی پارٹی حاصل کرے گی اور اس پر خوب تماشے ہوں گے۔ پلیز! تم ان تماشوں کا حصہ نہ بننا...... واپس جا کر اپنا گھر اور کاروبار سنبھالو...... میرا سارا بزنس صرف اور صرف میرا تھا اور میرے بعد تم اس کی مالک ہو۔ سارے قانونی کاغذات ہمارے لیگل ڈپارٹمنٹ کے چیف برنیڈن کے پاس ہیں۔ وہ اچھا آدمی ہے۔ تمہاری ہیلپ کرے گا۔ اگر کوئی پریشانی ہو تو ایملی سے رجوع کرنا، وہ تمہارے مسئلے حل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

''مجھ سے وعدہ کرو رانو! تم کبھی ہمت نہیں ہارو گی۔ ہمارے پیار کی نشانی ہمارا اعیان ہے۔ وہ تمہارے پاس ہمیشہ میری شکل میں موجود رہے گا۔ دیکھو! اس کی شکل ہے نہ بالکل میرے جیسی...... بس اس کا خیال رکھنا۔ ہم ملا کریں گے نا کبھی کبھی...... خوابوں میں...... ہے نا؟'' علی نے حلق میں پڑنے والے آنسوؤں کے پھندوں سے لڑتے لڑتے کہا تو وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ سنتی گئی۔

''میں جانتا ہوں اس وقت تمہارا ذہن منتشر ہے۔ شاید تمہیں یاد بھی نہ ہو کہ میں نے کیا کہا ہے اس لیے میں نے تمہارے فون کا وائس ریکارڈر آن کر دیا تھا۔ بعد میں سکون سے سننا۔''

پھر ان کی ملاقات ختم ہو گئی اور ویسا ہی ہوا جیسا علی نے کہا تھا۔ اس کی ڈیڈ باڈی اس کی پارٹی نے وصولی اور وہی تماشے بھی ہوئے جن کا اس نے ذکر کیا تھا لیکن وہ خاموشی سے وہاں سے واپس آ گئی۔

☆☆☆

تنہا ویران گھر میں وہ اپنے آپ سے بیگانہ گھنٹوں ایک ہی جگہ بیٹھی رہتی۔ اعیان اس کے پاس آتا، اسے آواز دیتا۔ ہلاتا تو اس میں کچھ زندگی ظاہر ہوتی۔ وہ اسے کچھ کھلا پلا کر پھر سے ہولناک تنہائیوں کے گونجتے سناٹوں میں کھو جاتی۔ اس نے اپنے آپ کو گھر میں قید کر لیا تھا۔

سعدی نے کئی مرتبہ اسے زندگی میں واپس لانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ ہاں وہ اعیان کو ضرور اپنے ساتھ کہیں گھمانے پھرانے لے جاتا۔ یا فرنٹ یارڈ میں اس کے ساتھ فٹ بال کھیل کر اس کا دل بہلا دیتا۔ لیکن رانیہ کو اب تک وہ صدمے کی کیفیت سے باہر لانے میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔

''رانیہ! پلیز، اپنے آپ کو سنبھالو۔ اعیان بہت ڈسٹرب ہے۔ آفس کے معاملات اٹکے ہوئے ہیں۔ بزنس ٹھپ ہوتا جا رہا ہے تم نے اگر ہمت نہ کی...... تو علی کا اس قدر محنت سے کھڑا کیا ہوا یہ بزنس تباہ و برباد ہو جائے گا۔ اٹھو، اپنا حلیہ درست کرو اور میرے ساتھ آفس چلو...... تمہارا ذہن تھوڑا بٹے گا تو دکھ ہلکا ہونا شروع ہو جائے گا...... چلو، اٹھو۔'' سعدی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا تو وہ ایک بے جان گڑیا کی طرح اٹھ گئی۔

گڈ گرل، چلو! شاباش تیار ہو کر آؤ۔ میں اعیان کو تیار کرتا ہوں۔ نینی! اسے تیار کرو اور اس کی ضرورت کی چیزیں بیگ میں ڈال دو۔'' سعدی نے رانیہ کی حالت دیکھتے ہوئے اعیان کے لیے ایک نینی کا بندوبست کر دیا تھا جو ایک خوش وضع دیسی خاتون تھیں اور اعیان کا خاصا خیال رکھتی تھیں۔

آفس میں سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا علی چھوڑ کر گیا تھا بس وہی نہیں تھا۔ وہ آفس میں داخل ہوئی تو علی کی خالی کرسی دیکھ کر اپنے آنسو اور سسکیاں ضبط نہ کر سکی۔ باہر سعدی نے آفس کے تمام لوگوں کو کہہ دیا کہ کوئی رانیہ سے علی کی تعزیت نہ کرے بلکہ نارمل طریقے پر بات کرے۔ ورنہ وہ پھر صدمے کی کیفیت میں چلی جائے گی۔

اس کے پاس آفس میں سب سے پہلے آنے والا اکاؤنٹ ڈپارٹمنٹ کا منیجر روہن تھا۔

''ہائے رانیہ! اچھا ہوا آپ آ گئیں۔ آپ کے نہ ہونے سے بہت سے معاملات اٹکے ہوئے تھے۔ یہ کچھ

فائلز ہیں۔ ان پر آپ کے دستخط چاہئیں۔ یہ کچھ اخراجات کی ادائیگی کے چیک ہیں۔ اور یہ سیلریز کا چیک ہے۔ ٹیکس ریٹرنز ہم نے تیار کرلیے ہیں۔ آپ ان پر بھی ایک نظر ڈال لیں اور سائن بھی کردیں۔ پرسوں انہیں جمع کروانے کی آخری تاریخ ہے۔ یہ سب میں آپ کے پاس چھوڑے جارہا ہوں۔ دیکھ لیجیے اطمینان سے...... اگر کوئی مسئلہ ہو تو مجھے بلا لیجیے گا، اوکے میم!'' روہن یہ سب چیزیں اس کی ٹیبل پر چھوڑ کر چلا گیا اور وہ بے خیالی سے انہیں گھورتی رہی۔

پھر سعدی اندر داخل ہوا۔

''رانیہ! یہ سب کچھ اب تم ہی کو کرنا ہے حوصلہ کرو اور کام شروع کرو، شاباش۔''

وہ سعدی کو کوئی جواب دیے بغیر ان کاغذات اور فائلز کو گھورتی رہی۔

''رانو! اگر کوئی مسئلہ ہے اور تم نہیں کر پا رہی ہو......تو کم از کم مجھے پاور آف اٹارنی ہی دے دو۔ اس وقت تک کے لیے...... جب تک تمہاری ذہنی کیفیت بحال نہیں ہو جاتی۔ آفس کے معاملات تو چلنا شروع ہوں کم از کم۔ ورنہ سب کچھ ختم ہوجائے گا۔''

سعدی اپنی دُھن میں بولتے ہوئے ٹیبل پر پڑی فائلز کو دیکھ رہا تھا اور ان کے صفحات پلٹتے ہوئے اس کی نظر رانیہ پر پڑی تو وہ پوری آنکھیں کھولے اسے دیکھ رہی تھی جن میں کچھ دکھ اور کچھ غصے کی جھلک تھی۔

''سعدی! میرا نام رانیہ ہے۔ مجھے رانو کہہ کر مخاطب کرنے کا حق صرف علی کو دیا تھا میں نے...... اور کوئی مجھے اس نام سے نہیں پکار سکتا...... تم بھی نہیں...... خیال رکھنا۔'' اس نے سرد سے لہجے میں کہا تو سعدی چونک پڑا۔

''اوہ...... آئی ایم سوری...... میں خیال رکھوں گا۔'' آہستگی سے یہ کہہ کر وہ اٹھ کر چلا گیا۔ رانیہ شیشے سے اسے جاتا دیکھتی رہی پھر اس نے ان فائلز کو اپنی طرف کھسکا لیا۔ کافی دیر تک ان کو دیکھتی رہی۔ چیکس سائن کیے...... ایک دو چیزیں کلیئر کرنے کے لیے روہن کو دوبارہ اس نے طلب کیا۔ اس نے بڑی خوش دلی اور توجہ سے اسے تمام چیزیں سمجھائیں۔

''وہاٹ اباؤٹ پاور آف اٹارنی؟ کیا میں یہ کسی کو دے سکتی ہوں؟'' رانیہ نے سوال کیا تو وہ حیران ہوکر اس کی شکل دیکھنے لگا۔

''کیا آپ کے پاس کوئی اتنا ہی قابلِ بھروسا اور اعتبار کرنے والا بندہ ہے جتنا مسٹر علی تھے۔ میم! پاور آف اٹارنی دینے کا مطلب ہے کہ تمام کے تمام مالکانہ حقوق اور اختیار کسی دوسرے بندے کو منتقل کر دینا۔ وہ جیسے چاہے چلائے...... ایمان داری سے آپ کے بزنس کو اسٹیبلش کرے...... یا بے ایمانی سے سب کچھ آپ کے ہاتھ سے لے کر......آپ کو خالی ہاتھ کردے۔ آپ کا ایک بیٹا ہے۔ اس کا سارا مستقبل آپ کے ہاتھ میں ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ دھوکا کھا کر...... اپنے ساتھ ساتھ...... اس کا مستقبل بھی تاریک کردیں اس لیے میرا مشورہ ہوگا کہ آپ ایک اچھی بزنس ایڈمنسٹریٹر ہیں۔ اس کا فائدہ اٹھائیں اور مسٹر علی کی طرح یہ سب کچھ خود چلائیں۔ ویسے آپ کی مرضی ہے۔'' وہ رانیہ کو صاف الفاظ میں اس کے سوال کا جواب دے کر چلا گیا۔

پھر ان کا لیگل ایڈوائزر آفس میں داخل ہوا۔

''ہائے میم رانیہ! آئی ایم برنیڈن...... یہاں مجھے اکثر لوگ 'برو' کہہ کر پکارتے ہیں۔ آپ کا تھوڑا سا وقت لوں گا۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو۔'' وہ نہایت خوش مزاجی سے کہہ رہا تھا۔

پھر وہ کافی دیر تک بزنس کے، آفس کے اور خود اس کے اور علی کے قانونی معاملات اس کو سمجھاتا رہا جنہیں وہ غور سے سنتی رہی۔

''مسٹر علی نے اپنا یہ سارا بزنس...... یہ آفس اور اس کے تمام اثاثے آپ کے نام کردیے تھے اور آپ کے بعد یہ آپ کے بیٹے اعیان کو منتقل ہوجائیں گے۔ اس پر نہ کوئی قرضہ ہے، نہ ملکیت کے بارے میں کوئی ابہام ہے۔ آج آپ اس کرسی پر اس بزنس کے مکمل مالکانہ حقوق کے ساتھ بیٹھی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ بھی اسے اسی خوش اسلوبی سے چلاتی رہیں گی جس طرح یہ مسٹر علی کے زمانے میں چلتا رہا ہے۔''

''وہاٹ اباؤٹ پاور آف اٹارنی؟ کیا میں یہ کسی کو دے سکتی ہوں؟'' رانیہ نے اس سے بھی وہی سوال کیا جو اس نے روہن سے کیا تھا۔

''پاور آف اٹارنی؟'' برنیڈن نے اس کے چشمے کے شفاف شیشوں کے پیچھے سے بڑے غور سے دیکھا۔

''قانونی طور پر تو ہاں...... لیکن میرا ذاتی مشورہ چاہتی ہیں تو...... بالکل نہیں...... بلکہ کبھی نہیں۔'' اس نے حتمی جواب دیا۔ کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ ''مسٹر سعدی میرے پاس دو تین بار آ چکے ہیں۔ اسی سلسلے میں بات کرنے......وہ آپ کے اور علی کے اچھے دوستوں میں سے ہیں۔ شاید اُن

کی یہی خواہش ہے کہ آپ کی پریشان، ذہنی کیفیت کے پیش نظر...... آپ کو بزنس کے بکھیڑوں سے آزاد ہو کر ریلیکس ہونے کا موقع دیں۔ یہ ان کی ایک اچھی خواہش ہے لیکن میں پھر بھی آپ سے یہی کہوں گا کہ ......نہیں...... آپ خود کو سنبھالیں...... ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔ برو کبھی کسی کو غلط مشورہ نہیں دیتا۔'' وہ بھی اٹھ کر چلا گیا تو رانیہ کے لیے بہت سے سوال چھوڑ گیا۔ اس نے ان سوالات کے جواب تلاش کرنے کے لیے اپنے ذہن کو بیدار کیا۔ وہ سوچتی رہی...... پھر اٹھ کر ٹہلتی ہوئی کھڑکی کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ شیشے کی دیوار کے اُس پار زندگی اسی طرح رواں دواں تھی جیسے کچھ بھی نہ ہوا ہو۔ علی کے جانے سے اس کی زندگی ٹھہر سی گئی تھی لیکن دنیا اسی طرح چلتی جا رہی تھی۔ سامنے ریوراک روڈ پر بہت سے لڑکے لڑکیاں ہنستے بولتے گھوم پھر رہے تھے۔ داہنی جانب ایمبیسڈر برج اسی طرح کمان بنا کھڑا تھا۔ اس کے آگے گہرے نیلے پانیوں والا دریا رواں اور اس پر چھوٹی کشتیاں۔ کھلا روشن آسمان، نیلے رنگ پر کہیں کہیں سفید بادل، زندگی کی وسعتوں کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ اس رواں دواں زندگی کے ماحول نے اس پر بھی کچھ خوشگوار اثر ڈالا۔ وہ کھڑکی کے تھوڑا اور نزدیک گئی۔ نیچے آفس کے سامنے سے گزرنے والی سڑک تھی۔ ٹریفک رواں اور فٹ پاتھوں پر بھانت بھانت کے لوگ چل پھر رہے تھے۔ وہ دیکھتے دیکھتے چونک پڑی۔

وہ سعدی تھا۔ ہاں سعدی ہی تھا جو ایک پولیس والے سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ پولیس والا کوئی دیسی لگ رہا تھا۔ شاید کوئی انڈین امریکن تھا۔ وہ دونوں جس قدر بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے اس سے لگ رہا تھا کہ ان کی شناسائی خاصی پرانی ہے۔

اس کی پیشانی پر سوچ و فکر کی لکیریں ابھریں اور نہ جانے کیوں اس کے ذہن میں علی کا کہا ہوا فقرہ گونجا جو اس نے آخری ملاقات میں کہا تھا۔ 'رانیہ! میری اس تباہی میں کسی اپنے...... بہت قریبی اپنے کا ہاتھ ہے...... اس کا دھوکا شامل نہ ہوتا...... تو میں یہاں نہ ہوتا۔' اس جملے کی گونج نے اسے پریشان کر دیا۔ اس نے آخری بار غور سے پولیس والے کو دیکھا۔ وہ ہنس رہا تھا اور اس کی گہری سانولی رنگت پر سفید دانت بہت نمایاں نظر آ رہے تھے۔

وہ واپس پلٹ آئی۔ پیشانی مسلتی ہوئی صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کی پریشان خیالی اپنے عروج پر تھی۔

'علی کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ وہ یہاں سے وہاں......

دسمبر 2017ء کا شمارہ ایک نظر میں

شکست کی فتح
گھٹن زدہ حالات سے ایک حسینہ کی بغاوت...... آخری صفحات پر **طاہر جاوید مغل** کے قلم سے
ایک ایسی دلگداز داستان جو سوچنے پر مجبور کر دے

نوشتِ اتحاد
تاریخی صفحات پر **ڈاکٹر ساجد امجد** کے قلم سے...... برہان نظام شاہ کے عہد کے اہم لمحات اور پر تجسس گزرے واقعات کا عکس

رنگ آسماں
ماضی کی دلفریب یادیں اور ایک فرنگی حسینہ کی دلداریاں......
اے۔ آر۔ راجپوت کے قلم سے خوب صورت سلسلہ

وقت
دلچسپ معلوماتی اور حیرت انگیز واقعات کا قصہ......
حسام بٹ کے خیالات کی روانی

اس کے علاوہ
تنویر ریاض۔ سلیم انور۔ علی اختر۔ ثمر عباس۔
افتخار اعوان اور ناہید سلطانہ اختر کی دلچسپ کہانیاں

اور وہاں سے پھانسی کے پھندے تک کیسے پہنچا؟ کوئی قریبی؟ کوئی اپنا؟ احسان؟ ایملی؟ یا پھر سعدی؟ کون ہوسکتا ہے؟ میں کس کو موردِ الزام ٹھہراؤں؟ کس پر بھروسا کروں اور کس پر نہیں، وہ بہت زیادہ الجھ گئی تھی۔ اسی الجھن میں وہ اٹھ کر نکل آئی۔ تھوڑی دیر میں وہ ایمبیسڈر برج کراس کر کے ونڈسر میں داخل ہورہی تھی۔ ریورواک روڈ سے گزرتے ہوئے اس کی نظر سیزرز کیسینو کی جل اٹھنے والی لائٹس پر پڑی۔ بلڈنگ ہیڈ پر ''یَنی'' کے پروگرام کی سلائڈز چمک رہی تھیں۔ کچھ سال پہلے علی سے پہلی ملاقات پر وہ اس کے ساتھ سیزرز آئی تھی تو یَنی کا ہی پروگرام دیکھا تھا۔ اس کے دل میں کوئی کانٹا سا ٹوٹ کر چبھا اور وہ نظریں چرا کر آگے بڑھی اور ٹیرون چرچ روڈ پر مڑ گئی۔ چند منٹوں بعد ہی وہ اپنے گھر کی انٹرینس پر پہنچ گئی۔ اس نے گاڑی روک کر لکڑی کے بڑے سے گیٹ کو دیکھا جس کے بائیں جانب ایک پتھر کی نیم پلیٹ لگی ہوئی تھی۔

''رانیاز۔ 147 ٹیرون چرچ روڈ'' اور اس پلیٹ کے نیچے ہی ایک خوب صورت میل باکس لگا ہوا تھا۔ جو آنے والی میل سے بھرا ہوا نظر آرہا تھا۔ اس نے نیچے اتر کر باکس سے میل نکالی۔ بے شمار لفافے، فلائیرز اور پیپرز وغیرہ تھے وہ سمیٹ کر اندر چلی گئی۔

''اعیان کہاں ہے؟'' اس نے نینی سے پوچھا۔

''کھانا کھلا کر سلا دیا ہے میں نے اسے۔'' نینی نے بتایا تو وہ اثبات میں سر ہلا کر پشت گاہ سے ٹک گئی۔ پریشان خیالی نے نہ صرف اسے ذہنی طور پر تھکا دیا تھا بلکہ اب اس پر جسمانی تھکن بھی ٹوٹ کر برس رہی تھی۔ پھر وہ کب صوفے کے آرم پر سر رکھ کر سوگئی۔ اسے پتا ہی نہیں چلا، رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا۔ وہ گہری نیند سے کچھ ہوشیار ہوئی تو اسے محسوس ہوا کہ کوئی اس کے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامے ہولے ہولے سہلا رہا ہے۔ تھپتھپا رہا ہے۔

''علی!'' وہ ہڑبڑا کر چیختی ہوئی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''رانیہ! یہ میں ہوں...... سعدی۔'' اس نے آنکھیں کھول کر سعدی کو دیکھا۔ وہ صوفے کے نزدیک نیچے کارپٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ پھر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ نینی نے سب تیز روشنیاں بجھا کر...... ہلکی روشنیں جلا دی تھیں۔ اسی لمحے کلاک نے رات گیارہ بجے کا اعلان کیا۔

''سعدی! تم یہاں...... اس وقت کیا کررہے ہو؟'' اس نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

''وہ...... دراصل میں تھوڑی دیر سے آیا تھا...... بیسمنٹ میں جارہا تھا تو تم مجھے یہاں سوتی ہوئی نظر آئیں۔ میں سمجھا شاید تمہاری طبیعت کچھ خراب ہے اسی لیے میں اِدھر چلا آیا...... تم ٹھیک ہونا؟'' سعدی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ اس کو گھور رہی تھی۔ آنکھوں میں شک کی پرچھائیاں لہرا رہی تھیں۔

''ہاں! میں ٹھیک ہوں، اب تم جاؤ۔'' اس نے سعدی کو گھورتے ہوئے کہا تو وہ سر ہلاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

''رانیہ! اپنا خیال رکھو...... تمہاری کوئی چھوٹی سی تکلیف بھی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔'' وہ بولا تو اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''رانیہ! زندگی بڑی طویل ہے۔ تم اسے تنہا کیسے کاٹو گی...... کس طرح اکیلے لڑو گی اتنے بہت سے مسائل سے...... کتنے مہینے ہوگئے تم اب تک سنبھل نہیں پائیں...... اور تنہا شاید اپنے آپ کو سنبھال بھی نہیں پاؤ گی۔'' وہ بول چکا تو اس نے سر اٹھایا۔

''پھر؟ کیا کروں؟......'' اس نے سپاٹ سے لہجے میں سوال کیا تو وہ دوبارہ گھٹنوں کے بل اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔

''اپنے آپ کو میرے پیار کے حوالے کردو۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں...... کہ اتنی محبت دوں گا تمہیں...... کہ تم اپنے سارے غم بھول جاؤ گی۔ بس اپنا وجود میرے نام کردو...... تم دیکھنا...... تمہاری ساری پریشانیاں...... سارے دکھ...... سارے مسئلے مسائل...... تمہاری زندگی سے اس طرح دور بھاگ جائیں گے جیسے کبھی تھے ہی نہیں...... پلیز رانیہ!'' اس نے ملتجی لہجے میں بات ختم کی۔

''یعنی...... اچانک تمہیں مجھ سے محبت ہوگئی ہے...... کیونکہ علی کے جانے کے بعد میں اکیلی ہوگئی ہوں...... اس لیے؟'' اس نے سنگین لہجے میں پوچھا۔

''اچانک نہیں...... یہ تو سالوں پرانی محبت ہے۔ اس وقت کی، جب ہم یونیورسٹی میں ساتھ تھے۔ تمہارا جھکاؤ علی کی طرف دیکھتے ہوئے کبھی اظہار کی جرأت نہیں کرپایا...... اب ملیں بھی...... تو علی کی بیوی تھیں...... لیکن اب وہ نہیں رہا...... تو کم از کم اب تو میں تمہیں بتا سکتا ہوں کہ رانیہ میں تم سے بہت بہت...... بلکہ بہت ہی زیادہ محبت کرتا تھا۔ کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا...... خدارا! میرا ہاتھ مت جھٹکنا...... میرا دل ٹوٹ جائے گا...... پلیز رانیہ! پلیز!'' وہ امید بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''بہت رات ہوگئی...... اب جاؤ...... جا کر سوجاؤ۔''

وہ آہستگی سے اپنے ہاتھ اس کے ہاتھوں سے نکالتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے بیڈروم کی طرف بڑھ گئی۔

اس دن کے بعد جب بھی اس کا سعدی سے سامنا ہوا۔ اس کے سامنے ایک ہی سوال آیا۔ جیسے سعدی کو اس کے جواب کا انتظار ہو...... لیکن وہ نہ جانے کیوں سعدی کی آنکھوں سے ہونے والے اس سوال سے کچھ چڑنے سی لگی تھی۔ سعدی کو دیکھتے ہی اس کی نظروں کے سامنے وہ منظر آجاتا جس میں سعدی اس پولیس والے سے انتہائی بے تکلفی سے باتیں کر کے ہنس رہا تھا بلکہ ایک مرتبہ قہقہہ لگاتے ہوئے اس کے ہاتھ پر ہاتھ بھی مارا تھا اس نے...... پھر اس کی یادوں کے پٹارے سے علی کے جملے سانپ کی طرح باہر آتے۔

''رانیہ! میری اس تباہی میں میرے اپنے...... بہت ہی قریبی اپنے کا ہاتھ ہے...... اس کا دھوکا شامل نہ ہوتا...... تو میں یہاں نہ ہوتا۔''

اس دن ناشتے کی ٹیبل پر وہ اعیان کو ناشتا کروا رہی تھی کہ سعدی آ گیا۔ وہ تیار ہو کر شاید آفس جا رہا تھا۔

''آہا...... ناشتا ہو رہا ہے۔ ہائے اعیان! کیا کھا رہے ہو؟ رانیہ! ایک کپ چائے ملے گی۔'' اس نے فرمائش کی تو نینی نے جلدی سے آگے بڑھ کر ایک کپ میں چائے بنا کر اس کے سامنے رکھ دی۔

''سعدی! کل میری ایک یونیورسٹی فرینڈ کا فون آیا تھا۔ یونیورسٹی کیمپس میں اس کے برابر والا سنگل روم اپارٹمنٹ خالی ہوا ہے۔ وہ میں نے تین ماہ کا ایڈوانس کرایہ دے کر تمہارے نام بک کروا دیا ہے۔ یہ اس کی چابیاں ہیں۔ تمہیں تین دن کے اندر ہی شفٹ ہونا ہے۔ ورنہ وہ کسی اور کو دے دیا جائے گا۔ یہ بات ایگریمنٹ میں لکھی ہوئی ہے۔ امید ہے تم وہاں آرام سے رہو گے۔'' رانیہ نے چابیاں اس کی جانب بڑھائیں تو وہ اسے گھورتا رہ گیا۔

''رانیہ! کیا تم مجھ سے ناراض ہو؟'' سعدی نے اسے عجب طرح سے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں، میں کسی سے بلاوجہ کیوں ناراض ہوں گی۔ علی سے تمہاری جو بات ہوئی تھی، وہ یہی تھی کہ تم کوئی معقول رہائش ملنے تک ہمارے بیس منٹ میں رہو گے۔ ورنہ بیس منٹ میں ساری زندگی تو نہیں گزاری جا سکتی۔'' رانیہ نے سرد سے لہجے میں جواب دیا۔

''لیکن...... تمہیں اور اعیان کو اس وقت کسی سہارے کی اشد ضرورت ہے جب تک اپنی نارمل لائف کی طرف نہیں آ جاتیں۔ میں تمہیں تنہا چھوڑنا نہیں چاہتا۔'' سعدی نے کچھ جذباتی انداز میں اصرار کیا۔

''تمہارا بے حد شکریہ کہ تم میرے بارے میں اس طرح سوچتے ہو لیکن میری طرف سے مطمئن ہو جاؤ۔ میں اب بالکل نارمل ہوں۔ میرے سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں بحال ہو چکی ہیں۔ میں اپنے گھر...... اعیان اور بزنس کے تمام معاملات کو اب بڑی اچھی طرح ہینڈل کر سکتی ہوں۔''

''بزنس کے معاملات کی تم کو اتنی کہاں خبر ہے۔ وہاں اس آفس میں معاملات خاصے گنجلک ہیں۔ انہیں ہینڈل کرنا اتنا آسان نہیں ہوگا تمہارے لیے رانیہ!''

''میں بزنس ایڈمنسٹریشن میں پوزیشن ہولڈر ہوں...... کچھ تو صلاحیت ہو گی نا...... مجھے یقین ہے کہ میں کرلوں گی۔ ویسے بھی...... وہاں تم ہو تو سہی...... کوئی مسئلہ ہوا...... تو تمہاری رائے تو لے سکتی ہوں نا میں۔''

رانیہ نے سعدی کے لیے کوئی راہ نہیں چھوڑی۔ وہ کچھ دیر سر جھکائے میز پر پڑی چابیوں کو گھورتا رہا پھر کچھ غصے سے چابیاں اٹھا کر جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔

''وہاں بھی پتا نہیں کب تک ہوں۔ گھر کی طرح وہاں سے بھی کب نکال دیا جاؤں، کیا خبر...... تم میرے ساتھ اچھا نہیں کر رہی ہو رانیہ! میرے جذبات میرے خلوص کو پیروں تلے روند رہی ہو، یہ مجھے بالکل اچھا نہیں لگ رہا ہے۔''

''سعدی! علی میری زندگی میں تھا...... ہے...... اور رہے گا...... زندگی بھر...... اور اس کے اس طرح موجود ہوتے ہوئے میں کسی کو اس کی جگہ دینے کا سوچ بھی نہیں سکتی اس لیے پلیز! اس بارے میں جذباتی ہو کر مت سوچو...... تم میرے اور علی کے دوست تھے، اور ہمیشہ رہو گے۔ بس یہ بات یاد رکھنا۔'' رانیہ کی بات سن کر اس نے گھور کر اسے دیکھا اور پیر پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔

☆☆☆

لینڈ لائن فون کی گھنٹی بڑی دیر سے بج رہی تھی۔ وہ کسلمندی سے بال سمیٹتی ہوئی لاؤنج میں آئی۔ سی ایل آئی پر کوئی اجنبی نمبر تھا لیکن کوڈ پاکستان کا تھا۔ وہ کچھ الجھی ہوئی سی اسے دیکھتی رہی۔ پھر ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا تو ایک اجنبی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

''ہیلو رانیہ!'' دوسری جانب سے کسی نے پوچھا۔

''رانیہ! تم نے پہچانا نہیں ہو گا...... میں شہریار بول

رہا ہوں..... تمہارے تایا کا بیٹا..... تم کیسی ہو؟''

''اوہ..... شہر یار! تمہاری اور تایا ابو کی مہربانی کے طفیل..... زندگی کی ٹھوکریں کھانے میں مبتلا ہوں۔ تم کیسے ہو؟ اور مجھے کیسے فون کیا؟ میرا نمبر تمہیں کس نے دیا؟''

''رانیہ! مجھے بہت افسوس ہے، ابو کی غلط سوچ اور زیادتی کی وجہ سے تم لوگوں کو جو تکالیف اٹھانی پڑیں۔ اس کا احساس ہے مجھے.....''

''لیواِٹ ناؤ..... اب میرے پاس تمہیں دینے کو کچھ نہیں ہے۔ اس لیے اب ان باتوں کا کوئی فائدہ بھی نہیں ہے۔ آئندہ فون مت کرنا.....'' رانیہ نے بیزاری سے فون بند کر دیا۔ اس کی نظروں میں وہ بڑا سا شاپنگ مال گھوم گیا جس کی بنیادوں میں اس کا وہ آبائی گھر دفن تھا۔ جس میں اس کا بچپن اور لڑکپن گزرا تھا اس کے چپے چپے میں کونے کونے میں اس کے ماں باپ کا لمس اور خوشبو بسی تھی۔ اسے اس چمکتے دمکتے شاپنگ مال کے در و دیوار پر اپنے ماں باپ کے خون کے دھبے نظر آئے تھے۔

''ہونہہ! سب کچھ لوٹ لیا، تباہ کر دیا اور میرے پیار کرنے والے والدین کو مجھ سے جدا کرنے پر مجبور کر دیا اور کون جانے وہ ایکسیڈنٹ واقعی ایک حادثہ تھا یا اسے ترتیب دیا گیا تھا۔ لعنت ہو تم پر ہزار بار شہر یار!'' وہ بڑبڑاتی ہوئی واپس اپنے کمرے میں چلی گئی۔

فون کی وجہ سے وقت سے پہلے ہی اٹھنا پڑ گیا تھا۔ اب دوبارہ سوتی تو مشکل تھا کہ وقت پر اٹھ پاتی اس لیے بیڈ پر جانے کے بجائے وہ کھڑکی کے پردے ہٹا کر کھڑی ہو گئی۔ باہر دھند چھائی ہوئی تھی۔ صبح کی ہلکی روشنی میں سارا ماحول نیلگوں سا محسوس ہو رہا تھا بھیگا بھیگا سا..... تھوڑی دیر کھڑے رہ کر وہ وہاں سے ہٹ کر اعیان کے کمرے میں آ گئی۔ وہ بے خبر سو رہا تھا۔ وہ اسے دیکھتی رہی۔

''تم واقعی علی کی تصویر ہو۔'' وہ ایک حزنیہ سی مسکراہٹ ہونٹوں پر لیے اسے دیکھتی رہی پھر واپس آ گئی۔

''آدھے گھنٹے بعد وہ تیار ہو کر آفس کے لیے نکل چکی تھی۔ تمام راستے اس کا ذہن الجھا رہا۔ سعدی کی پولیس والے سے دوستی..... اس کا بار بار پاور آف اٹارنی کے لیے اصرار..... پھر محبت کا اظہار..... اس کے گھر میں رہنے کے لیے ضد کرنا..... اسے یہ سب پریشان کر رہا تھا۔ پھر آج یہ ایک نئی پریشان کن ابتدا۔ شہر یار کا فون۔

کیوں فون کیا تھا اس نے؟ کیا چاہتا ہے وہ اب..... کیا اسے میرے حالات کی خبر ہے۔ ممکن ہے اس نے وہاں مجھے دیکھا ہو اور میرے بارے میں سب کچھ معلوم کر لیا ہو..... لیکن آخر کیوں؟ کیوں؟

ذہن پر ان سارے سوالات کا بوجھ لیے وہ آفس میں داخل ہوئی تو فائلوں کا ڈھیر دیکھ کر اسے انہیں اپنے ذہن سے جھٹکنا پڑا۔ وہ جلدی جلدی انہیں نمٹا کر فارغ ہوئی ہی تھی کہ احسان کی آمد ہوئی۔ اس نے ایک بجھی ہوئی مسکراہٹ سے دیکھا اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''کیسی ہیں رانیہ؟ کچھ دن سے علی کی بہت یاد آ رہی تھی۔ رات اسے خواب میں دیکھا کہ وہ یہیں اس آفس کے دروازے میں داخل ہو رہا ہے، ہمیشہ کی طرح ہنستا مسکراتا..... مجھے دیکھ کر کہہ رہا ہے۔

''آ گیا تو خون پینے..... بول! اب کون سی منحوس خبر لایا ہے۔ ہمارے درمیان ایسی ہی باتیں ہوتی تھیں رانیہ! کیونکہ ہمارا رشتہ ہی ایسا تھا۔ بچپن کا دوستانہ..... جب سے لے کر اب تک..... اچھا وقت تو کم ہی تھا۔ پر ہر مشکل اور کٹھن وقت ہم نے مل کر کاٹا تھا۔ ایک دوسرے کی طاقت بن کر..... اب وہ چلا گیا تو مجھے اپنے وجود کی ناطاقتی کا شدید احساس ہو رہا ہے جیسے میں ایک مفلوج شخص ہوں۔ بے جان، بے حس، بے روح..... اب میرے اندر شدت سے یہ خواہش ابھر رہی ہے کہ بس اب مجھے بھی جلد سے جلد اس کے پاس جانا ہے جس طرح بھی ممکن ہو..... جلد سے جلد.....'' بولتے بولتے اس کی آواز بھرانے لگی تو وہ خاموش ہو گیا۔

''میرا بھی یہی دل چاہتا ہے احسان! بالکل تمہاری طرح..... میرا وجود بھی بے روح ہو گیا ہے۔ اگر اعیان میری زندگی میں نہ ہوتا تو شاید میں خودکشی کر لیتی۔'' وہ دونوں کچھ دیر بیٹھ کر اس کی یادوں کو دہراتے رہے پھر رانیہ نے سوال کیا۔

''احسان! جانتے ہو، علی نے آخری ملاقات میں کیا کہا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ کسی اپنے..... کسی بہت ہی قریبی اپنے کی سازش اور دھوکے کی وجہ سے اس تباہی تک پہنچا ہے۔ کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ ایسا کون ہو سکتا ہے؟''

''کیا؟ کسی اپنے نے اس کے ساتھ دھوکا کیا؟ او مائی گاڈ! ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ اس کا تو یہاں کوئی تھا ہی نہیں..... اگر کوئی اپنا تھا تو تم اور اعیان..... یا پھر میں..... لیکن ظاہر ہے کہ ہم دونوں اُسے موت کے منہ میں نہیں دھکیل سکتے۔ رانیہ! ذہن دوڑاؤ اور سوچو کہ اس کے جانے سے کسے فائدہ ہو سکتا ہے۔''

''تمہاری پارٹی میں سے کوئی؟''

''پارٹی نے اُسے بہت ساری رقم خرچ کر کے یہاں لایا تھا۔ وہ ان کے لیے کام کرتا تھا۔ اس کے ہونے سے انہیں بہت فائدہ تھا اس لیے وہ اسے مرنے کے لیے وہاں نہیں بھیج سکتے۔ کوئی اور ہے...... سوچو! تلاش کرنے کی کوشش کرو...... میں بھی پریشان ہو گیا ہوں۔ یہ سوال مجھے چین سے بیٹھنے نہیں دے گا۔'' احسان کے لہجے میں تشویش تھی۔

''وہ اکثر دو دو تین تین دن کے لیے غائب ہو جاتا تھا پھر ملتا تو اکثر بری طرح زخمی ہوتا تھا۔ صاف محسوس ہوتا تھا کہ کسی کے ساتھ زبردست مارا ماری کی ہے لیکن ہمیشہ ایکسیڈنٹ بتا کر ٹال دیتا تھا۔ کیا تمہیں اس بارے میں کچھ علم ہے؟''

رانیہ نے سوال کیا تو احسان نے غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ کچھ دیر دیکھتا رہا۔ پھر نفی میں سر ہلا کر واپس چلا گیا۔ حالانکہ رانیہ نے اس کی آنکھوں میں جز بز والی کیفیت کو صاف دیکھا۔ اسے لگا کہ شاید وہ کچھ بتانا چاہتا تھا لیکن پھر اس نے نہ بتانے کا فیصلہ کیا اور چلا گیا۔ وہ خاموش بیٹھی رہ گئی۔ اس نے ایک نظر باہر آفس میں ڈالی۔ شیشے کی دیوار کے اس پار اس کا اسٹاف کام میں لگا ہوا تھا۔ سب ہی تھے لیکن سعدی کا کیوبکل خالی پڑا تھا۔ اسے آج یونیورسٹی جانا تھا۔ کیونکہ شاید ایک دو دن میں اس کا نیا سمسٹر شروع ہونے والا تھا۔ اس نے فائلز اپنی طرف کھسکائیں اور کام میں مصروف ہو گئی۔ لنچ کے بعد ایک میٹنگ تھی اور پھر ایک پریزنٹیشن دیکھنا پڑی۔ شام ہو گئی۔ آفس کا ٹائم ختم ہوا تو اسٹاف چلا گیا۔ آفس بوائے فرید سب کچھ بند کرتا ہوا اس کے آفس تک پہنچا تو وہ بھی جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔

اسے آج اعیان کے لیے کچھ چیزیں لینی تھیں اس لیے پارکنگ میں جانے کے بجائے وہ باہر نکل کر سڑک پر آ گئی۔ اگلے بلاک پر گریٹ لیکس مال تھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی فٹ پاتھ پر چلی جا رہی تھی۔ چند منٹ میں ہی وہاں پہنچ گئی۔ چند چیزیں اُسے خریدنا تھیں۔ وہ خرید کر مڑی تو ٹھٹک کر رک گئی۔ چوڑے پلر سے ٹیک لگائے وہ کھڑا تھا اور اس کو دیکھ رہا تھا۔

''ہیلو مسز علی! میں انسپکٹر وکرم پٹیل...... کیا میں آپ سے کچھ بات کر سکتا ہوں، صرف چند منٹ لوں گا۔''

''کس سلسلے میں بات کرنا چاہتے ہو؟'' رانیہ نے مشکوک نظروں سے اُسے دیکھا۔

''ظاہر ہے، مسٹر علی کے بارے میں، آیئے...... آیئے پلیز...... یہاں بیٹھتے ہیں...... صرف چند منٹ چاہئیں مجھے۔''

''علی کے بارے میں اب کوئی بھی بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں...... وہ باتوں کی حد سے بہت دور جا چکا ہے۔'' رانیہ نے اداس لہجے میں کہا۔

''میں جانتا ہوں...... مجھے بے حد افسوس ہے۔ جانے والے چلے جاتے ہیں...... مسئلے پیچھے رہ جانے والوں کے لیے ہوتے ہیں۔''

''ہاں! میں آج کل انہی مسئلوں سے نمٹ رہی ہوں لیکن ان سے تمہارا کیا تعلق؟'' رانیہ نے سوال کیا۔

''بہت بڑا تعلق ہے۔ کیا آپ جاننا نہیں چاہیں گی کہ علی کی اصل زندگی کیا تھی۔ نظر آنے والی زندگی سے الگ اور بالکل مختلف اور جس کے بارے میں سوائے چند لوگوں کے اور کوئی نہیں جانتا۔'' آفیسر پٹیل نے اس کے تجسس کو ہوا دی لیکن رانیہ نے اپنے آپ کو سنبھالا۔

''آفیسر! علی ایک بہت اچھا انسان تھا۔ اس کا مقام میرے دل میں دیوتاؤں جیسا ہے اور میں چاہتی ہوں کہ جب تک میں زندہ ہوں، اس کا وہی مقام میرے دل میں ہمیشہ رہے...... اسے کوئی خراب نہ کرے...... کوئی برائی اس کی ذات سے وابستہ نہ کرے...... تم بھی نہیں۔'' رانیہ نے اس کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔

''بے شک! وہ اپنے کردار کے حوالے سے ایک اچھا انسان تھا بس ہاتھیوں کی لڑائی کے درمیان آ کر پس گیا۔ چند لوگوں نے اپنے مفاد کی خاطر اسے مہرہ بنا کر استعمال کیا اور تباہ کر دیا...... اسے بری طرح گھیر کر مارا گیا ہے مسز علی۔''

وکرم پٹیل نے اس کی حیران آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا اور اس کے اعتماد کی دیوار گرا دی۔

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' اس نے اُلجھے ہوئے لہجے میں سوال کیا تو جواب میں پٹیل نے کرسی کھینچ کر اسے بیٹھنے کی پیشکش کی اور وہ روبوٹ کی طرح بیٹھ گئی۔

''آپ کے اور ہمارے ملک کی سیاست دراصل گینگسٹرز چلاتے ہیں۔ بڑے بڑے مافیا ڈان...... اپنا سیاسی کھیل کھیلنے کے لیے...... مختلف مہرے کس طرح گراتے اور اٹھاتے ہیں...... آپ جانتی ہوں گی بس ایسے ہی ایک سیاسی پارٹی نے اُسے گھیرا...... کام لیا...... پھر اسے یہاں لانے کے لیے اس کے گرد مجبوری حالات کے شکنجے تشکیل

دیے اور اسے مستند مجرم بلکہ قاتل بنا دیا...... اور اسے مجبور کر دیا گیا۔ یہاں وہ یہی کام کررہا تھا لیکن اندر کہیں رزقِ حلال کی طلب بھی تھی اس لیے اپنے ذاتی کاروبار کی شرط پر اس نے یہ کام کرنے کی ہامی بھری قسمت کی بات تھی اور اس کی ذہانت کہ اس کا ذاتی کاروبار بھی بہت اچھا چل نکلا۔ آپ جانتی ہیں کہ کوئی اونچا مقام حاصل کرلے دنیا کی ساری نعمتوں کا شمار اس کی مٹھی میں ہو...... تو اسے دیکھ کر خوش ہونے والوں کے ساتھ ساتھ...... بہت سے لوگ حسد میں بھی مبتلا ہو جاتے ہیں ایسے ہی حاسدوں میں سے ایک نے اسے پھانسی کے پھندے تک پہنچا دیا۔ ہمیں...... یعنی مقامی پولیس کو یہ ٹاسک دیا گیا کہ اس کے بارے میں چھان بین کی جائے اگر وہ واقعی یہاں پر بھی مجرمانہ حرکتوں میں ملوث ہے تو اسے گرفتار کیا جائے...... اور ڈی پورٹ کر دیا جائے۔

''اس کے خلاف کوئی ثبوت نہ ملتا...... اگر اس کے ایک بہت قریب رہنے والے نے ہماری مدد نہ کی ہوتی...... بس اسی کی مدد کی وجہ سے ہمیں اس کے بارے میں سب کچھ معلوم ہوسکا وہ یہاں بھی غیر قانونی طریقے سے آیا تھا اور ہم اسے روک نہ پائے۔ یہ ہمارے لیے سبکی کی بات تھی اس لیے طے یہ ہوا کہ خاموشی سے اسے اٹھا کر واپس اس کے ملک بھیج دیا جائے...... جہاں پولیس اس کی منتظر تھی۔'' وکرم پٹیل نے صاف الفاظ اور لہجہ استعمال کیا تھا۔

''وہ اچانک گھر سے کیسے غائب ہو گیا تھا اسے صفائی کا کوئی موقع بھی نہیں دیا گیا؟'' رانیہ کا لہجہ بھیگ رہا تھا۔

''صفائی کا موقع دینے کی کوئی گنجائش نہیں تھی اور غائب اس طرح کیا گیا کہ رات کے آخری پہر پولیس اپنی چابیوں سے آپ کے گھر کے دروازے کھول کر خاموشی سے داخل ہوئی اور اتنی ہی خاموشی سے آپ کے بیڈروم سے اٹھا کر لے گئی۔ آپ برابر میں سوئی ہوئی تھیں لیکن آپ کو بھی پتا نہیں چلا۔'' پٹیل نے چیونگم چباتے ہوئے اسے بتایا۔

''وہ...... وہ کون...... تھا؟'' رانیہ نے ٹوٹتے لہجے میں پوچھا۔

''ہم م م م...... دس از ملین ڈالر کوئسچن...... مسز علی! کیا آپ کچھ اندازہ کر سکتی ہیں؟'' پٹیل کے سوال پر رانیہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر گویا ہوئی۔

''میں نے کچھ دن پہلے سعدی کو تم سے باتیں کرتے دیکھا تھا اور جس بے تکلفی سے تم دونوں باتیں کررہے تھے، اس سے لگ رہا تھا کہ پرانی جان پہچان ہے...... کہیں...... وہ ہی تو نہیں؟''

''مسز علی! آپ کے سامنے ایک لمبی زندگی پڑی ہے پھر آپ کا بیٹا...... اور اس کا مستقبل بھی آپ کے سامنے ہے۔ اکیلے یہ طویل اور کٹھن سفر کاٹنا...... شاید آپ کے لیے ممکن نہ ہو سکے۔ کسی نہ کسی کو ہمسفر بنانا ہوگا تو یقیناً کسی ایسے ہی کا انتخاب کریں گی جسے آپ اچھی طرح جانتی ہوں اور ممکن ہے کہ آپ کی نظرِ انتخاب ایسے شخص پر ہی پڑے جو آپ کے نزدیک ہو...... آپ کو سراہتا ہو...... اور آپ کے مسائلِ زندگی میں آپ کا ساتھ دے سکے...... اس لیے......'' پٹیل بولتے بولتے رک گیا۔ کیونکہ رانیہ نے تلخ لہجے میں بول کر اس کی بات کاٹی تھی۔

''چاہے اُس کے ہاتھ علی کے خون سے رنگے ہوئے ہی کیوں نہ ہوں...... نو مسٹر پٹیل! نیور!''

''مسز علی! جذباتی فیصلے کرنا...... ہم ایشیائیوں کی فطرت ہے۔ میں آپ سے درخواست کروں گا کہ حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے...... اپنی جانب بڑھنے والے ہاتھ کو جھٹکنے کے بجائے...... تھام لیجیے...... شاید یہ آپ سب کے لیے اچھا ہو۔''

''مشورے کا بے حد شکریہ...... مسٹر پٹیل! لیکن میں آپ کو بتا دینا چاہتی ہوں کہ اب بھی اندر باہر سے میں صرف ایشین ہی ہوں...... علی کے خون سے رنگے ہوئے ہاتھ کو میں جھٹکنا نہیں...... توڑ دینا زیادہ پسند کروں گی۔'' وہ جھٹکے سے اٹھی اور تیزی سے باہر کی جانب نکلتی چلی گئی۔ انسپکٹر وکرم پٹیل اسے پُرخیال نظروں سے گھورتا رہا پھر اپنے فون پر مصروف ہو گیا۔

☆☆☆

آج پھر اس کا فون آیا تھا۔ پہلے فون پر رانیہ نے طے کیا تھا کہ آئندہ وہ کبھی اس سے بات نہیں کرے گی اور یہی بات اس نے شہریار سے کہہ بھی دی تھی لیکن اب جو فون کی گھنٹی بجی تو بے خیالی میں اس نے نمبر دیکھے بغیر فون اٹھا کر کان سے لگا لیا۔

''رانیہ! فون بند مت کرنا...... ورنہ میں دن و رات فون کر کر کے تمہیں پریشان کرتا رہوں گا مجھے تم سے بہت ضروری باتیں کرنا ہیں۔ میں جانتا ہوں تم مجھ سے بابا سے بہت نفرت کرتی ہو...... لیکن رانیہ! بابا کا انتقال ہو چکا ہے اور میں تمہیں تمہارا سب کچھ لوٹا کر تمہارے ساتھ ہوئی زیادتیوں کی تلافی کرنا چاہتا ہوں۔'' شہریار نے بھاری آواز میں اپنا مدعا بیان کیا تو رانیہ چڑ سی گئی۔

''اچھا...... تلافی کرنا چاہتے ہو؟ میرا سب کچھ لوٹا

...ہو؟ شہریار! تم مجھے میرے ماں باپ لوٹا سکتے ہو؟ ...ادہ گھر جس میں میرا بچپن گزرا..... جس کے کونے کونے ...میرے ممی پاپا کی محبتوں کے لمس رچے بسے تھے..... وہ گھر..... وہ وقت..... زندگی کی وہ معصوم خوشیاں واپس لوٹا ...ہو؟ اگر ایسا کر سکتے ہو تو بتاؤ..... میں اس احسان مندی ...کر یہ تمہارے پاؤں چھو کر ادا کروں گی۔ لیکن اگر ایسا ...ہیں کر سکتے تو آئندہ اس کا دعویٰ بھی مت کرنا میری زندگی ...چھننے کی ابتدا..... تم نے اور تایا ابو نے کی تھی پھر یہ میری ...مت بن گئی آج میں اپنی زندگی میں سب کچھ کھو کر..... ...الکل ہی دامن ہو چکی ہوں اس لیے پلیز!.....'' اس کے حلق ...یں آنسوؤں کا پھندا لگ گیا تو وہ خاموش ہو گئی۔

''میری معلومات کے مطابق تو تم ایک اچھی زندگی گزار رہی ہو..... اپنے شوہر اور بچے کے ساتھ..... اللہ نے تمہیں بڑا نوازا ہوا ہے پھر یہ تہی دامنی والی بات کیوں ...ر رہی ہو؟''

''ہاں ایسا تھا..... قسمت مجھ پر مہربان ہوئی تھی لیکن ...و عرصہ بہت تھوڑا تھا تمہارے ملک میں سیاست کی غلیظ ...دلدل نے میرے محبوب شوہر کو نگل لیا اور مجھے تڑپتا چھوڑ ...یا۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا..... تمہیں بھی یاد ہوگا..... علی حمزہ ...ان کو سیاسی بنیادوں پر پھانسی پر چڑھا دیا گیا تھا۔ اسے ...صفائی کا موقع بھی نہیں دیا گیا۔ اس دکھ نے مجھے بھی مار ڈالا ...شہریار! اگر میرا بیٹا نہ ہوتا تو شاید میں بھی علی کے ساتھ ہی ...ر جاتی۔'' وہ سسکنے لگی۔

''اوہ..... وہ علی حمزہ خان تمہارا شوہر تھا؟ مجھے افسوس ...ہے رانیہ! اگر مجھے پہلے معلوم ہوتا..... تو شاید میں کچھ کر ...پاتا..... بہت ہی افسوس ناک ہے..... اللہ تعالیٰ تمہیں اس غم ...کو برداشت کرنے کا حوصلہ عطا کرے۔

''دیکھو رانیہ! میرے بیٹے نے یہاں امریکن ...یورسٹی سے گریجویشن کیا ہوا ہے۔ اس کی گریجویشن کی ...تقریب میں شرکت کے لیے میں یہاں آیا ہوا ہوں۔ کینیڈا ...بھی آؤں گا۔ وہاں میری شادی شدہ بیٹی رہتی ہے..... پلیز! ...تم اجازت دو..... تو میں تم سے بھی ملنا چاہتا ہوں..... پلیز ...منع مت کرنا۔''

''لیکن کیوں؟'' رانیہ نے سوال کیا۔

''یہ تو مل کر بتاؤں گا..... اوکے۔'' شہریار نے فون ...بند کر دیا اور رانیہ سوچ میں پڑ گئی۔

چند دن بعد ہی سنڈے کی اس اداس شام کو اس کی ...بیل بجی۔ اس نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک بھاری بھر کم سی شخصیت نظر آئی۔ وہ غور سے دیکھنے لگی لیکن وہ چہرہ اسے مکمل طور پر اجنبی ہی لگا۔

''رانیہ! پہچانا نہیں؟ میں شہریار.....'' اس کی آواز سن کر اسے لگا کہ واقعی اس کے چہرے کے گوشت کی تہوں میں کہیں پرانے شہریار کے نقوش دبے ہوئے ہیں۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

''اوہ..... تو تم آ گئے..... کیوں آئے ہو؟''

''میں نے کہا تھا نا..... کہ میں آؤں گا۔''

''ہاں..... لیکن کیا لینے آئے ہو اب؟''

''اس وقت میں تم سے کچھ لینے نہیں..... بلکہ کچھ دینے آیا ہوں جو کچھ دینے آیا ہوں، اس کے بعد مجھے یقین ہے کہ میری تمام زیادتیوں کی تلافی ہو جائے گی۔''

''شہریار! بہت مشکل ہے۔ میں نے اتنا کچھ کھویا ہے کہ اس کی تلافی کسی طور ممکن ہی نہیں ہے اور مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ تم کیوں اس کے لیے اتنے پریشان ہو..... اطمینان رکھو..... میں کبھی تمہارے بارے میں تمہاری جانب سے کی گئی حق تلفیوں کے بارے میں..... کبھی منہ نہیں کھولوں گی۔ تمہارے سیاسی کیریئر کو کوئی داغ نہیں لگاؤں گی۔ تم جس قدر معزز لیڈر ہو..... ایسے ہی رہو گے..... میری وجہ سے پریشان مت ہو۔'' اس نے بیزاری سے ہاتھ جھٹک کر کہا تو شہریار نے مسکراتے ہوئے اسے متوجہ کیا۔

''اچھا! یہ تو بہت اچھی بات ہے..... پر رانیہ! ادھر تو دیکھو، کوئی ہے..... جسے میں لے کر آیا ہوں..... تم سے ملانے کے لیے..... دیکھو!''

پتا نہیں وہ قیامت کی گھڑی تھی۔ دنیا رک گئی تھی۔ ہوائیں..... آوازیں..... پرندے اور وقت شاید سب ساکت ہو گئے تھے یا شاید دنیا میں وقت الٹا چلنا شروع ہو گیا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑے..... ساکت سانس کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھی..... وہی تھا۔ ہاں وہی خوب صورت ترین مسکراہٹ آنکھوں اور چہرے پر سجائے..... وہ اسے دیکھ رہا تھا اور وہ بے یقینی کی کیفیت میں ساکت کھڑی اسے دیکھ رہی تھی پھر اس کے ہونٹ کھلے اور ایک سرسراتی ہوئی مدھم صدا سنائی دی۔

''علی!..... تم..... تم زندہ کیسے ہو گئے..... تم..... تم تو.....'' اتنا کہہ کر اس کا وجود کپکپانے لگا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے آپ پر اپنی گرفت کھو دیتی..... علی نے آگے بڑھ کر سہارا دیا۔

''رانیہ! میں زندہ ہوں..... تمہارے سامنے

ہوں..... یقین کرو..... میں ہی ہوں..... حقیقت..... واہمہ نہیں.....''

''لیکن تمہیں تو پھانسی..... وہ جنازہ..... جلوس..... تدفین..... وہ.....'' وہ بے یقینی کی انتہاؤں پر تھی۔

''ہاں..... وہ سب ہوا تھا لیکن میں وہاں نہیں تھا۔ میری جگہ کوئی اور تھا اور کیسے تھا؟ یہ مہربانی شہریار بھائی کی تھی۔''

رانیہ ابتدائی شاک سے سنبھل رہی تھی..... وہ تینوں اندر آکر بیٹھ گئے۔

''یہ سب کیسے ممکن ہوا؟''

''یہاں سے میں اپنے ملک پہنچا تو مجھے جیل کی اس بیرک میں رکھا گیا جہاں سیاسی قیدیوں کو رکھا جاتا ہے۔ کچھ جو معزز قیدی ہوتے ہیں اور کچھ جو معتوب ہوتے ہیں۔ میں بھی معتوب والے حصے میں تھا۔ پھر نہ جانے کیسے مجھے معزز قیدیوں والے حصے میں شہریار بھائی کا مشقتی بنا کر بھیج دیا گیا۔ یہاں ہم دونوں کی شناسائی ہوئی۔ مجھے جس سیاسی پارٹی کے رکن ہونے پر معتوب کیا گیا تھا، وہ شہریار بھائی کی پارٹی سے اچھی خاصی مخاصمت رکھتی ہے۔ ہم دونوں کے درمیان بہت سی باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ ان کو کسی طرح یہ معلوم ہوا کہ تم میری بیوی ہو کیونکہ اخبارات میں کافی خبریں آچکی تھیں..... تو انہوں نے کہا اتنی خوب صورت فیملی کو ٹوٹنا نہیں چاہیے۔

بس پھر انہوں نے ہی نہ جانے کیا کیا چکر چلائے جس صبح مجھے پھانسی ہونا تھی۔ پھانسی سے صرف دو گھنٹے پہلے مجھے نہ جانے کون لوگ اپنے ساتھ لے گئے اور میں جو پھانسی گھاٹ کی طرف جا رہا تھا۔ اچانک میرا راستہ بدل گیا اور میں ایک چھوٹے سے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ ان ہدایات کے ساتھ کہ یہاں چھپ کر خاموشی سے کچھ وقت گزارنا ہے۔ وہاں کافی وقت گزرا..... پھر ایک رات چھپ چھپا کر ائرپورٹ پہنچایا گیا۔ بورڈنگ ہوئی تو میرے ساتھ والی سیٹ پر شہریار بھائی بیٹھے تھے۔ پھر ہم یہاں آگئے۔ میرے سارے بند دروازے انہوں نے ہی کھولے اور وہ کیا جو ناقابلِ یقین ہے۔ آج میں یہاں موجود ہوں۔ تمہارے سامنے مکمل قانونی تحفظ اور آزادی کے ساتھ۔''

علی کے ناقابلِ یقین بیان کو سن کر رانیہ نے نم نم آنکھوں سے شہریار کو دیکھا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''ہاں، رانیہ! جب مجھے علم ہوا کہ علی تمہارا شوہر ہے تو مجھے خیال آیا کہ تمہارے ہر دکھ کی تلافی ممکن ہے۔ اگر میں علی کو بچا کر تم تک پہنچا دوں..... کیوں؟ کیا؟ اور کیسے؟ سوالوں کا ایک ہی جواب ہے..... پیسا..... پیسے کی زبان دنیا کے ہر ملک میں بولی اور سمجھی جاتی ہے..... کہیں کم اور کہیں زیادہ..... بتیس کروڑ..... بتیس کروڑ میں سے آدھے اسے پھانسی کے پھندے سے اتارلائے اور باقی پندرہ نے اس کی راہ میں حائل ہر قانونی رکاوٹ کو ہٹا دیا۔ آج یہ ایک آزاد اور معزز کینیڈین شہری ہے۔

''کیا اب تم میرے گناہ معاف کر سکتی ہو..... جو نے میرے نام لکھ دیے۔ یقین کرو..... میں کبھی بھی تمہیں اور چاچاجی کو ایسی تکلیفیں پہنچا کر سب کچھ چھین لینے کے میں نہیں تھا لیکن بابا جو فیصلہ کر لیتے تھے، وہ کر کے چھوڑتے تھے۔ ہم دو بھائی تھے اور بہن کوئی نہیں تھی۔ میں بچپن سے تمہیں بہن کے روپ میں ہی دیکھتا آرہا تھا شادی مجھے اپنی کلاس میٹ سے کرنا تھی جو مجھے بہت زیادہ پسند بھی تھی لیکن بابا!..... وہ دولت، بلکہ بہت ساری دولت کے شوقین تھے اور اس کے حصول کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتے تھے اسی لیے انہوں نے چاچاجی کی زمینیں اور پراپرٹی ہتھیانے کے لیے جو کچھ بھی کیا..... وہ تم جانتی ہو..... لیکن خیر..... وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ میں ان کے بُرے کاموں میں حصے دار رہا اس لیے ہمیشہ اپنے آپ سے شرمندہ رہا اور آج اپنے آپ کو سرخرو کرنے کے لیے تمہارے سامنے کھڑا ہوں۔ کیا تم مجھے اس احساسِ جرم سے بری کر سکتی ہو؟'' شہریار نے سوال کیا تو رانیہ بے ساختہ اٹھی۔ آنکھوں سے برستے آنسوؤں کی دھند میں اس نے جھک کر شہریار کے پاؤں پکڑ لیے۔

''شہریار بھائی! میں نے کہا تھا نا کہ میں آپ کے احسان کا بدلہ آپ کے پاؤں چھو کر ادا کروں گی۔ آپ نے اس احسان نے مجھے خرید لیا ہے۔ میں ساری زندگی بھی آپ کی غلامی کروں تو بدلہ نہیں چکا سکتی۔'' وہ روتے روتے کہہ رہی تھی۔ شہریار نے اٹھا کر اسے گلے سے لگا لیا۔

''کیسا احسان؟ یہ تو تلافی تھی۔ تو میری بہن ہے..... بس اس رشتے کو نہ توڑنا..... مجھے بہت خوشی ہوگی اور علی دیکھو بھائی! میری بہن کو کوئی تکلیف پہنچے..... یہ مجھے برداشت نہیں ہوگا اس لیے آئندہ خدانخواستہ کوئی مسئلہ ہو..... پہلی فرصت میں مجھے اطلاع دینا۔''

پھر وہ چلا گیا اور رانیہ کے لیے زندگی کے راستوں پر بے شمار پھولوں کا تحفہ دے گیا۔

خاموشی بعض اوقات بہت ہی تکلیف دہ ہوتی ہے... اور کبھی کبھی یہی خاموشی حالات و واقعات کو یکسر تبدیل کر کے آپ کے لیے سازگار بنا دیتی ہے... ایک فلم پروڈیوسر کا قتل... مرنے سے پہلے اس نے ایک ہی وقت میں چار افراد کو خط لکھ کر ہیجان بپا کر دیا...

محبت میں خیانت کرنے والے دیانت داروں کا انجام......

خط کا راز

سید زاہد علی شاہ

وہ اگست بینک ہالی ڈے تھا اور ساحل پر تفریح کرنے والوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی جہاں سورج ہمیشہ چمکتا رہتا ہے چنانچہ وہ بھی گرم دن تھا۔ مشہور فلم پروڈیوسر مارکوس روم نے اپنے فلیٹ کی فرانسیسی کھڑکیوں سے باہر کا جائزہ لیا اور ساحل کی سیر کے لیے چل پڑا۔ پورٹر نے پہلے ہی اس کے لیے ڈیک چیئر رکھ دی تھی تاکہ مارکوس اپنے مہمانوں کا

خیر مقدم کر سکے۔ مارکوس نے چاروں طرف نظریں گھما کر دیکھا کہ شاید وہاں اس کا کوئی پرستار اسے پہچان لے لیکن وہ سب نہانے، گھومنے پھرنے اور ریت کے گھروندے بنانے میں مصروف تھے۔

مارکوس کو غصہ آگیا حالانکہ اس کا نام کرسی کی پشت پر بڑے بڑے حروف میں لکھا ہوا تھا۔ کسی نہ کسی کی تو اس پر نظر پڑتی۔ کیا حالیہ بیماری کے بعد اس کا چہرہ سکڑ گیا ہے یا آنکھوں کے نیچے حلقے پڑ گئے ہیں جو لوگ اسے نہیں پہچان پا رہے۔ وہ کرسی پر نیم دراز ہوگیا اور ہیٹ ناک پر رکھ کر کچھ سوچنے لگا۔ پھر اسے محسوس ہوا کہ کوئی چیز اس کے پنجوں پر گدگدی کر رہی ہے۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ ایک لڑکی اس کے برابر میں ریت پر بیٹھی ہوئی تھی۔

''تم کون ہو؟'' مارکوس نے پوچھا۔

''تمہاری ایک پرستار'' لڑکی نے سادگی سے جواب دیا۔

''میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔''

''اوہ مسٹر روم۔ تمہیں کہاں یاد ہوگا۔'' لڑکی نے کہا۔ ''ہماری ملاقات رائفل کلب میں ہوئی تھی۔''

رائفل کلب وہاں کی مشہور جگہ تھی۔ ''تم اس ٹائپ کی تو نہیں لگتیں۔'' روم نے دل میں سوچا۔

''میں نے تمہاری وجہ سے اس کلب میں شمولیت اختیار کی تھی۔'' لڑکی نے بے باکی سے کہا۔

مارکوس بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور پوچھ بیٹھا۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟''

''ٹوسٹی جین جینز۔'' لڑکی نے کہا۔

مارکوس منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''جین میری نرس کا نام ہے۔ وہ گزشتہ جمعے کو مجھے چھوڑ کر چلی گئی کیونکہ اب میں صحت یاب ہوگیا ہوں۔''

''ہاں میں جانتی ہوں۔ ساندرہ جینز میری بہن ہے۔ میں کبھی کبھی اس سے ملنے آتی ہوں۔ تمہیں معلوم ہے کہ اس کا یہاں پر فلیٹ بھی ہے۔ میں جانتی تھی کہ تم اس کے مریض ہو لیکن اس نے تم سے میرا تعارف نہیں کروایا۔ غالباً وہ سمجھتی ہے کہ تم میرے لیے مناسب نہیں ہو۔'' مارکوس کسی بھی عورت کے لیے اچھا نہیں تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ ساندرہ نے اپنی خوب صورت بہن کا اس سے تعارف کیوں نہیں کروایا۔ ان عورتوں میں حسد کا مادہ بہت ہوتا ہے۔ تاہم اب مارکوس نے ان سب عورتوں سے تعلق ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اپنی بیوی ایلسا سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اچھا بننے کی کوشش کرے گا لیکن اب ٹوسٹی نہ جانے کہاں سے ٹپک پڑی تھی۔ مارکوس نے سوچا کہ ایلسا کے آنے تک اس کے ساتھ اچھا وقت گزرے گا۔

لہٰذا وہ اس سے باتیں کرتا رہا۔ وہ بڑی دلچسپ لڑکی تھی۔ مارکوس کو وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ جب وہ تھکاوٹ محسوس کرنے لگا تو اس نے ٹوسٹی کو فروٹ لولی لینے کے لیے بھیج دیا جو اس کی کمزوری تھی۔ جب وہ واپس آئی تو مارکوس نے اسے پیار سے تھپکی دی اور گلے لگاتے ہوئے کہا۔

''تم کیا کام کرتی ہو میری جان؟''

''میں ایک دفتر میں ہوں۔'' ٹوسٹی نے کہا۔ ''حال ہی میں یہ ملازمت شروع کی ہے لیکن میں اسے پسند نہیں کرتی۔ میں کچھ اور کرنا چاہتی ہوں۔ کیا تم مجھے فلموں میں کام دلا سکتے ہو؟''

مارکوس حیرت زدہ رہ گیا۔ اس نے سوچا کہ اسے کسی اور طریقے سے بہلانا چاہیے ٹوسٹی اس کا ردِعمل دیکھ کر دل برداشتہ اور ناراض ہوگئی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور غصے میں پیر پٹختی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

ان کے عقب میں واقع فلیٹ میں ایک عورت کھڑی یہ منظر دیکھ رہی تھی۔

ایلسا روم خود بھی اپنے وقت کی مشہور فلم اسٹار تھی۔ بے حد خوب صورت ہونے کے باوجود اس میں ایک کمزوری تھی اور وہ یہ کہ انتہائی ناروا سلوک کے باوجود وہ اپنے دل سے سابق شوہر مارکوس کی محبت کو نہ نکال سکی۔ جیسے ہی وہ اپنے فلیٹ سے باہر آئی تو اس کا چہرہ زرد تھا اور ہاتھ بُری طرح کانپ رہے تھے۔

سڑک بالکل سنسان تھی۔ ایلسا ایک بینچ کے قریب آئی۔ ''میں بے ہوش ہو جاؤں گی۔'' اس نے سوچا۔ ''مجھے بیٹھ جانا چاہیے۔''

ایک شخص تیزی سے آگے بڑھا اور اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ ایلسا چونکتے ہوئے بولی۔ ''جان... تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''مجھے مارکوس کا ایک خط ملا ہے جس میں اس نے لکھا ہے کہ وہ تم سے دوبارہ شادی کرنا چاہتا ہے اور اس سلسلے میں تمہیں خط بھی لکھ چکا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ اس نے مجھ سے کہا ہے کہ تم سے دور رہوں اور اس معاملے میں دخل نہ دوں۔ لہٰذا میں آج ہی لندن سے

یہاں آیا ہوں۔صرف یہ کہنے کے لیے کہ تم دوبارہ اس کے پاس چلی جاؤ۔''

''نہیں۔'' وہ بولی۔''اس نے مجھے بھی خط لکھا تھا اور میں پیرس سے دوڑی چلی آئی۔ میں بھی کتنی بے وقوف ہوں لیکن نہیں۔ میں اس کے پاس واپس نہیں جاؤں گی۔ سب کچھ ختم ہوگیا ہے۔''

''پھر بھی ایلسا......؟''

''نہیں جان۔اس کا کوئی فائدہ نہیں۔'' وہ اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے بولی۔''ساڑھے چار بج رہے ہیں۔ میں پیرس واپس جانے کے لیے رات کی فلائٹ پکڑ سکتی ہوں۔''

جان نے اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی ضد پر قائم رہی۔ بالآخر وہ بولا۔''ٹھیک ہے۔ میں تمہیں اپنی کار میں واپس لندن لیے چلتا ہوں۔ اب اس کے پاس جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔''

جان نے اسے بینچ سے اٹھایا اور بولا۔''میری کار اس کونے پر کھڑی ہے۔'' وہ بمشکل چل پا رہی تھی۔ اس نے کہا۔''تم بہت نقاہت محسوس کر رہی ہو ایلسا۔ میں تمہارے لیے برانڈی لے کر آتا ہوں۔''

''آج بینک ہالی ڈے ہے۔'' اس نے کہا۔''سب دکانیں بند ہوں گی۔''

''کیا مارکوس فلیٹ میں ہے؟''

''نہیں۔'' اس نے کہا اور پاگلوں کی طرح قہقہے لگانے لگی۔''مارکوس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔''

''کیا میں اندر جا سکتا ہوں۔''

''ہاں، سڑک کی طرف والی فرانسیسی کھڑکی کھلی ہوئی ہے اور یقیناً سائڈ بورڈ میں برانڈی بھی ہوگی۔''

وہ اسے کار میں بٹھاتے ہوئے بولا۔''تم یہاں انتظار کرو۔ میں ایک منٹ میں آتا ہوں۔''

لیکن اس کی واپسی پانچ منٹ میں ہوئی۔ اس نے ایلسا کے ہاتھ میں برانڈی کا گلاس پکڑایا لیکن اس کے اپنے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔

ایلسا نے برانڈی کا گلاس خالی کیا اور جان نے اسے سڑک کے کنارے جھاڑیوں میں پھینک دیا۔ اس کے بعد وہ کار میں بیٹھا اور اسکیمپٹن سے روانہ ہوگیا۔

فلیٹوں کے عقب میں سڑک خالی تھی لیکن وہاں کچھ الیکٹریشن رات کو ہونے والی آتش بازی کے لیے تیاریوں میں مصروف تھے۔ کبھی کبھی وہ مذاق میں کوئی پٹاخا چھوڑ دیتے تو بوڑھی عورتیں گھبرا کر اپنے دستی بیگ مضبوطی سے پکڑ لیتیں اور وہ سب قہقہے لگانے لگتے۔ پھر انہوں نے دیکھا کہ ایک لڑکی بڑی تیزی سے سڑک پر سائیکل چلاتی ہوئی جا رہی ہے اور ایک نوجوان شخص اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ ان کے لیے یہ ایک دلچسپ منظر تھا لیکن وہ یہ نہ دیکھ سکے کہ اس کا چہرہ کتنا سفید ہو رہا تھا اور وہ جگہ سرخ ہوگئی تھی جہاں اسے تھپڑ لگا تھا۔ اس کی آنکھوں سے خوف جھلک رہا تھا۔

وہ پولیس اسٹیشن پہنچی۔ سائیکل باہر کھڑی کی اور سیڑھیوں کی طرف بھاگی۔ اس وقت انسپکٹر پورٹ، سارجنٹ ٹروٹ سے باتیں کر رہا تھا جب وہ تقریباً اس کے بازوؤں میں گر گئی اور چلاتے ہوئے بولی۔''مجھے بچالو، وہ مجھے مار ڈالے گا۔ اس کے پاس گن بھی ہے۔''

''کون؟'' انسپکٹر پورٹ نے کہا۔

''رونالڈ، رونالڈ ہیریسن۔ میرا منگیتر۔ ہمارے درمیان جھگڑا ہوا اور اس نے کہا کہ وہ مجھے مار ڈالے گا۔ مجھے یقین ہے کہ اس کا یہی مطلب تھا۔''

انسپکٹر اس کا سفید چہرہ دیکھنے لگا جس پر ضرب کا سرخ نشان اور نارنجی رنگ کا زخم نظر آرہا تھا۔ ایک بار پھر دروازہ کھلا اور ایک طویل قامت دبلا پتلا نوجوان شخص اندر داخل ہوا لیکن ساندرہ کو دیکھ کر اس کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔

''ساندرہ! تم یہاں کیا کر رہی ہو؟'' وہ شخص چلاتے ہوئے بولا۔

''تم وہیں کھڑے رہو۔'' انسپکٹر پورٹ نے کہا اور سارجنٹ ٹروٹ اس کے قریب ہوگیا۔ لیکن وہ شخص دیکھنے میں خطرناک نہیں نظر آرہا تھا البتہ کچھ خوف زدہ ضرور تھا اور اس کے پاس گن بھی نہیں تھی۔

''کیا تم نے اس خاتون کو دھمکی دی تھی؟''

''ہاں۔'' ساندرہ چلائی۔''اور اس کے پاس ریوالور بھی تھا۔ اس نے کہا کہ وہ مجھے مار ڈالے گا۔''

''بالکل نہیں۔ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔'' رونالڈ ہیریسن نے کہا۔''اور نہ ہی میرے پاس کوئی گن ہے۔ میں اسے فلیٹ میں ہی چھوڑ آیا ہوں اور وہ بھی بھری ہوئی نہیں ہے۔''

''بہرحال اس نے مجھے دھمکی دی تھی۔'' ساندرہ نے کہا۔ وہ اب نسبتاً پُرسکون دکھائی دے رہی تھی۔''میں خوف زدہ ہوگئی تھی جب اس نے کہا کہ یہ مجھے اور مارکوس دونوں کو گولی مار دے گا۔'' پھر وہ اچانک چلائی۔''اسے

روکو۔''

یہ سنتے ہی وہ شخص پھرتی سے مڑا اور تیزی سے سیڑھیاں اترتا ہوا نیچے چلا گیا۔ وہاں سے اس نے سائیکل اٹھائی اور زور زور سے پیڈل مارتا ہوا دور نکل گیا۔

''اس کا پیچھا کرو۔'' انسپکٹر پورٹ چلایا پھر وہ سانڈرہ اور سارجنٹ ٹروٹ کے ساتھ پولیس اسٹیشن کے عقبی حصے میں آیا جہاں پولیس کار کھڑی ہوئی تھی لیکن جب وہ سڑک پر آئے تو وہ شخص غائب ہو چکا تھا۔

انسپکٹر پورٹ نے کچھ سوچا اور جلدی سے بولا۔ ''مارکوس روم کا فلیٹ کون سا ہے؟ ممکن ہے کہ وہ وہیں گیا ہو۔''

''گراؤنڈ فلور۔ مڈل پوائنٹ۔ میں تمہیں دکھاتی ہوں۔''

''وہ ہے۔'' سانڈرہ نے فلیٹ کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''اور وہ اس کی کھڑکی ہے۔'' فرانسیسی کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور سائیکل اس کے باہر گری ہوئی تھی۔

رونالڈ ہیریسن وہاں موجود تھا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی اور وہ مخالف کھڑکی کے پاس کھڑا ہوا تھا جو ساحل کی طرف کھلتی تھی۔ اس کی نظریں باہر سنہری ریت پر تھیں جس پر چھٹی منانے والوں کے قدموں کے نشانات نظر آرہے تھے اور وہ خاص طور پر اس ڈیک چیئر کو دیکھ رہا تھا جس پر سبز اور سفید کپڑوں میں ملبوس ایک گٹھری پڑی ہوئی تھی۔ اس کے سر پر ایک بڑا سا پانامہ ہیٹ تھا اور کرسی کی پشت پر بڑے سیاہ حروف میں مارکوس روم لکھا ہوا تھا۔

رونالڈ ہیریسن کے دائیں ہاتھ پر ایک میز تھی۔ اس نے آہستہ سے وہ رائفل وہاں رکھی۔ میز پر ایک چھوٹا کارتوس کا ڈبا، تیل کی کپی اور کپڑے کا ٹکڑا پڑا ہوا تھا۔ سانڈرہ نے ایک نظر رائفل اور دوسری رونالڈ کے چہرے پر ڈالی اور کھڑکی کی جانب لپکی۔ اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''تم نے اسے قتل کر دیا۔''

پھر انہوں نے دیکھا کہ سیاہ بڑے حروف کے نیچے ایک سرخ رنگ کا دھبا نظر آرہا تھا۔ سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا لیکن وہاں جمع ہو جانے والے لوگ حیران کھڑے اس پردے کی جانب دیکھ رہے تھے جس کے پیچھے مارکوس مردہ حالت میں پڑا ہوا تھا۔ اس کی پیٹھ میں گولی لگی تھی۔ پندرہ منٹ پہلے رونالڈ ہیریسن پولیس اسٹیشن سے بھاگا تھا اور بظاہر یہ قتل اسی نے کیا تھا اور پانچ منٹ پہلے وہ مارکوس کی کھلی ہوئی کھڑکی کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ مارکوس کی رائفل اس کے ہاتھ میں تھی۔

انسپکٹر پورٹ نے سارجنٹ ٹروٹ اور سانڈرہ جینز کو لاش کے پاس چھوڑا۔ اور خود رونالڈ کو لے کر فلیٹ میں واپس آگیا اور غور سے کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ رائفل میز پر پڑی ہوئی تھی اور کوئی بھی اس سے فائر کر سکتا تھا جو اسے چلانا جانتا ہو۔ مارکوس یقیناً اسے صاف کر رہا ہوگا کیونکہ تیل کا ڈبا اور کپڑے کا ٹکڑا ابھی تک اس کے برابر میں رکھے ہوئے تھے۔

اس نے رائفل کا دھاتی حصہ دیکھا۔ اسے کپڑے کی مدد سے تھوڑی دیر پہلے ہی صاف کیا گیا تھا اور اس پر ہیریسن کی انگلیوں کے نشانات ہوں گے۔ صاف ظاہر تھا کہ رائفل سے حال ہی میں فائر کیا گیا تھا۔

''تم اس بارے میں کیا کہتے ہو؟'' انسپکٹر پورٹ نے ہیریسن سے پوچھا۔

''میں کیا کہہ سکتا ہوں؟'' ہیریسن نے کہا۔ ''میں نے اسے گولی نہیں ماری۔ رائفل میز پر پڑی ہوئی تھی۔ میں نے اسے اٹھایا ہی تھا کہ تم آگئے۔''

''تم اسے مارنے کا ارادہ ظاہر کر چکے تھے۔''

''ہاں، میں نے ایسا کہا تھا۔'' ہیریسن بولا۔ ''اور میں اسی لیے یہاں آیا تھا۔''

''کیوں؟''

''وہ سانڈرہ سے افیئر چلا رہا تھا۔'' ہیریسن نے خفگی سے کہا۔ ''اس کا پتا مجھے آج ہی چلا۔ اس نے سانڈرہ کو ایک خط لکھا جو اسے آج سہ پہر میں ملا جب میں اس کے فلیٹ پر......''

''یہ کس وقت کی بات ہے؟''

''مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں۔ شاید چار بجے کا وقت ہوگا جب ڈاک آتی ہے۔ وہ دروازے پر گئی اور خط اٹھالیا پھر اسے لے کر کچن میں چلی گئی۔ میں نے اسے وہاں خط کھولتے دیکھا۔''

''اس خط میں کیا لکھا تھا؟''

''مجھے نہیں معلوم۔ جب اس نے مجھے آتے دیکھا تو خط کو چولھے میں پھینک دیا لیکن میں نے اسے وہاں سے نکال لیا اور اس کا ایک کونا جلنے سے محفوظ رہا۔ اسے پڑھ کر مجھے معلوم ہو گیا کہ ان کے درمیان کیا چکر چل رہا ہے۔''

''اسے خط لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ تو دس منٹ کے فاصلے پر رہتا تھا۔''

''میرا خیال ہے کہ وہ اس سے تعلق ختم کرنا چاہ رہا تھا۔''

''اگر معاملہ ختم ہو گیا تھا تو پھر تم اسے کیوں قتل کرنا چاہ رہے تھے؟''

''کیا میں یہ برداشت کر سکتا ہوں کہ اس جیسا شیطان ساندرہ کو پریشان کرے۔'' ہیریسن نے کہا۔ ''مجھے اپنے آپ پر قابو نہیں رہا۔ میں چاہتا تھا کہ کسی پر اس کا غصہ اتاروں سو میں ساندرہ سے لڑ پڑا۔ مجھے اس پر افسوس ہے۔''

اس کے ساتھ ہی وہ اچانک پھٹ پڑا اور مارکوس کو بُرے ناموں سے یاد کرنے لگا۔

''ان دونوں کی ملاقات کیسے ہوئی تھی؟'' پورٹ نے پوچھا۔

''ساندرہ نرس ہے۔ وہ یہاں صحت یاب ہونے آیا تھا اور ساندرہ اس کی دیکھ بھال کرنے لگی۔ وہ پورا دن اور آدھی رات تک اس کے ساتھ رہتی۔'' اس نے ناگواری سے کندھے جھٹکتے ہوئے کہا۔

گاڑیوں کے بریک چرچرانے کی آواز آئی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ جگہ پولیس والوں سے بھر گئی۔ سارجنٹ ٹروٹ کی ذمے داری ختم ہو گئی تھی۔ وہ ساندرہ کو لے کر فرانسیسی کھڑکی کے پاس آ گیا۔

''سر، یہ خاتون کچھ کہنا چاہ رہی ہے۔''

''اسے کہو کہ انتظار کرے۔'' پورٹ نے کہا۔ ''ہیریسن! تمہیں پولیس اسٹیشن چلنا ہوگا۔ تم پر مارکوس روم کے قتل کا الزام ہے اور میں تمہیں تنبیہ کر رہا ہوں......''

''میں تمہیں خبردار کر رہی ہوں انسپکٹر۔'' ساندرہ پھٹ پڑی۔ ''وہ شخص رونالڈ کے ہاتھوں نہیں مارا گیا۔ میں نرس ہوں اور جانتی ہوں کہ مارکوس کو مرے ہوئے کئی گھنٹے ہو چکے ہیں۔''

اسے کئی گھنٹے نہیں بلکہ ایک گھنٹا ہوا تھا جب پولیس سرجن نے لاش کا معائنہ کیا یعنی وہ کم از کم آدھ گھنٹے پہلے مر چکا تھا جب انہوں نے رونالڈ ہیریسن کو اس کمرے میں گن میت دیکھا۔

''جس کسی نے بھی یہ قتل کیا ہے اس کا نشانہ بہت اچھا تھا۔'' انسپکٹر پورٹ نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے سارجنٹ ٹروٹ سے کہا۔

''ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو۔'' سارجنٹ ٹروٹ نے کہا۔

''اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا نشانہ اتنا اچھا نہ ہو یا وہ کسی اور کو مارنا چاہ رہا ہو اور غلط آدمی کو گولی لگ گئی۔ ایسی صورت میں اس کا نشانہ بہت بُرا تھا۔''

''کیسی باتیں کر رہے ہو۔ وہ کسی اور کو گولی کیوں مارنے لگا؟'' انسپکٹر نے خفگی سے کہا۔

''کل یہاں ایک عورت آئی تھی۔ مجھے ابھی تک اس کے پرفیوم کی خوشبو آ رہی ہے۔''

''ممکن ہے۔'' ٹروٹ نے اپنی عادت کے مطابق کہا۔

پورٹ نے اسے گھور کر دیکھا تو وہ جلدی سے بولا۔ ''میرا مطلب ہے یہ اس عورت کے سینٹ کی خوشبو ہو سکتی ہے جو ابھی ابھی اندر آئی ہے۔''

وہ ایلسا روم تھی۔ ''فرانسیسی پولیس نے مجھ سے رابطہ کیا تھا۔'' اس نے کہا۔ ''میں ابھی ابھی پیرس سے یہاں پہنچی ہوں۔''

''پچھلے دنوں تم نے کافی سفر کیا ہے میڈم۔'' پورٹ نے کہا۔

''پولیس نے میرا پاسپورٹ چیک کیا ہے۔ میں گزشتہ روز انگلینڈ میں تھی۔''

''اور تم اکیمپٹن بھی آئی تھیں؟''

''تم یہ جانتے ہو؟''

''تمہارا ایک دوست یہاں ہے۔'' پورٹ نے کھڑکی کے قریب جا کر آواز لگائی۔ ''مسٹر جان گریگ!''

جیسے ہی گریگ اندر آیا اور ان دونوں کا آمنا سامنا ہوا تو وہ بولا۔ ''انہوں نے مجھ سے پوچھ گچھ کی ہے ایلسا۔ میں نے سوچا کہ بہتر یہی ہے کہ انہیں سچ بتا دیا جائے کہ میں تمہیں یہاں لے کر آیا تھا اور ہم فلیٹ میں اکٹھے گئے تھے۔''

''تم اسے سبق مت پڑھاؤ۔'' پورٹ نے کہا۔ ''تم سمجھتے ہو کہ یہ کچھ چھپا رہی ہے؟''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''اس نے فرانسیسی پولیس سے جھوٹ بولا کہ وہ یہاں اکیلی آئی تھی۔''

''اس کے پاس چھپانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔'' گریگ نے کہا۔ ''مجھے یہ معلوم نہیں تھا۔''

''مسز روم، تم یہاں کیوں آئی تھیں؟'' پورٹ نے پوچھا۔

''مجھے میرے سابق شوہر نے ایک خط لکھا تھا۔'' ایلسا نے کہا۔ ''مجھے وہ خط پیرس میں پیر کی صبح ملا۔ اس نے کہا تھا کہ میں واپس اس کی زندگی میں آجاؤں۔''

اس نے لمحہ بھر توقف کیا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''اس نے لکھا کہ وہ میرے بغیر بہت اداس ہے اور دوسری عورتوں کے رحم و کرم پر ہے۔ اس نے یہ بھی لکھا کہ اب وہ اِدھر اُدھر دیکھنا چھوڑ دے گا اور میرے ساتھ پُرسکون زندگی گزارے گا۔''

''اور تم چلی آئیں؟ کیا تم نے اس سے ملاقات کی؟''

''نہیں۔'' وہ بولی۔

''شاید تمہاری اس سے بات نہ ہوئی ہو لیکن تم اس فلیٹ میں آئی تھیں۔ میں تمہارے سینٹ کی خوشبو سونگھ سکتا ہوں، خیر چھوڑو۔'' پورٹ نے کہا۔ ''تم اب تک کی کہانی سناؤ۔''

''میں مارکوس سے جھگڑا کرنے آیا تھا۔'' گریگ نے کہا۔ ''لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ میری اس سے ملاقات نہیں ہوسکی۔ البتہ میں نے مسز روم کو فلیٹ کی طرف آتے دیکھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ وہاں کیوں جارہی ہے۔ میں نے کونے کا ایک چکر لگایا اور انتظار کرنے لگا کہ شاید اس کا ارادہ بدل جائے۔''

''اور میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔'' ایلسا بولی۔ ''ہاں انسپکٹر! میں فلیٹ پر آئی لیکن میرا سابق شوہر وہاں نہیں تھا۔ اس نے میرے آنے کا انتظار بھی نہیں کیا اور تب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اپنی حرکتوں سے باز آنے والا نہیں۔ میں ایک بار پھر اس کی حقیقت جان گئی تھی پھر میں نے سوچا کہ میں بھی کتنی بے وقوف ہوں۔ تب میں واپس لوٹ گئی۔''

''تمہاری شوہر سے ملاقات نہیں ہوئی؟''

''نہیں، البتہ جان گریگ میرا انتظار کررہا تھا۔''

''وہ یقیناً تمہارا فیصلہ سُن کر بہت خوش ہوا ہوگا۔''

''ہاں۔'' گریگ نے کہا اور پہلی بار وہ ایک مطمئن شخص نظر آیا۔

''پھر ہم کار میں بیٹھے اور لندن واپس چلے گئے۔''

''تم بھی فلیٹ پر نہیں آئے مسٹر گریگ۔'' انسپکٹر پورٹ نے کہا۔ ''میں تم سے کوئی چالاکی نہیں کررہا لیکن اس سے پہلے کہ تم کوئی جواب دو، میں یہ بتادوں کہ مسز روم کی برانڈی کا ایک گلاس اس جگہ گھاس پر پڑا ہوا ملا ہے جہاں تمہاری کار کھڑی ہوئی تھی۔''

گریگ کا چہرہ سفید ہوگیا۔ ''اوہ ہاں، وہ ایک الگ بات ہے۔'' اس نے کہا۔ ''ایلسا کو گھبراہٹ ہورہی تھی۔ میں اس کے لیے برانڈی لینے آیا تھا۔''

''اوہ اب سمجھا۔ گویا حقیقت یہ ہے کہ تم دونوں فلیٹ میں تھے اور تم میں سے کوئی مارکوس کو گولی مار سکتا ہے۔''

ایلسا نے فوراً کہا۔ ''لیکن ہم میں سے کسی نے اسے گولی نہیں ماری۔ ہم ایسا کیوں کرتے؟ وہ ہماری زندگی سے جاچکا تھا۔''

''یہاں آنے کے بعد یہ تمہارا اچانک فیصلہ بھی ہوسکتا ہے۔'' پورٹ نے کہا۔

''میں نے اسے نہیں دیکھا۔ بلکہ پہچان بھی نہ سکی۔ اس کی پشت میری طرف تھی اور ہیٹ سے چہرہ چھپا ہوا تھا۔''

''تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا؟''

''یہ میں نے اخبار میں پڑھا تھا۔''

''اخبار میں یہ نہیں آیا۔ حقیقت یہ ہے مسز روم کہ تم نے اسے دیکھا۔ وہ تمہاری ناک کے نیچے کسی لڑکی کو بے وقوف بنا رہا تھا۔ لہٰذا تم نے اسے گولی ماردی۔ تم نے اس کی رائفل اٹھائی اور باہر آکر اس کا نشانہ لیا۔ ممکن ہے کہ تم اسے خوف زدہ کرنا چاہ رہی تھیں لیکن تم نے اسے گولی ماردی۔''

اس سے پہلے کہ انسپکٹر کچھ کہتا، سارجنٹ ٹروٹ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا اور اسے فرانسیسی کھڑکی سے باہر لے گیا۔

''یہ قدموں کے نشانات ہیں۔'' ٹروٹ نے ریت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''کیا تم نے انہیں غور سے دیکھا؟''

''تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ کسی عورت کے قدموں کے نشان ہیں۔'' پورٹ نے کہا۔

''یہ صرف ریت میں دو خالی جگہیں ہیں۔''

''ہاں، لیکن دایاں نشان آگے اور بایاں اس سے تھوڑا سا پیچھے ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے تصور میں ایک رائفل اٹھائی اور اس سے نشانہ لینے لگا۔

''بایاں پاؤں آگے ہے۔'' اس نے کہا اور ایلسا کو دیکھنے لگا جو اپنے دائیں ہاتھ سے ہونٹوں میں سگریٹ دبائے کھڑی تھی اور جان گریگ اپنے دائیں ہاتھ سے اس کا سگریٹ سُلگا رہا تھا۔

''جس کسی نے بھی مارکوس روم کو گولی ماری وہ بایاں ہاتھ استعمال کرتا ہے۔'' اس نے کہا۔

''تھوڑی دیر خاموشی رہی پھر انسپکٹر پورٹ بولا۔ ''مارکوس کو ساحل پر ملنے والی لڑکی بایاں ہاتھ استعمال کرتی ہے۔'' لیکن اس نے ٹوسٹی جین کا نام نہیں لیا۔

اگلے روز یعنی بدھ کو انسپکٹر پورٹ اور سارجنٹ لروٹ صبح نو بجے کے قریب ساندرہ جین کے فلیٹ پہنچے جہاں ٹوسٹی جین ٹھہری ہوئی تھی۔ وہ بھی ایلسا روم کا سینٹ استعمال کرتی تھی۔ ''میں ہمیشہ سے یہ سینٹ لگاتی ہوں۔ ایلسا میری پسندیدہ اداکارہ ہے۔'' اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔

''تم مسٹر روم سے محبت کرتی تھیں؟''

''ہاں۔'' وہ روتے ہوئے بولی۔ ''میں ہی وہ بدنصیب ہوں جس نے آخری بار اس سے بات کی، وہ بہت ہی پیارا......''

انسپکٹر نے اسے ہمدردی سے دیکھا۔ اتنی خوب صورت لڑکی روتے ہوئے اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

اس کی بہن ساندرہ نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''اس پر رحم کرو انسپکٹر۔ یہ بہت تھک چکی ہے۔ صبح سے شام تک اخبار والوں اور دوسرے لوگوں کے فون آرہے ہیں۔ اسے بالکل آرام نہیں مل رہا۔''

''بالکل، وہ اس لیے دلچسپی لے رہے ہیں کیونکہ میں اس وقت مارکوس کے پاس تھی اور اس کے مرنے تک اس کی محبت میں ڈوبی ہوئی تھی۔''

''جینی ڈارلنگ! کیا تم ٹھنڈا دودھ پینا پسند کروگی؟''

''نہیں ساندرہ، اس سے میرا وزن بڑھ جائے گا۔''

''مس جینز۔'' انسپکٹر پورٹ نے ساندرہ سے کہا۔ ''میں تمہاری بہن سے تنہائی میں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

''میں اسے تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔ یہ میرا گھر ہے۔''

''پھر میں اسے پوچھ گچھ کے لیے پولیس اسٹیشن لے جاؤں گا۔''

ساندرہ کچھ ہچکچائی پھر وہاں سے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد انسپکٹر نے کہا۔

''میں سمجھتا ہوں کہ تمہارا نشانہ کافی اچھا ہے۔''

''ہاں، میں گھر پر ڈیڈی کے ساتھ نشانہ بازی کی مشق کیا کرتی تھی۔''

''لہٰذا تم رائفل کلب چلی گئیں تاکہ مسٹر روم سے جان پہچان پیدا کرسکو۔''

''میری بہن کبھی اس سے میرا تعارف نہ کرواتی۔ میرا خیال ہے کہ وہ حاسد ہے۔'' ٹوسٹی نے کہا۔ ''کیونکہ اب مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ خود بھی اس سے محبت کرنے لگی تھی لیکن میں نے اسے اہمیت نہیں دی۔ وہ چاہتی تھی کہ میں فلموں میں کام کروں۔''

''یعنی تمہاری بہن کو معلوم نہیں تھا کہ تم مسٹر روم کو جانتی ہو؟''

''نہیں، میں خفیہ طور پر مسٹر روم سے ملنے آئی تھی۔ ساندرہ کو تو اس کے مرنے تک بھی معلوم نہیں تھا کہ میں یہاں ہوں۔ پہلے تو میں صرف یہ چاہتی تھی کہ وہ کیریئر بنانے میں میری مدد کرے لیکن پھر ہم ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے اور اب شادی کرنے والے تھے۔''

''لیکن اس نے تو اپنی سابقہ بیوی کو خط لکھا تھا۔''

''ہاں، وہ اسے اس بارے میں بتانا چاہ رہا تھا۔''

''یہ بات سمجھ سے باہر ہے۔'' انسپکٹر پورٹ نے کہا۔ ''حقیقت یہ نہیں ہے بلکہ وہ تمہیں اپنی بیوی کے بارے میں بتانے والا تھا جب اس روز تم اس کے برابر میں بیٹھی ہوئی تھیں۔'' انسپکٹر نے اس پر نظریں جمائے ہوئے کہا۔ ''وہ پہلے ہی کئی عورتوں سے قطع تعلق کر چکا تھا اور اپنی بیوی کے پاس واپس جانے میں بالکل مخلص تھا لیکن تمہیں یہ بات پسند نہیں آئی۔''

''تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ میں نے اسے گولی ماری ہے۔'' ٹوسٹی جین چلاتے ہوئے بولی۔ ''تمہیں بتا رہی ہوں کہ میں اس سے محبت کرتی تھی۔''

''تم نے گولی چلنے کی آواز بھی نہیں سنی؟''

''یہاں ہر طرف پٹاخوں کا شور تھا اور میں پورے وقت اس کے ساتھ نہیں رہی بلکہ لولی خریدنے چلی گئی تھی۔''

''تم فلیٹ پر بھی گئی تھیں۔'' انسپکٹر نے خیال ظاہر کیا۔

''میں نہیں گئی۔'' ٹوسٹی نے دوبارہ رونا شروع کر دیا۔ ''میں نہیں گئی۔''

قریب سے دیکھنے پر انسپکٹر کو معلوم ہوا کہ اس کی ہچکیاں آنسوؤں سے خالی تھیں۔ ''کسی نے مجھے اس کے فلیٹ پر جاتے ہوئے دیکھا۔ تم جانتے ہو کہ کسی نے نہیں۔''

''اس روز کسی نے کسی کو نہیں دیکھا۔ وہ سب ساحل پر مصروف اور خوش و خرم تھے۔ کسی نے اس پر توجہ نہیں دی

کہ پیراکی کے لباس میں ایک لڑکی کیا کررہی ہے۔''

''ٹوسٹی نے غصے سے کہا۔''اگر وہ مجھے نہیں دیکھ رہے تھے تو انہوں نے مارکوس کو تو دیکھا ہوگا۔''

''حقیقت یہ ہے کہ کسی نے تم پر توجہ نہیں دی۔ لہٰذا تم ان کی نظروں میں آئے بغیر فلیٹ پر گئیں۔ میز پر سے رائفل اٹھائی۔''

''میں نے رائفل نہیں اٹھائی۔ وہ بولی۔''وہ میز پر نہیں تھی۔''

انسپکٹر حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگا۔ وہاں سے بہت دور کسی جگہ پر ساندرہ ہیریسن، ایلسا اور گریگ آپس میں بحث کررہے تھے۔ انہیں بالکل بھی علم نہیں تھا کہ فلیٹ میں کیا ہورہا ہے۔''یہ انتہائی ناقابلِ یقین ہے۔'' ایلسا بولی۔''یہاں بیٹھے ہوئے ہم چار لوگوں میں سے کوئی ایک یقینا قاتل ہے۔''

''یا پھر ٹوسٹی جینن۔'' رونالڈ ہیریسن نے کہا۔

☆☆☆

چار رنجیدہ اور خوف زدہ لوگ جمعرات کی سہ پہر آپس میں ملے۔ یعنی ایلسا روم، ٹوسٹی جینن، جان گریگ اور مرنے والی لڑکی کا منگیتر رونالڈ ہیریسن۔ پولیس صبح سے ان سے پوچھ گچھ کررہی تھی۔ اب انہیں آپس میں ملنے کا موقع ملا تھا۔ پولیس نے فلیٹ اپنی تحویل میں لے لیا تھا اور وہ ایک چٹان پر بیٹھے باتیں کررہے تھے۔''

''کیا اس کا یہ مطلب لیا جائے۔'' جان گریگ نے رونالڈ ہیریسن سے کہا کہ''پولیس کے خیال میں پہلے اس نے مارکوس روم کو گولی ماری اور پھر خود کو ختم کرلیا۔''

''میرا خیال ہے کہ وہ یہی سمجھ رہے ہیں۔'' اس نے اپنا نچلا ہونٹ کاٹتے ہوئے جواب دیا۔

''یہ سب میری غلطی ہے۔'' ٹوسٹی سسکیاں لیتے ہوئے بولی۔''اس نے مجھے بچانے کے لیے ایسا کیا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ پولیس مجھے گرفتار کرلے گی۔ میں نے کئی جھوٹ بولے اور اس کے لیے اداکاری بھی کی۔''میرا خیال تھا کہ اگر مجھ پر اس قتل کا شبہ کیا گیا یا میں گرفتار کرلی گئی تو اس سے مجھے بہت شہرت ملے گی۔ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ بعد میں رہا ہو جاؤں گی کیونکہ واقعتاً یہ قتل میں نے نہیں کیا تھا۔ لہٰذا میں نے یوں ظاہر کیا جیسے مارکوس کو اچھی طرح جانتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ساندرہ تمام رپورٹرز کو مجھ سے ملا رہی تھی اور میں خبروں میں آرہی تھی۔

''پھر میں نے یوں ظاہر کیا جیسے میں مارکوس کے فلیٹ میں تھی اور کہا کہ میز پر رائفل نہیں رکھی ہوئی تھی۔ حالانکہ میں وہاں نہیں گئی۔ مجھے کیا معلوم کہ وہاں رائفل تھی یا نہیں لیکن صرف مقتول ہی میری بات کی تردید کرسکتا تھا۔''

اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا اور سسکیاں لیتے ہوئے بولی۔''اور سب سے زیادہ خوفناک بات یہ ہے کہ اس کی قربانی کے باوجود وہ اب بھی مجھے گرفتار کرلیں گے۔''

''لیکن اگر اسی نے قتل کیا ہو۔''

ٹوسٹی روتے ہوئے بولی۔''وہ کیسے کرسکتی تھی۔ وہ الٹے ہاتھ سے کام نہیں کرتی۔''

ایلسا روم اور جان گریگ کے درمیان نگاہوں کا تبادلہ ہوا۔ گریگ نے کہا۔''جینی، ایک غم دوسرے پر غالب آجاتا ہے۔ تمہیں خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم جانتی ہو کہ تمہاری بہن نے اسے قتل کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ قاتل کھبا نہیں تھا۔''

''تمہارا مطلب ہے؟''

''اس کا یہی مطلب ہے۔'' ایلسا بولی۔''اس روز میں مارکوس سے اس کی درخواست پر ملنے آئی تھی۔ اس نے قسمیہ کہا تھا کہ وہ تمام عورتوں سے تعلق ختم کرچکا ہے اور ایک نئی زندگی شروع کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا میں وہاں آئی۔ وہ ساحل پر بیٹھا ایک خوب صورت لڑکی سے فلرٹ کررہا تھا۔ میں نے اسے نہیں مارا۔ رائفل میز پر پڑی ہوئی تھی اور میں اسے اٹھا سکتی تھی لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں مڑی اور فلیٹ سے باہر آگئی۔''

''اس کے پانچ منٹ بعد میں برانڈی لینے گیا۔'' گریگ نے کہا۔''میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ وہ وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس کی کرسی پر نام پڑھا اور خون کا دھبا دیکھا پھر میری نظر رائفل پر گئی اور ریت پر پڑے ہوئے نشان دیکھے۔ وہ کسی کے قدموں کے نشان تھے۔ بایاں پاؤں آگے۔ یعنی اس نے دائیں ہاتھ سے گولی چلائی تھی۔ میں نے سوچا کہ یہ گولی ایلسا نے چلائی ہوگی۔ لہٰذا اسے بچانے کا ایک ہی طریقہ تھا۔ میں نے ریت پر دو نئے نشان بنادیے جو کسی کھبے کے تھے۔''

''مجھے یہ معلوم نہیں تھا۔'' اس نے ٹوسٹی سے کہا۔''کہ اس طرح تم اس معاملے میں ملوث ہوجاؤ گی۔ اب تم سمجھ سکتی ہو کہ ساندرہ نے اسے قتل کیا ہوگا۔ وہ دایاں ہاتھ استعمال کرتی تھی۔''

رونالڈ ہیریسن نے احتجاجاً کچھ کہنا چاہا لیکن ایلسا

پہلے بول پڑی۔ ''وہ دوا جو اس نے لی......؟''

''وہ نرس تھی۔'' رونالڈ نے کہا۔ ''اس کے پاس فلیٹ میں دوائیں ہوتی تھیں۔ تم نے خود دیکھا ہوگا کہ وہ جینی کی طرف سے کتنی پریشان تھی۔ میں اسے سمجھاتا رہا کہ جینی کو کوئی خطرہ نہیں لیکن اس نے میری بات کا یقین نہیں کیا۔ اس کی نیند غائب ہو چکی تھی۔ لگتا یہی ہے کہ اس نے غنودگی کے عالم میں خواب آور گولیوں کی زیادہ مقدار لے لی۔''

''کیا تم نہیں سمجھتے کہ اس کا ارادہ خودکشی کا نہیں تھا۔ یہ محض ایک حادثہ بھی ہوسکتا ہے۔''

''مجھے ڈر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔'' ایلسا بولی۔ ''اگر اس نے ہی مارکوس کو قتل کیا تھا۔''

''بالکل نہیں، اس نے مارکوس کو قتل نہیں کیا۔'' ٹوسٹی چلاتے ہوئے بولی۔

☆☆☆

پولیس اسٹیشن کے لان میں بیٹھے ہوئے انسپکٹر پورٹ نے سارجنٹ ٹروٹ سے کہا۔ ''اس نے تین خط بھیجے تھے۔ ایک ایلسا روم کو پیرس میں، دوسرا لندن میں جان گریگ اور تیسرا ساندرہ جینز کو یہاں اسکیمپٹن میں اس کے فلیٹ پر۔''

''ان خطوط کا مارکوس کے قتل سے کیا تعلق ہے؟'' ٹروٹ نے پوچھا۔

''صرف مارکوس ہی نہیں بلکہ ساندرہ بھی قتل ہوئی ہے کیونکہ میں نہیں سمجھتا کہ اس نے خودکشی کی ہوگی اور نہ ہی اس کی موت ایک حادثہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسے قتل کیا گیا ہے۔''

''میں بھی یہی سمجھتا ہوں کیونکہ وہ سمجھتی تھی کہ اس کی بہن خطرے میں ہے کیونکہ وہ ان خطوط کے بارے میں بہت کچھ جانتی تھی۔''

''یاد کرو کہ جس دن وہ خط لکھے گئے وہ مارکوس کے فلیٹ میں تھی یعنی جمعے کے روز۔''

''ان میں سے ایک ہفتے کے روز سپردِ ڈاک کیا گیا جو مسز روم کو پیر کے روز پیرس میں ملا۔''

''دوسرا جان گریگ کو ہفتہ کے روز لندن میں ملا لیکن اس نے پیر کے روز اسے کلب جا کر وصول کیا لیکن وہ ضائع کر دیا گیا۔'' انسپکٹر پورٹ نے سرد لہجے میں کہا۔ ''جان گریگ کا کہنا ہے کہ اس خط میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ سوائے اس کے کہ وہ ایلسا کو واپس آنے کے لیے کہہ رہا ہے۔ مارکوس نے لکھا تھا کہ وہ تمام عورتوں سے تعلق ختم کر چکا

محمد علی جناحؒ...... کراچی کے ماہ و سال، شادی تک

☆6 سال کی عمر میں گھر پر گجراتی ٹیوشن کی ابتدا۔

☆9 سال کی عمر میں قریبی پرائمری اسکول میں داخلہ۔

☆اسکول جانے سے گریز اور دو ماہ کے لیے والد صاحب کے دفتر میں آمدورفت۔

☆دفتر سے اکتاہٹ، اسکول میں واپسی کا مطالبہ۔

☆پرانے اسکول میں واپسی مگر حساب میں کمزوری۔

☆10 برس کی عمر میں سندھ مدرستہ الاسلام میں گجراتی کی چوتھی جماعت میں داخلہ۔

☆نصاب سے عدم دلچسپی اور پھوپھی کے ساتھ بمبئی روانگی۔

☆ممبئی کے انجمن الاسلام اسکول میں داخلہ اور گجراتی کی چوتھی جماعت میں کامیابی۔

☆کراچی واپسی۔ 23 دسمبر 1887ء کو سندھ مدرستہ الاسلام میں دوبارہ داخلہ۔

☆5 جنوری 1891ء کو انگریزی کی چوتھی کلاس سے اسکول کو خیرباد۔

☆لارنس روڈ (حالیہ نشتر روڈ) کے ایس ایم ایس ہائی اسکول میں داخلہ۔

☆اسکول ناپسند۔ 9 فروری 1891ء کو سندھ مدرستہ اسلام میں تیسری بار داخلہ۔

☆گراہمز ٹریڈنگ کمپنی کے انگریز جنرل منیجر کی طرف سے لندن میں 3 سالہ کاروباری تربیت کی پیشکش۔

☆مٹھی بائی (والدہ) پریشان۔ جناح پونجا (والد) رضامند۔

☆والدہ کو خوف کہ کنوارے بیٹے کو ولایت بھیجنا خطرناک ہوسکتا ہے۔

☆ایمی بائی سے شادی کی تجویز۔ محمد علی جناح کی ہچکچاہٹ کے بعد رضامندی۔

☆ 30 جنوری 1892ء کو سندھ مدرستہ الاسلام کی انگریزی کی پانچویں جماعت سے رخصتی (بسلسلۂ عقد مسنونہ)

☆کراچی سے دیراوالی کی بندرگاہ کے ذریعے آبائی گاؤں، پانیلی میں آمد اور شادی کی پُرشکوہ تقریب۔

☆دلہن والوں کا سماجی رسوم پر اصرار، وہ تین ماہ یا کم از کم ایک ماہ سے پہلے اپنی بیٹی کو کراچی بھیجنے پر آمادہ نہیں تھے۔

☆ جناح پونجا کے کاروباری تفکرات، مواصلاتی رابطے مفقود یا انتہائی سست وہ فوری طور پر کراچی جانے کے خواہاں۔ مٹھی بائی اپنے شوہر کی دیکھ بھال کے لیے ان کے ساتھ جانے پر کمربستہ۔ محمد علی اپنے والدین کے ہم خیال۔

☆دونوں خاندانوں میں تناؤ اور سخت کشیدگی۔

☆بڑوں میں مذاکرات، مباحثے۔ محمد علی خاموش تماشائی۔

☆ مفاہمت کی سب کوششیں ناکام ہونے پر محمد علی کسی کو بتائے بغیر، خاموشی سے اپنی سسرال پہنچے اور کہا کہ وہ جب تک چاہیں اپنی بیٹی کو گھر رکھیں۔ وہ خود اپنے والدین کے ساتھ کراچی جارہے ہیں۔ وہاں سے 3 سال کے لیے یورپ چلے جائیں گے۔ شاید ان کی بیٹی اپنے شوہر کی عدم موجودگی میں کراچی پہنچے گی۔ اس بے باکانہ گفتگو نے مسئلہ حل کر دیا۔ والدین ایمی بائی کو فوراً سسرال بھیجنے پر آمادہ ہوگئے۔

ہے اور اس نے ایلسا کے ساتھ ایک نئی زندگی گزارنے کا وعدہ کیا ہے۔''

انسپکٹر نے چند لمحوں کے لیے خاموشی اختیار کی پھر بولا۔ ''اس خط میں ایک جملہ بلکہ ایک لفظ ایسا ہے جو ہمیں پوری کہانی بتا رہا ہے اور جس سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے جو میں کئی دن پہلے جان گیا تھا۔''

''کون سا لفظ؟''

''اس نے have استعمال کیا اور کہا کہ وہ تمام عورتوں سے تعلق ختم کر چکا ہے۔''

''اور اس ایک لفظ نے تمہیں بتا دیا کہ قاتل کون ہے؟''

''ہاں، یہ بھی اچھا ہوا کہ اس وقت سب لوگ یہاں موجود ہیں۔'' انسپکٹر پورٹ نے کہا۔

گریگ نے اس خط کے مندرجات کئی مرتبہ دہرائے لیکن یہ پہلی بار ہوا ہے کہ اسے صحیح جملہ یاد آ گیا۔ ''میں تمام عورتوں سے تعلق ختم کر چکا ہوں۔''

''اور اس جملے سے تم سب کچھ سمجھ گئے؟'' رونالڈ ہیریسن نے کہا۔

''اس جملے نے مجھے ایک بات بتائی۔ ایک میں پہلے سے جانتا تھا۔ ان دونوں کو ملایا تو تیسری بات سامنے آئی۔''

اس نے دو آدمیوں کی طرف اشارہ کیا اور وہ غیر محسوس طریقے سے تھوڑا آگے بڑھے۔ ''میں قاتل کو جانتا ہوں۔'' انسپکٹر نے کہا پھر وہ چلّایا۔ ''اسے پکڑلو۔''

ان پانچ دنوں میں دوسری بار ایسا ہوا کہ رونالڈ ہیریسن مڑا اور پولیس اسٹیشن کے دروازے سے باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد انسپکٹر پورٹ نے کہا۔ ''مارکوس روم نے جمعے کی شب جان گریگ کو جو خط لکھا۔ اس میں کہا۔ ''میں نے تمام عورتوں سے تعلقات ختم کر دیے ہیں۔ یہ نہیں لکھا کہ تعلق ختم کر رہا ہوں یا کر دوں گا۔''

''اسی شام اس نےساندرہ جینز کو بھی خط لکھا پھر وہ اسے پیر کو کیوں ملا؟''

''نہیں، وہ خط ساندرہ کے فلیٹ پر ہفتے کی سہ پہر تقریباً چار بجے پہنچ گیا تھا۔ رونالڈ ہیریسن وہاں موجود تھا۔ ان کے درمیان جھگڑا ہوا اور اس نے اسے مارا۔ غالباً پیر تک ان میں صلح ہو گئی لیکن اس کے دماغ میں ایک خلش پیدا ہو گئی۔ وہ مارکوس سے ملنے چلا گیا شاید اس سے لڑنے یا اسے زدوکوب کرنے۔ فرانسیسی کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور رائفل بھی وہاں موجود تھی۔ وہ بڑی آسانی سے اس کا نشانہ لے سکتا تھا۔''

پورٹ نے لحہ بھر رک کر دروازے کی طرف دیکھا پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''لیکن اس کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ وہ متوقع نتائج سے خوف زدہ تھا، پھر مسز روم وہاں آ گئی۔ وہ پردے کے پیچھے چھپ کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ کھڑکی کی طرف گئی اور دیکھا کہ مارکوس روم ایک لڑکی کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔ مسز روم فلیٹ سے چلی گئی لیکن وہ اس لڑکی کا چہرہ دیکھ چکی تھی۔''

''پھر وہ ہو گیا جو وہ نہیں چاہتا تھا۔ اس کا قتل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ لیکن اس نے مارکوس کو قتل کر دیا۔ وہ دوڑتا ہوا ساندرہ کے پاس گیا۔ وہ اس کی منگیتر تھی اور شاید اس نے محسوس کیا کہ یہ جرم اس کی اپنی بے وفائی کی وجہ سے سرزد ہوا ہے۔ اس کے علاوہ مارکوس نے بھی اسے دھتکار دیا تھا اور کوئی عورت یہ برداشت نہیں کر سکتی۔ چنانچہ وہ اس کی مدد کرنے پر تیار ہو گئی۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ ہیریسن کی جائے وقوعہ سے غیر موجودگی ظاہر کی جائے۔ اس نے ہیریسن سے کہا کہ وہ اس کے چہرے پر اس طرح ضرب لگائے کہ معلوم ہو چوٹ ابھی لگی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ پیر کو بینک ہالی ڈے تھا۔ اس دن کوئی ڈاک نہیں جاتی چنانچہ وہ خط ہفتے کو ہی آیا ہوگا۔''

''بشرطیکہ اسے دستی پہنچایا گیا ہو۔'' ٹروٹ نے کہا۔

حقیقت میں ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ خط مارکوس نے خود ساندرہ کے دروازے کے نیچے سے اندر پھینکا تھا۔

''پہلے ساندرہ پولیس اسٹیشن آئی اور اس کے پیچھے رونالڈ آیا لیکن اس سے پہلے ہی جرم سرزد ہو چکا تھا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو مارکوس کی لاش ملی۔ یہ صرف ساندرہ جانتی تھی لیکن اس کی بہن نے شہرت حاصل کرنے کے لیے خود کو مشتبہ ظاہر کرنا شروع کر دیا۔ ساندرہ کو ڈر ہوا کہ کہیں پولیس اسے گرفتار نہ کر لے۔ ادھر رونالڈ کو بھی خدشہ تھا کہ کہیں ساندرہ اپنی بہن کو بچانے کے لیے اصلی قاتل کا نام نہ بتا دے چنانچہ اس نے اسے بھی راستے سے ہٹا دیا۔ بہرحال وہ زیادہ دور نہیں جا سکتا۔ ہم اسے جلد ہی پکڑ لیں گے۔''

ایلسا اور گریگ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ رونالڈ نے ان کا کام کتنا آسان کر دیا تھا۔

حاسد

مظہر سلیم ہاشمی

خوش قسمت ہونا بھی خوش قسمتی سے کسی کسی کے نصیب میں ہوتا ہے... وہ پیدائشی قسمت کا دھنی تھا... زندگی کے اہم اور غیر اہم مرحلوں پر اس کی قسمت نے ہمیشہ اسے نوازا... پھر مشکل گھڑی میں جب موت کے سائے سر پر منڈلا رہے تھے... تب بھی اس کی قسمت نے اس کا ساتھ نہ چھوڑا... مختصر مگر منفرد مزاج کی دلچسپ کہانی...

ایک ایسے پروانے کی محبت کا چراغ...... جو دوسروں کے دیے سے جل بجھ رہا تھا......

کہانی ذرا انوکھی ہے اور میری نہیں بلکہ کیرول اور لکی چکی کی ہے۔

وہ ہائی اسکول کے آخری ایّام تھے کہ مجھے کیرول کے حاملہ ہونے کی اندوہناک خبر ملی۔ پچھلے ڈیڑھ دو برس سے مجھے اس کے ساتھ قربت کا کوئی موقع نہیں مل سکا تھا۔ پر اس سے مجھے ایسی محبت تھی کہ قصوروار نہ ہونے کے باوجود...... میں اسی حال میں اس سے شادی کے لیے تیار ہو گیا۔ میں اس بچے کا باپ نہیں تھا لیکن بچپن سے ہی مجھ میں شرافت کوٹ کوٹ کر بھری تھی سو میں نے اپنا اکاؤنٹنگ کالج جانے کا خواب بھی تیاگ دینے کا فیصلہ کر لیا مگر میرے سارے سپنے بکھر کر رہ گئے۔ میرے کچھ کہنے سے قبل ہی کیرول نے اعتراف کر لیا کہ بچے کا باپ چک دلاچ ہے...... نتیجتاً وہی اس کا شوہر بنا۔

چک نے عجیب قسمت پائی تھی...... اپنی خوش قسمتی سے زیادہ اسے دوسروں کی بدقسمتی سے ہمیشہ فائدہ پہنچا۔ فٹبال میں کوارٹر بیک کو موچ آئی تو چک کو اس کی جگہ مل گئی۔ سالانہ ڈرامے کے مقابلے میں پیٹر بوائڈ کھانسی کے مرض کا شکار ہوا تو بتائیں کون اس کے متبادل کے طور پر آیا؟...... صحیح پہچانے...... وہ چک دلاچ ہی تھا۔ اسی وجہ سے حلقۂ احباب میں وہ 'لکی چکی'

کے نام سے بھی جانا جاتا تھا۔

مجھے غلط مت سمجھیں، میں اعتراف کرتا ہوں کہ چک کی آواز بڑی مردانہ اور پاٹ دار تھی۔ اس کی آواز میں کامیابی کا نشہ ایسے گونجتا تھا جیسے اس کے علاوہ فتح مند ہونا کسی کا نصیب ہی نہ ہو۔ حسیناؤں کے جھرمٹ میں وہ اکثر پایا جاتا تھا، حتیٰ کہ کیرول بھی اس پر مرمٹی تھی۔ ان لڑکیوں نے ہی اس احمق کو کلاس کا صدر بنایا تھا۔ دماغ سے زیادہ جسم بنانا اس کا نعرہ تھا۔ ہمیشہ چست جینز کے ساتھ جل سے سیٹ کیے بالوں میں وہ مجھے کسی بطخ کے مانند لگتا تھا۔

لیکن یہ سب کچھ قصۂ پارینہ بن چکا ہے۔ اب بیس سال بعد ان باتوں کو کون یاد رکھے۔ میں بھی سب کچھ بھول کر معاف کر چکا ہوں...... سوائے کیرول کے...... وہ اب بھی رگ و جاں میں بستی ہے۔

چک کے باپ نے ہائی اسکول کے واقعے کی ہزیمت سے بچنے کے لیے اسے کالج بھیجنے کی زحمت نہیں کی۔ فوراً ہی اپنے خاندانی کاروبار کے تحت چلنے والی فیکٹری میں ایک انتظامی عہدے پر لگا دیا۔ اس دوران میں بھی مزید تعلیم کے لیے روانہ ہوگیا اور وہیں دل لگانے کی کوشش کرتا رہا۔

چند سال کے بعد میری واپسی بڑے ہی نامساعد حالات میں ہوئی۔ میرے والد فارم پر کام کرتے ہوئے تھریشر میں غلطی سے پاؤں دے بیٹھے اور والدہ کو سوائن فلو کی بیماری نے جکڑ لیا۔ ان دونوں کو کسمپرسی میں تڑپتا چھوڑنے کی مجھ میں تاب نہ تھی اس لیے لوٹ آیا۔ فارم پر کام کرنے کی میری ہمت تھی اور نہ ہی میں نے کبھی اس کی کوشش کی۔ جو شخص کھیتوں میں کام نہیں کرتا تھا اس کے لیے ہمارے قصبے میں صرف ایک ہی متبادل جگہ تھی...... ولاچ بس باڈی مینوفیکچررز۔

اب میں اپنے منہ میاں مٹھو نہیں بننا چاہتا کہ میں کوئی بہت بڑا ماہر شماریات ہوں، کیونکہ میں نہیں ہوں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اعداد کے ساتھ کچھ بھی کرنا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ یہ بات چک بخوبی جانتا تھا کیونکہ وہ ہائی اسکول کے کھیلوں کے دوران میرا کمال اسکور بورڈز پر دیکھ چکا تھا۔

''ولاچ کمپنی میں شمولیت بہت بہت مبارک ہو۔'' پہلے دن وہ اپنی گونج دار آواز میں بولا۔

میرے سابقہ ٹیلنٹ اور کالج کے کورسز اس کو قائل کرنے کے لیے کافی تھے۔ میں بھی ولاچ کمپنی کا حصہ بن چکا تھا۔

''شکریہ۔'' میں نے مختصر ترین جواب دینے پر اکتفا کیا۔

ولاچ بس کمپنی نے مجھے فوری طور پر اپنے اسٹور میں رکھ لیا۔ میرے جیسے اعلیٰ دماغ کو کسی چھوٹے موٹے سیکشن میں رکھنا بے وقوفی ہی ہوتی۔ بسیں بنانے والی یہ کمپنی...... نئی سیٹ لگاتے ہوئے کس طرح جگہ کو کم کرتی تھی تاکہ زیادہ سواریاں آسکیں یا پھر آٹومیٹک ڈور کی تنصیب کے لیے کیا کیا گھپلے کیے جاتے تھے، ان کی تفصیلات میں آپ کو بتاؤں تو آپ حیران رہ جائیں گے لیکن یہ کہانی ان کے بارے میں نہیں ہے۔

یہ تو چک اور اس کی ایلوس پریسلے کی نقالی کرنے کی کہانی ہے۔ میں نے کمپنی میں چک کی نسبت کافی کم عرصہ گزارا لیکن جانے کیوں مجھے محسوس ہوا کہ وہ کمپنی کی صدارت میں دلچسپی آہستہ آہستہ کھونے لگا تھا۔ اپنے کاروبار سے اس کی یہ بے اعتنائی حیران کن تھی پر مجھے کوئی خاص فکر نہیں تھی۔ اس کی غیر موجودگی میں کمپنی کا کرتا دھرتا میں ہی تھا۔ وجہ تو سادہ سی تھی کہ میں یہ کام اس سے کہیں بہتر کرنا جانتا تھا لیکن چک ولاچ کا ایلوس ثانی بننے کا جنون اس معاملے میں میرا معاون ثابت ہوا۔

اس نے اپنی قلموں کو تراشنا چھوڑ دیا اور ایلوس کی طرح بڑی بڑی کرلیں جو اس کے چہرے کی چوڑائی کو مزید بڑھا دیتی تھیں۔ میرے بالوں میں جب چاندی اتری تو میں نے خندہ پیشانی سے اسے قبول کرلیا لیکن چک نے بالوں کو گہرا سیاہ رنگنا شروع کر دیا جو نظروں کو بہت گراں گزرتا تھا۔

میں اس کے جل تھوپ کر بنائی گئی بالوں کی مرغے جیسی کلغی کی بات نہیں کر رہا۔ یہ تو اس کے بٹن کھلے سینے سے نکلتے رنگے ہوئے بال تھے جن کو دیکھ کر کراہت سی طاری ہو جاتی تھی۔ جی ہاں، آپ صحیح سمجھے، وہ آفس میں ٹائی لگا کر آنے کی زحمت بھی نہیں کرتا تھا۔ دو سال قبل جب اس کے والد نے کمپنی کی صدارت سے ریٹائرمنٹ لے کر معاملات چک کو سونپے تو وہ بے قابو ہوگیا۔ مجھے یقین ہے کہ میری بدولت کمپنی اپنے پیروں پر کھڑی تھی ورنہ نااہل چک کمپنی کا مالک نہ ہوتا تو اسے کھڑے کھڑے فارغ کر دیا جاتا۔

''تم نہ ہوتے تو میں اپنے شوق کیسے پورے کرتا۔'' بے ڈھنگے انداز میں کی گئی اس کی تعریف مجھے متاثر نہیں کر سکی تھی لیکن میں نے بھی منافقت کا سہارا لیا۔

''تم بھی تو میرے بہترین دوست ہو، اتنا سب تو میں تمہارے لیے اب کر ہی سکتا ہوں۔'' سینے میں سلگتی آگ کو نظر انداز کر کے میں نے چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔

''شکریہ دوست...... شکریہ۔'' جذبات سے مغلوب ہوتے اس نے مجھے گلے سے لگالیا۔

میں نے بمشکل ابکائی روکی اور اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے خود سے الگ کیا۔ اب خود اندازہ لگالیں آپ کہ مجھے جاب پر ذہنی ٹارچر کے ساتھ ساتھ جسمانی ٹارچر بھی برداشت

کرنا پڑتا تھا۔

اس سال ہونے والی کمپنی پکنک پر وہ ایک بھڑکیلا سنہرا اسکن ٹائٹ لباس پہن کر وارد ہوا۔ تھل تھلاتا ہوا اس کا بدن کئی نامناسب جگہوں سے نمایاں ہو رہا تھا لیکن اسے اپنی عزت کی کوئی پروا نہ تھی۔

''آپ سب کے لیے پیش ہے میرا نیا گانا۔'' مائیک سنبھالتے ہی وہ بولا۔

جانے کہاں سے تین ہم نوا آ گئے جو اپنے آلاتِ موسیقی کے ساتھ اس کی بے سری آواز میں سُر تال ملانے لگے۔ یہ کہنے میں مجھے کوئی عار نہیں کہ وہ گانے بجانے والے نہ آتے تو اس کی بے سری آواز میں کوئی کشش نہ تھی۔ گانے کے ساتھ اس کے ٹھمکے کئی لوگوں کے لیے قہقہوں کا باعث بن رہے تھے۔ گانے کے اختتام پر جب ہمارے آفس بوائے ٹام نے کرسی پر چڑھ کر اُسے داد دی تو میں اندر سے سلگ اٹھا۔

''بے چاروں کو سال کے دو سو پینسٹھ دن کام کرنے کے باوجود کیسے چاپلوسی کرنی پڑتی ہے؟'' میں نے با آواز بلند تبصرہ کیا۔

پھر چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ میری بات سننے کے لیے کوئی آپ پاس نہیں تھا۔ آفس کے لوگ میری قابلیت سے حسد کرتے تھے اور میں خود بھی عام لوگوں کو منہ لگانے کا قائل نہ تھا اس لیے سب مجھ سے فاصلے پر ہی رہتے تھے۔

یہ میری اندرونی جلن نہیں تھی لیکن میں نے کیرول کے چہرے پر شرمندگی کے تاثرات واضح دیکھے۔ وہ پارٹی میں ایک جالی کے کام والا اسکرٹ پہن کر آئی تھی۔ اس کا سحر انگیز حسن میری آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا لیکن میں حالِ دل کو آج بھی زباں پر لانے سے قاصر تھا۔

''بہترین ڈارلنگ...... تم نے تو کمال ہی کر دیا...... ایک اور ہو جائے۔'' اپنے پُھدکتے مینڈک جیسے شوہر پر وہ بھی کھل کر داد و تحسین کے ڈونگرے برسا رہی تھی۔

میں دیکھ سکتا تھا کہ وہ بحالتِ مجبوری یہ سب کر رہی تھی، آخر اسے سال کے تین سو پینسٹھ دن جو اس بے ہودہ شخص کے ساتھ گزارنے ہوتے تھے۔ میں نے کبھی انہیں چھٹی منانے کے لیے تفریحی مقام پر جاتے نہیں دیکھا تھا۔

کیرول جیسی حور کے پہلو میں بیٹھا چک کسی لنگور سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ دوسری جانب کیرول بڑھتی عمر کے ساتھ روز بروز خوبصورت ہوتی جا رہی تھی۔ چالیس کے پیٹے میں ہوتے ہوئے بھی تنگ سا اسکرٹ اگر اس پر جچ رہا تھا تو اس کی یہی وجہ تھی کہ وہ خود کا بے حد خیال رکھتی تھی۔

''تم کیوں کونے میں تنہا بیٹھے ہو؟'' اس نے مسکراتے ہوئے مجھ سے سوال کیا تو میں بس پلکیں جھپکائے اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

چک آفس کے دیگر لوگوں کے ساتھ 'پارٹی' کرنے میں اتنا محو تھا کہ اپنی لاکھوں میں ایک بیوی سے بھی غافل ہو چکا تھا۔

''میرے ساتھ چل کر ہماری ٹیبل پر بیٹھو۔'' کیرول نے میرا ہاتھ تھامتے ہوئے مجھے اس ٹیبل سے اٹھا دیا جہاں میرے سوا کوئی نہیں تھا۔ میں اس کی آنکھوں میں اپنے لیے وارفتگی محسوس کر سکتا تھا۔ ہاں بھی کبھی مجھے شک ہوتا کہ وہ نگاہ ہمدردی کی بھی ہو سکتی تھی پر میرا دل اس بات کو قبول کرنے سے انکار کر دیتا۔

'نہیں...... یہ بس محبت ہے...... اور کچھ بھی نہیں۔' میرے ذہن نے فوراً اس سوچ کی تردید کر دی۔

میں کسی ٹرانس میں آئے معمول کے مانند اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کی ٹیبل تک آ گیا۔

لنچ کے دوران میں بھی اس کی آنکھیں بولتی رہیں اور میں سنتا رہا۔ وہ آنکھوں سے اپنے دکھڑے بیان کرتی رہی اور میں انہیں اپنے دل میں اتارتا رہا۔ اس کی مسکراہٹ مجھے دھوکا نہیں دے سکتی تھی۔ وہ لاکھ چھپائے لیکن میں اس کے دل کا کرب محسوس کر سکتا تھا۔ اس دن مجھے احساس ہوا کہ ہم دونوں کی زندگی ایک دوجے کے بنا کتنی خالی تھی۔ وہ زباں سے کچھ نہیں بولی تھی لیکن میں سمجھ چکا تھا کہ اس کے دل کی پکار کیا کہتی ہے...... اس دن ہی میں نے ایک فیصلہ کیا...... چک کی موت کا فیصلہ...... ہم دونوں کے بیچ کی دیوار کے گرانے کا وقت آ گیا تھا۔

☆☆☆

''تمہیں بھی ابھی چھٹی پر جانا تھا؟'' چک کے لہجے میں بیزاری بھری ہوئی تھی۔ ''حالانکہ تم جانتے ہو کہ ایلوس کے پرستاروں کا سالانہ مقابلہ ہونے والا ہے...... اور میری شمولیت تو ضروری ہے۔''

''مجھے نہیں معلوم تھا۔'' میں اپنے لہجے میں معصومیت لاتے ہوئے بولا۔ ''ورنہ میں رک جاتا...... اب تو میں اپنے ٹکٹ بھی کرا چکا ہوں۔''

''ہاں ہاں...... میں جانتا ہوں۔'' وہ سر کو جھلاتے ہوئے بولا۔ ''اور تمہاری تو اتنی چھٹیاں کمپنی پر بقایا ہیں کہ اگر تم چاہو تو پانچ ماہ تک گھر بیٹھے تنخواہ لیتے رہو۔''

میں اس کی بات پر صرف مسکرا کر رہ گیا لیکن اتنا عرصہ کام سے دوری کا تصور ہی مجھے اندر سے لرزا گیا تھا۔

''ٹھیک ہے تم جا سکتے ہو...... میں پاپا کو دو دن کی ریٹائرمنٹ سے چھٹی دے دوں گا...... گھر بیٹھے بیٹھے وہ بھی اکتا جاتے ہیں۔'' چک نے فیصلہ کن انداز میں کہا تو میں نے اطمینان کی سانس لی۔

اپنے گھر واپس آکر میں نے ایک بار پھر سے اپنے فول پروف منصوبے کا جائزہ لیا۔ میں نے چک کو راہی ملکِ عدم کرنے کا بڑا سادہ سا منصوبہ بنایا تھا جس میں غلطی کا امکان ہی نہیں تھا۔ کیرول کا تصور ہمہ وقت میرے منصوبے کی نوک پلک درست کرتا رہتا۔ میں اپنے خیالوں میں ہی کیرول کو اس کامیابی پر خود کو سراہتے ہوئے محسوس کرتا تھا۔

میں یہ بات بہت پہلے سے جانتا تھا کہ چک نے مارچ میں ایلوس پریسلے کے ماسک میں اس کے پرستاروں کے ایک مقابلے میں شرکت کے لیے فیس جمع کرائی تھی۔ چک واحد اکلوتا بے وقوف نہیں تھا بلکہ ملک میں ایسے بہت سے گدھے موجود تھے جو کہ اپنے کلغی جیسے بالوں کو رنگ کر خود کو ایلوس پریسلے سمجھ لیتے تھے۔ ہمارے قصبے سے سو میل دور شہر میں ہونے والے اس مقابلے میں کوئی ایک سو چھتیس لوگ شامل ہو رہے تھے۔ ان میں ایک میرا اضافہ ہو جاتا تو کس کو خبر ہوتی؟

میں بالوں کو رنگنے کے لیے پہلے سے ایک عارضی اثر والا خضاب خرید چکا تھا۔ ایلوس پریسلے کے ماسک کا حصول بھی بے حد آسان ثابت ہوا۔ جب میں مقابلہ منعقد کرانے والے ہوٹل پہنچا تو کوئی مجھے شناخت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اپنا غلط نام و پتا بتا کر بکنگ کرائی تھی اس لیے کمرا حاصل کر کے میں نے سکون سے بیٹھ کر اپنی گن کو چیک کیا۔ امریکا میں حفاظت کے نام پر ایسی گنز بہت آسانی سے مل جاتی ہیں، آپ کی جیب میں بس ادائیگی کے لیے رقم ہونی چاہیے۔

میری ہنسی نہیں رک رہی تھی کیونکہ منصوبے پر عمل درآمد بے حد سہل رہا۔ مجھے چھپنے کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ گواہی دینے والے زیادہ سے زیادہ یہی بیان دے سکتے تھے کہ ایلوس جیسا نظر آنے والے شخص نے گن نکال کر دوسرے کو مارا اور بھیڑ میں غائب ہو گیا۔

میں نے بالکل یہی کیا۔ ہال روم میں پہنچ کر چک کو اس کے واہیات سنہرے لباس میں پہچان لیا۔ میں نے گن نکالی تو برسوں کی دل میں دبی نفرت عود کر آئی۔ میری آنکھوں کے سامنے کیرول کا چہرہ لہرا رہا تھا جس نے اپنی زندگی کے قیمتی ایام اس چک کے ساتھ برباد کر دیے تھے۔ میرا گن والا ہاتھ خود بخود بلند ہوا اور میں نے فائر کر دیا۔

”ٹھاہ......“ گن فائر کی آواز سے جیسے میں اپنے حواسوں میں واپس آ گیا۔

میں نے چک کو ایک جانب گرتے دیکھ لیا تھا۔ فوراً سے پہلے اپنی گن گرا کر میں ہجوم میں شامل ہو گیا تا کہ کوئی جیالا ہاتھ میں گن دیکھ کر مجھے دبوچ نہ لے۔ ہاتھوں پر دستانوں کی موجودگی کے باعث مجھے فنگر پرنٹس کا بھی کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ افراتفری کے دوران مجھے نکلنے کا موقع مل گیا۔

فلائٹ پکڑ کر اپنے گھر واپسی تک کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ میں خضاب دھو کر چین کی نیند سو گیا۔ برسوں سے لگی آگ ٹھنڈی پڑ چکی تھی۔ میں کیرول کو اپنی بانہوں میں تصور کرتا میٹھے سپنوں میں کھو گیا۔

☆☆☆

اگلی صبح آفس جاتے ہوئے مجھے اطمینان تھا کہ کوئی مجھ سے چھٹیوں کے بارے میں نہیں پوچھے گا۔ میں نے کسی کو خود کے ساتھ اتنا بے تکلف ہونے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ مگر وہاں پر چک کو دیکھ کر مجھ پر تو جیسے کوئی بم ہی گر گیا۔

”آؤ آؤ ہیکرڈ...... دیکھو چک نے ایلوس کے مقابلے میں تیسری پوزیشن حاصل کی ہے۔“ آفس بوائے ٹام نے میرے داخل ہوتے ہی نعرہ لگایا۔

میری تو دنیا جیسے اندھیر ہو گئی۔ سب لوگ چک کو گھیرے ہوئے تھے۔ میری چلائی گولی اس کے بازو کو رگڑتی ہوئی جس ایلوس نما کو لگی تھی، وہ پولیس کو تین ریاستوں میں مختلف جرائم کے سلسلے میں مطلوب تھا۔ چک کو بنا کسی وجہ کے سب لوگوں نے ایک بار پھر ہیرو بنا دیا تھا۔ اخبار اور ٹی وی والے اس کے انٹرویو لے رہے تھے۔ میں بھی مبارک باد دے کر ایک طرف ہو گیا۔

اس واقعے کے کا میری توقع کے خلاف نتیجہ نکلا۔ سب لوگ چک کو کوئی سپر اسٹار سمجھنے لگے، خاص طور پر کیرول۔ وہ ہر وقت اس سے چپکی رہنے لگی۔ واقعے کے باعث ہوٹل والوں نے جب چک کو بیگم کے ساتھ چھٹیاں گزارنے کے لیے ہنی مون سوئٹ کا فری پیکیج دیا تو اس کی مسرت دیدنی تھی۔ وہ اٹھلاتی ہوئی میرے پاس آئی۔

”کیا تم ہمیں ائرپورٹ تک چھوڑ دو گے؟“ کیرول نے مجھ سے پوچھا تو میں چک سے نفرت کے باوجود انکار نہ کر سکا۔

وہ خوبصورت پری اب بھی دیو کی قید میں تھی...... بنا بولے اس کی پکار میرے کان سن سکتے تھے۔ اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ بظاہر چک سے والہانہ محبت کرتی رہی لیکن میں......ہاں، میں اس کے دل کا حال خوب جانتا تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ کیرول دل و جان سے مجھے چاہتی ہے۔ میں اب بھی اس کی آنکھوں میں اپنے لیے محبت دیکھ سکتا تھا۔ گاڑی چلاتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ کبھی کی قسمت کسی دن تو ضرور اس کا ساتھ چھوڑے گی اور آخر کار میں اپنی کیرول کو پانے کے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

مشکل ہدف

تنویر ریاض

امریکا اور روس کے درمیان نہ ختم ہونے والی سیاسی چپقلش کی سنسنی خیزی... دونوں ممالک ایک دوسرے کے خلاف کسی نہ کسی مہم جوئی میں ہمہ وقت مصروفِ کار رہتے ہیں... بظاہر خوب صورت اور خوش اطوار نظر آنے والے خفیہ اداروں کے سفاک ایجنٹوں کا کھیل... وہ اپنے اپنے وطن کی بقا کے لیے دوسرے ملک کی جڑوں کو کھوکھلا کررہے تھے...

ٹھوس بنیادوں پر تخلیق کیے گئے منصوبوں کے تباہ کن نتائج......

البرٹ لیمن نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ نارتھ ورجینیا میں خزاں کا موسم شروع ہو چکا تھا اور ہر طرف درختوں سے گرے ہوئے پتے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ اڑتیس سال کا ہو چکا تھا۔ قد چھ فٹ سے کچھ کم۔ زمانۂ طالب علمی میں بیس بال کا اچھا کھلاڑی رہ چکا تھا۔ پیشے کے لحاظ سے وہ یونیورسٹی پروفیسر تھا لیکن ان دنوں سینٹرل اینڈ

ایسٹرن یورپ ڈیسک میں تجزیہ کار کے طور پر کام کر رہا تھا۔
سامنے بیٹھے ہوئے ڈائریکٹر نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا اور بولا۔ ''ٹونی کوفمین زخمی ہو گیا ہے۔ تم اسے جانتے ہو؟''

''نہیں۔ میں نے اس کا نام سنا ہے۔ کیا وہ کلینڈ اسٹائن سروسز میں تھا؟''

یہ ادارہ سی آئی اے کی ایک شاخ ہے جو بھیس بدل کر جاسوسوں کے ذریعے دوسرے ملکوں میں کارروائی کرتا ہے۔

''وہ بچ جائے گا لیکن کچھ عرصے کے لیے کام کرنے کے قابل نہیں ہو سکے گا۔ اسے میونخ کے نزدیک ایک گاڑی نے ٹکر ماردی۔''

''کیا یہ......؟''

''نہیں، یہ واقعی ایک حادثہ تھا۔''

اس کا مطلب ہے کہ روسی خفیہ ادارے ایس وی آر، کسی دوسری خفیہ ایجنسی یا دہشت گرد تنظیم نے اسے مارنے کی کوشش نہیں کی۔

ڈائریکٹر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''گزشتہ آٹھ ماہ سے وہ اس نیٹ ورک کے خلاف ایک آپریشن میں مصروف تھا اور کسی حد تک اسے نقصان پہنچا چکا تھا۔ تم اس بارے میں جانتے ہو؟''

''کچھ زیادہ نہیں۔'' لیمن نے کہا۔ ''صرف اتنا معلوم ہے کہ نیٹ ورک امریکا کے خلاف کام کر رہا ہے اور ماسکو کی کسی بڑی شخصیت نے ایک سال پہلے اسے قائم کیا تھا۔''

''روستیکوف۔'' ڈائریکٹر منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ اس کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ اور روستیکوف پرانے دشمن ہیں اور روسی اس کھیل میں جیت رہے ہیں۔

ڈائریکٹر نے اس نیٹ ورک کے طریقۂ کار کے بارے میں بتایا کہ روسی منحرف امریکی شہریوں اور غیر ملکیوں کو ویب سائٹ کے ذریعے تلاش کر کے بھرتی کرتے ہیں اور انہیں ایسے کام دیے جاتے ہیں جن سے امریکا غیر مستحکم ہو۔ مثلاً لابنگ کرنا یا اخبارات اور سوشل میڈیا پر ایسے مضامین لکھنا جن کا مقصد جمہوری قدروں کو کمزور کرنا اور ہمارے انتخابات پر اثر انداز ہونا ہے۔''

ڈائریکٹر نے غصے سے فائل پر ہاتھ مارتے ہوئے لیمن کو بتایا کہ یہ ایجنٹ امریکا کو غیر مستحکم کرنے کی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ انہوں نے سیاہ فام کے جلوسوں میں اشتعال پھیلایا۔ پناہ گزینوں کے خلاف ہونے والے مظاہروں کی حوصلہ افزائی کی اور یونیورسٹی انتظامیہ میں ایسے لوگوں کی حمایت کی جنہوں نے طالب علموں کی جنسی بے راہ روی پر آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔

''اب جنوب مغربی پولینڈ جاتے ہوئے ٹونی کوفمین بھی زخمی ہو گیا ہے۔ اس نے اپنے ذرائع سے معلوم کر لیا تھا کہ روستیکوف کا ایک آدمی اور اس کا بھائی دو دن میں وہاں پہنچنے والے ہیں۔ بظاہر وہ ہرن کا شکار کرنے آرہے ہیں جبکہ ایسا نہیں ہے۔ اس نے معلوم کر لیا تھا کہ وہ دونوں کس ہوٹل میں قیام کریں گے۔ کوفمین بھی اس کے قریب ہی ایک ہوٹل میں ٹھہرتا اور ان کے بار میں جا کر ان سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتا۔''

''اس طرح وہ ان سے پینگیں بڑھا لیتا۔''

''بالکل، اس نے ایک ایسے شخص کا روپ دھار رکھا تھا جیسا وہ اپنے نیٹ ورک کے لیے چاہتے ہیں۔''

''گویا اس سلسلے میں روستیکوف کی آمد بھی وہاں متوقع تھی۔''

''نہیں۔ اس میں خطرہ ہے لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم کسی شخص کو پولینڈ کی سرزمین پر اغوا نہیں کر سکتے۔ اس سلسلے میں وارسا کے قوانین بڑے واضح ہیں۔ بلغاریہ، چیکوسلواکیہ وغیرہ میں ہم یہ کارروائی کر سکتے ہیں لیکن پولینڈ میں نہیں۔ ہمیں خوشی ہوتی کہ روستیکوف کے آدمی کوفمین کو بھرتی کر لیتے۔ اس طرح ہم اس سے ڈبل ایجنٹ کا کام لے سکتے تھے۔ اگر ہم ایک سال پہلے یہ آپریشن شروع کر دیتے تو ہمیں تیس چالیس فیصد تک کامیابی ہو سکتی تھی۔''

ڈائریکٹر نے لیمن کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اب تمہیں اندازہ ہو گیا ہو گا کہ کیا کرنا ہے؟''

لیمن نے چونکتے ہوئے کہا۔ ''تم چاہتے ہو کہ میں اس کی جگہ لے لوں۔''

''کوفمین پوٹومیک یونیورسٹی کے پروفیسر کے روپ میں وہاں جاتا۔ اس کے علاوہ یہ پروفیسر واشنگٹن ڈی سی میں ایک تھنک ٹینک کا بھی ممبر ہے۔ اس کے پہلے ہی کچھ امریکا مخالف مضامین اور بلاگز شائع ہو چکے ہیں۔ تم بھی پروفیسر رہ چکے ہو اور تمہارے کئی علمی مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ میں نے بھی تمہاری رپورٹیں پڑھی ہیں۔ تم جملوں کا استعمال جانتے ہو۔ اس کے علاوہ روسی اور پولش زبان میں بھی تمہیں مہارت ہے۔''

یہ ایک بہت ہی خطرناک قسم کا خفیہ کام تھا۔ آفیشل کور کا مطلب آپ کسی سرکاری ادارے سے وابستہ ہوتے ہیں لیکن اپنے اصل کام کے بجائے جاسوسی کرتے ہیں۔ آپ کا تعلق زیادہ تر سفارت خانہ سے ہوتا ہے اور سیکیورٹی فورسز آپ کی حفاظت کرتی رہتی ہیں لیکن نان آفیشل کور میں کوئی تحفظ نہیں ہوتا۔ اگر ایک بار پکڑے گئے تو رات کی تاریکی میں گولی ماردی جاتی ہے۔

لیمن نے لمحہ بھر کے لیے سوچا پھر بولا۔ ''میں تیار ہوں۔''

☆☆☆

دو دن بعد البرٹ لیمن پراگ ائرپورٹ پر جہاز سے اُتر رہا تھا۔ پاسپورٹ، کریڈٹ کارڈ اور دوسری دستاویزات کے مطابق اب وہ لیمن نہیں بلکہ پیٹر کرین شا تھا۔ وہ واشنگٹن کی پوٹو میک یونیورسٹی کا باصلاحیت پروفیسر، کئی مقالوں کا مصنف اور ایک معروف تھنک ٹینک کا رکن تھا۔ لیکن اس کی زندگی ایک مشکل دور سے گزر رہی تھی۔ اس کی دو بیویوں سے طلاق ہو چکی تھی اور وہ ابھی تک ان کے مطالبات بھگت رہا تھا۔ اسے شراب پینے کی بھی عادت تھی۔ دوسرے لفظوں میں وہ روستیکوف کے ایجنٹ کے لیے بہترین چارہ تھا۔

امیگریشن کے مرحلے سے گزرتے وقت وہ بڑی بے چینی محسوس کر رہا تھا کیونکہ اسے زندگی میں پہلی بار کسی سرکاری اہلکار کے سامنے اپنی شناخت کے حوالے سے جھوٹ بولنا پڑا۔ اس نے ممکنہ سوالات کے جواب دینے کے لیے بڑی محنت سے اپنا فرضی نام اور دیگر تفصیلات یاد کی تھیں لیکن نوجوان آفیسر نے کچھ پوچھنے کے بجائے اس کے کاغذات دیکھے اور مہر لگا دی۔

کسٹم کے مرحلہ سے گزرنے کے بعد وہ باہر آیا تو اس کی ملاقات اسٹین اسمائلز سے ہوئی جو پہلے ڈیلٹا فورس میں تھا پھر اس نے سی آئی اے میں شمولیت اختیار کرلی۔ اب وہ امریکی سفارت خانہ میں اکنامک ڈیولپمنٹ آفیسر کے طور پر خدمات انجام دے رہا تھا جو محض ایک بہروپ تھا۔ درحقیقت وہ مشرقی یورپ میں تعینات خفیہ ایجنٹوں کی نگرانی کر رہا تھا گو کہ لیمن پہلے کبھی اس سے نہیں ملا لیکن اس نے محسوس کیا کہ وہ اسے جانتا ہے۔ وہ خفیہ معلومات بھیجنے کا اہم ذریعہ رہ چکا تھا جن کا تجزیہ کرنے میں لیمن کو گھنٹوں لگ جاتے تھے۔

''ہمیں اس میں جانا ہے۔'' اسمائلز نے ایک بڑی سیڈان کار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ گاڑی میں ایک گہرے سانولے رنگ کا شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اسمائلز نے اس کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ ''یہ ولیم ہے۔''

''ہائے، کیا حال ہیں؟'' لیمن خوش دلی سے بولا۔

ولیم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسمائلز نے پوچھا۔ ''باس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''

''ڈائریکٹر۔'' لیمن چونکا ہوتے ہوئے بولا۔ ''کیا اس کا امتحان لیا جارہا ہے۔'' اس نے ایک نظر ولیم پر ڈالی اور محتاط انداز میں بولا۔ ''سچی بات تو یہ ہے کہ جب اس نے مجھے بلایا تو حیران رہ گیا کیونکہ میں کافی جونیئر ہوں۔''

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کر تمہارا انتخاب کیا ہوگا۔ پوشیدہ رہ کر کام کرنا بھی ایک آرٹ ہے۔ لوگوں کو کئی سال تربیت دینے کے بعد اس طرح کی ذمے داری دی جاتی ہے لیکن یہ نیٹ ورک اس کے لیے ایک کانٹا بن کر رہ گیا ہے۔ جب کوفمین کو حادثہ پیش آیا تو ڈائریکٹر کو اسٹروک ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔''

''مجھ پر ایسا کوئی دباؤ نہیں ہے۔'' لیمن نے کہا۔

''اچھی بات ہے۔ ہم تقریباً تین گھنٹے میں سرحد پر پہنچ جائیں گے۔ وہاں سے کوستکا تقریباً پانچ میل کے فاصلے پر ہے۔''

لیمن نے پوچھا۔ ''سرحد پار کرنے میں کوئی مسئلہ تو نہیں ہوگا؟''

''پولینڈ اور جمہوریہ چیک دونوں ہی یورپی یونین کے ممبر ہیں لیکن پناہ گزینوں کی وجہ سے کچھ ملکوں نے اپنی سرحدوں پر سختی کردی ہے لیکن یہاں ایسا کچھ نہیں ہے۔ ہم نے تصدیق کرلی ہے کہ روستیکوف کا نمبر ون ایجنٹ بورس بخارن آج صبح کوستکا پہنچ گیا ہے اس کا بھائی جانتا ہے کہ بورس شکاری نہیں ہے۔ اس کا درآمدات کا کاروبار ہے۔''

''یہاں وہ شکار کھیلنے آرہا ہے۔''

''ہاں وہ شہر کے مرکز میں واقع چوبن لاج میں ٹھہرے ہوئے ہیں گو کہ اسے مرکزِ شہر نہیں کہا جاسکتا کیونکہ پورے قصبے کی آبادی تقریباً پانچ ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔'' اس نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے نرمی سے کہا۔ ''تمہاری دوسری بیوی کا نام کیا ہے؟''

''اینڈریا۔ وہ نارتھ کیرولینا میں ایک سو سات ساؤتھ میل ڈرائیو پر رہتی ہے۔ یہ مجھے اس لیے معلوم ہے

کہ میں اس پتے پر اسے ہر مہینے چیک بھیجتا ہوں۔‘‘
اسائلز نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔’’بہت خوب۔‘‘ پھر اس نے اپنے بریف کیس میں ہاتھ ڈال کر بورس بخارن اور اس کے بھائی کی تصویریں نکالیں۔لیمن نے غور سے انہیں دیکھا۔
اسائلز نے کہا۔’’اب میں جان گیا ہوں کہ تم کافی ذہین ہو لیکن اس آپریشن میں سب سے اہم بات مشکل ہدف سے کھیلنا ہے۔تم اچھی طرح سمجھ گئے ہو کہ انہیں اپنے نیٹ ورک کے لیے کس کی تلاش ہے لیکن انہیں شبہ بھی ہوسکتا ہے۔‘‘
’’وہ کیسے؟‘‘
’’ہم نے اس بات کو بالکل راز میں رکھا ہے کہ ہمیں کوستکا میں بخارن کی موجودگی کا علم ہے۔ روستیکوف اور ماسکو کو یہ توقع نہیں ہوگی کہ ہم یہاں کوئی کارروائی کررہے ہیں لیکن ان کی فطرت میں شک شامل ہے اور اسی چیز نے انہیں برسوں سے کامیاب اور زندہ رکھا ہوا ہے۔ ان کے پاس دنیا کے بہترین جاسوس ہیں۔وہ تمہیں ترغیب دیں گے لیکن اگر تم نے دلچسپی دکھانے میں جلد بازی کی تو وہ مشکوک بھی ہوسکتے ہیں۔‘‘
’’گویا یہ ایک مشکل ہدف ہے؟‘‘
’’ایک بار وہ تمہارے پیچھے لگ گیا تو یہ اتنا مشکل نہیں ہوگا۔تم نے ہمارے فون نمبر یاد کرلیے ہیں؟‘‘
لیمن نے وہ نمبر اس کے سامنے دہرا دیے۔تین گھنٹے کا سفر طے کرنے کے بعد وہ کوستکا پہنچ گئے۔ یہ ایک درمیانے درجے کا قصبہ تھا جس میں زیادہ تر عمارتیں سوویت دور کی بنی ہوئی تھیں جبکہ چند ایک جدید طرز تعمیر کا نمونہ تھیں۔
’’ہم تمہیں یہاں اتار دیتے ہیں۔اس سے پہلے کہ کسی خفیہ کیمرے کی زد میں آجائیں۔ اگر کوئی پوچھے تو بتا دینا کہ پراگ سے کرائے کی کار میں آئے ہو۔‘‘ پھر اس نے ایک عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔’’یہ ہے تمہارا ہوٹل۔‘‘
’’تم یہاں کیوں نہیں ٹھہرے؟‘‘
’’میں پولش نہیں بولتا اور مجھے ڈر تھا کہ ان کی زبان نہیں سمجھ پاؤں گا۔‘‘
’’بہت خوب۔‘‘
’’سڑک کے پار چوبن ہے جہاں بخارن اور اس کا بھائی ملیں گے۔تم ریستوران کے بہانے وہاں چلے جانا۔‘‘

لیمن گاڑی سے اُترا...اور ڈکی سے اپنا سوٹ کیس نکال کر فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔ ہوٹل کی لابی میں پہنچ کر اس نے اپنے حواس درست کیے۔سوٹ میں ملبوس ڈیسک کلرک فون پر کسی سے بات کررہا تھا۔ اس نے لیمن پر مشتبہ نگاہ ڈالی جیسے وہ کوئی بے روزگار شخص ہو اور ملازمت کی تلاش میں آیا ہے۔ اس نے فون رکھ کر پوچھا۔’’ٹک‘‘ (کیا ہے؟)
’’معذرت چاہتا ہوں۔کیا تم انگریزی بول سکتے ہو؟‘‘
’’ہاں۔‘‘
’’کیا مجھے دو دن کے لیے ایک کمرا مل سکتا ہے؟‘‘
’’میں دیکھتا ہوں۔‘‘
ہوٹل تقریباً خالی تھا۔اس لیے لیمن کو امید تھی کہ اسے بہ آسانی کمرا مل جائے گا لیکن ڈیسک کلرک نے کہا۔’’فی الحال ایک ہی کمرا دستیاب ہے اور وہ بہت مہنگا ہے۔‘‘
’’ٹھیک ہے۔وہی دے دو۔‘‘
’’پاسپورٹ۔‘‘ اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا اور اسے غور سے پڑھنے لگا۔لیمن کئی ملکوں میں جا چکا تھا لیکن اس نے کسی ہوٹل کلرک کو اتنی توجہ سے پاسپورٹ پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔کلرک نے اس کی ایک کاپی بنائی اور پاسپورٹ واپس کاؤنٹر پر رکھ دیا پھر وہ رجسٹریشن شیٹ پر کچھ لکھنے لگا۔
عقبی کمرے سے ایک تقریباً بیس سالہ ملازم سیاہ پتلون، سفید قمیص اور پتلی سی ٹائی لگائے ہوئے برآمد ہوا۔ منیجر نے اسے گھور کر دیکھا اور پولش زبان میں بولا۔’’یہ تم نے کیا پہن رکھا ہے۔تمہارے پاس کوئی اور ٹائی نہیں ہے۔ میں نے تم سے کیا کہا تھا؟ کیا تم چاہتے ہو کہ تمہیں ملازمت سے فارغ کردیا جائے اور تم بھی اپنی بہن کی طرح سڑکوں پر لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلاؤ۔‘‘
’’میرے پاس یہی ایک ٹائی ہے۔اسے میں نے دھولیا تھا۔‘‘ لڑکے نے جواب دیا۔
’’میں کوئی بہانہ نہیں سننا چاہتا۔ جاؤ بازار سے کوئی اچھی ٹائی خرید کرلاؤ۔‘‘
’’میں...... میری گنجائش نہیں ہے۔‘‘ لڑکے نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔
’’ٹھیک ہے۔آج تم اسے پہن سکتے ہو لیکن دوبارہ یہ تمہارے گلے میں نظر نہیں آنی چاہیے۔ ورنہ تم ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔‘‘

''جی جناب! معذرت چاہتا ہوں۔'' لڑکے نے کہا اور ریستوران میں چلا گیا۔

منیجر لیمن کی جانب متوجہ ہوا اور رجسٹریشن شیٹ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے دستخط کرنے کے لیے کہا۔ لیمن نے فارم پُر کیا اور دستخط کر کے منیجر کے حوالے کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مقامی کرنسی میں دو دن کا پیشگی کرایہ بھی ادا کر دیا۔

منیجر نے شیٹ کا بغور معائنہ کیا اور کمرے کی چابیاں لیمن کو دیتے ہوئے بولا۔ ''ڈائننگ روم صبح چھ بجے سے رات گیارہ بجے تک کھلا رہتا ہے۔''

''شکریہ۔ میں کہیں بھی کھانا کھا لوں گا۔''

لفٹ کے پاس پہنچ کر لیمن نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ منیجر رجسٹریشن شیٹ پر کچھ لکھ رہا تھا۔

شام سات بجے وہ نہا دھو کر سوئمنگ ٹراؤٹ ریستوران پہنچا۔ وہاں کا بار بہت بڑا تھا اور دیواروں پر جنگلی جانوروں کی تصاویر لگی ہوئی تھیں گو کہ وہاں تمباکو نوشی ممنوع تھی لیکن سگریٹ کا دھواں ہر جانب پھیلا ہوا تھا۔ ہال میں داخل ہوتے ہی لیمن کی نظر بخارن اور اس کے بھائی پر گئی۔ ان کے ساتھ دو آدمی اور بھی تھے جو یقیناً شکاری ہی ہوں گے۔ اگر وہ روسی خفیہ ایجنسی کے لوگ ہوتے تو اسمائلز ان کے بارے میں ضرور بتاتا۔ وہ چاروں ہال کے وسط میں ایک گول میز پر بیٹھے ووڈکا اور بیئر سے دل بہلا رہے تھے۔

اب اسے کسی طرح ان لوگوں کی نظروں میں آنا تھا۔ اس نے لمبے تڑنگے گنجے بارٹینڈر سے کہا۔

''پلیز مجھے ایک ووڈکا آئی پیسو چاہیے۔''

وہ آدمی اسے گھورتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں پیسو چاہیے؟''

بخارن سمیت بہت سے لوگوں نے مڑ کر انہیں دیکھا۔ اس آدمی نے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''اس نے پیسو کا آرڈر دیا ہے۔ انگریزی میں اسے پیشاب کہتے ہیں۔''

اس بات پر لوگوں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور لیمن کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا، وہ بولا۔ ''مجھے افسوس ہے۔ میرا مطلب ووڈکا آئی پیور تھا۔''

''اچھا، اچھا۔ میں وہی دوں گا اور وہ میری طرف سے ہو گی کیونکہ تم بہت دلچسپ آدمی ہو۔''

اس نے دو گلاس میز پر لا کر رکھ دیے۔ لیمن نے ووڈکا کو ہاتھ نہیں لگایا اور بیئر کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے لگا۔ اچانک ہی اس کے فون کی گھنٹی بجی۔ یہ فون کال نہیں بلکہ الارم تھا۔ اس نے اسکرین کی طرف دیکھا اور منہ بناتے ہوئے الارم بند کر دیا پھر یوں ظاہر کرنے لگا جیسے ٹیلی فون پر کسی سے باتیں کر رہا ہو۔

''ہاں، مجھے تمہاری ای میل مل گئی تھی۔ میں تمہیں کیوں جواب دیتا۔'' اس نے ایک اور ووڈکا کے لیے اشارہ کیا اور اسے بھی زمین پر پھینک دیا۔ ''تم یہ مطالبہ کیسے کر سکتی ہو؟ تم سمجھتی ہو کہ میرے پاس بہت پیسا ہے تاکہ تم اسے جیک پر خرچ کر سکو۔ نہیں وہ شخص تمہارا دوست نہیں ہے۔ تم اس کے ساتھ راتیں گزارتی ہو۔''

اس نے کوشش کی کہ ضرورت سے زیادہ ردِعمل ظاہر نہ کرے۔ ''وکیل کی فیس میں کیوں ادا کروں۔ ہمارے درمیان طلاق ہو چکی ہے اور میں گزارے کی رقم کے علاوہ کسی اور ادائیگی کا پابند نہیں ہوں۔ میں کاروبار کے سلسلے میں پولینڈ آیا ہوا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

چند لمحوں بعد اس نے اپنے قریب کسی کی موجودگی محسوس کی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو بخارن بار کاؤنٹر پر جھکا ہوا تھا۔ ''تم امریکن ہو مسٹر پیسو؟''

''ہاں، تم مذاق اچھا کر لیتے ہو۔''

''یہ مذاق ہی ہے۔ بعض اوقات دوسری زبان میں بات کرتے ہوئے غلط الفاظ ادا ہو جاتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی ایسا کئی مرتبہ ہو چکا ہے۔''

''تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟''

''کچھ نہیں، میرا نام بورس ہے۔''

''پیٹر، مجھے پیٹر کہتے ہیں۔''

''تمہاری بیوی سے طلاق ہو چکی ہے، میں تمہاری گفتگو سن رہا تھا۔''

''اس نے مجھ سے بے وفائی کی پھر طلاق کا دعویٰ کر دیا۔''

''کوئی وجہ تو ہو گی؟''

''اسے شکایت تھی کہ میں دولت مند نہیں ہوں۔ اس نے ایک پروفیسر سے شادی کر کے غلطی کی۔''

بورس بخارن نے ایک اور بوتل کا آرڈر دیا اور لیمن سے بولا۔ ''تم یہاں شکار کے لیے آئے ہو؟''

''نہیں، میں معیشت اور ترقی پر ایک مقالہ لکھ رہا ہوں۔ بہت سی امریکی کمپنیاں پولینڈ میں کام کرنا چاہتی ہیں۔ کیونکہ ہماری معیشت بُری طرح تباہ ہو رہی ہے۔''

بخارن نے ووڈکا کی بوتل کھولی اور لیمن کے لیے گلاس بھر دیا۔ اب اسے شراب پینے کا ناٹک رچانا تھا لیکن وہ مدہوش ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اسے اپنے ہدف کے ساتھ ایک تعلق بھی قائم کرنا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ بخارن اس پر شک کرے چنانچہ اس نے چپکے سے شراب نیچے پھینک دی۔ بخارن بوتل سے منہ لگائے پی رہا تھا۔

''تم سب شکاری ہو؟'' لیمن نے پوچھا۔

''ہاں، آج کا دن ہمارے لیے بہت اچھا تھا۔ تم نے کبھی شکار کھیلا ہے؟''

''نہیں، میں نے ہمیشہ اس کی خواہش کی۔''

لیمن نے دل میں سوچا کہ کہیں وہ اگلے روز اسے شکار پر چلنے کے لیے مدعو نہ کر دے۔ اس نے سی آئی اے ٹریننگ کے دوران صرف ایک مرتبہ بندوق چلائی تھی اور کبھی کسی جانور کا شکار نہیں کیا تھا۔ ماسوائے ایک گلہری کے جو اس کی کار کے نیچے آ گئی تھی۔

بخارن کچھ کہہ رہا تھا لیکن لیمن نہ سمجھ سکا۔ اسے سارا کمرا گھومتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے اپنا گلاس اوپر اٹھایا۔ بخارن اسے بھرتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں پولش ووڈکا سے محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اگر تم اس کے عادی نہیں ہو تو یہ تمہارے لیے خطرناک ہو سکتی ہے۔''

''میں نے پانچ سال اس کتیا کے ساتھ گزارا کیا۔'' وہ اپنی جیب میں رکھے ہوئے ٹیلی فون پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ''یہ تھوڑی سی ووڈکا میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔'' یہ کہہ کر اس نے بخارن کے جوتوں کے پاس قے کر دی۔

دوسری صبح وہ دیر سے سو کر اٹھا۔ ایک بجے کے قریب اس نے اسمائلز کو فون کیا۔ اس نے خفیہ زبان استعمال کرتے ہوئے بتایا کہ وہ روستیکوف کے آدمی سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے اور اسے اپنے بارے میں تھوڑا بہت بتا دیا ہے لیکن زیادہ نہیں۔''

''یقیناً یہ تمہارے لیے ایک مشکل ہدف ہے۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔

گزشتہ شب پیش آنے والے واقعے سے اس کے مشن کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا۔ بخارن نے اس حرکت کا برا نہیں منایا بلکہ خود ہی اپنے جوتے صاف کر لیے اور لیمن کی جانب سے اگلے روز ڈنر کی دعوت قبول کر لی البتہ یہ ضرور کہا کہ وہ لوگ شکار کے لیے شہر سے باہر جا رہے ہیں اور ممکن ہے کہ ان کی واپسی ایک دن بعد ہو۔ لیمن نے اسمائلز کو بتایا کہ وہ سات بجے سے لے کر بار بند ہونے تک وہیں رہے گا۔ ممکن ہے کہ بخارن اس دوران واپس آ جائے۔

دوپہر میں وہ کوستکا کی سڑکوں پر گھومتا رہا۔ واپس آ کر اس نے غسل کر کے لباس تبدیل کیا۔ جب وہ ہوٹل سے باہر جا رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ منیجر اسے دزدیدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ لابی پار کرتے ہوئے اس کی نظر اسی لڑکے پر گئی جسے گزشتہ روز منیجر نے ڈانٹ پلائی تھی۔ وہ بغلی دروازہ سے ناکارہ سامان باہر لے جا رہا تھا۔

لیمن نے ہوٹل سے باہر آ کر اسے ہیلو کیا اور پوچھا۔ ''تم انگریزی بول سکتے ہو؟''

''ہاں، میں ٹی وی شوز دیکھتا ہوں۔ خاص طور پر امریکی اور برطانوی شوز سے ہمیں انگریزی سیکھنے میں مدد ملتی ہے۔''

لیمن نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''شاید تمہارا باس مجھے پسند نہیں کرتا۔''

''وہ مجھے بھی پسند نہیں کرتا حالانکہ میں اس کا بھتیجا ہوں۔''

''واقعی؟''

''وہ کسی کو بھی پسند نہیں کرتا۔ بس اپنی ذات میں مگن رہتا ہے۔''

''اور وہ شکی بھی ہے؟''

''ہاں، وہ ہر ایک پر شک کرتا ہے۔''

لیمن نے اپنی آواز نیچی کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم میرا ایک کام کر دو گے؟''

''وہ کیا؟''

''میں نے اسے اپنے رجسٹریشن کارڈ پر کچھ لکھتے دیکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس نے کمرے کا کرایہ بڑھا دیا ہے۔''

''ہاں، وہ ایسا کر سکتا ہے۔''

لیمن نے اپنی جیب سے سو ڈالر کے مساوی مقامی کرنسی نکالی اور اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بولا۔ ''کیا تم اپنے فون کے ذریعے اس شیٹ کی ایک تصویر اتار کر مجھے بھیج سکتے ہو، اگر اس میں پکڑے جانے کا خطرہ نہ ہو۔''

''ہاں، ہاں کیوں نہیں، اگر وہ تم سے بے ایمانی کر رہا ہے تو ہم پولیس کو بتا دیں گے۔''

لیمن مسکرا دیا۔ اس نے لڑکے کا فون نمبر اپنے فون میں محفوظ کر کے اسے کال کی اس طرح ان کے پاس ایک

دوسرے کے نمبر محفوظ ہو گئے۔ اس کے بعد وہ ریسٹورنٹ کی جانب روانہ ہو گیا اور اپنے آپ کو یاد دلاتا رہا کہ آج وہ ووڈکا کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔

اس روز ایک نئی بارٹینڈر کاؤنٹر پر موجود تھی۔ لیمن نے اپنے لیے کوکا کولا مانگا۔ اس وقت وہاں چند شکاری موجود تھے۔ اس کے علاوہ دو درمیانی عمر کے جوڑے بھی اپنے پسندیدہ مشروب سے دل بہلا رہے تھے۔ بار کے آخری سرے پر ایک عمر رسیدہ شخص اور ایک عورت وائن کی چسکیاں لے رہی تھی۔ عورت کی عمر تیس کے لگ بھگ تھی اور اس نے اپنا کمپیوٹر کھول رکھا تھا۔ لیمن نے وقت گزاری کے لیے ایک دن پرانا نیویارک ٹائمز کا شمارہ پڑھنا شروع کر دیا۔

جب نو بجے تک بخارن اور اس کا بھائی نظر نہیں آئے تو وہ سمجھ گیا کہ دونوں شہر سے باہر ہی رات گزاریں گے۔ لیمن نے یہیں ڈنر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے بارٹینڈر سے پوچھا کہ کیا وہ ریستوران کے بجائے یہیں بار میں کھانا کھا سکتا ہے تو وہ اسے گھورنے لگی۔ بار کے آخری سرے پر بیٹھی ہوئی عورت نے لیمن کو دیکھا اور بولی۔ ''تم یہاں کھانا چاہتے ہو؟''

''ہاں، میں سوچ رہا تھا اگر......''

وہ عورت بارٹینڈر کی طرف مڑی اور اس سے مقامی زبان میں کچھ کہا۔

''ہاں، تم جہاں چاہے بیٹھ سکتے ہو۔'' بارٹینڈر بولی۔

''یہ رہا مینیو۔''

لیمن نے اس عورت کا شکریہ ادا کیا۔ جواب میں وہ مسکرائی اور دوبارہ اپنے کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہوئی پھر اچانک ہی اس کا منہ بن گیا۔ لیمن نے گردن اٹھا کر اسکرین کی طرف دیکھا۔ مقامی زبان میں لکھا ہوا تھا۔ ''کین ناٹ فائنڈ سرور۔''

اس عورت نے بارٹینڈر سے پوچھا کہ کیا نیٹ نہیں کام کر رہا۔ اس نے جواب دیا کہ اس وقت سب لوگ گھروں میں بیٹھے فیس بک، یوٹیوب یا فلمیں دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ سے نیٹ پر لوڈ بڑھ جاتا ہے۔

اس عورت نے بے بسی سے کمپیوٹر کو دیکھا اور لیمن سے بولی۔ ''واقعی انٹرنیٹ کام نہیں کر رہا۔''

لیمن نے ازراہِ ہمدردی کہا۔ ''کاش میں تمہاری مدد کر سکتا۔'' پھر اس نے مینیو پر ایک نظر ڈالی جو پولش زبان میں تھا اور بولا۔ ''کیا تم اس کا ترجمہ کر سکتی ہو؟''

اس عورت نے اپنے برابر رکھے ہوئے اسٹول کی طرف اشارہ کیا۔ لیمن اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ وہ عورت خاصی پُرکشش تھی اور کسی بھی مرد کے لیے اسے نظرانداز کرنا مشکل تھا۔

''میں الیگزینڈرا ہوں۔''

''مجھے پیٹر کہتے ہیں۔''

وہ وارسا کی ایک ہاؤس ویئر کمپنی میں سیلز ریپریزینٹو تھی۔ لیمن نے اسے اپنے بارے میں بتایا۔ الیگزینڈرا کو تحقیقی کام اور تھنک ٹینک کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں تھیں لیکن وہ یونیورسٹی کی طالبہ رہ چکی تھی۔ اس لیے اس سے درس و تدریس کے بارے میں پوچھنے لگی۔ لیمن نے اسے کیمپس کی زندگی اور پوٹومیک یونیورسٹی کے بارے میں بتایا۔ الیگزینڈرا کی بیٹی وارسا میں اسکول کی طالبہ تھی اور شوہر سے اس کی علیحدگی ہو گئی تھی۔

''اوہ، گویا ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔'' لیمن نے کہا۔

''میں کچھ سمجھی نہیں۔''

''مجھے بھی طلاق ہو چکی ہے۔''

وہ کچھ دیر سپاٹ چہرے کے ساتھ اسے دیکھتی رہی پھر دونوں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

لیمن نے اس کے لیے وائن منگوائی تو وہ بولی۔ ''تم نے پیشگی معاوضہ ادا کر دیا۔ میں مینیو کا ترجمہ کر کے بتاتی ہوں۔''

لیمن نے ڈشز کے نام سنے اور بولا۔ ''مجھے بھوک نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر وہ تھوڑا سا اس کی جانب جھکا۔ اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی اور اس کے بازوؤں میں سما گئی۔ وہ دونوں بار سے باہر آئے اور ہوٹل کی جانب روانہ ہو گئے۔

سورج کی روشنی کھڑکی کے راستے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ دونوں بیدار ہو گئے۔ لیمن اس کی قربت سے مزید لطف اندوز ہونے کا خواہاں تھا۔ الیگزینڈرا نے مسکرا کر اسے دیکھا اور اس سے لپٹ گئی۔

''پیٹر۔'' اس نے سرگوشی کی۔

''ہاں، غالباً تم ناشتے کے بارے میں سوچ رہی ہو۔''

''پیٹر، میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا۔'' وہ نظریں جھکاتے ہوئے بولی۔ ''میں گھریلو اشیا نہیں بیچتی اور نہ ہی پولش ہوں۔ میرا تعلق روس سے ہے اور میں خفیہ ایجنسی ایس وی آر، میں آفیسر ہوں۔ یہ تمہاری سی آئی اے کی طرز پر کام

کرتی ہے۔‘‘

’’کیا؟‘‘ لیمن کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

’’اور میرا نام الیگزینڈرا نہیں بلکہ ویلنٹینا ہے۔ ویلنٹینا روستیکوف۔‘‘

لیمن سوچنے لگا کہ اگر اسے میرے بارے میں معلوم ہو جاتا تو یہ گزشتہ شب بڑی آسانی سے میری شراب میں زہر ملا سکتی تھی۔ اب میں اس سے کیسے نمٹوں؟ اچانک اس نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ ’’روسی ایجنٹ؟ کیا تم ماتا ہری بننا چاہتی ہو؟‘‘

’’میں مذاق نہیں کر رہی۔‘‘ وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔

’’میرا خیال ہے کہ مجھے کسی کو اس کی اطلاع دینا ہو گی۔‘‘ لیمن بولا۔

’’فی الحال اس کی ضرورت نہیں۔‘‘ الیگزینڈرا بولی۔ ’’کہیں باہر چلتے ہیں۔ مجھے تم سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔‘‘

بیس منٹ بعد وہ نہا دھو کر کافی پینے کے بعد ہوٹل سے باہر نکلے اور ایک کیفے کی جانب چل دیے۔ انہوں نے باہر ہی ایک میز کا انتخاب کیا اور ویٹرس کو ناشتے کا آرڈر دینے کے بعد روستیکوف بولی۔ ’’اس رات تم نے ایک آدمی کے جوتوں پرتے کر دی تھی۔‘‘

لیمن اسے گھورتے ہوئے بولا۔ ’’تمہیں کیسے معلوم ہوا؟ کیا وہ تمہارا ساتھی ہے؟‘‘

’’وہ یہاں کام کرنے نہیں آیا بلکہ چھٹیوں پر ہے۔ اسے تم میں کچھ دلچسپی محسوس ہوئی تو اس نے مجھے ماسکو فون کر دیا اور میں بذاتِ خود تمہیں دیکھنے یہاں چلی آئی۔‘‘

’’دلچسپی؟‘‘ لیمن نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ’’کسی کو مجھ میں دلچسپی نہیں ہو سکتی سوائے تمہارے یا میں ایسا سوچ رہا ہوں۔‘‘

’’نہیں، رات جو کچھ ہوا۔ وہ کسی منصوبے کا حصہ نہیں تھا۔‘‘ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ’’بہرحال میں رات ہی تمہیں سب کچھ بتانا چاہ رہی تھی۔‘‘

’’کیا؟‘‘ اس نے مضبوطی سے اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ ’’کیا بتانا چاہ رہی تھیں؟‘‘

’’بورس کو معلوم ہوا ہے کہ تمہیں اپنی سابقہ بیوی کی وجہ سے کچھ مسائل کا سامنا ہے۔‘‘

’’نہیں، میں کئی سال اس کے ساتھ مشکل وقت گزار چکا ہوں۔ البتہ اب اس کی وجہ سے مالی مسائل کا سامنا ہے۔‘‘

’’کیا تم محبِ وطن ہو؟‘‘ روستیکوف نے پوچھا۔

’’کسی حد تک جیسا کہ زیادہ تر لوگ ہوتے ہیں۔‘‘

’’میں نے تمہارے کچھ مضامین پڑھے ہیں۔ جب بورس نے مجھے تمہارے بارے میں بتایا تو میں نے انہیں اپنے کمپیوٹر میں ڈاؤن لوڈ کر لیا۔ تم اپنی حکومت پر کافی تنقید کرتے ہو۔‘‘

لیمن نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ ’’تنقید کی گنجائش ہمیشہ رہتی ہے۔‘‘

وہ کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے بولی۔ ’’اب میں مطلب کی بات پر آتی ہوں۔ میرے اختیار میں بہت کچھ ہے اور میں تمہیں سات ہندسوں تک ڈالر یا یورو میں ادائیگی کر سکتی ہوں۔ اس کے عوض تمہیں ہمارا ایک کام کرنا ہوگا۔‘‘

لیمن کو محتاط ہونا پڑا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے نیٹ ورک میں شامل ہونے اور ایسے مضامین یا مقالے لکھنے کے لیے کہا جائے گا جو اس کے ملک کے لیے نقصان دہ ہوں۔ وہ نپے تلے انداز میں بولا۔ ’’مجھے شبہ ہے کہ ایسا کوئی کام کر سکوں گا۔‘‘

’’تم کر سکتے ہو کیونکہ تمہاری وہاں تک رسائی ہے۔‘‘ وہ معنی خیز انداز میں بولی۔ ’’کیا تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے صدر کا بیٹا اگلے سال پوٹومیک یونیورسٹی میں داخلہ لینے والا ہے؟‘‘

’’نہیں۔‘‘

’’جو کچھ میں کہہ رہی ہوں‘ وہ خطرناک ہے لیکن برسوں کا تجربہ بتاتا ہے کہ میں تم پر بھروسا کر سکتی ہوں اور تم یہ بات کسی کو نہیں بتاؤ گے۔‘‘

’’اگر تم وہی ہو جو ظاہر کر رہی ہو تو میں کسی کو بتا کر اپنی جان خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔‘‘

وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ’’میں چاہوں گی کہ تم صدر کے بیٹے کے پروفیسر اور مشیر کے طور پر کام کرو۔ اس حیثیت میں تم ہر وہ بات جان سکتے ہو جو اس نے اپنے باپ، ماں اور حکومت کے دوسرے لوگوں سے سنی ہو۔ ممکن ہے کہ تم اس سے وائٹ ہاؤس میں ہونے والی اہم گفتگو کے بارے میں معلوم کر سکو۔‘‘

’’کیونکہ تم صدر کو دھوکے سے قتل کرنا چاہتی ہو۔‘‘ اس نے غصے سے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

روستیکوف مسکراتے ہوئے بولی۔ ’’نہیں پیٹر۔ بیٹھ جاؤ، یہ باتیں اب پرانی ہو چکی ہیں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ

کے جی بی کے دور میں بھی ہم نے کبھی ایسا نہیں سوچا۔''

لیمن جانتا تھا کہ یہ کام اصل اسکیم سے بہتر ہے۔ اگر اسے محض جعلی مضامین لکھنے کے لیے کہا جاتا تو اس کا مطلب ہے کہ اس سے کام لینے والے نچلی سطح کے ایجنٹ ہیں لیکن جو لوگ وہائٹ ہاؤس تک اس کی رسائی چاہتے ہیں وہ اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ ایک بار اسے ان کے نام معلوم ہو گئے تو وہ ایف بی آئی اور سی آئی اے کو ان کے بارے میں بتا سکے گا۔

لیمن سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ہر طالب علم کسی کھیل میں دلچسپی لیتا ہے۔ میں اپنے اسپورٹس ڈپارٹمنٹ سے بات کروں گا۔ اگر مجھے اس کی کوچنگ کا موقع مل سکے...... لیکن نہیں۔ یہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ میں یہ نہیں کر سکتا۔ میں اپنے ملک سے غداری نہیں کر سکتا۔''

روستیکوف نے اس کے بازو پر اپنا ہاتھ رکھا اور بولی۔ ''یہ غداری نہیں ہے پیٹر بلکہ تم دو ملکوں کو امن کی راہ پر چلنے میں مدد دو گے۔ کوئی بھی تباہی اور موت نہیں چاہتا۔''

''تمہیں معلوم ہے کہ اس کا ایک چھوٹا بھائی ہے۔'' لیمن نے کہا۔

''ہاں لیکن ہم نہیں سمجھتے کہ اس کے قریب ہونے کا کوئی طریقہ ہو سکتا ہے۔''

''ممکن ہے لیکن اگر ہم اس پر غور کریں تو کئی مواقع پر دونوں بھائی اکٹھے بھی ہوتے ہوں گے تو شاید میں چھوٹے سے بھی قریب ہو سکوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ صدر اور اس کے رفقا ایک سترہ سالہ لڑکے کی موجودگی میں بات کرتے ہوئے محتاط ہوتے ہوں گے لیکن نو دس سالہ لڑکے کے سامنے انہیں سرکاری امور پر گفتگو کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہو گی۔''

روستیکوف متاثر ہوتے ہوئے بولی۔ ''بہت اچھا خیال ہے۔''

اسی وقت لیمن کے فون پر ایک پیغام آیا۔ اس نے جھک کر دیکھا۔ منیجر کے بھتیجے نے اس کے رجسٹریشن کارڈ کی تصویر بھیجی تھی۔ اسے دیکھ کر لیمن کا خدشہ درست ثابت ہوا۔ ہوٹل کا منیجر غالباً پولش پولیس کا خفیہ ایجنٹ تھا کیونکہ اس نے لیمن کے نام کے آگے سی آئی اے لکھا ہوا تھا۔ لیمن کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی اور اس نے سر کو زور سے جھٹکا۔

''کوئی اہم پیغام ہے؟'' روستیکوف نے پوچھا۔

''میری سابقہ بیوی کا پیغام ہے۔ اس نے ایک بار پھر پیسوں کا تقاضا کیا ہے۔''

یہ کہہ کر اس نے فون جیب میں رکھ لیا۔ روستیکوف نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا اور اسے معاوضے کی ادائیگی کے طریقۂ کار کے بارے میں بتانے لگی کہ اس کی فیس جنیوا کے بینک اکاؤنٹ میں جمع ہو گی جس پر اسے ٹیکس ادا کرنا ہو گا۔

لیمن نے تائید میں سر ہلا دیا اور اس سے چند رسمی سوالات کیے لیکن وہ تسلسل یہی سوچ رہا تھا کہ اس عورت سے کس طرح پیچھا چھڑایا جائے۔ اسے یقین تھا کہ جلد یا بدیر منیجر کی اطلاع پولش پولیس کے ذریعے روستیکوف تک پہنچ جائے گی اور اسے اس کی اصلیت کے بارے میں معلوم ہو جائے گا۔

''کیا تمہارے ذہن میں کوئی اور بات ہے؟'' روستیکوف نے اس کی پریشانی محسوس کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں۔ دراصل میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ تم جانتی ہو کہ ریسٹ روم کہاں ہے؟''

''نہیں۔'' اس نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں ڈھونڈ لوں گا۔'' وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''میرا انتظار کرنا۔ ابھی واپس آتا ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ ریستوران میں داخل ہو گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ اپنے فون پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔ یقیناً اسے خفیہ سروس کے ہیڈ کوارٹر سے کوئی پیغام آیا ہو گا۔ لیمن نے کچن میں قدم رکھا اور عقبی دروازے سے باہر نکل گیا۔ وہ ایک گلی میں تھا۔ لیمن اسے عبور کر کے قریبی سڑک پر آیا۔ وہاں ایک قطار میں چار کاریں کھڑی ہوئی تھیں۔ اس نے باری باری ان میں جھانک کر دیکھا۔ پہلی دو کاریں آٹومیٹک نہیں تھیں اور ان میں ہاتھ سے گیئر بدلنا ہوتا تھا۔ تیسری کار آٹومیٹک تھی جسے لیمن بہ آسانی چلا سکتا تھا۔

اس نے ڈرائیور کو اپنا لائسنس دکھایا اور پولش زبان میں کہا۔ ''میں خفیہ ایجنسی کا آفیسر ہوں۔ ہمیں ہنگامی حالت میں تمہاری کار چاہیے۔''

''لیکن میں......''

لیمن نے اس کے ہاتھ پر دو سو ڈالر مالیت کی مقامی کرنسی رکھی اور دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔ ''تم اس کونے پر میرا انتظار کرو۔ میں پانچ منٹ میں واپس آتا ہوں۔''

ڈرائیور گاڑی سے باہر آ کر پیسے گننے لگا۔ ''پانچ منٹ۔ اس سے زیادہ نہیں لیکن مجھے اپنا شناختی کارڈ تو

دکھاؤ۔''

''اتنا وقت نہیں ہے۔'' لیمن نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس نے گاڑی کا رخ شہر سے باہر جانے والی سڑک پر موڑ دیا۔ اس نے عقبی مرر میں دیکھا۔ ویلنٹینا روستیکوف ایک کار کی جانب اشارہ کر رہی تھی جو اس کے سامنے آکر رکی۔ اسے بورس بخارن چلا رہا تھا۔ ان کے پیچھے وہ ڈرائیور کھڑا چلا رہا تھا جس کی کار لیمن کے پاس تھی۔ بخارن اور روستیکوف نے مڑ کر دیکھا اور اس کا تعاقب شروع کر دیا۔

دونوں کاریں دورویہ سڑک پر دوڑ رہی تھیں جس کے دونوں طرف گھنے درخت تھے۔ چند میل جانے کے بعد درختوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اب دونوں جانب کھلا میدان نظر آرہا تھا۔ دونوں کاروں کے درمیان بمشکل تیس گز کا فاصلہ تھا۔ اگر تعاقب کرنے والے فائرنگ شروع کر دیتے تو بڑی آسانی سے اسے نشانہ بنا سکتے تھے۔ لیمن نے کار کا ایکسیلریٹر پورا دبا دیا۔ آگے چل کر درختوں کا ایک جھنڈ آیا۔ اس سے آگے ایک موڑ تھا۔ لیمن نے رفتار کم کرنا چاہی لیکن وہ اس گائے کو نہ دیکھ سکا جو سڑک کے عین درمیان کھڑی تھی۔ لیمن نے پوری قوت سے اسٹیئرنگ گھمایا۔ گائے تو بچ گئی لیکن گاڑی کا توازن برقرار نہ رہ سکا اور وہ سڑک سے اتر کر گھسٹتی ہوئی کھیتوں میں چلی گئی۔ اس کے نیچے سے کچھ ٹوٹنے کی آواز آئی اور وہ ایک گڑھے کے کنارے پر جاکر رک گئی۔

لیمن نے اپنا جائزہ لیا۔ اس کا جسم صحیح سلامت تھا۔ لیمن نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ بخارن اور روستیکوف کار سے باہر آچکے تھے اور اس کی طرف دوڑتے ہوئے آرہے تھے۔ لیمن نے سیٹ بیلٹ کھولی اور دروازے کو زور سے دھکا دیا۔ اس نے باہر نکلنے کی کوشش کی لیکن گیلی زمین پر پھسل گیا۔

''پیٹر، یہ تم کیا کر رہے ہو؟'' روستیکوف چلائی۔

وہ دونوں چلتے ہوئے اس کے پاس آئے۔ لیمن اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ابھی تک انہوں نے اپنے ہتھیار نہیں نکالے تھے۔

''تم نے ایسا کیوں کیا پیٹر؟ تم کیوں بھاگے؟''

گویا انہیں ابھی تک یہ معلوم نہیں ہوا کہ وہ سی آئی اے کا ایجنٹ ہے۔ اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''میرا ضمیر اس کی اجازت نہیں دیتا۔ میں یہ کام نہیں کر سکتا۔''

''اوہ پیٹر، ہمارے ساتھ واپس چلو۔ میں ڈرائیور کا نقصان پورا کر دوں گی۔'' وہ تباہ شدہ کار کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تم ایک ذہین شخص ہو اور تمہارے خیالات ہمارے منصوبے کے لیے مثالی ہیں۔''

اس کے کندھے ڈھلک گئے اور اس کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔ اچانک ہی عقب سے ایک آواز آئی۔ ''کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔''

انہوں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ دو تھے۔ انہوں نے سوٹ اور اوورکوٹ پہن رکھے تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں پستول تھے جن کا رخ ان تینوں کی جانب تھا۔

''ہمارا تعلق روسی خفیہ ایجنسی سے ہے۔'' روستیکوف نے کہا۔

عمر رسیدہ شخص نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا اور اس نے آگے بڑھ کر ان دونوں کے شناختی کارڈ لے لیے اور ان پر ایک نظر ڈال کر اپنے افسر کے حوالے کر دیے۔ اس نے انہیں غور سے پڑھا اور اپنے اوورکوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔

''یہ کارڈ مجھے واپس چاہئیں۔'' روستیکوف نے کہا۔

اس آدمی نے اس کی بات نظر انداز کر دی اور لیمن سے کہا۔ ''تم ادھر آؤ۔''

اب لیمن کی سمجھ میں آیا۔ یہ پولش خفیہ سروس کے لوگ تھے اور ہوٹل کا منیجر ان کے لیے کام کر رہا تھا۔ اسی نے انہیں اطلاع دی ہوگی کہ لیمن سی آئی اے کا آدمی ہے۔

لیمن آہستہ آہستہ چلتا ہوا ان کے پاس گیا۔ تبھی اس نے ان کے عقب میں ایک سیاہ وین کے رکنے کی آواز سنی۔ اس میں سے چار مسلح افراد برآمد ہوئے۔ ان کے پاس مشین گنیں تھیں۔ لیمن نے سوچا کہ اسے لے جانے کے لیے چار آدمیوں کی ضرورت کیوں پیش آئی لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے اسے نظر انداز کر کے دونوں روسیوں کے ہاتھ پلاسٹک کی ڈوری سے باندھ دیے اور ان کی تلاشی لی۔ بورس بخارن کی جیکٹ سے ایک پستول برآمد ہوا۔

روستیکوف نے دھمکی آمیز لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟ تم نے سنا نہیں کہ میرا تعلق روسی خفیہ ایجنسی سے ہے اور ہم مقامی خفیہ ایجنسی سے مل کر کام کر رہے ہیں۔''

سادہ لباس والا معمر شخص بولا۔ ''ممکن ہے کہ تم سچ بول رہی ہو لیکن ہمارا تعلق مقامی خفیہ ایجنسی سے نہیں ہے۔''

وین سے ایک اور شخص برآمد ہوا۔ یہ اسائلز کا ساتھی

ایلم تھا۔ اس نے باری باری روستیکوف اور بخارن کو دیکھا اور پھر لیمن سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''ان لوگوں کا تعلق چیک سیکیورٹی ایجنسی سے ہے اور ہم اس وقت بمھور یہ چیک میں ہیں۔''

روستیکوف نے گہری سانس لے کر چاروں طرف دیکھا۔ لگتا تھا کہ وہ لوگ لیمن کا تعاقب کرتے ہوئے سرحد عبور کر گئے۔ ولیم نے چیک زبان میں سپاہیوں سے کہا۔ ''انہیں میلاڈ وبولیسلا سکا کے اڈے پر لے جاؤ۔''

لیمن جانتا تھا کہ پراگ کے نزدیک ایک ایسا فضائی اڈا ہے جسے سی آئی اے اور امریکی فوجیں یورپ اور افریقا سے گرفتار کیے ہوئے قیدیوں اور مشتبہ لوگوں سے تحقیقات کی غرض سے عارضی طور پر استعمال کرتی ہیں۔ دو سپاہیوں نے اپنی جیبوں سے سیاہ نقاب نکال کر روستیکوف اور بخارن کے چہروں پر چڑھا دیے اور انہیں بیدردی سے دھکیلتے ہوئے وین کی طرف لے گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ گاڑی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

ولیم نے لیمن سے اس کا فون مانگا۔ اس کی بیٹری نکال کر ایک طرف اور سم دوسری طرف پھینک دی اور بولا۔ ''اب ہمیں چلنا چاہیے۔''

پراگ کے امریکی سفارت خانے میں لیمن اور اسمائلز ایک کانفرنس روم میں بیٹھے ہوئے تھے اور سامنے اسکرین پر نارتھ ورجینیا میں بیٹھا ہوا ڈائریکٹر ان سے مخاطب تھا۔

''روستیکوف کو ایک خفیہ مقام پر لے جایا جا رہا ہے۔ اس سے لمبی چوڑی تحقیقات نہیں ہوگی بلکہ ہم اس سے ایک سودا کریں گے۔ وہ بے وقوف عورت نہیں ہے۔ اس کے بدلے اسے ان لوگوں کے نام بتانا ہوں گے جو اس نیٹ ورک کے لیے کام کرتے ہیں۔''

''تم نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ وہ ایک عورت ہے۔'' لیمن نے کہا۔

''ہم نے پہلے کبھی نہیں سنا کہ وہ ماسکو سے باہر گئی ہو۔ شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو۔'' ڈائریکٹر نے کہا۔ ''لیکن تمہیں یہ خیال کیسے آیا کہ اسے ورغلا کر چیک ری پبلک کی حدود میں لے جاؤ۔''

ایسا لگتا تھا کہ اسمائلز اور ولیم نے سرحد کی دوسری جانب ایک سیف ہاؤس بنا رکھا تھا جہاں سے وہ آپریشن کی نگرانی کر رہے تھے۔ لیمن کے فون سے ملنے والے سگنل سے بھی اس کے محلِ وقوع کا پتا چل رہا تھا۔ جب اس نے کار چرائی اور روستیکوف نے بخارن کے ساتھ مل کر اس کا تعاقب کیا تو اسمائلز نے صورتِ حال کو محسوس کرتے ہوئے چیک سیکیورٹی فورسز کو مدد کے لیے بلالیا۔

لیمن نے صورتِ حال اپنے حق میں دیکھی تو جھوٹ کا سہارا لیا اور بولا۔ ''تم کہہ سکتے ہو کہ مجھے بروقت یہ خیال آیا اور میں نے اسے اپنے پیچھے لگالیا۔''

''وہ اسی لیے تمہارے پیچھے آئی کیونکہ اسے تم پر بھروسا تھا۔''

اس لمحے لیمن نے فیصلہ کرلیا کہ وہ ڈائریکٹر کو اصل حقیقت بتا دے کہ وہ روسیوں کو سرحد کی طرف لے جانے کے لیے نہیں بلکہ اس لیے بھاگا تھا کہ ہوٹل کے منیجر نے اسے سی آئی اے ایجنٹ کے طور پر پہچان لیا تھا۔

اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اسمائلز بول پڑا۔ ''اب تم پیٹر نہیں لیمن ہو۔ پیٹر کے نام پر بنا ہوا پاسپورٹ اور کریڈٹ کارڈ ضائع کر دیا جائے گا۔'' پھر اس نے ڈائریکٹر سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''اس نے اپنا رول بڑی عمدگی سے نبھایا۔ یہاں تک کہ ہوٹل کے بل کی بھی پیشگی ادائیگی کردی۔''

''اوہ میرے خدا۔'' لیمن نے دل میں سوچا۔ ''پیشگی ادائیگی۔ سی آئی اے، یہی کچھ تو منیجر نے اس کے رجسٹریشن کارڈ پر لکھا تھا۔ اس سے کتنی بڑی غلطی سرزد ہوئی تھی۔''

''تم کچھ کہہ رہے تھے لیمن؟''

''احمق مت بنو۔'' اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ ''میں صرف یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ اگر تم لوگ میری پشت پناہی نہ کرتے تو میں یہ سب نہیں کرسکتا تھا۔''

''اچھا۔'' ڈائریکٹر نے کہا۔ ''مجھے ایک میٹنگ میں جانا ہے۔ ہم آئندہ چند ہفتوں میں ایک تربیتی پروگرام شروع کر رہے ہیں۔ تمہیں بھی اس میں شامل کیا جائے گا۔ گوکہ اس میں بہت زیادہ سفر کرنا ہوگا۔ یہ ایک مشکل اور خطرناک کام بھی ہوسکتا ہے لیکن اس کے لیے ہمیں تم جیسے آدمی ہی کی ضرورت ہے۔''

ایک مشکل ہدف حاصل کرنے کے بعد لیمن بہت زیادہ پُراعتماد ہوگیا تھا۔ اس نے بے خوفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں ہر خدمت کے لیے تیار ہوں۔''

''شکریہ لیمن۔'' اس کے ساتھ ہی اسکرین تاریک ہوگیا۔

طاہر جاوید مغل

انگارے

تیسویں قسط

نیکی کر دریا میں ڈال... بات محاورے کی حد تک ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن خودغرضی اور سفاکی کے اس دور میں نیکی کرنے والے کو ہی کمر میں پتھر باندھ کر دریا میں ڈال دیا جاتا ہے۔ انسان بے لوث ہو اور سینے میں دردمند دل رکھتا ہو تو اس کے لیے قدم قدم پر ہولناک آسیب منہ پھاڑے انتظار کررہے ہوتے ہیں۔ بستیوں کے سرخیل اور جاگیرداری کے بے رحم سرغنہ لہو کے پیاسے ہو جاتے ہیں... اپنوں کی نگاہوں سے نفرت کے انگارے برسنے لگتے ہیں... امتحان در امتحان کے ایسے کڑے مراحل پیش آتے ہیں کہ عزم کمزور ہو تو مقابلہ کرنے والا خود ہی اندر سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتا چلا جاتا ہے لیکن حوصلہ جوان ہو تو پھر ہر سازش کی کوکھ سے دلیری اور ذہانت کی نئی کہانی ابھرتی ہے۔ وطن کی مٹی سے پیار کرنے والے ایک بے خوف نوجوان کی داستان جسے ہر طرف سے وحشت و بربریت کے خون آشام سایوں نے گھیر لیا تھا مگر وہ ان پیاسی دلدلوں میں رکے بغیر دوڑتا ہی چلا گیا... اثرورسوخ اور درندگی کی زنجیریں بھی اس کے بڑھتے ہوئے قدم نہیں روک سکیں۔ وقت کی میزان کو اس کے خونخوار حریفوں نے اپنے قدموں میں جھکا لیا تھا مگر وہ ہار مان کر پسپا ہونے والوں میں سے نہیں تھا...

سطر سطر رنگ بدلتی... ایک لہو رنگ اور دل گداز داستان...

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ڈنمارک سے پاکستان کسی کی تلاش میں آیا تھا مگر یہ تلاش شروع ہونے سے پہلے ہی ایک ایسا واقعہ ہوگیا جس نے میری زندگی کو تہ وبالا کر دیا۔ میں نے سرراہ ایک زخمی کو اٹھا کر اسپتال پہنچایا۔ مقامی پولیس نے مددگار کے بجائے مجرم ٹھہرایا اور یہیں سے جبر و ناانصافی کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جس نے مجھے شکیل داراب اور لالہ نظام جیسے خطرناک لوگوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ یہ لوگ ایک قبضہ گروپ کے سرخیل تھے جو رہائشی کالونیاں بنانے کے لیے چھوٹے زمینداروں اور کاشت کاروں کو ان کی زمینوں سے محروم کر رہا تھا۔ میرے چچا حفیظ سے بھی زبردستی ان کی آبائی زمین ہتھیانے کی کوشش کی جارہی تھی۔ چچا کا بیٹا ولید اس جبر کو برداشت نہ کر سکا اور شکیل داراب کے دست راست انسپکٹر قیصر چودھری کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہوگیا۔ اس جرأت کی سزا اسے یہ ملی کہ ان کی حویلی کو اس کی ماں اور بہن فائزہ سمیت جلا کر راکھ کر دیا گیا اور وہ خود دہشت گرد قرار پاکر جیل پہنچ گیا۔ انسپکٹر قیصر اور لالہ نظام جیسے سفاک لوگ میرے تعاقب میں تھے، وہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ میں MMA کا یورپی چیمپئن تھا، وسطی یورپ کے کئی بڑے بڑے گینگسٹر میرے ہاتھوں ذلت اٹھا چکے تھے۔ میں اپنی پچھلی زندگی سے بھاگ آیا تھا لیکن وطن پہنچتے ہی یہ زندگی پھر مجھے آواز دینے لگی۔ میں یہاں سے بیزار ہوکے واپس ڈنمارک جارہا تھا کہ ایک انہونی ہوئی۔ وہ جادوئی حسن رکھنے والی لڑکی مجھے نظر آگئی جس کی تلاش میں، میں یہاں پہنچا تھا۔ اس کا نام تاجور تھا اور وہ اپنے گاؤں چاند گڑھی میں نہایت پریشان کن حالات کا شکار تھی۔ میں اس کے گاؤں جا پہنچا اور ایک ٹریکٹر ڈرائیور کی حیثیت سے اس کے والد کے پاس ملازم ہوگیا۔ انیق بطور مددگار میرے ساتھ تھا۔ تاجور کا غنڈا صفت منگیتر اسحاق اپنے ہمنوا ؤں زمیندار عالمگیر اور پیر ولایت کے ساتھ مل کر تاجور اور اس کے والد دین محمد کے گرد گھیرا تنگ کر رہا تھا۔ مقامی مسجد کے امام مولوی فدا کی موت میں بھی اسی زمیں دار کا ہاتھ تھا۔ مولوی جی کی بیٹی زینب ایک عجیب بیماری کا شکار تھی۔ وہ زمیندار عالمگیر کے گھر میں ٹھیک رہتی لیکن جب اسے وہاں سے لایا جاتا تو اس کی حالت غیر ہونے لگتی۔ اسی دوران میں ایک خطرناک ڈاکو سجاول نے گاؤں پر حملہ کیا۔ حملے میں عالمگیر کا چھوٹا بھائی مارا گیا۔ میں تاجور کو حملہ آوروں سے بچا کر ایک محفوظ جگہ لے گیا۔ ہم دونوں نے کچھ اچھا وقت گزارا۔ واپس آنے کے بعد میں نے بھیس بدل کر مولوی فدا سے ملاقات کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ عالمگیر وغیرہ نے زینب کو جان بوجھ کر بیمار کر رکھا ہے اور یوں مولوی صاحب کو مجبور کیا جارہا ہے کہ وہ اپنی بچی کی جان بچانے کے لیے اسحاق کی حمایت کریں۔ مولوی صاحب کو قتل کر دیا گیا۔ ایک گھناؤنی واردات کے خاتمے کے بعد ہم گھروں کی جانب گامزن تھے کہ میں اور تاجور سجاول ڈاکو کے ڈیرے پر جا پہنچے۔ یہاں سجاول کی ماں (ماؤجی) مجھے اپنا ہونے والا جوائی سمجھا۔ جس کی پوتی مہناز عرف مانی سے میری بات طے تھی۔ یوں سجاول سے ہماری جان بچ گئی۔ سجاول کے ساتھ میرا مقابلہ طے پاچکا تھا کہ میرا ذہن ماضی میں بھٹک گیا۔ جب میں ڈنمارک میں تھا اور ایک کمزور پاکستانی کو گورے اور انڈین غنڈوں سے بچاتے ہوئے خود ایک طوفان کی لپیٹ میں آگیا۔ وہ غنڈے ٹیکساری گینگ کے لوگ تھے جس کا سرغنہ جان ڈیرک تھا۔ مجھ سے بدلہ لینے کے لیے انہوں نے میری یونیورسٹی دوست ڈیزی کے ساتھ اجتماعی کھیل کھیلا، پھر ڈیزی غائب ہو گئی۔ اس واقعے کے بعد میری زندگی میں ایک انقلاب آگیا پھر میرا رجحان مارشل آرٹ کی طرف ہوگیا اور ایسٹرن کنگ کی حیثیت سے MMA کی فائٹس میں تہلکہ مچاتا رہا اور دوسری طرف اسکائی ماسک کی اوٹ میں ٹیکساری گینگ کے غنڈوں سے برسرپیکار رہا۔ اسی مارشل آرٹ کی بدولت میں نے سجاول سے مقابلہ کیا اور سخت مقابلے کے بعد برابری کی بنیاد پر ہار مان کے سجاول کا دل جیت لیا۔ سجاول سے کہہ کر میں نے انیق کو بلوالیا۔ سجاول ایک حسین دوشیزہ سنبل کو نوبیاہتا دلہن کی طرح سنوار کر ریان فردوس (وڈے صاحب) کی خدمت میں تحفے کے طور پر پیش کرنا چاہتا تھا۔ میں، انیق اور جاناں ساتھ تھے۔ ہم ریان فردوس کے محل نما بنگلے پارا ہاؤس پہنچے۔ وڈا صاحب اپنے دو بیٹوں کے ہمراہ برونائی سے پاکستان شفٹ ہوا تھا۔ برونائی میں اس کی خاندانی دشمنی چل رہی تھی۔ سجاول کو پارا ہاؤس میں کلیدی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ پارا ہاؤس میں کوئی بڑا چکر چل رہا تھا۔ کھوج لگانے پر پتا چلا کہ بڑے صاحب کے دونوں بیٹوں میں زہریلا عنصر پایا جاتا ہے۔ زینب والا معاملہ بھی اسی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ اسی وجہ سے زینب کو بھی اغوا کرلیا گیا۔ ابراہیم اور کمال احمد کے لیے جولڑکیاں تیار کی گئی تھیں وہ پارا ہاؤس پہنچ چکی تھیں۔ ایک تقریب میں دونوں لڑکیوں کی رونمائی کی گئی تو ان میں ایک زینب تھی۔ ابراہیم نے مجھ پر اور سجاول پر اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ ابراہیم نے بتایا کہ دونوں بھائیوں میں زہریلا پن موجود ہے اسی لیے ان کے لیے ایسی لڑکیاں ڈھونڈی گئی ہیں۔ میں نے ابراہیم کو آگاہ کیا کہ زینب پوری طرح محفوظ نہیں ہے اور شادی کی صورت میں اسے نقصان ہو سکتا ہے۔ یہ سن کر ابراہیم پریشان ہوگیا۔ ادھر آقا جان جو پارا ہاؤس کا کرتا دھرتا تھا، دھماکے گونج اٹھے۔ میرے کہنے پر ابراہیم نے زینب کا خون ٹیسٹ کرایا تو حقیقت کھل کر سامنے آگئی۔ اس تمام قتل وغارت میں آقا جان ملوث تھا مگر کوئی اس پر شک کرنے کو تیار نہ تھا۔ ثاقب کی موت کے بعد برونائی میں مخالفین نے بڑی کارروائی کرکے وڈے صاحب کے برادر نسبتی کو مار ڈالا تھا۔ بڑی بیگم صاحبہ کا رو رو کر برا حال تھا، ان حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے میں اور سجاول وڈے صاحب کے

ساتھ برونائی جانے کے لیے تیار تھے۔ برونائی جانے سے پہلے میں ایک نظر تاجور کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ایک طویل فاصلہ طے کر کے میں تاجور کی ایک جھلک ہی دیکھ پایا تھا کہ گاؤں کے چند لڑکوں نے مجھے گھیر لیا۔ میرے سامنے وہ بچے تھے۔ اپنی ہار کے بعد ایک دلیر لڑکا میرے گلے کا ہار بن گیا اور میرا پیچھا کرتا ہوا پارا ہاؤس تک آگیا۔ سیف عرف سیفی کی بچی نکالنے کے لیے ہم اسے اپنے ساتھ برونائی لے آئے تھے۔ یہاں حالات بہت خراب تھے۔ ریان فردوس کا بیٹا رائے زل مخالف پارٹی بن چکا تھا۔ امریکن ایجنسی کے ساتھ مل کے پورے علاقے پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ فردوس بیگی قسطینا کمانڈر اور جی دار آفیسر تھی۔ وہ انڈر کنگ کی حیثیت سے مجھے جان گئی تھی۔ میں کئی مہم میں اس کے ہمراہ رہا۔ ریان فردوس کی پہلی بیوی اور اس کے بیٹے کی شورشیں بڑھتی جارہی تھیں۔ مجھے شروع ہی سے آقاجان پر شک تھا۔ اور اس کی سرگرمیاں بڑھتی جارہی تھیں۔ رائے زل اور امریکن ایجنسی کی قوت نے محل پر دھاوا بول دیا تھا۔ افراتفری اور قتل و غارت گری نے اینٹ سے اینٹ بجادی تھی۔ اس حملے میں ریان فردوس اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ اب ریاست پر کلی طور پر رائے زل کا قبضہ ہو چکا تھا۔ ہم سب بڑی مشکل سے جان بچانے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ آقاجان اور رائے زل کے کارندے ہماری تلاش میں تھے۔ ابراہیم اور زینب کا بُرا حال تھا۔ میری ذات ان کے لیے بہت بڑا سہارا تھی۔ کمال اس جنگ میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ ہم زیرِ زمین مقید تھے۔ مگر انتقام رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ جس لانچ میں ہم یہاں آئے تھے وہ ابھی تک باہر موجود تھی۔ آقاجان کے آدمیوں سے بچنے کے لیے اسے ٹھکانے لگانا ضروری تھا۔ بن مشہد اور تبارک زیرِ زمین بنکر سے باہر نکل گئے۔ مگر باہر سخت پہرا تھا...... تبارک پھسل کر ایک کھائی میں گرجاتا ہے۔ میں اور سیف اسے ڈھونڈنے جاتے ہیں مگر ایجنسی کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ بے تحاشا تشدد سہنے کے باوجود ہم قسطینا اور ابراہیم کا پتانہیں بتاتے ......سیف کی حالت بُری تھی۔ مجھے اس کو اپنے ہاتھ سے زہر دے کے اذیت کم کرنا پڑی۔ مگر میرا اپنا حال بہت بُرا تھا۔ امریکی لونگ نے تشدد کی انتہا کردی تھی۔ جاماجی کے حالات روز بروز بدتر ہورہے تھے۔ میں رائے زل کی قید سے رہائی پاچکا تھا۔ عوام کا سمندر میرے لیے بے چین تھا۔ وہ مجھے اپنا سربراہ مان چکے تھے۔ وہ آزادی کے لیے سر پر کفن باندھ چکے تھے۔ ہمارا قافلے کا رخ اب ڈی پیلس کی جانب تھا۔ پال کی مدد سے پوری ٹیم اور عوام کا سمندر ڈی پیلس کی جانب گامزن تھا۔ ہر طرف گولیاں ......شیلنگ اور دھواں دھار لڑائی تھی۔ بالآخر پسپا ہوئی عوام نے اپنے جوش، جذبے اور جنون سے کام لے کر رائے زل کے ساتھیوں کا خاتمہ کردیا۔ اب تخت کے حق دار قسطینا اور ابراہیم تھے۔ وطن آنے کے بعد تاجور اپنے گھر چلی گئی اور میں داؤ بھاؤ کے پاس تھا لیکن وطن آتے ہی اس دشمن نے مجھے ڈھونڈ ہی لیا جس سے میں چھپتا پھر رہا تھا۔ ٹیکساری گینگ پاکستان آچکا تھا ہر طرف قتل و غارت گری پھیلا رہے تھے...... اسجد اسکواڈ کے کارندے میری تلاش میں کئی معصوم لوگوں کی جان لے چکے تھے۔ اب ان کا خاتمہ ضروری ہوگیا تھا میں اور ایق نے ان کے ٹھکانے کا کھوج لگایا اور بہت ہوشیاری سے ان کے جشن والے دن رنگ میں بھنگ ڈال دیا۔ ادھر جاماجی سے خورسنہ آچکی تھی اور سجاول کو اپنا حتمی فیصلہ سنانا چاہتی تھی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

فون پر خاموشی تھی۔ بس خورسنہ کی سانسوں کی مدھم آواز آرہی تھی۔ سجاول بھی ہمہ تن گوش تھا۔ آخر خورسنہ کی دھیمی آواز فون کے اسپیکر سے اُبھری۔ ''او کے سجاول! تمہاری خوشی میں میری خوشی ہے۔ اگر تم یہی چاہتے ہو تو ٹھیک ہے، میں تمہیں...... ناراض نہیں دیکھ سکتی۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے جیسے شرما کر فون بند کردیا...... یا شاید گڑبڑا کر۔

سجاول کا چہرہ سرخ ہورہا تھا۔ ''سیالکوٹی، میدان مار لیا تم نے۔'' میں نے اسے کندھے سے پکڑ کر کہا اور کھینچ کر اسے اٹھنے پر مجبور کردیا۔ ہم ایک دوسرے کے گلے ملے۔ سجاول چٹانی چہرے کا مالک تھا۔ اب بھی اس کا چہرہ تاثرات سے عاری تھا مگر اس کی آنکھوں میں جھانک کر اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے سینے کی گہرائی میں خوشی کی لہر ہے۔

☆☆☆

اس کے بعد جو کچھ ہوا، بڑی تیزی سے ہوا۔ گھڑی کی سوئیوں کی رفتار جیسے ایک دم ہی تیز ہوگئی تھی۔ جب ''میاں بیوی'' راضی تھے تو پھر راستے میں کوئی رکاوٹ ہی نہیں تھی۔ خبروں سے خورسنہ پر بھی یہ جانکاہ انکشاف ہوگیا تھا کہ میں ایک حادثے میں ''چل بسا'' ہوں۔ سجاول نے نہایت طریقے اور رازداری کی کڑی شرط کے ساتھ خورسنہ کو بتادیا کہ یہ غلط خبر ہے اور میں زندہ سلامت لاہور میں موجود ہوں۔ خورسنہ کے لیے یہ بڑی جاں فزا خبر تھی۔ وہ فوراً مجھ سے ملنا چاہتی تھی مگر سجاول نے اسے بتایا کہ یہ ابھی ممکن نہیں ہے۔ سجاول کے لیے یہ بالکل مشکل نہیں تھا کہ وہ نکاح کے لیے نکاح خواں اور چار گواہوں کا انتظام کرتا۔ ایک وکیل اور دو وکیل کے تقرر کے گواہ خورسنہ کی طرف سے، جبکہ دو شادی کے گواہ۔

پلان یہی بنا کہ نکاح گیسٹ ہاؤس کے بجائے اسی ہوٹل میں کیا جائے جہاں میں ٹھہرا ہوا ہوں اور نکاح کے بعد خورسنہ اور سجاول چند دن اسی ہوٹل میں گزاریں۔ اس غرض سے سجاول نے ہوٹل میں ایک کشادہ کمرا بک کرالیا تھا۔

نکاح سے صرف ایک دن پہلے گڑبڑ ہوگئی۔ ہوٹل کے منیجر نے سجاول کو ایک بیرے کے ذریعے اپنے کمرے میں بلوایا۔ میں بھی سجاول کے ساتھ ہی چلا گیا۔ یہ منیجر اس دو منزلہ ہوٹل میں بزنس پارٹنر بھی تھا۔ وہ پینتیس چالیس سال کا ایک خرانٹ سا شخص تھا۔ سرخ شرٹ کے نیچے سفید پینٹ پہنے اور اپنی فربہ توند کو بیلٹ میں کس کر میز کے عقب میں بیٹھا ہوا تھا، سامنے دو تین پرانے فون سیٹ، شان بڑھانے کے لیے رکھے ہوئے تھے۔ ہم میز کے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

منیجر کے رُوبرو ایک رجسٹر تھا۔ وہ سجاول کو سرتا پا دیکھتے ہوئے بولا۔ ''بھائی صاحب! بکنگ والا بتا رہا ہے کہ آپ نے میاں بیوی کے طور پر کمرا بک کرایا ہے؟''

''ہاں، کوئی اعتراض ہے؟'' سجاول نے پاٹ دار آواز میں کہا۔

سجاول کے انداز نے منیجر کے تیور کچھ اور بگاڑ دیے۔ کہنے لگا۔ ''بیوی کہاں ہے آپ کی؟''

''وہ بھی آجائے گی۔ تمہیں پریشانی کیوں ہے؟''

''مجھے پریشانی اس لیے ہے جناب عالی کہ میں انگوٹھا نہیں چوستا یا فیڈر میں دودھ نہیں پیتا۔ بڑے پاپڑ بیلے ہوئے ہیں۔ ہم مشکوک لوگوں کو کمرا نہیں دیتے۔''

''کیا شک پڑ رہا ہے آپ کو؟'' میں نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

''مجھے لگتا ہے کہ آپ لوگ کسی چکر میں ہیں۔ آج کل ہوٹلوں میں نکاح نامہ بھی مانگا جارہا ہے یا پھر بیوی کے شناختی کارڈ پر خاوند کا نام ہو۔ کارڈ یا نکاح نامے کی کاپی ہے آپ کے پاس؟''

''اگر کاپی نہ ہو تو پھر؟'' سجاول کا موڈ بگڑ رہا تھا۔

''تو پھر میں سمجھوں گا کہ آپ لوگ کوئی ناجائز کام کر رہے ہو۔ کسی کے ماتھے پر کچھ نہیں لکھا ہوتا بھائی صاحب! ہوسکتا ہے کہ وہ عورت بھاگ کر آئی ہو۔''

میں نے دیکھا، سجاول کا پیمانۂ صبر لبریز ہونے والا تھا۔ میں نے میز کے نیچے اس کا گھٹنا دبا کر اسے تحمل برتنے کا کہا اور منیجر سے مخاطب ہوکر پوچھا۔ ''جناب کا نام؟''

''شہریار کہتے ہیں مجھے۔''

''تو شہریار بھائی! تم کافی سیانے سیانے لگتے ہو۔ ہر سیانے بندے کو پتا ہوتا ہے کہ جب بالغ بندہ اور بندی راضی ہوں تو ان کے رشتے ناتے اور نکاح وغیرہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ یہاں بھی ایسا ہی ہے۔''

''یعنی نکاح ابھی ہوا نہیں ہے؟'' شہریار تیکھے لہجے میں بولا۔

''اصل جوڑ تو آسمانوں پر ہوتا ہے، زبانی بول بھی کل تک پڑھے جائیں گے۔''

''زبردست...... زبردست۔'' منیجر شہریار نے کہا۔ اس کے رخساروں کے نیچے موٹا گوشت تھا اور آنکھوں میں عیاری اور حرام خوری کی چمک بھی تھی۔

اس نے رجسٹر پر اپنا قلم چلا کر سجاول کی اور میری بکنگ کینسل کردی۔ اس کے بعد سجاول کا دیا ہوا ایڈوانس بٹوے میں سے نکال کر میز پر دھرا اور بولا۔ ''بڑا بڑا شکریہ۔ اب تم لوگ جاسکتے ہو یہاں سے۔''

سجاول پھر بھڑکنے کے قریب تھا لیکن میں نے اُسے سنبھال لیا۔ شہریار سے کہا۔ ''یار، یہ کوئی غیر قانونی کام نہیں ہے، نہ ہی زبردستی ہے کسی سے...... بس کچھ مجبوریاں ہیں جن کی وجہ سے ہم یہاں ہوٹل میں ہیں اگر تم......''

''میرے پاس فالتو ٹائم نہیں ہے۔'' اس نے بات کاٹی۔ ''میں تم لوگوں کی بڑی عزت کر رہا ہوں، ورنہ ایسے معاملوں میں پولیس کو اطلاع دی جاتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ذرا ایک منٹ علیحدہ ہوکر میری بات سن لو۔''

وہ بات سننے کو بھی تیار نہیں تھا مگر میں کسی نہ کسی طرح اسے بغلی کمرے میں لے گیا۔ یہ شاید اس کا ریٹائرنگ روم تھا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے رام کرنے کی کوشش کی اور جب وہ ذرا نرم دکھائی دیا تو جیب سے ہزار ہزار کے بیس نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے۔ ''یار! میری بات کا یقین کرنا۔ کوئی رسک نہیں ہے اس کام میں۔ پھر بھی ہمارے ساتھ تعاون کرنے کا ''شکریہ'' سمجھ کر رکھ لو۔''

نوٹ دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں چمک آئی لیکن دوبارہ ہٹ دھرمی اور کمینگی عود کر آئی۔ وہ نفی میں سر ہلانے لگا۔ میں نے پانچ نوٹ مزید شامل کر کے زبردستی اس کی جیب میں ٹھونس دیے۔

وہ لمبی سانس لے کر بولا۔ ''کل ہوگا نکاح؟''

''امید یہی ہے۔''

''کمرے کب چھوڑو گے؟''

''زیادہ سے زیادہ پانچ چھ دن تک۔''

''نہیں، جمعرات تک خالی کرنے ہوں گے۔ میں اس سے زیادہ نہیں کرسکتا۔ میرا پارٹنر ایسے معاملات میں زیادہ سخت ہے۔''

''چلیں کوشش کرتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

دس منٹ بعد میں اور سجاول دوبارہ اپنے کمرے میں بیٹھے تھے۔ ''مجھے اس کمینے کی آنکھوں میں سؤر کا بال نظر آتا ہے۔ کوئی گڑبڑ نہ کردے۔'' سجاول بولا۔

''ایسے لوگ بے ایمانی کا کام بڑی ایمانداری سے کرتے ہیں۔''

''پھر بھی ہمیں احتیاط کرنی چاہیے شاہی! میرا تو خیال تھا کہ یہ ہوٹل بدل لیتے۔''

''وہاں بھی تو یہی مسئلہ پیش آسکتا ہے یار، ویسے میں نے ایک انتظام بھی کردیا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''وہی جادو کا دانہ۔'' میں نے کہا اور اپنے سیل فون کو آن کرکے اس کے ''کی پیڈ'' سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔

چند ہی سیکنڈ کے بعد میرے فون کی اسکرین پر منیجر شہریار کے کمرے کا بے ڈھنگا منظر ابھرا۔ ٹیڑھے اینگل سے اس کی میز اور ایک صوفے کا آدھا حصہ دکھائی دے رہا تھا۔

''یہ کیمرا کب لگایا تم نے؟''

''جب وہ بک بک کررہا تھا ہمارے ساتھ۔'' میں نے جواب دیا۔

اسپائی کیمرا تصویر تو ڈھنگ کی نہیں دے رہا تھا لیکن آوازیں، آہٹیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ کمرے میں کوئی لڑکی بھی موجود تھی، پھر لڑکی کی ٹانگیں اور منیجر صاحب کی ٹانگیں صوفے کے قریب دکھائی دیں۔ ٹانگوں کے اینگل سے پتا چلتا تھا کہ یہ لڑکی منیجر صاحب کی کوئی سہیلی ہے اور اس وقت باقاعدہ جناب کی آغوش میں بیٹھی ہے۔ اس نے شارٹ پہن رکھی تھی اور اس کی نصف پنڈلیاں بے لباس تھیں۔

شہریار کی آواز سنائی دی۔ ''بامٹرڈز۔ بڑے چالاک بن رہے ہیں۔ مجھے تو اس لمبے تڑنگے کا شناختی کارڈ بھی جعلی لگتا ہے۔''

''تو ''نادرا'' سے پتا کرالو۔ وہاں تو تمہارا وہ افسر یار بیٹھا ہے۔'' لڑکی کی کھنکتی ہوئی آواز آئی۔

''مجھے کیا ضرورت پڑی ہے۔ پولیس والے خود ہی بُرے کے گھر میں گھس جائیں گے۔''

''تو پولیس کو اطلاع دو گے؟''

''میرے خیال میں دینی چاہیے۔ مجھے یہ لمبا تڑنگا گڑبڑ لگ رہا ہے۔ لگتا ہے کہ اس کی صورت کہیں دیکھی ہوئی ہے۔ کوئی دبنگ قسم کی شے ہے یہ۔'' (یہ ذکرِ خیر سجاول کا تھا)

''اور دوسرا؟'' لڑکی نے پوچھا۔

''وہ بھی کوئی گھنی شے ہے۔ اس کا بازو بھی زخمی ہے۔ کیا پتا کوئی پھڈا شڈا کرکے آیا ہو۔ پر اس سے زیادہ مجھے اس تڑنگے کی فکر ہے۔ اس کے شناختی کارڈ پر نام محمد فاضل لکھا ہے۔ پر پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ اس کا اصل نام کچھ اور ہے اور کسی اخبار میں...... یا کسی اور جگہ میں اس کی شکل بھی دیکھ چکا ہوں۔ بس کھوپڑی میں نہیں آرہا۔''

لڑکی منیجر کی آغوش کو چھوڑ کر الماری کی طرف گئی اور اس کی ذرا سی جھلک نظر آئی۔ وہ تراشیدہ بالوں والی ایک پر کٹی کبوتری تھی۔ کانوں میں چمکیلے جھمکے تھے۔ عین ممکن تھا کہ کوئی کال گرل ہو۔ ذرا فاصلے سے اس کی باریک آواز آئی۔ ''لیکن تم تو روپے بھی وصول کرچکے ہو اُن سے۔''

''اوئے بھولی شہزادی! بیس پچیس ہزار کوئی شے نہیں۔ اس طرح کے لوگ جب پھنستے ہیں تو چار پانچ لاکھ بھی آرام سے ڈھیلے کردیتے ہیں اور وجاہت رانا جیسا تھانے دار تو دگنے تگنے بھی نکلوا لیتا ہے۔''

''کوئی زبان بھی تو ہوتی ہے۔'' لڑکی نے شوخی سے کہا۔

''کسی خفیہ اطلاع پر چھاپا بھی تو پڑ سکتا ہے۔'' اس نے کمینگی بھرے لہجے میں جواب دیا۔

''تمہیں کیا ملے گا؟'' پر کٹی کبوتری نے پوچھا۔

''کچھ نہ کچھ تو مل ہی جائے گا۔ شکار پھنسا کر دینا بھی تو کام رکھتا ہے۔''

''تو پھر سوچ کیا رہے ہو، لگاؤ فون۔''

''تو لاؤ فون۔'' شہریار کی پاٹ دار آواز آئی۔

میں نے اور سجاول نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور دونوں ہی سیڑھیاں اتر کر منیجر کے کمرے کی طرف لپکے۔ سجاول نے دھڑ دھڑ دروازہ بجایا۔

''کون ہے؟'' اندر سے کرخت آواز ابھری۔

''میں ہوں منیجر صاحب! ایک منٹ بات کرنا تھی۔'' میں سنبھلے لہجے میں بولا۔

چند سیکنڈ بعد دروازہ کھلا اور شہر یار کی برہم صورت نظر آئی۔ ہم اندر چلے گئے۔ لڑکی کہیں نظر نہیں آئی۔ شہر یار نے اسے عارضی طور پر بغلی کمرے میں بھیج دیا تھا۔ ہمیں اپنے کمرے سے شہر یار کے دفتر تک پہنچنے میں دس سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ یقینی بات تھی کہ وہ ابھی فون والے ارادے پر عمل نہیں کرسکا تھا۔

میں نے دروازہ اندر سے بند کیا تو شہر یار کا منہ کھلا رہ گیا۔

''کیا بات ہے؟'' وہ ششدر ہو کر بولا۔

اس دوران میں سجاول بغلی دروازہ کھول کر اور لڑکی کو بالوں سے پکڑ کر کمرے میں لا چکا تھا۔ سجاول کے ہاتھ میں خوفناک نال والا ریوالور دیکھ کر لڑکی کی گھگی بندھ گئی تھی۔ شہر یار بھی زرد نظر آرہا تھا۔ یکایک اس نے اپنی میز کی طرف ہاتھ بڑھایا جیسا کہ بعد میں پتا چلا وہ پستول نکالنا چاہتا تھا۔

سجاول نے لپک کر شہر یار کی کلائی تھام لی اور اسے بے دردی سے میز کے کنارے پر مارا۔ ہڈی ٹوٹنے کی آواز بڑی واضح تھی۔ لڑکی چلائی مگر آواز اتنی بلند نہیں تھی کہ باہر تک جاسکتی۔ شاید اس کا گلا خشک ہو چکا تھا اور آواز کو بلند ہونے کے لیے مناسب ''ماحول'' میسر نہیں آسکا تھا۔

سجاول نے اپنا ریوالور اس کی گردن میں گھسیڑا اور پھنکارا۔ ''شور مچائے گی تو اسی جگہ فوت کردوں گا۔''

کوئی ایسی بات تھی اس کے لہجے میں کہ لڑکی نے وہشت زدہ ہو کر اپنے ہونٹ بڑی مضبوطی سے بھینچ لیے۔ وہ دبلی پتلی تھی۔ یوں کانپنے لگی جیسے لرزے کا بخار چڑھا ہو۔

دوسری طرف چوڑے جبڑے والے منیجر شہر یار کو بھی ایسے سخت ردِعمل کی توقع نہیں تھی۔ اس نے اپنی مضروب کلائی کو دوسرے ہاتھ میں تھام لیا تھا اور ایک کونے میں سٹ گیا تھا، اس کی آنکھوں میں تکلیف آمیز خوف کا دریا بہنے لگا تھا۔

سجاول نے اس پر گندی گالیوں کی بوچھاڑ کی اور فون کا ریسیور اٹھا کر شہر یار کی طرف بڑھایا۔ ''لے کر فون اپنے ناجائز باپ کو۔ بتا اُسے کہ شکار پھنسا لیا ہے میں نے۔ لے پکڑ۔''

منیجر شہر یار کو اب سمجھ آگئی تھی کہ اس کا پالا ایسے لوگوں سے پڑ گیا ہے جو اس سے کافی بھاری ہیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ سجاول نے ریسیور اس کے منہ پر مارا اور زہریلے انداز میں پچکار کر بولا۔ ''چل کر لے فون۔ اپنے پلسیے یار کو جو بتاتا ہے وہ بتا بھی دے...... میں کرتا ہوں تجھے کچھ نہیں کہوں گا۔ اور نہ روکوں گا۔ پر جن کو ابھی نئی سوزوکی گڈی کی خبر سنا رہا تھا نا، انہیں آج رات تک قبرستان میں پہنچا دوں گا۔'' (ابھی تھوڑی دیر پہلے شہر یار نے فون پر چند فقرے اپنے بیوی بچے سے بھی بولے تھے اور انہیں نئی گاڑی خریدنے کی خبر دی تھی)

شہر یار دہشت زدہ اور ہکا بکا تھا۔ یقیناً اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اس کمرے میں ہونے والی گفتگو ہم تک کیسے پہنچی ہے۔ وہ سجاول کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''م...... مجھے لگتا ہے کہ میں نے...... تمہیں...... آ...... آپ کو کہیں دیکھا ہوا ہے۔''

''یہ ڈاکٹر صاحب ہیں۔'' میں نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ''جب تم جیسے ''مت ماے'' بدمعاشوں کو طاقت اور پیسے کی بدہضمی ہوتی ہے تو ان کی ایک دو خوراکوں میں ہی ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر سجاول نام ہے ان کا۔ ڈاکٹر سجاول بی ایم پی پی۔ بی ایم پی پی کا مطلب ہے بندے مارو پیٹ پھاڑو۔'' میں نے منیجر کی توند کو انگلی سے زور کا ٹھوکا دیا۔

شہر یار کی آنکھیں بے ساختہ پھیلتی چلی گئیں۔ اس کی چوڑی پیشانی پر سوچ کی لکیریں تھیں پھر یکایک اس کا چہرہ اوپر تلے تین چار رنگ بدل گیا۔

وہ سجاول کی طرف انگلی اٹھا کر ہکلایا۔ ''س...... سجاول نام ہے آپ کا۔ مجھے یاد آگیا ہے...... یاد آگیا ہے...... آ...... آپ کا تو بڑا نام ہے۔ آپ تو بادشاہ ہو جی۔ ہمارا آپ کا کیا جوڑ جی...... غلطی ہوگئی مجھ سے...... بڑی غلطی ہوگئی۔''

اس نے اپنی کلائی ضرور دوسرے ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی لیکن ان لمحوں میں وہ جیسے اپنی تکلیف بھی بھول گیا تھا۔

میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ وہ سجاول سیالکوٹی کو ایک خطرناک ڈکیت کی حیثیت سے جانتا تھا۔ اب اسے پہچاننے کے بعد اسے اپنی سفید پتلون گیلی ہونے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ اپنے ''باس'' کی یہ حالت دیکھ کر لڑکی کی حالت اور بھی پتلی ہوگئی۔ وہ مسلسل روتی جارہی تھی۔ سجاول نے اس کے ڈیانا کٹ بال چھوڑ دیے اور وہ بے دم سی ہو کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس میں اب اتنا دم نہیں تھا کہ کسی بھی طرح کی مزاحمت کرسکتی۔

حیرت ہوئی کہ چند سیکنڈ بعد منیجر شہر یار نے زمین پر بیٹھ کر باقاعدہ سجاول کے پاؤں پکڑ لیے۔ (ویسے اس کا

ایک ہاتھ ٹوٹ کر جھول رہا تھا۔ وہ فقط ایک پاؤں ہی پکڑ سکا تھا۔

''غلطی ہوگئی جی۔ میرے ماں باپ کی توبہ جو میں کسی کو اطلاع دوں۔ آپ جو کہیں گے، وہی ہوگا۔'' وہ گھگھیایا۔

''اور یہ تمہاری پر کٹی کبوتری؟'' میں نے لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ..... ایک لفظ بھی کسی سے بولے..... تو میں خود اسے جان سے مار دوں گا۔'' منیجر شہریار کی آواز لرز رہی تھی۔ لڑکی بھی شدومد سے نفی میں سر ہلانے لگی۔

ایک دو گھنٹے کے اندر کافی ''کایا کلپ'' ہوگئی۔ پہلے ہمارے پاس صرف دو کمرے تھے۔ منیجر شہریار کی ہدایت پر دو اور کمرے ہمارے سپرد کر دیے گئے۔ شہریار نے کہا کہ چیک آؤٹ ٹائم کے بعد اوپر والا پورا پورشن ہمارے تصرف میں رہے گا اور ہم جس طرح چاہیں اسے استعمال کر سکتے ہیں۔ رشوت کے جو پچیس ہزار روپے اس نے مجھ سے وصول کیے تھے، وہ بھی ہاتھ جوڑ کر واپس کر دیے۔

اس کی کلائی کی ایک ہڈی بچ گئی تھی۔ وہ صدر کے کسی ماہر پہلوان سے اپنا بازو بندھوا کر واپس آ گیا۔ ہوٹل میں بھی پتا چلا تھا کہ بڑے صاحب واش روم میں گر پڑے تھے۔

اگلے روز منیجر شہریار کا اسسٹنٹ ایک بڑی سی گٹھڑی لے کر آیا۔ معلوم ہوا کہ اس گٹھڑی میں مسہری کا سامان ہے اور گلاب کی پتیاں وغیرہ ہیں۔ ایک کمرے کو باقاعدہ حجلہ عروسی کی شکل دے دی گئی۔ یہ فرسٹ فلور کا سب سے کشادہ اور اچھا کمرا تھا، نکاح خواں اور گواہوں کا انتظام کل شام ہی ہو چکا تھا۔ شہریار نے بناؤ سنگھار والی دو لڑکیوں کو ایک پارلر سے منگوا رکھا تھا۔ یہ معاوضہ لے کر بناؤ سنگھار کرنے والی لڑکیاں تھیں۔ انہیں کچھ غرض نہیں تھی کہ کس کی شادی کس کے ساتھ کیوں ہورہی ہے۔ اخراجات کے لیے مجھے بھی کیش کی ضرورت تھی۔ اس سے پہلے میں نے سجاول سے پچاس ہزار روپیا ادھار لیا تھا۔ ماضی قریب میں، میں نے ایم اے کی فائٹس میں کافی ڈالرز کما رکھے تھے، یہ رقم امارات میں میرے ایک قریبی راز دار دوست کے پاس تھی، میں بینک کے ذریعے تو منتقل نہیں کرا سکتا تھا، مجبوراً ہنڈی کے ذریعے معقول رقم منگوالی تھی......

شام سے تھوڑی دیر پہلے خورسنہ ایک بڑی چادر میں لپٹی لپٹائی اسٹیشن کے اس قریبی ہوٹل میں پہنچ گئی۔ عروسی جوڑے کے علاوہ تین چار مزید جوڑوں، جیولری اور جوتوں وغیرہ کا انتظام سجاول نے دو دن پہلے ہی کر لیا تھا۔ خورسنہ کی ضرورت کی بیشتر اشیا عروسی کمرے میں موجود کر دی گئی تھیں۔ خورسنہ ایک بڑے اٹیچی کیس میں اپنا سامان بھی برونائی سے لے کر آئی ہوئی تھی۔ یہ سامان بھی ایک دن پہلے ہی ہوٹل میں پہنچ گیا تھا اور سیٹ کر دیا گیا تھا۔

منیجر شہریار بڑا جہاندیدہ اور موقع شناس بندہ لگتا تھا۔ وہ بڑی رازداری اور اپنائیت کے ساتھ سجاول کی ہر ضرورت پوری کر رہا تھا۔ میں اس سارے معاملے میں پیش پیش نہیں تھا۔ میرا زیادہ وقت کمرے میں بند رہ کر گزر رہا تھا۔

شام کو نکاح سے کوئی دو گھنٹے پہلے خورسنہ میرے کمرے میں آئی، وہ بولی۔ ''میں خوش قسمت ہوں کہ اس بات سے آگاہ ہوں...... کہ آپ زندہ سلامت ہیں۔ ورنہ شاید اس وقت میں بھی جاجاجی کے بے شمار لوگوں کی طرح آپ کے غم میں آنسو بہا رہی ہوتی۔''

''مجھے امید ہے خورسنہ کہ یہ راز ہم تینوں کے درمیان ہی رہے گا۔ میرے بے حد قریبی لوگ جن میں انیق بھی شامل ہے، اس بھید سے بے خبر ہیں۔''

''آپ بے فکر رہیں۔ میں اس معاملے کی نزاکت اور سنگینی کو بہت اچھی طرح سمجھ رہی ہوں۔ مجھے سولی پر لٹکا دیا جائے تو بھی اس معاملے میں زبان نہیں کھولوں گی۔''

''بہت شکریہ خورسنہ۔''

''آپ کے ہم پر بہت احسان ہیں۔ آپ کے لیے تو جان بھی حاضر ہے۔'' اس نے جیسے تہ دل سے کہا پھر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی۔ ''میں یہاں اس لیے نہیں آئی تھی کہ سجاول سے شادی کر لوں۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ سجاول جاجاجی سے دکھی ہو کر واپس گیا ہے۔ میں اس سے ملنا چاہتی تھی۔ اسے بتانا چاہتی تھی کہ یہ دوری عارضی ہے۔ ہم آگے چل کر مل بھی سکتے ہیں لیکن یہاں آ کر سب کچھ ہی بدل گیا۔ میں نے دیکھا کہ سجاول میرے اندازوں سے کہیں زیادہ ڈسٹرب ہے۔ وہ اتنا بکھرا ہوا تھا کہ مجھے ڈر لگنے لگا......''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو خورسنہ! وہ تمہاری محبت میں بہت دور تک چلا گیا ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اتنا بدل سکتا ہے۔ جاجاجی سے آنے کے بعد وہ اٹھتے بیٹھتے تمہیں اور ذیشان کو یاد کرتا رہا ہے۔ مجھے لگتا تھا کہ وہ ٹوٹ پھوٹ کر رہ جائے گا۔ تم نے جو فیصلہ کیا ہے خورسنہ! میں اس سے

پوری طرح اتفاق کرتا ہوں۔''
اس کے چہرے پر ہلکی سی سرخی لہرائی۔''یہ میرا نہیں سجاول کا فیصلہ ہے۔ میں نے تو بس اس کے فیصلے پر سرِ تسلیم خم کیا ہے۔''
''مجھے پورا یقین ہے، تم دونوں خوش رہو گے۔''
وہ ذرا توقف سے بولی۔''آپ تو سجاول کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں، آپ مجھے بتائیں، مجھے اس سے ڈر کیوں لگتا ہے؟''
''......کس طرح کا ڈر؟'' میں نے پوچھا۔
''شاید...... مجھے خود بھی پتا نہیں، ہوسکتا ہے کہ یہ اس بات کا ڈر ہو کہ وہ بہت غصے والا ہے، بہت اکھڑ اور کڑوا ہے۔''
''مجھے یقین ہے کہ محبت ساری کڑواہٹیں ختم کر دیتی ہے۔ یہ تو تم بھی جان ہی چکی ہو گی کہ سجاول دوسروں سے بہت مختلف ہے۔ میں ماضی کے حوالے سے اس کی صفائیاں پیش کرنا نہیں چاہتا۔ میں صرف ماضی قریب اور حال کی بات کرنا چاہتا ہوں۔ خورسنہ! تمہاری محبت ایک طوفان کی طرح اس کی زندگی میں آئی ہے اور اس نے اسے بنیادوں سے ہلا ڈالا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اس کی زندگی کی پرانی عمارت ڈھے گئی ہے اور اب ایک نئی تعمیر ہو رہی ہے۔''
''آپ اس کے غصے اور اکھڑپن کے بارے میں کیا کہیں گے؟'' وہ بولی۔
''تم اس کے غصے پر نہ جاؤ خورسنہ، اس کا مزاج فولادی ہے پر دل سونے کا ہے۔ اس کا تھوڑا بہت تجربہ تمہیں جاماجی میں بھی ہو گیا ہو گا۔ وہ سین تو میں نے بھی دیکھا تھا جب تمہیں اور چھوٹے ذیشان کو بپھرے ہوئے گرے فوجیوں اور ایجنسی والوں سے بچانے کے لیے وہ بے دریغ ان پر جھپٹ پڑا تھا۔''
''ہاں...... وہ سب کچھ تو میرے دل پر نقش ہے۔''
اس نے ہولے سے کہا پھر چند لمحے خاموش رہنے کے بعد مسکرائی اور بولی۔''ویسے اس کے غصے سے مجھے خود اپنے لیے اتنا ڈر نہیں آتا جتنا دوسرں کے لیے آتا ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ جو کوئی اس کی مرضی کے خلاف چلے گا، وہ اس پر جھپٹ پڑے گا اور مارنا شروع کر دے گا۔''
''میں نے کہا ہے ناں خورسنہ! وہ بڑی تیزی سے تبدیل ہوا ہے اور مزید ہو رہا ہے۔ میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ تمہاری اور ذیشان کی محبت اسے ایک بدلا ہوا شخص بنا دے گی۔ بس تمہیں تھوڑا سا وقت دینا ہے اسے۔''

وہ بولی۔''میری ایک خواہش ہے شاہ زیب صاحب۔''
''ہاں کہو۔''
''کیا اس نکاح میں آپ میرے لیے سرپرست کا کردار ادا کر سکتے ہیں؟ اگر ایسا ہو جائے...... تو یہ میرے لیے بڑی خوش نصیبی کی بات ہو گی۔ اس نکاح میں میرا کوئی چھوٹا بڑا شریک نہیں ہے۔ آپ کے ہونے سے مجھے یوں لگے گا جیسے کوئی کمی نہیں رہی۔''
میں سمجھ رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے، میں نے کہا۔''خورسنہ! مجھے اس میں کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا تھا مگر تم موجودہ صورتِ حال کو جانتی ہو۔ اگر میں نکاح نامے پر ولی یا سرپرست کی حیثیت سے نام دوں گا اور دستخط کروں گا تو یہ میرے تاحال زندہ ہونے کا ایک ثبوت بن جائے گا۔''
بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور اس کے چہرے پر مایوسی کا رنگ لہرا گیا۔
میں نے اسے تسلی دی۔''خورسنہ! کاغذ پر لکھے ہوئے لفظ تو خانہ پُری کی ضرورت کے تحت ہوتے ہیں۔ اصل بات تو دل کی ہوتی ہے اور دل سے نکلے بولوں کی ہوتی ہے اور میں تمہاری بات کو دل سے قبول کرتا ہوں۔ نکاح کے فارم میں میرا نام نہ ہونے کے باوجود میں تمہاری طرف سے اس نکاح میں شریک ہوں گا۔''
''شکریہ شاہ زیب صاحب۔'' اس نے کہا۔
اٹھنے سے پہلے اس نے ایک غیر متوقع حرکت کی۔ میرے کندھوں پر اجرک ٹائپ کی ایک چادر تھی۔ اس نے آگے جھک کر چادر کا پلو تھاما اور اسے بوسہ دیا۔
''ارے یہ کیا کرتی ہو؟'' میں نے اسے ٹوکا۔
وہ آنکھوں میں ہلکی سی نمی لے کر واپس چلی گئی۔ اس نے جاماجی کے مقامی رواج کے مطابق عزت افزائی کے لیے میری چادر کو چوما تھا۔
یہ وہی باتیں تھیں جو میرے دل و دماغ پر بوجھ ڈالتی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ میں کتنے پانی میں ہوں۔ بے شک میں ایک فائٹر تھا مگر سیاست، جنگ اور جہاں بانی کا مجھے کم تجربہ تھا۔ جاماجی میں جو کچھ ہوا، بس آپوں آپ ہی ہو گیا تھا۔ لوگوں کے اندر پہلے سے ایک زبردست ابال موجود تھا جسے غیظ و غضب کی صورت پھٹ پڑنے کے لیے کسی بہانے کی ضرورت تھی اور یہ بہانہ انہیں میری اور میرے ساتھیوں کی صورت میں مل گیا تھا۔
شام کو سجاول سیالکوٹی اور جاماجی کی خوش رنگ

ہمیں خورسنہ کا نکاح بخیر و خوبی ہوگیا۔ میں حتی الامکان الگ تھلگ رہنا چاہتا تھا اس لیے عین نکاح کے وقت چند منٹوں کے لیے اپنے کمرے سے باہر نکلا اور وہ بھی سندھی ٹوپی، اجرک اور ہلکے رنگ کی کمانی دار عینک کے ساتھ۔

اس نکاح میں سجاول نے اپنی طرف سے بھی کسی کو شریک نہیں کیا تھا۔ یہاں تک کہ والدہ کو بھی نہیں۔ منیجر شہر یار، جو شاید عام حالات میں ناک پر مکھی بھی نہیں بیٹھنے دیتا ہوگا، نکاح کے دوران میں سرگرم نظر آرہا تھا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ جو ہونا ہے، وہ تو ہونا ہی ہے تو پھر کیوں نا وہ اس حوالے سے سجاول جیسے دبنگ کی خوشنودی حاصل کرے۔

میں نے اگلے روز سہ پہر سے کچھ دیر پہلے خورسنہ کو دیکھا۔ وہ پاکستانی دلہنوں کی طرح بہت زیادہ شرمالجا تو نہیں رہی تھی مگر اس نے لباس پاکستانی ہی پہن رکھا تھا۔ فیروزی رنگ کا کڑھائی دار شلوار کرتہ تھا اور مہندی، جیولری وغیرہ بھی دکھائی دے رہی تھی، ایک شوخی آمیز حیا نے اس کے دلکش چہرے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ مجبوری تھی، میں نے شادی کا تحفہ اسے کیش کی صورت میں دیا جسے اس نے نہایت خوش دلی سے قبول کیا۔ ہم نے بند کمرے میں ایک پُرتکلف کھانا کھایا اور اِدھر اُدھر کی باتیں بھی کرتے رہے۔ اپنے بچے ذیشان کے ذکر پر وہ تھوڑی سی اداس ہوگئی تھی۔ خوشی کی ان گھڑیوں میں بھی وہ اس کی دوری محسوس کر رہی تھی۔

میں نے سجاول سے کہا۔ ”بھابی کی بات ذیشان سے ہو نہیں سکتی؟“

”ہاں، میں کوشش کر رہا ہوں۔ ذیشان وہاں اپنے ماموں کے پاس ہے۔ ماموں کا فون نمبر تو خورسنہ کے پاس موجود ہے، ہم رات کو بھی کوشش کرتے رہے ہیں لیکن رابطہ نہیں ہوا۔ امید ہے آج ہوجائے گا۔“

”تو پھر کرو ناں رابطہ...... دیکھو کتنا سا منہ نکل آیا ہے۔“ میں نے خورسنہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔“ وہ ہولے سے مسکرائی۔ ”دراصل زور کی بھوک لگ رہی تھی۔ اب کھانا کھایا ہے تو منہ پر بھی رونق آجائے گی۔ وہ جاباجی میں ایک کہاوت ہے، اچھا کھانا، چہرے پر چمکتا ہے۔“

ٹی وی آن تھا۔ خبروں کے درمیان آنے والی ایک خبر نے ہمیں اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ نیوز کاسٹر نے اپنی روٹین کے مطابق ہیجان خیز لہجے میں کہا۔ ”ہم آپ کو یہاں ایک اہم خبر دے رہے ہیں۔ لاہور میں کالج روڈ پر نالے کے پاس سے ایک شخص کی تشدد زدہ لاش ملی ہے۔ مرنے والے پر کیا جانے والا تشدد لرزہ خیز ہے۔ اس کے زندہ جسم سے گوشت کے ٹکڑے کاٹے گئے ہیں...... اور شاید اس کے دونوں پاؤں بھی جیتے جی اس کے جسم سے علیحدہ کیے گئے ہیں۔ خدشہ ظاہر کیا جارہا ہے کہ اس ہولناک قتل کے پیچھے وہی غیر ملکی ہیں جنہوں نے اس سے پہلے بیس شہریوں کو گولیوں سے چھلنی کیا۔ ہم نے اپنے نمائندے سے رابطہ کیا ہے۔ ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ ان کے پاس اس حوالے سے کیا معلومات ہیں؟“

فیلڈ رپورٹر سے رابطہ ہوگیا۔ اس نے کہا۔ ”جی میں اس اسپتال کے باہر کھڑا ہوں جہاں مقتول کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے لائی گئی ہے۔ اس شخص کا نام تاری بتایا جارہا ہے اور یہ بھی کہا جارہا ہے کہ اس کا تعلق کسی نہ کسی طور داؤد بھاؤ کے گروپ سے رہا ہے۔“

اسٹوڈیو میں موجود نیوز کاسٹر نے کہا۔ ”اگر ایسا ہے تو پھر یہ سوچا جاسکتا ہے کہ لاہور میں موجود غیر ملکی گھس بیٹھیوں نے ابھی تک شاہ زیب وغیرہ کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ عین ممکن ہے کہ اب وہ شاہ زیب کے قریبی ساتھیوں مثلاً انیق اور مختار وغیرہ کو تلاش کر رہے ہوں۔“

”بالکل جی، یہ ممکن ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ابھی انہیں شاہ زیب کی طرف سے بھی پوری تسلی نہ ہوئی ہو۔ وہ اپنا یہ شک رفع کرنا چاہتے ہوں کہ کہیں شاہ زیب اس دھماکے میں ”سروائیو“ تو نہیں کرگیا۔“

”لیکن اب تو دھماکے میں مرنے والے بیشتر افراد کی ڈی این اے رپورٹ بھی آچکی ہے، جن میں معروف اداکارہ اروشا اور شاہ زیب بھی شامل ہیں۔“

”جی کچھ حلقے ایسے بھی ہیں جو اس رپورٹ کو بہت زیادہ وزن نہیں دے رہے۔ دھماکا اور دھماکے کے بعد لگنے والی آگ اتنی شدید تھی کہ بہت کچھ راکھ کا ڈھیر بن گیا تھا۔ ایسے حالات میں شکوک کا اظہار تو ہمیشہ کیا ہی جاتا ہے۔“

نیوز کاسٹر نے کہا۔ ”یہ بھی خبر آئی ہے کہ ایک معروف مقامی ہوٹل میں بھی کل رات کچھ نامعلوم افراد داخل ہوئے اور انہوں نے اسسٹنٹ منیجر کے ساتھ سخت بدتمیزی کی اور اس سے شاہ زیب اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہیں؟“

”جی ہاں، صرف بدتمیزی ہی نہیں کی گئی بلکہ اسسٹنٹ منیجر کو زدوکوب بھی کیا گیا۔ یہ وہی ہوٹل ہے جہاں شاہ زیب اور انیق قیام پذیر تھے اور جہاں سے غیر ملکیوں نے انہیں پہلی بار ٹریس کیا تھا۔“

آدمی اسکرین پر ہاؤس نمبر 18 کا وڈیو کلپ دکھایا جارہا تھا۔ یہاں روڈ بلاکر لگے ہوئے تھے اور خاردار تار کے چھلوں سے عمارت کے گرد حصار قائم کیا گیا تھا۔ صبح ایک خبر میں بتایا جاچکا تھا کہ دھماکے کے بعد سے عمارت کا مالک سابق قونصلیٹ روپوش ہے۔ پولیس اسے تلاش کررہی ہے اوراس کے لنکس ڈھونڈ رہی ہے۔

نیوز کاسٹر نے اپنا رخ کیمرے کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ ''تو ناظرین! یہ ساری صورتِ حال مزید خطرات کی طرف اشارہ کررہی ہے۔ واضح مطلب یہی ہے کہ ٹیکساری گینگ کے وہ عالمی شہرت یافتہ قاتل ابھی یہیں پر موجود ہیں۔ ابھی وہ اپنی ''خونی کارکردگی'' سے پوری طرح مطمئن نہیں۔ ہماری انتظامیہ کو پوری طرح چوکس رہنے کی ضرورت ہے۔''

نیوز ختم ہوئیں اور اشتہارات شروع ہو گئے۔ ہم تینوں کچھ دیر اس موضوع پر گفتگو کرتے رہے۔ سجاول اور خورسنہ کی رائے بھی یہی تھی کہ ابھی مجھے مکمل طور پر روپوش رہنا چاہیے اور کوئی چھوٹے سے چھوٹا رسک بھی نہیں لینا چاہیے۔ عین ممکن تھا کہ چند دن بعد وہ لوگ میری ''موت'' کی طرف سے مکمل طور پر مطمئن ہوجاتے۔

خورسنہ جلد از جلد اپنے ماموں زاد سے رابطہ کر کے اپنے بچے سے بات کرنا چاہتی تھی۔ وہ سیل فون کے ساتھ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں اور سجاول موجودہ صورتِ حال کے حوالے سے بات کرنے لگے۔ میں نے کہا۔ ''سجاول، مجھے انیق کی طرف سے فکر ہے، کہیں وہ ان کے ہتھے نہ چڑھ جائے۔''

''وہ جتنا زمین کے اوپر ہے، اتنا ہی نیچے بھی ہے۔ آسانی سے ہاتھ نہیں آئے گا اور آ بھی گیا تو رونی صورت بنا کر اور پاؤں کو ہاتھ شاتھ لگا کر بچ جائے گا۔'' سجاول نے قدرے بیزاری سے کہا۔

''نہیں سجاول! میں چاہتا ہوں کہ تم فون پر اس سے رابطہ کرو۔''

''اور بتادوں کہ تم یہاں خیر خیریت سے موجود ہو اور ابھی ابھی کڑاہی گوشت کھا کر فارغ ہوئے ہو۔''

''نہیں، یہ بات تو بس اب ہم تینوں کے درمیان ہی رہنی چاہیے۔ تم اس کی خیر خیریت پوچھو اور اسے ہوشیار کرو کہ ڈیتھ گینگ اسے ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔''

اس حوالے سے میرے اور سجاول کے درمیان کافی بحث ہوئی، آخر وہ فون کرنے پر رضامند ہوگیا۔ لیکن ہوٹل کے اندر سے فون کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ سیل فون کی لوکیشن ٹریس ہوسکتی تھی۔ ضرورت تھی کہ سجاول اپنی جیپ پر بیٹھ کر ہوٹل سے دور جائے اور بات کرے۔

سجاول کوئی ایک گھنٹے بعد واپس آیا۔ اس نے بتایا کہ انیق سے بات ہوگئی ہے۔

''کیا کہا اس نے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ تمہارا انکو بہت بڑا ڈرامے باز ہے۔ اس کو تو فلموں، ڈراموں میں بھرتی ہوجانا چاہیے۔ تمہارے لیے خود کو اتنا دکھی ظاہر کررہا تھا جیسے تم نے اس کے پیٹ سے جنم لیا ہے۔ دوسروں کی طرح وہ بھی تمہیں روپے میں سے نوے پیسے تو ''فوت'' کرہی چکا ہے۔''

''کہاں ہے وہ؟''

''اتنا بھولا نہیں ہے کہ بتا دیتا۔ بیٹھا ہوگا کہیں چھپ کر۔ ویسے مجھے لگتا ہے کہ لاہور میں ہی ہے۔''

''تاجور یا کسی اور سے رابطہ تو نہیں ہوا اُس کا؟''

''وہ الٹا مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ تاجور کو اس واقعے کی خبر ہوئی ہے یا نہیں۔''

''تم نے کہا کہ گینگ والے اسے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں؟''

''ڈرایا تو بڑا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ نکو شہزادے اگر تم ان کے ہاتھ آ گئے تو اگلی پچھلی کسر نکال دیں گے۔ بڑے وحشی لوگ ہیں، بندے کا قیمہ بنا دیتے ہیں اور پاؤں کی طرف سے شروع کرتے ہیں۔''

''خیر، وہ ڈرنے والا تو نہیں ہے سجاول! اس کا تجربہ تم بھی جاماجی میں کر چکے ہو اور اصل میں اس کی یہی دلیری مجھے ڈرا رہی ہے۔''

میں نے اسے چنگی طرح سمجھا دیا ہے یار! بے فکر رہو۔ اب اس نے اتنی بھی جان تَلی پر نہیں رکھی ہوئی کہ سیدھا موت کے کھوہ میں چھال مار دے۔'' سجاول نے پھر بیزار لہجے میں کہا۔

''تم جب بھی اس کے بارے میں بولتے ہو تمہارے منہ سے انگارے ہی نکلتے ہیں۔''

''اور وہ بھی میرے بارے میں اپنے منہ سے جو پھول جھاڑتا ہے، وہ میں چنگی طرح جانتا ہوں۔'' سجاول کے لہجے میں بدستور بیزاری تھی۔

میں نے موضوع بدل دیا۔ اسے نارمل ہونے میں کچھ دیر لگی۔ میں نے کہا۔ ''سجاول! موجودہ صورتِ حال میں تمہارا کیا مشورہ ہے؟ تم نے دیکھ ہی لیا ہے۔ وہ اب بھی

لاہور میں ہیں اور ہر جگہ مجھے ڈھونڈ رہے ہیں۔ یہ بھی کوئی بڑی بات نہیں کہ وہ چاند گڑھی اور سکھیرا گاؤں بھی معلومات حاصل کریں۔''

''تمہارا مطلب ہے وہ خود وہاں پہنچ جائیں گے؟''

''نہیں، لیکن مقامی بدمعاشوں سے بھی تو ان کے رابطے ہیں۔ وہ ان کے ذریعے کھوج لگا سکتے ہیں اور اپنی تسلی کر سکتے ہیں۔''

''ایسے حالات میں تو چنگا یہی ہے کہ تم کچھ دیر کے لیے غائب ہی رہو۔ میرا مطلب ہے کہ دو چار مہینوں کے لیے دائیں بائیں ہو جاؤ۔ سب سے اچھا یہی ہے کہ ڈیرے پر چلے جاؤ۔ وہاں فیض محمد تمہارے رہنے سہنے کا سارا انتظام کر دے گا۔''

''میرے دل میں بار بار ایک خیال آرہا ہے سجاول! کرنل احرار کا تو تمہیں پتا ہی ہے ناں جو جاجی سے ہمارے ساتھ یہاں آئے تھے؟''

''ہاں، ہاں، سنا ہے بڑا قابل ڈاکٹر ہے۔''

''لیکن وہ عام ڈاکٹر نہیں ہے۔ بہت بڑا پلاسٹک سرجن ہے۔ جن لوگوں کے چہرے کسی حادثے میں بگڑ جاتے ہیں یا جل جاتے ہیں، وہ ان کی ایسی شاندار مرمت کرتا ہے کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے ہیں۔ میں نے وہاں ایک فوجی لڑکی کو دیکھا تھا۔ وہ لیفٹیننٹ تھی اور ایک جنگی مشق کے دوران میں اس کا چہرہ اور گردن بری طرح جھلس گئے تھے۔ اب اس کے چہرے کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ وہی لڑکی ہے اور ایسی کئی اور مثالیں بھی ہیں۔''

سجاول نے ذرا تعجب سے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''تو تم بھی اپنا چہرہ بدلنا چاہتے ہو؟''

''نہیں...... لیکن چہرے پر کچھ ایسی چھوٹی موٹی تبدیلیاں تو ہو ہی سکتی ہیں جن کی وجہ سے مجھے آسانی سے پہچانا نہ جاسکے۔''

''یہ تو وہی فلموں والی بات لگتی ہے۔''

''لیکن اس دور میں یہ ناممکن نہیں رہا۔ یہ کام اتنی صفائی اور مہارت سے ہوتا ہے کہ مصنوعی تبدیلی کا شبہ تک نہیں ہوتا۔ شوبز اور دیگر شعبوں کے کئی مشہور لوگ ہیں جنہوں نے اپنے چہروں پر من پسند تبدیلیاں کروائی ہیں۔ کسی نے موٹی ناک کو پتلا کیا ہے۔ کسی نے اپنے ہونٹوں کو بدلا ہے۔ کہیں آنکھیں چھوٹی بڑی کروائی گئی ہیں اور یہاں شوق کا معاملہ تو نہیں ہے، یہ تو ایک بہت بڑی مجبوری ہے۔''

''تمہارا کیا مطلب ہے۔ تم اپنے چہرے کو بدل کر آؤ گے تو میں تمہیں پہچان نہیں سکوں گا؟ تمہارا قد کاٹھ تو وہی رہے گا...... اور تمہاری آواز...... تمہاری آنکھیں......؟''

''آنکھیں بھی بڑی حد تک بدل جاتی ہیں۔ جہاں تک آواز کی بات ہے، اس کو بدلا جا سکتا ہے بلکہ جدید سائنس میں تو یہ بھی ممکن ہو گیا ہے کہ آپ اگر کسی خاص بندے کی آواز میں بولنا چاہیں تو ایسا کر سکتے ہیں لیکن ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔''

سجاول نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اور بولا۔ ''یارا سچی گل تو یہ ہے کہ یہ سب کچھ میری سمجھ میں نہیں آرہا۔ تمہارا کیا مطلب ہے کہ تم اپنے چہرے کی مرمت کرا کے تاجور کے پاس جاؤ گے تو وہ یہ سمجھتی رہے گی کہ تم کوئی اور ہو؟''

''نہیں، جو لوگ آپ کو بہت قریب سے جانتے ہیں تو وہ ضرور شک میں پڑ جاتے ہیں، یا کم از کم الجھن میں آجاتے ہیں لیکن جن سے آپ کی سرسری جان پہچان ہوتی ہے، وہ سو فیصد دھوکا کھا جاتے ہیں پھر اس میں یہ بات بھی ہوتی ہے کہ چہرے کی تبدیلی کس حد تک ہوئی ہے اور کتنی مہارت سے کی گئی ہے۔''

''کم از کم میں تو تمہیں اس بارے میں کوئی مشورہ نہیں دے سکتا۔ میں تو یہی کہوں گا کہ ڈیرے پر چلے جاؤ اور......''

''دیکھو، میں بھی ابھی یقین سے کچھ نہیں کہہ رہا۔ کرنل احرار سے ملنے اور مکمل مشورہ کرنے کے بعد ہی کوئی رائے قائم کی جاسکتی ہے۔''

''تو پھر منہ سر لپیٹ کر نکل جاؤ...... اور مل لو ڈاکٹر سے۔ لیکن تمہیں پتا ہے کہ وہ کہاں ہیں؟''

''ان کا فون نمبر ہے میرے پاس۔''

''تو کر لو فون۔''

''نہیں فون میں نہیں کروں گا فون تم کرو...... اور اپنے نمبر سے کرو۔''

صلاح مشورے کے بعد سجاول نے اپنے نمبر سے کال ملائی۔ کچھ دیر بیل جاتی رہی مگر رابطہ نہیں ہو سکا۔ شاید فون ''سائیلنٹ'' پر تھا یا ویسے ہی نامعلوم نمبر دیکھ کر کرنل صاحب نے کال ریسیو نہیں کی تھی۔ دو تین بار ٹرائی کرنے کے بعد ہم نے یہ کوشش وقتی طور پر ترک کر دی۔

میں نے سجاول سے پوچھا۔ ''انیق سے اور کیا بات ہوئی؟''

''باتیں تو بہت سی کر رہا تھا، اب یاد بھی نہیں رہیں۔ یہ بھی بتا رہا تھا کہ منگل کے روز ڈی سی کے دفتر کی طرف

لکڑی کا ایک تابوت ملا تھا اور بتایا گیا تھا کہ اس میں شاہ زیب کی میت ہے، یعنی وہی راکھ شاکھ۔ بعد میں اس تابوت کو مراد پور کے قبرستان میں ہی دفنا دیا گیا۔ تمہارے چاچے کے بیٹے ولید کو پیرول پر رہا کیا گیا تھا...... وہ بھی سیدھا مراد پور پہنچ گیا تھا...... اور ہاں تمہارا چاچا بھی تمہارے ''جنازے'' میں پہنچا تھا......''

''یعنی چچا حفیظ؟''

''ہاں، اس کو اخبار یا ٹی وی سے پتا چل گیا ہوگا۔ پر یہاں نکو شہزادوے نے ایک عقلمندی کی۔ وہ تمہارے چاچے کو قبرستان سے ہی لے کر غائب ہو گیا۔ اب تمہارا چاچا اس کے پاس ہی ہے۔''

''یہ تو واقعی عقلمندی کی ہے۔'' پریشانی کے شدید حملے کے بعد میں نے ذرا ریلیف محسوس کیا۔ تصور ہی تصور میں، میں نے وہ سارے مناظر دیکھے جن کا ذکر سجاول کر رہا تھا۔ بڑا عجیب محسوس ہوا۔ دل چاہا کہ میں یہ مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا۔ اپنی موجودگی میں اپنی غیر موجودگی کو دیکھنا اور اپنی زندگی میں اپنی ''موت'' کے اثرات اپنے پیاروں کے چہروں پر دیکھنا بڑا انوکھا تجربہ ہوتا ہوگا۔ مجھے یہ تجربہ کرنے کا کوئی شوق نہیں تھا مگر یہ ہو گیا تھا اور اب...... میرا دل چاہ رہا تھا کہ اس کو طول دے دیا جائے۔ ٹیکساری گینگ کی دہشت سے بچنے کا یہ ایک منفرد راستہ نکلا تھا۔

سجاول اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا...... اور اکتاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ ''اچھا اپنے کمرے میں چلتا ہوں، ذرا نیند آ رہی ہے۔''

میں نے زیرِلب مسکرا کر کہا۔ ''نیند آ رہی ہے...... کہ محبت آ رہی ہے۔''

''فی الحال تو نیند ہی آ رہی ہے۔'' وہ بدستور سنجیدہ رہا۔

''دن دہاڑے نیند کیوں آ رہی ہے؟'' میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''مسکرانا تو اسے آتا ہی نہیں تھا، اس کی سنجیدگی کا کم ہونا ہی مسکرانا ہوتا تھا۔ ذرا کم سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''نئی نئی وہٹی ہے، پریشان ہو رہی ہوگی۔''

''اچھا یہ اپنا موبائل مجھے دے جاؤ۔'' میں نے کہا۔

اس نے موبائل مجھے تھما دیا اور لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر نکل گیا۔

کچھ دیر بعد میں نے دوبارہ کرنل ڈاکٹر احرار کے نمبر پر کال کی۔ بیل جاتی رہی۔ دوسری بار کوشش کی تو فون اٹھالیا گیا۔ کرنل احرار کی بارعب آواز سنائی دی۔ ''ہیلو...... کون؟''

''کرنل احرار؟'' میں نے بدلی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''یس کرنل احرار اسپیکنگ...... آپ کون؟'' انگلش میں پوچھا گیا۔

''میں...... شاہ زیب کا دوست عباسی بول رہا ہوں، اکرام عباسی۔ مجھے شاہ زیب نے ہی آپ کا نمبر دیا تھا۔'' میں نے بھی انگلش میں کہا۔ کرنل احرار صرف ملائی اور انگلش ہی سمجھ سکتے تھے۔

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی، پھر بھرائی ہوئی آواز میں کہا گیا۔ ''اگر واقعی آپ ان کے دوست ہیں تو پھر یہ وقت آپ پر بھی بہت بھاری ہوگا۔ ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ یہ سب کچھ ہو چکا ہے۔'' پھر وہ جیسے ایک دم چونک کر بولے۔ ''میرا یہ نمبر آپ کو شاہ زیب نے دیا یا آپ کو ویسے ملا؟''

''شاہ زیب نے خود دیا۔ انہوں نے آپ کے لیے ایک اہم پیغام چھوڑا ہے جناب۔''

''کیسا پیغام؟'' کرنل احرار کی آواز بدستور بوجھل تھی۔

''یہ فون پر کرنے والی بات نہیں ہے جی۔ میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ آپ سے ملنا ضروری ہے۔''

دوسری طرف پھر خاموشی چھا گئی۔ آخر کرنل احرار کی آواز ابھری۔ ''میں کس طرح یقین کرلوں کہ تم واقعی شاہ زیب کے دوست ہو...... میرا مطلب ہے کہ شاہ زیب کے اردگرد کے حالات بہت خطرناک رہے ہیں اور یہ حالات اس کے جانے کے بعد بھی موجود ہیں۔'' کرنل کے لہجے کے نیچے دکھ ہلکورے لے رہا تھا۔

میں نے اپنی گفتگو جاری رکھی اور چند منٹ میں کافی حد تک ان کی تسلی کر دی۔ میں نے برونائی سے لاہور آتے ہوئے جہاز میں ہونے والی وہ ساری گفتگو بھی بیان کر دی جو میرے اور کرنل احرار کے درمیان ہوئی تھی۔ بالآخر کرنل نے دلیری کا ثبوت دیا اور مجھے اپنے ہوٹل اور کمرے کے نمبر سے آگاہ کر دیا۔

قریباً دو گھنٹے بعد میں کرنل احرار سے ملنے کے لیے تیار تھا۔ دو دن کی شدید گرمی کے بعد آندھی آئی تھی اور لاہور کے آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ کبھی تیز اور کبھی ہلکی بارش بھی ہو رہی تھی۔ شام معمول سے زیادہ تاریک نظر

آ رہی تھی۔ میرے ساتھ سجاول اور خورسنہ بھی جا رہے تھے۔ خورسنہ کو لے جانے کی وجہ یہ تھی کہ راستے میں چیکنگ وغیرہ سے بچا جا سکے۔ مزید احتیاط کے طور پر اپنا چہرہ چھپانے کے لیے میں نے زخموں پر لپیٹنے والی سفید پٹیاں منگوائی تھیں۔ خورسنہ نے یہ پٹیاں بڑے طریقے سے میرے چہرے پر لپیٹی تھیں۔ میری پیشانی، ایک آنکھ اور رخسار اس بینڈیج میں چھپ گئے تھے۔ لگتا تھا کہ پیشانی اور باقی چہرے پر گہری چوٹیں لگی ہیں۔

بارش کے پیشِ نظر ایک چھتری بھی ساتھ لے لی گئی تھی۔ ہم تینوں سجاول والی جیپ میں سوار ہوئے۔ سجاول اور خورسنہ آگے بیٹھے۔ میں اجرک کی بُکل مار کر پچھلی نشست میں دھنس گیا۔ بارش کی وجہ سے کوئی خاص پولیس ناکا بھی ہمارے راستے میں نہیں آیا۔

خورسنہ نے کہا۔ ''شاہ زیب صاحب، لگتا ہے کہ پولیس والے جان بوجھ کر آپ کے راستے سے ہٹ گئے ہیں۔''

''بھئی میں تو ''مردہ'' ہوں۔ مجھ سے کیا ڈریں گے۔ تمہارے شوہر نامدار سے خوف زدہ ہو گئے ہوں گے، خاصا دبنگ لگتا ہے۔''

وہ مسکرا کر بولی۔ ''یہ بات تو ٹھیک کہی۔ سجاول سے تو مجھے بھی ڈر آتا ہے۔ پتا نہیں کہ کس وقت کس بات پر جناب کا پارا چڑھ جائے۔''

''اب یہ تمہاری حکمتِ عملی ہے کہ شیر کو گیدڑ کیسے بنانا ہے۔'' میں نے یہ فقرہ انگلش میں کہا تھا اس لیے سجاول کی سمجھ میں نہیں آیا۔ ہاں خورسنہ مسکرانے لگی۔ سجاول نے کڑی نظروں سے مجھے گھورا۔ میں نے کہا۔ ''یار! تمہاری تعریف ہی کر رہا ہوں۔''

وہ سگریٹ سلگا کر ایک ہاتھ سے ڈرائیونگ کرتے ہوئے بولا۔ ''میں ایسی انگریزی تعریفوں پر لعنت بھیجتا ہوں۔ جو بھی قصیدہ پڑھنا ہو اپنی زبان میں پڑھا کرو۔''

''وہ سامنے ناکا ہے شاید۔'' خورسنہ نے تھکی آواز میں کہا۔

میں نشست پر تقریباً نیم دراز ہو گیا۔ بہرحال ہم بخیریت گزر گئے۔ پولیس تو آپ سے غائبانہ محبت فرما رہی ہے۔'' خورسنہ نے کہا۔

''مجھے پولیس سے زیادہ ڈر داؤد بھاؤ کے لوگوں کا ہے۔ وہ اس شہر کو ہزاروں آنکھوں کے ساتھ واچ کرتے رہتے ہیں۔''

انہی باتوں کے دوران میں ہم جل تھل سڑکوں سے گزرتے ہوئے شاہراہ قائداعظم کے مطلوبہ ہوٹل کی پارکنگ میں پہنچ گئے۔ کئی علاقے گہری تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے مگر ہوٹل کی چار دیواری میں جنریٹرز کی روشنی موجود تھی۔ پروگرام کے مطابق سجاول تو جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا رہا، میں اور خورسنہ چھتری لے کر باہر نکلے اور آہستہ رفتار سے چلتے ہوئے ہوٹل کی لابی میں پہنچ گئے۔ خورسنہ نے چھتری بند کر دی۔ وہ مجھے سہارا دیتے ہوئے لائی تھی۔ ظاہر یہی ہو رہا تھا کہ میں زخمی ہوں اور خورسنہ تیماردار کے طور پر میرے ساتھ ہے۔ میں نے صاف ستھری شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ جوتے بھی نئے اور چمکیلے تھے۔ قیمتی اجرک میرے شانوں پر تھی۔ ہم لفٹ کے ذریعے تیسری منزل پر پہنچے۔ خورسنہ مجھے کرنل احرار کے کمرے کے سامنے چھوڑ کر واپس چلی گئی۔ عروسی جوڑے میں وہ جگمگا رہی تھی اور دیکھنے والی نظر اس پر جم جاتی تھی۔

میں نے ڈوربیل پر انگلی رکھی۔ ٹائم ٹھیک سات بج کر چالیس منٹ تھا اور یہی وقت کرنل احرار سے میری ملاقات کا طے ہوا تھا۔

دروازہ خود کرنل احرار نے ہی کھولا۔ ''السلامُ علیکم'' میں بدلی ہوئی آواز میں بولا۔

میرے چہرے کی پٹیوں نے کرنل صاحب کو ذرا چونکایا۔ ''اکرام عباسی؟'' انہوں نے دریافت کیا۔

''جی۔'' میں نے کہا اور ان سے مصافحہ کرنے کے بعد اندر چلا گیا۔

کمرے میں زیادہ روشنی تھی۔ کرنل نے ذرا توجہ سے میری طرف دیکھا اور چونکتے ہوئے نظر آئے۔ وہ براہِ راست میری آنکھوں...... بلکہ اکلوتی آنکھ میں دیکھ رہے تھے۔ الجھن زدہ لہجے میں بولے۔ ''تم......زخمی ہو......؟''

''جی نہیں، خود کو چھپا رکھا ہے میں نے۔'' اس مرتبہ میں نے اپنی اصل آواز میں کہا تھا۔

وہ پھر بھی پہچان نہیں پائے۔ ہاں اُن کے چہرے پر الجھن کا تاثر کچھ اور گہرا ہو گیا۔ کچھ ڈرے ہوئے بھی لگے۔

میں نے کہا۔ ''میں شرمندہ ہوں کرنل کہ آپ کو سرپرائز دینے پر مجبور ہوا بلکہ ایک پریشان کن سرپرائز۔'' میں نے چہرے کی پٹی کھولنی شروع کی۔

اچانک کرنل احرار کی ہلکی براؤن آنکھوں میں حیرت کا دریا اُمڈ آیا۔ وہ سرتاپا لرز گئے......اور بے ساختہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئے۔ ''جی کرنل صاحب، یہ میں ہی ہوں شاہ

زیب، اس برستی رات میں چھپتا چھپاتا آپ کے پاس پہنچا ہوں۔''

''او مائی گاڈ......او مائی گاڈ۔'' وہ مسلسل کہتے جارہے تھے۔ اب ان کی آنکھوں میں خوف آمیز حیرت کے ساتھ ساتھ خوشی کی چمک بھی نمودار ہونے لگی تھی۔

انہوں نے جلدی سے دروازے کے بولٹ کی طرف دیکھا، وہ اندر سے بند تھا۔ کھڑکیوں کے پردے بھی برابر تھے۔ اس بات کا اندازہ میں پہلے ہی لگا چکا تھا کہ یہاں کوئی بغلی کمرا موجود نہیں اور نہ کسی تیسرے شخص کی موجودگی کا امکان ہے۔

میں نے باقی ماندہ پٹی کھینچ کر اپنی پیشانی سے اتار دی۔ وہ لرزاں آواز میں بولے۔ ''اپنی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہورہا۔ یہ واقعی بڑا سرپرائز ہے، دل بند کردینے والا سرپرائز۔''

وہ آگے بڑھے، ہم گلے لگ گئے۔

باہر بارش مسلسل جاری تھی۔ ہم آمنے سامنے صوفوں پر بیٹھ گئے۔ لگژری کمرے کو دیکھ کر ہی اندازہ ہوجاتا تھا کہ یہاں کچھ دیر پہلے تک ڈاکٹر صاحب کے دوست یا ہم پیشہ افراد موجود تھے۔ میڈیکل سے متعلق کچھ رسائل و جرائد شیشے کی خوب صورت میز پر بکھرے ہوئے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کو اور مجھے نارمل ہونے میں چار پانچ منٹ لگ گئے۔ ان کے لیے تو میں جیسے مر کر زندہ ہوا تھا۔ میں پہلے سے ارادہ کرکے آیا تھا کہ ڈاکٹر کرنل احرار سے موجودہ صورتِ حال کے بارے میں کچھ چھپاؤں گا نہیں۔ میرے اب تک کے تجزیے کے مطابق وہ ان لوگوں میں سے تھے جن پر ہر طرح کا بھروسا کیا جاسکتا ہے۔ ویسے وہ بھی جاماجی کے اَن گنت لوگوں کی طرح دلی طور پر میرے مداح تھے۔

میں نے چند باتیں چھوڑ کر سب کچھ ان کے گوش گزار کردیا۔ پرانی دشمنی کی بنا پر نیکساری گینگ کا میرے پیچھے یہاں پہنچنا۔ قسطینا کا جاماجی سے مجھے اطلاع دینا کہ کچھ نہایت خطرناک لوگ میری تلاش میں ہیں۔ یہاں لاہور میں میری اور گینگ کی مڈبھیڑ ہونا، لاہور میں بیس بے گناہ شہریوں کا اندوہناک قتل اور پھر ہاؤس نمبر اٹھارہ کا خونی دھاکا......

کرنل احرار حیرت میں گم سنتے رہے۔ کہیں کہیں انہوں نے مجھ سے سوال بھی کیے...... میری گفتگو کے اختتام تک پہنچتے پہنچتے وہ میرے حوالے سے کافی کچھ جان چکے تھے۔ شاید یہ بھی کہ اگر مجھے ''مارا'' جا چکا ہے تو میں ''مرے رہنا'' ہی پسند کروں گا۔

میں نے کہا۔ ''کرنل صاحب! اب تک میرے سوا بس دو بندوں کو پتا ہے کہ میں زندہ ہوں۔ آپ تیسرے ہیں۔ مجھے پوری امید ہے کہ آپ میری مصیبت کو سمجھتے ہیں اور میرے اس راز کی حفاظت فرمائیں گے۔''

کرنل احرار کی آنکھوں کے گوشوں میں نمی آگئی۔ انہوں نے صدقِ دل سے مجھے یقین دلایا کہ جب تک میں چاہوں گا یہ بھید ان کے سینے میں دفن رہے گا۔

آخر ہماری گفتگو اس موڑ پر آگئی جس کے لیے میں رسک لے کر یہاں کرنل احرار تک پہنچا تھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ اپنے جنونی دشمنوں کی خونخواری سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ میں ان کے لیے واقعی ''مر'' جاؤں اور ان کی نگاہوں سے اوجھل ہوجاؤں۔''

وہ میری بات سمجھ رہے تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو اپنے ہنر میں یکتائے روزگار ہوتے ہیں۔ بولے۔ ''کیا تم اپنے خدوخال میں تبدیلی چاہتے ہو؟''

''مجھے ان کی نظروں سے مستقل طور پر بچنے کا کوئی اور طریقہ نظر نہیں آتا۔''

انہوں نے میرے چہرے کو غور سے دیکھا اور گہری سانس لے کر بولے۔ لیکن یہ کوئی اتنا سہل نہیں ہے۔ اس میں ٹائم لگے گا اور دوسری بات یہ ہے کہ میں اپنے خاص ماحول اور اپنے کلینک میں ہی کام کرتا ہوں۔ کئی اہم ٹیسٹ بھی ضروری ہوتے ہیں۔''

''میں ہر چیز کے لیے تیار ہوں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''بس آپ کے ہنر اور آپ کی مہربان نظر کی ضرورت ہے۔ آپ اخراجات کا تخمینہ لگا کر بتادیں، میں انتظام کرلیتا ہوں۔''

انہوں نے گہری نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''شاہ زیب! تمہارے بہت احسان ہیں ہم پر۔ خرچ کا کوئی اتنا بڑا ایشو نہیں ہے لیکن اگر تمہیں میرے ساتھ واپس جاماجی جانا پڑا تو یہ تمہارے لیے مشکل ہوگا۔''

''ہاں کرنل، یہ تو مشکل ہوگا۔ وہ لوگ ہر جگہ ڈھونڈتے پھر رہے ہیں...... ابھی میری طرف سے پوری طرح مطمئن نہیں ہیں۔ میرے ساتھیوں کی تلاش بھی جاری ہے۔''

''تو پھر کچھ عرصہ یہیں روپوش رہو اور جاماجی آنے کے لیے انتظار کرلو۔''

''کرنل..... کیا یہیں پر کچھ نہیں ہو سکتا؟'' میں نے کرنل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے درخواست اور گزارش والا لہجہ اختیار کیا۔

مجھے یوں لگا کہ میرے لہجے نے کرنل احرار پر اثر کیا ہے۔ ان کی چوڑی پیشانی پر سوچ کی گہری لکیریں نمودار ہو گئیں۔

☆☆☆

تیسرے روز میں اور کرنل احرار بہت رازداری کے ساتھ کراچی پہنچ چکے تھے۔ یہاں کاسمیٹک اور پلاسٹک سرجری کا ایک بڑا اچھا یونٹ موجود تھا۔ وہاں ڈاکٹر احرار نے میرے کچھ ٹیسٹ کرائے اور پھر کاسمیٹک سرجری کا فیصلہ کیا۔

انہوں نے ایک موقع پر کہا۔ ''شاہ زیب! تین تین گھنٹے کے تقریباً تین دورانیے ہوں گے جن میں، میں اپنا کام مکمل کروں گا۔ اس کے بعد قریباً دو تین ہفتے تمہاری اسکن کو نارمل ہونے میں لگیں گے۔''

''کیا میرے جسم کے کسی حصے سے ٹشوز بھی لیے جائیں گے؟''

''نہیں شاہ زیب! ٹشوز لینے کو ہم آٹو گرافٹس کہتے ہیں۔ یہاں ہم دوسری تکنیک برت رہے ہیں۔ مصنوعی خلیوں کی کچھ پرتیں ہوتی ہیں جنہیں ہم خدوخال کی تبدیلی میں استعمال کرتے ہیں۔ ان میں ''سیلیکون اور کاربن، ہائیڈروجن'' کی آمیزش ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی کٹ لگائے بغیر چہرے کے کچھ حصوں سے چربی نکالی جاتی ہے، کچھ میں داخل کی جاتی ہے۔ چہرے کے کچھ رگ پٹھوں کو ٹریٹ کر کے گردن اور چہرے کی ساخت بدلی جاتی ہے۔''

''کرنل! اگر میں بعد میں اپنی نارمل صورت اختیار کرنا چاہوں؟''

''تو یہ بھی آسان ہے۔ بس چہرے کی اسکن کو نارمل ہونے میں کچھ وقت لگتا ہے اور بعض اوقات ''ٹریٹ منٹ'' بھی کرنا پڑتی ہے۔''

کرنل احرار نے بے حد توجہ اور دلجمعی کے ساتھ میری کاسمیٹک سرجری کی۔ ایک دو مرتبہ ''لوکل اینستھیزیا'' بھی دیا گیا۔ انجکشنز اور ''لیپوسکشن'' کے طریقے سے رخساروں، ناک اور ٹھوڑی کی ساخت بدلی گئی۔ میں اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ ہوتا دیکھ رہا تھا اور حیران تھا۔ کبھی کبھی سوچتا تھا کہ اسامہ اور صدر صدام جیسے لوگ اپنے جانی دشمنوں سے بچنے کے لیے چہرے میں اس طرح کی تبدیلیاں کیوں نہ کرا پائے۔ بڑا عجیب احساس تھا شکل بدلنے کا۔ میرے اندازے کے مطابق یہ تیس فیصد سے زیادہ تبدیلی تھی۔ میں آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر دیر تک چہرے پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ کاسمیٹک سرجری کے فوراً بعد ہی میں ایک رہائشی اپارٹمنٹ میں شفٹ ہو گیا۔

ڈاکٹر کرنل احرار نے مجھے چند نفسیاتی لیکچرز بھی دیے اور بتایا کہ شکل وشباہت میں تبدیلی آنے سے بندے کو اور اس کے اردگرد کے لوگوں کو کس طرح کے تناؤ اور الجھن کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ڈاکٹر احرار نے میرے سر اور داڑھی مونچھ کے بالوں کا رنگ بھی تبدیل کر دیا تھا۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ رنگ کی اس تبدیلی نے مجھے ایک نئی شباہت دینے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔

ایک دن میں نے کہا۔ ''کرنل! مجھے رخساروں اور ٹھوڑی کے نیچے بے حسی اور بھاری پن کا احساس ہوتا ہے۔''

وہ بولے۔ ''یہ کچھ دن رہے گا۔ میں اسے ہینڈل کرنے کے طریقے تمہیں بتاؤں گا۔''

ابھی تک کوئی سائڈ افیکٹ سامنے نہیں آیا تھا لیکن میں اس سلسلے میں پریشان تھا۔ کرنل احرار نے پیش بندی کے طور پر کچھ میڈیسنز بھی تجویز کر دیں۔

اس سارے عمل کے دوران میں ایک اور کام بھی ہو رہا تھا۔ میں وقاص احمد کے نئے نام سے اپنے کچھ شناختی کاغذات بھی بنوا رہا تھا۔ ''سب سے بڑا روپیا'' والا محاورہ یہاں بھی صادق آ رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ لاہور اور کراچی جیسے بڑے شہروں میں روپے کے زور سے سب کچھ ممکن ہے۔ آخر وہ دن آیا جب کرنل احرار مجھ سے رخصت ہوئے۔ انہوں نے بغیر کسی معاوضے کے اپنا نہایت قیمتی وقت مجھے دیا تھا۔ اب وہ جلد از جلد جاپان واپس پہنچنا چاہتے تھے۔ وقتِ رخصت انہوں نے گرم جوشی اور نم آنکھوں کے ساتھ مجھے گلے لگایا۔

چہرہ تو بڑی حد تک تبدیل ہو چکا تھا، اب میں اپنی چال ڈھال بدلنے کی کوشش بھی کرنے لگا۔ اس کے علاوہ آواز کی تبدیلی بھی ضروری تھی۔ میں نے فون کے وائس ریکارڈر میں بار بار آواز ریکارڈ کی اور اس کی خامیاں دور کیں۔

درحقیقت یہ سب کچھ بڑا دلچسپ اور سنسنی خیز تھا۔ ایک نئی شخصیت..... ایک نیا روپ۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ میں بالکل کوئی اور شخص لگ رہا تھا مگر تبدیلیاں بڑی موثر

تھیں۔ میرا چہرہ ڈاکٹر کرنل احرار کے ہنر کا منہ بولتا ثبوت بن گیا تھا۔ جدید سائنس کس طرح زندگیوں کو بدل رہی ہے، یہ مجھ پر پہلی بار آشکار ہورہا تھا۔ اس سارے عمل میں ڈاکٹر احرار کے اندازے کے مطابق قریباً آٹھ ہفتے لگ گئے۔

اس ساری کارروائی کے دوران میں تین چار بار میں اپنے نئے فون نمبر سے سجاول کے ساتھ رابطہ کرچکا تھا۔ سجاول نے وہی کیا تھا جو میں سوچ رہا تھا...... وہ قریباً دس روز تک خورسنہ کے ساتھ اسی ہوٹل میں رہا جہاں اس کا نکاح ہوا تھا پھر ایک روز اسے لے کر نہایت خاموشی سے لالہ موسیٰ کے قریب اپنے اسی یونس نامی دوست کے پاس چلا گیا تھا جس نے ایک دفعہ ''ہماری'' مدد بھی کی تھی۔ یہ ایک بالکل چھوٹی سی الگ تھلگ آبادی تھی۔ یونس کے دیہاتی پیٹرول پمپ سے قریباً دو کلومیٹر کے فاصلے پر ایک، سات آٹھ مرلے کا آرام دہ گھر تھا جہاں سجاول نہایت رازداری سے خورسنہ کے ساتھ رہ رہا تھا۔ میری معلومات کے مطابق چند روز تک خورسنہ کا بیٹا ذیشان بھی اپنے ماموں کے ساتھ خورسنہ کے پاس پہنچنے والا تھا۔

اگر دیکھا جائے تو سجاول کی زندگی میں خوشنما خورسنہ ایک انقلاب کی طرح آئی تھی۔ وہ تو عورت کو بس ایک استعمال کی چیز سمجھتا تھا۔ اب سرتاپا ایک عورت کی محبت میں جکڑا گیا تھا۔ وہ کوئی نمازی پرہیزگار تو نہیں بنا تھا مگر فی الحال ڈاکو بھی نہیں رہا تھا۔ اس نے اپنے ڈیرے پر فیض محمد کو اپنا مستقل قائم مقام بنایا تھا اور خود بالکل الگ تھلگ ہوگیا تھا۔ میرے اور یونس کے سوا اس کے کسی ساتھی کو بھنک تک نہیں تھی کہ وہ کہاں ہے؟ آئندہ کیا ہونا ہے اس کا فیصلہ سجاول سیالکوٹی نے غالباً وقت پر چھوڑ دیا تھا۔

محبت ایسے ہی زندگیوں کو بدلا کرتی ہے۔ میرے اپنے حالات بھی تو کچھ مختلف نہیں تھے۔ جب سے مجھے محسوس ہوا تھا کہ ہاؤس نمبر اٹھارہ والے حادثے نے میرے لیے زندگی کا ایک نیا راستہ کھولا ہے، تاجور کا خیال ہر وقت دل و دماغ میں بسا رہتا تھا۔ ویسے تو وہ پہلے بھی کبھی دل و دماغ سے نکلی نہیں تھی مگر اب کچھ اور طرح کی کیفیت تھی۔ دل میں ایک ترنگ سی جاگی ہوئی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے تک وہ مجھے کوئی بہت دور کی چیز نظر آتی تھی۔ جیسے آسمان پر چمکتا ہوا چاند جسے زمین کا باسی صرف دیکھ سکتا ہے مگر اب مجھے لگتا تھا کہ وہ چاند زمین پر آگیا ہے یا پھر میں بیکراں بلندیوں پر پرواز کر رہا ہوں اور شاید...... شاید ہم دونوں کا ملاپ ہوسکتا ہے۔

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں
گھر بیٹھے
رسائل حاصل کیجیے
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 800 روپے
امریکا کینیڈا آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 9,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 8,000 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کردیں گے۔
یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہوسکتا ہے
بیرونِ ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔
رابطہ: ثمر عباس (فون نمبر 0301-2454188)
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 021-35895313 فیکس 021-35802551

سجاول سے فون پر میری آخری گفتگو پانچ چھ روز پہلے ہوئی تھی۔ میں نے اسے ایک کام کا کہا تھا۔ اب کراچی چھوڑنے سے پہلے میں ایک بار سجاول سے بات کرنا اور اپنے کام کا پوچھنا چاہتا تھا۔ ناشتے کے بعد میں نے سجاول کو کال کی۔ اس کی بھاری بھرکم بھرائی ہوئی آواز کان میں گونجی۔ ''ہاں بھئی شاہی، صبح سویرے گھنٹی کھڑکھڑا دی؟''

''اچھا تو تمہارے لیے اب یہ صبح سویرے ہو گیا ہے۔ خدا کے بندے! ساڑھے دس بجنے والے ہیں۔ خلقِ خدا اپنے اپنے کاروبار میں لگی ہوئی ہے۔''

''کس میں لگی ہوئی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''کاروبار میں...... کاروبار میں۔'' میں جھلا کر بولا...... پھر ذرا توقف سے کہا۔ ''ویسے تو تم بھی کاروبار میں لگے ہو...... محبت کے کاروبار میں۔ اور یہ کاروبار عام طور پر نائٹ شفٹ میں ہوتا ہے۔ تمہارا سونا بنتا ہے بھئی...... بنتا ہے۔ ٹھیک ہے، میں شام کو فون کرلوں گا۔ خدا حافظ۔''

کھنکتی ہوئی نسوانی ہنسی کی مدھم آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی چوڑیوں کی جھنکار ابھری۔ پھر چند فٹ کے فاصلے سے فون پر خورسنہ کی آواز آئی۔ ''نہیں...... نہیں، شاہ زیب صاحب! آپ بات کریں۔ یہ اب پوری طرح جاگ گئے ہیں۔''

قدموں کی چاپ ابھری۔ وہ شاید بستر سے اٹھ کر کمرے سے نکل گئی تھی۔

میرا دل اب تیزی سے دھڑکنا شروع ہوا تھا۔

''میرے کام کا کیا بنا؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور ذرا مدھم آواز میں بولا۔ ''میں نے کل یونس کو سکھیرا بھیجا تھا۔ سن گن لی ہے اس نے۔''

''تاجور کا کچھ پتا چلا؟''

''ہاں، سنا ہے کہ وہ کچھ بیمار ہے۔ دو چار دن گجرات کے اسپتال میں بھی رہی ہے۔ لیکن اب گاؤں واپس آگئی ہے۔''

''...... کیا مسئلہ ہے؟''

''شاید ٹائیفائڈ وغیرہ ہے مگر اصل بخار تو تمہارے والا ہی ہوگا۔ تمہارے ''مرنے'' والی خبر اس کے لیے بڑی ڈھاڈی رہی ہوگی۔''

''اس کے امی ابا اور گھر والے؟''

''وہ تو سب ٹھیک ہیں...... ہاں سیف کی ماں کی حالت ٹھیک نہیں۔ وہ پتر کے لیے بڑی پریشان ہے۔ ماں، پیو دونوں ابھی تک سیف کی موت کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ تاجور اور اس کے گھر والوں نے ابھی تک انہیں کچھ نہیں بتایا۔''

''اچھا کیا ہے۔ ماں بے چاری دل کی مریضہ ہے۔ بے موت مر جائے گی۔ اس کے بارے میں، میں نے کچھ سوچ رکھا ہے۔''

''کیا سوچ رکھا ہے؟''

''سکھیرا پہنچ لوں، پھر بتاؤں گا۔''

''تم سکھیرا آرہے ہو؟''

''اب تو آنا بنتا ہی ہے یار! شاہ زیب تو ''مر مرا'' گیا۔ اب تو ایک نیا بندہ ہے۔ فی الحال اس سے کسی کی دشمنی ہے نہ وہ کسی کا دشمن ہے۔ سیدھا سادہ...... عام...... محنت کش...... اپنے کام سے کام رکھنے والا...... روزگار کی تلاش میں بھٹکتا ہوا سکھیرا پہنچے گا اور وہاں ٹکنے کی کوشش فرمائے گا۔''

چند لمحے خاموشی رہی پھر سجاول نے کہا۔ ''کیا واقعی تمہاری شکل اتنی بدل گئی ہے کہ تمہیں پہچانا نہ جاسکے؟''

''تجربہ کر کے دیکھیں گے مگر تمہاری شکاری نظر سے بچنا مشکل ہے اور......'' میں نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''اور کیا......؟''

''میرے خیال میں تو کوئی بھی ایسا شخص جو مجھے قریب سے جانتا ہو اور جس نے میرے ساتھ کچھ وقت گزارا ہو، مجھے دیکھ کر چکر میں تو ضرور پڑے گا۔ اس کے اندر کوئی نہ کوئی گھنٹی بجنا شروع ہو جائے گی۔ بہرحال دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔''

☆☆☆

میں اپنی نئی پہچان اور نئے شناختی کارڈ کے ساتھ کراچی سے لاہور پہنچ چکا تھا۔ میں نے بذریعہ ٹرین سفر کیا تھا اور اب براستہ سڑک مجھے لالہ موسیٰ کی طرف روانہ ہونا تھا۔ میرا حلیہ ایک نیم دیہاتی شخص والا تھا۔ سستی سی شلوار قمیص، سر پر ڈبی دار پرنا یعنی بڑا رومال۔ پاؤں میں پشاوری ٹائپ چپل۔ گلے میں تعویذ اور چھوٹی چھوٹی ہموار داڑھی پر گھنی مونچھیں۔ میرا شوٹ کا ایک سستا سا تھیلا میرے کندھے پر تھا جس میں میری ضرورت کی چیزیں موجود تھیں۔ اس تھیلے کے دو پیندے تھے جن کے درمیان میں نے نقدی بھی بھری ہوئی تھی۔ لاہور پہنچتے ہی بہت سے سنسنی خیز مناظر ذہن میں تازہ ہو گئے۔ شیطان زادوں سے وہ گھمسان کا رن جو لاہور میں ہی پڑا تھا، اور پھر اس سے بھی

پہلے کے واقعات جب میں قسطینا اور ابراہیم وغیرہ کے ساتھ جاماجی میں تھا۔ وہ سارا جنگ وجدل جاگتی آنکھوں کا خواب لگتا تھا۔ ان لوگوں سے میرا رابطہ اب بالکل منقطع تھا۔

لاہور اسٹیشن سے باہر نکل کر میں اس دو منزلہ ہوٹل کے سامنے سے گزرا جہاں میں نے اور سجاول نے چند سنسنی خیز دن گزارے تھے اور جہاں منیجر شہریار کی مہربانی سے سجاول کا نکاح بھی ہوا تھا۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا ورنہ میں ہوٹل کے اندر جا کر اور ملازمین کا سامنا کر کے یہ جاننے کی کوشش کرتا کہ مجھے پہچانا جاتا ہے یا نہیں۔ بہرحال آدھ پون گھنٹے بعد مجھے اس تجربے کا ایک موقع مل بھی گیا۔

یتیم خانہ چوک جانے کے لیے میں ایک وین میں سوار تھا۔ وین میں لوگ بھیڑ بکریوں کی طرح ٹھسے ہوئے تھے بلکہ باہر کے ملکوں میں بھیڑ بکریوں کو بھی اس سے کہیں زیادہ سہولت کے ساتھ لے جایا جاتا ہے۔ شروع شروع میں جب میں نے ڈنمارک سے یہاں لینڈ کیا تھا تو اس طرح کے مناظر دیکھ کر سخت تعجب ہوتا تھا لیکن اب یہ سب کچھ روٹین میں آچکا تھا۔ میں خود کو اس ماحول کا حصہ ہی محسوس کرتا تھا اور میری بول چال اور اٹھنے بیٹھنے میں بھی مقامی رنگ پختہ ہو گیا تھا۔ پنجابی کے کئی ٹھیٹ لفظ بھی اب میں روانی سے بولنے لگا تھا۔ میں گئے دنوں میں انیق کے ساتھ باقاعدہ پنجابی اور ''پنجابی لہجے کی اردو'' بولنے کی پریکٹس کرتا رہا تھا۔ اس زبان کی نسبت تاجور سے تھی۔ یہ مجھے کیوں پیاری نہ ہوتی۔

اچانک زور سے بریک لگے...... وین لہرائی اور ایک شاندار مرسڈیز کار کو چھیلتی ہوئی نکل گئی۔

مرسڈیز اور وین دونوں رک گئیں۔ وین کا ہانپا کانپا ڈرائیور بھی اپنی سواریوں سمیت باہر نکل آیا۔ مرسڈیز میں سے پہلے ڈرائیور نکلا، پھر لمبا تڑنگا مالک بھی نکل آیا۔ مالک کو دیکھ کر میں چونک گیا۔ یہ وہی پاشا تھا جس نے سیاست زادے شکیل داراب کے لیے بھی دلال کا کردار ادا کیا تھا۔ اس نے اپنی ''ٹیچر بیوی'' ناہید کو نوعمر شکیل داراب کی خواہشات کے ''احترام'' میں طلاق دے کر اس کے حوالے کر دیا تھا۔ بدلے میں پاشا کو من پسند رنگین زندگی ملی تھی۔

پاشا غصے میں تپا ہوا تھا۔ پہلے تو اس نے وین ڈرائیور کو مار مار کر لہولہان کر دیا پھر جب ایک ٹریفک کانسٹیبل نے نشاندہی کی کہ اس ایکسیڈنٹ میں زیادہ غلطی خود پاشا کی ہے تو پاشا کا پارا ساتویں آسمان کو چھو گیا۔ اس نے غریب کانسٹیبل کی وردی پھاڑ کر اسے نیم عریاں کر دیا اور اسی کی بیلٹ سے اسے روئی کی طرح دھنکنے لگا۔ اس کا ڈرائیور بھی بڑھ چڑھ کر اس کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ یہ تو ایک ٹریفک کانسٹیبل تھا شاید ٹریفک سارجنٹ بھی ہوتا تو اس کا یہی حشر ہوتا۔ پاشا کوئی عام شہری نہیں تھا وہ شکیل داراب جیسے ''بادشاہ گر'' کے ''پے رول'' پر تھا۔

میں آگے بڑھا۔ میرے ساتھ دو تین اور جوشیلے نوجوان بھی سامنے آئے اور ہاتھ وغیرہ جوڑ کر نیم بے ہوش کانسٹیبل کو پاشا کے نرغے سے نکالا۔ اسی دوران میں میری نگاہ مرسڈیز کے نیچے چلی گئی۔ کوئی چمک دار چیز پڑی تھی۔ یہ پاشا کی نہایت قیمتی رسٹ واچ تھی۔ میں نے جھک کر یہ واچ اٹھالی۔ سب پاشا اور کانسٹیبل کی طرف متوجہ تھے یا اس نوجوان وین ڈرائیور کو دیکھ رہے تھے جو پاشا کے حکم پر سڑک کے کنارے مرغا بنا ہوا تھا۔ میں نے گھڑی جیب میں رکھ لی۔

ایک رعب دار سارجنٹ بھی موٹر سائیکل پر سوار موقع پر پہنچ گیا۔ حسب توقع اس نے پاشا کو سیلوٹ کے انداز میں سلام کیا۔ سارجنٹ کے آنے سے کم از کم اتنا ہوا کہ وین ڈرائیور اور کانسٹیبل کی گلوخلاصی ہو گئی اور ان کی معافی تلافی قبول کر لی گئی۔ ہنگامہ دیکھ کر کسی چینل کا نمائندہ اور دو اخباری رپورٹر بھی موقع پر پہنچ گئے تھے۔ پاشا کی گاڑی کا نقصان تو کافی ہوا تھا لیکن اس نے کون سا اپنی جیب سے پورا کرنا تھا۔

اس سارے ہنگامے میں پاشا کی نظر کئی بار مجھ پر پڑی تھی۔ میں نے اسے مخاطب کر کے منت سماجت کے دو چار فقرے بھی بولے تھے۔ بہرحال وہ مجھے پہچاننے میں قطعی ناکام رہا تھا۔ یہ حوصلہ افزا شروعات تھی۔ جب چند منٹ بعد پاشا اپنی لگژری کار میں بیٹھ کر فاتحانہ انداز میں موقع سے روانہ ہونے لگا تو میں ادب سے گاڑی کی کھڑکی پر جھکا۔ پاشا نے دو سیکنڈ تذبذب میں رہنے کے بعد کھڑکی کا شیشہ نیچے سلائڈ کیا اور سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

''یہ آپ کی امانت ہے جی۔ گاڑی کے نیچے پڑی تھی۔''

میں نے طلائی کام والی سنہری گھڑی اس کے سامنے کر دی۔

پاشا کی آنکھوں میں چمک ابھری۔ کثرتِ شراب نوشی اور شبانہ روز عیاشیوں نے اس کے چہرے پر چربی کی تہ چڑھا دی تھی اور اس کے تاثرات چربی کے اندر ہی نہیں

گم ہو جاتے تھے، پھر بھی ایک اندازہ سا ہوا کہ وہ ہزاروں ڈالر کی شے واپس ملنے پر خوش ہوا ہے۔

اس نے گھڑی میرے ہاتھ سے لے لی اور ہزار روپے کا ایک نیلا نوٹ میری طرف بڑھا کر روانہ ہو گیا۔

رپورٹرز نے مجھے گھیر لیا۔ حسبِ عادت سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ ''کیا نام ہے تمہارا؟ کہاں سے آئے ہو؟''

وقاص نام ہے۔ گجرات کا رہنے والا ہوں۔ روٹی روزی ڈھونڈ رہا ہوں۔'' میں نے ایک عام شخص کے لب و لہجے میں کہا۔

''تمہیں پتا ہے، یہ کتنی قیمتی گھڑی تھی؟''

''جی زیادہ پتا تو نہیں...... لیکن سونا اور نگینے تو نظر آ ہی رہے تھے۔''

''کیا تمہارے دل میں نہیں آیا کہ اسے جیب میں ہی رکھو۔ یہاں کس کو پتا چلنا تھا؟'' ایک اخباری رپورٹر نے میری تصویر بنواتے ہوئے کہا۔

''اللہ کو جان دینی ہے جی۔ دنیا کا مال تو دنیا میں ہی پڑا رہ جاتا ہے۔''

اس طرح کی دو چار باتیں مزید ہوئیں۔ پھر دو اور ٹریفک سارجنٹ موقع پر پہنچ گئے اور ٹریفک بحال کرنے کے لیے لوگوں پر گرجنے برسنے لگے۔ مجمع منتشر ہو گیا۔ میں بھی چوک کراس کر کے دوسری طرف آ گیا اور اس بار ایک آٹو رکشا پر سوار ہو کر بس اڈے کی طرف روانہ ہوا۔ گرم ہوا لگنے کے سبب رخساروں پر ہلکی سی اکڑن پیدا ہو رہی تھی۔ کرنل احرار کی ہدایت کے مطابق میں انگلیوں سے ہولے ہولے رخساروں کو سہلانے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں ریلیف محسوس ہوا۔ پاشا مجھے پہچان نہیں پایا تھا اور یہ بات بڑی حوصلہ افزا تھی، خصوصاً اس تناظر میں کہ پاشا سے بات کرتے ہوئے میں اپنی آواز تبدیل کرنا یکسر بھول گیا تھا۔ میں نے تہیہ کیا کہ اب یہ ''بھول'' دہراؤں گا نہیں۔

میں نے بس سے بذریعہ جی ٹی روڈ سفر کیا اور ایک چلچلاتی ہوئی گرم سہ پہر میں اس موڑ پر پہنچ گیا جہاں سے مجھے کھٹارا دیہاتی بس یا وین میں سکھیرا گاؤں کی طرف جانا تھا۔ موسم کیسا بھی ہو، دل میں امنگ ترنگ ہو تو ہر منظر بھلا لگتا ہے۔ خستہ حال سڑک پر وین ہچکولے کھاتی ہوئی جا رہی تھی مگر اردگرد کی ہر شے سہانی تھی۔ سونا رنگے کھیت جن میں کہیں کہیں ہرے زمرد کے ٹکڑے جڑے تھے۔ آبی گزرگاہوں میں چمکتی ہوئی چاندی اور درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں سے دور دھوپ میں محنت کے موتی چمکاتے جفاکش کسان۔

اگست کی طویل سہ پہر اپنے تمام تر سحر کے ساتھ نشیب و فراز کو اپنے حصار میں لیے ہوئے تھی۔ گرم لیکن شفاف ہوا سنسناتی دھوپ میں بڑے ہموار انداز میں بہہ رہی تھی۔ ہاں دل کا موسم اچھا ہو تو سب اچھا لگتا ہے۔ ایک وقت تھا جب میں تاجور کو موٹر سائیکل پر بٹھا کر بڑے دکھی انداز میں ان کھیت کھلیانوں سے گزرا تھا۔ وہ جدائی کا موسم تھا، مگر اب آس کا موسم تھا۔ کچھ نئی امیدیں تھیں دل میں...... ایک نئی زندگی آواز دیتی محسوس ہوتی تھی۔

سجاول جس جگہ رہائش پذیر تھا، وہ راستے میں ہی پڑتی تھی مگر وہاں یونس بھی موجود تھا۔ میں سجاول سے اور خورسنہ سے ملے بغیر آگے بڑھ گیا۔ رات میں نے ایک کاشت کار کے ڈیرے پر گزاری اور صبح وہی پراٹھے کا ناشتا کر کے اور تانگے پر سوار ہو کر سکھیرا کی طرف روانہ ہو گیا۔ سکھیرا جہاں میری زندگی سانس لیتی تھی۔ جہاں اُس کے قدم پڑتے تھے اور جہاں اس کا آنچل لہراتا تھا۔

میں ایک پردیسی کے طور پر گاؤں میں اترا۔ دوپہر ہونے والی تھی۔ سائے اچھے لگنے لگے تھے۔ مویشی اور پرندے ہانپنا شروع ہو گئے تھے۔ پروگرام کے مطابق میں سیدھا سیف کے والد چوہدری بشیر کے ڈیرے پر ہی گیا۔ بوڑھ کی گھنی چھاؤں کے نیچے چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں اور چوہدری بشیر نڈھال سا گول تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ حقے کی نال اس کے منہ میں تھی۔ ایک ملازم اس کا سر دبا رہا تھا۔

''السلام علیکم چوہدری جی۔'' میں نے بدلی آواز میں کہا اور ہاتھ ماتھے پر لے جا کر سلام کیا۔

''ہاں بھئی۔ وعلیکم سلام۔ کیا بات ہے؟'' چوہدری بشیر تھکی تھکی آواز میں بولا۔

''کوئی کام شام مل جائے گا جی؟''

چوہدری بشیر نے مجھے سرتاپا گھورا۔ ''کیا کرتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''ایف اے پاس ہوں جی۔ حساب کتاب کر لیتا ہوں۔ ویسے ہر کام کر سکتا ہوں۔''

''نہیں بھئی منشی کی لوڑ تو نہیں ہے ہمیں...... اور کیا کر لیتے ہو؟''

''ٹریکٹر کو بڑی اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ چلاتا بھی رہا ہوں۔''

''نہیں ٹریکٹر والا تو ہے۔'' چوہدری بشیر نے کہا۔ پھر

ذرا توقف سے بولا۔ ''عام گڈی بھی چلا لیتے ہو؟''

''ہاں جی۔'' میں نے شدومد سے سر ہلایا۔

''دو گڈیاں ہیں ہمارے پاس، ایک کار ہے ایک چھوٹا لوڈر...... لوڈر پر صبح سویرے سبزی یا پھل منڈی تک لے جانا ہوتا ہے۔ گڈیوں کی ڈرائیوری کر لو گے؟''

''کیوں نہیں جی۔ لائسنس بھی ہے میرے پاس۔

(وقاص کے نام کے ڈرائیونگ اور اسلحہ لائسنس اور کارڈ وغیرہ میں کراچی سے بنوا کر نکلا تھا۔ بے شک روپے کے زور پر ہر کام ممکن ہو جاتا ہے)

چوہدری بشیر نے اپنے ٹریکٹر ڈرائیور کو آواز دی۔ ''حاکم علی ذرا گڈی پر ٹرائی تو لے اِس کی۔''

میں ادھیڑ عمر حاکم علی کے ساتھ ٹیوب ویل کی طرف آ گیا۔ یہاں مہران کار کھڑی تھی۔ کار دیکھ کر سیف کا چہرہ نگاہوں میں گھوم گیا۔ ہاں، یہی مہران کار تھی جس پر وہ سکھیرا گاؤں سے میرا پیچھا کرتا ہوا یہ جا پہنچا تھا۔ وہ میرے فن کا پرستار تھا اور یہ پرستاری اسے موت کے منہ میں لے گئی تھی۔

میں نے تین چار منٹ مہران کار اور دو تین منٹ چھوٹا لوڈر چلایا اور حاکم علی کو مطمئن کر دیا۔ واپسی پر چوہدری بشیر سے بات چیت ہوئی۔ معمولی تنخواہ مل رہی تھی، میں اس پر بھی راضی تھا لیکن اصل مسئلہ ضمانتی وغیرہ کا تھا۔ شناختی کارڈ میرے پاس موجود تھا مگر اس پر گجرات کی تحصیل کا پتا درج تھا۔ چوہدری بشیر کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ میں گجرات چھوڑ کر یہاں نوکری کیوں ڈھونڈ رہا ہوں۔ میں نے اسے بھائیوں کی گھریلو ناچاقی کا بتا کر مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ اس دوران میں میری ایک غیر متوقع مدد بھی ہو گئی۔

چوہدری بشیر کے منشی ماسٹر منظور نے عینک کے اوپر سے مجھے بڑے غور سے دیکھا اور بولا۔ ''تمہارا پورا نام وقاص احمد ہے ناں؟'' میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ ہاتھ میں پکڑے اخبار کو دیکھ کر بولا۔ ''کل تم لاہور میں تھے؟''

''آہو جی۔'' میں نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی اگلی بات میری سمجھ میں آ گئی۔ منشی منظور احمد نے اخبار کا رخ چوہدری بشیر کی طرف کیا اور دھیمی آواز میں کچھ کہا۔ چوہدری بشیر نے اخبار دیکھا، پھر میری طرف دیکھا...... پھر اخبار کی طرف دیکھا۔

ماسٹر منظور بولا۔ ''تمہیں پتا ہے تمہاری تصویر چھپی ہے اخبار میں؟''

''میری تصویر؟'' میں نے انجان بن کر حیرت کا اظہار کیا۔

ماسٹر منظور نے اخبار میری طرف بڑھا دیا۔ پچھلے صفحے پر یہ وہی کل والے واقعے کی خبر تھی۔ میری تصویر کے ساتھ قیمتی گھڑی کا ذکر بھی تھا اور لہولہان وین ڈرائیور کا تذکرہ بھی۔ یہ سب کچھ تائیدِ غیبی کی طرح تھا۔ مجھے لگا کہ میری ملازمت کا مسئلہ آسانی سے حل ہو گیا ہے۔ اگلے بیس تیس منٹ میں یہ بات ثابت ہو گئی۔ تنخواہ تو وہی رہی تھی لیکن مجھے عزت کے ساتھ دو ماہ کے لیے ملازم رکھ لیا گیا۔ اچھی کارکردگی پر میری نوکری پکی ہو سکتی تھی۔ اخبار والی خبر نے ڈیرے پر موجود سارے افراد کو متاثر کیا۔ میں نے چوہدری بشیر اور ماسٹر منظور وغیرہ کو اس واقعے کی تفصیل بھی بتائی۔ حالات کی کڑیاں ایسے ہی ایک دوسرے سے جڑتی ہیں اور کئی دفعہ اتفاقاً کوئی کڑی بڑی مفید ثابت ہو جاتی ہے۔

چوہدری بشیر سے میری پچھلی ملاقات بڑی مختصر سی رہی تھی اور اس کو کافی دن بھی گزر چکے تھے، پھر بھی یہ بات اہم تھی کہ وہ مجھے پہچاننے میں قطعی ناکام رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ سیف کی ماں اور اس کی بہنیں وغیرہ بھی مجھے پہچان نہیں پائیں گی۔

اچانک میری ساری حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آ گئیں۔ یوں لگا کہ میں پتھرا گیا ہوں اور بس میری آنکھوں میں زندگی موجود ہے۔ میں نے تاجور کو دیکھا۔ وہ پچاس ساٹھ قدم کی دوری پر ایک تانگے میں بیٹھی تھی اور تانگا گاؤں میں داخل ہو رہا تھا۔ تانگے کی پچھلی نشست پر تاجور کے ساتھ اس کی والدہ اور شاید ملازمہ تھی۔ تاجور کا رنگ بالکل زرد تھا اور وہ بہت کمزور بھی ہو چکی تھی۔ رنگ دار تانگا بڑا سجا سجایا تھا۔

تانگا تھوڑا آگے گیا تو اس کا ایک پہیا کھڈے میں پھنس گیا۔ گھوڑا زور لگانے لگا۔ ہچکولے لگے تو سواریاں نیچے اتر آئیں۔ اگلی نشست سے کوچوان کے علاوہ چوہدری دین محمد بھی اترے۔ تاجور کا جسم خزاں رسیدہ پتے کی طرح تھا۔ ملازمہ نے اسے سہارا دے رکھا تھا۔ پہیا بری طرح پھنسا ہوا تھا۔ نکلنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ گھوڑا اور کوچوان دونوں زور لگا رہے تھے۔

چوہدری بشیر بڑبڑائے۔ ''ایک تو یہ سڑک بنانے والے راستہ کھودتے ہیں اور پھر اپنی بے بے کی گود میں

جا کر سو جاتے ہیں۔''

ماسٹر منظور نے کارندوں سے کہا۔ ''اوئے جاؤ، ذرا دھکا لگاؤ تانگے کو۔''

کارندے ہنستے ہوئے تانگے کی طرف لپک گئے۔

ماسٹر منظور نے چوہدری بشیر سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''دین محمد صاحب کی دھی زیادہ ہی بیمار لگتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب بھی کسی ڈاکٹر حکیم کو دکھا کر آرہے ہیں۔''

چوہدری بشیر نے آہ بھری۔ ''ان دنوں تو وچاری کا ویاہ بھی ہو جانا تھا۔ پتا نہیں اللہ کو کیا منظور ہے۔ کچھ پتا ہی نہیں لگ رہا سیفی کا۔''

''دھی رانی کی بیماری کی وجہ بھی یہی لگتی ہے۔'' ماسٹر منظور نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

''یہ بالڑیاں تو بس پھولوں کی طرح ہوتی ہیں۔ ذرا تتی ہوا لگے تو مرجھا جاتی ہیں۔''

چوہدری بشیر تتی ہوا یعنی گرم ہوا کا ذکر کر رہا تھا لیکن اسے اس ہوا کی اصل گرمی کا اندازہ نہیں تھا۔ وہ مجھے ''کھو'' چکی تھی ہمیشہ کے لیے۔ اس کی دانست میں، میں مراد پور کے ایک قبرستان میں مٹی کے ڈھیر کے نیچے سو رہا تھا اور اس کی اس حالت کی وجہ یہی تھی۔

تانگا کھڈے میں سے نکل آیا۔ سواریاں دوبارہ سوار ہو گئیں۔ اس کی اوڑھنی چہرے کی طرف ڈھلکی ہوئی تھی۔ ایک گھونگھٹ سا بنا ہوا تھا۔ میں اسے پوری طرح نہ دیکھ سکا۔

چوہدری بشیر کا ڈیرا اور بھینسوں کا واڑا گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میرا بسیرا ڈیرے پر ہی تھا۔ یہاں ٹریکٹر ڈرائیور حاکم علی، چوکیدار وارث اور بھینسوں بکریوں کے رکھوالے ہاشم کے علاوہ تین چار کھیت مزدور بھی رہائش رکھتے تھے۔ ہاشم عرف ہاشو کی بیوی اور ایک مطلقہ بہن انوری بھی ڈیرے پر ہی ہوتی تھیں اور ڈیرے پر ہانڈی روٹی بھی کرتی تھیں۔ اس کام کا انہیں علیحدہ سے معاوضہ ملتا تھا۔

چار پانچ دن کے اندر ہی میں نے اپنے کام کو اچھی طرح سمجھ لیا اور ہاشو سے میری اچھی بے تکلفی بھی ہو گئی۔ ان چار پانچ دنوں میں مجھے دو دفعہ چھوٹے لوڈر پر سبزی لے کر قریبی قصبے کی منڈی تک جانا پڑا۔ یہاں چند بڑے ٹرک اور لوڈر موجود تھے جو سبزی اور پھل وغیرہ لے کر جی ٹی روڈ کے شہروں کی طرف جاتے تھے۔ میرا کام سمجھانے کے لیے ہاشو بھی دونوں دفعہ میرے ساتھ ہی گیا۔ ہاشو کی طلاق یافتہ بہن انوری دایہ کا کام بھی کرتی تھی۔ سکھیرا گاؤں کے اکثر گھروں میں اس کا آنا جانا تھا اور اس کے پاس بہت سی ''معلومات'' جمع رہتی تھیں۔ انوری سے یہ معلومات ہاشو کی بیوی اور ہاشو تک بھی پہنچتی تھیں۔

ایک روز میں اور ہاشو لوڈر سے سبزی اتار کر اور کھاد وغیرہ لے کر واپس سکھیرا آرہے تھے۔ ہماری گفتگو بھی جاری تھی۔ میں نے ہاشو کو کریدتے ہوئے پوچھا۔ ''چوہدری صاحب کے بیٹے کا کیا چکر ہے۔ سنا ہے کہ وہ اسے ڈھونڈنے بہاولپور بھی گئے ہوئے تھے؟''

''ڈھونڈنے کیا گئے تھے بس خجل خراب ہونے گئے تھے۔ بڑا منع بھی کیا تھا سب نے لیکن آخر باپ ہے۔''

''کیا بیٹا ناراض ہو گیا تھا؟''

''کہتے تو سب یہی ہیں۔ کام شام نہیں کرتا تھا۔ کبڈی کھیلتا تھا۔ پیو کسی وقت ڈانٹ بھی دیتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ کسی ایسی ہی ڈانٹ کے بعد نکل گیا ہو۔ کچھ عرصہ پہلے اس کا کوئی دوست آیا تھا۔ اس کے گھر والوں سے ملا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ سیف بہاولپور میں ہے، وہاں کسی یار دوست کے ساتھ مل کر اس نے درختوں کی کٹائی کا ٹھیکا لیا ہوا ہے۔ جیسے ہی فارغ ہو جائے گا، آجائے گا۔ پر وہ نہیں آیا۔ ماں رو رو کر مرنے والی ہو چکی ہے۔ پچھلے مہینے چوہدری بشیر صاحب اپنے ایک بھانجے کے ساتھ اسے ڈھونڈنے کے لیے بہاولپور گئے تھے۔ تھک ہار کر چھ سات دن پہلے واپس آئے ہیں۔''

''کیا کوئی اتنی ہی بڑی ناراضگی تھی؟''

''اللہ جانے...... ویسے کچھ لوگ ایک اور بات بھی کہتے ہیں۔ سچی ہے یا جھوٹی اس کا کچھ پتا نہیں۔'' ہاشو نے ذرا توقف کر کے سر پر بندھے ہوئے رومال سے اپنا پسینا پونچھا اور بولا۔ ''یہ بات بھی اڑی ہوئی ہے کہ کچھ عرصہ پہلے یہاں سکھیرا گاؤں میں ایک جوان آیا تھا۔ پتا نہیں کون تھا؟ کس لیے آیا تھا؟ یہاں باغ کے پچھواڑے ایک احاطے میں پنڈ کے تین چار اتھرے منڈوں سے اس کی لڑائی ہو گئی۔ ان میں اپنے چوہدری صاحب کا پتر سیف بھی تھا۔ اس جوان نے پنڈ کے ان سارے اتھرے منڈوں کو اکیلے ہی دن میں تارے دکھا دیے۔ سیف خود بھی لڑائی مار کٹائی میں بڑا تیز تھا، وہ تو اس جوان کا ''مرید'' بن گیا۔ بعد میں وہ اس کے پیچھے ہی، گڈی لے کر پنڈ سے نکل گیا اور پھر واپس نہیں آیا۔''

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''تم کیا سمجھتے

ہو کہ یہ بات صحیح ہے؟''

''میں نے کہا ہے نا کہ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں...... نہ ہی اس بات کا کوئی ثبوت ہے کہ پیو پُتر یعنی چوہدری بشیر اور سیف میں کوئی وڈا جھگڑا ہوا تھا۔''

''پر یار! اگر کوئی بات نکلتی ہے تو اس کی وجہ تو ہوتی ہے ناں؟''

ہاشو ونڈ اسکرین کی دوسری جانب سڑک پر نظریں جمائے ہوئے بولا۔ ''پنڈ کے منڈوں سے اس جوان کی لڑائی تو واقعی ہوئی تھی اور اس کے وہی منڈے گواہ بھی ہیں، مگر باقی کی بات صرف ایک منڈے کو معلوم ہو سکتی تھی۔ اس کا نام صدیق ہے۔ وہ سیف کا لنگوٹیا یار سمجھا جاتا ہے...... پر اب پچھلے دو ڈھائی مہینے سے وہ بھی غائب ہے۔''

میں نے لوڈر کو ایک گڑھے سے بچاتے ہوئے کہا۔ ''اس کا مطلب یہ ہے کہ چوہدری بشیر صاحب کے پُتر اور دین محمد صاحب کی بیٹی کی شادی اب کھٹائی میں پڑ گئی ہے؟''

''ہاں، یہ تو کھٹائی میں ہی ہے...... بلکہ...... اب تو سیفی مل بھی گیا تو یہ شادی شاید نہیں ہو سکے گی۔''

''کیا مطلب ہاشو بھائی؟'' میں نے کہا۔

''چوہدری دین محمد صاحب اب بڑی اُچی ہواؤں میں چلے گئے ہوئے ہیں۔ بڑے وڈے لوگوں سے ان کا تعلق بن رہا ہے...... بلکہ...... بن ہی گیا ہے۔ کئی مہینے اسلام آباد رہ کر بھی آئے ہیں۔ اب یہ بھی ان کی مہربانی ہے کہ سکھیرا تک پکی سڑک بن رہی ہے۔''

''کیا مطلب؟ یہ سڑک دین محمد صاحب بنوا رہے ہیں؟''

''نہیں بھئی! وہ وڈے لوگ بنوا رہے ہیں جن سے دین محمد صاحب کی فیملی کا تعلق بنا ہے۔'' ہاشو نے رازداری کے انداز میں کہا۔

''کوئی سیٹھ خاندان ہے؟ یا کوئی وڈا افسر وغیرہ؟''

''اوئے جن جی، اس سے بھی بہت زیادہ اُچے لوگ ہیں۔ لاہور کے دارابیوں کا نام سنا ہے تم نے؟ عطاء اللہ داراب، شکیل داراب وغیرہ؟''

''ہاں، ہاں، کچھ تو سنا ہوا ہے، حکومت کے لوگ ہیں۔''

''حکومت کے نہیں ہیں لیکن حکومتیں ان لوگوں کی وجہ سے چلتی ہیں۔ سمجھو کہ یہ ان لوگوں میں سے ہیں جو پردے کے پیچھے رہ کر حکومتیں چلاتے ہیں اور گراتے ہیں...... ایویں...... چغلی والی بات ہو جاتی ہے مگر...... یہ بات تو اب قریباً سب کو پتا لگ چکی ہے کہ دارابیوں کی یہ وڈی وڈی کالی گڈیاں اور جیپیں چوہدری دین محمد کے گھر کیوں آتی ہیں۔''

''کیوں آتی ہیں؟''

''اوئے تو بڑا کھوچل ہے وقاصے! ساری باتیں پوچھتا چلا جا رہا ہے۔ وہ بھی مفتے میں۔''

میں نے ڈبی سے ایک سگریٹ نکال کر ہاشو کی طرف بڑھائی۔ اس نے اسے خوش دلی سے قبول کر لیا اور رازداری کے انداز میں بولا۔ ''خیر اب یہ بات کوئی راز بھی نہیں ہے۔ کہتے ہیں کہ وڈے داراب صاحب...... میرا مطلب ہے کہ عطاء اللہ داراب صاحب کا چھوٹا بیٹا دین محمد کی دھی تاجور کو پسند کرنے لگا ہے۔ ان کی شادی کی گل بات چلنے والی ہے۔ بڑی اُچی ہواؤں میں اُڑنے والے ہیں دین محمد صاحب...... اب ذرا سوچو...... وہ نکھٹو سیفی کہیں سے آ بھی گیا تو اس کی دال کون گلنے دے گا۔''

میری دھڑکنیں زیر و زبر ہو رہی تھیں۔ تاہم میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''ہاں...... بات تو تمہاری ٹھیک ہے ہاشو بھائی...... لیکن یہ اتنے بڑے خاندان کے ساتھ چوہدری دین محمد کا ٹانکا جڑ کیسے گیا؟''

''اوپر والے کی باتیں اوپر والا ہی جانتا ہے۔ وہ سیانے کہتے ہیں ناں کہ جب اللہ دیتا ہے تو چھپر پھاڑ کے دیتا ہے۔''

سورج اب کافی اوپر آ گیا تھا۔ کھیتوں کھلیانوں میں لوگ اپنے کام میں لگ چکے تھے۔ اب ہم گاؤں میں داخل ہونے والے تھے۔ اچانک میرا پاؤں بے ساختہ بریک پیڈل پر دب گیا۔ ہاشو ڈیش بورڈ سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔

''اوئے کیا ہوا؟'' وہ پکارا۔

میری نگاہ کھڑکی سے گزر کر دور ایک نیم پختہ راستے پر پڑ رہی تھی۔ گاؤں کی چند عورتیں لمبی لمبی چادریں اوڑھے پیدل جا رہی تھیں۔ مجھے ان میں تاجور کی جھلک بھی نظر آئی۔ وہ اب قدرے بہتر نظر آتی تھی کیونکہ بغیر سہارے کے چل رہی تھی۔ تاہم جسم نحیف اور رنگ زرد تھا۔ چڑھتے سورج کی دھوپ اس زردی کو اور بھی گہرا کر رہی تھی۔ بالکل اداس اور کھوئی کھوئی سی وہ خاموشی کے ساتھ دیگر عورتوں کے ہمراہ آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

''وہ سامنے شاہ سائیں کا مزار ہے۔ یہ عورتیں وہیں جا رہی ہیں۔'' ہاشو نے میرے سوال کرنے سے پہلے ہی بتا دیا۔

میں نے دیکھا، دور کچھ فاصلے پر درختوں کے جھنڈ میں شاہ سائیں کے مزار کا سفید اور نیلا گنبد دکھائی دے رہا تھا۔ جھنڈے وغیرہ بھی لگے ہوئے تھے۔

میں نے کہا۔ ''وہ سفید چادر والی لڑکی وہی تو نہیں جس کے بارے میں ہم ابھی بات کر رہے تھے۔ میرا مطلب ہے دین محمد صاحب کی بیٹی؟''

''ہاں یہ وہی ہے۔ تاجور نام ہے پر تمہیں کیسے اندازہ ہوا؟''

''ہاشو بھائی، اس دن وہ رنگین تانگا نہیں پھنس گیا تھا کھڈے میں، اس دن بات ہو رہی تھی ناں کہ دین محمد صاحب بیمار بیٹی کو کہیں دکھا کر آ رہے ہیں۔''

''ہاں، وہ اب بھی بیمار ہی لگتی ہے۔ اس کے ساتھ بائیں طرف جو دو لڑکیاں ہیں یہ اپنے چوہدری بشیر صاحب کی دھی رانیاں ہیں۔ اپنے بھائی کے لاپتا ہونے سے بہت پریشان ہیں یہ بھی۔''

میں نے دھیان سے دیکھا اور پہچان لیا۔ یہ چوہدری بشیر کی بیٹیاں ہی تھیں۔ میں اپنی اصل شکل کے ساتھ ان کے گھر میں جا کر ان سے مل چکا تھا۔

گرم ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ تاجور کی پیلے پھولوں والی چادر ایک لمحے کے لیے اس کے سر سے سرکی اور مجھے اس کا پورا چہرہ دیکھنے کا موقع ملا۔ وہی چہرہ جو میرے دل کا داغ تھا جوائنٹ روشنائی سے میرے سینے میں نقش ہو چکا تھا۔ خزاں کی ایک اپنی خوب صورتی ہوتی ہے اور ان لمحوں میں یہ خوب صورتی مجھے تاجور کے اردگرد نظر آئی۔

ان آٹھ دس عورتوں کے عقب میں کچھ فاصلے پر دو پولیس اہلکار بھی چل رہے تھے۔ ان کے کندھوں پر رائفلیں تھیں۔ ''یہ پولیس والے یہاں کیا کر رہے ہیں؟'' میں نے ہاشو سے پوچھا۔

''یہ گارڈ ہے۔ دین محمد صاحب کے گھر پر ہوتے ہیں۔''

''میں سمجھا نہیں؟''

وہ رازداری کے لہجے میں بولا۔ ''چن جی! اسلام آباد والے پھیرے کے بعد اب دین محمد صاحب اور ان کے گھر والے خاص الخاص لوگ ہو گئے ہیں۔ دو تین پولیس والے تو کیا پورا تھانہ ان کا پہرا دے سکتا ہے۔ دارابیوں کے ساتھ رشتے داری ہونے والی ہے ان کی۔''

میں نے دانت پیسے اور دل ہی دل میں کہا۔ ایسی تیسی دارابیوں کی اور ان کے ہوتے سوتوں کی۔ تاجور کی مرضی نہ ہوگی تو کوئی اس کی پرچھائیں کو بھی نہ چھو سکے گا۔

یہ تیسرے روز کی بات ہے۔ شام کا وقت تھا۔ بہت حبس ہو رہا تھا۔ حاکم علی اور میں ایک ہی کمرے میں سوتے تھے۔ ہم کھانا کھا کر بیٹھے تھے اور گپ شپ کر رہے تھے۔ کل صبح چونکہ مجھے لوڈر لے کر منڈی نہیں جانا تھا لہٰذا ''ایزی'' محسوس کر رہا تھا۔ حاکم علی نے ابھی ابھی آم چوسا تھا اور اس کا گودا اس کی گھنی مونچھوں پر لگا ہوا تھا۔ پکی لسی کے تین چار بڑے گھونٹ لے کر بولا۔ ''ویسے اخبار والی خبر سے تیری بڑی نیک نامی ہوئی ہے پنڈ میں...... لیکن...... ایک بات سچی سچی بتا۔'' اس نے ذرا شرارتی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''کیا بتاؤں؟''

''کہیں ایسا تو نہیں کہ تجھے گھڑی اٹھاتے کسی نے دیکھ لیا ہو...... اور تو نے سوچا ہو کہ اگر تو نے گھڑی واپس نہ کی تو پھر پھڑا جائے گا؟''

''حاکم بھائی! مجھ کو ایسے لگتا ہے کہ آپ مجھے نوکری ملنے سے خوش نہیں ہو۔ اگر ایسی بات ہے تو میں سویرے ہی بستر بوریا باندھ کر نکل جاتا ہوں۔''

''او نہیں وقاصے، میں تو مذاق کر رہا تھا تو بھی چوہدری جی کے ٹریکٹر کی طرح ایک دم ہی بگڑ جاتا ہے۔'' حاکم علی بلند آواز میں ہنسا۔

اسی دوران میں دوسرے کمرے سے ہاشو نے اسے آواز دے دی اور وہ میرا کندھا تھپکتا ہوا باہر نکل گیا۔

میں اسی وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے پتا تھا اب حاکم ایک ڈیڑھ گھنٹے سے پہلے واپس نہیں آئے گا۔ میں نے لکڑی کے دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھائی اور ٹچ والا اسیل فون نکال لیا (ایک ہلکا سا فون بھی میں نے عام استعمال کے لیے رکھا ہوا تھا) کچھ ہی دیر بعد میں سجاول سے بات کر رہا تھا۔

''ہاں بھئی! کیسی گزر رہی ہے اپنی معشوق کے پنڈ میں؟'' سجاول نے چھوٹتے ہی سوال داغا۔

میں نے کہا۔ ''یار! تم سے پہلے بھی گزارش کی ہے اس کے بارے میں ایسے لفظ استعمال نہ کیا کرو۔ مجھے تکلیف ہوتی ہے۔''

''اچھا، چلو بتاؤ کیسی گزر رہی ہے بی بی تاجور صاحبہ کے پنڈ میں؟'' وہ بولا۔

''پہلے تم بتاؤ۔ تمہاری کیسی گزر رہی ہے خورسنہ کے ساتھ؟''

''بہت اچھی۔ بڑے تحمل والی ہے۔ میرے جیسے

ڈھنگ بندے کے ساتھ گزارا کر رہی ہے۔''

''ہاں اس بات پر تو اسے حسنِ کارکردگی کا ایوارڈ بھی دیا جاسکتا ہے۔'' میں نے تائید کی پھر ذرا توقف سے پوچھا۔ ''اور اس کا بلکہ...... تم دونوں کا بیٹا؟''

''ہاں...... ذیشان بھی پہنچ گیا ہے۔ اس کے آنے سے وہ اور بھی اچھی ہوگئی ہے بلکہ سج بھی گئی ہے۔ اس طرح لگتا ہے جیسے اب ہمارا گھر مکمل ہوگیا ہے۔ وہ یہ جان کر بھی بہت خوش ہوئی ہے کہ تم ہمارے آس پاس ہی موجود ہو۔''

''سجاول! سچی بات یہ ہے کہ وہ تم سے پیار کرتی ہے اور تم سے ڈرتی بھی ہے۔ ابھی تو نیا نیا کام ہے اس لیے سب کچھ ٹھیک جارہا ہے...... لیکن تمہیں اپنے حد سے بڑھے ہوئے غصے پر کنٹرول کرنا ہوگا۔ تم دونوں نے ایک دوسرے کے لیے بہت کچھ چھوڑا ہے، اب اپنے غصے کو بھی چھوڑ دو۔''

''اچھا گرو جی۔'' وہ بیزار لہجے میں بولا۔

میں نے کہا۔ ''گرو تم ہو۔ طوفانی محبت کی...... طوفانی ملاقاتیں کیں...... اور تین چار ماہ میں چٹ منگنی اور پٹ بیاہ بھی کرلیا۔ ہمیں دیکھو برسوں سے پیار کی راہ میں گھسیٹے مار رہے ہیں۔''

''اس میں بھی زیادہ قصور تمہارا ہی ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم نے خود دور کیا ہے اُسے اپنے آپ سے۔''

میں سجاول کے ساتھ سکھیرا گاؤں کے حالات کے بارے میں بات کرتا رہا۔ میں نے اسے یہاں کی صورت حال سے آگاہ کیا اور سیف کے والدین کے بارے میں بھی بتایا۔ آخر میں سجاول اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ ''کسی بھی طرح کا کوئی مسئلہ ہو تو مجھے بتانا ہے۔ مجھے تمہارے پاس پہنچنے میں آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں لگے گا۔''

ابھی سجاول سے فون پر میری بات ختم ہی ہوئی تھی کہ باہر کچھ شور سنائی دیا۔ میں نے اپنا ڈبی دار رومال سر پر باندھا اور پشاوری چپل پہنتا ہوا باہر نکل آیا۔ گاؤں کے پرائمری اسکول کی عمارت تھوڑے ہی فاصلے پر تھی۔ میں نے دیکھا کہ تین چار بندے کسی نوجوان لڑکے سے الجھ رہے ہیں۔ اسکول کے گیٹ کے پاس بلب روشن تھا۔ اس کی روشنی میں، میں نے لڑکے کو غور سے دیکھا اور میری کھوپڑی میں دھماکا سا ہوا۔ وہ انیق تھا۔ اس نے پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی۔ تین چار افراد اس سے لڑ رہے تھے اور گاہے بگاہے دھکے بھی دے رہے تھے۔ میں نے ان دھکے دینے والوں کو پہچان لیا۔ یہ دین محمد صاحب کے کارندے ہی تھے۔

''اوئے تیرا کام کیا ہے یہاں۔ تجھے پہلے بھی کہا تھا کہ یہاں نہیں آنا۔'' ایک کارندے نے شعلہ بار لہجے میں کہا۔

''دیکھو تمیز سے بات کرو۔ کوئی چور، ڈاکو نہیں ہوں میں۔''

''تیری تمیز کی تو......'' کارندے نے غلیظ گالی نکالی اور انیق کو الٹے ہاتھ کا تھپڑ مارنا چاہا۔

لیکن وہ بھی انیق تھا۔ کرائے کے ایسے ٹٹو اس کا کیا بگاڑ سکتے تھے۔ اس نے خود کو بچایا۔ تین چار افراد نے اسے دبوچ لیا۔ اسی دوران میں دور سے دو مسلح پولیس اہلکار بھی بھاگتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ یہ اسی گارڈ کے لوگ تھے جو دین محمد صاحب کے گھر پر مقرر کی گئی تھی۔

پولیس والوں کو دیکھتے ہی کارندوں کا حوصلہ بڑھ گیا اور انہوں نے انیق کو زمین پر گرانا چاہا۔ وہ تڑپ کر ان کی گرفت سے نکل گیا۔ ایک پولیس اہلکار نے انیق کو رائفل کے کندے سے ضرب لگانا چاہی۔ یہ ضرب اُچٹ کر سر کے بجائے کندھے پر لگی۔ انیق نے پلک جھپکتے میں رائفل پر ہاتھ ڈالا اور اہلکار کے سینے پر ایسی لات رسید کی کہ وہ اچھلتا ہوا جوہڑ میں جاگرا۔

اب یہ پولیس مقابلہ بنتا جارہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ مجھے مداخلت کرنی چاہیے یا نہیں کہ ایک طرف سے چوہدری دین محمد صاحب لپکتے دکھائی دیے۔ دوسرا پولیس اہلکار خطرناک انداز میں اپنی رائفل سیدھی کررہا تھا۔ شاید وہ انیق کی ٹانگ وغیرہ پر فائر مار کر اسے زخمی کرنا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا، انیق اسے یہ موقع مشکل سے ہی دے گا۔

چوہدری دین محمد جلدی سے اہلکار اور انیق کے درمیان آگئے۔ انہوں نے اہلکار کو روک دیا۔ پھر وہ گرج کر انیق سے مخاطب ہوئے۔ ''اوئے کیوں تیری موت تجھے آوازیں مار رہی ہے۔ مرنا ہی ہے تو جا کسی ریل گڈی کے نیچے سر دے دے، تجھے کہا بھی تھا کہ پھر اپنی منحوس شکل نہ دکھانا۔''

انیق کی مدھم آواز میرے کانوں تک پہنچی۔ ''چوہدری جی! میں آپ سے کچھ لینے دینے نہیں آیا۔ دو باتیں ہی تو کرنا چاہتا ہوں آپ لوگوں سے۔ آپ کو کیا خطرہ ہے مجھ سے؟''

''دم تو کے پٹھے! خطرہ مجھے نہیں، تجھے ہے۔ ٹانگیں چیری جائیں گی تیری۔ لاش کسی کھیت میں پڑی ہوگی۔ کتے

کھا رہے ہوں گے اسے۔ جس طرح وہ حرام موت مرا ہے اس سے زیادہ بری موت مرے گا تو۔" اس کے ساتھ ہی چوہدری دین محمد نے ایک زناٹے کا تھپڑ انیق کے گال پر مارا۔ پھر دوسرا...... پھر تیسرا۔

چوہدری دین محمد نے اس پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔ ساتھ ساتھ وہ گرج رہے تھے۔ "دفع ہو جا...... دور ہو جا نظروں سے۔"

انیق اس طرح تھپڑ کھانے والا شخص نہیں تھا لیکن اس نے کھائے اور بغیر مزاحمت کے کھائے۔ اسے "سعادت مندی" کے سوا اور کیا کہا جا سکتا تھا۔ وہ تاجور کو باجی اور آپی کہتا تھا اور وہ تاجور کا باپ تھا۔ جو اہلکار انیق کی لات کھا کر جوہڑ میں گرا تھا وہ اب اچھل اچھل کر انیق کی طرف آ رہا تھا مگر چوہدری دین محمد کے اشارے پر ان کے کارندے، اہلکار کو سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یقینی بات تھی کہ چوہدری دین محمد اس بات کو زیادہ بڑھانا نہیں چاہتے کیونکہ یہ ان کی بیٹی کا معاملہ تھا۔

جھگڑے کی آوازیں سن کر حاکم علی، ہاشو، اس کی بہن انوری اور دیگر لوگ بھی باہر نکل آئے تھے۔ کچھ تو وہیں کھڑے رہے اور کچھ جھگڑے کی جگہ پر چلے گئے۔

میرے کانوں میں ابھی تک وہی الفاظ گونج رہے تھے جو تھوڑی دیر پہلے دین محمد صاحب نے ادا کیے تھے۔ انہوں نے انیق کو لتاڑتے ہوئے کہا تھا...... وہ حرام موت مرا ہے...... اس سے زیادہ بری موت مرے گا تو......

ان الفاظ میں یقیناً میری طرف ہی اشارہ کیا گیا تھا۔ دین محمد صاحب اور ان کی پوری فیملی بڑی اچھی طرح جانتی تھی کہ انیق شروع دن سے میرا سنگی ساتھی رہا ہے۔ اب میری "وفات" کے بعد وہ یہاں سکھیرا گاؤں میں آ جا رہا تھا۔ دین محمد صاحب جتنی نفرت مجھ سے کرنے لگے تھے، یقیناً اتنی ہی انیق کے حصے میں بھی آ گئی تھی۔

میں نے ہاشو سے پوچھا۔ "کون ہے یہ لڑکا؟"

ہاشو بولا۔ "ٹھیک سے تو مجھے بھی پتا نہیں۔ ایک دن پہلے بھی یہاں آیا تھا۔ دین محمد صاحب کی بیٹھک سے نکلتے دیکھا تھا میں نے۔ اس وقت بھی دین محمد صاحب کا منہ لال بوٹی ہو رہا تھا۔"

"مجھے تو لگتا ہے کہ یہ اسلام آباد سے ہی چوہدری دین کے پیچھے لگ کر آیا ہے۔" ایک کارندے مجید نے خیال ظاہر کیا۔

"کسی کا کوئی مخبر شخبر نہ ہو۔" ہاشو نے ڈکار لیتے ہوئے کہا۔ "پچھلی دفعہ پرچون والے رمضان نے بتایا تھا کہ چوہدری دین سے ملنے سے پہلے یہ لڑکا اس کی دکان پر بھی گیا تھا اور سن گن لیتا رہا تھا۔ پوچھ رہا تھا کہ یہ سڑک کیوں بن رہی ہے۔ کون بنوا رہا ہے۔ داراب کی گاڑیاں یہاں کس کے گھر آتی ہیں؟"

کارندے مجید نے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ دارابوں کی طرح کوئی اور وڈی پارٹی بھی ہو جس نے چوہدری دین کے گھر پر نظر رکھی ہوئی ہو۔" لہجے میں شرارت تھی۔

ہاشو بولا۔ "مجیدے، میں نے چپیڑ مارنی ہے تیرے منہ پر۔ چوہدری دین اب ہمارے پنڈ کا رہائشی ہے۔ اس کی عزت ہم سب کی عزت کے ساتھ سانجھی ہے۔"

مجید اکٹ کر رہ گیا۔

جھگڑے پر اب قابو پا لیا گیا تھا۔ دین محمد صاحب نے بڑی فراست سے معاملے کو سنبھالا تھا۔ دوسری طرف انیق کی بھی عقلمندی تھی کہ دین محمد صاحب کے تھپڑ کھا کر بھی وہ چپ رہا تھا۔ ورنہ وہ کسی کی سہنے والا کہاں تھا۔

میں جھگڑے والی جگہ پر جا کر انیق کے رُوبرو ہونا نہیں چاہتا تھا۔ بے شک چہرہ تیس پینتیس فیصد تک بدل چکا تھا مگر مجھے شک تھا کہ جو لوگ انیق کی طرح مجھے بہت نزدیک سے جانتے ہیں وہ مجھے دیکھ کر چونک سکتے ہیں اور بعدازاں شبے کا شکار بھی ہو سکتے ہیں۔

میں کمرے میں واپس آ گیا۔ سوچنے لگا کہ انیق کے یہاں وارد ہونے کی اصل وجہ کیا ہو سکتی ہے۔ یہ عام سا نظر آنے والا لڑکا عام نہیں تھا۔ اس کے اندر ایک گھاگ اور ذہین وفطین شخص چھپا ہوا تھا۔ داؤد بھاؤ جیسا شخص اسے دستِ راست کی حیثیت دیتا تھا۔ اس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پی رکھا تھا...... درجنوں زبانیں پانی کی سی روانی کے ساتھ بولتا تھا اور اس کے علاوہ بھی اَن گنت صلاحیتیں تھیں جو گنوائی جا سکتی تھیں۔

یہ عین ممکن تھا کہ وہ ابھی تک میری "موت" کے حوالے سے مطمئن نہ ہوا ہو اور میرا کھوج لگاتا پھر رہا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ یہاں تاجور سے مل کر اس کی دلجوئی کرنا چاہتا ہو۔ اس کے علاوہ یہاں بڑی بڑی گاڑیوں میں داراب فیملی کے لوگوں کی آمد بھی انیق کو چونکانے کا باعث ہو سکتی تھی۔

میں سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ میں انیق کو خود سے کتنی دیر تک دور رکھ سکوں گا اور یہ دور رکھنا کس حد تک مفید یا نقصان دہ ثابت ہو گا۔

کچھ دیر بعد حاکم علی واپس کمرے میں آیا تو میں نے اس سے پوچھا کہ کیا بنا؟

وہ بولا۔ ''پتا نہیں کون خر دماغ منڈا ہے۔ خوامخواہ اوکھلی میں سر دے رہا ہے۔ پولیس والے تو اسے کسی صورت چھوڑنے کو تیار نہیں ہو رہے تھے۔ چوہدری دین کی بات بھی نہیں مان رہے تھے۔ تھانے میں ٹیلی فون کر رہے تھے۔ چوہدری دین نے مشکل سے معاملہ رفع دفع کیا ہے۔''

''چاہتا کیا ہے؟''

''کوئی اندر کا معاملہ ہی لگتا ہے۔'' حاکم علی راز داری سے بولا۔ ''نہیں تو ایسے کون زورا زوری کرسکتا ہے چوہدری دین محمد کے ساتھ۔ اب تو علاقے کے بڑے بڑے چوہدری اور زمیندار اس کے اگے پیچھے پھرتے ہیں۔ وڈے وڈے پھنے خاں افسر آ کر سلام کرتے ہیں چوہدری دین کو۔''

یہ اس سے تیسرے روز کی بات ہے۔ چوہدری بشیر نے مجھ سے کہا کہ مہران گاڑی کا تیل پانی چیک کرلوں، میں نے گھر والوں کو کہیں لے جانا ہے۔

میں نے فرمانبرداری سے اثبات میں سر ہلایا اور اپنے کام میں لگ گیا۔ کسی وقت میرے چہرے کے مرمت شدہ حصوں میں اکڑاؤ سا پیدا ہو جاتا تھا، تاہم گرمی میں صورتِ حال بہتر رہتی تھی۔ پسینا وغیرہ بھی اسی طرح نکلتا تھا جس طرح چہرے اور جسم کے باقی مساموں سے نکلتا تھا۔ شروع شروع میں چہرے کے تبدیل شدہ حصوں کی اسکن کے رنگ میں معمولی سا فرق موجود تھا مگر اب غور کرنے سے بھی یہ فرق محسوس نہیں ہوتا تھا۔

دو روز پہلے بارش ہوئی تھی اور موسم خوشگوار تھا۔ میں گاڑی کو کپڑا مار کر فارغ ہوا ہی تھا کہ ادھیڑ عمر منشی منظور آتا دکھائی دیا۔ ''ہاں بھئی وقاص، گڈی ریڈی ہے؟'' اس نے پوچھا۔ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ بولا۔ ''چلو اسٹارٹ کرو۔''

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ وہ میرے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔ ہم گاڑی چلا کر چوہدری بشیر کے گھر کے دروازے کے بالکل سامنے لے گئے اور نیچے اتر گئے۔ دروازہ کھلا اور سیفی کی بیمار والدہ شفقت بی بی نمودار ہوئی۔ اس کی دو بیٹیوں نے اسے دائیں بائیں سے سہارا دے رکھا تھا، وہ بمشکل چل پا رہی تھیں۔ انہیں بمشکل گاڑی کی پچھلی نشست پر بٹھایا گیا۔ اتنی مشقت سے ہی ان کا سانس بری طرح پھول گیا تھا۔ میں نے اور منشی منظور نے انہیں سلام کیا۔ دونوں لڑکیاں بھی ماں کے ساتھ ہی بیٹھ گئیں اور ہم روانہ ہو گئے۔ شفقت بی بی کے سر پر وہی چادر تھی جو میں ڈھائی تین ماہ پہلے ان کے لیے لایا تھا۔ یہ چادر ان تحفوں میں شامل تھی جو میں ان کے لیے ''سیفی کی طرف سے'' لایا تھا۔

مجھے پتا چلا کہ ہمیں قریباً بیس کلومیٹر دور ایک شاہ پور نامی گاؤں جانا ہے۔ وہاں کوئی اللہ والا دم درود کرتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس کی دعا میں بہت اثر ہے۔ آنکھوں میں امید کے چراغ جلائے یہ دکھیاری ماں نجانے کہاں کہاں بھٹک رہی تھی، یہ جانے بغیر کہ وہ جس لختِ جگر کی تلاش میں ہے، وہ اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔

میں نیم پختہ راستوں پر ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ منشی ماسٹر منظور نے سیف کی والدہ کو آپا جی کہہ کر مخاطب کیا اور بولا۔ ''یہ وہی ہے جی، جس کا ذکر میں نے آپ سے کیا تھا، وقاص نام ہے اس کا۔''

سیف کی والدہ بولیں۔ ''اچھا یہ ہے وہ جس کی تصویر اخبار میں بھی چھپی تھی۔'' اس کے ساتھ ہی انہوں نے پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر میرا کندھا تھپکا اور بولیں۔ ''شاباش پتر! ایمانداری سے زیادہ وڈی چیز اور کوئی نہیں۔ اللہ سوہنا دنیا اور آخرت دونوں میں اس کا صلہ دیتا ہے۔''

''شکریہ ماں جی۔'' میں نے عقب نما آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''محنت سے کام کر، اللہ نے چاہا تو یہاں بھی ترقی ملے گی تجھے۔''

''آپ کی دعا کی ضرورت ہے جی۔''

انہوں نے گہری سانس لی۔ ''دعاؤں میں واقعی بڑا اثر ہوتا ہے پتر۔ یہ کبھی بھی بے کار نہیں جاتیں۔ ان کا صلہ ایک صورت میں نہ ملے تو دوسری صورت میں مل جاتا ہے...... بس ہمیں دعا کرتے رہنا چاہیے۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔''

وہ مجھ سے میرے گھر بار اور شادی وغیرہ کے بارے میں پوچھنے لگیں۔ میں نے وہی کچھ بتایا جو اس سے پہلے چوہدری بشیر اور دیگر کو بتا چکا تھا۔ میں شادی شدہ تھا۔ دو چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ بوڑھے ماں باپ کا بوجھ بھی میرے سر پر تھا۔ بھائیوں میں ناچاقی اور جھگڑے کے سبب اپنے آبائی علاقے سے نکل آیا تھا اور مارا مارا پھر رہا تھا...... وغیرہ وغیرہ۔

ہم دوپہر کے وقت اس شاہ پور نامی گاؤں میں پہنچے۔

یہ اللہ والے بزرگ صرف جمعرات اور جمعے کو عقیدت مندوں کے مسائل سنتے تھے اور دعا کرتے تھے۔ ایک مسجد کے ساتھ ایک کشادہ حجرہ تھا۔ وہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔ میں نے دیکھا کہ سیف کی والدہ اور دونوں بہنوں نے اپنی جوتیاں گاڑی کے اندر ہی رہنے دیں اور ننگے پاؤں چلتی ہوئی حجرے کی طرف چلی گئیں۔

وہاں سادہ سے لنگر کا انتظام بھی تھا۔ دوپہر کا کھانا وہیں کھانے کے بعد ہم ظہر کے بعد وہاں سے واپس روانہ ہوئے۔ سیف کی والدہ کا سانس بری طرح پھولا ہوا تھا اور چہرے کا رنگ نیلگوں ہو رہا تھا۔ وہ مسلسل آنسو بہا رہی تھیں۔ بڑی بیٹی شازیہ کی آواز گاہے بگاہے ابھرتی تھی۔ وہ انہیں پچکارتی تھی اور کہتی تھی۔ ''بس امی جی! ایسے کریں گی تو آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔ بس چپ ہو جائیں اب۔''

میں نے عقب نما آئینے میں دیکھا، اس نے ماں کا سر اپنے کندھے سے لگایا ہوا تھا اور اپنی ہلکی گلابی اوڑھنی سے بار بار ان کے آنسو پونچھ رہی تھی۔ وہ صاف رنگت اور متناسب جسم والی لڑکی تھی۔ میں اسے ایک بار پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ عمر سولہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اس نے آدھا گھونگھٹ نکالا ہوا تھا۔ خوب صورت ناک میں کوکا چمک رہا تھا۔ دوسری بہن سال ڈیڑھ سال چھوٹی ہوگی۔ اس کی شکل سیفی سے بہت ملتی تھی۔ جب بھی اس کے چہرے پر نگاہ پڑتی خوبرو پنجابی گبرو کا چہرہ نگاہوں میں گھوم جاتا۔ وہی جو جاماجی کے ایک قریبی ٹاپو پر ابدی نیند سو رہا تھا۔

ابھی ہم سکھیرا سے چھ سات کلومیٹر دور ہی تھے کہ ایک موٹر سائیکل نے ہمیں اوورٹیک کیا اور ہمارے آگے آگے چلنے لگی۔ اس پر دو لڑکے سوار تھے۔ دونوں شلوار قمیص میں تھے اور مقامی لگتے تھے۔ وہ موٹر سائیکل کو کبھی ہماری گاڑی کی سائڈ پر لے آتے اور اندر جھانکنے لگتے، کبھی آگے آگے چلنے لگتے۔ انداز سے شرارت عیاں تھی۔

ماسٹر منظور نے مجھے مخاطب کیا اور بگڑے تیوروں کے ساتھ کہا۔ ''دقاصے! گاڑی آگے نکلوان سے۔''

میں نے گاڑی آگے نکالنے کی کوشش کی مگر انہوں نے راستہ نہیں دیا۔ ''لوفر کہیں کے۔'' ماسٹر منظور بڑبڑایا۔

میں نے کچھ آگے جا کر موٹر سائیکل کو زبردستی اوورٹیک کرنے کی کوشش کی۔ وہ بھی ایک نمبر کے ڈھیٹ تھے بالکل راستہ نہیں دے رہے تھے۔ میں نے اوورٹیک تو کر لیا مگر موٹر سائیکل ذرا پھسلی اور گاڑی کی سائڈ سے ٹکرانے کے بعد بری طرح ڈگمگائی۔ یقیناً گاڑی پر بھی اچھا خاصا ڈینٹ پڑ چکا تھا۔ ''کمینے...... اُلو کے پٹھے۔'' ماسٹر منظور نے دانت پیس کر کہا۔

ہم نے گاڑی روک لی۔ موٹر سائیکل بھی رک گئی۔ گاڑی کے دونوں دروازوں پر اچھی خاصی خراشیں آگئی تھیں۔ موٹر سائیکل چلانے والے تنومند لڑکے کا رنگ سرخ انگارا ہو رہا تھا۔ بلاتردد میرا گریبان پکڑ کر بولا۔ ''آنکھیں نہیں ہیں...... اندھے ہو؟''

ماسٹر منظور نے اس سے میرا گریبان چھڑاتے ہوئے کہا۔ ''اوے کم بختا، حیا کر...... ایک تو گڈی چھیل کر رکھ دی، اوپر سے بکواس کر رہے ہو۔''

لڑکے کا ساتھی جس کی گھنی مونچھیں تھیں اور شکل سے ہی جھگڑالو لگتا تھا، گرجا۔ ''زبان سنبھال کر بات کر ماسٹر! ایویں بےعزتی خراب نہ ہو جائے۔''

بات مزید بگڑی تو میں نے سوالیہ نظروں سے ماسٹر منظور کی طرف دیکھا۔ وہ غصے میں تھے لیکن تھرتھر کانپ رہے تھے۔ میرا گریبان پھر تنومند لڑکے کے ہاتھ میں تھا۔ ماسٹر منظور نے اسے بےغیرت کہا تو جواب میں اس نے بھی ماسٹر منظور کو یہی خطاب دیا۔ اب اسے سزا دینا ضروری ہو گیا تھا۔ میں نے اس کے منہ پر مُکا جڑا اور وہ الٹ کر کھیت میں جا گرا۔

گاڑی کے اندر سے شفقت بی بی اور لڑکیاں چلائیں۔ دونوں لڑکے مجھ سے بھڑ گئے۔ میں نے انہیں محتاط انداز میں چوٹیں لگائیں لیکن وہ بپھرتے جا رہے تھے۔ ایک لڑکا لپک کر گیا اور اس نے موٹر سائیکل کی سائڈ پر لٹکے بیگ میں سے آہنی مُکا نکال کر ہاتھ پر چڑھا لیا۔ دوسرا اس سے بھی دو ہاتھ آگے نکلا۔ اس نے قمیص کے نیچے سے چاقو برآمد کر لیا۔ یہ وہی گھنی مونچھوں والا تھا جو موٹر سائیکل چلانے والے کے عقب میں بیٹھا تھا۔ ''چیر ڈالوں گا۔'' وہ دہاڑا اور چاقو سے میری ران کو نشانہ بنانا چاہا۔

میں نے اس کا وار بچایا اور بازو مروڑ کر چاقو اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ جس طرح چاقو میں نے اس سے چھینا تھا، اسے فوراً اندازہ ہو گیا کہ میں ان کے بس کا نہیں ہوں۔ وہ گالیاں بکتا ہوا جوار کے اونچے کھیت میں گھس گیا۔ وہ پسپا ہو رہا تھا مگر انداز ایسا ہی تھا جیسے کوئی آتشیں ہتھیار وغیرہ لینے کے لیے جا رہا ہو۔

جس نے ہاتھ پر آہنی مُکا چڑھایا تھا، وہ تذبذب میں تھا کہ حملہ کرے یا نہیں، یہ وہی تھا جس نے چند سیکنڈ

مرحبا
قدرت کی حکمت
اصلی فارمولا
100%
100%
نزلہ، زکام، فلو، بخار، کھانسی اور گلے کی سوزش کے لیے مفید و مؤثر
مرحبا جوشاندہ
نزلہ، زکام، فلو، بخار، کھانسی اور گلے کی خراش کے لئے مفید اور مؤثر ہے
پی سی ایس آئی آر لیبارٹریز پاکستان سے تصدیق شدہ

یہ اللہ والے بزرگ صرف جمعرات اور جمعے کو عقیدت مندوں کے مسائل سنتے تھے اور دعا کرتے تھے۔ایک مسجد کے ساتھ ایک کشادہ حجرہ تھا۔ وہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔ میں نے دیکھا کہ سیف کی والدہ اور دونوں بہنوں نے اپنی جوتیاں گاڑی کے اندر ہی رہنے دیں اور ننگے پاؤں چلتی ہوئی حجرے کی طرف چلی گئیں۔

وہاں سادہ سے لنگر کا انتظام بھی تھا۔ دوپہر کا کھانا وہیں کھانے کے بعد ہم ظہر کے بعد وہاں سے واپس روانہ ہوئے۔سیف کی والدہ کا سانس بری طرح پھولا ہوا تھا اور چہرے کا رنگ نیلگوں ہو رہا تھا۔ وہ مسلسل آنسو بہا رہی تھیں۔ بڑی بیٹی شازیہ کی آواز گاہے بگاہے ابھرتی تھی۔ وہ انہیں پچکارتی تھی اور کہتی تھی۔"بس امی جی! ایسے کریں گی تو آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔ بس چپ ہو جائیں اب۔"

میں نے عقب نما آئینے میں دیکھا، اس نے ماں کا سر اپنے کندھے سے لگایا ہوا تھا اور اپنی ہلکی گلابی اوڑھنی سے بار بار ان کے آنسو پونچھ رہی تھی۔ وہ صاف رنگت اور متناسب جسم والی لڑکی تھی۔ میں اسے ایک بار پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ عمر سولہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اس نے آدھا گھونگھٹ نکالا ہوا تھا۔خوب صورت ناک میں کوکا چمک رہا تھا۔دوسری بہن سال ڈیڑھ سال چھوٹی ہوگی۔ اس کی شکل سیفی سے بہت ملتی تھی۔ جب بھی اس کے چہرے پر نگاہ پڑتی خوبرو پنجابی گبرو کا چہرہ نگاہوں میں گھوم جاتا۔ وہی جو جاما جی کے ایک قریبی ٹاپو پر ابدی نیند سو رہا تھا۔

ابھی ہم سکھیرا سے چھ سات کلومیٹر دور ہی تھے کہ ایک موٹر سائیکل نے ہمیں اوورٹیک کیا اور ہمارے آگے آگے چلنے لگی۔ اس پر دو لڑکے سوار تھے۔ دونوں شلوار قمیص میں تھے اور مقامی لگتے تھے۔ وہ موٹر سائیکل کو کبھی ہماری گاڑی کی سائڈ پر لے آتے اور اندر جھانکنے لگتے، کبھی آگے آگے چلنے لگتے۔انداز سے شرارت عیاں تھی۔

ماسٹر منظور نے مجھے مخاطب کیا اور بگڑے تیوروں کے ساتھ کہا۔"وقاصے! گاڑی آگے نکلوان سے۔"

میں نے گاڑی آگے نکالنے کی کوشش کی مگر انہوں نے راستہ نہیں دیا۔"لوفر کہیں کے۔" ماسٹر منظور بڑبڑایا۔

میں نے کچھ آگے جا کر موٹر سائیکل کو زبردستی اوورٹیک کرنے کی کوشش کی۔ وہ بھی ایک نمبر کے ڈھیٹ تھے بالکل راستہ نہیں دے رہے تھے۔ میں نے اوورٹیک تو کر لیا مگر موٹر سائیکل ذرا پھسلی اور گاڑی کی سائڈ سے ٹکرانے کے بعد بری طرح ڈگمگائی۔ یقیناً گاڑی پر بھی اچھا خاصا ڈینٹ پڑ چکا تھا۔"کمینے...... اُلو کے پٹھے۔" ماسٹر منظور نے دانت پیس کر کہا۔

ہم نے گاڑی روک لی۔موٹر سائیکل بھی رک گئی۔ گاڑی کے دونوں دروازوں پر اچھی خاصی خراشیں آئی تھیں۔موٹر سائیکل چلانے والے تنومند لڑکے کا رنگ سرخ انگارا ہو رہا تھا۔ بلاتردد میرا گریبان پکڑ کر بولا۔"آنکھیں نہیں ہیں......اندھے ہو؟"

ماسٹر منظور نے اس سے میرا گریبان چھڑاتے ہوئے کہا۔"اوئے کم بختا، حیا کر...... ایک تو گڈی چھیل کر رکھ دی، اوپر سے بکواس کر رہے ہو۔"

لڑکے کا ساتھی جس کی گھنی مونچھیں تھیں اور شکل سے ہی جھگڑالو لگتا تھا، گرجا۔"زبان سنبھال کر بات کر ماسٹر! ایویں بےعزتی خراب نہ ہو جائے۔"

بات مزید بگڑی تو میں نے سوالیہ نظروں سے ماسٹر منظور کی طرف دیکھا۔ وہ غصے میں تھے لیکن تھر تھر کانپ رہے تھے۔ میرا گریبان پھر تنومند لڑکے کے ہاتھ میں تھا۔ ماسٹر منظور نے اسے بےغیرت کہا تو جواب میں اس نے بھی ماسٹر منظور کو یہی خطاب دیا۔اب اسے سزا دینا ضروری ہو گیا تھا۔ میں نے اس کے منہ پر مُکا جڑا اور وہ الٹ کر کھیت میں جا گرا۔

گاڑی کے اندر سے شفقت بی بی اور لڑکیاں چلائیں۔ دونوں لڑکے مجھ سے بھڑ گئے۔ میں نے انہیں محتاط انداز میں چوٹیں لگائیں لیکن وہ بھرتے جا رہے تھے۔ایک لڑکا لپک کر گیا اور اس نے موٹر سائیکل کی سائڈ پر لٹکے بیگ میں سے آہنی مُکا نکال کر ہاتھ پر چڑھا لیا۔ دوسرا اس سے بھی دو ہاتھ آگے نکلا۔ اس نے قمیص کے نیچے سے چاقو برآمد کر لیا۔ یہ وہی گھنی مونچھوں والا تھا جو موٹر سائیکل چلانے والے کے عقب میں بیٹھا تھا۔"چیر ڈالوں گا۔" وہ دہاڑا اور چاقو سے میری ران کو نشانہ بنانا چاہا۔

میں نے اس کا وار بچایا اور بازو مروڑ کر چاقو اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔جس طرح چاقو میں نے اس سے چھینا تھا، اسے فوراً اندازہ ہو گیا کہ میں ان کے بس کا نہیں ہوں۔ وہ گالیاں بکتا ہوا جوار کے اونچے کھیت میں گھس گیا۔ وہ پسپا ہو رہا تھا مگر انداز ایسا ہی تھا جیسے کوئی آتشیں ہتھیار وغیرہ لینے کے لیے جا رہا ہو۔

جس نے ہاتھ پر آہنی مُکا چڑھایا تھا، وہ تذبذب میں تھا کہ حملہ کرے یا نہیں، یہ وہی تھا جس نے چند سیکنڈ

پہلے ماسٹر منظور کو گندی گالی دی تھی۔ میں نے چاقو ماسٹر منظور کی طرف پھینکا اور اس پٹھے کٹے کو روئی کی طرح دھنک دیا۔ چند سیکنڈ بعد حالت یہ تھی کہ اس کے ناک منہ سے خون چھوٹ رہا تھا اور وہ کھیت کی مٹی میں لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ اگر گاڑی میں بیٹھی ہوئی شازیہ بے ساختہ چلا کر مجھے روک نہ دیتی تو شاید میں اس کے چہرے کا بھرتا بنا دیتا۔

میں نے اپنا اٹھا ہوا ہاتھ روک لیا اور لڑکے کی پسلیوں میں ایک ٹھوکر مار کر اٹھ کھڑا ہوا۔ شفقت بی بی بھی دہائی دے رہی تھیں اور مجھے پیچھے ہٹنے کا کہہ رہی تھیں...... لیکن جس انداز میں لڑکی شازیہ بے ساختہ پکاری تھی اس نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں نے اس کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ہراس کے ساتھ ساتھ دکھ کی لہر نظر آئی۔ نجانے کیوں ان لمحوں میں میرے دل نے گواہی دی کہ شازیہ اور اس لڑکے کے درمیان کوئی تعلق موجود ہے۔

اس دوران میں ایک اور نوجوان لڑکا دکھائی دیا جو ایک پگڈنڈی پر بھاگتا ہوا ہماری طرف آ رہا تھا۔ وہ لڑنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ وہ ہانپا ہوا تھا اور رنگ زرد ہو رہا تھا۔ اس نے زخمی لڑکے کو اکبر کہہ کر مخاطب کیا اور بولا۔ ”کیا ہو گیا ہے، کیسے ہوا ہے جھگڑا؟“

میں نے کہا۔ ”یہ سوال جواب اس سے بعد میں کر لینا۔ پہلے اسے کسی ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ تاکہ اس کے بوتھے پر ٹانکے شانکے لگ سکیں۔“

اکبر نامی اس لڑکے کی ٹھوڑی کے نیچے گہرا زخم آیا تھا اور خون تیزی سے نکل رہا تھا۔ وہ اب بھی بڑی گرم نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”اب بھی دل میں کوئی حسرت ہے تو بعد میں نکال لینا۔ وقاص نام ہے میرا۔ بشیر صاحب کا ڈرائیور ہوں اور یہ گاڑی کے اندر میری بہنیں بیٹھی ہیں۔ ان پر گندی نظر ڈالو گے تو یہ آنکھیں نکال کر ہتھیلی پر رکھ دوں گا۔“

وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا مگر اس کے ساتھی نے روکا۔ ”نہیں اکبرے! بعد میں دیکھ لیں گے۔ ابھی چل اسپتال۔“

اس نے اکبر کو سہارا دے کر اٹھایا۔ خون بند کرنے کے لیے ٹھوڑی کے نیچے ایک کپڑا باندھا۔ دونوں موٹر سائیکل پر سوار ہو کر نکل گئے۔ ہم نے بھی وہاں زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھا۔ عین ممکن تھا کہ جو چاقو بردار دھمکیاں دیتا ہوا بھاگ گیا تھا وہ واقعی کمک لے کر پہنچ جاتا، یا پھر کوئی آتشیں ہتھیار لے آتا۔ اس کا چاقو ماسٹر منظور نے اپنے پاس محفوظ کر لیا تھا تاکہ اگر تھانے کچہری تک نوبت پہنچے تو اسے ثبوت کے طور پر پیش کیا جا سکے۔

شفقت بی بی اپنی پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ مسلسل آج کل کے لوفر لڑکوں کو کوسنے دے رہی تھیں اور میری شان میں قصیدہ پڑھ رہی تھیں، بولیں۔ ”آج ان کا بھائی یہاں ہوتا تو وہ بھی ایسے ہی غصہ کرتا جیسے تم نے کیا ہے۔ کسی نیک ماں کے پتر لگتے ہو۔“ انہوں نے عقب سے ہاتھ بڑھا کر میرا کندھا تھپکا اور دعائیں دیں۔

میں نے ماسٹر منظور سے کہا۔ ”منشی جی، یہ لڑکے تھے کون؟ کیا پہلے بھی کبھی ان پر نظر پڑی ہے؟“

”نہیں پہلی بار دیکھا ہے بدبختوں کو۔ پر یہ شاید مجھے جانتے ہوں۔ ان میں سے ایک مجھے ماسٹر کہہ رہا تھا۔“

”پتا نہیں کہاں کے تھے لعنتی۔ شاید وہاں لنگر خانے سے ہی پیچھے لگ گئے ہوں۔“ شفقت بی بی بڑبڑائیں۔

منشی جی اور شفقت بی بی دونوں ہی لڑکوں کے سلسلے میں لاعلمی کا اظہار کر رہے تھے مگر میں جان گیا تھا کہ کم از کم شازیہ تو انہیں جانتی ہے۔ اکبر نامی لڑکے کی درگت بنتے دیکھ کر وہ جس طرح اچانک بے ساختہ پکاری تھی، وہ لہجہ کسی دوسرے نے چاہے نوٹ نہ کیا ہو لیکن میں نے کیا تھا۔ وہ اب بھی بالکل چپ بیٹھی ہوئی تھی۔ آدھا گھونگھٹ اس کے چہرے پر لہرا رہا تھا۔

”تمہیں تو کوئی چوٹ نہیں لگی پتر؟“ شفقت بی بی نے ہمدردی سے پوچھا۔

”نہیں ماں جی، میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

گاؤں پہنچ کر میں نے گاڑی گھر کے دروازے کے عین سامنے روکی اور پچھلا دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا۔ حسبِ سابق دونوں لڑکیوں نے ماں کو سہارا دیا اور آہستہ آہستہ چلاتی ہوئی اندر لے گئیں۔ اس دوران میں دو سیکنڈ کے لیے میری نگاہ شازیہ کی نگاہ سے ملی۔ مجھے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے غصے اور نفرت کی لہر سی دکھائی دی۔

ڈیرے پر جا کر منشی ماسٹر منظور نے سارا ماجرا چوہدری بشیر کے گوش گزار کر دیا۔ چوہدری بشیر بھی پریشان ہو گئے لیکن صاف ظاہر تھا کہ وہ اس بات کو بڑھانا نہیں چاہتے تھے۔ اس میں ان کی بیٹیوں کا تذکرہ آ رہا تھا۔ وہ حقے کا ایک طویل کش لے کر بولے۔ ”پر وہ منڈے تھے کون، آلے دوالے کے کسی پنڈ کے ہی ہوں گے ناں، حلیے کیسے تھے؟“

ماسٹر منظور نے کہا۔ ''شلواروں قمیصوں میں تھے، کھاتے پیتے گھر کے لگتے تھے۔ ایک لڑکے کے گلے میں سونے کی موٹی زنجیر بھی تھی۔ اب افسوس ہو رہا ہے کہ ان کی موٹر سائیکل کا نمبر کیوں نوٹ نہ کیا ہم نے۔''

ہاشو بھی پاس ہی بیٹھا تھا۔ گلے میں سونے کی زنجیر کا سن کر وہ تھوڑا سا چونکا بولا۔ ''ماسٹر جی! آپ نے منڈے کا نام اکبر بتایا ہے ناں؟'' ماسٹر منظور نے اثبات میں جواب دیا۔ ہاشو نے کہا۔ ''گورا رنگ ہے۔ ذرا گھونگرالے بال اں تھوڑے سے لمبے؟''

''ہاں، بال لمبے ہی تھے۔'' میں نے تائید کی۔

''میں سمجھ گیا جی۔ یہ مہرا پور کے منڈے تھے۔ اُدھر کوئی میاں نثار ہے۔ کافی وڈا باغ ہے اس کا۔ اس کا ایک بھائی پھل فروٹ کی آڑھت بھی کرتا ہے۔ بندے تو یہ شریف ہی ہیں۔''

لڑکوں کی شناخت ہو گئی تو پھر گفتگو کا رخ دوسری طرف مڑ گیا کہ کیا رویّہ اختیار کیا جائے؟ فیصلہ یہی ہوا کہ اگر گاڑی کا نقصان ہوا ہے تو ان لڑکوں کو بھی ٹھیک ٹھاک سزا مل گئی ہے۔ اگر وہ لوگ چپ رہتے ہیں تو ہم بھی چپ رہیں اگر وہ بات آگے بڑھاتے ہیں تو پھر دیکھا جائے گا۔

چونکہ جھگڑا ایک ویران جگہ پر ہوا تھا اور دوسرے لوگوں کو اس کا پتا نہیں چلا تھا۔ مار کٹائی کا سارا معاملہ تین چار دوستوں تک ہی محدود رہا تھا اس لیے عین ممکن تھا کہ معاملہ یہیں پر ٹھپ ہو جاتا۔

دو دن اسی طرح گزر گئے۔ کسی طرح کی کوئی گڑبڑ نہ ہوئی۔ مطلب یہی تھا کہ وہ لڑکے اس معاملے میں چپ سادھ گئے ہیں۔ یہ تیسرے دن کی بات ہے۔ گاؤں میں کوئی شادی تھی۔ دور کہیں ڈھولک بجنے کی مدھم آواز ابھر رہی تھی۔ شام کے سائے گہرے ہوتے ہوتے اب تاریکی میں بدل چکے تھے۔ لوڈشیڈنگ کے سبب بجلی بھی غائب تھی۔ ایسے میں گاؤں کی تاریکی اور بھی گہری محسوس ہوتی ہے۔ بس گھروں کے اندر لیمپ اور لالٹینیں وغیرہ روشن ہوتی ہیں۔ میرے سرہانے بھی لالٹین کی لو تھرتھرا رہی تھی۔ میں کمرے کی دیوار سے ٹیک لگائے تاجور کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ شاید وہ بھی اس ڈھولک میں شریک ہو۔ زرد جوڑا پہنے، ہونٹوں پر ہلکی لالی سجائے اپنے بالوں کو بار بار کانوں کے پیچھے اڑس رہی ہو۔ وہ کیا سوچ رہی ہو گی، اس کی شربتی آنکھوں میں کون سا رنگ ہو گا؟ دل کی بے قراری بڑھنے لگی۔ میں کمرے سے نکل کر باہر کیکر کے درختوں کے نیچے آ گیا۔ میرے ہاتھ میں شیشم کی ایک چھوٹی لاٹھی تھی۔ دیہات میں رات کے وقت آوارہ کتوں کو خود سے دور رکھنے کے لیے اس طرح کی احتیاط کر لی جاتی ہے۔ خاص طور سے جو لوگ گاؤں میں اجنبی ہوتے ہیں، انہیں زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ گلیوں میں اِکا دُکا لوگ نظر آتے تھے۔ میری نگاہ ایک چھوٹے سے جلوس پر پڑی۔ یہ زرق برق کپڑوں والی عورتوں اور لڑکیوں کا جلوس تھا۔ انہوں نے ہاتھوں میں تھالیاں اور چنگیریں اٹھائی ہوئی تھیں، ان کے اندر موم بتیاں روشن تھیں۔ غالباً یہ عورتیں مہندی لے کر لڑکی والوں کے گھر جا رہی تھیں۔

میں نے دل ہی دل میں خود سے پوچھا۔ ''کیا تاجور بھی ان میں موجود ہو گی؟''

میں چند قدم چل کر ایک کچا راستہ پار کر کے گاؤں کے گھروں کے کچھ اور نزدیک پہنچ گیا۔ درختوں کی اوٹ میں کھڑا ہو کر لڑکیوں اور عورتوں کے دمکتے ہوئے چہرے دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ شاید ان میں موجود نہیں تھی۔ وہ تو گہرے غم کے گھیرے میں تھی۔ ایسی تقریبات میں کہاں شریک ہو سکتی تھی۔ میں اس جگمگاتے جلوس کو دیکھتا رہا جو اب گاؤں کے بیرونی راستے پر چلتا چلتا ایک گلی میں گم ہو رہا تھا۔ اچانک میں چونکا۔ دو لڑکیاں جلوس میں چند قدم پیچھے رہ گئی تھیں۔ ان میں سے ایک دہری ہو کر شاید اپنے سینڈل وغیرہ کا فیتہ درست کر رہی تھی۔ تب یکا یک وہ مڑی اور درختوں میں اوجھل ہو گئی۔

نجانے کیوں مجھے لگا کہ یہ کوئی اور نہیں سیفی کی بہن شازیہ ہے۔ میں بھی محتاط انداز میں درختوں کی طرف گیا۔ لڑکی کا ہیولا اب ایک اونچے کھیت میں اوجھل ہو رہا تھا۔ میں بھی تھوڑی دیر بعد احتیاط سے کھیت میں داخل ہو گیا۔ اونچی فصل کے درمیان آواز پیدا کیے بغیر میں آگے بڑھتا رہا۔ یکا یک ایک مدھم آواز نے میرے قدم جکڑ لیے۔ میں وہاں کا تہاں کھڑا ہو گیا۔

آواز سو فیصد شازیہ ہی کی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''تمہیں کیا ضرورت پڑی تھی اس طرح کی حرکت کرنے کی، تم نے جب بھی کہا ہے میں کسی نہ کسی طرح ملنے آ ہی گئی ہوں ناں......''

مردانہ آواز ابھری۔ ''وہ تو بس ویسے ہی ذرا موڈ ہو گیا تھا تمہارے ساتھ چلنے کا......لیکن جو کچھ ہوا ہے، اس ... ڈرائیور کے لیے چنگا نہیں ہوا ہے۔ پورا بدلہ لوں گا اس سے، ہتھ پیر توڑ کر لولا نہ کر دوں تو اکبر نام نہیں۔''

''نہ نہ ایسا نہ کرنا اکبر...... تمہیں میری قسم...... بات بڑھ جائے گی۔ آخر میں بدنامی تو میری اور میرے گھر والوں کی ہی ہونی ہے ناں۔ سیف بھائی جان کے گم ہونے سے امی ابا پہلے ہی بڑے پریشان ہیں۔ مجھے تو ہر وقت اسی کی طرف سے دھڑکا لگا رہتا ہے۔''

''تو فکر نہ کر شازی! بڑے طریقے سے ماروں گا اُسے۔ ہم پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔ اب اس کی دو چار ہڈیاں توڑے بغیر مجھے چین نہیں آتا۔''

''ایسی باتیں نہ کیا کرو اکبر، ہماری مصیبتیں پہلے ہی کوئی کم نہیں ہیں۔ اوپر سے اتنی چوٹیں لگوا لی ہیں تم نے۔ میرے دل کو کچھ ہو رہا ہے۔''

پھر شاید وہ اس کے گلے لگ گئی تھی۔ دس پندرہ سیکنڈ خاموشی رہی پھر شازیہ کی سسکتی ہوئی سی آواز ابھری۔ ''یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے ناں، اللہ کرے میں ہی مر جاؤں۔''

''کتنی بار کہا ہے۔ ایسی باتیں نہ کیا کر۔ اگر تو نہیں تو پھر میں بھی نہیں۔''

''لیکن تیرے بھائی جان کبھی نہیں مانیں گے اکبر! وہ ذات برادری سے باہر کبھی رشتہ نہیں جوڑیں گے۔''

فصل میں سرسراہٹ کی آواز آئی۔ شازیہ جیسے کانپ کر بولی۔ ''شاید کوئی آ رہا ہے اِس طرف...... اچھا...... میں چلتی ہوں۔''

میں اپنی جگہ دم سادھے بالکل ساکت کھڑا رہا۔ چومنے کی مدھم آواز آئی۔ وہ مجھ سے پانچ چھ فٹ کے فاصلے سے گزری اور پھر کھیت سے باہر نکل گئی۔ کچھ دیر بعد اندازہ ہوا کہ فصل میں جو سرسراہٹ پیدا ہوئی وہ کسی آوارہ کُتے کی وجہ سے تھی۔ میں اپنی جگہ دم بخود کھڑا رہا۔ شازیہ کے جانے کے بعد اکبر بھی اپنی جگہ سے حرکت میں آ گیا۔ مجھے پتا چلا کہ کھیتوں کے درمیان ایک تنگ پگڈنڈی پر اس کی موٹر سائیکل بھی کھڑی ہے۔ اس نے اپنا منہ سر ایک کپڑے میں لپیٹا اور موٹر سائیکل کو اسٹارٹ کرنے کے لیے اس کے اوپر بیٹھ گیا۔

میں نے تیزی سے ایک فیصلہ کیا اور اس کے سامنے آ گیا۔ وہ بری طرح چونکا اور تاروں کی مدھم روشنی میں مجھے پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا ہاتھ اپنے نیفے کی طرف بڑھایا۔ یقیناً وہاں کوئی ہتھیار وغیرہ موجود تھا۔

''کون ہے؟'' وہ بے دھڑک بولا۔

میں اس کے بالکل سامنے چلا گیا۔ اس نے آنکھیں سکیڑ کر مجھے دیکھا۔ میں نے کہا۔ ''تین دن پہلے کی ملاقات ہے۔ اتنی جلدی بھولی تو نہیں ہوگی۔''

اس نے لمبی سانس لی۔ ''اچھا تو یہ تم ہو۔ یہ تو چنگا ہی کیا کہ خود چل کر آ گئے ہو۔''

میں نے اطمینان سے کہا۔ ''دیکھو اگر تمہاری قمیص کے نیچے پستول وغیرہ ہے تو وہ مت نکالنا۔ میں نہیں چاہتا کہ تم فائر مار کر مجھے زخمی یا ''اِنّا للہ'' کرو اور قانون کے ہتھے چڑھ کر لمبے ٹائم کے لیے اندر ہو جاؤ۔ ہاں اگر اپنا دوسرا شوق پورا کرنا چاہو تو کوئی حرج نہیں۔''

''کیا بکواس کر رہے ہو؟'' وہ پھنکارا۔ اس کا ہاتھ بدستور قمیص کے نیچے ہی تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اسلحے کی موجودگی کے باوجود میرا اطمینان اسے خوف زدہ کر رہا ہے۔ میں اس کے نزدیک ایک معمولی ڈرائیور تھا اور اپنی اوقات سے بڑھ کر بات کر رہا تھا۔

''میں نے ابھی سب کچھ سن لیا ہے اکبرے! تو میری دو چار ہڈیاں توڑنا چاہتا ہے ناں...... اور مجھے یہ سزا منظور ہے۔ لیکن اس سے زیادہ کی اجازت میں تمہیں نہیں دوں گا۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

میں نے ہاتھ میں پکڑا ہوا مضبوط لاٹھی نما ڈنڈا اُسے تھما دیا اور کہا۔ ''لے بھئی، اپنا بدلہ لے لے تو۔ میرا یقین رکھ۔ میں تجھے نہیں روکوں گا۔ نہ تجھ پر جوابی وار کروں گا، لے پکڑ لے۔''

''تیرا ناٹک میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔'' وہ بدستور غصیلے لہجے میں بولا۔

''یہ ناٹک نہیں ہے۔ میں سچ مچ اس بات کے لیے تیار ہوں کہ تو اپنا پرسوں والا بدلہ اتار لے۔''

وہ مجھے گھور کر دیکھتا رہا پھر اس نے لاٹھی نما ڈنڈا گھما کر دور پھینک دیا۔ تنک کر بولا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ تم چھپ کر ہماری باتیں سن رہے تھے؟''

''سن رہا تھا تو پتا چلا ہے ناں کہ تم مالک کی بیٹی سے محبت کرتے ہو اور اسی وجہ سے پرسوں والی بات پر افسوس بھی ہو رہا ہے۔ تمہیں کافی چوٹیں آئی ہیں۔''

''مطلب کی بات کرو۔'' وہ پھنکارا۔

''مطلب کی بات بھی کروں گا۔ پہلے تم سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔''

''کس بات کی معافی؟'' اس کا انداز بدستور

الانے والا تھا۔ تاہم اب اس نے اپنا ہاتھ قمیص کے نیچے سے نکال لیا تھا۔

''اس بات کی معافی کہ تمہیں چوٹیں لگیں۔ اسپتال جانا پڑا۔'' میرے لہجے میں لجاجت تھی۔

وہ ابھی تک اکڑا اکڑا تھا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے چند نرم فقرے بولے۔

وہ ذرا دھیما پڑا تو میں نے کہا۔ ''مجھے دشمن نہ سمجھو۔ میں نے بشیر صاحب کے گھر کا نمک کھایا ہوا ہے۔ ان کی بیٹیوں کو بہنوں کی طرح عزت دیتا ہوں۔ اگر شازیہ تمہیں چاہتی ہے اور تم بھی اسے پسند کرتے ہو تو پھر اس طرح چھپ چھپ کر ملنا کسی طور ٹھیک نہیں۔ میں تم دونوں کی مدد کر سکتا ہوں۔''

میرے آخری فقرے سے اس کی آنکھوں میں چمک سی نمودار ہوگئی۔

قریباً پندرہ بیس منٹ بعد میں اور اکبر گاؤں سے کچھ فاصلے پر درختوں کے نیچے گھاس کے ایک قطعے پر چادر بچھائے بیٹھے تھے، قریب سے ہی پانی کا کھالا گزر رہا تھا۔ ہوا میں ہلکی سی خنکی تھی۔ اب اکبر کافی بے تکلفی سے بات کر رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''میں پھر کہتا ہوں، میرے دل میں کوئی چور نہیں اس لیے مجھے کوئی ڈر بھی نہیں۔ لیکن شازیہ کے گھر والوں سے رشتے کی بات میں خود تو نہیں کرسکتا۔ یہ بات تو میرے بڑوں نے کرنی ہے۔ بھائی جان نے کرنی ہے یا پھر والدہ نے کرنی ہے اور بھائی جان برادری سے باہر کبھی تیار نہیں ہوں گے۔ انہوں نے تو جیسے قسم کھائی ہوئی ہے۔ والدہ کو بھی ان کی بات ماننا پڑتی ہے کیونکہ وہی سارا گھر چلاتے ہیں......''

''تو پھر اکبر! تم کیوں اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہوتے؟''

وہ ذرا اداسی سے بولا۔ ''میں نے تمہیں بتایا ہے ناں کہ قسمت ساتھ نہیں دے رہی۔ ایف اے والوں کو نوکری کہاں ملتی ہے، اپنا ہی کام کرنا پڑتا ہے۔ سوڈا واٹر بنانے کا کام بڑی محنت اور ہمت سے شروع کیا تھا۔ جگہ لی تھی، مشینیں لے کر آیا تھا...... ماں بے چاری نے کچھ ادھار دیا تھا، وہ بھی لگا دیا مگر پچھلے سال جو سیلاب آیا اس نے سب برباد کر دیا۔ مشینیں بھی لوہے کے بھاؤ بیچنا پڑیں۔''

اکبر سے ڈیڑھ دو گھنٹے کی گفتگو میں، میں نے نتیجہ نکالا کہ لڑکا ذرا خودسر اور غصیلا ضرور ہے لیکن نیت کا برا نہیں۔ محنت کرنا چاہتا ہے شازیہ کو کچھ بن کر دکھانا چاہتا ہے لیکن فی الحال قسمت ساتھ نہیں دے رہی۔ بڑے بھائی کا بہت رعب ہے اور اس نے دبا کر رکھا ہوا ہے۔

میرے دل نے گواہی دی کہ اگر مناسب طریقے سے اس کی کوئی مالی مدد ہوسکے تو وہ چند مہینوں میں ہی کچھ کر کے دکھا سکتا ہے۔ میں نے اسے اشارہ دیا کہ میں ایک ایسے شخص کو جانتا ہوں جو باہمت نوجوانوں کے ساتھ تعاون کرتا ہے۔ کاروبار میں لگانے کے لیے انہیں بہت تھوڑے منافع پر سرمایہ فراہم کرتا ہے۔ میں نے کہا۔ ''اکبر! اگر تم کہو تو میں تمہارے لیے اس سے بات کر کے دیکھتا ہوں۔''

وہ دل گرفتہ انداز میں بولا۔ ''لیکن وقاص بھائی! میرے پاس گروی وغیرہ رکھنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔''

''اس کا بھی کوئی حل نکل آئے گا۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

☆☆☆

اگلے روز میں نے صبح دس بجے کے قریب ایک عجیب تماشا دیکھا۔ میں فون پر سجاول اور خورسنہ سے بات کر رہا تھا۔ بات ختم کر کے کمرے سے نکلا تو کالے رنگ کی کئی بڑی بڑی گاڑیاں دندناتی ہوئی گاؤں میں داخل ہو رہی تھیں۔ ان کی آمد سے پہلے ہی راتوں رات راستہ ہموار اور درست کر دیا گیا تھا۔ مقامی پولیس کے باوردی اہلکار بھی یہاں وہاں چوکس کھڑے تھے۔ ان میں گارڈ کے لوگ بھی تھے۔

یہ گاڑیاں سیدھی چوہدری دین محمد صاحب کے گھر کے عین سامنے رکیں۔ یہاں چونے سے لائنیں وغیرہ ڈالی گئی تھیں۔ دو لگژری جیپوں میں سے قیمتی لباسوں والی کئی خواتین اتریں۔ ان میں سے کچھ کافی فربہ اندام بھی تھیں۔ دیگر گاڑیوں سے بھی لوگ اترے۔ چوہدری دین محمد اور گاؤں کے چوہدری عظمت رندھاوا نے بڑے تپاک سے مہمانوں کو خوش آمدید کہا۔ وہ ان کے راستے میں جیسے بچھے جا رہے تھے۔

''یہ دارابی ہیں۔'' ہاشو نے میرے پہلو میں کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''وہ جو شلوار قمیص اور کالی واسکٹ والا گورا چٹا لڑکا نظر آرہا ہے، وہ شکیل داراب صاحب کا چھوٹا بھرا ہے، دیکھا ہے کیسی شان ہے اس کی۔ دارج نام ہے اس کا۔''

ہاشو ٹھیک کہہ رہا تھا۔ چھبیس ستائیس سال کا وہ نوجوان دراز قد تھا اور شکل میں شکیل داراب سے کافی ملتا تھا۔

میں نے کہا۔ ''ہاشو! یہ کس چکر میں آئے ہیں؟''

''چن جی، چکر کا تمہیں بتایا تو تھا۔ دین محمد صاحب کے ستارے بڑے اُونچے جا رہے ہیں۔ جن کے گھر گورنمنٹ مہمان آ جائے ان کو پھر کس بات کی کمی ہوتی ہے۔''

چند ہی لمحوں میں مہمان دین محمد کی حویلی کے اندر چلے گئے۔ چار پانچ کالی گاڑیوں کے پاس بس ان کے ڈرائیور اور مسلح گارڈز وغیرہ کھڑے رہ گئے۔ میرا سینہ جیسے سلگنے لگا۔ شاید قسمت پھر اپنا چکر چلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اب تک میں تاجور سے اس لیے دور تھا کہ مجھے اپنے حالات سے پیچھا چھڑانے کا کوئی طریقہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ٹیکساری گینگ میری جان کو آیا ہوا تھا۔ اب میری زندگی نے ایک نئی اور حیران کن کروٹ لی تھی اور یہ کروٹ مجھے پھر تاجور کے گاؤں میں اور اس کی گلی میں لے آئی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ اب تاجور کے ساتھ ایک نہایت دلکش زندگی میری دسترس میں آ سکتی ہے۔ اب میں تاجور سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اسے بتانا چاہتا تھا کہ میں زندہ ہوں...... میں یہاں ہوں۔ میں اپنے جسم اور اپنی روح میں کچھ نئے ارادے لے کر یہاں پہنچا تھا۔

میں بے قراری سے اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا۔ میں نے ہاشو کی بہن انوری سے بھی اس بارے میں سن گن لینے کی کوشش کی۔

وہ بولی۔ ''یہ وڈے لوگوں کے وڈے معاملے ہیں۔ ہم غریبوں کو کیا پتا۔''

''مگر باجی انوری تمہیں تو آتی جاتی ہوا بھی گھروں کے اندر کی خبریں دے جاتی ہے۔''

میری تعریف نے اسے خوش کیا، بولی۔ ''لگتا ہے وہی چوہدری دین صاحب کی دھی رانی والا معاملہ ہے۔ یہ لوگ پنڈ کی سیر کے بہانے چوہدری دین کی دھی تاجور کو دیکھنے ہی آئے ہیں۔ رشتہ پکا کرنے سے پہلے سیانے لوگ ایسے ہی ایک دو پھیرے لگا کر اپنی تسلی کرتے ہیں۔''

غالباً انوری کی بات درست ہی تھی۔ یہ لوگ گاؤں کی سیر بھی کرنا چاہ رہے تھے۔ گاؤں کے باغ اور مزار کی طرف کسی مرد کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ خیر باغ کی سیر کو تو وہ لوگ نہیں گئے لیکن مزار دیکھنے چلے گئے۔ گاڑیوں کے اندر سے چڑھاوے کی بڑی بڑی طشتریاں اور چادریں وغیرہ نکالی گئیں۔ مزار کی قبر کو پھولوں کے عرق سے دھوئے جانے کا پروگرام بھی تھا۔ اس مقصد کے لیے پلاسٹک کے بڑے بڑے ''کینوں'' میں لاہور سے عرق بھر کر لایا گیا تھا۔ جب یہ سامان گاڑیوں سے اتارا جا رہا تھا میں اور ہاشو بھی قریب ہی کھڑے تھے، میں نے ہاشو کو اشارہ کیا اور لپک کر ایک وزنی کین اپنے کندھے پر رکھ لیا، ہاشو نے بھی ایک طشتری سر پر اٹھا کر اس رضاکارانہ خدمت میں حصہ لیا۔ یوں ہیلپرز کی حیثیت سے ہم مزار کے احاطے میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے اور ایک طرف مؤدب بیٹھ گئے۔ اس حصے کو ایک قنات کے ذریعے باقی احاطے سے علیحدہ کیا گیا تھا۔

کچھ دیر بعد مہمانانِ گرامی بھی پہنچ گئے۔ دارج داراب نے اپنے چوڑے شانوں پر سیاہ شال پھیلا رکھی تھی اور اس کی شان و شوکت دیکھنے کے قابل تھی۔ اس کے ارد گرد فیملی کے دوسرے لوگ تھے۔ ایک سے بڑھ کر ایک خوب صورت اور بارعب۔ ان میں فربہ جسم کی ایک ادھیڑ عمر خاتون نمایاں نظر آتی تھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کہ دارج کی والدہ تھی۔ اس کے جسم پر قیمتی زیورات تھے۔ ہمیں یہ سارا منظر مزار کی جالی میں سے نظر آ رہا تھا۔ وہ سب لوگ مزار کی دوسری جانب تھے۔ دین محمد صاحب اور گاؤں کے چوہدری عظمت رندھاوا صاحب کی فیملی کی کچھ عورتیں بھی میزبانوں کی حیثیت سے ارد گرد موجود تھیں۔

اور پھر دو طرفہ جالیوں سے گزر کر میری نگاہ تاجور پر پڑی۔ وہ ایک خاموش تصویر کی طرح دکھائی دیتی تھی۔ ک[illegible] کلر کی اوڑھنی میں اس کے چہرے کی دلکش سادگی نما[illegible] ہو رہی تھی۔ اس کی حالت اب پہلے سے کافی بہتر دکھائی [illegible] تھی، قبر کے تعویذ کو دھویا جا چکا تھا۔ پھر اس پر کئی چادریں چڑھائی گئیں۔ میں نے دیکھا، اس دوران دارج کی والدہ گاہے بگاہے بڑی شفقت کے ساتھ تا[illegible] سے بات بھی کرتی رہی...... تب ایک فقیر عورت نے [illegible] لگائی۔ ''بادشاہواں دیاں مراداں پوریاں ہوون اللہ [illegible] مبارک گھڑیاں دکھائے......''

ایک اور عمر رسیدہ فقیرنی بولی۔ ''رب کرم کرے بلاواں مصیبتاں دور کرے، ہر بھیڑی نظر توں بچائے۔''

میں نے دیکھا دارج کی دبنگ والدہ نے اپنے پرس میں ہاتھ ڈالا اور پانچ پانچ سو کے کئی نوٹ نکا[illegible] انہیں پہلو میں کھڑی دو لڑکیوں کے سر پر وارا اور ایک [illegible]

قد ملازم کے حوالے کر دیا۔ ان دو لڑکیوں میں سے ایک تو دارج کی بہن لگتی تھی دوسری تاجور تھی۔ دراز قد ملازم نوٹ لے کر برآمدے میں چلا گیا۔ فقیرنیاں اور ان کے بچے اس پر ٹوٹ پڑے، اس نے نوٹ ہوا میں اچھال دیے۔

دوسری طرف دارج کی والدہ نے تاجور کو اپنے ساتھ لگایا اور محبت سے اس کا سر چوما۔ عین اس وقت میری نگاہ دارج داراب پر پڑی، وہ کن انکھیوں سے تاجور کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بڑی فدا ہو جانے والی نگاہ تھی۔

میں نے دانت پیسے اور دل ہی دل میں کہا۔ ”تجھے تو دیکھ لوں گا بچو۔“

جب وہ لوگ دعا کر رہے تھے تب بھی میں نے آنکھیں جالی سے لگا رکھی تھیں اور تاجور کو دیکھ رہا تھا۔ شال کے ہالے میں اس کا چہرہ گلاب کے سفید پھول کی طرح تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ وہ نہ جانے کیا پڑھ رہی تھی؟ کیا سوچ رہی تھی؟ کیا ان لمحوں میں اس کے ذہن کے کسی گوشے میں، میں بھی موجود تھا۔ اگر موجود تھا تو اس نے میرے لیے دعا کی ہوگی؟ دعا کے دوران میں دارج داراب کی ترچھی نگاہیں تاجور کی طرف ہی رہیں۔

”میری طرف دیکھو تاجور! میں یہاں ہوں۔“ میں نے دل ہی دل میں کہا۔

”ہاں دیکھو تاجور...... میں یہاں ہوں۔ میں آ گیا ہوں۔ تمہارا شاہ زیب۔ تمہارے لیے...... صرف تمہارے لیے۔ دیکھو میری طرف...... جالیوں کے پار دیکھو۔ میں مزار کی دوسری طرف کھڑا ہوں...... دیکھو تاجور......“

میں نے بہت دفعہ پڑھا تھا کہ ٹیلی پیتھی کے اثرات ہوتے ہیں۔ خیالات لہروں کی طرح سفر کرتے ہیں اور ایک ذہن سے دوسرے ذہن تک پہنچتے ہیں۔ میں اسی ٹیلی پیتھی کو آزمانے کی بچکانا کوشش کر رہا تھا۔ تاجور نے اس وقت تو... میری طرف نہیں دیکھا لیکن جب تھوڑی دیر بعد لنگر کھولنے کے بعد لاہور کے مہمان واپس دین محمد صاحب کے گھر کی طرف روانہ ہوئے تو مجھے یوں لگا کہ دور سے تاجور کی نظر مجھ پر پڑی ہے...... اور دو لمحوں کے لیے میرے چہرے پر ٹھہری ہے۔ یقیناً یہ میرا وہم ہی تھا۔ اس بدلی ہوئی شکل کے ساتھ اور اتنی دور سے وہ مجھے کہاں پہچان سکتی تھی۔

سہ پہر کے وقت لاہور کے یہ وی آئی پی مہمان واپس روانہ ہو گئے۔ علاقے کے چوہدریوں اور زمینداروں نے بہت سی مقامی سوغات ان کے ساتھ روانہ کی تھیں۔ گاؤں کا اصل چوہدری تو عظمت رندھاوا تھا، مگر ان گھڑیوں میں اس کا رتبہ دین محمد صاحب سے کہیں کم دکھائی دے رہا تھا۔ شام کے وقت جب ہاشو کی بہن انوری روٹیاں پکانے کے لیے ڈیرے کا تندور گرم

قارئین متوجہ ہوں

پرچا نہیں ملتا

پچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر چا دستیاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

رابطہ اور مزید معلومات کے لیے

ثمر عباس 0301-2454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
سسپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں
35802552-35386783-35804200
ای میل: jdpgroup@hotmail.com

کر رہی تھی، میں نے اس سے سن گن لی۔

اس نے کہا۔ ”لگتا ہے کہ اپنے دین محمد صاحب کی دمی رانی لاہور کی بیگموں کو پسند آ گئی ہے۔“

”کیا مطلب؟ بات پکی ہو گئی ہے؟“

”پکی تو نہیں ہوئی پر کچی بھی نہیں رہی۔ وہ جو بڑی بیگم تھیں وہ بڑے پیار سے بولتی رہی ہیں دین محمد صاحب کی دمی کے ساتھ۔ جاتے جاتے اپنے ہاتھ کی ایک انگوٹھی اتار کر تاجور کی انگلی میں ڈال گئی ہیں۔ ایک طرح سے یہ اس بات کا اشارہ ہوتا ہے کہ اب بات آگے چلے گی اور پکی انگوٹھی بھی پہنائی جائے گی۔“

”وہ خوش تھی؟ میرا مطلب ہے جس کو انگوٹھی پہنائی گئی؟“

انوری نے تندور میں لکڑیاں جھونکتے جھونکتے مجھے گھورا۔ ”وے تو ڈرائیور ہے، اپنی ڈرائیوری کر۔ تو اتنی معلومات کیوں لے رہا ہے؟“

”مجھے پتا چلا ہے کہ تم جس لڑکی کی بات کر رہی ہو، اس کا رشتہ اپنے مالک بشیر صاحب کے بیٹے سیف سے طے تھا؟“

”ہاں طے تو تھا؟“ انوری نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”پر اب مہینے ہو گئے ہیں کہ کچھ اتا پتا نہیں اس کا۔ کوئی کب تک جوان دمی کو گھر میں بٹھائے گا۔“

”پھر بھی دین محمد صاحب کو انتظار تو کرنا چاہیے۔ انہوں نے زبان دی ہوئی ہے۔“

”تم بات تو ٹھیک کر رہے ہو، پر یہ جو لاہور والے ہیں۔ یہ بہت ہی وڈے لوگ ہیں۔ ہماری سوچ سے بھی زیادہ وڈے ہیں اور وہ جو وڈی بیگم صاحبہ ہیں وہ تو کوئی مہارانی لگتی ہیں۔ اگر انہوں نے ارادہ کر ہی لیا تو پھر بھلا ان کے سامنے کس کی پیش چلنی ہے؟“

”تو اپنے بشیر صاحب چپ ہو کر بیٹھ جائیں گے؟“ میں نے پوچھا۔

”کچھ پتا نہیں لیکن مالک بڑے دکھی نظر آ رہے ہیں۔ ابھی مسجد سے نماز پڑھ کر نکل رہے تھے۔ آنکھیں لال سرخ ہو رہی تھیں۔ مجھے لگتا ہے کہ روتے رہے ہیں۔“

”ان کو دین محمد صاحب سے کھل کر بات کرنی چاہیے۔ آخر انہوں نے زبان دی ہوئی ہے۔“

”مجھے شک پڑتا ہے کہ وہ بات کریں گے آج۔“ انوری نے تندور کے دھوئیں میں آنکھیں میچتے ہوئے جہاندیدہ لہجے میں کہا۔

کچھ دیر بعد میں نے بھی بشیر صاحب کو ڈیرے پر دیکھا۔ وہ بہت غم زدہ دکھائی دے رہے تھے۔ وہ پہلے ہاشو کو آوازیں دیتے رہے، وہ کہیں گیا ہوا تھا، پھر مجھ سے بولے۔ ”وقاصے، ذرا بیٹھک کی جھاڑ پونچھ کر دے، کسی نے آنا ہے۔“

”جی مالک۔“ میں نے ادب سے کہا۔

میرے ذہن نے اطلاعی گھنٹی بجائی کہ ممکن ہے آنے والے تاجور کے اباجی دین محمد صاحب ہی ہوں۔

میں نے بیٹھک میں جا کر جھاڑ پونچھ کی اور صفائی کرتے ہوئے ایک اور کام بھی صفائی سے کر دیا۔ اپنا ننھا سا اسپائی کیمرا بھی وہاں رکھ دیا۔ ایک پرچھتی پر کچھ آرائشی چیزیں پڑی تھیں۔ رنگ دار پتھروں والی ایک چھوٹی سی رنگین چائی پر میں نے وہ 4 ملی میٹر کا ریسیور چپکا دیا اور باہر آ گیا۔ یہ کیمرا میری زندگی میں بہت اہم ہو چکا تھا۔

اس شام تو کوئی مہمان آیا اور نہ کوئی میٹنگ ہوئی لیکن اگلے روز شام کے فوراً بعد اسی کمرے میں چوہدری دین محمد اور چوہدری بشیر اکٹھے ہوئے اور ان کے درمیان چونکا دینے والی بات چیت ہوئی۔ میں نے اپنے اسمارٹ فون کو اس کام کے لیے پہلے سے چارج اور تیار کر رکھا تھا۔ کمرے میں چونکہ ٹریکٹر ڈرائیور حاکم بھی لیٹا ہوا تھا اس لیے میں تاریکی میں کھڑے لوڈر میں چلا گیا اور فون پر دونوں کی گفتگو سننے لگا۔

کمرے میں روشنی بہت کم تھی اور کیمرے کا رخ بھی مناسب نہیں تھا۔ تصویر نہیں آ رہی تھی مگر دونوں کی آوازیں صاف تھیں۔ چوہدری بشیر بڑے دکھی انداز میں کہہ رہا تھا۔ ”یہ امید نہیں تھی مجھے تم لوگوں سے...... اور تم سے تو بالکل نہیں دین محمد۔ اللہ نہ کرے...... اللہ نہ کرے میرا پتر مر نہیں گیا، گم ہی ہے ناں، آج نہیں تو کل...... کل نہیں پرسوں اس نے آ جانا ہے۔ تمہیں اس کی ماں پر بھی ترس نہیں آ رہا جو پہلے ہی بستر سے لگی ہوئی ہے۔“

”میری پوری بات سنو بشیر۔“ دین محمد نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ”اور یہ بات سننے کے لیے تم کو اپنا دل بہت بڑا کرنا پڑے گا۔“

”میرا دل بڑا ہی ہے، تمہارا چھوٹا ہے جو وڈے لوگوں کو دیکھ کر بے ایمان ہو رہے ہو۔ اپنی زبان سے

رہے ہو......"

"محمد بشیر...... محمد بشیر...... تمہیں اصل بات کا پتا نہیں ہے۔ تمہیں نہیں پتا اصل بات کا۔" دین محمد صاحب نے گلوگیر آواز میں کہا اور پھر چند لمحے بعد توقف سے بولے۔ "ذرا دل بڑا کر کے سنو۔ میں تمہیں شروع سے ساری بات بتاتا ہوں۔ تمہارا سیف کبھی بھی بہاولپور نہیں گیا تھا بلکہ وہ پاکستان میں ہی نہیں تھا۔ وہ پہلے میانوالی سے آگے لیہ گیا تھا اور پھر وہاں سے ایک کمینے کے ساتھ بردنائی چلا گیا تھا...... بردنائی کا نام سنا ہوا ہے تم نے؟"

چوہدری بشیر، دین محمد صاحب کی سنی ان سنی کرتے ہوئے بولا۔ "میرے دل کو کچھ ہو جائے گا دین محمد! مجھے بتاؤ میرے سیفی کے بارے میں تمہارے پاس کیا خبر ہے، کیا ہوا ہے میرے بچے کو۔"

دین محمد صاحب بہت بوجھل آواز میں بولے۔ "کاش...... مجھے تم کو یہ خبر نہ سنانی پڑتی۔ میرا کلیجا غم سے پھٹ رہا ہے محمد بشیر...... پر میں کیا کروں۔ میرے چپ رہنے سے سچ بدل تو نہیں جائے گا...... تیرا پُتر...... تیرا پُتر......اب اس دنیا میں نہیں ہے محمد بشیر۔"

ایک دم کمرے میں دہاڑوں کی آوازیں گونجیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ چوہدری بشیر اکلوتے جوان بیٹے کے بارے میں اندوہناک خبر سن کر دھاڑیں کھا رہا تھا اور دین محمد اسے شاید سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ چوہدری بشیر کی آواز بار بار میرے سیل فون کے اسپیکر پر ابھرتی تھی۔ "نہیں یہ جھوٹ ہے۔ کسی نے تمہیں غلط بتایا ہے......" یہ ہنگامہ بڑی مشکل سے سرد ہو پایا۔ لیکن اس دوران میں کسی اور کی آواز سنائی نہیں دی۔ شاید آواز دوسروں تک نہیں جا رہی تھی یا دونوں بزرگوں نے کسی دوسرے کو اس طرف آنے سے منع کر دیا تھا۔

"لو تھوڑا سا پانی پی لو۔" دین محمد صاحب کی آواز ابھری۔

چوہدری بشیر نے شاید ایک آدھ گھونٹ ہی لیا ہوگا پھر دل فگار آواز میں بولا۔ "میں یہ کیسے مان لوں، اس کا خط آیا تھا۔ بہاولپور سے اس کے تحفے لے کر......"

"وہی بدبخت تو اس ساری مصیبت کی جڑ تھا۔" دین محمد صاحب نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ "اسی کمینے کے ساتھ مل کر سیفی لیہ پہنچا تھا اور پھر بردنائی۔ مجھے پتا تھا محمد بشیر تمہیں میری بات پر آسانی سے یقین نہیں آئے گا۔ میں ایک گواہ بھی لے کر آیا ہوں اپنے ساتھ۔ لیکن میں ایک بار پھر کہوں گا۔ یہاں میرے اور تیرے درمیان جو گل بات ہو، وہ باہر نہ نکلے۔ نہیں تو دونوں گھروں کا بڑا نقصان ہو جائے گا۔"

چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں آئیں۔ دین محمد صاحب نے کسی کو پکارا تھا۔ تب اندازہ ہوا کہ جس کو پکارا گیا تھا، وہ آ گیا ہے اور اب بند کمرے میں چوہدری بشیر اور دین محمد صاحب کے علاوہ بھی کوئی موجود ہے۔ پھر فون کے اسپیکر کے ذریعے اس کی آواز مجھ تک پہنچی۔ میں نے پہچان لیا۔ یہ سیفی کا لنگوٹیا دوست صدیق تھا۔ (میں جب سیفی کی طرف سے تحفے لے کر سیفی کے گھر جانا چاہ رہا تھا تو صدیق سے میری ملاقات ہوئی تھی اور اس نے بڑی رازداری سے مجھے بتایا تھا کہ وہ جانتا ہے سیفی بردنائی میں ہے) اب کافی دنوں سے صدیق سکھیرا میں موجود نہیں تھا، تاہم دین محمد صاحب نے گواہی کے لیے اسے کہیں سے ڈھونڈ نکالا تھا۔

صدیق کی گواہی کے بعد چوہدری بشیر کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا کہ دین محمد صاحب کی طرف سے دی جانے والی اندوہناک خبر پر یقین کر لے۔ چوہدری بشیر کی حالت بری ہو رہی تھی۔ صدیق کو پھر کمرے سے باہر بھیج دیا گیا تھا۔

کچھ دیر بعد دین محمد صاحب نے آہستہ آہستہ چوہدری بشیر کو تفصیل بتانا شروع کی۔ وہ نہایت گمبھیر لہجے میں بولے۔ "وہ بدذات منڈا پتا نہیں کس طرح دھی رانی تاجور کے پیچھے پڑ گیا تھا پرلے درجے کا غنڈا تھا۔ ہماری بھیڑی قسمت کہ وہ ایک دن تاجور کے پیچھے یہاں پنڈ میں بھی پہنچ گیا...... یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی اور کام سے آیا ہو...... میں تم سے کچھ بھی چھپا نہیں رہا بشیر جو کچھ بھی مجھے پتا ہے، صاف صاف بتا رہا ہوں۔"

چند سیکنڈ کے توقف کے بعد دین محمد صاحب نے کہا۔ "ہمارے پنڈ کے کچھ منڈوں کے ساتھ اس شاہ زیب نام کے منڈے کی لڑائی ہوئی وہ بڑا کپا پیٹھا بدمعاش تھا اور مرن مٹی چڑھی ہوئی تھی۔ اس اکیلے نے پنڈ کے منڈوں کو مارا۔ ان میں ہمارا سیفی بھی تھا۔ کچا ذہن تھا چارے کا۔ اس نے اسے کوئی بڑا استاد سمجھا اور اس کے پیچھے گڈی لے کر لیہ جا

پہنچا۔''

چوہدری دین محمد صاحب نے ایک بار یہ رُوداد شروع کی تو چند باتوں کو حذف کر کے آخر تک سنا ڈالی۔ لیّہ میں عزت مآب ریان فردوس کا عیاشی محل ...... لیّہ سے ہمارا پاکستان سے باہر جانا پھر تاجور کو برونائی پہنچانا تاکہ وہ مجھ کو اپنے ساتھیوں کا پتا بتانے پر آمادہ کرے۔ ایک ٹاپو پر سیفی کی موت اور علاقے میں ہونے والی خونی لڑائی۔ دین محمد صاحب نے رازداری کی شرط پر تقریباً ساری باتیں چوہدری بشیر کے گوش گزار کر دیں۔ یہ سب کچھ بتاتے ہوئے انہوں نے ایک دانا شخص کی طرح دو باتوں کا خاص خیال رکھا۔ ایک یہ کہ تاجور کو برونائی اور جاباجی پہنچانے والی حرکت کا الزام براہِ راست داراب فیملی پر نہ آئے اور دوسرا یہ کہ اس خبیث غنڈے سے (یعنی مجھ سے) تاجور کی مکمل بے رخی ثابت ہو۔

اس ساری گفتگو کے دوران میں گاہے بگاہے چوہدری بشیر کی آہ و بکا بھی سنائی دے جاتی تھی۔

☆☆☆

ہنڈی کے ذریعے میں نے جو خطیر رقم منگوائی تھی وہ میری دسترس میں تھی بلکہ اس میں سے کافی ساری میرے بیگ کے پیندے میں موجود تھی۔ میں اس میں سے ایک معقول اماؤنٹ شازیہ کے محبوب اکبر تک پہنچانا چاہتا تھا۔ اس کے لیے میں نے سجاول سے فون پر بات کر لی تھی اور اسے آمادہ کر لیا تھا کہ وہ اپنے پیٹرول پمپ والے دوست یونس کو فرضی فنانسر کی حیثیت سے اکبر کے گاؤں بھیجے گا اور یونس ایک عام سا اسٹامپ پیپر سائن کروا کے رقم اکبر کو دے دے گا۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد، میرے سینے پر سیفی کے حوالے سے جو بھاری بوجھ تھا، اس میں تھوڑی سی کمی واقع ہو گئی۔ سیف کے زندہ نہ ہونے والی اندوہناک خبر چوہدری بشیر نے ابھی خود تک ہی محدود رکھی ہوئی تھی اور اس کا ثبوت یہ تھا کہ ان کے گھر میں اب تک سب نارمل تھے۔ یقیناً شفقت بی بی کی نازک حالت چوہدری بشیر کو بھی ڈراتی تھی۔ بہرحال ایک نہ ایک دن تو انہیں سچائی کا سامنا کرنا ہی تھا۔

وہ ایک بڑی خوشگوار رات تھی۔ ستمبر کا آغاز ہو رہا تھا۔ ہوا میں لطیف سی خنکی تھی۔ حبس اور پسینے سے جان چھوٹ چکی تھی۔ سرِشام مجھے انوری کی زبانی پتا چلا تھا کہ دین محمد صاحب کسی بزرگ کی فوتیدگی پر اچانک گوجرانوالہ چلے گئے ہیں۔ تاجور کی والدہ اور ایک عزیزہ بھی ساتھ ہی گئی تھیں۔ دین محمد صاحب کے حویلی نما مکان پر پولیس کے تین اہلکار تھے۔ ان میں سے بھی دو ایک موٹر سائیکل پر سوار دین محمد کے ساتھ چلے گئے تھے۔ میرے دل میں ایک ترنگ سی جاگی۔ پتا نہیں کیوں ان لمحوں میں، میں نے ایک عرصے بعد خود کو ایک کھلنڈرے نوجوان کی طرح آزاد اور پُرجوش محسوس کیا۔

میرا دل چاہا کہ تاجور کو دیکھوں۔ گاؤں کے اکثر لوگ ابھی چھتوں پر سوتے تھے۔ وہ بھی چھت پر ہی سوتی تھی۔ اس کے گھر کے عقب میں پہنچ کر چھت تک چلے جانا میرے لیے چنداں مشکل نہیں تھا۔ عجب عاشقانہ سا موڈ تھا۔ میں نے تصور میں دیکھا وہ تاروں کی چھاؤں میں اپنی رنگین چارپائی پر سیدھی لیٹی ہے۔ اس شہزادی کی طرح سوئی پڑی ہے جس کے کومل جسم میں سیکڑوں سوئیاں پیوست ہیں۔ میں ان سوئیوں کو اپنی پلکوں سے چن کر اسے زندہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ پھر اسے بتا رہا ہوں کہ وہ زندہ ہے اور میں بھی زندہ ہوں۔

ایک عجیب سا بہاؤ تھا جس میں بہہ کر میں اس گلی میں پہنچ گیا۔ رات کے گیارہ بجے کا عمل تھا۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ گارڈ مکمل طور پر اُلّو کا پٹھا تھا۔ داخلی گیٹ کے قریب چارپائی ڈالے اونگھ رہا تھا۔ چوکیدار کو بھی ''اُلّو کا پٹھا'' کہا جاسکتا تھا کیونکہ وہ دور کسی گلی میں صدا لگا کر بتا رہا تھا کہ میں گاؤں کے اس حصے میں ہوں، دوسرے حصے میں اگر کسی نے کوئی کارروائی ڈالنی ہے تو اطمینان سے ڈال لے۔

میں نے آسانی سے بیرونی دیوار پھاندی اور پلک جھپکتے میں اس چھت پر پہنچ گیا جہاں وہ موجود تھی۔ میں جی بھر کر اسے دیکھ سکتا تھا۔ رنگین پایوں والی نواڑی چارپائی پر چھوٹا اسفند اس سے لپٹ کر سویا ہوا تھا۔ راحیل دوسری چارپائی پر تھا۔ دائیں طرف ایک اور چارپائی پر تنومند گھریلو ملازمہ خراٹے لے رہی تھی۔ میں محبت کی تصویر کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک وہ ہوا جو میں نے ہرگز سوچا نہیں تھا...... تاجور نے کروٹ لی اور میری طرف رخ کیا۔

خونریزی اور بربریت کے خلاف
صف آرا نوجوان کی کھلی جنگ
باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیے

سکے کی چوری

تمکین رضا

اس کے گھر میں چوری ہوئی... اور چور رنگے ہاتھوں گرفت میں آبھی گیا... مگر اس کے باوجود کیس حل نہ ہوا... سراغ رساں اس معمے کو حل کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے کہ اصل مجرم کون ہے؟

اس چوری کی روداد جس میں دو پڑوسی ملوث تھے...

خاموش الارم اس بات کی اطلاع تھی کہ کوئی ٹھگ جورڈن مارش کے نواحی گھر میں زبردستی گھس گیا ہے۔

جب پولیس افسر وہاں پہنچا تو دیکھا کہ دو افراد جورڈن مارش کے نواحی مکان کے عقبی صحن میں ایک ٹوٹی ہوئی کھڑکی کے پاس کھڑے اس کا انتظار کر رہے تھے۔

"میرا نام ڈگبائی ڈونے ہے۔" پہلے شخص نے بتایا۔ "میں جورڈن کا ہمسایہ ہوں۔ میں نے اس شخص کو زبردستی اس کے گھر میں گھستے اور اس کا بیش قیمت کلوپیٹرا کوائن چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا ہے۔"

"اسے میں نے رنگے ہاتھوں پکڑا ہے۔" دوسرے شخص نے جواباً کہا۔ "میرا نام کینی جانسن ہے اور میں جورڈن کا دوسرا پڑوسی ہوں۔"

"ایک وقت میں ایک شخص بولے۔" پولیس افسر نے کہا۔ "پہلے تم بتاؤ مسٹر ڈگبائی۔"

"جورڈن ایک ماہ کے لیے باہر گیا ہوا ہے۔" ڈگبائی گویا ہوا۔ "اس نے اپنے مکان کی چابی دینے کے ساتھ الارم کا کوڈ بھی بتادیا تھا۔ ہر پانچویں دن اس کے پودوں کو پانی دینا ہوتا ہے۔ مجھے آج سہ پہر یہ کام کرنا تھا اور میں جورڈن کے گھر کے داخلی دروازے کا تالا کھولنے کے مرحلے میں تھا کہ میری نگاہ اندر پڑی۔ کینی لیونگ روم میں موجود تھا اور ڈسپلے کیبنٹ سے پلاسٹک کا وہ چھوٹا فریم اٹھا رہا تھا جس میں جورڈن کا بیش قیمت اور نادر کلوپیٹرا سکہ رکھا ہوا تھا۔ اتنے میں کینی نے مجھے دیکھ لیا اور دوڑتا ہوا کچن میں چلا گیا۔ میں مکان کے عقبی حصے کی طرف بھاگا اور اسے عقبی صحن میں جالیا۔"

"یہ جھوٹ ہے۔" کینی نے کہا۔ "میں دوسری منزل پر واقع اپنے دفتر میں تھا۔ جب میں نے شیشہ ٹوٹنے کی آواز سنی تو باہر کی طرف جھانک کر دیکھا۔ ڈگبائی، جورڈن کے کچن کے دروازے کے پاس عقبی صحن میں موجود تھا۔ اس نے یقیناً اس وقت ہی کھڑکی کا شیشہ توڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں جورڈن کے بیش قیمت کلوپیٹرا کوائن کا پلاسٹک ہولڈر دکھائی دے رہا تھا۔ میں سیڑھیوں پر سے دوڑتا ہوا نیچے پہنچا اور اس سے پہلے کہ وہ عقبی صحن سے نکل جاتا، میں نے اسے حیران کردیا۔ یہ یقیناً اس چابی سے دروازہ کھول کر اندر گیا ہوگا جو جورڈن نے اسے دے رکھی تھی۔ اس نے اندر جا کر کلوپیٹرا کوائن چوری کیا اور خود پر سے شبہ ہٹانے کی خاطر کھڑکی کا شیشہ توڑ دیا جیسے کہ یہ حرکت کسی اور نے کی ہو۔"

پولیس افسر جورڈن مارش کے مکان میں داخل ہو گیا۔ اس کو ڈسپلے کیبنٹ میں ایک خالی جگہ دکھائی دی جیسے وہاں سے کوئی چیز اٹھائی گئی ہو۔ دھوپ سے روشن کچن کے دروازے کے پاس ایک گملا رکھا ہوا تھا۔

پولیس افسر نے اس گملے کا جائزہ لیا۔ گملے کی مٹی خشک تھی اور پودے کے ہرے بھرے لمبے شاداب پتے تاریک لیونگ روم کی جانب جھکے ہوئے تھے۔ دوبارہ صحن میں جانے کے بعد پولیس افسر نے دیکھا کہ صبح ہونے والی بارش سے جگہ جگہ گیلی مٹی کے دھبے پڑے ہوئے تھے اور پتھریلی روش پر جابجا جوتوں کے نشانات موجود تھے۔

دونوں افراد یعنی ڈگبائی اور کینی اصرار کررہے تھے کہ ان کی تلاشی لے لی جائے لیکن پولیس افسر نے تلاشی لینے سے انکار کردیا۔ "مجھے تم میں سے کسی کی بھی تلاشی لینے کی ضرورت نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ تم میں سے کون جھوٹ بول رہا ہے۔"

پولیس افسر سمجھ گیا تھا کہ جب دونوں ہی افراد اپنی تلاشی دینے پر رضامند تھے تو اس کا مطلب صاف ظاہر تھا کہ وہ نادر کلوپیٹرا سکہ ان میں سے کسی کی بھی تحویل میں نہیں تھا اور چونکہ ان میں سے کوئی بھی جورڈن کے مکان کے احاطے سے باہر نہیں گیا تھا اس لیے سکہ یقیناً یہی کہیں موجود تھا اور کہیں چھپادیا گیا تھا۔

پولیس افسر نے یہ بات نوٹ کی تھی کہ پودے کو پانی نہیں دیا گیا تھا اور گملے کی مٹی خشک پڑی تھی۔ اس نے یہ بات بھی نوٹ کی تھی گملے کا پودا روشن کچن کی کھڑکی کے بجائے تاریک لیونگ روم کی جانب جھکا ہوا تھا چونکہ پودے قدرتی طور پر دھوپ کی جانب جھکتے ہیں اس لیے پولیس افسر سمجھ گیا کہ کسی نے حال ہی میں گملے کو کھسکایا ہے۔ یقیناً وہ نادر قدیم سکہ اس گملے کے نیچے چھپایا گیا تھا۔

پولیس افسر نے کینی کو تفتیش کے لیے حراست میں لے لیا۔

کینی نے پولیس افسر کو یہی بتایا تھا کہ جب شیشہ ٹوٹنے کی آواز سن کر اس نے دوسری منزل پر واقع اپنے دفتر سے باہر جھانکا تھا تو اس وقت ڈگبائی جورڈن کے کچن کے دروازے کے پاس عقبی صحن میں موجود تھا اور اس کے ہاتھ میں جورڈن کے بیش قیمت کلوپیٹرا کوائن کا پلاسٹک ہولڈر دکھائی دے رہا تھا، سراسر ایک جھوٹ تھا۔

کینی کو بالآخر نادر سکہ چوری کرنے اور اسے گملے کے نیچے چھپانے کے جرم کا اعتراف کرنا پڑا۔

جاگیر کے اسیر

محمد یاسر اعوان

زر... زن... زمین کی ازلی تکون نے ہمیشہ انسان کے ارادوں... خوابوں اور محبتوں کو مسمار کیا ہے... دشمنی کرنے کے باوجود ارادوں کی پختگی اور پُرجوش محبت کا سر چشمہ بدستور جاری و ساری رہتا ہے... یہ اور بات کہ اس کی رفتار سست اور تیز ہوتی رہتی ہے... ایک ایسی ہی مثلث کے گرد گھومتی کہانی جس کے تینوں زاویے مستقل مزاجی سے متحرک و مستعد تھے...

جاگیر کے شیطان صفت اسیروں کی یکجائی کا عبرت ساماں ماجرا......

سفید سنگِ مرمر سے بنی اس حویلی میں رات کا کھانا عموماً آٹھ بجے کھالیا جاتا تھا اور یہ دستور پرانی حویلی سے اب تک جوں کا توں بغیر کسی بڑی تبدیلی کے چلا آرہا تھا۔

اس رات گرمی کچھ زیادہ تھی اس لیے نائلہ کھانے سے فارغ ہوکر حویلی کے باغ میں ٹہلنے چلی گئی۔ اگر اُسے یہ معلوم ہوتا کہ وہاں ثاقب اس کی آمد کا منتظر ہے تو وہ یقیناً

اپنے کمرے میں جانے کو ترجیح دیتی۔ ثاقب اس کے چچا چوہدری حشمت علی کا اکلوتا بیٹا تھا اور جاگیردارانہ مزاج اور خصوصیات میں بالکل اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چل رہا تھا۔ چوہدری حشمت کے بارے میں عزیز اور رشتے دار ہی نہیں، پوری جاگیر کے لوگ جانتے تھے کہ وہ اپنی جوانی کے زمانے میں بڑا رنگین مزاج رہ چکا تھا۔ اسی آوارگی کے باعث ان کے بڑے بھائی چوہدری نثار علی نے انہیں نہ صرف حویلی بلکہ اپنی جاگیر سے بھی نکال دیا تھا اور یہ جلاوطنی کم و بیش پندرہ برس کے بعد اس وقت ختم ہوئی جب چوہدری نثار علی اچانک دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔

ثاقب پچھلے ایک ہفتے سے اس کوشش اور موقع کی تلاش میں تھا کہ اسے کسی طرح نائلہ سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع مل جائے۔ چوہدری نثار کی وفات کے بعد جاگیر ان کے دو بچوں نائلہ اور کاشف کی قانونی ملکیت تھی لیکن نائلہ گریجویٹ ہونے کے باوجود لڑکی تھی اور سولہ سالہ کاشف بھی میٹرک کا طالب علم تھا۔ دونوں ہی جاگیر کے نظم و نسق کو سنبھالنے سے قاصر تھے۔ یہی وجہ تھی کہ باپ کے چالیسویں کے دن جب چوہدری حشمت نے اچانک حویلی میں آکر آنسو بہاتے ہوئے نائلہ کو اپنے گلے سے لگایا تو وہ بھی چچا کی پذیرائی کرنے پر مجبور ہوگئی پھر بظاہر چوہدری حشمت بھی بہت بدل گئے تھے۔ انہوں نے داڑھی رکھ لی تھی، نماز پڑھنے لگے تھے۔ بیوی کو گھر میں آباد کرلیا تھا۔ پرانے وفاداروں نے بھی نائلہ کو یہی رائے دی کہ اس وقت زمینوں کو سنبھالنے کے لیے چوہدری حشمت کی موجودگی ضروری ہے اور جب چھوٹے چوہدری آئے تو ان کی بیوی اور اکلوتا بیٹا ثاقب بھی حویلی میں ہی آباد ہوگئے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ چوہدری حشمت نے ابھی تک جاگیر کا انتظام بڑی خوش اسلوبی سے سنبھال رکھا تھا۔

نائلہ ٹہلتی ہوئی باغ میں داخل ہوئی تو اسے گمان بھی نہیں تھا کہ وہاں ثاقب اس کی تاک میں بیٹھا ہے۔ وہ ثاقب کی آوارہ مزاجی اور خود کو دوسروں پر بڑی بے غیرتی کے ساتھ مسلط کرنے کی کوشش سے عاجز تھی۔ اس کے دل میں اپنے چچا زاد کے لیے نفرت بڑھتی جارہی تھی مگر وہ اسے اس لیے برداشت کر لیتی تھی کہ چوہدری صاحب کو بُرا نہ لگے۔ جاگیر کا انتظام ہاتھ میں لینے کے بعد سے وہ اندر، باہر ہر چیز پر حاوی ہوگئے تھے۔ بلاشبہ وہ اپنی حیثیت یاد رکھتے تھے۔ ہر ضروری بات میں نائلہ سے مشورہ کرتے تھے مگر نائلہ کبھی کبھی سوچنے لگتی تھی کہ اپنے چچا کو حویلی میں جگہ دے کر، جاگیر کا منتظم بنا کر اس نے کوئی غلطی تو نہیں کی؟

باغ میں رات کی رانی اور کھلی ہوئی کلیوں کی مہکتی خوشبو اور ساتھ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے بہت خوشگوار لگ رہے تھے۔ نائلہ پندرہ بیس منٹ تک ٹہلتی رہی اور پھر پھولوں کے ایک کنج میں سبزے پر لیٹ گئی۔ ثاقب نے یہاں بھی ہوشیاری سے کام لیا۔ وہ نائلہ کے باغ میں قدم رکھتے ہی سامنے نہیں آیا تھا بلکہ انتظار کرتا رہا کہ نائلہ ٹہلنے سے تھک کر کہیں بیٹھ جائے۔ وہ آتے ہی اس کا راستہ روکتا تو قوی امکان تھا کہ نائلہ وہیں سے حویلی میں لوٹ جاتی۔ اس نے نائلہ کو بیٹھتے دیکھا تو چند لمحے توقف کے بعد بڑے اطمینان سے کنج کی طرف بڑھنے لگا۔

قدموں کی آہٹ سن کر تو نائلہ نے چونک کر نظر اٹھائی۔ باغ میں روشنی کا انتظام گھر کی طرح تو نہیں تھا پھر بھی محرابی دروازے پر لگے ہوئے بلب کی روشنی اتنی کافی تھی کہ اس نے دور ہی سے ثاقب کو آتے دیکھ لیا اور ایک احساسِ ناگوار کے ساتھ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ثاقب کو کھانے کی میز سے غائب پا کر اس نے یہی سوچا تھا کہ ثاقب اپنے آوارہ گرد دوستوں کے ساتھ کہیں نکل گیا ہے اور اب رات کے بارہ بجے سے پہلے گھر میں قدم نہیں رکھے گا۔

"میں اس وقت خدا سے کچھ اور بھی مانگ لیتا تو مل جاتا۔" ثاقب نے مسکرا کر قریب آتے ہوئے کہا۔ "معلوم ہے، میں یہی دعائیں کرتا آرہا تھا کہ خدا کرے تم مجھے باغ میں مل جاؤ۔"

"صبح سے میری بائیں آنکھ پھڑک رہی تھی۔" نائلہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ "دن بھر دھڑکا لگا رہا کہ اللہ جانے کیا مصیبت آنے والی ہے۔ شام ہوئی تو قدرے اطمینان ہوا کہ شاید آفت ٹل گئی۔ خاص طور سے اس لیے کہ آپ بھی گھر میں موجود نہیں تھے، لیکن اب ایسا لگتا ہے کہ بُری گھڑی سے مفر نہیں، وہ کسی وقت بھی آسکتی ہے۔"

"آج تم کچھ بھی کہہ لو، میں بُرا نہیں مانوں گا۔" ثاقب نے ڈھٹائی سے ہنستے ہوئے کہا۔

"کیوں، آج کیا خاص بات ہے؟" نائلہ نے پوچھا۔

"میں تم سے ایک نہایت ضروری بات کہنا چاہتا ہوں۔" ثاقب نے کہا۔ "اجازت ہو تو بیٹھ جاؤں؟"

"ضرور بیٹھیے مگر پانچ چھ گز کے فاصلے پر۔" نائلہ نے جواب دیا۔ "اور اس طرح کہ ہوا آپ کو چھو کر مجھ تک نہ پہنچے۔"

''اتنی دور بیٹھوں گا تو بات کیسے کروں گا؟'' ثاقب نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''تو مت کیجیے۔'' نائلہ بولی۔

''واہ...... پھر فیصلہ کیسے ہوگا؟''

''کیسا فیصلہ؟'' نائلہ کچھ چونکی۔

''میرے اور تمہارے مستقبل کا۔'' ثاقب نے سنجیدہ ہونے کی کوشش کی۔ ''دیکھو نائلہ! میں جانتا ہوں کہ تم ایک بڑی جاگیر کی مالک ہو، مجھ سے زیادہ پڑھی لکھی ہو لیکن محبت کسی اونچ نیچ، کسی امتیاز کو نہیں مانتی۔ میں تمہیں پسند کرتا ہوں، تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اس وقت ہمارے خاندان میں میرے سوا کوئی اور لڑکا تمہارے قابل نہیں ہے۔ اگر تم نے خاندان سے باہر شادی کی تو یہ وسیع جاگیر ہمارے خاندان سے نکل کر غیروں کی ملکیت بن جائے گی۔ اس جاگیر کو قائم رکھنے کے لیے ہماری خاندانی روایت یہ رہی ہے کہ جاگیر کا مالک بڑا لڑکا ہوتا ہے اور اس کی شادی خاندان میں کی جاتی ہے۔ یہاں اتفاق سے تم بڑی ہو اور کاشف چھوٹا ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ ایسی صورت میں قانونی پوزیشن کیا ہے لیکن تم مجھ سے شادی کرلو تو کوئی اُلجھن یا مشکل پیش نہیں آسکتی۔''

''میں اس موضوع پر آپ سے کوئی گفتگو کرنا نہیں چاہتی تھی۔'' نائلہ بھی سنجیدہ ہوگئی۔ ''لیکن آپ نے بات چھیڑ دی ہے تو جواب دینا ضروری ہوگیا ہے، تاکہ آپ کو اگر کوئی غلط فہمی ہے تو دور ہو جائے۔ میں اپنی یا کاشف کی شادی کے معاملے کو جاگیردارانہ مصلحتوں سے الگ رکھنا چاہتی ہوں۔ اس کے لیے ضروری ہوا تو میں کاشف کے حق میں یا کاشف میرے حق میں جاگیر سے دستبردار ہوسکتا ہے اس لیے آپ جاگیر کی فکر میں دبلے نہ ہوں۔ رہا آپ کی پیشکش کا جواب! تو میں اس حیثیت سے آپ کو پسند نہیں کر سکتی۔ آپ میرے چچازاد بھائی ہیں اور میرا مشورہ ہے کہ بس اسی رشتے پر قناعت کریں۔''

''کیا اس لیے کہ دوسرے رشتے کے لیے تم نے کسی اور کو پسند کرلیا ہے؟'' ثاقب کے لہجے میں طنز تھا۔

''ایسا ہی سمجھ لیں۔'' نائلہ نے بے پروائی سے کہا۔

''کیا میں اُس خوش نصیب کا نام پوچھ سکتا ہوں؟''

''جی نہیں۔'' نائلہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ میرا ذاتی معاملہ ہے اور میں اپنے نجی معاملات میں کسی کو بھی مداخلت کی اجازت نہیں دے سکتی۔''

''تم کیا سمجھتی ہو کہ دوسرے تمام لوگ اندھے ہیں؟''

''کیا مطلب؟''

''یہ کہ تمہارے بتائے بغیر بھی میں جانتا ہوں کہ وہ کون ہے۔'' ثاقب نے جواب دیا۔ ''اور مجھے تمہاری حماقت پر ترس آتا ہے۔ اس شاخ پر آشیانہ بنانا چاہتی ہو جہاں پہلے ہی کسی نے گھونسلا بنا رکھا ہے۔''

''میں نہیں جانتی کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' نائلہ اٹھنے لگی۔ ''اور نہ ہی جاننا چاہتی ہوں۔''

''بیٹھ جاؤ۔'' ثاقب نے درشت لہجے میں کہا۔ ''آج تم میری پوری بات سنے بغیر نہیں جاسکتیں۔''

اپنی تمام حوصلہ مندی کے باوجود نائلہ ایک لڑکی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ثاقب ایک آوارہ مزاج اوباش نوجوان ہے اور وہ اس وقت باغ میں اس کے ساتھ تنہا بیٹھی ہے۔ اس نے ثاقب کے انداز میں کوئی ایسی ہی بات محسوس کی کہ وہ کچھ سہم کر بیٹھ گئی۔

''تمہارا بچپن شرجیل کے ساتھ کھیلتے گزرا ہے۔'' ثاقب نے پھر کہا۔ ''اس ساتھ کی بنیاد پر تمہیں یہ خوش فہمی ہے کہ اگر تم اسے پسند کرتی ہو تو وہ بھی تمہیں چاہتا ہے۔ بچپن اور لڑکپن کے بارے میں، میں کچھ نہیں کہہ سکتا، کیونکہ اس وقت میں یہاں موجود نہیں تھا مگر پچھلے دو تین برسوں میں جو کچھ میں نے دیکھا اور سنا ہے، اس کی بنا پر یہ اچھی طرح جانتا ہوں کہ شرجیل کو یونیورسٹی میں پڑھنے والی ایک لڑکی کومل سے محبت ہے۔ وہ دونوں ہر جگہ ہمیشہ ساتھ ساتھ دیکھے جاتے ہیں، کومل بھی ایک بڑے باپ کی بیٹی ہے۔ شہر میں رہتی ہے۔ اس کے والدین شرجیل کو جانتے ہیں۔ اس کا ان کے گھر میں آنا جانا ہے، ممکن ہے پہلے کبھی بچپن میں شرجیل تم میں دلچسپی رکھتا ہو لیکن جب سے وہ یونیورسٹی گیا ہے اور وہیں شہر میں، ہوسٹل میں رہتا ہے، تم اس کے دل و دماغ سے قطعی طور پر نکل چکی ہو۔''

''میں اس بکواس کے ایک لفظ پر بھی یقین کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔'' نائلہ غصے اور جوش میں کھڑی ہوگئی۔

''مت کرو مگر یہ حقیقت ہے۔'' ثاقب بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ ''تمہیں اس دن ہوش آئے گا جب شرجیل تمہیں ٹھکرا کر کومل سے شادی کرے گا۔ اس کے علاوہ تم ایک اور اہم بات بھی بھول رہی ہو۔''

''وہ کیا؟''

''شریفاں پھوپی کو بزرگوں نے خاندان سے باہر نکال دیا تھا۔ کیونکہ انہوں نے والدین کے طے کردہ رشتے کو مسترد کر کے اپنی پسند سے شادی کر لی تھی۔ یہ سچ ہے کہ

جب ان کے شوہر کا انتقال ہو گیا تو تایا ابا...... تمہارے ابو، عزیزوں کی مرضی کے بغیر انہیں گاؤں لے آئے۔ حویلی کے قریب ان کے رہنے کے لیے مکان بنوا دیا۔ ان کی اور ان کے اکلوتے بیٹے شرجیل کی ہر طرح سرپرستی کی اور آج شرجیل ان کی مہربانیوں کے طفیل علم کی سیڑھی پر اتنی بلندی پر جا پہنچا ہے، مگر ان تمام باتوں کے باوجود نہ خاندان والوں نے شریفاں پھوپی کو معاف کیا ہے اور نہ پھوپی صاحبہ اپنے دل کے زخموں کو بھول سکی ہیں۔ انہیں تو یہ بھی شبہ ہے کہ پھوپا کی موت حادثہ نہیں تھی بلکہ اس میں کچھ خاندان والوں کا ہاتھ تھا۔ ایسی صورت میں نہ وہ اپنے بیٹے کی شادی خاندان میں کرنا چاہیں گی اور نہ ہی خاندان والے ایسی کسی شادی کو برداشت کریں گے، خواہ وہ جاگیردار کے گھر میں ہی کیوں نہ ہو۔''

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ کو میرے مستقبل کے بارے میں اتنی فکر ہے۔'' نائلہ نے بڑے طنز سے کہا۔

''مجھے نہیں ہوگی تو اور کسے ہوگی؟'' ثاقب مسکرایا۔

''آخر میں تمہارے چچا کا بیٹا ہوں۔ میں تمہیں اور جاگیر کو نہ تو برباد ہوتے دیکھ سکتا ہوں اور نہ ہی غیروں کے قبضے میں جاتے ہوئے۔''

''میرا نام لینے کا تکلف کیوں کر رہے ہو۔'' نائلہ کا لہجہ بدستور طنزیہ تھا۔ ''صرف جاگیر کیوں نہیں کہتے......''

''تم اسے جو چاہو سمجھو لیکن حقائق جاننے کے بعد ٹھنڈے دل سے غور کرو گی تو تمہیں اس سے بہتر کوئی اور حل نظر نہیں آئے گا، جس کی پیشکش میں ابھی کر چکا ہوں۔''

''اچھی بات ہے تو پھر میرے دل کے ٹھنڈے ہونے کا انتظار کیجیے۔'' نائلہ نے کہا اور آگے چل دی۔

''ضرور...... ضرور۔'' ثاقب خوش ہو گیا۔ ''کب تک ٹھنڈا ہو جائے گا؟''

''جب اس میں زندگی کی حرارت باقی نہ رہی۔'' نائلہ نے سرد لہجے میں جواب دیا۔

ثاقب کے چہرے سے غصے کی سرخی نمودار ہونے لگی۔ وہ قدم بڑھا کر نائلہ کے قریب پہنچ گیا۔ ''کیا میں یہ سمجھوں کہ میرے اس قدر سمجھانے کا تم پر کوئی اثر نہیں ہوا؟'' وہ بولا۔

''اتنی دیر میں آپ نے ایک یہی عقلمندی کی بات کی ہے۔'' نائلہ محرابی دروازے سے باہر نکل چکی تھی۔ سامنے حویلی کی عمارت نظر آ رہی تھی۔ ارادے کے باوجود ثاقب اسے یہاں زبردستی روکنے کی کوشش نہیں کر سکتا تھا۔ وہ چند قدم تیزی سے آگے بڑھا مگر پھر رک گیا اور غصے کے عالم میں مٹھیاں بھینچ کر اسے جاتا دیکھتا رہا۔

☆☆☆

نائلہ نے اس وقت تو ثاقب کی باتوں کو بے پروائی ظاہر کر کے ٹال دیا تھا مگر دل ہی دل میں وہ محسوس کر رہی تھی کہ ثاقب تمام تر غلط بیانی سے کام نہیں لے رہا تھا۔ جب سے شرجیل نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا، وہ خود بھی اس کے طرزِ عمل میں ایک انجانی سی تبدیلی دیکھ رہی تھی۔ وہ اور شرجیل بچپن کے ساتھی تھے۔ ایک ساتھ کھیل کر جوان ہوئے تھے، ہر چند ان کے درمیان کبھی پسند و ناپسند کے موضوع پر بات نہیں ہوئی تھی مگر نائلہ کا خیال تھا کہ شرجیل اس کے ساتھ ایک خاص انسیت رکھتا ہے۔ ایسی چاہت جو رشتے کے بہن، بھائی کی محبت سے الگ تھی مگر جہاں محبت ہوتی ہے، وہاں شک و شبہ بھی ہوتا ہے۔ اب سے پہلے نائلہ نے کبھی اس انداز سے نہیں سوچا تھا لیکن ثاقب کی باتوں کی روشنی میں اس نے گزشتہ دو تین برس کے اندر شرجیل کے طرزِ عمل کا تجزیہ کیا تو اس کے ذہن نے ایسی کئی مثالیں پیش کر دیں جہاں شرجیل کا وہ سلوک نہیں رہا تھا جس کی نائلہ اس سے توقع رکھتی تھی۔ جب اس نے یہ سب کچھ سوچا تو آپ ہی آپ دل میں یہ شبہ ابھرنے لگا کہ اپنی تمام جھوٹی سچی باتوں کے باوجود ثاقب کہیں اس بارے میں سچ ہی تو نہیں کہہ رہا؟ اس کی تصدیق یا تردید شرجیل ہی کر سکتا تھا۔ چنانچہ نائلہ نے فیصلہ کر لیا کہ اس مرتبہ جب وہ چھٹیوں میں حویلی آئے گا تو اس سے اس موضوع پر ضرور بات کرے گی۔ خواہ اسے اس کی بے شرمی ہی کیوں نہ سمجھا جائے۔ عیدِ قرباں قریب ہی تھی، اس لیے یہ موقع بھی جلد ہی آ گیا۔ شرجیل عید کرنے گاؤں آیا اور حسبِ عادت نائلہ سے اسی خلوص اور بے تکلفی کے ساتھ ملا جس طرح اب تک ملتا چلا آیا تھا۔ وہ اس کے لیے ایک خوب صورت ہار اور چوڑیوں کا تحفہ بھی ساتھ لایا تھا۔ ''یہ میری طرف سے تمہارے لیے عید کا تحفہ۔'' اس نے کہا۔

''بہت بہت شکریہ۔'' نائلہ نے ہار اور چوڑیاں لیتے ہوئے جواب دیا۔ ''کتنے دن کے لیے آئے ہو؟''

''بس یہی کوئی پانچ چھ دن کے لیے۔''

''جب سے آپ یونیورسٹی میں گئے ہیں، آپ نے یہاں آنا کم نہیں کر دیا ہے؟'' نائلہ نے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا واقعی! میں نے کبھی خیال نہیں کیا۔'' شرجیل نے

جواب دیا۔

''شاید اس لیے کہ اب آپ کا دل شہر میں زیادہ لگنے لگا ہے۔'' نائلہ بولی۔

''نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' شرجیل مسکرایا۔ ''ہاں یہ ضرور ہے کہ اس مرتبہ میں پہلے سے زیادہ محنت کر رہا ہوں۔ میری کوشش ہے کہ اس بار میں ٹاپ کروں تا کہ مجھے مزید تعلیم کے لیے باہر جانے کا موقع مع وظیفہ مل جائے۔''

''جتنا آپ پڑھ چکے ہیں، کیا وہ کافی نہیں ہے؟'' نائلہ نے پھر سوال کر دیا۔

''میں نے جو خواب دیکھے ہیں، ان کے اعتبار سے ناکافی ہے۔'' وہ بولا۔ ''تم تو جانتی ہو کہ میں نے اور امی نے بڑی عسرت میں زندگی گزاری ہے اور یہ سب اس لیے کہ امی نے بڑی جرأت سے آزادیٔ رائے کا مظاہرہ کیا تھا۔ میں اس رویّے کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا جو خاندان والوں نے اب تک ہمارے ساتھ روا رکھا ہے۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ ایک نہ ایک دن میں اس شان سے گاؤں میں داخل ہوں کہ یہی سب لوگ میری اور میری امی کی عزت کرنے پر مجبور ہو جائیں۔''

''آپ نے شاید کبھی غور نہیں کیا۔'' نائلہ دوسری طرف منہ پھیر کے بولی۔ ''ورنہ یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے دوسرے طریقے بھی ہیں۔''

''ہو سکتے ہیں۔'' شرجیل نے جواب دیا۔ ''مگر میں اپنے دست و بازو سے اپنا مقام بنانا پسند کرتا ہوں۔''

وہ دونوں اس وقت باغ میں بیٹھے گفتگو کر رہے تھے۔ نائلہ کوئی جواب دینا چاہتی تھی کہ اس نے کاشف کو آتے دیکھا۔

''چچا جان آپ کو کھانے کے لیے بلا رہے ہیں۔'' اس نے آتے ہی کہا۔

''اچھا تم چلو، ہم ابھی آ رہے ہیں۔'' نائلہ نے جواب دیا۔

''جلدی آئیں، مجھے بڑے زور کی بھوک لگی ہے۔'' کاشف نے واپس جاتے ہوئے کہا۔

''میں آپ سے ایک ضروری مسئلے پر بات کرنا چاہتی تھی۔'' کاشف کے دور چلے جانے پر نائلہ بولی۔ ''آج شام کو آ سکتے ہیں؟ کل سے تو عید کا ہنگامہ شروع ہو جائے گا۔''

''مجھے بھی تم سے کچھ اہم گفتگو کرنا تھی۔'' شرجیل نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ''مگر شاید یہ آج شام ممکن نہ ہو سکے۔''

''وہ کیوں؟''

''میں امی کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا چاہتا ہوں، ان کی صحت روز بروز گرتی جا رہی ہے۔''

''نور پور تک ہی تو جانا ہے۔'' نائلہ نے کہا۔ ''آپ سہ پہر کو جا کر مغرب تک واپس آ سکتے ہیں۔''

''کوشش کروں گا، وعدہ نہیں کر سکتا۔'' شرجیل نے اٹھتے ہوئے کہا۔

دونوں اپنے اپنے خیالات میں گم حویلی کی جانب چلنے لگے۔ نائلہ پہلے سے کچھ زیادہ مطمئن تھی۔ اس کے لیے یہ بات بڑی خوش آئند تھی کہ شرجیل بھی کسی اہم موضوع پر اس سے بات کرنا چاہتا ہے اور حالات کو دیکھتے ہوئے وہ موضوع ان دونوں کے مستقبل کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا؟

☆☆☆

مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد نائلہ اپنی لائبریری میں چلی گئی۔ اسے کتابوں کا بہت شوق تھا اور اپنے علم اور جنرل نالج میں اضافے کے لیے ہر نوعیت کی کتابیں بڑے شوق سے پڑھتی تھی۔ روپے پیسے کی کمی نہ تھی اس لیے جس کتاب کے بارے میں سنتی یا پڑھتی، شہر سے منگوا لیا کرتی تھی۔ یوں رفتہ رفتہ، اس کے پاس کتابوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ جب وہ سیکڑوں سے تجاوز کر گئیں تو اس نے حویلی کا ایک چھوٹا کمرا خالی کر کے اسے لائبریری کی شکل دے دی اور الماریاں بنوا کر تمام کتابوں کو موضوع کے اعتبار سے یکجا کر کے ان الماریوں میں سجا دیا۔

اس کا دل تو باغ میں جانے کو چاہ رہا تھا تا کہ وہ اپنے پسندیدہ رات کی رانی اور چمپے کے پھولوں کے کنج میں بیٹھ کر شرجیل سے ہونے والی ملاقات کے بارے میں سوچ سکے۔ لیکن اسے اندیشہ تھا کہ ثاقب جو اس کے گرد و پیش منڈلاتا رہتا تھا، کہیں باغ میں نہ آ جائے۔ شرجیل کے بارے میں نہ جانے کیوں اسے یقین تھا کہ وہ اگر ملنے آئے گا تو رات کے کھانے کے بعد ہی نو، دس بجے تک آئے گا۔ چنانچہ وہ لائبریری میں آ گئی۔ دوسروں کو بظاہر مصروف نظر آنے کے لیے اس نے افسانوں کی ایک کتاب نکال لی اور آرام کرسی پر کتاب کھول کر بیٹھ گئی۔ اگرچہ اس کا ذہن کتاب کا کوئی افسانہ نہیں، بلکہ آنے والے دنوں کی داستان پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ابھی اسے بیٹھے ہوئے دس، پندرہ منٹ ہی گزرے تھے کہ کمرے میں ایک چھ، سات سالہ لڑکی داخل ہوئی۔ آہٹ سن کر نائلہ نے چونکتے ہوئے نگاہ اٹھائی اور لڑکی کو پہچان لیا۔ وہ زینت تھی جو گاؤں کے دوسرے بچوں

کے ساتھ صبح کے وقت اس سے قرآن پاک پڑھنے آتی تھی۔

"کیا بات ہے زینت؟" نائلہ نے سنبھلتے ہوئے پوچھا۔ "ماسٹر جی نے یہ کاغذ دیا ہے کہ آپ کو دے دوں۔" زینت نے جواب دیا۔

شرجیل یونیورسٹی جانے سے قبل کئی ماہ تک گاؤں کے پرائمری اسکول میں اعزازی طور سے پڑھاتا رہا تھا، اس لیے گاؤں کے تمام بچے اسے ماسٹر جی کہنے لگے تھے۔ نائلہ کو کچھ حیرت تو ہوئی، وہ شرجیل کو محبت بھرے خطوط لکھنے والے نوجوانوں میں شمار نہیں کرتی تھی اور نہ ہی کبھی آج تک ان دونوں میں کسی قسم کی خط و کتابت ہوئی تھی، پھر بھی اس نے ہاتھ بڑھا کر زینت سے خط لے لیا۔ زینت خط دیتے ہی بھاگ کھڑی ہوئی، جیسے اسے ڈر ہو کہ اب ایک لمحہ بھی ٹھہری تو استانی جی اسے ڈانٹ دیں گی۔

نائلہ نے تیز ہوتی ہوئی دھڑکنوں کے ساتھ لفافے میں سے خط نکالا۔ لفافہ بند نہیں تھا۔ خط جس کاغذ پر لکھا گیا تھا، نائلہ اسے پہچانتی تھی۔ وہ اس قسم کے رائٹنگ پیڈ شرجیل کے پاس دیکھ چکی تھی۔ اس نے تہ کھولی۔ لکھا تھا۔

"ڈیئر نائلہ!

میں تم سے جس موضوع پر بات کرنا چاہتا ہوں، اس کے لیے حویلی میں کوئی بھی جگہ مناسب نہیں ہے۔ وہاں ہر وقت کوئی آسکتا ہے۔ خاص طور سے ثاقب جو تمہارے آگے پیچھے پھرتا رہتا ہے۔ اس لیے میں نے طے کیا ہے کہ ہماری اس یادگار ملاقات کے لیے پرانی حویلی کی شکستہ عمارت سے زیادہ موزوں کوئی اور جگہ نہیں ہوسکتی، چنانچہ تم آج رات بارہ بجے کے بعد پرانی حویلی آجانا۔ میں بڑی بے تابی سے تمہارا انتظار کروں گا۔ مجھے امید ہے کہ تم مجھے مایوس نہیں کروگی...... تمہارا بچپن کا ساتھی......"

"تاکید ہے کہ اس خط کو پڑھنے کے بعد پھاڑ دینا۔"

خط کے آخر تک پہنچتے پہنچتے نائلہ کے دل کی دھڑکن اتنی تیز ہوگئی تھی کہ اس کے خیال میں، اگر اس وقت کوئی اور بھی موجود ہوتا تو ضرور سن لیتا۔ نائلہ نے خط کو بار بار پڑھا اور ہر مرتبہ ایک عجیب سے نشے نے اسے سرشار کردیا۔ ہر چند یہ کوئی محبت نامہ نہیں تھا اور نہ خط کے کسی بھی فقرے میں اظہارِ محبت کیا گیا تھا مگر خط کی عبارت پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ عنقریب ہونے والی ملاقات میں شرجیل اس سے کیا کہنے والا ہے؟

اس نے خط کو تہ کر کے لفافے میں رکھا اور اسے ضائع کرنے کی تاکید کے باوجود وہ لفافہ ایک موٹی سی کتاب کے اندر محفوظ کر دیا۔ یہ کاغذ کا ٹکڑا اس کے خوابوں میں بسے ہوئے خوشگوار مستقبل کی پہلی جھلک تھی۔ وہ اسے کس دل سے ضائع کرتی۔ جہاں تک اس کے نصف شب کے بعد پرانی حویلی جانے کا تعلق تھا تو اس میں کوئی سوچنے والی بات تھی ہی نہیں۔ اسے ہر صورت میں جانا تھا کیونکہ بلانے والا شرجیل تھا۔

☆☆☆

پرانی حویلی گاؤں کے جنوبی کنارے پر واقع تھی۔ نئی حویلی سے اس کا فاصلہ کم و بیش ایک کلومیٹر تھا۔ نصف صدی قبل گاؤں کے قریب بہنے والے دریا میں شدید سیلاب آیا جس کی وجہ سے گاؤں کے کچے مکان ہی تباہ نہیں ہوئے بلکہ قدیم سال خوردہ حویلی کا بیشتر حصہ بھی زمین بوس ہو گیا۔ باڑھ اترنے کے بعد اس وقت کے جاگیردار نے صرف گاؤں کو تقریباً ایک میل ہٹ کر آباد کرنے کا حکم د... بلکہ قدیم حویلی چھوڑ کر، نئی حویلی تعمیر کرائی۔ پرانی حویلی کے بارے میں ان کا ارادہ تھا کہ اس کی شکستہ عمارت کو گرا... وہاں ایک سیکنڈری اسکول بنوا دیں جو نہ صرف اس گاؤں بلکہ آس پاس کے دیہات کے لیے بھی علم کے ایک سرچشمے کا کام کرے۔ مگر ان کے انتقال سے یہ منصوبہ سردخانے میں پڑ گیا۔ بعد میں آنے والے جاگیرداروں نے اس طرف کوئی توجہ نہیں دی اور قدیم حویلی کی عمارت رفتہ رفتہ کھنڈر بن گئی اور پھر جیسا کہ ایسی عمارتوں کے بارے میں ہوتا ہے گاؤں والوں نے اس سے بھوتوں، چڑیلوں کی داستانیں منسوب کرنا شروع کر دیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ رات... رات، دن کے وقت بھی اُدھر کا رخ نہیں کرتے تھے۔

نائلہ رات کے ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے ایک چادر اوڑھ کر حویلی سے باہر نکل آئی۔ اسے ایک ایسا راستہ معلوم تھا جس سے پرانی حویلی کا فاصلہ نصف میل کے قریب رہ جاتا تھا مگر اس کے باوجود رات کے وقت قدیم حویلی تک جانا بڑی ہمت کا کام تھا۔ نائلہ جانتی تھی کہ اگر محبت اسے حوصلہ نہ دیتی تو وہ کبھی اس شکستہ عمارت میں جانے کی جرأت نہ کرسکتی تھی۔

تیز تیز قدموں سے راستہ طے کرتے اور دل ہی دل میں شرجیل اور اس سے ہونے والی باتوں کا تصور کرتے ہوئے وہ تقریباً پچیس منٹ میں پرانی حویلی پہنچ گئی۔ عید کی رات ہونے کی وجہ سے بیشتر گھروں میں لوگ خاص طور سے نوجوان لڑکے، لڑکیاں جاگ رہے تھے مگر یہ اتفاق

تھا کہ اسے راستے میں کوئی بھی نہیں ملا اور نہ ہی کسی نے اُسے پرانی حویلی کی طرف جاتے دیکھا۔

شرجیل نے خط میں لکھا تھا کہ وہ پرانی حویلی میں نائلہ کا انتظار کرے گا مگر حویلی پہنچ کر اِدھر اُدھر تلاش کرنے کے باوجود اسے شرجیل کہیں نظر نہیں آیا۔ نائلہ ایک گرے ہوئے ستون پر بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگی۔ انتظار کرتے ہوئے اسے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ سن کر وہ متوقع انداز میں گھومی تو...... اسے وہاں...... شرجیل کے بجائے ثاقب کھڑا دکھائی دیا۔

''خوب! خوب!'' اس نے آگے قدم بڑھاتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اتنی رات گئے تم یہاں کیا کر رہی ہو؟''

''میں سیر کرنے آئی تھی۔'' نائلہ نے غصے سے جواب دیا۔ ''کیا تم کسی وقت میرا پیچھا نہیں چھوڑ سکتے؟''

''کیسے چھوڑ دوں؟'' ثاقب ہنسنے لگا۔ ''مجھے تمہاری سلامتی اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔''

نائلہ مایوسی اور جھنجلاہٹ میں مبتلا تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ثاقب کو موجود پا کر شرجیل کبھی اس سے ملنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ ایک آخری صورت یہی ممکن تھی کہ وہ ابھی نئی حویلی واپس جائے اور پھر کچھ دیر کے بعد کسی طرح ثاقب کی آنکھ بچا کر دوبارہ آنے کی کوشش کرے۔ یہ سوچ کر وہ چلنے کے لیے کھڑی ہوگئی۔

''کہاں جا رہی ہو؟'' ثاقب نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''اپنے مجنوں کا انتظار نہیں کرو گی؟''

''میں کہہ چکی ہوں کہ میں یہاں سیر کرنے آئی تھی۔'' نائلہ نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ ''لیکن تمہاری موجودگی ہر خوب صورت منظر کو برباد کر دیتی ہے اس لیے واپس جا رہی ہوں۔''

''شرجیل تمہیں بے وقوف بنا رہا ہے نائلہ۔'' ثاقب اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ ''جتنی تم اس کے لیے دیوانی ہو، اگر اس کی آدھی محبت مجھے دو، تو میں تمہاری پوجا کر سکتا ہوں۔''

''مجھے تم سے اپنی پوجا کرانے کا شوق نہیں ہے۔'' نائلہ نے غصے سے کہا۔ ''میرا راستہ چھوڑ دو۔''

''راستہ تو خیر نہیں، البتہ اس وقت تمہیں ضرور چھوڑ دوں گا۔'' ثاقب بولا۔ ''مگر اپنے سوال کا جواب پانے کے بعد۔''

''وہ جواب میں تمہیں کل ہی دے چکی ہوں۔ تم سے

نہیں ہوتا

مودی جی جوش و خروش سے تقریر کر رہے تھے۔ ''ہم نے پورے بھارت میں لاکھوں کھڈیاں بنائیں تاکہ لوگوں کو جنگل اور کھیتوں میں نہ جانا پڑے۔ یہ عورتوں کے لیے تو بہت شرم اور بے عزتی کی بات ہے۔ ہم نے ان کے استعمال پر پانچ روپیہ انعام بھی رکھا ہے مگر سب ویران پڑی رہتی ہیں، کوئی ادھر نہیں جاتا۔ گھر میں ٹوائلٹ بنانے کے پورے دس ہزار دیے ہیں مگر جاہل لوگ نہیں بناتے۔ پُرکھوں کی روایات کے نام پر جنگل، کھیت اور ندی نالوں کو گندہ کرتے ہیں اور تو اور، ریل کی پٹریوں پر بیٹھ جاتے ہیں، سارا ٹریک گندا کر ڈالتے ہیں۔ ان بے وقوفوں کو نہیں معلوم کہ ہم زبردست قوم ہیں۔ بیت الخلا سے بہت آگے نکل کر خلا میں جا گھسے ہیں۔ بس پندرہ بیس برس کی بات ہے، پھر سورج پر ہمارا بھارتی خلاباز اتر رہا ہوگا......'' مودی جوشِ خطابت میں بڑھا نکتے چلے جا رہے تھے کہ انہیں اچانک خاموش ہو جانا پڑا۔

تقریر رک گئی کیونکہ پریس کانفرنس میں ہنسی اور تبصروں کی تیز گونج پھیل گئی تھی۔

''مہاراج! سورج تو آگ سے زیادہ تپتا ہے...... وہاں سب کچھ بھسم ہو جاتا ہے۔ ہمارا آدمی وہاں کیسے اُترے گا؟'' ایک رپورٹر نے حیرت سے پوچھا۔

مودی جی ذرا دیر کو بوکھلائے پھر سنبھل کر اور سینہ تان کر اطمینان سے بولے۔ ''ہمارا شاندار خلائی مشن رات کے سمے سورج پر اترے گا۔ اُس وقت وہ بالکل ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔''

''ہونہہ!'' مودی کے پیچھے بیٹھے ہوئے بھارتی وزیر خارجہ نے سر جھٹک کر دھیرے سے کہا۔ ''کیسے اور کہاں اتاریں گے...... رات کو تو سورج ہی نہیں ہوتا!''

عمرکوٹ سے کرشن لال کا دلچسپ تجزیہ

شادی کرنے کے بجائے میں مرنا زیادہ پسند کروں گی۔''

''یہ تمہارا آخری جواب ہے؟'' ثاقب نے پوچھا۔

''بالکل آخری اور قطعی......'' نائلہ نے بے دھڑک ہو کر جواب دیا۔

''پھر اب تمہیں مرنا ہی پڑے گا۔'' ثاقب نے دانت پیستے ہوئے کہا اور اس کے ساتھ ہی اس نے نائلہ کو اتنی زور سے دھکا دیا کہ وہ سنبھلنے کی کوشش کے باوجود اس گرے ستون سے جا ٹکرائی جس پر چند لمحے قبل بیٹھی تھی۔ اس کا سر بڑے زور سے ستون کے نکیلے کنارے سے ٹکرایا۔ آنکھوں کے سامنے چنگاریاں سی اڑیں، ذہن گہری تاریکی میں ڈوبتا محسوس ہوا اور وہ بے ہوش ہوگئی۔

پھر نہ جانے کتنی دیر کے بعد نائلہ کو ہوش آیا تو اس کے سامنے ثاقب ایک فاتحانہ مسکراہٹ ہونٹوں پر لیے کھڑا تھا۔ نائلہ کے ہوش و حواس پر ایک بجلی سی گری۔ پتا نہیں یہ سر کی چوٹ تھی، اس کا اثر تھا، یا اپنی بربادی کا صدمہ کہ وہ دیوانہ وار قہقہے لگانے لگی۔ یہاں تک کہ اس کے ہذیانی قہقہوں نے ثاقب کو بھی بوکھلا دیا۔ پرانی حویلی گاؤں سے کافی دور تھی مگر اسے خوف ہوا کہ کہیں نائلہ کی چیخیں گاؤں والوں کے کانوں تک نہ پہنچ جائیں۔ اس نے نائلہ کو خاموش کرانے کی بہت کوشش کی، اس کے منہ پر تھپڑ مارے، اسے جھنجوڑا، اور جب اس پر بھی وہ چپ نہ ہوئی تو اس کے مضروب سر پر ایک گھونسا مارا، جس سے وہ پھر بے ہوش ہو گئی۔

اس صورتِ حال نے ثاقب کو خوف زدہ کر دیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اگر نائلہ کو واپس حویلی لے جائے تو اس کی موجودہ کیفیت کا کیا جواز پیش کرے گا اور سرِدست کسی بہانے سے وہ لوگوں کو مطمئن کر بھی دے تو کیا نائلہ ہوش میں آنے کے بعد اس کی درندگی کا راز فاش نہ کر دے گی؟...... بہت سوچنے کے بعد بھی اس گھبراہٹ میں اسے اس کے سوا کوئی اور چارہ کار نظر نہیں آیا کہ وہ اپنے باپ کے پاس جائے اور انہیں سب کچھ بتا کر اس بگڑی بات کو سنبھالنے کے لیے درخواست کرے۔

بے ہوش نائلہ کو اٹھا کر ایک تاریک گوشے میں لٹانے کے بعد وہ حویلی واپس گیا۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ چوہدری حشمت علی اتنی رات گئے تک بھی جاگیر کے حساب کتاب میں الجھا ہوا تھا۔ ثاقب زرد چہرے کے ساتھ گھبرایا ہوا اس کے کمرے میں داخل ہوا تو چوہدری حشمت اسے دیکھتے ہی تاڑ گیا کہ کوئی غیر معمولی حادثہ پیش آگیا ہے۔

''کیا بات ہے؟'' اس نے چونک کر پوچھا۔ ''تم اتنی رات گئے کہاں سے آرہے ہو؟''

''ابا جان! میں ایک بڑی مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔'' ثاقب نے جواب دیا۔ ''اور آپ کے سوا کوئی نہیں ہے جو مجھے اس مصیبت سے نکال سکے۔'' یہ کہہ کر اس نے مختصر الفاظ میں تفصیل بیان کر دی۔ ''میرا خیال تھا کہ اس طرح وہ میرے قبضے میں آجائے گی اور خود کو بے عزتی سے بچانے کے لیے مجھ سے شادی کرلے گی مگر...... مگر وہ تو پاگل ہوگئی ہے۔''

''لیکن وہ اتنی رات گئے پرانی حویلی گئی کیوں تھی؟'' چوہدری حشمت نے پوچھا۔

''مجھے کیا معلوم؟'' ثاقب نے جھوٹ بولا۔

''میرا خیال ہے تم جانتے ہو اور اندازہ تو میں بھی لگا سکتا ہوں۔''

''مگر اب کیا کیا جائے؟'' ثاقب بُری طرح نروس ہو رہا تھا۔

''تم انتہائی احمق نوجوان ہو، میں کب تک تمہیں بچاتا رہوں گا۔''

''پلیز ابا جان۔''

''اچھا، تم یہیں ٹھہرو، میں کوئی راستہ نکالنے کی کوشش کرتا ہوں۔'' چوہدری حشمت نے جواب دیا اور اٹھ کر باہر چلا گیا۔

ثاقب تھکے تھکے انداز میں ایک کرسی پر لڑھک گیا۔ اسے کافی دیر انتظار کرنا پڑا۔ چوہدری حشمت تیس چالیس منٹ بعد واپس آیا۔

''گاؤں میں دو تین آدمی میرے بھروسے کے ہیں۔'' چوہدری نے بتایا۔ ''میں ان کے گھر گیا تھا مگر وہ سب عید کی خریداری کے لیے ابھی شہر سے واپس نہیں آئے۔ نہ جانے کس وقت آئیں۔ اب اس کے سوا کوئی اور چارہ نہیں کہ ہم خود پرانی حویلی جائیں۔ اگر وہ سچ مچ پاگل ہوگئی ہے تو میں لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے کوئی بہانہ سوچ لوں گا اور اگر اس کی کیفیت صدمے کی وجہ سے عارضی طور پر بہکی ہوئی ہے، تو میں نہیں جانتا کہ وہ ہوش میں آکر تمہارے اور میرے ساتھ کیا سلوک کرے گی۔''

''ہم...... ہم اُسے ہوش میں ہی کیوں آنے دیں۔'' ثاقب بولا۔ ''پرانی حویلی کا کھنڈر بہترین قبرستان بن سکتا ہے۔''

''بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ قتل ایک سنگین جرم

ہے۔ میرا تجربہ ہے کہ اس کا ارتکاب کرنے والا اول تو قانون سے ہی نہیں بچ پاتا، اور کسی طرح بچ بھی جائے تو اسے قدرت بڑی عبرت ناک سزا دیتی ہے۔''

''نائلہ کا کچھ نہ کچھ علاج تو کرنا ہی پڑے گا۔'' ثاقب نے کہا۔

''وہ بعد میں اس کی حالت دیکھ کر سوچ لیں گے۔'' چوہدری حشمت نے جواب دیا۔ ''ابھی ہمیں فوراً پرانی حویلی پہنچنا چاہیے۔''

وہ تیز رفتاری سے چلتے ہوئے شارٹ کٹ راستے سے دس منٹ میں ہی پرانی حویلی پہنچ گئے۔ چوہدری حشمت نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ''کہاں ہے، وہ؟'' اس نے سوال کیا۔

''میں اُسے تاریک گوشے میں لٹا گیا تھا۔'' ثاقب نے اشارے سے بتایا۔ دونوں لپک کر وہاں پہنچے مگر نائلہ کا کوئی پتا نہ تھا۔

''کہاں گئی، کہاں جاسکتی ہے؟'' ثاقب نے گھبرا کر کہا۔ ''میں تو اسے اسی جگہ بے ہوش چھوڑ گیا تھا۔''

''تم اپنے ساتھ مجھے بھی برباد کر کے رہو گے۔'' چوہدری حشمت نے غصے سے کہا۔ ''میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو، اسے آس پاس تلاش کرو۔ اگر وہ ہوش میں آکر گاؤں کی طرف نکل گئی ہے تو پھر تمہارا اور میرا خدا ہی حافظ ہے۔''

دونوں باپ، بیٹے ایک گھنٹے تک نائلہ کو حویلی کے کھنڈرات اور گرد و نواح میں دور دور تک تلاش کرتے رہے مگر نائلہ کو نہ ملنا تھا، نہ ملی۔ تھک ہار کر دونوں حویلی میں واپس آگئے۔

''جاؤ اب اپنے کمرے میں جاکر سونے کی کوشش کرو۔'' چوہدری نے کہا۔ ''ابھی صبح ہونے میں تین چار گھنٹے باقی ہیں۔ تم اپنی زبان بالکل بند رکھنا بلکہ طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر کمرے میں ہی رہنا، بہت کم باہر آنا۔ میری سمجھ میں کوئی معقول بہانہ آگیا تو شرجیل اور گاؤں والوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کروں گا۔ ورنہ پھر میں بھی خاموش رہوں گا۔''

☆☆☆

دوسرے دن نائلہ کے غائب ہونے کی خبر پورے گاؤں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ چوہدری حشمت نے اپنی قطعی لاعلمی کا اظہار کیا مگر اپنے دو تین وفاداروں کے ذریعے یہ افواہ ضرور پھیلا دی کہ گزشتہ رات نائلہ کو کسی نوجوان کے ساتھ جو اپنے لباس سے شہر کا رہنے والا معلوم ہوتا تھا، پرانی حویلی کی طرف جاتے دیکھا گیا تھا۔ نوعمر کاشف کو اپنی بڑی بہن سے اس درجہ محبت تھی کہ وہ اس کی گمشدگی کے صدمے سے بے ہوش ہوگیا۔ اس کے لیے قصبے سے ڈاکٹر کو بلانا پڑا جس نے کوئی انجکشن اور دوا وغیرہ دے کر مکمل آرام کرنے کا مشورہ دیا۔

نائلہ کی پُراسرار گمشدگی سے سب سے زیادہ حیرت اور شبہ شرجیل کو تھا۔ اس نے نزدیکی پولیس چوکی میں رپورٹ کردی اور بیان دیا کہ گزشتہ روز دوپہر کو اس کی نائلہ سے آخری ملاقات ہوئی تھی اور اس وقت اس کی باتوں سے اس قسم کا کوئی تاثر نہیں ملتا تھا کہ وہ کہیں جانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس نے نائلہ کے کسی نوجوان کے ساتھ فرار ہونے کے نظریے کو قطعی مسترد کردیا۔

قصبے کے پولیس اسٹیشن کے انچارج انسپکٹر چٹھہ نے حویلی پہنچ کر چوہدری حشمت سے ملاقات کی۔ اس ملاقات کے وقت ثاقب بھی موجود تھا۔

''آپ کے خیال میں نائلہ بیگم کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہوگا؟'' انسپکٹر چٹھہ نے ابتدائی معلومات حاصل کرنے کے بعد پوچھا۔

''میری بیٹی (بھتیجی) تعلیم یافتہ مگر سیدھی سادی طبیعت کی مالک تھی۔'' چوہدری صاحب نے جواب دیا۔ ''اس کا کردار بے داغ اور پاکیزہ تھا۔ اس نے شہر کے کالج میں تعلیم حاصل کی تھی۔ مجھے اندیشہ ہے کہ یا تو کالج میں یا پھر گاؤں میں، کسی چالاک اور چرب زبان نوجوان نے اسے اپنی چکنی چپڑی باتوں سے شیشے میں اتار لیا۔ مقصد ظاہر ہے کہ وہ نائلہ کے ذریعے اس کی جاگیر پر قبضہ کرنے کا خواب دیکھ رہا ہوگا۔ ممکن ہے نائلہ اس سے ملاقات کرنے پرانی حویلی جاتی رہی ہو۔ مگر وہ بدکردار نہیں تھی۔ اس نے اس شخص کو ایک خاص حد سے آگے بڑھنے کا موقع نہیں دیا ہوگا۔ عید کی رات کو بھی وہ اس سے ملنے گئی، اس رات اس شخص کے سر پر شیطان سوار ہوگیا۔ اس نے زبردستی کرنے کی کوشش کی ہوگی، نائلہ نے مزاحمت کی۔ اس کشمکش کا ثبوت پرانی حویلی میں اس مقام پر بھی ملتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس شخص نے قابو پانے کی کوشش میں ناکامی پر یا تو نائلہ کو مار دیا ہے یا پھر اسے زبردستی کہیں لے جاکر قید کردیا ہے۔''

''آپ اس نوجوان کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگاسکتے؟'' انسپکٹر نے سوال کیا۔

''ایک اندازہ تو پیش کرسکتا ہوں۔'' ثاقب بول اٹھا۔

''وہ کیا؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔
''شرجیل، پھوپی شریفاں کا بیٹا۔'' ثاقب نے جواب دیا۔ ''وہ بچپن سے نائلہ کے ساتھ رہا ہے۔''
''ثاقب!'' چوہدری حشمت نے ڈانٹا۔ ''تمہیں بغیر ثبوت کے اس طرح کسی کا نام نہیں لینا چاہیے۔''
''آپ ثاقب کو بولنے دیں، چوہدری صاحب۔'' انسپکٹر چٹھہ نے کہا۔ ''میرا تجربہ ہے کہ بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں کی حویلیوں میں عموماً اس طرح کی سازشیں ہوتی رہتی ہیں۔تم کھل کر بات کرو ثاقب۔''
''میں شرمندہ ہوں۔'' ثاقب نے کہا۔ ''مجھے واقعی اس طرح کسی کا نام نہیں لینا چاہیے تھا۔''
''آپ لوگ تعاون نہیں کریں گے تو پولیس یہ کیس کیسے حل کر سکے گی؟''
''قانون کی مدد کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔'' ثاقب بولا۔ ''لیکن یہ سچ ہے کہ شرجیل کے خلاف میرے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے، صرف ایک اندازہ ہے۔''
''مجھے تمہارے اندازے سے بھی کام کی باتیں معلوم ہوسکتی ہیں۔'' انسپکٹر نے کہا۔ ''آخر کوئی تو وجہ ہوگی کہ تمہارا ذہن شرجیل کی طرف منتقل ہوا؟''
''پہلی وجہ تو یہی ہے کہ گاؤں کے کچھ افراد نے نائلہ کو ایک ایسے نوجوان کے ساتھ دیکھا تھا جس نے شہری لباس پہنا ہوا تھا اور ہمارے گاؤں میں ایسا لباس صرف شرجیل پہنتا ہے۔'' ثاقب نے جواب دیا۔
''دوسری وجہ ایک خاندانی تنازع ہے، برسوں پہلے شریفاں پھوپی کو خاندان سے نکال کر ان کے تمام حقوق ختم کر دیے گئے تھے۔ میرے مرحوم چچا نے شریفاں پھوپی کو پناہ دی، ان کی اور شرجیل کی پرورش اور سرپرستی کی مگر شرجیل اپنی ماں کے ساتھ کیے گئے سلوک کو نہیں بھولا تھا۔ ممکن ہے، نائلہ پر قابو پا کر وہ اپنی ماں کے ساتھ کیے گئے سلوک کا انتقام لینا چاہتا ہو۔''
''ہوں......'' انسپکٹر چٹھہ نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا یہ اندازہ درست بھی ہوسکتا ہے۔ میں ایک بار پھر شرجیل سے ملوں گا۔ کوشش کروں گا کہ جرح کر کے اس کی زبان سے کوئی مفید بات معلوم کر سکوں لیکن جب تک اس کے خلاف کوئی عینی گواہ نہیں ملے گا یا پھر خود نائلہ کو برآمد نہیں کر لیا جائے گا ہم اس پر کوئی مقدمہ قائم نہیں کر سکتے۔''
''انسپکٹر صاحب۔'' چوہدری حشمت نے کہا۔ ''میرا بیٹا جوشیلا اور نوجوان ہے اور نادان بھی ہے۔ آپ اپنی تحقیقات کھلے ذہن کے ساتھ کریں۔ میں ذاتی طور پر کسی کے خلاف کوئی شبہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا۔ یہ نائلہ کی اپنی حرکت بھی ہوسکتی ہے۔''
انسپکٹر چٹھہ نے چوہدری صاحب کو کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ حویلی سے رخصت ہو کر شرجیل کے گھر پہنچا۔ دستک کے جواب میں خود شرجیل نے دروازہ کھولا۔
''میں تم سے کچھ مزید سوالات کرنا چاہتا ہوں۔'' انسپکٹر نے کہا۔
''ضرور آیئے تشریف لائیے۔'' شرجیل نے کہا اور وہ انسپکٹر چٹھہ کو نشست کے کمرے میں لے گیا۔ ''فرمائیے۔'' اس نے بیٹھتے ہوئے کہا۔
''واقعے کی رات کو کچھ گواہوں نے تمہیں نائلہ کے ساتھ دیکھا تھا۔'' انسپکٹر نے کہا۔
''مجھے نہیں، ایک ایسے نوجوان کو جس نے شہری لباس پہن رکھا تھا۔'' شرجیل نے جواب دیا۔ ''بشرطیکہ وہ گواہ سچ بول رہے ہوں جس کا مجھے یقین نہیں ہے۔''
''تمہاری چوہدری خاندان سے کوئی رنجش تو نہیں؟'' انسپکٹر نے دوسرا سوال کیا۔
''نہیں، کبھی میری والدہ کو تھی مگر تایا ابا مرحوم چوہدری نثار علی نے اپنی شفقت اور مہربانیوں سے ان تمام زخموں کو بھر دیا۔ شاید آپ نہیں جانتے کہ میرے والد کے انتقال کے بعد سے انہوں نے ہی ہمارے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔ میں آج جو کچھ ہوں، انہی کی وجہ سے ہوں۔''
''لیکن گاؤں میں ایک خیال یہ بھی ہے کہ تم نائلہ کو ورغلا کر جاگیر پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔''
''مجھے نہیں معلوم کہ میرے خلاف یہ بے بنیاد شبہ کس نے آپ کے ذہن میں پیدا کیا ہے۔'' شرجیل نے بڑے تحمل سے جواب دیا۔ ''لیکن آپ اس نقطہ نظر سے بھی سوچیں تو مجھ سے زیادہ کچھ اور لوگ جاگیر کے حریص نظر آئیں گے۔ ذرا سوچئے! جاگیر کا نظام کس کے ہاتھ میں ہے۔ نائلہ اور کاشف کے بعد کون قانونی طور پر جاگیر کا مالک بن سکتا ہے؟ اگر نائلہ کو غائب کر کے کاشف کو مٹھی میں لے لیا جائے تو کسے جاگیر پر مکمل دسترس حاصل ہوسکتی ہے؟''
''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا سمجھوں اور کیا نہ سمجھوں۔'' انسپکٹر چٹھہ الجھ کر بولا۔ ''دونوں طرف ہی شبہ کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال، میں تحقیقات کے مزید آگے بڑھنے تک کسی کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرنا چاہتا۔''
''میری چھٹیاں ختم ہوگئی ہیں۔'' شرجیل نے کہا۔

''میں کل شہر واپس جا رہا ہوں۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ میں یونیورسٹی کا طالب علم ہوں۔ جب بھی میری ضرورت ہو، مجھے یونیورسٹی کے ذریعے اطلاع کر سکتے ہیں، میں فوراً آجاؤں گا۔''

☆☆☆

کاشف کے دماغ پر نائلہ کی گمشدگی کا اتنا گہرا اثر ہوا تھا کہ وہ ایک ہفتہ بعد بھی نارمل نہ ہو سکا۔ جب بھی اسے ہوش آتا، وہ بہکی بہکی باتیں کرنے لگتا۔ قصبے کا ڈاکٹر اگرچہ بڑی توجہ سے اس کا علاج کر رہا تھا مگر اس کے علاج سے کوئی فائدہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

چوہدری حشمت نے اسے شہر کے کسی اچھے اسپتال میں داخل کرنے کا خیال ظاہر کیا لیکن ان کی بیوی نے اس کی مخالفت کی۔ ان کا کہنا تھا کہ اسپتال میں کسی نہ کسی کو کاشف کے ساتھ رہنا پڑے گا اور حویلی میں کون ہے جو اس کے ساتھ رہ سکتا ہے۔ اس لیے زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ شہر کے کسی بڑے ڈاکٹر کو گاؤں بلا کر کاشف کو دکھایا جائے۔ جتنا بھی خرچہ ہو، کاشف کا علاج گھر پر ہی ہونا چاہیے تاکہ اس کی مناسب دیکھ بھال بھی کی جا سکے اور پھر کیا معلوم کہ شہر میں ایسے مریضوں کو پاگل خانے بھیج دیا جاتا ہو۔ چوہدری حشمت نے اس مشورے سے اتفاق کیا اور شہر کے ایک معروف ڈاکٹر کو جو ذہنی امراض کے اسپیشلسٹ سمجھے جاتے تھے، گاؤں بلا کر کاشف کو دکھایا پھر ان کی تشخیص کے مطابق علاج بھی شروع ہو گیا۔

☆☆☆

اس ایک ہفتے میں پولیس اپنی تمام دوڑ دھوپ کے باوجود نہ تو نائلہ کو برآمد کر سکی تھی اور نہ اس کی پُراسرار گمشدگی کا معما حل کر سکی لیکن ساتویں دن علی الصباح انسپکٹر چٹھہ کو رپورٹ ملی کہ ایک دیہاتی نے گاؤں سے آٹھ میل دور شمال میں واقع ایک چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن سے کچھ آگے ریل کی پٹری پر ایک کٹی ہوئی لاش دیکھی ہے۔ لاش کسی عورت کی معلوم ہوتی ہے۔ انسپکٹر چٹھہ فوراً چار پانچ سپاہیوں کو لے کر موقع پر پہنچا۔ لاش بلاشبہ موجود تھی اور کچھ ایسے عجیب و غریب طریقے سے کسی گزرنے والی ٹرین کے نیچے آئی تھی کہ جسم کے کئی ٹکڑے ہونے کے علاوہ چہرہ بالکل کچل کر اور کٹ کر ناقابلِ شناخت ہو گیا تھا۔ لاش کے کپڑوں اور کٹے ہوئے ہاتھ پاؤں سے یہ اندازہ کرنا کچھ دشوار نہیں تھا کہ وہ کوئی عورت تھی۔ نائلہ کی گمشدگی کچھ اس طرح انسپکٹر چٹھہ کے ذہن پر مسلط ہوئی تھی کہ بظاہر شناخت کی کوئی علامت نہ ہوتے ہوئے بھی وہ لاش کے ٹکڑے سمیٹ کر تھانے پہنچانے کے بعد حویلی پہنچا۔

''ریلوے لائن پر ایک کٹی ہوئی زنانہ لاش ملی ہے۔''

اس نے چوہدری صاحب کو بتایا۔ ''میں یہ نہیں کہتا کہ وہ ضرور ہی نائلہ بیگم کی لاش ہوگی۔ پھر بھی آپ ایک نظر دیکھ لیں تو اچھا ہے۔''

چوہدری صاحب فوراً تیار ہو گئے اور انسپکٹر کے ساتھ قصبے کے پولیس اسٹیشن پہنچے...... لاش کے ٹکڑوں کو غور سے دیکھا اور ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے افسردگی کے عالم میں اثبات میں سر ہلا دیا۔

''یقینی طور پر پہچاننا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے۔'' انہوں نے کمرے سے باہر آتے ہوئے انسپکٹر چٹھہ سے کہا۔ ''پھر بھی لاش کے جسم پر جو کپڑے ہیں وہ نائلہ کے ہی معلوم ہوتے ہیں۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، میں نے اس شام کھانے کی میز پر اسے اسی لباس میں دیکھا تھا۔''

''لباس کے علاوہ کوئی اور شناخت نہیں ہے؟'' انسپکٹر چٹھہ نے پوچھا۔

''ہے، اس کے دائیں ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی۔'' چوہدری صاحب نے جواب دیا۔ ''نائلہ اسی طرح کی انگوٹھی پہنا کرتی تھی۔''

''پھر تو کوئی شک نہیں رہ جاتا کہ یہ لاش نائلہ بیگم ہی کی ہے۔'' انسپکٹر نے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے، چوہدری صاحب کہ وہ اس انجام سے دوچار ہوئیں۔''

''مگر یہ سب ہوا کیسے؟'' چوہدری حشمت نے حیرت سے کہا۔

''میرا اندازہ ہے کہ نائلہ بیگم کے ساتھ جو نوجوان تھا، اس نے انہیں دھوکا دیا، وہ انہیں چھوڑ کر بھاگ گیا۔ نائلہ بیگم نے غیرت اور شرمندگی کے احساس سے مغلوب ہو کر ٹرین کے نیچے آ کر خودکشی کر لی۔''

''شاید یہی بات ہو۔'' چوہدری صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اب آپ لاش لے جانے کی اجازت دیں تاکہ میں اپنی بدنصیب بھتیجی کی تجہیز و تکفین کے فرض سے سبکدوش ہو سکوں۔''

''آپ چاہیں تو لاش ابھی لے جا سکتے ہیں۔'' انسپکٹر چٹھہ نے کہا۔ ''میں غیر ضروری کاغذی کارروائی میں اُلجھ کر آپ کو مزید دکھ دینا نہیں چاہتا۔ خدا آپ سب کو یہ صدمہ برداشت کرنے کی توفیق دے اور مرحومہ کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔''

چوہدری حشمت نے انسپکٹر کا شکریہ ادا کیا اور لاش اپنے ساتھ ہی حویلی لے گیا، جہاں شام ہونے سے پہلے ہی اسے آبائی قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔

☆☆☆

کاشف کی دماغی حالت بدستور اسی طرح چل رہی تھی۔ یوں اس کی جسمانی صحت تو بالکل ٹھیک تھی مگر ذہن نے ابھی تک نائلہ کی موت کو قبول نہیں کیا تھا۔ وہ گاہے بہ گاہے کچھ دیر کے لیے ہوش وحواس کی دنیا میں واپس آتا تو اسی طرح باتیں کرتا، جیسے نائلہ حویلی میں موجود ہو۔ اب چونکہ وہ جاگیر کا واحد وارث اور مالک تھا اور اس کی یہ کیفیت جاگیر کے انتظام وغیرہ میں حارج ہو رہی تھی۔ اس لیے چوہدری صاحب نے نائلہ کے سوئم کے بعد ہائی کورٹ میں درخواست دی کہ انہیں کاشف کا سرپرست اور جاگیر کا منتظم قرار دیا جائے۔

بات بالکل سیدھی تھی۔ ہائی کورٹ نے ڈاکٹروں کے ایک بورڈ سے کاشف کا معائنہ کرایا۔ بورڈ کی رپورٹ کے مطابق کہ کاشف اپنی موجودہ ذہنی حالت میں کوئی بھی ذمے داری سنبھالنے کے قابل نہیں ہے۔ عدالت نے بورڈ کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے چوہدری حشمت علی کو اپنے بھتیجے کاشف کا قانونی سرپرست اور اس کی ذہنی حالت بحال ہونے تک منتظم اعلیٰ قرار دیا اور انہیں ہر قسم کے کاغذات پر دستخط کرنے کی اجازت دی مگر ساتھ ہی یہ پابندی بھی لگا دی کہ وہ کاشف کا علاج پوری توجہ اور بہترین انداز سے کراتے رہیں گے۔ نیز جاگیر کے جملہ حسابات سال کے سال کورٹ کے سامنے پیش کریں گے تاکہ عدالت کا مقرر کردہ آڈیٹر انہیں چیک کر سکے۔

☆☆☆

ایک سال گزر گیا۔ گاؤں کے لوگ نائلہ کے واقعے کو تقریباً فراموش کر چکے تھے۔ کاشف کی حالت اسی طرح چل رہی تھی مگر چوہدری صاحب نے جاگیر کا انتظام بڑی خوش اسلوبی سے سنبھال رکھا تھا۔ ان کے طرزِ عمل سے کسی کو کوئی شکایت نہیں تھی۔ یہ سچ تھا کہ روپے پیسے کے معاملے میں ان کا رویہ بڑا سخت تھا۔ وہ اپنے واجبات کے سلسلے میں کسی سے کوئی رعایت نہیں کرتے تھے مگر کسی کے ساتھ زیادتی بھی نہیں کرتے تھے، عام جاگیرداروں کی طرح بیگار نہیں لیتے تھے۔ موڈ میں ہوتے تو غریبوں کی مدد بھی کر دیا کرتے۔ کاشف کا بہت خیال رکھتے تھے۔ دور دور سے ڈاکٹر بلا کر انہوں نے اس کا علاج کرایا تھا، مگر انہوں نے ڈاکٹروں کے اس مشورے سے کبھی اتفاق نہیں کیا کہ کاشف کو کسی بڑے اسپتال میں داخل کر دیا جائے تو اس کی صحت یابی کا امکان بڑھ جائے گا۔ ان کا کہنا تھا کہ میں اسے اسپتال کے ڈاکٹروں اور نرسوں کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑ سکتا اور پھر جب گھر پر اس کا کمرا الگ ہے، ایک نرس مستقل اس کی تیمارداری کرتی ہے تو اسپتال لے جانے سے ایسا کیا فرق پڑ جائے گا۔ عجیب بات یہ تھی کہ جب بھی کوئی نیا ڈاکٹر تبدیل کیا جاتا تھا، فائدے کی رفتار تیز ہو جاتی تھی مگر یہ صحت یابی ایک حد پر آ کر ٹھہر جاتی اور پھر رفتہ رفتہ وہ اپنی سابقہ حالت پر واپس آ جاتا تھا۔

اسی ایک سال میں شرجیل نے نمایاں پوزیشن سے ایم کام کر لیا۔ ثاقب کا اندازہ اس کے بارے میں غلط نہیں تھا۔ شرجیل کو واقعی کومل سے محبت تھی اور یہ محبت کالج کے زمانے سے پروان چڑھ رہی تھی۔ کومل کے والدین شیخ حسام الدین شہر کے ایک بڑے اور کامیاب بزنس مین تھے اور کومل تین بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ شیخ صاحب، شرجیل کو ایک ہونہار طالب علم خیال کرتے تھے اور اس کے مستقبل کے بارے میں بڑے پُرامید تھے، یہی وجہ تھی کہ انہوں نے کبھی اس کے گھر میں آنے جانے یا کومل سے ملنے پر کوئی ناروا پابندی نہیں لگائی۔ انہیں شرجیل سے پہلا اختلاف اس وقت ہوا، جب اس نے ان کے مشورے کے مطابق ایم بی اے کرنے کے بجائے ایم کام کرنا پسند کیا۔

شرجیل کا کہنا تھا کہ اسے بزنس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، وہ یا تو ایم کام کرنے کے بعد ٹیچنگ لائن میں چلا جائے گا یا پی ایچ ڈی کی ڈگری لے کر لیکچرر شپ کے لیے اپلائی کرے گا۔ گویا دونوں صورتوں میں اس کی منزل قوم کے نوجوانوں کو تعلیم دینا تھی۔

یہ بات شیخ صاحب کو پسند نہیں آئی، مگر وہ خاموش رہے۔ ایم کام میں شرجیل کی کارکردگی دیکھنے کے لیے۔ اس نے پورے صوبے میں دوسری پوزیشن حاصل کی تو شیخ صاحب نے کہا کہ اگر وہ ٹیچنگ لائن ہی پسند کرنا چاہتا ہے تو وہ اس کے امریکا جانے اور کسی یونیورسٹی میں ملازمت کا انتظام کر دیں گے اور وہ چاہے تو وہیں رہ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کرے۔

شرجیل نے بڑے ادب کے ساتھ اس مشورے سے بھی اختلاف کیا کہ اس نے جو کسبِ علم کیا ہے تو پہلا حق اس کے ملک اور ابنائے وطن کا ہے کہ وہ انہیں فائدہ پہنچائے۔ شیخ صاحب نے تب ہی فیصلہ کر لیا کہ یہ کم عقل نوجوان ان کا

داماد نہیں بن سکتا۔ کومل جس نے بڑے ناز و نعم میں پرورش پائی تھی، اپنے والد کی ہم خیال تھی۔ چنانچہ جب کچھ دن کے بعد شیخ صاحب نے اس کی منگنی اپنے ایک دوست کے ڈپٹی کمشنر بیٹے سے کر دی تو اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور جب شرجیل نے اسے اس فیصلے کے خلاف احتجاج پر آمادہ کرنے کے لیے ملاقات کی تو کومل نے صاف کہہ دیا۔

''میں آپ کو پسند کرتی تھی، اب بھی کرتی ہوں مگر صرف محبت سے کسی کا پیٹ نہیں بھر سکتا۔ مجھے آرام سے زندگی گزارنے کے لیے ان تمام لوازمات کی ضرورت ہے جن کی میں عادی رہی ہوں۔ ڈیڈی نے کئی مرتبہ آپ کو ایک بہتر مستقبل کے لیے آمادہ کرنے کی کوشش کی مگر آپ نے ان کے مشوروں کو مسترد کر دیا۔ بلاشبہ آپ کو حق ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنی بہترین صلاحیتوں کو جہاں چاہیں ضائع کریں مگر میں یہ گھاٹے کا سودا کرنا نہیں چاہتی۔ مجھے آپ کو نہ پانے کا افسوس ضرور ہوگا مگر زندگی بھر کے عیش و آرام کے مقابلے میں اس وقتی افسوس کی میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں۔''

شرجیل نے اس سے بحث نہیں کی۔ اسے پہلی مرتبہ کومل کے اندازِ فکر کا اس قدر واضح ادراک ہوا تھا۔ اس نے کھلے دل سے تسلیم کر لیا کہ وہ ایک دوسرے کے لیے موزوں نہیں تھے۔ اگر تقدیر انہیں یکجا کر بھی دیتی تو آگے کہیں جا کر ان کی راہیں جدا ہو سکتی تھیں۔ اس نے کومل کو منگنی اور پھر چند ماہ بعد شادی پر بڑی خوش دلی سے مبارک باد دی اور ہمیشہ کے لیے اس کی زندگی سے نکل گیا۔ کچھ ہی دن بعد شرجیل کو اس کی شاندار کامیابی کی وجہ سے یونیورسٹی میں لیکچرر کی جگہ مل گئی۔ ایک سال کی ملازمت کے بعد یونیورسٹی نے اسے اپنے خرچ پر انگلینڈ جانے اور پی ایچ ڈی کرنے کی پیشکش کی جسے شرجیل نے بلا تامل قبول کر لیا اور ضروری تیاری کے بعد لندن روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

وقت اس تیزی سے گزرا کہ دو سال پلک جھپکتے بیت گئے۔ شرجیل بڑے شاندار طریقے سے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کر کے انگلینڈ سے واپس پلٹا۔ آتے ہی اسے پروفیسر بنا دیا گیا۔ اس کے اعزاز میں ضیافتیں دی گئیں۔ یہ خبریں گاؤں پہنچیں تو گاؤں والوں نے بھی اسے ایک استقبالیہ دینے کا پروگرام بنایا، گاؤں کی پوری تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا، جب اس کے کسی سپوت نے علم کے میدان میں ایسا شاندار کارنامہ انجام دیا ہو۔ گاؤں والوں کے جذبات سے باخبر ہو کر چوہدری حشمت نے اس استقبالیہ کا تمام خرچ اور انتظام اپنے ذمے لے لیا۔ پورے گاؤں کی صفائی کی گئی۔ اسے دلہن کی طرح سجایا گیا۔ قرب و جوار کے تمام نمایاں افراد کو دعوت دی گئی۔ ضلعی انتظامیہ کے اعلیٰ حکام اور پولیس کے افسران کو مدعو کیا گیا اور جب مقررہ تاریخ پر شرجیل نے گاؤں میں قدم رکھا تو اسے پھولوں سے لاد دیا گیا۔ اس دوران میں گاؤں کے پرائمری اسکول کو مڈل اسکول کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ شرجیل کے ہاتھ سے اس کا افتتاح بھی کرایا گیا۔ چوہدری صاحب نے دعوت کے اہتمام میں بھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ ایسی شاندار دعوت گاؤں میں پہلی بار منعقد ہوئی تھی اس لیے حویلی سے کچھ فاصلے پر ایک وسیع و عریض پنڈال لگایا گیا تھا۔

یہ ہنگامہ شام تک ختم ہو گیا تو چوہدری صاحب نے ذاتی طور پر شرجیل کو رات کے کھانے پر حویلی میں مدعو کیا۔

تین سال کی طویل مدت کے بعد اس رات شرجیل پہلی مرتبہ حویلی میں داخل ہوا تو ذہن میں تمام سوئی ہوئی یادیں جاگ اٹھیں۔ وہ شہر میں تھا جب اسے اخبارات کے ذریعے معلوم ہوا کہ گمشدہ نائلہ کی لاش ریلوے لائن پر کٹی ہوئی پائی گئی۔ لاش ناقابلِ شناخت تھی مگر چوہدری صاحب نے اس کے کپڑوں اور ہاتھ میں پہنی ہوئی انگوٹھی سے پہچان لیا اور یہ کہ بعد میں اسے آبائی قبرستان میں دفن بھی کر دیا گیا۔ شرجیل کو خبر پڑھتے ہی نائلہ کی موت کا یقین آ گیا بلکہ وہ تو اسے شاید پہلے سے ہی مردہ خیال کرنے لگا تھا۔ اس نے دیکھا تھا کہ ثاقب کس طرح نائلہ کے گرد منڈلاتا رہتا ہے جب وہ اس کی طرف دیکھتا ہے تو اس کی نظروں میں ہوس کی پرچھائیاں ناچ رہی ہوتی ہیں۔ شرجیل کو تقریباً یقین تھا کہ نائلہ کے کسی نوجوان کے ساتھ پرانی حویلی جانے کی جو داستان تراشی گئی ہے، وہ بالکل جھوٹ ہے اور غالباً اس لیے گھڑی گئی ہے کہ اسے شک کی لپیٹ میں لایا جا سکے۔ ورنہ واقعہ صرف اتنا ہوگا کہ اس رات ثاقب نے موقع پا کر نائلہ کی عزت پر حملہ کیا، نائلہ نے مزاحمت کی اور ثاقب نے اسے نادانستہ طور پر ہلاک کر دیا۔ پھر بذاتِ خود یا چوہدری صاحب کی ملی بھگت سے اس کی لاش ریلوے لائن پر ڈال دی گئی۔

حویلی میں قدم رکھتے ہی شرجیل کے دماغ میں ایک بار پھر وہ تمام شکوک و شبہات سر اٹھانے لگے۔ اس کے نزدیک تو کاشف کی طویل ذہنی علالت میں بھی ان دونوں باپ بیٹے کی شرارت ہو سکتی تھی۔ اپنی ماں جیسی بہن کی

گمشدگی نے بلاشبہ کاشف کے دماغ کو متاثر کیا ہوگا لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی جس کا علاج نہ کیا جاسکے۔ چوہدری صاحب نے جان بوجھ کر علاج میں غفلت کی ہوگی۔ اپنے خریدے ہوئے ڈاکٹرز سے علاج کراتے رہے اور آج تک اسے اسپتال میں داخل نہیں کیا، جہاں اس کی اچھی دیکھ بھال اور مکمل علاج کیا جاسکتا تھا اور پھر بعد میں نائلہ کی موت اور کاشف کی بیماری کو جواز بنا کر جاگیر اور جائداد پر قبضہ کرلیا جو اُن کی تمام سازشوں کا بنیادی مقصد تھا۔

چوہدری حشمت نے شرجیل کو ہی نہیں، اپنی بہن کو بھی مدعو کیا تھا۔ شریفاں بیگم کم وبیش پچیس سال کے بعد حویلی میں داخل ہوئیں۔ مرحوم چوہدری نثار علی جب انہیں بڑی خوشامد اور اصرار کے بعد گاؤں واپس لائے تو ان کی تمام تر منت سماجت کے بعد بھی شریفاں بیگم حویلی میں رہنے پر آمادہ نہیں ہوئیں۔ تب مجبور ہوکر چوہدری نثار علی نے ان کے لیے حویلی کے پاس ایک مکان بنوا دیا۔ پھر وہ بار بار وقفے وقفے سے بہن سے کہتے رہے کہ وہ پرانی رنجشیں بھلا دیں اور حویلی میں آجائیں یا کم سے کم آمدورفت تو رکھیں، مگر شریفاں بیگم کے کانوں میں ہمیشہ اپنے سخت دل، ظالم و جابر باپ کے الفاظ گونجتے رہتے تھے۔ جب وہ شرجیل کے والد سے شادی کرکے (اور یہ شادی بھی انہوں نے بزرگوں سے چھپ کر اسی لیے کی تھی کہ ان کے والد نے ان کا رشتہ بھاری دولت کے عوض ایک ایسے زمیندار کے ساتھ طے کر دیا تھا، جو نہ صرف عمر میں بیس سال ان سے بڑا تھا، بلکہ تین بیویوں کو قبرستان پہنچا چکا تھا)

حویلی واپس آئیں تو ان کے والد نے تمام حالات سے واقف ہوکر پہلے تو انہیں گولی مار کر ہلاک کرنا چاہا پھر بھائی نثار علی کی مداخلت پر جب وہ ایسا نہ کرسکے تو دھکے دے کر بیٹی کو حویلی سے نکال دیا اور چیخ کر بولے کہ ”آج سے تو ہمارے لیے اور ہم سب تیرے لیے مرچکے ہیں۔ اگر تیرے خون میں شرافت کا ایک قطرہ بھی شامل ہے تو آئندہ کبھی حویلی میں قدم مت رکھنا۔“

اب چھوٹے بھائی نے قدموں میں سر رکھ دیا تو شریفاں بیگم ضبط نہ کرسکیں۔ دل کا تمام بار آنسوؤں سے دھو کر حویلی میں داخل ہوئیں۔ بھاوج نے پھولوں کے ہار سے ان کا استقبال کیا۔ چوہدری صاحب نے کھانے کی میز پر انہیں اس کرسی پر بٹھایا جس پر دستور کے مطابق جاگیر کا سربراہ بیٹھا کرتا تھا اور پچھلے تین سال سے وہ خود بیٹھتے چلے آرہے تھے۔ ثاقب بھی کھانے کی میز پر موجود تھا مگر اس کا طرزِ عمل اپنے باپ سے بالکل مختلف تھا۔

دو سال قبل چوہدری صاحب نے اس کی شادی کر دی تھی مگر شادی کے بعد بھی ثاقب کی آوارگیوں میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ اس وقت باپ کے سامنے اس نے پھوپی کو سلام بھی کیا اور شرجیل سے گلے بھی ملا مگر چہرے پر ناگواری کا تاثر یہ بتا رہا تھا کہ وہ یہ سب کچھ دل سے نہیں کر رہا ہے۔

شریفاں بیگم یا شرجیل کو اس رویے کی کوئی پروا نہیں تھی۔ انہیں جاگیر سے کوئی دلچسپی نہ تھی کہ کسی کی ناراضی سے مایوس یا کسی کی رضامندی سے خوش ہوتے۔ وہ صرف پرانی کدورتوں کو بھلانے اور ٹوٹے تعلقات پھر سے استوار کرنے آئے تھے۔

کھانے سے فارغ ہوکر چوہدری حشمت ان کی اہلیہ اور شریفاں بیگم باہم بیٹھ کر کچھ پرانی یادیں تازہ کرنے لگے۔ شرجیل چہل قدمی کے خیال سے باہر باغ میں آگیا۔ باہر نکلا تو ماضی کی سوگوار یادوں نے دامن تھام لیا۔ سوئی ہوئی امنگیں جاگنے لگیں اور اس کے قدم آپ ہی آپ رات کی رانی کے اس کنج کی طرف بڑھنے لگے جہاں وہ اور نائلہ عموماً بیٹھ کر باتیں کیا کرتے تھے۔ ابھی وہ گلِ داؤدی کے محرابی دروازے سے گزر رہا تھا کہ ایک عجیب بات ہوئی۔ پہلے تو ہوا کا ایک جھونکا گلاب کی خوشبو مہکاتا چلا گیا اور جب اس نے چونک کر نظریں اٹھائیں تو رات کی رانی کے کنج میں اسے ایک سرتاپا سفید ہیولا سا نظر آیا۔ گلاب کی خوشبو نائلہ کو بہت پسند تھی۔

”کون ہو تم؟“ شرجیل نے متجسس نگاہوں سے اس ہیولے کو گھورا۔ کوئی جواب تو نہیں ملا مگر وہ جو کوئی بھی تھا، قدم بڑھا کر روشنی میں آگیا اور شرجیل کی آنکھیں حیرت سے پھیلی کی پھیلی رہ گئیں۔ اس کے سامنے نائلہ کھڑی تھی۔ سفید چادر میں ملبوس ہونے کے سبب وہ جسمانی صحت کا اندازہ تو نہیں لگا سکتا تھا مگر ستا ہوا چہرہ...... اور اڑی ہوئی رنگت...... دبلا چہرہ اور زرد رنگت، یہ ظاہر کرنے کے لیے کافی تھے کہ اگر وہ نائلہ ہی تھی تو پہلے کے مقابلے میں بہت کمزور ہوگئی تھی۔

”میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں یا تم سچ مچ نائلہ ہو؟“ شرجیل نے کہا اور آگے قدم بڑھایا۔ نائلہ بھی جلدی سے پیچھے ہٹی اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

”مگر تم نائلہ کیسے ہوسکتی ہو؟“ شرجیل نے پھر کہا۔ ”اسے تو انتقال کیے تین سال گزر چکے ہیں تم شاید اس کی روح ہو؟“

نائلہ پھر بھی خاموش رہی اور کوئی بات کہنے کے

بجائے اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ شرجیل موت کے بعد دنیا میں روحوں کے آنے کا قائل نہیں تھا۔ روح کی بات اس نے صرف اس لیے کی تھی کہ اگر اسے کوئی فریب دیا جارہا ہے تو دشمن کو یقین ہو جائے کہ وہ اس کے دھوکے میں آگیا ہے۔ چنانچہ جب نائلہ نے اسے اپنے تعاقب میں آنے کا اشارہ کیا تو وہ بلا تامل چل پڑا۔

اس وقت زیادہ رات نہیں ہوئی تھی۔ تقریباً نو بجے ہوں گے مگر دیہات کے لوگ جلدی سونے اور جلدی اٹھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ گاؤں کی گلیوں میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ شرجیل نے جلد ہی اندازہ کرلیا کہ وہ سفید ہستی اسے اس مختصر راستے کی طرف لے جارہی ہے جو پرانی حویلی کی طرف جاتا ہے۔ اب اس کی دلچسپی اور بڑھ گئی، اسے یوں لگا جیسے کسی راز سے پردہ اٹھنے والا ہو...... وہ دونوں جلد ہی آگے پیچھے چلتے ہوئے پرانی حویلی پہنچ گئے۔ نائلہ، شرجیل کو اسی ستون کے پاس لے آئی جس پر بیٹھ کر اس نے تین سال پہلے شرجیل کا انتظار کیا تھا۔

چند لمحے وہ بالکل خاموش ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر دفعتاً نائلہ کے منہ سے ایک سسکی سی نکل گئی۔ وہ گھٹنوں کے بل زمین پر جھک گئی۔ اس کا سیدھا ہاتھ چادر سے باہر نکلا اور ایک تیز دھار چمکتا ہوا خنجر شرجیل کے قدموں میں آگرا۔

”نہیں، میں تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتی۔“ نائلہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر بولی۔ ”خواہ تم نے میرے ساتھ کچھ بھی سلوک کیا ہو؟“

”مجھے یقین نہیں آرہا۔“ شرجیل ابھی تک حیران تھا۔ ”تم نائلہ تو نہیں ہوسکتیں مگر لگ بھی رہا ہے کہ تم نائلہ ہو، آخر تم کون ہو؟“

”میں نائلہ ہی ہوں شرجیل۔“

”مگر نائلہ کا تو......“ شرجیل بے اختیار آگے بڑھا اور نائلہ کے دونوں بازو پکڑ لیے۔ ”تم سچ مچ زندہ ہو اور زندہ ہو تو یقیناً نائلہ ہو۔“ اس نے بڑے جوش کے ساتھ کہا۔ ”تو پھر وہ لاش کس کی تھی؟“

”مجھے نہیں معلوم......“ نائلہ نے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں تو تین سال سے اس شیطان ثاقب کی قید میں حویلی کے تہ خانے میں بند ہوں۔ اس نے میری نگرانی صغراں مائی کو سونپ رکھی ہے۔ تین سال کی قید نے اس ظالم عورت کے دل میں بھی رحم پیدا کر دیا۔ میں نے سنا کہ تم حویلی میں آرہے ہو تو صغراں مائی، کی بڑی خوشامد کر کے اس وعدے پر باہر نکلی ہوں کہ دو گھنٹے بعد ضرور واپس آجاؤں گی۔ مجھے تم سے انتقام لینا تھا مگر یہاں بھی میں ہار گئی۔“

”مجھ سے انتقام۔“ شرجیل چونکا۔ ”تو وہ خنجر تم میرے لیے لائی تھیں؟ میں اس وقت تمہاری بات نہیں سمجھ سکا تھا لیکن مجھ سے کس بات کا انتقام لینا چاہتی ہو، میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟“

”تم نے میری زندگی برباد کردی ہے۔ یہ جو کچھ بھی ہوا، تمہاری وجہ سے ہوا۔“ نائلہ نے تیزی سے کہا۔ ”آج تمہاری وجہ سے میں سورج کی روشنی اور تازہ ہوا سے بھی محروم ہوں۔“

”میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے؟“ شرجیل اُلجھ کر بولا۔ ”میں تمہاری زندگی برباد کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا پھر تم نے ابھی بتایا کہ ثاقب نے تمہیں قید کررکھا ہے؟“

”ہاں، مگر یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا۔“

”وہ کس طرح؟“

”یہ دیکھو۔“ نائلہ نے اپنے گریبان سے ایک مڑا تڑا لفافہ نکال کر شرجیل کے سامنے ڈال دیا۔ شرجیل نے لفافے کے اندر رکھا ہوا کاغذ نکالا۔ یہ وہی خط تھا جو نائلہ کو پرانی حویلی لے گیا تھا۔ ”میں یہ خط پا کر تم سے ملنے پرانی حویلی گئی اور......“ بیتی ہوئی داستان ختم کرتے ہوئے نائلہ کی آنکھیں ایک بار پھر آنسو بہانے لگی تھیں۔ ”مجھے ہوش آیا تو میں ایک بند کمرے میں تھی۔“ نائلہ نے آخر میں کہا۔

”رات بھر وہاں کوئی نہیں آیا۔ میں یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ میں کہاں ہوں، اور وہ کس عمارت کا کمرا ہے...... صبح کو صغراں مائی میرے لیے ناشتا لے کر آئی۔ اسی سے پتا چلا کہ ثاقب مجھے بے ہوشی کی حالت میں اٹھا کر لایا تھا اور وہ کمرا جس میں مجھے قید کیا گیا، حویلی کے تہ خانے کا ایک حصہ ہے۔ مجھے اس تہ خانے کی موجودگی کا کوئی علم نہیں تھا، نہ کبھی ابا جان نے کسی تہ خانے کی موجودگی کا ذکر کیا تھا۔ اس دن سے آج رات تک میں اسی کمرے میں اپنی زندگی کے دن اس انتظار میں کاٹتی رہی کہ کسی دن تمہارا گریبان پکڑ کر پوچھوں گی کہ تم نے میرے ساتھ یہ فریب کیوں کیا؟ جس نے بالآخر مجھے تباہ کر دیا۔“

”یہ خط میں نے نہیں لکھا تھا نائلہ۔“ شرجیل نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”میں قسم کھاتا ہوں اور تم بھی ذرا توجہ سے کام لیتیں تو خط کی عبارت اور اندازِ تخاطب سے سمجھ جاتیں کہ میں ایسی تحریر لکھ ہی نہیں سکتا۔ ذرا سوچو، مجھے تمہیں پرانی حویلی بلانے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا میں گھر

میں تم سے بات نہیں کرسکتا تھا؟ میں خط لکھ کر ملاقاتیں کرنے کا قائل نہیں ہوں اور پھر ڈیئر نائلہ! یہ عامیانہ انداز میں کیسے اختیار کرسکتا تھا؟''

''تب یہ خط کس نے لکھا تھا؟'' نائلہ حیرت سے بولی۔

''کیا تم اب بھی نہیں سمجھیں، یہ ساری سازش ثاقب کی تھی۔ اس نے تمہیں میرے نام سے پرانی حویلی بلایا، تمہیں برباد کیا اور پھر تہ خانے میں قید کردیا۔ تاکہ تم اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کرسکو۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' نائلہ کا لب ولہجہ یک دم بدل گیا۔ ''میں خود اپنی حماقت سے برباد ہوئی ہوں۔'' وہ ایک بار پھر رونے لگی۔

''غم نہ کرو۔ جو ہونا تھا، وہ ہوچکا۔'' شرجیل نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔ ''تم نے بہت دکھ سہے ہیں، شاید خدا کی مرضی یہی تھی لیکن میں وعدہ کرتا ہوں کہ ثاقب سے نہ صرف اس ظلم کا انتقام لوں گا بلکہ تمہاری زندگی کو خوشیوں سے بھردوں گا۔ اگرچہ عید کی رات میں تم سے جو بات کرنا چاہتا تھا، وہ یہ نہیں تھی مگر اس کے بعد بہت جلد مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ کول جیسی لڑکیاں جذبات کے خلوص کو بھی اسٹیٹس کے ترازو میں تولتی ہیں، یہ بات مجھے بہت دیر سے معلوم ہوئی۔ تم ابھی میرے ساتھ پولیس اسٹیشن چل کر اپنا بیان تحریر کراؤ۔ پھر میں ثاقب اور چوہدری حشمت علی سے سمجھ لوں گا۔''

''نہیں، اس میں چچا جان کا کوئی ہاتھ نہیں۔'' نائلہ جلدی سے بولی۔ ''یہ سب کچھ ثاقب کا کیا دھرا ہے اور میں ابھی آپ کے ساتھ پولیس اسٹیشن بھی نہیں چل سکتی۔ ورنہ، ثاقب صغراں مائی کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ یوں بھی یہ ہمارے خاندان کا اندرونی معاملہ ہے، اسے پولیس یا عدالت تک لے جانے میں اپنی ہی رسوائی ہوگی۔ ابھی مجھے واپس جانے دیں اور پھر کل چچا جان سے مل کر انہیں میرے تہ خانے میں قید ہونے کے بارے میں بتائیں۔ وہ ثاقب کے باپ ضرور ہیں مگر اس ظلم وزیادتی میں اس کا ساتھ نہیں دیں گے۔''

''ان تین برسوں میں کیا ثاقب تمہارے پاس آتا رہا ہے؟'' شرجیل نے پوچھا۔

''ہاں، مگر اسے پھر کبھی کوئی غلط حرکت کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔'' نائلہ نے جواب دیا۔ ''مجھے صغراں سے یہ خنجر مل گیا تھا اور میں نے ثاقب پر واضح کردیا تھا کہ اگر اس نے میرے کمرے میں قدم بھی رکھا تو میں اپنی جان دے دوں گی۔ وہ آتا ہے، کمرے سے باہر کھڑے رہ کر مجھے اپنے ساتھ شادی پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور میرا سخت جواب سن کر واپس چلا جاتا ہے۔''

''اچھی بات ہے۔'' شرجیل نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''جیسا تم کہتی ہو ویسا ہی کروں گا۔ دیکھنا یہ ہے، ماموں جان کس کا ساتھ دیتے ہیں۔''

''آؤ چلیں، میں تمہیں حویلی تک چھوڑ دوں۔'' اس نے نائلہ سے کہا۔

''نہیں، آپ پہلے جائیں۔ میں خود ہی واپس پہنچ جاؤں گی۔'' نائلہ نے جواب دیا۔

☆☆☆

شرجیل حویلی پہنچا تو اسے غیر حاضر ہوئے ایسا زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔ نہ جانے کیا سوچ کر وہ حویلی کے عقبی دروازے سے جو ملازموں کی آمدورفت کے لیے رات گیارہ بجے تک کھلا رہتا تھا اندر داخل ہوا۔ کھانے کی میز پر گفتگو کے دوران میں جب شریفاں بیگم نے کاشف کی طبیعت کے بارے میں پوچھا تھا تو چوہدری صاحب نے بتایا کہ اسے حویلی کے پچھلے حصے میں ایک کمرے میں رکھا گیا ہے۔ غالباً شرجیل کے ذہن میں اسی بات نے کاشف کا کمرا دیکھنے کا تجسس پیدا کیا تھا اور شاید اسی خیال سے وہ عقبی دروازے سے آیا تھا۔

راہداری میں وہ تھوڑی دور ہی آگے بڑھا تھا کہ اس نے ایک کمرے میں روشنی ہوتے دیکھی۔ کھلی ہوئی کھڑکی سے جھانکا تو اندر ثاقب ایک نرس کے ساتھ کھڑا باتیں کررہا تھا۔

''آج رات کی خوراک کو ایک گھنٹے کی دیر ہوگئی ہے۔'' نرس کہہ رہی تھی۔

''مجبوری تھی، پھوپی جان کمرے میں موجود تھیں، ان کے سامنے تو روز کی خوراک نہیں دی جاسکتی تھی۔'' ثاقب نے جواب دیا اور اپنے پیچھے کی الماری کی طرف گھوما۔ اس نے الماری کھول کر ایک چھوٹی سی شیشی نکالی، نرس ہاتھ میں ایک گلاس لیے کھڑی تھی جس میں کوئی دوا نظر آرہی تھی۔ ثاقب نے شیشی کھول کر دو تین قطرے دوا میں ٹپکائے اور شیشی واپس الماری میں رکھ دی۔ کاشف کمرے میں نظر نہیں آرہا تھا مگر سامنے ہی ایک دروازہ کھلا تھا جس کا مطلب تھا کہ کاشف کا پلنگ ملحقہ کمرے میں موجود ہے۔ نرس دوا لے کر اس دروازے کی طرف بڑھی تو ثاقب

کمرے سے نکل کر راہداری میں آ گیا۔ شرجیل نے چھپنے کی کوشش کی مگر اس کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ ثاقب کسی بھی طرف دیکھے بغیر سامنے لپکتا ہوا چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی شرجیل تیزی سے کمرے میں داخل ہوا، وہی الماری کھولی، مطلوبہ شیشی سامنے رکھی تھی، اس پر لگا ہوا ''پوائزن'' کا لیبل جو وہ پہلے نہیں دیکھ سکا تھا۔ اب واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔ شرجیل اسے اٹھانے ہی والا تھا کہ کسی خیال سے رک گیا۔ جیب سے رومال نکالا اور شیشی پر ڈال کر اسے اٹھا لیا۔ پھر اسے لپیٹ کر جیب میں رکھتے ہوئے دبے پاؤں کمرے سے باہر نکل آیا۔

☆☆☆

شریفاں بیگم اور چوہدری صاحب بدستور باتیں کر رہے تھے۔ شرجیل کمرے میں داخل ہوا تو چوہدری صاحب مسکراتے ہوئے بولے۔ ''ارے میاں! کہاں غائب ہو گئے تھے؟ یہ تمہاری ماں پریشان ہو رہی تھی۔''

''میں باہر باغ میں کچھ غائب ہونے والوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔'' شرجیل نے جواب دیا۔

''غائب ہونے والے؟'' چوہدری صاحب چونکے۔ ''تم کس کی بات کر رہے ہو؟''

''مثال کے طور پر صغراں مائی۔'' شرجیل نے کہا۔ ''وہ حویلی کی پرانی ملازمہ تھی مگر اب کہیں نظر نہیں آتی۔''

''اوہ صغراں مائی، وہ تو تین سال پہلے ملازمت چھوڑ کر چلی گئی تھی۔''

''گویا تقریباً ان ہی دنوں میں جب نائلہ غائب ہوئی تھی۔''

''مجھے ٹھیک سے یاد نہیں مگر صغراں مائی، نائلہ کی موت کے بعد گئی تھی۔'' چوہدری نے کہا۔

''موت نہ کہیے، گمشدگی کہیے، ماموں جان! اس لیے کہ جس لاش کو دفنایا گیا ہے، مجھے یقین نہیں کہ وہ نائلہ کی لاش تھی۔'' شرجیل بولا۔

چوہدری صاحب کچھ پریشان سے ہو گئے۔ ''یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو، میں نے خود لاش شناخت کی تھی۔ آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' چوہدری صاحب کے لہجے میں تیزی آ گئی۔

''آپ نے لاش کی شناخت لباس اور انگوٹھی سے کی تھی، ورنہ لاش ناقابلِ شناخت تھی۔'' شرجیل نے ماموں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ شریفاں بیگم بھی حیرت سے اپنے بیٹے کی صورت دیکھ رہی تھیں۔

''میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں ماموں جان کہ آپ کے بدکردار بیٹے نے نائلہ کو اپنی سازش کا شکار بنایا، اسے بہانے سے پرانی حویلی میں بلایا، وہاں اس کی عزت پر حملہ کیا اور پھر قانون کے خوف سے اسے حویلی کے تہ خانے میں قید کر دیا۔ وہ تین سال سے وہیں زندہ درگور ہے اور صغراں مائی اس کی نگرانی پر مامور ہے۔''

''تمہارے پاس اس تمام بکواس کا کیا ثبوت ہے؟'' چوہدری صاحب غصے میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''میرے پاس جو ثبوت ہے، وہ میں عدالت میں پیش کروں گا۔'' شرجیل نے جواب دیا۔ ''لیکن اگر یہ سب آپ کی لاعلمی میں ہوا ہے تو اس کے درست و غلط ہونے کا فیصلہ ابھی کیا جا سکتا ہے۔ آپ ہمیں حویلی کے تہ خانے میں لے چلیں۔''

''یا تو تمہیں کسی نے بہکایا ہے یا پھر تم باغ میں جا کر سو گئے تھے اور تم نے کوئی خواب دیکھا ہے۔''

''بھائی جان! یہ بڑا سنگین الزام ہے جو شرجیل نے لگایا ہے۔'' شریفاں بیگم بھی کھڑی ہو گئیں۔ ''میں اپنے بیٹے کو جانتی ہوں، وہ بغیر کسی ٹھوس وجہ کے ایسی بات نہیں کہہ سکتا۔ مجھے معلوم ہے کہ حویلی میں تہ خانہ موجود ہے۔ آپ اسے دیکھ کیوں نہیں لیتے؟ ثاقب کی داستانوں سے آپ ناواقف تو نہیں ہیں۔''

''ہر مہینے تہ خانے کی صفائی ہوتی ہے۔'' چوہدری صاحب بولے۔ ''میں اور ثاقب خود صفائی کرتے ہیں۔ اگر وہاں کسی کو قید کیا گیا ہوتا تو کیا مجھ سے یہ بات چھپی رہ سکتی تھی؟''

''صفائی کے دن قیدی کو کہیں اور منتقل کیا جا سکتا ہے۔'' شرجیل نے جواب دیا۔

''اچھی بات ہے۔'' چوہدری نے غصے پر قابو پاتے ہوئے ایک گہری سانس لی۔ ''اگر تمہارا اطمینان اسی طرح ہو سکتا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں، آؤ چلو۔''

تہ خانے کا دروازہ مرحوم چوہدری نثار علی کے کمرے میں واقع تھا۔ (یہ کمرا اب چوہدری حشمت علی کے زیرِ استعمال تھا)

شریفاں بیگم بھی اس سے واقف تھیں۔ چوہدری صاحب نے فرش میں لگا ہوا تختہ اٹھا کر نیچے جانے والے زینے کا دروازہ کھولا، پہلے خود اترے، بجلی کا بٹن دبا کر روشنی کی۔ ان کے پیچھے شریفاں بیگم اور شرجیل تہ خانے میں پہنچے جو چار کمروں، ایک کوٹھری، ایک غسل خانے اور ایک بیت

الخلا پر مشتمل تھا۔ ایک ایک کر کے ہر کمرا اور کوٹھری دیکھ لیے گئے مگر وہاں کوئی متنفس تو کجا، کسی کے رہنے کے آثار بھی نظر نہیں آئے۔

''کیوں برخوردار! اب کیا کہتے ہو؟'' چوہدری صاحب نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''صرف یہ......'' شرجیل نے بلا تامل جواب دیا۔ ''کہ ثاقب میری توقع سے زیادہ پھرتیلا نکلا۔ اس نے نائلہ کو اتنی سی مختصر مدت میں یہاں سے ہٹا دیا، جتنی دیر میں آپ ہمیں یہاں آنے سے روکتے رہے۔''

''گویا تمہارا خیال بدستور قائم ہے کہ نائلہ یہاں قیدی کی حیثیت سے موجود تھی؟''

''یقیناً'' شرجیل نے کہا۔ ''یہ دوسری بات ہے کہ سرِدست میں اسے یہاں سے برآمد کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔''

''تم جو چاہو، خیال کرو۔'' چوہدری صاحب نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''لیکن میں صرف اتنا کہوں گا کہ اگر ثاقب نے کوئی ایسی حرکت کی ہوتی تو میں اسے اپنے ہاتھ سے شوٹ کر دیتا۔''

☆☆☆

شریفاں بیگم اور شرجیل تہ خانے سے باہر آنے کے بعد وہاں مزید نہیں ٹھہرے، اپنے گھر چلے آئے تھے۔

''تمہیں یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے بیٹے۔'' شرجیل کی ماں نے کہا۔ ''ثاقب لاکھ بدچلن اور آوارہ سہی مگر ایسی حرکت نہیں کرسکتا۔''

''غلط فہمی کا کوئی امکان ہی نہیں ہے امی۔'' شرجیل نے جواب دیا۔ ''میں نے وہاں یہ بتانا مناسب نہیں سمجھا، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ میں آج خود نائلہ سے ملا ہوں اور یہ بات مجھے اسی نے بتائی تھی کہ تین سال سے وہ حویلی کے تہ خانے میں قید ہے اور صغراں مائی، اس کی دیکھ بھال کرتی ہے۔'' یہ کہہ کر شرجیل نے نائلہ سے ملنے کی تمام رُوداد اپنی ماں کو سنادی۔

''تمہیں یقین ہے، وہ لڑکی نائلہ ہی تھی؟'' شریفاں بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

''کیا بات کر رہی ہیں امی! اب کیا میں نائلہ کو بھی نہیں پہچان سکتا۔'' شرجیل نے جواب دیا۔

''اگر وہ نائلہ تھی تو پھر کہاں غائب ہوگئی؟''

''دو ہی باتیں ہوسکتی ہیں یا تو وہ اس وقت تک پرانی حویلی سے واپس نہیں پہنچی تھی یا پھر ثاقب نے جو شاید کہیں چھپ کر ہماری باتیں سن رہا تھا، اسے کہیں چھپا دیا ہو مگر میں سوچ رہا ہوں کہ وہ اسے کس جگہ چھپا سکتا ہے۔''

''ایک ایسی انتہائی محفوظ جگہ تو ہوسکتی ہے۔'' شریفاں بیگم نے سوچتے ہوئے کہا۔

''کون سی جگہ؟'' شرجیل نے جلدی سے پوچھا۔

''پرانی حویلی کا تہ خانہ'' اس کی امی نے جواب دیا۔

''کیا وہاں بھی کوئی تہ خانہ ہے؟'' شرجیل نے حیرت سے پوچھا۔

''کسی جاگیردار کی حویلی تہ خانے کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ یہ اور بات ہے کہ اس تہ خانے کا راز پوشیدہ رکھا جاتا ہے اور اس کا علم جاگیردار یا اس کے قریبی عزیزوں کے سوا کسی کو نہیں ہوتا۔''

''آپ کا اندازہ درست معلوم ہوتا ہے۔ میں ابھی جا کر دیکھتا ہوں۔ مگر میں تہ خانے کو تلاش کیسے کروں گا؟'' شرجیل پریشان سا ہو کر بولا۔

''پرانی حویلی کا تہ خانہ بھی اس کے عقبی حصے کے بڑے کمرے میں واقع ہے۔'' شریفاں بیگم نے جواب دیا۔ ''لیکن تمہارا اس وقت وہاں اکیلے جانا مناسب نہیں، صبح پولیس کو ساتھ لے کر جانا۔''

''صبح تک بہت دیر ہو جائے گی امی۔ اگر ثاقب کو مہلت مل گئی تو وہ نائلہ کو کہیں غائب بھی کرسکتا ہے اور جان سے بھی مار سکتا ہے، مجھے اسی وقت جانا چاہیے۔''

''شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' شریفاں بیگم نے جواب دیا۔ ''خدا کرے تم نائلہ کو بچا سکو اور مجھے حشر کے دن نثار بھائی جان کے سامنے سرخروئی حاصل ہو، جاؤ، خدا تمہارا حامی و ناصر ہو۔''

☆☆☆

شرجیل جب پرانی حویلی پہنچا تو اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا۔ شکستہ حویلی کی پوری عمارت زمین بوس نہیں ہوئی تھی۔ کئی کمروں کی دیواریں کھڑی ہوئی تھیں۔ ایک دو کمروں کی چھت بھی باقی تھی مگر ملبے کے ڈھیر، جھاڑ جھنکاڑ، خودرو پودوں اور گھاس نے ہر کمرے کے فرش کو ڈھک رکھا تھا۔ شرجیل نے ایک ایک کمرے خاص طور سے عقبی کمروں کا جائزہ لیا۔ ایک کمرے میں اسے تھوڑا سا فرش قدرے صاف نظر آیا۔ اگرچہ اس پر ایک ٹوٹا ہوا ستون پڑا تھا۔ شرجیل نے ستون کو اٹھایا۔ وہ کچھ زیادہ بھاری نہ تھا۔ آسانی

سے اٹھ گیا۔ اس کے ہٹتے ہی اسے فرش میں ایک کنڈا لگا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے اسے پکڑ کر زور لگایا تو لکڑی کا تختہ اوپر اٹھتا چلا گیا۔ چاندنی میں زینے کی سیڑھیاں نظر آ رہی تھیں۔

شرجیل نے جیب سے سگریٹ لائٹر نکال کر جلایا اور اس کی روشنی میں سیڑھیاں طے کر کے نیچے پہنچا۔

''ابھی اس نے ایک دو قدم ہی اٹھائے تھے کہ اسے اپنے سر پر ایک پہاڑ سا ٹوٹتا محسوس ہوا۔ ذہن میں ایک دھماکا سا ہوا اور اس کا وجود...... گہرے اندھیرے میں ڈوب گیا۔

☆☆☆

ہوش آیا تو کوئی...... اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مار رہا تھا۔ شرجیل نے چونک کر آنکھیں کھول دیں...... سر اٹھانے کی کوشش کی تو درد کی ایک لہر نے اسے کراہنے پر مجبور کر دیا۔ نیم تاریک کمرے کے ایک کونے میں جلتی ہوئی مشعل کی روشنی میں اس نے صغراں مائی کو اپنے اوپر جھکا ہوا دیکھا۔

''اب کیسی طبیعت ہے؟'' بوڑھی صغراں مائی نے محبت سے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں۔'' شرجیل نے جواب دیا اور ایک بار پھر اٹھنے کی کوشش کی۔ درد کی تیز لہر اس مرتبہ بھی ناقابلِ برداشت تھی مگر وہ ہمت کر کے اٹھ ہی گیا۔ ''میں کہاں ہوں؟'' اس نے پوچھا۔

''تم پرانی حویلی کے تہ خانے میں ہو۔'' صغراں بولی۔

''اور نائلہ؟''

''وہ برابر کے کمرے میں بند ہے۔'' صغراں نے بتایا۔ ''ثاقب نے تجھے اندر آتے دیکھ لیا تھا۔''

''اب ثاقب کہاں ہے؟''

''وہ واپس حویلی چلا گیا ہے۔'' بوڑھی ملازمہ نے افسردگی سے سر ہلایا۔ ''میں نے مرحوم چوہدری صاحب کا نمک کھایا ہے۔ ثاقب کی دھمکیوں اور لالچ نے میری زبان بند کر رکھی تھی مگر اب میں نائلہ بیٹی پر اس کے مزید ظلم و ستم برداشت نہیں کر سکتی۔ وہ تین سال سے قید ہے۔ کچھ دن اور یہ صورت رہی تو وہ ضرور مر جائے گی۔ صبح ہونے میں ابھی تین چار گھنٹے باقی ہیں۔ گاؤں کی پولیس چوکی کا داروغہ ثاقب کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔ اگر تم نائلہ کی، اپنی اور میری جان بچانا چاہتے ہو تو قصبے کے تھانے تک جانا ہوگا۔ اگر صبح ہونے سے پہلے پولیس ہمیں یہاں سے آزاد نہیں کرا سکی تو ہماری موت یقینی ہے۔ ثاقب نے تمہیں غائب پایا تو ساری بات سمجھ جائے گا اور یقیناً ہم دونوں کو قتل کر دے گا۔''

''خدا تمہیں اس وفاداری کا اجر دے گا صغراں مائی۔'' شرجیل نے کہا۔ ''تم مجھے آزاد کر دو، میں اپنی جان پر کھیل کر بھی صبح سے پہلے انسپکٹر چٹھہ کو یہاں لانے کی پوری کوشش کروں گا۔''

صغراں مائی نے شرجیل کو گرم دودھ پینے کے لیے دیا اور بتایا کہ پرانی حویلی کا تہ خانہ ثاقب اپنی عیاشی کے لیے استعمال کرتا رہا ہے اس لیے یہاں بھی ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔ گاؤں والوں میں پرانی حویلی کے بارے میں مختلف باتیں، راتوں کو ثاقب کی پُراسرار آمد و رفت دیکھ کر ہی پھیلی ہیں...... دودھ پی کر شرجیل کو اپنے جسم میں کچھ توانائی محسوس ہوئی۔ اس نے نائلہ سے مل کر اسے بھی تسلی دی۔

''قدرت نے تین سال کے بعد ہمیں یونہی نہیں ملایا ہے۔'' یہ تمام حالات بلاوجہ پیدا نہیں ہوئے ہیں۔ ظالم کی رسی جتنی دراز کی جا سکتی تھی، وہ کی جا چکی، اب سزا کا وقت ہے اور خدا ظالموں کو معاف نہیں کرتا۔ یقین رکھو کہ خدا تمہیں اس مصیبت سے ضرور آزاد کرائے گا۔ بس اسی سے دعا کرتے رہنا۔''

☆☆☆

قصبے کے تھانے کا فاصلہ پرانی حویلی سے آٹھ دس میل تھا اور یہ فاصلہ شرجیل کو پیدل طے کرنا تھا۔ سر کی چوٹ کافی تکلیف دہ تھی۔ زخم آ گیا تھا۔ جس سے خاصا خون بھی بہا تھا۔ کپڑوں پر خون کے داغ اس کا ثبوت تھے پھر چوٹ کھا کر گرنے سے بھی جسم پر کئی خراشیں آ گئی تھیں مگر یہ زندگی اور موت کی جنگ تھی۔ شرجیل نے ہمت باندھی اور قصبے کا رخ کر کے بھاگنے لگا۔ وہ کالج اور یونیورسٹی کے زمانے میں صرف ایک اچھا طالب علم ہی تھا، کوئی ایتھلیٹ نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ ٹینس یا بیڈمنٹن کھیل لیا کرتا تھا۔ پھر بھی اس نے ذہانت سے کام لیا، اپنی رفتار یکساں رکھی۔ بہت تیز نہ بہت ہلکی گاؤں کی پگڈنڈیاں ناہموار اور سڑکیں پکی نہ ہوتیں تو وہ زیادہ آسانی سے دوڑ سکتا تھا پھر بھی وہ اپنی سانس کو پھولنے سے ممکن حد تک بچاتے ہوئے دوڑتا رہا۔ یکساں رفتار سے دوڑنے اور سانس کو ہموار رکھنے کی حکمتِ عملی آخری دو میل سے پہلے ہی جواب دے گئی۔ وہ ایک پتھر سے ٹھوکر کھا کر گرا۔ اسے یوں لگا جیسے اب دوبارہ نہیں اٹھ سکے گا۔

وہ کچھ دیر تک یونہی بے دم سا پڑا رہا۔ اچانک اس نے کچھ فاصلے پر کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس چمکتے دیکھیں۔ اس نے ہمت کی اور گھسٹتے ہوئے بیچ سڑک پر آ گیا اور سر اٹھا کر قریب آنے والی روشنی کو دیکھنے لگا۔

یہ حسنِ اتفاق تھا کہ اس رات انسپکٹر چٹھہ خود گشت پر نکلا ہوا تھا۔ آنے والی روشنی اس کی جیپ کی تھی۔ اس نے دور ہی سے سڑک پر ایک آدمی کو گرے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ قریب آ کر اس نے جیپ روک دی، کود کر نیچے اترا۔ اس کے ساتھ تین کانسٹیبل بھی تھے، وہ بھی نیچے آئے۔ شرجیل سر اٹھائے انہیں دیکھ رہا تھا۔

''ارے شرجیل صاحب، آپ!'' انسپکٹر چٹھہ نے حیرت سے کہا اور سہارا دے کر اسے کھڑا ہونے میں مدد دی۔

''خدا کا شکر ہے۔'' بے اختیار شرجیل کی زبان سے نکلا۔ ''آپ خود ہی مل گئے، میں اس وقت آپ کی تلاش میں پولیس اسٹیشن ہی جا رہا تھا۔''

☆☆☆

انسپکٹر چٹھہ نے ایک مرتبہ پھر اُلجھے اُلجھے غیر یقینی انداز میں شرجیل کی طرف دیکھا۔ ''پروفیسر صاحب! آپ کو احساس ہے کہ آپ کتنی انوکھی اور ناقابلِ یقین داستان بیان کر رہے ہیں۔'' وہ بولا۔

''میں جانتا ہوں۔'' شرجیل نے ایک گہری سانس لی۔ ''آپ کی جگہ میں ہوتا تو شاید میرا ردِعمل بھی یہی ہوتا لیکن میں سرِدست آپ سے ثاقب کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کی درخواست نہیں کر رہا ہوں۔ آپ میرے ساتھ پرانی حویلی تو چل سکتے ہیں۔ خدا کے لیے زیادہ سوچ و بچار میں وقت ضائع نہ کریں۔ صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں ہے اور مجھے یقین ہے کہ ثاقب بھی اپنے بستر پر چین کی نیند نہیں سو رہا ہوگا۔ اگر وہ صبح ہونے سے پہلے ہی وہاں پہنچ گیا، تو میں اپنی سچائی کا کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' انسپکٹر چٹھہ نے سر ہلایا۔ ''میں آپ کے ساتھ پرانی حویلی چلنے کو تیار ہوں۔''

اس نے شرجیل کو جیپ میں بٹھایا اور جیپ وہیں سے گاؤں کی طرف موڑ دی۔ جو فاصلہ شرجیل نے کم و بیش دو گھنٹوں میں طے کیا تھا، وہ دس منٹ میں ختم ہو گیا۔ تقریباً پندرہ منٹ کے بعد جیپ پرانی حویلی کے کھنڈرات کے سامنے کھڑی تھی اور انسپکٹر چٹھہ ایک ہاتھ میں ٹارچ اور دوسرے میں ریوالور لیے تہ خانے کی سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ اس کے پیچھے شرجیل اور تینوں کانسٹیبل بھی محتاط قدموں سے آ رہے تھے۔

☆☆☆

ابھی صبح کے سات بھی نہیں بجے تھے کہ انسپکٹر چٹھہ قصبے میں موجود پولیس کی نفری کی تین چوتھائی تعداد لے کر نئی حویلی کے پھاٹک پر دستک دے رہا تھا۔ اس نے ایک کانسٹیبل کو ساتھ رکھ کر باقی تمام جوانوں کو حویلی کا محاصرہ کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ شرجیل بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہ اگرچہ مضروب اور رات بھر کی جدوجہد سے تھکا ہوا تھا مگر پھر بھی اس کے چہرے پر ایک چمک اور دبا ہوا اندرونی جوش نمایاں تھا۔

دستک کے جواب میں خود چوہدری حشمت علی نے دروازہ کھولا جو صبح کی نماز کے لیے جلدی اٹھ جاتا تھا۔ انسپکٹر چٹھہ کو دیکھ کر اس نے حیرت ظاہر کی مگر جب اس کی نظر شرجیل پر پڑی تو ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولے۔ ''مجھے یہ تو یقین تھا صاحب زادے کہ تم خاموش نہیں بیٹھو گے۔'' انہوں نے شرجیل سے کہا اور پھر انسپکٹر کی طرف دیکھا۔ ''مگر یہ اندازہ نہیں تھا کہ آپ جیسا ذمے دار آفیسر ایک ایسی لغو اور بے بنیاد کہانی پر اعتبار کر سکتا ہے۔''

''اس پر ہم ابھی بات کریں گے چوہدری صاحب۔'' انسپکٹر چٹھہ نے نرم لہجے میں کہا۔ ''مجھے پہلے یہ بتائیے کہ کیا ثاقب حویلی میں موجود ہے؟''

''جی ہاں اپنے کمرے میں سو رہا ہے۔'' چوہدری صاحب نے جواب دیا۔

''مجھے اندر آنے کی اجازت دیجیے۔ میرے پاس ثاقب کی گرفتاری کا وارنٹ ہے اور تمام حویلی کی خانہ تلاشی کا اجازت نامہ بھی...... مجھے امید ہے کہ آپ قانون سے تعاون کریں گے۔''

''تو بات اتنی دور تک پہنچ گئی۔'' چوہدری حشمت چونکا پھر شرجیل کی طرف دیکھا۔ ''ماننا پڑتا ہے برخوردار کہ تم نے بڑی تیز رفتاری کا مظاہرہ کیا ہے۔ آجائیے انسپکٹر صاحب، میں آپ کی کسی قانونی کارروائی میں حارج نہیں ہوں گا۔''

انسپکٹر چٹھہ نے کمرائے نشست میں بیٹھنے کے بجائے اس راہداری میں کھڑے رہنے کو ترجیح دی، جس میں ثاقب کا کمرا واقع تھا۔ چوہدری صاحب نے متواتر دستک دے کر ثاقب کو اٹھایا۔ اسے انسپکٹر چٹھہ کی آمد کے بارے میں بتایا اور باہر آنے کے لیے کہا۔

ثاقب سلیپنگ سوٹ میں کمرے سے باہر نکلا۔ اس کا چہرہ زرد تھا۔ جیسے ہی اس کی نگاہ شرجیل پر پڑی، وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ ایک لمحے کے لیے ایسا لگا جیسے وہ پلٹ کر

بھاگنا یا کمرے میں گھس جانا چاہتا ہو، مگر پھر اس نے خود پر قابو پالیا۔ انسپکٹر چٹھہ نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی۔ ''چوہدری ثاقب! میں تمہیں، نائلہ بیگم کو مسلسل تین سال تک حویلی کے تہ خانے میں قید رکھنے اور ان پر ظلم و زیادتی کرنے کے الزام میں گرفتار کرتا ہوں۔''

''انسپکٹر صاحب!'' چوہدری حشمت صاحب قدم بڑھا کر بولے۔ ''اگر آپ کے پاس ثاقب کا وارنٹ گرفتاری ہے تو میں آپ کو اس کی گرفتاری سے نہیں روکوں گا لیکن کم سے کم میں اتنا پوچھنے کا حق تو رکھتا ہوں کہ شرجیل کی بے سروپا داستان کا کوئی ثبوت بھی آپ کو ملا ہے یا آپ محض اس کے بیان پر یہ کارروائی کررہے ہیں؟''

''چوہدری صاحب! آپ مجھے برسوں سے جانتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں کسی ٹھوس ثبوت کے بغیر اتنا بڑا قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔'' انسپکٹر چٹھہ نے جواب دیا۔ ''آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ہم نے پرانی حویلی کے تہ خانے سے آپ کی سابقہ ملازمہ صغراں مائی اور نائلہ بیگم کو رہا کرالیا ہے۔ نائلہ پہلے اسی حویلی کے تہ خانے میں قید تھیں مگر آپ کی اور شرجیل صاحب کی گفتگو سن کر ثاقب نے بڑی پھرتی کے ساتھ، آپ دونوں کے تہ خانے میں پہنچنے سے قبل، انہیں وہاں سے نکال کر پرانی حویلی کے تہ خانے میں پہنچادیا۔''

چوہدری حشمت علی کا چہرہ ایک لمحے کے لیے سفید پڑ گیا مگر دوسرے لمحے وہ ایک دم غصے سے بپھر کر آگے بڑھے اور اپنے بیٹے کے منہ پر ایک زبردست تھپڑ رسید کیا۔ ''ناخلف، یہ تو نے کیا کیا؟'' وہ گرجے۔ ''تیرے پہلے ہی کرتوت کچھ کم نہ تھے لیکن آج تو نے میری سفید داڑھی میں سارے زمانے کی کالک مل دی۔ اسے میرے سامنے سے لے جاؤ، انسپکٹر، ورنہ شاید میں اسے گولی ماردوں گا۔''

ثاقب سر جھکائے کھڑا تھا۔ انسپکٹر چٹھہ نے ایک نظر اسے دیکھا پھر بولا۔ ''اس قدر جوش میں آنے کی ضرورت نہیں ہے، چوہدری صاحب! ابھی اس حویلی میں ہمارا کام ختم نہیں ہوا۔ میں اس نرس سے ملنا چاہتا ہوں، جو آپ کے بھتیجے کاشف کی دیکھ بھال کرتی ہے۔''

''وہ کس لیے؟'' چوہدری صاحب نے حیرت سے پوچھا۔

''یہ میں بعد میں عرض کروں گا...... پہلے مجھے اس نرس کا کمرا بتائیے، آپ کو زحمت کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اسے میرا کانسٹیبل لے آئے گا۔''

چوہدری حشمت نے اسی راہداری کے آخری کمرے کی جانب اشارہ کیا۔ سپاہی آگے بڑھا، دروازے پر دستک دی اور تین منٹ کے بعد نرس بھی انسپکٹر چٹھہ کے سامنے کھڑی حیرت و خوف کے عالم میں کبھی ثاقب کو اور کبھی چوہدری صاحب کو دیکھ رہی تھی۔

انسپکٹر چٹھہ نے کچھ کہنا ہی چاہا تھا کہ شرجیل بول پڑا۔ ''ایک منٹ...... انسپکٹر صاحب!'' اس نے کہا۔ ''پہلے مجھے اس سے دو باتیں کرنے کا موقع دیں۔'' اور پھر انسپکٹر کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ نرس کی طرف گھوما۔

''دیکھو نرس! تم ایک مقدس پیشے سے وابستہ ہو۔'' اس نے نرم لہجے میں کہا۔ ''اگر کسی بھی وجہ سے تم سے کوئی غلطی ہوگئی ہے تو یہ اس کی تلافی کا پہلا اور آخری موقع ہے۔ کاشف کی بیماری کی پوری کہانی ہمیں معلوم ہوچکی ہے۔ ہم نے زہر کی وہ شیشی بھی قبضے میں لے لی ہے، جس کے دو تین قطرے ہر رات کاشف کو اس لیے دیے جاتے تھے کہ وہ اپنی ذہنی بیماری سے صحت یاب نہ ہو۔ تم اس کارروائی میں شامل تھیں لیکن اس وقت قانون کی مدد کرکے تم نہ صرف اپنے جرم کی سنگینی کم کرسکتی ہو بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ عدالت اسے پہلی غلطی قرار دیتے ہوئے تمہارے تعاون کے پیش نظر تمہیں معاف کردے۔ میری بات سمجھ رہی ہو، نا۔ اب پوری سچائی سے مجھے بتاؤ کہ یہ کام ثاقب کب سے کررہا تھا؟''

''اوہ نو، انسپکٹر۔'' نرس انسپکٹر چٹھہ کی طرف پلٹی۔ ''ثاقب ایک احمق نوجوان ہے۔ اس کے پاس اتنی عقل نہیں۔ دواؤں اور زہروں کا اتنا علم نہیں رکھتا۔ یہ ساری پلاننگ تو جاگیردار صاحب کی ہے۔ یہ میں بھی نہیں جانتی کہ وہ کون سا زہر ہے، جاگیردار صاحب ہی کہیں سے لاتے تھے۔ ثاقب تو بس اسے ہر رات اپنے ہاتھ سے دینے کا قصوروار ہے۔''

راہداری میں موجود ہر فرد کی نظر بیک وقت چوہدری حشمت علی کی جانب اٹھی۔ جو بڑی بے پروائی سے سینہ تانے کھڑا تھا۔

''میں نے ایک آخری بازی کھیلی تھی، انسپکٹر چٹھہ!'' چوہدری صاحب کے لہجے میں کوئی کمزوری نہیں تھی۔ ''مگر ہار گیا، محض اپنے اس بے وقوف بیٹے کی وجہ سے جس کے لیے میں نے سب کچھ کیا تھا۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے۔ دانا دشمن سے نادان دوست زیادہ خطرناک ہوتا ہے مگر...... میں بہت دور اندیش آدمی ہوں انسپکٹر! میں نے اس بُرے وقت کے لیے بھی ایک چال رکھ چھوڑی تھی۔ جب تک میں زندہ

ہوں [illegible] ہتھکڑی نہیں ڈال سکتے۔'' اور اس [illegible] صاحب کا مقصد سمجھ سکتا، انہوں [illegible] منہ میں کھول دی۔ پتا نہیں اس دوران کس وقت انہوں نے ایک سریع الاثر زہر کا کیپسول اپنی مٹھی میں چھپالیا تھا۔

جب تک انسپکٹر چٹھہ اور شرجیل کوئی قدم اٹھاتے، چوہدری صاحب لڑکھڑا کر زمین پر گرے اور ساکت ہو گئے۔ یقیناوہ کیپسول سائنائڈ پوائزن کا تھا۔ راہداری میں ایک کڑوی بُو نے اس کی تصدیق کر دی۔

☆☆☆

تمام واقعات نائلہ، صغراں اور نرس کے بیانات کی روشنی میں پہلے ہی واضح ہو چکے تھے۔ چوہدری صاحب کی موت نے ثاقب کی قوتِ مزاحمت بھی ختم کر دی۔ اس نے اپنے اعترافِ جرم میں تمام الزامات کی ذمّے داری قبول کر لی، صرف اتنے اضافے کے ساتھ کہ شروع میں چوہدری صاحب نے اسے بھی اپنے منصوبے سے بے خبر رکھا تھا۔ اس کی زبان سے نائلہ کا واقعہ سنتے ہی انہوں نے اپنے خاص آدمیوں کو پرانی حویلی بھیج کر اپنے اور ثاقب کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی بے ہوش نائلہ کو اٹھوا کر نئی حویلی کے تہ خانے میں بند کرا دیا تھا۔ یہ بات انہوں نے دوسرے دن ثاقب کو بتائی اور تب سے صرف ثاقب ہی کو آگے رکھا تاکہ محبوس نائلہ اور بوڑھی ملازمہ دونوں ہی اسے تمام واقعات کا ذمّے دار خیال کرتی رہیں۔ اس میں ان کی مصلحت یہ تھی کہ وقت گزرنے کے ساتھ جب نائلہ کی مزاحمت کمزور پڑ جائے گی تو وہ اس کے ہمدرد بن کر، یوں جیسے انہیں اچانک تمام باتوں کا علم ہوا ہو، تہ خانے سے آزاد کر دیں گے، اور پھر کچھ وقت گزرنے کے بعد اسے سمجھا بجھا کر ثاقب سے شادی پر آمادہ کر لیں گے۔ یہ بہرحال ان کا ایک خیال تھا کہ شاید نائلہ ان کی بات مان لے۔ کاشف کو بڑی بہن کی گمشدگی اور پھر موت سے واقعی گہرا صدمہ پہنچا تھا مگر وہ ٹھیک ہو جاتا، یہ صرف چوہدری صاحب کی سازش تھی کہ وہ مسلسل بیمار چلا آرہا تھا اور اس سے ان کا مقصد پوری جاگیر پر قبضہ کرنا تھا۔ نرس بھی ثاقب کا شکار بن چکی تھی اور ثاقب نے اسے شادی کا لالچ دے کر ساتھ دینے پر آمادہ کیا تھا۔ اعترافِ جرم کے بعد ثاقب کا مقدمہ عدالت میں پیش کر دیا گیا، جہاں سے بالآخر اسے عمر قید کی سزا ہو گئی۔

کاشف چند ہفتوں کے علاج کے بعد بالکل صحت یاب ہو گیا۔ وہ سب ایک بار پھر نئی حویلی میں خوشگوار زندگی بسر کرنے لگے اور اس مرتبہ وہ تنہا بھی نہیں تھے بلکہ، شریفاں پھوپی اور شرجیل بھی ان کے ساتھ تھے۔

جس مکان میں شریفاں بیگم نے اپنی آزمائش کے دن گزارے تھے وہ مکان ثاقب کی بیوی اور دو بچوں کو دے دیا گیا جہاں نائلہ اور شرجیل ہر طرح ان کا خیال رکھتے اور خبر گیری کرتے تھے۔

ان واقعات کے تقریباً تین ماہ بعد جب سب کچھ معمول پر آگیا تھا۔ ایک رات نائلہ اور شرجیل پھولوں کے کنج میں بیٹھے تھے کہ شرجیل بولا۔ ''مجھے وہ بات کہہ ہی دینا چاہیے جس کا وعدہ میں نے اس عید سے ایک دن قبل کیا تھا مگر اس سے پہلے کہ میں کچھ کہوں...... یہ جاننا چاہوں گا کہ تم مجھ سے کون سی بات کہنا چاہتی تھیں؟''

''میں کچھ پوچھنا چاہتی تھی۔'' نائلہ بولی۔ ''مگر اب ضرورت نہیں رہی۔ کیونکہ میرے سوال کا جواب کوئل پہلے ہی دے چکی ہے۔''

''پہلے میں کچھ بتانا چاہتا تھا مگر...... آج کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔''

''کوئی فائدہ نہیں۔'' نائلہ مسکرائی۔ ''ممتحن کی غفلت سے پرچہ پہلے ہی آؤٹ ہو چکا ہے۔''

''پھر طالب علم کو پاس کیا جائے گا یا دوبارہ امتحان لینے کا خیال ہے؟'' شرجیل نے شرارت بھرے لہجے میں کہا۔

''سنا ہے طالب علم جب پروفیسر بن جائے، تو اس کا امتحان صرف ایک ہی ہستی لے سکتی ہے...... اس کی بیوی۔''

''تو پھر......''

''اوہو......'' وہ جلدی سے بات کاٹ کر بولی۔ ''یہ مسئلہ ہمارے طے کرنے کا نہیں۔''

''اوہو، یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔'' شرجیل نے سر کھجایا۔

''چلو پھر ابھی امی کے سامنے پیش کیے دیتے ہیں۔''

اب تک یہ باتیں بڑی سنجیدگی اور آزادی سے ہو رہی تھیں مگر شرجیل کی بات سنتے ہی نائلہ کو کچھ ایسی حیا دامن گیر ہوئی کہ وہ گھوم کر حویلی کی طرف بھاگی۔

''اتنی جلدی بھی کیا ہے؟'' شرجیل نے پکارا۔ ''مجھے بھی تو آنے دو۔''

اور یہ الفاظ سن کر نائلہ کی رفتار کچھ اور تیز ہو گئی۔

Pakistanipoint Waqar Azeem

مجرم شناس

سلیم انور

کام چور… کاہل اور تن آسان لوگ محنت تو کر نہیں سکتے… مگر جب طبیعت لالچ پر مائل ہو تو حریص بن جاتے ہیں ایسی ہی ایک بدنیت عورت کا احوال… اسے مال غائب کرنے کا نادر موقع مل گیا تھا…

اپنی سوچوں کو حقیقت کا روپ دینے والے مجرم کا گھیراؤ……

شیرف اسٹیلا، لارا ٹیلر کے بیڈروم کی کھڑکی کا مکمل معائنہ کرنے کے بعد گویا ہوئی۔ ”اس بات کا کوئی نشان نہیں ہے کہ کھڑکی زبردستی کھولی گئی ہے۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ کھڑکی اندر سے بند تھی؟“

”میرا یہی خیال ہے۔“ ساٹھ سال سے زیادہ عمر کی پُرکشش عورت نے جواب دیا۔ ”لیکن جب میں گھر واپس لوٹی تو یہ چوپٹ کھلی ہوئی تھی اور میری جیولری غائب تھی۔ ساتھ ہی میرا پیارا میوزک بکس بھی موجود نہیں تھا۔“ اس نے

اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''یہ وہ آخری تحفہ تھا جو میرے آنجہانی شوہر نے مجھے دیا تھا۔''

اتنے میں انہیں جالی دار بیرونی دروازے کی زوردار آواز سنائی۔

''یہ ڈپٹی ہیری ہوسکتا ہے۔'' شیرف اسٹیلا نے کہا۔

لیکن جب دونوں خواتین ہال وے سے گزر کر لیونگ روم میں پہنچیں تو انہیں وہاں ڈپٹی شیرف کے بجائے خاکستری بالوں اور ایتھلیٹک جسم والی عورت دکھائی دی جو پسینہ جذب کرنے والی قمیص اور پتلون پہنے ہوئے تھی۔

''لارا، باہر پولیس کی دو کاریں موجود ہیں...... اور پولیس مین تمہارے لان میں کیکٹس کے اطراف میں فلیش لائٹ سے جائزہ لے رہا ہے...... کیا ہوا ہے؟''

''اوہ میگی، آج جب میں بنگو گیم کھیلنے گئی ہوئی تھی تو کوئی میرے بیڈ روم کی کھڑکی توڑ کر اندر گھس آیا اور میری جیولری چرا کر لے گیا۔''

''یہ تو بہت برا ہوا۔'' میگی نے شیرف اسٹیلا کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم نئی لیڈی شیرف ہو، ہے نا؟''

شیرف اسٹیلا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''کیا کوئی سراغ ملا؟''

''ہم نے ابھی تحقیقات کا آغاز کیا ہے، میڈم۔''

''اوہ، یقیناً...... اور مجھے میڈم کہنے کی ضرورت نہیں۔ میرا نام میگی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ لارا ٹیلر کی جانب گھوم گئی۔ ''لارا تم نے شیرف کو اس عجیب آدمی کے بارے میں بتایا جو آج ہمارے محلے میں گھوم رہا تھا؟''

''کون سا عجیب آدمی...... وہ تمہارا مطلب اس کارپٹ کلیننگ سیلز مین سے ہے۔'' لارا ٹیلر نے یہ کہتے ہوئے کافی ٹیبل پر رکھا ہوا ایک بروشر اٹھایا اور شیرف اسٹیلا کی جانب بڑھا دیا۔ ''وہ یہ بروشر چھوڑ گیا تھا لیکن یہ آج صبح کی بات ہے، آج شام کی نہیں۔''

''اس کے باوجود بھی ہم کچھ کہہ نہیں سکتے۔'' میگی نے بھویں اچکاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یہ کہتے ہوئے اچھا تو نہیں لگ رہا لارا لیکن تمہارا اپنی بھتیجی کے بارے میں کیا خیال ہے؟ اسے معلوم تھا کہ تم آج رات گھر سے باہر رہو گی۔ اس نے تمہیں کارل کی فلم دیکھنے کی دعوت کے جواب میں نہیں کہتے ہوئے سنا تھا اور تمہیں یہ کہتے ہوئے بھی سن لیا تھا کہ تم پہلے ہی کمیونٹی سینٹر میں بنگو کھیلنے کا پلان بنائے ہوئے ہو۔''

''کیتھی کے ساتھ کچھ معاملات ہوسکتے ہیں میگی لیکن چوری چھپے زبردستی اندر گھس آنا اور چوری کرنا......''

''وہ ماضی میں بھی تمہاری چیزیں چوری کرتی رہی ہے۔''

''ہاں لیکن......'' لارا تیوریاں چڑھاتے ہوئے دھم سے کاؤچ پر بیٹھ گئی۔

اتنے میں باہر سے آوازیں سنائی دیں اور ڈپٹی ہیری اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے دو افراد بھی تھے۔

''کارل!'' لارا ٹیلر نے حیرانی سے کہا۔ ''کیتھی!''

''کھڑے ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، لارا۔'' چاندی جیسے بالوں والے دُبلے پتلے شخص نے کہا۔ ''ڈپٹی ہیری نے ہمیں بتا دیا ہے کہ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ یہ اچھا ہوا کہ تم اس وقت یہاں موجود نہیں تھیں۔ البتہ کاش میں یہاں موجود ہوتا۔ میں اس چور کو دیکھ لیتا۔''

ڈپٹی ہیری کے پیچھے آنے والی دوسری ہستی ایک عورت تھی جو ٹی شرٹ اور گھسی ہوئی جینز میں ملبوس تھی۔ وہ چیونگم چبا رہی تھی اور وہ اس کا...... غبارہ بنا کر پھوڑتے ہوئے بولی۔ ''کاش میں بھی آس پاس موجود ہوتی، آنٹی لارا...... یہ کتنی غلیظ حرکت ہے کہ کوئی گھناؤنا شخص تمہاری جیولری چرا کر لے گیا۔''

''وہ جو کوئی بھی تھا یا تھی وہ تمہاری آنٹی کا میوزک بکس بھی چرا لے گیا ہے، کیتھی۔'' میگی نے کہا۔ ''وہی میوزک بکس جسے آج سہ پہر تم حریصانہ نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔''

''تم کہنا کیا چاہ رہی ہو؟''

''کچھ نہیں ڈارلنگ۔'' لارا نے درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''بس ہمیں یہ بتا دو کہ یہ تمہاری حرکت تو نہیں ہے؟''

کیتھی نے اپنے اطراف موجود مشتبہ چہروں کا جائزہ لیا اور پھر بولی۔ ''اوکے، یہ حرکت میری نہیں ہے۔''

''اگر تم جائے واردات سے اپنی عدم موجودگی کے بارے میں وضاحت بیان کر دو تو اس سے اور مدد مل جائے گی۔'' کارل نے مشورہ دیا۔

''جائے واردات سے عدم موجودگی؟'' کیتھی نے غصے سے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔ ''بھلا مجھے جائے واردات سے اپنی عدم موجودگی کی وضاحت کی کیا ضرورت ہے؟ کیا تمہارے پاس اپنی عدم موجودگی کا کوئی ثبوت ہے؟''

یہ سُن کر کارل کا بدن تن گیا اور اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ کیتھی نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''ہوسکتا ہے کہ تم

مووی تھیٹر سے چوری چھپے باہر نکل آئے ہو اور یہاں واپس آ کر تم کھڑکی کے راستے اندر گئے ہو اور چوری کی یہ واردات کر لی ہو۔ ہر کسی کے علم میں ہے کہ آنٹی لارا نے تمہارے ساتھ فلم دیکھنے جانے کے بجائے بنگو کے کھیل کے لیے جانے کو ترجیح دی تھی تو تم پاگل ہو گئے تھے یا......'' کیتھی یہ کہتے ہوئے گھوم گئی اور میگی کو گھورتے ہوئے بولی۔ ''یا یہ کہ یہ حرکت تمہاری بھی ہوسکتی ہے۔ بظاہر تو تم خود کو آنٹی لارا کی دوست کہتی ہو لیکن یہ بات صاف ظاہر ہے کہ تم ان کے حسن اور دولت سے حسد کرتی ہو۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے......''

''یا......'' کیتھی اسی کیفیت میں بولتی رہی۔ ''یا سب سے کم مشکوک فرد کون ہوسکتا ہے، آنٹی لارا؟ تمہارے بارے میں کیا خیال ہے؟ ہوسکتا ہے کہ کوئی بھی چیز چوری نہ ہوئی ہو؟ ہوسکتا ہے کہ تم نے تمام چیزیں کسی جگہ چھپا دی ہوں اور بیمہ کمپنی سے وصولیابی کی توقع کر رہی ہو؟''

''میں بھلا ایسا کیوں کروں گی......؟''

''یہ حرکت تم میں سے کسی کی بھی ہوسکتی ہے۔'' کیتھی نے چیختے ہوئے کہا اور پھر دوڑتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔

ڈپٹی ہیری اس کے پیچھے لپک گیا۔

''رک جاؤ۔'' شیرف اسٹیلا نے آدھے راستے میں اسے جالیا۔ ''اسے جانے دو۔ ہمیں صرف ایک سرچ وارنٹ کی ضرورت ہے۔ پھر ہم اسے حراست میں لے لیں گے۔''

''تلاشی کا وارنٹ؟'' ڈپٹی ہیری نے پوچھا۔ ''تمہارا مطلب کیتھی کے گھر کی تلاشی کے وارنٹ سے ہے؟''

''نہیں، میگی کے گھر کی تلاشی کے وارنٹ سے ہے۔ اس نے کیتھی سے کہا تھا کہ لارا کا میوزک بکس بھی چوری ہو گیا ہے جبکہ لارا نے یہ بات میگی سے بالکل بھی نہیں کہی تھی۔ لارا نے میگی کو صرف یہ بتایا تھا کہ اس کی جیولری چوری ہو گئی ہے۔ میگی کو میوزک بکس کی چوری کا علم صرف اس صورت میں ہوسکتا تھا اگر وہی چور تھی۔'' شیرف اسٹیلا نے وضاحت کی۔

میگی کے گھر کی تلاشی کے وارنٹ سے لیس جب شیرف اسٹیلا اور ڈپٹی ہیری نے اس کے گھر کی تلاشی لی تو تمام چوری شدہ مال اس کے گھر سے بازیاب ہو گیا۔

تفتیش کے دوران میں تھوڑی سی سختی اختیار کرنے پر میگی کھل گئی اور اس نے اقرارِ جرم کر لیا۔ اس روز صبح کے وقت جب وہ لارا سے ملنے کے لیے آئی تھی تو اس نے موقع پا کر لارا کے بیڈروم کی کھڑکی کی چٹخنی کھول دی تھی۔ پھر وہ لارا کے بنگو کھیلنے کے لیے جانے کا انتظار کرتی ہے۔ جب لارا چلی گئی تو وہ کھڑکی کے راستے بیڈروم میں کود گئی اور اس کی جیولری اور میوزک بکس چرا کر لے گئی۔

روایتی حریف

قمر لبے پہلی مرتبہ لندن گئے۔ سڑکوں اور بازاروں کی سیر کرتے کرتے انہیں کسی بیت الخلا کی ضرورت محسوس ہوئی۔ شہر میں اجنبی تھے۔ تلاش بسیار کے بعد بھی کوئی گوشۂ راحت نہ مل سکا۔ تقاضائے فطرت زور مار رہا تھا۔ تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق ایک تنگ اور ویران سی گلی میں گھس گئے تاکہ مثانے کا بار ہلکا کر سکیں۔

وہ تیاری کے اولین مرحلے میں تھے کہ لندن پولیس کا ایک ٹامی بلائے ناگہانی کی طرح وہاں نازل ہو گیا۔

اس کے خشم ناک استفسار پر قمر لبے نے اپنی مجبوری بیان کی۔ ٹامی نے سختی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہرگز نہیں......تم یہ جگہ گندی نہیں کر سکتے......'' پھر ان کا بگڑا ہوا منہ دیکھ کر بولا۔ ''آؤ......میرے ساتھ آؤ۔''

چند پُر پیچ راستوں سے گزر کر وہ انہیں ایک خوب صورت باغ میں لے گیا جہاں ہر طرف رنگا رنگ پودے اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ ٹامی نے ایک باڑھ کے ساتھ لگی ہوئی حسین کیاری کے پاس رک کر قمر لبے کو اجازت دے دی۔

نجات کا ایک گہرا سانس لے کر قمر لبے نے ٹامی سے کہا۔ ''یہ ہے روایتی انگریزوں کی مہمان داری اور رواداری......میں تمہارا ممنون ہوں۔''

ٹامی نے ناک چڑھا کر کہا۔ ''کوئی مہمان داری نہیں۔ یہ فرانس کا سفارت خانہ ہے۔''

ڈھاکا سے خرم علیم کا کارنامہ

آوارہ گرد

قسط نمبر: 44

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھنائونے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہورہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر، سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ اس کی نظروں کے سامنے تھا مگر سوتیلی ماں کے ساتھ۔ اس کا باپ بیوی کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی، جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے انسیت ہوگئی تھی۔ بچے اور بوڑھوں کے سنگم میں چلنے والا یہ اطفال گھر ایک خدا ترس آدمی، حاجی محمد اسحاق کی زیر نگرانی چلتا تھا۔ پھر شہزی کی دوستی ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہوگئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بے حس بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگتا ہے۔ شہزی کا ایک دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون زہرہ بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کھبیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دستِ راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازعہ عرصے سے چل رہا تھا۔ کھبیل دادا، شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آرہا تھا، زہرہ بانو، لئیق شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش ہے۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ ''اسپیکٹرم'' کا زونل چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کرلیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہوجاتی ہے، بعد میں اس میں شکیلہ اور اول خیر بھی شامل ہوجاتے ہیں، عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ لولوش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے بی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دستِ راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر فیگ شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولوش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولوش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک نودولتیا سیٹھ نوید سانچے والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولوش کا ٹاؤٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنی کوششوں میں کامیاب ہوجاتا ہے اور وہ اپنے ماں باپ کو تلاش کرلیتا ہے۔

اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطنِ عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیوٹلسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھجوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیوٹلسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کرلیتے ہیں۔ شہزی، کھبیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کھبیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہوجاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر فیگ کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آجاتا ہے، ٹائیگر فیگ کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولوش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دستِ راست سے جی کوہارا، شہزی کو ٹائیگر فیگ سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری یوٹ میں قیدی بنالیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، بشام پھلگری سے ہوتی ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ بشام اسے پاکستان میں موئن جودڑو سے برآمد ہونے والے طلسم نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہوچکا ہے اور لولوش اور سی جی بھجوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوہارا کی یوٹ میں بلیوٹلسی کے چندر ناتھ، شیام اور کوریلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پٹی باندھ کر بلیوٹلسی کے ہیڈ کوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیوٹلسی کے چیف سی جی بھجوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہوگئی تھی کہ وہ ایک محبِ وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھجوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے شہزی کے ساتھیوں، زہرہ بانو اور اول خیر وغیرہ سے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندر داس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس بری قصاب، سے جی کوہارا اور اس کے ساتھی بھومک کو بے بس کردیتا ہے، وہاں سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد وہاں سے فرار ہوجاتے ہیں۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل پُرفریبیوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ کوہارا اور چندر ناتھ حملہ کردیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی بھجوانی تھا۔ اسے اس تک پہنچنا تھا۔ ممبئی ان کی منزل تھی۔ موہن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لوفر ٹائپ لڑکے ایک رینا نامی لڑکی کو تنگ کررہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کررہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کرڈالی۔ رینا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں رینا کے باڈی گارڈ وہاں آجاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ ایل کے ایڈوانی کی

ملتا ہے۔ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ ہوگیا تھا۔شہزی، رینا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔رینا، شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیو تلسی تک پہنچ جاتا ہے۔پھر وہاں کی سیکیورٹی سے مقابلے کے بعد بلیو تلسی کے ہیڈ کوارٹر میں تباہی مچادیتا ہے اور سی جی بھجوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا ہوا تھا۔سی جی بھجوانی، شہزی کے گن کے نشانے پر تھا مگر اسے مار نہیں سکتا کہ شہزی کے ساتھی اول خیر، شکیلہ اور کھبیل دادا اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی ''انڈیمان'' پہنچا دیے گئے تھے۔کالا پانی کا نام سن کر شہزی گنگ رہ جاتا ہے کیونکہ وہاں جانا ناممکنات میں تھا۔اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے سی جی بھجوانی کو ٹارچر کرتا ہے۔بھجوانی مدد کے لیے تیار ہوجاتا ہے۔اس اثنا میں کورنیلا فون پر بتاتی ہے کہ تینوں کو ''کلی منجارو'' پہنچا دیا گیا ہے۔یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہو جاتا ہے۔اچانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔مقابلے میں سی جی بھجوانی مارا جاتا ہے۔پھر شہزی کی ملاقات ناناشکور سے ہوتی ہے، جو ممبئی کا ایک بڑا سمگلر تھا۔ناناشکور شہزی کی مدد کے لیے تیار ہوجاتا ہے اور پھر شہزی، سوشیلا اور ناناشکور کے ہمراہ کلی منجارو کی طرف روانہ ہوجاتا ہے۔ناناشکور کی سربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔چمائی کے گھنے دلدلی جنگل کی حدود شروع ہوچکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہریلے تیروں سے حملہ کر دیتے ہیں۔شہزی اپنی گن سے جوابی فائرنگ کرکے کچھ جنگلی وحشیوں کو ختم کردیتا ہے۔پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں مگر تاریکی کی وجہ سے ناناشکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہوجاتا ہے۔اس سناٹے میں اب شہزی اور زخمی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ وہ ایک نیم صحرائی علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں حدِنگاہ کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔سوشیلا کو جیپ میں چھوڑ کر خود ایک قریبی پہاڑی کا رخ کرتا ہے تاکہ راستوں کا تعین کرسکے۔واپسی کے لیے پلٹتا ہے تو ٹھٹک کر رک جاتا ہے۔کیونکہ ہر طرف رینگتے ہوئے کالے سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈنک والے بچھو نظر آئے۔یہ سیاہ پہاڑی بچھو تھے جنہیں دیکھ کر شہزی کے اوسان خطا ہوجاتے ہیں۔بچھوؤں سے بچ نکلنے کے لیے وہ اندھادھند دوڑ پڑتا ہے۔ڈھلوان پر دوڑتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے اور چٹانی پتھر سے ٹکرا کر بے ہوش ہوجاتا ہے۔ہوش میں آنے پر خود کو ایک لانچ میں پاتا ہے۔وہ لانچ میجر کیم کھلا اور اس کی بیٹی سونگ کھلا کی تھی۔وہ نایاب کالے بچھوؤں کے شکاری تھے اور بچھوؤں کا کاروبار کرتے تھے۔اچانک سونگ کھلا کی نظر بے ہوش شہزی پر پڑتی ہے اور اسے ان بچھوؤں سے بچالیتی ہے مگر سوشیلا کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔شہزی خود کو ایک ہندو ظاہر کرکے فرضی کہانی سنا کر باپ بیٹی کو اعتماد میں لے لیتا ہے۔اس اثنا میں بری مسلم گروپ کا مجاہد تولا ان پر حملہ کردیتا ہے۔شہزی کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیم کھلا کو بے گناہ اور مظلوم بری مسلمانوں کے قتل کا ٹاسک ملا ہوا ہے تو وہ کیم کھلا اور اس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کردیتا ہے، پھر نارتھ انڈیمان کے ساحل کا رخ کرتا ہے۔جہاں کلی منجارین سے ٹاکرا ہو جاتا ہے۔شہزی گھات لگا کر ان کے ایک ساتھی دیال داس کو قابو کرلیتا ہے اور اس کا بھیس بھر کر ان میں شامل ہوجاتا ہے۔وہاں پتا چلتا ہے کہ اس سارے چکر میں جنرل کے ایل ایڈوانی کا ہاتھ ہے اور اس کا نائب بلراج سنگھ بھی موجود ہے۔جنرل ایڈوانی یہاں اپنے خاص مشن کی تکمیل اور ٹھکانے کو مضبوط بنانے کے لیے ڈارک کیسل نام کی عمارت تعمیر کروارہا تھا جس کے پیچھے بیرونی طاقتیں تھیں۔ایڈوانی نے اپنے مکروہ مفادات کے لیے کلی منجارین سے مل کر جاوا قبیلے کے سردار کو مار کر پورے جاوا قبیلے کو اپنا غلام بنالیا تھا۔ایڈوانی اور بلراج شہزی کو دیال داس کے بہروپ میں پہچان نہ سکے اور وہ چالاکی سے اپنا اعتماد بحال کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔پھر شہزی منصوبے کے تحت بلراج سنگھ کو جہنم واصل کرتا ہے۔ایڈوانی ڈارک کیسل سے موٹر بوٹ کے ذریعے فرار کی کوشش کرتا ہے۔شہزی ساتھیوں سمیت ایڈوانی کا پیچھا کرتا ہے اور اسے سمندر برد کرکے طلسم نور ہیرا حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے پھر ہندوستانی مچھیروں کے روپ میں پاکستان کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔راستے میں دونوں ملکوں کے کوسٹ گارڈز سے نمٹتے اپنی سرزمین پاکستان پہنچتے ہی زہرہ بانو سے رابطہ کرتا ہے۔ملتان جانے سے پہلے لاڑکانہ پہنچ کر بشام کی بیوہ ارم سے ملتا ہے۔وہاں کا زمیندار شاہ نواز خان جو پہلے بھی ہیرا چوری کرچکا تھا اب دوبارہ حاصل کرنے کے چکر میں بشام کی بیوہ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔شہزی وغیرہ کی آمد پر شاہ نواز خان دھوکے سے بشام کے قتل اور اس کی بیوہ ارم کے اغوا کے جرم کی رپورٹ کرادیتا ہے۔پولیس اول خیر اور کھبیل دادا کو پکڑ کرلے جاتی ہے۔شہزی کو شاہ نواز خان اپنا قیدی بنا کرلے جاتا ہے۔اچانک رات کے سناٹے میں خطرناک ڈاکو پریل جانڈیو حویلی پر حملہ آور ہوتا ہے۔واپسی میں شاہ نواز کی بیٹی سونہڑیں بھی ساتھ ہوتی ہے جو اس کی محبوبہ ہے۔جاتے ہوئے پریل، شہزی کو بھی اپنے اڈے پر لے جاتا ہے۔اسی رات پریل کا نائب لائق ماچھی لانچ میں آکر سازش کرتا ہے اور پریل کو غائب کراکر خود سردار بن بیٹھتا ہے اور سونہڑیں کو تاوان کے لیے قبضے میں کرلیتا ہے۔شہزی، لائق ماچھی کے ساتھی عارب خان کو قابو کرلیتا ہے۔عارب بتاتا ہے کہ پریل کو بے ہوش کرکے ایک گہرے گڑھے میں ڈال دیا ہے صبح تک جنگلی کتے اس کا کام تمام کردیں گے۔ شہزی، پریل کو بچالانے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔پریل، شہزی کا احسان مند ہوتا ہے اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شہزی کے ساتھیوں اور سونہڑیں کو چھڑانے کے لیے تھانے پر حملہ کرتا ہے مگر رینجرز کی اینٹی ڈکیت فورس وہاں پہلے سے موجود تھی۔مقابلے میں پریل اور اس کے ساتھی مارے جاتے ہیں۔ شہزی اور اس کے ساتھی رینجرز کی تحویل میں چلے جاتے ہیں۔ شہزی، میجر وسیم کو اپنے بارے میں تمام حقائق سے آگاہ کرتا ہے، میجر وسیم، شہزی پر اعتماد کرتے ہوئے بھاری نفری کے ساتھ شاہ نواز کے خفیہ ڈیرے پر ریڈ کرکے طلسم نور ہیرا برآمد کرلیتے ہیں۔اس مہم کے بعد شہزی اپنے ساتھیوں سمیت ملتان کا رخ کرتا ہے جہاں شہزی کے والدین اور زہرہ کی نگاہیں منتظر تھیں۔پاکستان پہنچ کر شہزی کو پتا چلتا ہے کہ عارفہ، نوید سانچے والا کی قید میں ہے عارفہ کو رہائی دلا کر نوید کو قانون کے شکنجے میں دے دیتا ہے پھر زہرہ کے تعاون اور ماں باپ کی دعاؤں کے سائے میں عابدہ کی رہائی کے لیے کھبیل دادا اور شکیلہ کے ساتھ نئے مشن پر امریکا روانہ ہوتا ہے۔طیارہ ابھی پاکستانی حدود میں تھا کہ شہزی کو ایک شناسا آواز نے چونکا دیا۔یہ وزیر جان تھا۔اور بینکاک ائرپورٹ سے شہزی کو ہیروئن اسمگلنگ کی دھمکی دے کر اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔مگر شہزی، وزیر جان کو چکما دے کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوجاتا ہے اور ایک تھائی لڑکی سانچی سے ملاقات ہوجاتی ہے۔وہاں ایک شاپنگ مال میں کچھ دہشت گرد حملہ آور ہوتے ہیں اور لوگوں کو یرغمال بنا کر اپنے قیدی چھڑانا چاہتے ہیں۔ان کا سرغنہ، شہزی کے ہاتھوں مارا جاتا ہے جو کاسیا کو کا آدمی ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

ہوش میں آنے پر مجھے سب سے پہلا احساس شدید قسم کی ٹیس کا ہوا تھا، جو میرے سر کے پچھلے حصے سے اٹھتی محسوس ہوئی تھی، یہی وجہ تھی کہ ہوش آتے ہی میرے حلق سے بے اختیار ایک درد بھری کراہ سی خارج ہوگئی تھی۔

میں نے اپنے بے سدھ ..... پڑے جسم کو جنبش دی اور اپنا ایک ہاتھ سر کے زخم پر رکھا تو وہاں مجھے چپچپاہٹ سی محسوس ہوئی، ایک عقدہ یہ بھی کھلا کہ میں رسن بستہ حالت میں نہیں تھا۔

تھوڑی دیر تک تو میرا ذہن ماؤف سا رہا، کچھ سجھائی نہیں دیا کہ میں یہاں اور ایسی حالت میں کیوں تھا؟ لیکن پھر رفتہ رفتہ جب عقل وخرد کا یارانیم خوابیدہ ذہن کے ساتھ جڑنے لگا تو مجھے سب یاد آتا چلا گیا کہ میں کس طرح تھائی لینڈ آتے ہی بڑے دھواں دھار حالات کا شکار ہو گیا تھا۔

اپنے ازلی دشمن وزیر جان سے ڈرامائی مڈبھیڑ بینکاک کے ایک بڑے اور معروف ترین شاپنگ مال میں خطرناک کرمنلو کے نرغے میں آنا اور کاؤسپا کو نامی ایک بڑے گینگسٹر کے آدمیوں سے خوف ناک ٹکراؤ، سانچی سے ملاقات کا ایک لطیف سا احساس، اور ہلینا کی دکھ بھری کہانی اور اس کا دردناک انجام.....لیکن اس سے بھی بڑھ کر میری آنکھوں میں جو لرزہ خیز منظر ثبت ہوکے رہ گیا تھا وہ کاؤشی کی رہائش گاہ میں اس کی مردہ حالت کا تھا اور ابھی میں اس کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ مجھے وہاں خطرے کا احساس ہوا جسے بھانپنے تک میں خود نامعلوم قاتل یا حملہ آور کی اپنے سر پہ پڑنے والی شدید ضرب کا شکار ہوکے دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہوتا چلا گیا.....

سب سے زیادہ فکر وتشویش کی صورتِ حال میرے لیے کاؤشی کا قتل تھا۔ کیونکہ اس کے بغیر میرا تھائی لینڈ سے آگے امریکا کا سفر کھٹائی میں پڑسکتا تھا...بلکہ پڑ ہی چکا تھا۔ اب یہ بھی ہوسکتا تھا کہ پاکستان ٹیلی فونک رابطہ کرکے زہرہ بانو اور زور آور خان کو ساری صورتِ حالات بتاتا اور وہ کوئی اور تدبیر سوچتے۔ دوسری فکر مجھے اس بات کی ہو رہی تھی کہ میرے تھائی لینڈ کے سفری کاغذات کاؤشی کی رہائش گاہ میں پڑے رہ گئے تھے۔ نیز ایک پریشانی مجھے یہ بھی کھائے جا رہی تھی کہ کہیں میں مال میں ہونے والی خون ریزی کے سلسلے میں ہونے والی متوقع تفتیش کی لپیٹ میں نہ آجاؤں، اگرچہ کچھ تسلی تو تھی کہ میں چپ چپاتے ہلینا کے ساتھ نکل آیا تھا اور یقینی طور پر ہماری کوئی تصویر سی سی ٹی وی کیمرے میں نہیں آئی ہوگی، کیونکہ کرمنلو نے سب سے پہلے اندھا دھند فائرنگ کے دوران سی سی ٹی وی کیمرے کو ہی نشانہ بنایا تھا۔ الگ بات تھی کہ میرا چونکہ ان دہشت گرد کرمنلو کے سا اچھا خاصا ٹکراؤ ہوا تھا تو عین ممکن تھا کہ وہاں یرغمالیوں پوچھ گچھ کے دوران میرا ''خیالی خاکہ'' تیار کرکے پور بینکاک میں میری تلاش شروع کردی جاتی۔ اگرچہ میں ایسا کوئی جرم تو نہیں کیا تھا بلکہ عوامی مفاد میں ایک طرح کارنامہ ہی انجام دیا تھا مگر میں اس وقت اپنے بُرے بھ کی پوزیشن میں تھا ہی کب؟ میں ہیرو یا اور کسی حوالے خود کو منظرِ عام پر لانا ہی نہیں چاہتا تھا، البتہ سانچی کی طرف سے میں ذرا تحفظات کا شکار تھا۔

بہر حال...... چند لمحوں میں یہ سب کچھ یاد کر چکنے بعد ہی موجودہ صورتِ حال کا جائزہ لینے پر میری توجہ مرکو ہوئی تھی۔

میری نیم باز سی آنکھوں کے سامنے مدھم مدھم روشنی ہلکورے لے رہی تھی۔ گردوپیش کی تاریکی اس ہلکی روشنی پر سوار تھی۔ شکر تھا کہ میرے ہاتھ پاؤں آزاد تھے۔

میں نے سر کو دو تین بار جھٹکے دے کر درد اور بھاری پن سے مقدور بھر نجات حاصل کرنے کی کوشش چاہی تھی او اس کے بعد میں نے اپنے جسم کو حرکت دی تو احساس ہوا کہ میں کسی سخت جگہ پر پڑا ہوا تھا۔ پہلا احساس فرش کا ہی ہو تھا لیکن جب میں نے اپنے ہاتھ پاؤں پھیلائے اور جسم کو حرکت دی تو نیچے آرہا۔ ہلکے دھڑاکے کی آواز سے میں شاید فرش پر آن گرا تھا اور اسی وقت ''چٹ'' کی ہلکی آواز سے اندھیرے کا پردہ بھی چاک ہو گیا۔

وہ دس بائی بارہ کا کمرا تھا۔ جس کی چھت مخروطی تھی اور گول سا روشندان اس کی ڈھلوانی دیوار پر پیوست نظر آتا تھا۔ روشنی کا مخرج شاید یہی تھا۔ تاہم اب روشنی ہوتے ہی مجھ پر عقدہ کھلا کہ مجھے رسن بستہ کرنے کی ''زحمت'' کیوں نہیں گوارا کی گئی تھی۔

کمرے کے وسط میں فولادی سلاخوں کی دیوار تھی۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ اس نصف گوشہ قید خانے میں فقط میں تھا اور وہ تختہ دار بیڈ جس سے میں لڑھک کر فرش پر گر پڑا تھا جبکہ سلاخوں کی دوسری طرف کھلا ہوا دروازہ تھا اور وہاں مجھے تین افراد نظر آرہے تھے۔ تینوں غیر مسلح تھے۔ دو گماشتہ نما اجنبی اور ایک چہرہ شناسا تھا میرا۔ اسی مکروہ چہرے کو دیکھ کر بے اختیار میرے منہ سے ایک ٹھنڈی سانس خارج ہو کے رہ گئی تھی۔ وہ ہلکے بلو کلر کے بیش قیمت سفاری سوٹ میں ملبوس تھا۔

"کہاں تک بھاگو گے مجھ سے شہزی!؟" اس نے سرسراتے لہجے میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"بھاگ تو تم رہے ہو مجھ سے بزدل انسان! میں تو موت بن کے تمہارے تعاقب میں رہتا ہوں۔" میں نے اُسی سوٹ پوش شخص کو جو بلاشبہ وزیر جان ہی تھا، گھورتے ہوئے ترکی بہ ترکی جواب دیا تھا۔ اس کے چہرے پر سبکی اور تلملاہٹ کے آثار لحہ بھر کے لیے اُبھرے تھے۔ چندی چندی آنکھوں میں پُرطیش سی چمک لہرائی تھی پھر بھیڑیئے کی سی غراہٹ سے مشابہ آواز میں بولا۔

"نہیں شہزی! اب تمہارے گھمنڈ کی یہ بازی مات کی طرف پلٹنے لگی ہے۔ اب تم مجھ سے بھاگو گے اور میں موت بن کر تمہارا تعاقب کروں گا۔ کیا تم نے اپنے تھائی ساتھی کا حشر نہیں دیکھا؟ میرے ایک اشارے پر وہ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ چچ...... چچ...... بے چارہ! تمہیں امریکا پہنچانے کا عزم لیے خود ہی دوسری دنیا میں پہنچا دیا گیا۔"

اس کے تاؤ دلانے والے لہجے نے مجھے دروں و بروں کھولا کے رکھ دیا۔ اس بدبخت کا اشارہ کاؤشی کی طرف تھا۔ میں نے اسے خوف ناک نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ "تمہارے پاس ان بزدلانہ حرکتوں کے سوا اور رہ ہی کیا گیا ہے ذلیل آدمی! تم نے ہمیشہ اب تک معصوم، بے گناہ اور کمزور لوگوں کو ہی اپنی بربریت اور سفاکی کا نشانہ بنایا ہے۔ یہی اوقات ہے تمہاری بس......"

"اپنی زبان کو لگام دو شہزی!" وہ بپھرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ایسا نہ ہو کہ میں وقت سے پہلے تمہارے سلسلے میں کوئی اٹل فیصلہ کر ڈالوں۔"

"وقت کی ڈور صرف میرے اللہ کے ہاتھ میں ہے، جو تمہارے جیسے شیطانوں کی رسی کو ایک حد تک دراز رکھتا ہے۔ اپنی فکر کرو، کہیں تم زندگی کی یہ چند سانسیں مستعار تو نہیں گزار رہے ہو۔" میری اس جوابی کارروائی پر اس کے چہرے پر غضبناکی سوا ہوتی نظر آنے لگی۔ آنکھوں سے نفرت و انتقام کے شرارے پھوٹتے محسوس ہوئے۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے، بتدریج اس کی حالت نارمل ہوتی چلی گئی۔ اس نے اپنے حلق سے ایک بدمست سا شیطانی قہقہہ اگلا اور دوسرے ہی لمحے سرسراتے لہجے میں بولا۔

"اگر ماسٹر چیف (لولووش) کا حکم نہ ہوتا تو میں تمہیں بڑی اذیت ناک موت سے دوچار کرتا کہ تم زندگی کے بجائے مجھ سے موت کی بھیک مانگ رہے ہوتے۔"

اس کی یہ بات سُن کر میں بے اختیار دل میں مسکرایا تھا۔ اسے تاؤ دلانے کا میرا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ اپنے بچے کھچے غرور کے زمین بوس ہوتے پہاڑ اور انا کی بکھری ہوئی ریت کو مٹھی میں سمیٹنے کی ناکام کوشش کے جوش تلے اس نے ایک طرح سے مجھے اس "تسلی" سے باخبر کر دیا تھا کہ وہ مجھے فوری طور پر کوئی جانی نقصان پہنچانے کا ارادہ نہیں رکھے ہوئے تھا۔ تاہم یہ سوچا جا سکتا تھا کہ مجھے ابھی ہلاک نہ کرنے یا زندہ رکھنے کا اس کے "ماسٹر چیف" یعنی لولووش کا مقصد آخر کیا ہو سکتا تھا؟

لہٰذا یہی کچھ وزیر جان کے منہ سے اگلوانے کے لیے میں نے بدستور اسی روش کو اختیار کرتے ہوئے دانستہ اس کا مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا۔ "اوہ...... پھر تو تمہارا ماسٹر چیف مجھے زندہ رکھ کر بڑی فاش غلطی کر رہا ہے۔ کیونکہ میں اس کے کسی کام کا نہیں ہوں...... ہاں! اگر کسی معاملے کی ڈیل کی بات ہو تو اور بات ہے۔"

"تم اب اپنی اوقات بھلا رہے ہو مسٹر شہزی! ڈیل، محکوم دشمنوں سے نہیں کی جاتی۔" وزیر جان زہریلی مسکراہٹ سے بولا۔ "تمہاری حیثیت اب ہمارے سامنے کسی بڑے یا ٹکر کے دشمن کی نہیں رہی ہے شہزی! وہ کہتے ہیں ناں کہ پتھر اپنی جگہ پر ہی بھاری ہوتا ہے، اپنی جگہ سے لڑھکتا ہے تو پھر ٹھوکروں پہ رہتا ہے۔ تم بھی اب ہماری ٹھوکروں پہ ہو۔ کیونکہ پاکستان چھوڑ کر تم نے بڑی خطرناک غلطی کی ہے۔"

"یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ کون غلطی پر ہے۔" میں نے بھی اسی بے پروائی سے کہا۔ ورنہ تو سچی بات یہی تھی کہ اس بدبخت نے کچھ ایسا غلط بھی نہیں کہا تھا۔ کیونکہ پاکستان میں جب تک میں اپنے ساتھیوں اور بہی خواہوں کی چھایا میں تھا تو چوہدری ممتاز سمیت وزیر جان اور اسپیکٹرم کی باقیات کو ناکوں چنے چبوا چکا تھا۔ یہاں تک کہ وطنِ عزیز سے اسپیکٹرم کے بخیے تک ادھیڑ ڈالے تھے۔ یہی نہیں پاکستان کے ازلی دشمن "را" کے خطرناک اور ذیلی ونگ "بلیو تلسی" تک کو بھی نابود کر کے رکھ دیا تھا۔ انڈین خفیہ ایجنسی کا ایک بڑا اور خطرناک جاسوس جسے اسپیکٹرم کی مدد سے پاکستان میں داخل کیا گیا تھا اسے بھی گرفتار کروایا تھا۔

اسپیکٹرم اب وزیر جان کی صورت میں اپنے یہ "زخم" کسی خارش زدہ کتے کی طرح اب تک چاٹ رہا تھا۔ اب جبکہ انہیں یہ بھنک پڑی کہ میں عابدہ کو رہائی دلانے کے عزمِ مصمم تلے اپنے وطن کی سرحدیں عبور کر آیا ہوں تو اسپیکٹرم، اعلیٰ قیادت بہ شمول ان کی حلیف جماعتیں "ٹائیگر ٹیگ"، "جیوش بزنس کمیونٹی"، "را" اور وہ لوگ جن کے وسیع تر

مفادات کی سلامتی کے لیے ''اسپیکٹرم'' کا وجود لازمی جزو بن کے رہ گیا تھا۔ ان میں تھرتھلی مچ گئی تھی۔

پاکستان کی خفیہ ایجنسیوں، آرمی اور کمانڈوز کی دھاک یوں بھی پوری دنیا میں تھی۔ یہی سبب تھا اسپیکٹرم نے میرا راستہ روکنے کے لیے اپنے مہرے سرکانا شروع کردیے تھے۔ اس طرح وزیر جان میرا پہلا شکار ثابت ہوسکتا تھا۔ اس کی ہلاکت اسپیکٹرم پر ضربِ شدید کا اثر رکھ سکتی تھی۔ دیکھنا اب یہ تھا کہ ان سارے حقائق کی روشنی کے باوصف لولووش مجھ سے کیا چاہتا تھا؟ ایک ہی بات ذہن میں آتی تھی۔ اڑیسہ کمپنی کے شیئرز کا حصول......

''کسی خوش فہمی میں مت رہنا شہزی کہ ہم کسی ڈیل کے لیے ہاتھ جوڑ کر تمہارے سامنے دوزانو ہو جائیں گے۔'' وزیر جان زہرخند لہجے میں بولا۔ ''تم اپنے دل میں جو عزم لے کر نکلے ہو وہ بہت جلد تم سمیت خاک میں ملنے والا ہے مگر ماسٹر چیف تو دشمنوں سے بھی کام لینے کا ماسٹر ہے۔''

''تو تم مجھے لولووش کے حوالے کرنا چاہتے ہو......؟'' میں نے آنکھیں سکیڑ کر مستفسرانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''ابھی تمہاری اتنی اوقات نہیں ہوئی کہ تمہیں ماسٹر چیف کے سامنے پیش کیا جائے۔'' وزیر جان پُرغرور لہجے میں بولا۔ ''تم سے حساب کتاب کرنے کے لیے میں اور بینکاک کی سرزمین کافی ہے۔''

''کیا چاہتے ہو مجھ سے......؟'' میں نے گفتگو سمیٹنا چاہی۔

''اڑیسہ کمپنی کے شیئرز ماسٹر چیف کے حوالے کر دو......''

''اوہو......تو تمہاری اوقات لولووش نے اتنی گرا کر رکھ دی ہے کہ تمہیں اب اس گھٹیا کام پر لگا دیا۔'' میں نے بے پروائی انداز میں اور زہریلے طنز سے کہا۔ ''اس کے حصول کے لیے تو تمہارے ماسٹر چیف لولووش کا ایک گماشتہ سیٹھ نوید سانچے والا پہلے سے ہی ڈھول چاٹ رہا ہے۔'' میں نے دانستہ اس کی حساس ادارے کی حوالگی کا ذکر نہیں کیا تھا۔

''ماسٹر لولووش سات سمندر پار رہتے ہوئے بھی تمہاری ایک ایک کارگزاریوں سے اچھی طرح واقف ہے۔'' وزیر جان کی شیخیاں جاری تھیں۔ ''پاکستان سے تمہارے اور تمہارے دونوں ساتھیوں، لبیل دادا اور شکیلہ کی امریکا کے لیے نکلنے کی تدبیروں میں مصروف رہنا، زورآور خان کے ذریعے سے بھاری رقوم کے عوض یہ سودا طے ہونے سے لے کر تمہارا تھائی لینڈ اور تمہارے مذکورہ ساتھیوں کا دبئی سے امریکا روانہ ہونے تک سب کچھ ماسٹر لولووش جانتا ہے اور...... یہ بھی کہ تم نے اس کے جاسوس (سیٹھ نوید) کا جو حشر کیا ہے، اس کی سزا تو تمہیں ضرور بھگتنا پڑے گی۔ لیکن اگر تم بغیر کسی چالاکی اور رکاوٹ کے اڑیسہ کمپنی کے شیئرز ماسٹر لولووش کے حوالے کردو تو سمجھو عابدہ سے لے کر اب تک سارا معاملہ ختم......''

اس کی بات نے مجھے اندر سے ہک دک سا کر کے رکھ دیا۔ کہاں تو میں یہ سمجھے ہوئے تھا کہ یہ ساری کارروائی میں چپ چپاتے کرنے میں مصروف تھا اور بڑی کامیابی سے اپنے اس اہم ترین مشن کو خفیہ رکھتے ہوئے جاری رکھے ہوئے تھا۔ اگرچہ مجھے نوشابہ اور وزیر جان کی طرف سے خدشہ تو تھا کہ ضرور اپنی تیسری آنکھ مجھ پر رکھے ہوئے ہوں گے۔ لیکن تب تک ایسا کوئی واقعہ ہی ظہور پذیر نہ ہوا تھا کہ جس سے پتا چلتا کہ میری یہ کارروائی کس حد تک خفیہ اور کامیاب جارہی تھی؟ تو گویا ان لوگوں نے سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی کسی مصلحت کی بنا پر چشم پوشی اختیار کیے رکھی اور ہمارے نکلنے کا راستہ کھلا رکھا۔ یہی وجہ تھی کہ پاکستان سے فلائی کرتے ہی وزیر جان اچانک ایک بھونچال کی صورت میرے سامنے آگیا اور طیارے میں ہم دونوں کی ڈرامائی مڈبھیڑ ہوگئی۔ یہی نہیں بینکاک میں زورآور خان کے ''گروپ'' کے آدمی کاوشی کا سفاکی سے قتل کردیا گیا۔ مجھے اب لبیل دادا اور شکیلہ کی فکر ہوئی۔ تاہم میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

''کاوشی کو تم نے ہی قتل کروایا تھا؟''

''صرف کاوشی کو نہیں......تمہاری اس سلسلے میں مدد کر[illegible]ر پاکستان میں موجود زورآور خان بھی اپنے بھیا[illegible]نجام سے دوچار کر دیا گیا ہے۔'' وہ سفاکانہ مسکراہٹ سے ایک لرزہ دینے والا انکشاف کرتے ہوئے بولا اور میرے پورے وجود میں جیسے موت کی سی سرد لہر دوڑ گئی۔

''تت......تو کیا تم نے زورآور خان کو بھی......!'' باوجود کوشش ضبط کے میں اپنے اندر کی ابھرتی ژولیدگی اور بوکھلاہٹ پر قابو پانے میں ناکام رہا تھا۔

''ہاں......! یہ سب ضروری تھا تاکہ تمہارے آگے جانے کے وہ تمام راستے .... بند ہوجائیں جن کی راہ ہموار کرنے میں زورآور خان کا گروپ مصروف تھا مگر

افسوس کہ ہم سے تھوڑی دیر ہوگئی اور تمہارے دونوں ساتھی (کبیل دادا اور شکیلہ) امریکا روانہ ہونے میں کامیاب رہے لیکن خیر وہ ہمارے لیے خطرناک نہیں ثابت ہوسکتے، امریکا کی سرزمین میں ان دونوں کا شایانِ شان استقبال کرنے لیے ہمارے ساتھی پہلے سے وہاں موجود ہیں۔ مگر ہمارے لیے تم زیادہ اہم تھے اور تم سے ادھر ہی نمٹنے کا فیصلہ کیا گیا۔'' وزیر جان لحہ بہ لحہ یہ لرزہ دینے والے انکشافات کر کے میری دل پاور کو زبردست دھچکے پہنچا رہا تھا۔ تو گویا میں اب تک اندھیرے میں ہی تھا کہ ''سب ٹھیک'' جا رہا تھا۔

''تمہاری ضرور اس معاملے میں اس حرافہ اور دخترِ ابلیس نوشابہ نے مدد کی ہوگی۔ ورنہ تو تم کسی چوہے کی طرح کہیں کونے میں، ڈرے چھپے بیٹھے تھے۔'' میں نے اپنی بوکھلاہٹ اور افسردگی کو چھپاتے ہوئے اس سے کہا۔ وہ بھی طیش میں آنے کے بجائے ہنسا اور شاطرانہ انداز کی معنی خیزی سے بولا۔

''نوشابہ کو بھی تو پالنے والے ہم ہی ہیں۔ اب جوان ہوگئی ہے تو کیا اپنے بڑوں کے کام آنا اس کا فرض نہیں بنتا......؟''

میں بے بسی اور شدید تلملاہٹ کے مارے اپنے ہونٹ چبا کر رہ گیا۔ بقول اس خبیث وزیر جان کے، زور آور خان پاکستان میں ختم کیا جاچکا تھا۔ یہاں میرا آگے (امریکا) جانے کی راستہ بنانے والے کا ڈشی کو بیدردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ یوں حکمت علی اور خفیہ طریقے سے مجھے، کبیل دادا اور شکیلہ کو ان رذیلوں نے جیسے بیچ منجدھار میں چھوڑ دیا تھا۔ یقیناً یہ ساری چالیں اس مردود لولوش نے ہی سات سمندر پار سے ہدایات کی صورت میں وزیر جان کے ذریعے چلی تھیں اور وزیر جان نے نوشابہ کو استعمال کیا تھا۔

''چلو، اب چھوڑو ان باتوں کو اور مقصد کی بات کرو، کیا کہتے ہو پھر شیئرز کے سلسلے میں......؟'' اس نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔

''شیئرز میرے پاس ضرور.... مگر ان پر میرا قانونی اختیار نہیں ہے۔'' بالآخر میں نے مکارانہ مفاہمت سے کام لیتے ہوئے ایک اصولی بات کہی۔

''میں نے کہا ناں...... کہ ماسٹر چیف ہزاروں میل دور رہ کر بھی سب جانتا ہے۔ یہاں تک کے منظور وڑائچ کی وصیت کی وہ کاپی بھی اس کے پاس موجود ہے جس کی رو سے اڑیسہ کمپنی کے پچاس فیصد شیئرز پر کلی طور پر تمہارا ہی اختیار ہے۔''

''یہ تو اچھی بات ہوئی کہ لولوش کو اس سلسلے میں ساری حقیقت کا علم ہے۔'' میں نے چالاکی سے کہا۔ ''کیونکہ تب تو وہ یہ بھی جانتا ہوگا کہ وہ شیئرز اب منظور وڑائچ کے دونوں پوتے پوتیوں کے نام ہوجائیں گے کیونکہ ان کی ماں عارفہ کے سامنے اب نوید سانچے والا کا اصل چہرہ بے نقاب ہوچکا ہے اور وہ راہِ راست پر بھی آچکی ہے۔''

''گیم مت کھیلو شہزی! ہمارے ساتھ......'' وہ غرایا۔ ''شیئرز اب بھی تمہارے اختیار میں ہیں اور تمہیں وہ شیئرز ماسٹر لولوش کے حوالے کرنا ہوں گے۔ بہ صورتِ دیگر تمہاری ایک خوب صورت کمزوری عابدہ کی شکل میں پہلے ہی ہماری.... گرفت میں ہے۔''

عابدہ کے ذکر نے مجھے ملول سا کر دیا۔ مگر اس خنزیر کے منہ سے عابدہ کا نام سن کر میرے رگ و پے میں نفرت و انتقام کی آگ سی دوڑ گئی، تاہم دوسرے ہی لمحے میں خود کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے اس سے بظاہر نارمل لہجے میں بولا۔

''مجھے بیوقوف بنانے کی کوشش مت کرو وزیر جان! میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ عابدہ اس وقت کن لوگوں کے رحم و کرم پر ہے۔'' میں نے جان بوجھ کر اسے رگیدا۔

''ماتم ہی کرنے کو دل کرتا ہے میرا تمہاری اس ناقص معلومات پر۔'' وہ بولا۔ ''عابدہ جن لوگوں کے قبضے... میں ہے، ماسٹر لولوش کے ایک اشارے پر وہ اسے کہاں سے کہاں پہنچا دینے کے لیے ہر.... وقت تیار رہتے ہیں۔ اسپیکٹرم ایک آکٹوپس ہے، جس نے نہ صرف دشمنوں کو بلکہ اپنے دو حلیفوں کو بھی ان کے مفادات کی ڈور سے جکڑے رکھا ہے۔ اسی لیے تو کہتا ہوں کہ اسپیکٹرم سے ٹکر مت لو۔''

''تمہارا خیال ہے کہ اگر میں اڑیسہ کمپنی کے شیئرز لولوش کے حوالے کر دوں گا تو وہ عابدہ کو میرے حوالے کر دے گا؟'' میں نے اس کی لاف گزاف کو صرفِ نظر کرتے ہوئے دانستہ معصومانہ سے انداز میں پوچھا۔

''ہاں!''

اس کی مکاری پر میں دل میں ہنسا تھا کہ یہ مجھے اتنا ہی بےوقوف سمجھے ہوئے ہے۔ تاہم میں اپنے منہ سے ایسا کوئی اظہار کیے بغیر بولا۔ ''اگر ایسی بات ہے تو میرے لیے اس سے اچھی بات اور کیا ہوسکتی ہے کہ شیئرز کے بدلے مجھے عابدہ مل جائے۔ لیکن بہتر ہوگا کہ یہ سب اس ہاتھ لے اور

اس ہاتھ دے کے تحت کیا جائے۔''

''تم پھر اپنی اوقات بھول رہے ہو، شہزی!'' وہ غرایا۔''تم اس وقت ہمارے محکوم ہو مفتوح نہیں...... سمجھے تم...... اور جیسا ہم کہیں گے ویسا ہی تمہیں کرنا ہوگا بہ صورتِ دیگر تمہیں اسی قید خانے میں رہتے ہوئے ایسے ایسے مناظر دیکھنا پڑیں گے کہ تمہارا جسم تو کیا روح تک بلبلا اٹھے گی۔''

اس کی تہدید میرے لیے درگزر کرنے والی نہیں تھی۔ وہ بدبخت مجھے یہاں قید میں رکھتے ہوئے کوئی بھی گل کھلا سکتا تھا۔ لولوڈش کے لیے ہوئے ٹاسک اور سپورٹ تلے وہ پاکستان میں میرے بہی خواہوں کے خلاف کچھ بھی کرسکتا تھا اور ان کے ناپاک عزائم کو جلا بخشنے والی نوشابہ پہلے ہی سے وہاں ایک زخمی ناگن بنی ہوئی تھی۔ تاہم اب میری یہ کوشش تھی کہ وزیر جان اور لولوڈش کو ابھی اپنی حد تک ہی مشغول رہنے دوں تاکہ ان کی گردن تک میرا ہاتھ پہنچ جائے۔ لہٰذا میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے اس سے کہا۔

''مجھے سوچنے کا موقع دے سکتے ہو؟''

میری بات پر اس کے چڑھے ہوئے تیور اترنے لگے۔ بولا۔''سوچنے کا کوئی فائدہ نہیں لیکن ایک پرانے دشمن کا لحاظ کرنا بھی تو معیارِ دشمنی ہے۔ اس لیے صرف آج کی رات...... صبح کا سورج ابھرتے ہی تمہیں صرف ہماری ہدایات پرعمل کرنا ہوگا۔'' اس نے مکروہ ہنسی کے ساتھ کہا اور پھر پلٹ گیا۔ عقب میں دروازہ سلائڈ ہوا اور ان تینوں کے نکلتے ہی وہ دوبارہ برابر ہوکے سپاٹ دیوار کا منظر پیش کرنے لگا۔

میں سلاخوں سے ہٹ کر پلٹا اور تختہ دار بیڈ پر تھکے تھکے اور بوجھل ذہن کے ساتھ بیٹھ گیا۔ وزیر جان کی قید میں آنا معمولی خطرناک بات نہ تھی۔ ایک طرح سے اچھا بھی تھا کہ مجھے یہاں رہتے ہوئے کوئی ایسا موقع مل سکتا تھا کہ میں اس موذی کا ادھر ہی خاتمہ کرڈالتا، اب از بس ضروری بھی ہوگیا تھا۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ پھر اپنے ہاتھ پاؤں پھیلانے لگا تھا اور وہ نوشابہ کو استعمال کرکے پاکستان میں ایک بار پھر اسپیکٹرم اور ''را'' والوں کے لیے راہ ہموار کرنے کی ناپاک کوششوں میں تھا تاکہ را والوں کے مفادات کے لیے کام کرسکے۔

اب تک میرے حالاتِ زندگی میں یہی کچھ ہوتا رہا تھا، میں جہاں بھی اور جدھر بھی دشمنوں کے نرغے میں آیا وہاں میں نے مشیتِ ایزدی اور مصلحت تقدیر ہی پائی تھی، لہٰذا میری یہاں بینکاک میں بھی وزیر جان کے پاس آمد کی حیثیت خالی از علت نہ تھی کہ خدا کی شاید یہی مصلحت تھی کہ مجھے اس موذی اور زہریلے ناگ وزیر جان کو موت کے گھاٹ اتارنے کا موقع مل سکے۔

مجھے کھانے پینے کو کچھ نہیں دیا گیا تھا۔ بھوک کا تو کوئی خاص احساس نہیں ہو رہا تھا مگر پیاس ضرور ستا رہی تھی۔ حلق سوکھ کر کانٹا ہو رہا تھا۔ وزیر جان مجھ سے بُری طرح تپا ہوا تھا۔

تھوڑی دیر بیٹھے رہنے کے بعد میں اٹھا اور گردوپیش کا تفصیلی جائزہ لینے لگا۔ مجھے سب کچھ سپاٹ نظر آرہا تھا۔ در و دیوار اور چھت، ماسوائے ایک روشندان کہ جس سے بلی وغیرہ تو گزر سکتے تھے مگر میرا جیسا لمبا چوڑا آدمی گزرنے سے قاصر تھا۔

ہاں یہ دیکھا ضرور جاسکتا تھا کہ باہر کا منظر اور وقت کیا تھا۔ یہ شاید رات کا کوئی آخری پہر تھا۔

کافی دیر بیت گئی۔ ہر سو خاموشی کا راج تھا۔ اچانک ایک آواز پر میں ٹھٹکا۔ پہلے میں نے اسے اپنا وہم خیال کیا تھا، کیونکہ دروازے کے نام پر صرف ایک سپاٹ دیوار تھی جسے کسی وقت بھی ایک خودکار میکنزم کے ذریعے باہر سے کھولا اور بند کیا جاسکتا تھا۔

ٹھیک اسی وقت وہی سپاٹ دیوار سرسرائی تھی۔ میں اس وقت تختہ دار بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ دروازہ فوراً کھلا۔ اندر مدھم روشنی ہوئی، میں نے بیڈ پر ٹانگیں جھلائے، بیٹھے بیٹھے سلاخوں کے پار مذکورہ دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں اندھیرے کے بطن میں پھوٹتی ہلکی روشنی میں تین افراد کو اندر داخل ہوتے دیکھا۔ پہلے تو میں یہی سمجھا تھا کہ وزیر جان دوبارہ اپنے انہی دو ساتھیوں کے ساتھ آیا ہے۔ تاہم اس کی اتنی جلد دوبارہ آمد کی مجھے کم از کم ابھی کوئی توقع نہ تھی۔

''تو پھر یہ کون تھے؟'' میرے ٹھٹکے ہوئے ذہن میں ابھرا۔ انہوں نے کمرے میں آتے ہی لائٹ بھی نہیں جلائی تھی۔ کیوں؟

کسی انجانے خطرے کے سبب میرا دل کنپٹیوں پہ دھڑکنے لگا اور میں اسی طرح بے حرکت سا بیڈ پر پاؤں جھلائے بیٹھا سامنے تکتا رہا۔ وہ تینوں افراد...... اندر داخل ہوئے مگر ان کے عقب میں، حسب سابق، دروازہ سلائڈ ہو کے بند نہیں ہوا تھا۔ ان تینوں کا انداز بھی مجھے خاصا مشکوک دکھائی دے رہا تھا۔ وہ مجھے بظاہر غیر مسلح ہی دکھائی

رہے تھے۔ وہ تینوں چست لباس میں سیاہ ہیولوں کی صورت ہی نظر آ رہے تھے اور فل ماسک میں تھے۔ دبے پاؤں سلاخوں کے قریب آئے اور پھر ایک نے مجھ پر پنسل ٹارچ کی روشنی پھینکی۔ جو سیدھی میرے چہرے پر پڑی۔ میری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور ان کی جانب ہی گھور رہی تھیں۔

''شی شی ی ی...... کوئی آواز نکالے بغیر ادھر آ جاؤ۔'' ان میں سے ایک نے اسرار بھری سرگوشی میں مجھ سے کہا اور میرا ماتھا ٹھنکا۔

''یہ کیا معاملہ تھا؟ کیا وزیر جان میرے ساتھ کوئی چال چل رہا تھا یا پھر یہاں میرا کوئی نجات دہندہ پیدا ہو گیا تھا جس کی توقع پہلے ہی مجھے ''صفر'' ہی نظر آئی تھی۔

میں اٹھا اور دبے پاؤں چلتا ہوا سلاخوں کے قریب آ گیا۔

ان میں دو ایک جیسے تھے، جبکہ تیسرا ہلکے قد و قامت کا تھا، اسی کے ہاتھ میں پنسل ٹارچ دبی ہوئی اور مخاطب بھی وہی ہوا تھا مجھ سے، اب بھی وہی بولا۔

''ہمیں اپنا دوست سمجھو! ہم تمہیں یہاں سے رہائی دلانا چاہتے ہیں۔'' وہ پھر بولا۔ میری پُرغور، خاموش اور بھانپتی ہوئی نظریں ان تینوں کے نقاب میں ڈھکے چہروں کا جائزہ لینے میں محو تھیں۔ ان کی ناک، ہونٹ اور آنکھیں فل سیاہ ماسک کے تنگ سوراخوں سے جھانک رہی تھیں۔ بات ٹوٹی پھوٹی سی انگریزی میں کی گئی تھی۔

''کیا تم تیار ہو؟'' مجھے خاموش اور سوچتا پا کر وہی ہلکے قد والا شخص بولا۔ وہ مجھے کوئی نوجوان سا لڑکا دکھائی پڑتا تھا۔

''کون ہو تم لوگ؟'' میں نے سرِدست کسی خوش فہمی میں پڑے بغیر سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

''کہا ناں...... ہمیں اپنا دوست سمجھو۔'' وہ بولا۔

''دوست چہرے نہیں چھپاتے۔''

ان تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، اس کے بعد باری باری انہوں نے اپنے نقاب نیچے کیے۔ دو میرے لیے اجنبی تھے۔ تیسرے کو دیکھ کر میں ذرا چونکا تھا۔ یہ وہی تھا جسے میں نے وزیر جان کے ساتھ دیکھا تھا۔

''کیا وزیر جان کوئی نئی چال چل رہا ہے؟'' میں نے سرد مگر نیچی آواز میں کہا۔

''تم اب وقت ضائع کر رہے ہو......'' ایک نے نقاب دوبارہ سیٹ کرتے ہوئے کہا۔ باقی دونوں نے بھی فوراً اس کی تقلید کی تھی۔ وہ پھر آگے بولا۔ ''یہاں سے پہلے نکل چلو...... اس کے بعد باہر کہیں آرام سے بیٹھ کر ہم تمہاری ساری تسلی کرا دیں گے۔'' اس بار اس کے ایک ساتھی نے مجھ سے کہا تھا۔ مجھے اس کا لہجہ ذرا کھردرا اور بھاری لگا۔ اس میں رعب کا عنصر... غالب محسوس ہوا تھا جو اس کے کسی خاص ''قبیل'' سے تعلق کا پتا دیتا تھا۔ میں نے پل کے پل سوچا۔ اگر یہ کوئی چال تھی تو یہی سہی، کم از کم میں یہاں سے تو نکلتا اور پھر چوکنا رہنا پہلی شرط تھی۔

''ٹھیک ہے۔ میں تیار ہوں...... مگر تسلی والی بات یاد رکھنا۔''

اس نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا اور پھر تیسرے نے اپنی جیب سے ایک چابی نکال کر سلاخ دار دروازے کے کسی رخنے میں ڈال کر بے آواز گھمائی اور دروازہ اندر کی طرف تھوڑا سا کھول کر مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا۔

میں محتاط انداز میں ان کی ایک ایک حرکات و سکنات پر نگاہ رکھتے ہوئے باہر آ گیا۔ ہم دبے پاؤں دروازے کی طرف بڑھے۔ میرا ذہن ان کے بارے میں طرح طرح کے اندازے ہی قائم کرتا رہا کہ یہ کون لوگ ہو سکتے تھے جو .... دیارِ غیر میں میرے ہمدرد اور نجات دہندہ بن کر گویا امدادِ غیبی بن کر اچانک نمودار ہوئے تھے۔

سب سے پہلے ان کا تیسرا نسبتاً دراز قامت ساتھی، سلائڈنگ ڈور سے باہر نکلا، ادھر ادھر دیکھا اور پھر ہمیں باہر آنے کا اشارہ کیا۔ ذرا ہی دیر بعد ہم تاریک راہداری میں کھڑے تھے۔ دروازہ ہلکی سرسراہٹ سے ''برابر'' ہو گیا تھا۔ یکلخت ہی نوجوان نظر آنے والے کے دونوں ساتھیوں کے ہاتھوں میں اب سیاہ رنگ کے پستول آ گئے، ان پر سائلنسر چڑھے ہوئے تھے۔ میرے ٹھٹکے ہوئے وجود میں سنسنی سی دوڑ گئی، میں خود بھی ان کی طرف سے نہایت محتاط ہو گیا تھا۔

ہم آگے بڑھتے رہے۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ نوجوان بھی ان کی ہی رہنمائی میں تھا جیسے میں تھا۔

پندرہ، بیس قدم چلنے کے بعد ہم جیسے ہی دائیں جانب مڑے تو ہم سے ایک گام آگے چلنے والے نے اپنے پسٹل کی لبلبی دبا دی۔ اس کی سائلنسر لگی لمبی نال سے شعلہ چمکا اور میں نے کسی کے کراہتے ہوئے راہداری کے چکنے فرش پر گرنے کی آواز ہلکی سی آواز سنی۔ موڑ کاٹا تو میں نے ایک گن بردار کو فرش بوسی کی حالت میں پڑے دیکھا۔ اس کی

پیشانی پر روشندان بنا ہوا تھا اور وہاں خون کی لکیر چکنے فرش پر پھیلتی جا رہی تھی۔

ہم اس کی لاش کے قریب سے گزرتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ تھوڑی ہی دیر بعد دو تین مزید خفیہ راستوں سے ہوتے ہوئے ہم باہر تھے۔

یہ جگہ اس عمارت کے عقبی حصے میں تھی جسے دیکھتے ہی میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ یہ وہی شاندار محل نما عمارت تھی جسے میں چند روز پہلے ہی کاوشی کے ساتھ یہاں آکر دیکھ چکا تھا، اس وقت میں نے ائرپورٹ سے ہی وزیر جان سمیت اس کے تین آدمیوں کا تعاقب کرتے ہوئے اس رہائش گاہ کا پتا چلایا تھا۔ اس وقت وہ سیاہ رنگ کی مسٹینگ میں سوار تھے جبکہ میں اور کاوشی امپالا میں۔

یہ وزیر جان کی عالیشان رہائش گاہ تھی، جو ہل ٹاپ میں فوکٹ پیلس کے علاقے میں قائم تھی۔ تو گویا مجھے اسی عمارت کے کسی خفیہ تہ خانے میں رکھا گیا تھا۔

میں نے ہونٹ بھینچ کر سوچا۔ اس طرف بوہڑ کے درختوں کی بہتات نظر آرہی تھی۔ آگے جنگلا تھا۔ وہاں میں نے دو بھاری بھرکم اور جھبرے کتوں کو بے سدھ گھاس پر پڑے پایا، یہ کارنامہ یقیناً انہوں نے ہی انجام دیا ہوگا۔

وہاں سے ہم جھکے جھکے اور تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے ایک سروس روڈ پر آگئے، یہاں ایک لیمپ پوسٹ کے نیچے کار کھڑی تھی۔ اطراف میں سناٹا تھا۔ کچھ اور رہائشیوں کی بھی کاریں اور گاڑیاں ویران سڑک کے کنارے پارک تھیں۔ ایک کالی بلی قریب سے میاؤں کرتی ہوئی گزری، تو میں نے نوجوان کے ایک ساتھی کو دونوں ہاتھ جوڑ کر تھائی زبان میں زیرِلب کچھ بڑبڑاتے ہوئے دیکھا۔ شاید یہاں کے لوگ بھی کالی بلی کے راستہ کاٹنے کی توہم پرستی میں مبتلا تھے۔ یا ممکن ہے کہ یہ توہم پرستی مغرب کا ہی شاخسانہ رہی ہو۔

ہم کار کی طرف بڑھ گئے۔ نوجوان نے کار کی ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولا اور ایک نظر اپنے اسی ساتھی کے چہرے پر ڈالی جو میرے پیچھے تھا۔ پل کے پل مجھے یوں لگا جیسے اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے کوئی اشارہ دیا ہو۔ آگے والا عقبی دروازہ کھول کر اس میں سوار ہو گیا۔ میں اس کے پیچھے تھا، گردوپیش اور بالخصوص ان تینوں سے چوکنا رہنے کی احتیاط اور نوجوان کو مشکوک اشارتی نظروں سے اپنے دوسرے ساتھی کو دیکھنے کے سبب جب میں کار میں جھک کر بیٹھنے لگا تو میں نے کھڑکی کے چڑھے ہوئے سیاہ شیشے سے اپنے عقب والے ماسک مین کا پستول والا ہاتھ اٹھتے دیکھا اور یہی وہ وقت تھا جب میرے جھکے ہوئے وجود میں پل کے پل کے پارا دوڑ گیا۔ میں نے اسی طرح جھکے ہوئے انداز میں خود کو اس کی ضرب سے بچانے کے ساتھ ہی اپنے دائیں بازو کی کہنی کا ''رائٹ ہک'' اس کے پیٹ پر رسید کر دیا۔ یہ ضرب جاں کش ہوتی ہے، وہی ہوا، وہ دھوکے سے مجھ پر وار کرنے کی حسرت لیے ہی حلق سے ''اوغ'' کی آواز خارج کیے چمکتی سڑک پر ڈھیر ہو گیا۔

اندر سوار ہونے والے نے جو یہ دیکھا تو اس نے پھرتی سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ میں نے وحشیانہ غراہٹ سے اسے وہیں دبوچ لیا، جبکہ ڈرائیونگ سیٹ سنبھالے ہوئے نوجوان نے شاید گھبرا کر یا پھر کچھ اور سوچ کر تیزی کے ساتھ کار اسٹارٹ کر کے ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

رات کے دم بخود سناٹے میں کار کے ٹائر سمع خراش آواز میں چرچرائے، کار نے ڈرفٹ کیا پھر ہلکی سی چیز تک کے ساتھ بیک ہو کے ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔

دبوچے ہوئے شخص نے خود کو چھڑانے کی کوشش چاہی تھی کہ میں نے ایک راؤنڈ پنچ اس کی ٹھوڑی پر رسید کر دیا۔ ضرب ٹیکنیکل اور زوردار تھی۔ اس کا جبڑا کھل گیا، وہ وہیں سیٹ پر ہی ڈھیر ہو گیا۔ میں نے بجلی کی سی پھرتی سے اس کی جیب سے سائلنسر لگا پستول نکال لیا اور دروازہ کھول کر اسے باہر دھکیل دیا پھر اسی پھرتی سے دروازہ بند کر کے پستول کی نال نوجوان کی گردن سے لگا دی۔

''دھوکے بازی کا کھیل ختم ہو گیا۔ رفتار آہستہ کر دو ورنہ گردن میں سوراخ کر دوں گا۔'' میں نے زہریلی آواز میں پھنکارتے ہوئے اس سے کہا۔ میرا خیال تھا کہ وہ میری ان چند لمحات کی ''کارگزاری'' کی دھاک میں آچکا ہوگا اور فوراً ہی میرے حکم کی تعمیل کرنے پر مجبور ہو جائے گا مگر میری خوش فہمی ہی ثابت ہوئی۔

اگرچہ میں نے بیک ویو میں اس کے نظر آنے والے چہرے کے تاثرات بھانپ لیے تھے، وہ خاصا بوکھلایا ہوا تھا، مگر اپنی ہمت سے باز نہ آیا اور کار کی رفتار بجائے کم کرنے کے اور بڑھا دی، ساتھ ہی بولا۔

''تم مجھے گولی مارنے کی غلطی نہیں کر سکتے۔ اس صورت میں یہ تیز رفتار کار الٹ جائے گی اور تم بھی نہیں بچو گے......'' اس کی بات پر میں نے پرتشویش انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے اور پستول بیلٹ میں اڑس لی پھر اچک کر اس کے برابر والی سیٹ پر آ گیا اور ... چاہتا تھا کہ اس کی

مکوں اور گھونسوں سے تواضع کر ڈالوں کہ اس نے تیزی سے اسٹیئرنگ دائیں جانب گھما دیا، نتیجے میں میرا توازن بگڑا اور میں دروازے سے جالگا۔

تب ہی مجھے لات چلانے کا موقع ملا، میرے بوٹ کی ٹھوکر اس کے جبڑے پر پڑی، وہ کراہ آمیز آواز میں چیخا۔ کار کے ٹائر چرچرائے اور اس نے ایک جھٹکے سے بریک لگا دیے۔ کار گول گھوم گئی، مجھے لمحے بھر کو چکر سا آیا اور اسی دوران میں اس نے اپنی جیب سے پستول نکالنے کی کوشش کی تھی کہ میری دوسری لات اس کی گردن پر پڑی۔ وہ پھر چلایا اور پستول والا اس کا ہاتھ بہک گیا۔ پستول چھوٹ کر اس کی گود میں گرا اور وہاں سے لڑھک کر بریکس پائدان میں جاگرا۔ اسے اٹھانے کی اس نے زحمت تک گوارا نہ کی اور وحشیانہ انداز میں غراتے ہوئے مجھ پر پل پڑا۔

اس نے میرے پیٹ میں مکا رسید کرلیا، میں پہلے ہی سانس روک کے اپنا پیٹ سخت کر چکا تھا۔ زیادہ درد کا احساس نہ ہوا، مگر اگلے ہی لمحے اس نے چاقو نکال لیا، وہ اس نے تولتے ہی اس کا چمکتا ہوا پھل میری بائیں ٹانگ کی ران میں پیوست کر دیا۔ درد کی ایک جاں کُش لہر میرے پورے وجود میں سرایت کر گئی اور ساتھ ہی کراہ آمیز سی چیخ میرے حلق سے خارج ہوگئی، اس نے بے رحمی سے چاقو دوبارہ کھینچا اور چاہتا تھا کہ اس کا خون آلود مہیب پھل میرے پیٹ میں گھونپتا، میری دائیں ٹانگ حرکت میں آئی اور بوٹ کی زوردار ضرب اس کے سینے پر پڑی۔ اس کی گردن کو زبردست جھٹکا لگا، سر اس کا دروازے سے ٹکرایا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا میں نے پھرتی سے بیلٹ میں اڑسا ہوا پستول نکال کر اس پر گولی چلا دی۔ خاموش پستول سے ''چز ز......'' کی مخصوص آواز نکلی اور گولی اس کے پہلو میں گھس گئی۔ وہ کریہہ ناک چیخ کے ساتھ ڈھے گیا۔ خون آلودہ چاقو اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور اس کا سر ڈھلک کر اسٹیئرنگ سے جا لگا جس کے باعث ہارن مسلسل سمع خراش آواز میں بجتا چلا گیا میں اپنی زخمی ران اور خود کو سنبھالتے ہوئے سیدھا ہوا اور اس کے بے سدھ وجود کو سیٹ کی پشت گاہ سے لگا دیا۔ ہارن بجتا بند ہوگیا۔

میں بُری طرح ہانپ رہا تھا، میری زخمی ران سے مسلسل خون رسے جارہا تھا۔ میں نے حواس بحال کرتے ہوئے کار کے اندر ہی بیٹھے بیٹھے اطراف کا جائزہ لیا۔ ہر سو ویرانی کا راج تھا۔ سڑک دورویہ تھی اور کسی بڑی مارکیٹ کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ دائیں بائیں بند دکانوں کے شٹر گرے ہوئے نظر آرہے تھے۔ دور کہیں دو ایک آدمیوں کے ہیولے نظر آئے تھے۔ میں نے سب سے پہلے اسی تھائی نوجوان کی شرٹ کا ٹکڑا پھاڑ کر اپنی زخمی ران پر باندھ دیا تاکہ جریانِ خون کم ہو جائے اور ایک قدرتی پروسس کے تحت بہتا خون جم کر رک جائے۔

اس کے بعد میں نے نوجوان کے زخم کا جائزہ لیا۔ میری چلائی ہوئی گولی اس کے پہلو میں کافی اندر تک دھنس گئی تھی۔ میں اسے اسی حالت میں چھوڑ کر جب کار سے باہر اترنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اس کی کراہتی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

''پپ......پلیز......!سس......سانچی کو بچالو......''

دروازے کے ہینڈل پر میرا ہاتھ ایک دم رک گیا۔ یہی نہیں مجھے ایسا لگا جیسے ان الفاظ نے میرے متحرک وجود کو بھی جامد کر دیا ہو۔ اس نوجوان کے منہ سے سانچی کا نام سن کر میں بے طرح چونکا تھا۔ میں سیٹ پر بیٹھے بیٹھے اس کی جانب پلٹا اور اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر موت کی زردی پھیلتی جارہی تھی اور چہرہ پسینے سے تر ہوا جارہا تھا۔

''تت......تم نے کیا کہا ابھی......؟'' مجھے جیسے ابھی تک یقین نہیں آیا تھا۔ میں غیر یقینی انداز میں بولا۔ اس کی طرح میری آواز بھی لڑکھڑا گئی تھی۔

''شش...... شاید مجھ سے ایک بڑی غلطی ہوگئی ہے۔'' وہ کراہتے ہوئے مگر ڈوبی ڈوبی آواز میں بولا۔ ''تت......مسٹر شش......شہزاد ہو ناں......؟''

''ہاں !لل......لیکن تم مجھے کیسے جانتے ہو؟ اور...... اور یہ سانچی......کیا لگتی ہے تمہاری......؟''

''وہ...... وہ......'' نوجوان یہ کہتے کہتے بے دم ہو گیا۔ اس کا سر پھر ایک طرف کو ڈھلک گیا۔ میرے اندر ہلچل سی مچ گئی۔ پیشانی پر ان گنت سلوٹوں کا جال اور آنکھوں ... میں سوچوں کی پرچھائیاں لہرا گئیں۔ میں اپنی زخمی ران کی تکلیف بھی بھول گیا۔ سانچی کے حوالے سے اس نوجوان کی طرف سے میرا فکرمند ہونا یہی معنی رکھتا تھا کہ سانچی میرے ساتھ مخلص تھی۔ کاؤشی کے بعد میرا یہاں دیارِ غیر میں کوئی نہ تھا۔ جس سے میں زیادہ مدد کی توقع نہیں رکھ سکتا تھا تو کم از کم تھوڑا بہت تو وہ میرے ضرور کام آہی سکتی تھی۔ پھر اس نوجوان کا سانچی کے ساتھ ایسا کیا تعلق تھا اور یہ مجھے کیوں، کہاں اور کس کے کہنے پر لے جارہا تھا؟ آخر میں اس کا اپنی غلطی کا اظہارِ تاسف مجھے الجھن میں مبتلا کر گیا تھا،

وزیر جان کا ساتھی اس کے ساتھ شامل تھا۔

''اے...... ہوش میں آؤ۔'' میں نے اس کا گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ میں اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے پانی کی بوتل نظر آئی، میں نے چند گھونٹ خود پیے اور اس منہ پر بھی اس کے چھینٹے مارے۔ وہ کسمسایا اور منہ سے بے ربط آوازیں خارج کرنے لگا۔ میں نے اس کے زخم والی جگہ پر اسی کی شرٹ اتار کر بڑی سی پٹی باندھ دی تھی تاکہ خون کا اخراج کم سے کم ہو، لیکن اس کی حالت بگڑی ہوئی تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ اسے جب میری مدد کی ضرورت تھی تو اس نے ایسی حرکت کیوں کی تھی؟ شاید اسی بات کا اسے کوئی پچھتاوا تھا مگر معاملہ کیا تھا اس کا مجھے علم نہ تھا۔ اس کی حالت سنبھل نہیں پا رہی تھی، اس کے چہرے کا رنگ بھی پیلا پڑتا جا رہا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں خود کو سنبھالوں یا اسے، یا پھر ان حالات کو سمجھنے کی کوشش کروں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ کہاں جانا چاہیے؟ کون تھا میرا یہاں؟ کاوشی تو مر چکا تھا۔

میں ہونٹ بھینچ کر چند لمحے یہی کچھ سوچتا رہا۔ اچانک میرے ذہن میں کاوشی کی رہائش گاہ کا خیال آیا۔ وہاں فرسٹ ایڈ سے متعلق کچھ نہ کچھ مل سکتا تھا۔ مگر میرا وہاں جانا خطرے سے خالی بھی نہ تھا۔ وہاں کاوشی کو قتل کر دیا گیا تھا، پتا نہیں اب تک اس کی لاش وہاں سے دریافت کر لی گئی تھی یا اسی طرح ہی وہ پڑی تھی؟ میں نے وقت کا اندازہ لگانے کی کوشش چاہی تو آٹھ سے دس گھنٹے بیت ہی چکے تھے۔ اتنی سی دیر میں، میں نہیں سمجھتا تھا کہ کسی اریب قریب کے لوگوں کو پتا چل سکا ہو، یہ الگ بات تھی کہ وزیر جان کے آدمی وہاں میری تلاش میں دوبارہ آسکتے تھے۔ مگر اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہاں جانا کسی طور بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔ میں قانون کے نرغے میں بھی پھنس سکتا تھا اور کوئی بعید نہ تھا کہ راستے میں بھی پولیس سے میری مڈبھیڑ ہو جاتی۔

میں نے نوجوان کو سہارا دے کر برابر والی سیٹ پر ڈالا۔ خود اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ میری زخمی ران کا درد بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ بڑی مشکلوں سے میں نے اتنا سا کام نمٹایا تھا۔ کار میں نے اسٹارٹ کی ہی تھی کہ نوجوان تھوڑا ہوش میں آتے ہوئے بولا۔

''ک..... کار آگے بڑھاؤ......'' میں چونکا اور اس کی طرف دیکھنے لگا، وہ اس حالت میں بھی بڑی سخت قوتِ ارادی سے کام لے رہا تھا، اسے کچھ ہوش میں دیکھ کر میں نے کہا۔

''دیکھو......! میں خود یہاں تنہا ہوں، میرا کوئی ٹھکانا نہیں رہا ہے، ہم دونوں زخمی ہیں۔ پہلے کسی محفوظ ٹھکانے......''

''کار...... آگے بڑھاؤ......'' وہ میری بات کاٹ کے گھٹی گھٹی آواز میں بولا اور میں سمجھ گیا کہ وہ کیا چاہتا تھا، لہٰذا میں نے فوراً کار آگے بڑھا دی۔

''اس...... طرف......'' اس نے ہاتھ کے بہکتے ہوئے اشارے سے کہا۔ میں نے کار اسی طرف موڑ لی۔ ''چلتے رہو، رفتار بڑھا دو۔''

میں نے یہی غنیمت جانا اور رفتار ایک دم بڑھا دی۔ رات کے تاریک اور ویران سناٹے میں کار فراٹے بھر رہی تھی۔ میرے دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ پر مضبوطی سے جمے ہوئے تھے اور نظریں ونڈ اسکرین کے پار چمکتی سڑک پر۔ میں گاہے بہ گاہے اس کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا اور یہی دعا مانگے جا رہا تھا کہ کسی محفوظ ٹھکانے تک یہ ہوش میں ہی رہے۔

نصف گھنٹے تک تیز رفتار ڈرائیونگ کے بعد میں اسی کے اشاروں پر کار دوڑاتا ہوا بالآخر ایک رہائشی آبادی میں داخل ہوا۔ بادی النظر میں یہ مکان مجھے کاغذی محسوس ہو رہے تھے۔ لیکن یہ سب اعلیٰ درجے کی عمارتی لکڑیوں کے بنے ہوئے تھے۔ شکر تھا کہ نوجوان ہوش میں رہا۔ اگرچہ اس پر بار بار غنودگی کے دورے پڑ رہے تھے۔ کئی ایک جگہوں پر وہ کچھ بتا نہ پاتا اور مجھے کار روکنا پڑ جاتی۔ پھر جب اسے کچھ ہوش آتا تو وہ مجھے گائیڈ کرتا۔

اس نے ایک مکان کے سامنے کار روکنے کا کہا اور بولا کہ یہ اس کی بڑی بہن کا گھر ہے۔ اس کا شوہر ٹرک ڈرائیور تھا۔ دو بچے تھے۔ بہن نرس تھی۔ اس کا نام فرنا تھا۔ مجھے اسے یہی کہنا تھا کہ ہم دونوں دوست ہیں۔

میں نے کار روک دی۔ نوجوان دوبارہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ میں کار سے اترا۔ اردگرد نظر دوڑائی۔ مذکورہ گھر کے سامنے چھوٹا سا باغیچہ تھا۔ درمیان سے روش گھر کے دروازے تک جاتی تھی جہاں مختصر سے برآمدے میں ہی دروازہ تھا۔ میں نے وہاں جا کر بیل بجا دی۔ میرا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ آس پاس ویرانی تھی۔ سپیدۂ سحر نمودار ہونے لگا تھا۔ دوسری بار کال بیل بجانے پر کسی نے دروازہ کھولا تھا مگر نصف، سیفٹی چین لگی ہوئی تھی۔ ایک چکنا چپٹا اور قدرے بیضوی چہرہ نمودار ہوا۔ آنکھیں چھوٹی اور گول تھیں،

ناک بھی بیٹھی ہوئی سی نظر آتی تھی۔ بال سلیقے سے گوندھے ہوئے تھے، فقط چہرے سے ہی اس کے رکھ رکھاؤ اور نفاست کا پتا چلتا تھا۔

’’ہے میم! تم فرنا ہو ناں……؟ تمہارا بھائی باہر کار میں زخمی پڑا ہوا ہے، میں خود بھی زخمی ہوں، ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔‘‘ میں نے انگریزی میں کہا۔ عورت کے چہرے کے پر اشتباہ انگیزی کے آثار ابھرے مگر دروازہ اس نے پورا پھر بھی نہیں کھولا تھا۔ وہ دروازے سے ہٹ گئی۔ میں وہیں کھڑا رہا۔

تھوڑی دیر بعد شاید اس نے کسی کھڑکی سے باہر کار کی طرف جھانک کر تصدیق کر لی تھی کہ اس کا بھائی وہاں موجود تھا، شکر رہا کہ میں نے اس کے بھائی کو عقبی سیٹ پر نہیں لٹا رکھا تھا، پھر شاید اسے نظر نہ آتا اور مجھے لمبی چوڑی تفصیل اسے دینے میں وقت ضائع کرنا پڑتا۔

اس نے دروازہ کھولا تو میں نے دیکھا کہ وہ ایک درمیانی عمر کی فربہی مائل خاتون تھی۔ اس نے فل اسکرٹ پہنا ہوا تھا۔ لگتا تھا وہ سویرے اٹھنے کی عادی تھی اور جاگی ہوئی تھی۔ اسی لیے فریش ہی نظر آرہی تھی۔ میں خود لنگڑا رہا تھا۔ اسے میری حالت کا بھی احساس ہوا۔ اس نے سب سے پہلے مجھے اندر آنے کا کہا اور ایک کمرے میں سہارا دیے لے آئی۔ وہ خاصی مہربان سی خاتون نظر آتی تھی، لیکن چہرہ اس کا سپاٹ ہی تھا۔ جب اس نے مجھے ایک کاؤچ پر لٹایا تو میں نے کہا۔

’’میں ٹھیک ہوں، مگر تمہارے بھائی کی حالت زیادہ نازک ہے، پلیز! اس کی فکر کرو۔‘‘

’’میں اپنا کام جانتی ہوں۔‘‘ اس نے مختصراً جواب دیا اور پلٹ گئی۔ جانے وہ کہاں غائب ہوگئی تھی۔ مجھے ڈر ہوا کہ کہیں وہ پولیس یا کسی ادارے کو فون نہ کردے، لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ وہ ایسا نہیں کرسکتی تھی۔ کیونکہ اس کے بھائی کی جان بھی داؤ پر تھی اور وہ ہمارے یہاں اس طرح آنے کا مقصد سمجھ ہی چکی ہوگی۔

میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ یہ کشادہ کمرا تھا ایک بیڈ بھی کونے میں بچھا ہوا تھا۔ اٹیچ باتھ تھا اور کمرا بڑے سلیقے سے سجا ہوا تھا۔ ایک طرف کارنس پر بدھا کا مجسمہ رکھا ہوا تھا۔ کچھ فریم شدہ تصویریں دیوار پر آویزاں تھیں، ان میں دو نوعمر بچوں اور ایک اس کی اپنی اور ایک بھاری بھرکم مرد کی فوٹو تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ کمرے میں داخل ہوئی اور میں اسے دیکھ کر چونک پڑا۔

وہ ایک وہیل چیئر پر اسی زخمی نوجوان کو لیے اندر داخل ہوئی۔ مجھے حیرت ہوئی تھی کہ وہیل چیئر اس کے پاس کہاں سے آگئی تھی۔ اس کا عقدہ بعد میں کھلا تھا۔ اس نے بھائی کو بیڈ پر لٹایا اور اس کے زخمی پہلو کا جائزہ لیا۔ وہ اپنے کام میں طاق و مشاق معلوم ہوتی تھی۔

’’اسے گولی لگی ہے۔‘‘ میں نے بتایا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بہت کم گو معلوم ہوتی تھی اور کام کی پھرتیلی لگتی تھی۔ وہ اٹھ کر چلی گئی اور جب دوبارہ لوٹی تو دو وہیل کی چھوٹی سی ٹرالی لیے اندر داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ ایک بڑا سا کینوس بیگ جھول رہا تھا۔ ٹرالی پر آکسیجن سلینڈر ٹنگا ہوا تھا، اس نے سب سے پہلے نوجوان کے آکسیجن لگائی اور پھر بیگ کھول کر اس نے کچھ دوائیاں نکال لیں۔ ایک چھوٹا باکس بھی نکالا۔ وہ اپنے کام میں جت گئی۔ میں حیرت سے اسے کام کرتے دیکھے جا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ذرا سی بھی گھبراہٹ اور پریشانی کے آثار نہ تھے۔ چند لمحوں بعد اس نے مرہم پٹی کر دی اور پھر بی پی آپریٹس اور اسٹیتھ اسکوپ سے وائٹل چیک کیے، کچھ انجکشن لگائے اس کے بعد ایک ڈرپ بھی لگا دی۔ ٹرالی کے ساتھ ہی ڈرپ اسٹینڈ نتھی تھا۔ وہ میری طرف متوجہ ہوئی اور میری ران کے زخم کا جائزہ لیا۔

’’تمہارے بھائی کی حالت اب ٹھیک ہے؟‘‘ میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

’’گولی اندر ہی ہے۔ وہ میرے بس کی بات نہیں۔ باقی فرسٹ ایڈ میں نے دے دی ہے، اب اس کی حالت کچھ بہتر ہے۔‘‘ اس نے سپاٹ سے لہجے میں جواب دیا۔ مجھے اس کا لب و لہجہ عجیب ہی محسوس ہوا تھا۔ وہ میری مرہم پٹی کرنے میں مشغول ہوگئی۔

’’تمہارے بھائی نے مجھے بتایا تھا کہ تم ایک اچھی نرس ہو اور کسی اسپتال میں کام کرتی ہو۔‘‘ میں نے بہ غرض سلسلۂ جنبانی کے کہا۔

’’کمال ہے میرے بھائی نے تمہیں اپنا نام بھی نہیں بتایا؟ تم اس کے کیسے دوست ہو؟‘‘ وہ بولی۔

’’آہ……‘‘ جواب دینے کے بجائے میرے حلق سے کراہ خارج ہوگئی۔ اس نے میری ران کے زخم کے اندر کوئی مرہم لگا دیا تھا۔

’’زخم گہرا اور چاقو کا ہے۔ گہرائی تک مرہم بھرنا ضروری تھا۔‘‘ وہ بولی۔

''ہاں! ٹھیک ہے، تم ہی بہتر جانتی ہو، تمہارا شکریہ۔''

''تم انڈین ہو؟''

''نہیں۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''پاکستانی ہوں۔''

''میرے بھائی کے دوست کیسے بن گئے؟ کیا تم بھی اس کی طرح کرمنل گروپ سے تعلق رکھتے ہو؟'' وہ عجیب سے لہجے میں بولی اور میں اس کی بات پر چونک پڑا۔ گویا یہ خاتون اپنے بھائی کے کرتوتوں سے واقف تھی۔ تب ہی میں نے تھوڑی صاف گوئی سے کام لینا ضروری سمجھا۔ بولا۔

''میں اس سے پہلے تمہارے بھائی کو جانتا تک نہیں، نہ ہی مجھے اس کا نام ... معلوم ہے۔ میں اس کا دوست نہیں ہوں، بس، یوں سمجھو ہم ایک دوسرے سے ہی لڑتے ہوئے اور ایک دوسرے کے ہاتھوں سخت زخمی ہوئے ہیں۔ لیکن میرا ایسے لوگوں سے کوئی تعلق نہیں رہا ہے۔ میں تو ایک سیاح ہوں۔''

''فینٹاسٹک، اپنی شرافت کی تم نے اچھی اسٹوری سنائی، ویسے تم ایک دوسرے کے مخالف گروپ کے بھی تو ہو سکتے تھے؟'' اس کے لہجے میں طنز تھا۔

اس کی بات سن کر میں نے بے اختیار ایک گہری ہمکاری خارج کی اور اس سے خفیف سی مسکراہٹ سے بولا۔

''تو کیا تم اپنے بھائی کے کرتوتوں سے واقف ہو اور پھر بھی اس کی مدد کرنے کو ہر دم تیار رہتی ہو۔''

''خون کے رشتے پانی کی اس سطح کے مانند ہوتے ہیں جس کے درمیان ... ڈنڈا مارو تو سطح ٹوٹنے کے بعد دوبارہ یکجا ہو جاتی ہے۔ کیا تمہارے ملک میں خونی رشتوں سے ذرا ذرا سی باتوں پر قطع تعلق کر دیا جاتا ہے۔'' اس نے مدبرانہ لہجے میں کہا تو مجھے ذرا خفت کا احساس ہوا، بولا۔

''نہیں ایسی تو بات نہیں ہوتی، وہاں بھی خونی رشتوں کی قدر ہوتی ہے۔ مگر... ہر جگہ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔''

وہ میری مرہم پٹی کر کے فارغ ہو گئی۔ اس کے بعد میرے بازو میں ایک انجکشن بھر کے ٹیکا بھی لگا دیا۔ یہ شاید اینٹی بایوٹک کا تھا یا پھر پین کلر۔ وہ فارغ ہو کے بولی۔

''تم اس کمرے سے باہر نہیں نکلو گے۔ دوسرے کمرے میں میرا شوہر آرام کر رہا ہے۔ یہ چیئر اسی کی تھی۔ میں تمہارے لیے ناشتا لاتی ہوں۔'' وہ یہ کہہ کر اپنا سامان سمیٹنے لگی۔ میں اس مہربان خاتون کو دیکھنے لگا۔ اس کی وہیل چیئر والی بات سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ اس کا شوہر شاید دونوں ٹانگوں سے معذور تھا۔ میں اس کے بارے میں کچھ پوچھنا ہی چاہتا تھا کہ وہ سامان سمیٹ کر چلی گئی۔ البتہ میں نے اسے پانی کا کہہ دیا تھا جو وہ فوراً ہی ایک جگ میں لے آئی تھی، جبکہ گلاس وہیں ایک تپائی پر رکھا تھا۔ وہ دوبارہ چلی گئی۔ اس کا فرسٹ ایڈ کا سامان وہیں پڑا تھا۔

میں پانی پینے کے بعد دراز ہو گیا اور پھر سر گھما کے بیڈ کی طرف دیکھا۔ وہ نوجوان ابھی تک بے ہوش تھا۔ میں سیدھا ہو کے آنکھیں موندے لیٹ گیا۔ نیند کے مارے میرا سر اور آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ ابھی شاید میری آنکھ لگی ہی تھی کہ فرنا نے آ کے مجھے جگا دیا۔ اس کے ہاتھوں میں ٹرے تھی۔ اس میں ناشتے کے مختصر سے برتن تھے۔ وہ اس نے تپائی پر رکھ دی۔

''ناشتا کر لو، پھر سو جانا۔'' وہ ہلکے سے مسکرا کے بولی۔ وہ پہلی بار مسکراتے ہوئی اچھی لگی۔ میں نے کہا۔

''نہیں، میں دراصل سونا نہیں چاہتا ہوں۔ تمہارے بھائی کو ہوش آ جائے تو میں اس سے کچھ باتیں کرنے کے بعد اپنا راستہ لوں گا۔''

''جیسے تمہاری مرضی۔'' اس نے عام سے لہجے میں کہا تو میں نے اس کے پلٹنے پر پوچھا۔ ''یہ کب تک ہوش میں آ جائے گا؟''

''ایک دو گھنٹے تو لگ ہی جائیں گے۔ اس کے بعد میں اسے اپنے اسپتال لے جانے کی کوشش کروں گی۔ وہاں اس کی سرجری ہونا ضروری ہے۔''

''جہاں تم کام کرتی ہو، اسی اسپتال میں......؟'' میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

''ہاں۔'' اس نے اثبات میں سر کو جنبش دی اور کمرے سے نکلتی چلی گئی۔

میں نے سیدھے ہو کے ناشتے کی ٹرے کی طرف دیکھا۔ بریڈ، مکھن، دودھ اور کافی تھی۔ ایک ابلا ہوا انڈا بھی تھا۔ پنیر بھی رکھا ہوا تھا۔ میں نے بریڈ مکھن کھایا اور انڈا، اس کے بعد کافی پینے لگا۔

ناشتا کرنے اور کافی وغیرہ پینے کے بعد میری جان میں جان آئی تھی۔ میرے ذہن کو تازگی ملی تو میں تصویر کے جانے پہچانے رخ کو چھوڑ کر دوسرے رخ سے دیکھنے اور سوچنے لگا تو مجھے احساس ہوا کہ میں اب بھی خطرے میں گھرا ہوا ہوں۔ جب تک اس نوجوان کی سانحے سے متعلق بات واضح نہیں ہو جاتی، میں اس پر کلی طور پر بھروسا نہیں کر

سکتا تھا، اس پر مستزاد یہ کہ میں اس وقت اس کی بہن کے گھر میں تھا جو شادی شدہ تھی اور غالباً دو بچوں کی ماں بھی تھی۔ نیز یہ نوجوان جس کا نام اس کی بہن فرنا نے مجھے موتو بتایا تھا، مجھ سے آخر کس قسم کی مدد لینا چاہتا تھا، جبکہ وہ خود مجھے شکار کرنے کی کوشش میں ناکام ہو کر میرے ہی ہاتھوں موت کے منہ میں جاتے جاتے بچا تھا۔

لہٰذا میں موتو کے ہوش میں آنے اور اس سے وضاحت طلب گفتگو کرنے کے لیے بے چینی سے منتظر تھا۔

میں نے اس دوران دو تین گھنٹوں کی نیند بھی کر لی تو وہ ہوش میں آچکا تھا اور اپنی بہن فرنا سے باتوں میں مصروف تھا۔ وہ ہنوز بیڈ پر دراز تھا اور فرنا اس کے قریب ایک کرسی کھسکائے بیٹھی تھی۔

میں ہولے سے کھنکھارتا ہوا سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ مجھے اپنا سر بھاری محسوس ہونے لگا۔ تاہم میں نے ان دونوں بہن بھائی کی طرف دیکھا۔ وہ میری طرف متوجہ تھے۔ پھر شاید موتو نے اپنی بہن سے کچھ کہا تھا، وہ میری طرف دیکھتے ہوئے اٹھ کر وہاں سے چلی گئی۔ میں کاؤچ سے اٹھا اور اپنی زخمی ران پر ہاتھ رکھے ہولے سے لنگڑاتا ہوا اس کے قریب دھری اسی کرسی پر بیٹھ گیا جس پر تھوڑی دیر پہلے فرنا بیٹھی تھی۔

"شکر ہے تمہاری حالت قدرے بہتر ہوگئی، ورنہ مجھے تمہاری موت کا افسوس ہی ہوتا۔ تمہاری بہن بہت اچھی مہمان نواز اور ایک مہربان خاتون ہے۔"

وہ میری بات پر محض مسکرا کر رہ گیا تو میں نے مزید کہا۔ "اب مجھے بتاؤ، یہ سب کیا گورکھ دھندا ہے؟ تم وزیر جان کے آدمی ہو؟ لیکن مجھے قید سے رہائی کی آڑ میں کہاں لے جانے کا ارادہ رکھے ہوئے تھے؟"

"میں وزیر جان کا آدمی نہیں، کاسپاکو کا آدمی ہوں۔" اس نے جیسے میرے سامنے دھماکا کیا اور میں سُن ہو کر رہ گیا۔ شنید کی حد تک مجھے مال والے اس المناک واقعے میں موت کے ہرکاروں سے نمٹنے کے دوران اس کے ایک ساتھی سے تہدید آمیز الفاظ میں یہ پتا چلا تھا کہ کاسپاکو بینکاک کا ہوّا کہلاتا تھا۔ ایک بڑا انڈر ورلڈ ڈان اور گینگسٹر...... میں نے اس روز اس کے سفاک ہرکاروں کے انسانیت سوز مقصد کو نہ صرف سبوتاژ کیا تھا بلکہ انہیں موت کے گھاٹ بھی اتار ڈالا تھا۔ سرغنہ کو بھی میں نے نہیں چھوڑا تھا ہاں البتہ ایک ان کا ساتھی میری چلائی ہوئی گولی سے زخمی ضرور ہوا تھا۔ ممکن تھا اسی نے... بعد میں کاسپاکو کو میرے بارے میں بتایا ہو، لیکن پھر بھی بھلا اسے میرے بارے میں کیا پتا تھا؟ خیر......! میں سمجھتا تھا کہ میرا معاملہ پردے کے پیچھے ہی رہے گا لیکن اب موتو کے انکشافات نے مجھے تشویش آمیز الجھن میں مبتلا کر ڈالا تھا۔

"تمہاری اس مہم جوئی کا اسے علم ہو چکا ہے اور تمہارے بارے میں بھی......" موتو بولا۔ "تم نے اس روز مال میں ہونے والی خوں ریزی کے دوران کاسپاکو کے چند آدمیوں کے علاوہ اس کے ایک اہم آدمی...... چارلی کو بھی ہلاک کر ڈالا تھا جو اس روز اس منصوبے کی کمانڈ کر رہا تھا۔ مگر ایک آدمی زخمی ہو کر بھاگ جانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اسی نے... سب سے پہلے سانچی کے بارے میں کاسپاکو کو آگاہ کیا اور وہ زخمی جانتا تھا کہ تمہارا کسی حوالے سے سانچی کے ساتھ کوئی نہ کوئی تعلق تھا، بس! پھر کیا تھا۔ کاسپاکو نے تمہارا سراغ لگانے کے لیے سانچی کو اٹھوالیا۔"

"سانچی تمہاری کیا لگتی ہے؟"

"گرل فرینڈ تھی مگر بعد میں یہ حقیقت جان لینے کے بعد کہ میں کرمنلو گروپ سے تعلق رکھتا ہوں، وہ مجھ سے سخت ناراض ہوگئی....." اس نے مغموم سے لہجے میں جواب دیا۔

"مگر مجھے اب بھی اس سے محبت ہے۔ وہ بھی مجھ سے کرتی ہے لیکن اس کا اصرار یہی تھا کہ میں کاسپاکو جیسے کرمنل کا ساتھ چھوڑ دوں۔ میں نے وعدہ تو کر لیا تھا سانچی سے مگر یہ اتنا آسان نہ تھا۔ کیونکہ کاسپاکو کو چھوڑنا خود کو یقینی موت کے سپرد کرنے کے مترادف ہوتا۔ یہی بات سانچی نہیں سمجھتی تھی۔"

اتنا بتا کر وہ ذرا سانس لینے اور ستانے کو رکا تھا۔ میرے سوچتے ذہن میں دھکڑ پکڑ ہونے لگی تھی۔ اندھیرے میں چھپے سوالوں کے جواب روشنی میں آنے لگے تھے۔

"مجھے تو بعد میں پتا چلا کہ یہ سب کیا معاملہ تھا۔ تتلی جیسی معصوم اور چڑیا جیسی بے ضرر سانچی کو کاسپاکو جیسے خونخوار بھیڑیئے کی گرفت میں دیکھ کر میرے اپنے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ میں نے یہ راز وہاں کسی کو بھی نہیں بتایا تھا کہ سانچی میری گرل فرینڈ ہے۔ نہ ہی بتانا... چاہتا تھا۔ خیر! میں سانچی سے قید خانے میں جا کر کسی بہانے سے ملا اور اس نے مجھے ساری حقیقت بتا ڈالی۔ وہ بے چاری بے حد ہراساں اور خوف زدہ تھی۔

"سانچی کو اور نہ ہی مجھے، تمہارے بارے میں کچھ... علم... تھا کہ تم کہاں تھے جبکہ کاسپاکو بضد تھا کہ سانچی اپنے

بوائے فرینڈ یعنی تمہیں ان سے چھپانا چاہ رہی ہے۔ کیونکہ اس کے زخمی آدمی نے یہی بتایا تھا کہ اس روز مال میں تم اور سانچی ساتھ ساتھ تھے۔ وہ تمہیں سانچی کا بوائے فرینڈ سمجھے ہوئے تھے۔ مجھے بھی یہی غلط فہمی ہوئی تھی کہ کہیں سانچی میرا ساتھ چھوڑ کر تمہاری محبت میں تو نہیں مبتلا ہو گئی تھی، مگر سانچی سے ملنے کے بعد اس نے ساری حقیقت مجھے بتا دی تھی کہ تم سے اس کی محض اتفاقاً ہی ملاقات ہو گئی تھی۔ سانچی اب بھی مجھ سے محبت کرتی ہے۔“

وہ پھر تھوڑا سانس لینے اور ستانے کو رکا۔ میں ہک دک... نظروں سے اس کے چہرے کی طرف تکتے ہوئے، اس کے بولنے کا منتظر رہا۔ مگر وہ ہانپنے لگا تھا۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ آخر اسے پتا کیسے چلا کہ میں وزیر جان کی قید میں تھا اور اسے وزیر جان کے بارے میں کیسے معلوم ہوا، یہ سوال اس کی خاموشی پر میں نے کیا تو وہ کچھ سنبھلنے کے بعد بتانے لگا۔

”یہ میرے اور مجھ سے زیادہ سانچی کے لیے بڑا کڑا وقت تھا... بلکہ میرے لیے تو یہ ایک امتحان تھا۔ مجھے سانچی کو کاسپا کو جیسے بھیڑیے سے بچانا تھا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ کاسپا کو جیسا وحشی آدمی کبھی بھی معصوم سانچی کی اس بات پر بھروسا نہیں کرے گا کہ وہ واقعی تمہارے متعلق کچھ نہیں جانتی اور بالآخر وہ جلاد صفت انسان سانچی کو پہلے اپنی وحشیانہ فطرت تلے روندے گا اس کے بعد بڑی اذیتیں دے کر مار ڈالے گا۔ سانچی خود بھی نہیں چاہتی تھی کہ تم ان کے ہتھے چڑھو، وہ تمہاری حوالگی کے بدلے میں اپنی آزادی بھی نہیں چاہتی تھی۔ ہاں مسٹر شہزاد......! سانچی ایسی ہی .... نیک نیت اور جذباتی سی لڑکی ہے۔ وہ تمہاری بہادری اور تمہارے مضبوط کردار سے بہت متاثر ہے۔ جو تم نے مال میں کارنامہ انجام دے کر اور اپنی جان خطرے میں ڈال کر بہت سے معصوم اور بے گناہ انسانوں کو ان درندوں سے بچایا تھا۔ وہ سب تو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اسی وجہ سے مجھے بھی پہلی بار سانچی کے بیان پر جھوٹ کا گمان ہوا تھا کہ کیا واقعی سانچی تمہیں بچانے کی خاطر تمہارا پتا نہیں بتا رہی تھی یا پھر وہ جانتی ہی نہیں تھی کہ تم ہو کہاں......؟ خیر! میں نے اسے یہی تسلی دی تھی کہ میں تمہیں تلاش کر کے ان کے حوالے کرنے کے بجائے، تمہیں (سانچی کو) یہاں سے نکال لے جاؤں گا۔ لیکن ایسا میں نے سانچی کا محض دل رکھنے کے لیے کہا تھا، کیونکہ یہ اتنا آسان نہ تھا۔ جبکہ میں چاہتا یہ تھا کہ کسی طرح تمہارا سراغ حاصل کر لوں اور اس کے بعد تم پر قابو پا کر کسی اور جگہ قید کر لوں، بعد میں کاسپا کو سے یہی کہوں کہ میں نے بالآخر اس قیدی لڑکی کا منہ کھلوانے میں کامیابی حاصل کر لی ہے، اس نے تمہارا پتا بتا دیا ہے۔ اس کے بعد تمہیں ان کے حوالے کر دیتا۔ رہی بات یہ کہ میں نے تمہارا سراغ کیسے حاصل کیا...... وہ میرے لیے جتنا مشکل تھا بعد میں اتنا ہی آسان ثابت ہوا۔ لوکاس نامی ایک آدمی سے میری دوستی تھی۔ میرے اس پر بہت احسانات تھے۔ میں نے کئی مواقع پر اس کی مدد کی تھی۔ وہ وزیر جان کا ہی آدمی تھا، جبکہ مجھے اس کے بارے میں کوئی علم نہ تھا، مجھے پریشان دیکھ کر اس نے وجہ پوچھی تو میں نے اسے بتایا کہ میں ایک مسلم پاکستانی نوجوان جس کا نام شہزاد ہے یعنی تم، اس کی تلاش میں ہوں اور اس کی وجہ سے میری گرل فرینڈ کی عزت اور زندگی دونوں ہی داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ تب وہ چونکا اور اس نے مجھے یہ حقیقت بتا دی کہ تم ان کی قید میں ہو۔

لوکاس نے میری مدد کرنے کا وعدہ کر لیا۔ میں نے اسے ایک بڑی رقم کا بھی لالچ دے دیا۔ اس نے بتایا کہ وہ یہ رقم اپنے ساتھی کو دے کر اس مشکل اور خطرناک کام کے لیے رضامند کرے گا۔ کیونکہ یہ کام اس کے اکیلے کے کرنے کا نہیں ہے۔ یوں ہم نے تمہیں دھوکے میں رکھتے ہوئے دوست کہہ کر.... وزیر جان کی قید سے رہائی دلوا دی مگر افسوس تم واقعی ہمارے لیے ایک خطرناک کھلاڑی ثابت ہوئے اور سب کچھ الٹ گیا، لیکن مجھے دکھ ہے کہ سانچی کا کیا بنے گا۔ کل تک وہ بھیڑیا صفت کاسپا کو اس معصوم کی عزت اور جان دونوں ہی روند ڈالے گا۔ میری مدد کرو، سانچی نے مجھے بتایا تھا کہ تم ایک اچھے کردار کے انسان ہو، انسانیت کا جذبہ اور اس سے ہمدردی تمہارا شیوہ ہے، خدا کے لیے سانچی کو بچا لو...... میں تمہارا یہ احسان ساری زندگی نہیں بھولوں گا مسٹر شہزی......!“

یہ سب بتاتے ہوئے موتو...... بُری طرح ہانپتے ہوئے رو پڑا۔ میں کرسی پر گنگ اور چپکا بیٹھا رہا۔ میں موتو کی باتوں کے تناظر میں ان عوامل پر غور کرنے پر مجبور تھا کہ میرے مفادات میں کیا بہتر ہو سکتا تھا، کیونکہ دیارِ غیر میں ایسی کسی جذباتی قسم کی سوچ اور سانچی کی مدد کے لیے کوئی قدم اٹھانا میرے لیے بڑے مسائل کھڑے کر سکتا تھا۔ سانچی کی خاطر میں... عابدہ والا مشن کھٹائی میں ڈال سکتا تھا نہ ہی اپنے ساتھیوں سے محروم ہونا چاہتا تھا۔ سانچی تو جمعہ جمعہ آٹھ دن تو کیا صرف ایک شام، یا ایک رات کی شناسا تھی

اور نہ ہی میں کوئی فلمی ہیرو تھا کہ موتو کے آگے سینہ تان کر کہتا کہ ''لو مسٹر موتو! مجھے اپنی محبوبہ کے بدلے میں کاسپا کو جیسے سفاک گینگسٹر کے سپرد کر دو، مجھے معاف رکھو بھائی موتو......! میں چلا تپلی گلی سے۔''

ہاں! البتہ ''آن دی اسپاٹ'' اور بات تھی جیسے اس رات ہال میں خوں ریزی ہوئی تھی اور میں موت کے ہرکاروں کے نرغے میں جن بے گناہ لوگوں کی مدد کرسکا تھا وہ کی تھی۔ لیکن جانتے بوجھتے ہوئے ''آ بیل مجھے مار'' والی بے وقوفی میں نہیں کرسکتا تھا۔ تاہم ابھی میری کمزوریاں اپنی جگہ تھیں اسی لیے میں موتو سے یہ سب نہیں کہہ سکتا تھا یوں بھی وہ کون سا دودھ کا دُھلا تھا۔ یہ تو میں نے اس پر قابو پایا تھا تو وہ سچ بولنے اور سانچی کی مدد کی مجھ سے بھیک مانگنے پر مجبور ہوا تھا۔ نہیں جانتا تھا... کہ اب جبکہ بازی میرے ہاتھ میں تھی تو موتو کی نیت اور دل میں کیا تھا؟

''کیا سوچنے لگے دوست......؟'' مجھے گمبھیرتا سی سوچ میں مستغرق پاکر موتو نے پوچھا۔

''آں...... ہاں! کک...... کچھ نہیں، بس! یہی سوچ رہا تھا کہ سانچی کی ہمیں کیسے مدد کرنی چاہیے......؟'' میں نے معاملہ فہمی سے اور دانستہ ''میں'' کے بجائے ''ہم'' کا صیغہ استعمال کیا تھا۔

''میں تو بیڈ سے ہی لگ کے رہ گیا ہوں......فرنا بھی بتا رہی تھی کہ میرے پہلو میں گولی دھنسی ہوئی ہے، مجھے اسپتال لے جانا پڑے گا، کچھ قانونی معاملات درپیش ہوں گے جنھیں فرنا بہ خوبی نمٹا لے گی۔ سرجری کے بعد پندرہ سے بیس روز کا بیڈ ریسٹ کرنا ہوگا مجھے......''

''میرا خیال ہے تمہیں اپنی بہن فرنا کی مدد سے ہی پولیس سے مدد لینی چاہیے۔'' میں نے اسے صائب مشورہ دیتے ہوئے کہا تو اس کا چہرہ اُتر سا گیا۔ بولا۔

''پولیس نے کاسپا کو جیسے مافیائی ڈان کے خلاف کوئی کارروائی کرنا ہوتی تو بہت پہلے کر چکی ہوتی۔ کیا تم میری مدد نہیں کر سکتے؟ میرے کچھ ساتھی بھی ہوں گے جو تمہارے زیرِ ہدایت رہیں گے۔''

''مجھے افسوس ہے دوست! میں خود یہاں بینکاک میں عارضی طور پر مقیم ہوں۔ میرے ویزے کی مدت بھی ختم ہونے والی ہے۔ بلکہ اب ان حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے، ممکن ہے مجھے فوراً واپس اپنے وطن لوٹنا پڑ جائے۔'' میں نے کہا۔ میری بات پر اس کا چہرہ دھواں دھواں سا ہو گیا۔ مجھے اس پر ترس بھی آنے لگا۔ تب ہی وہ تلخ ہنسی اور انتہائی مایوسانہ لہجے میں بولا۔

''کوئی شک نہیں اس میں کہ میں نے تمہیں اپنے مفاد کے لیے تمہارے ایک دشمن کی قید سے رہائی دلائی، مگر یہ بھی تو دیکھو کہ آج تم میری ہی وجہ سے آزاد ہو۔'' اسے جتانے والی سطح پر اترتے دیکھ کر میں نے بھی تلخی سے مسکرا کر کہا۔

''تمہارا شکریہ...... بے شک تم نے اپنے مفاد کی خاطر ہی یہ حرکت کی تھی اور کاسپا کو تو میرے خون کا پیاسا ہو رہا تھا، تم نے میری قبر ہی کھودنے کی کوشش میں اب نہ صرف خود کو بلکہ اپنی گرل فرینڈ سانچی کو بھی پھنسوا دیا۔''

''مجھے پورا یقین ہے کہ تم پاکستان سے یہاں محض سیاحت کے لیے نہیں آئے ہو، کوئی چکر ہے تمہارا یہاں...... ورنہ وزیر جان بھی ایک مسلم اور تمہارا ہم وطن ہے۔ اس نے کیوں تمہیں یرغمال بنانے کی کوشش کی تھی؟''

وہ اپنے مقصد کی برآری کے لیے بلیک میلنگ پر بھی اتر آیا۔ موتو اپنے تئیں بڑا مکار آدمی تھا اسی لیے میرا اس پر کسی بھی معاملے پر بھروسا کرنے کا جی ہی نہیں چاہ رہا تھا، لٰہذا بے پروانہ انداز کی مسکراہٹ تلے بولا۔

''چھوڑ دان باتوں کو میں اپنے معاملات جانوں اور تم اپنے...... میں اب یہاں سے جانا چاہوں گا اور تمہیں بھی آخری بار یہی دوستانہ مشورہ دوں گا کہ سانچی جیسے نازک معاملے میں اپنی بہن فرنا اور پولیس سے مدد لے لو، آخر کو تم کاسپا کو کے ساتھی رہے ہو، اس کے بہت سے رازوں سے......''

''پولیس کے پاس جانے سے پہلے ہی وہ مجھے ختم کرا ڈالے گا۔'' موتو نے میری کاٹ دی۔ میں موضوع قطع کرنے کی غرض سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''مسٹر شہزی بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے موتو برادر......!''

اچانک ایک آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ جسے سن کر ہم دونوں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا جہاں فرنا کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ وہ ہمارے قریب آگئی اور قریب رکھے اپنے فرسٹ ایڈ بیگ کی طرف بڑھ گئی۔ وہاں سے ایک انجکشن بھرا اور اپنے بھائی موتو کے بازو میں لگا دیا۔ اس کے بعد دوسرا ایمپول لیا اور سرنج میں بھرتے ہوئے۔

''معاف کرنا میں نے تمہاری باتیں سن لی تھیں۔ یہ مشورہ بالکل درست ہے کہ کاسپا کو کے خلاف قانون کا سہارا لینا چاہیے، سانچی اس کے قبضے میں ہے اور موتو اس کے

مجرمانہ رازوں سے واقف ہے۔''

مجھے موتو کی بہن فرنا خاصی عقل مند نظر آئی۔ اس نے اپنے بھائی کی حمایت کے مقابلے میں میری بات کو درست تسلیم کیا تھا۔

''یہ ذرا قمیص اوپر کرو...... ایک آخری ٹیکا لگانا ہے۔'' اس نے مجھ سے کہا۔

''میرا خیال ہے اس کی اب ضرورت تو نہیں رہی۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''ضرورت ہے، پہلے میں نے پین کلر لگایا تھا، فوراً اینٹی بائیوٹک نہیں لگایا جاتا، اب لگا رہی ہوں۔'' اس نے کہا اور میں نے آستین اٹھا کر بازو آگے کردیا۔

''آں...... نہیں، یہ بازو میں نہیں نس میں لگے گا۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔ اس کا وہ سپاٹ پن اچانک غائب ہوگیا تھا۔ یہ تبدیلی میرے لیے عجیب اور اچانک تھی۔ میں نے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

وہ جھک گئی۔ میری نس میں اس نے سوئی گھونپ دی۔ اس کا چہرہ میرے چہرے کے بالکل قریب تر ہوگیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں، میں نے ایک عجیب سی سناٹے دار چمک امڈتے دیکھی۔ ہونٹ بھی اس کے باہم پیوستہ تھے مگر ان میں ہلکی سی اضطراری تھرتھراہٹ تھی، کونے کھنچے ہوئے سے محسوس ہوئے، جو اس کے اندر کی بدطینتی کو ظاہر کرنے لگے تھے۔ میری طرف یک ٹک تکتی ہوئی اس کی آنکھوں کی چمک میں ہولناک مکاری کی پرچھائیاں لہرانے لگیں اور تب ہی پل کے پل میری چھٹی حس نے کسی مخفی خطرے کا الارم بجایا۔ سرنج کی سوئی میری نس میں گھونپی ہوئی تھی۔ نصف دوا انجیکٹ ہوچکی تھی، باقی آدھی سرنج میں ہی تھی، یہی وہ وقت تھا، جب میں نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑا لیا۔

اس جھٹکے کی وجہ سے سرنج اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی، اس کے چہرے پر ایک لمحے کو بوکھلاہٹ اور غصے کے آثار نمودار ہوئے۔ اسی لہجے میں بولی۔ ''یہ کیا کر رہے ہو......؟ بے وقوف......! سوئی ٹوٹ جاتی تو......؟''

اسی وقت مجھے چکر سا آیا۔ میں چند قدم پیچھے کی طرف لڑکھڑایا۔ موتو کو میں نے اپنی بہن سے تھائی زبان میں کچھ کہتے پایا۔ جبکہ میں لڑکھڑا کر سنبھلنے کی کوشش میں پیچھے پڑے کاؤچ پر جا گرا۔ فرنا جلدی سے فرش سے سرنج اٹھانے کے لیے لپکی۔ میرا سر گھوم رہا تھا۔ مجھ سے دوبارہ کھڑے ہونا محال ہورہا تھا اور یہی نہیں میری آنکھوں کے سامنے سیاہ دھبے بھی رقصاں ہونے لگے تھے۔ وہ سرنج اٹھا کے پھر میری جانب لپکی۔

اس نے میرا بازو تھام کر نس میں دوبارہ سوئی گھونپنے کی کوشش چاہی تھی کہ میں نے اسے دھکا دیا۔ وہ ہلکی سی چیخ کے ساتھ موتو کے بیڈ کے پاس جا گری۔ میں نے دھندلی آنکھوں سے نکاسی کے دروازے کی طرف دیکھا۔ کاؤچ سے اٹھا، دروازے کی طرف بڑھا مگر میرے پاؤں دوبارہ لڑکھڑا گئے۔

''تم اب چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہے ہو، تمہیں کاسپاکو کے حوالے ہونا ہی پڑے گا۔ میرے بھائی کی جان...... سانچی کو بچانا ہی پڑے گا۔ سمجھے تم......''

فرنا غرائی۔ اس وقت وہ مجھے مہربان خاتون کے بجائے ایک بھیانک چڑیل کے روپ میں نظر آرہی تھی۔ میری بروقت چھٹی حس نے مجھے اس خطرے سے آگاہ کردیا تھا کہ فرنا کو اپنے بھائی موتو سے کس قدر محبت تھی۔ وہ ہماری باتیں پہلے ہی سن چکی تھی اور کوئی بعید نہ تھا کہ موتو نے بھی اسے اب تک کی حقیقت حالات کے بارے میں تفصیل سے آگاہ کردیا ہو۔ یہی وجہ تھی کہ وہ غراتے ہوئے دوبارہ بولی۔

''تم نے ہی میرے بھائی کو اس حال تک پہنچایا ہے اور اب تمہیں ہی اپنی جان دے کر یہ قربانی دینا ہوگی۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے فرسٹ ایڈ باکس سے قینچی نما کوئی تیز دھار نشتر اٹھا لیا۔ میں نے موتو کے چہرے پر بھی اسی طرح کے بپھرے ہوئے پُرجوش آثار امڈتے دیکھے تھے۔ میں کمرے کے قالین پر گرا ہوا اب سنبھل کر اٹھنے کی کوشش میں تھا کہ وہ ملک الموت بنی ایک بار پھر میرے سر پہ آن کھڑی ہوئی...... اور چاہتی تھی کہ وہ نشتر نما قینچی سے مجھ پر وار کرے...... میں نے اپنے الٹے ہاتھ کا ایک زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر جڑ دیا۔ وہ ہسٹریائی چیخ مار کے پیچھے کی جانب الٹ گئی۔

میں بار بار اپنے سر کو جھٹکے دیے جارہا تھا تاکہ ذہن اور آنکھوں میں اترتی تاریکیوں سے بچ جاؤں اپنی اس کوشش میں کافی حد کامیاب بھی رہا تھا، شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ متوقع طور پر خواب آور دوا کی ابھی نصف خوراک ہی میرے بدن میں انجیکٹ ہوئی تھی۔ ورنہ تو میری یہ قوت ارادی بھی کام نہ کرتی جس سے میں ابھی کام لینے کی پوری کوشش میں مصروف تھا۔

فرنا کے تھپڑ کھا کے الٹتے ہی میں نے موتو کی غراہٹ

سے مشابہ بڑبڑانے کی آواز سنی۔ میری آنکھوں سے پوری طرح دھند نہیں چھٹی تھی مگر مجھے جتنا نظر آرہا تھا اور جو میں اپنی غیر معمولی قوتِ ارادی کے بل بوتے پر اپنی بقا کی جنگ جاری رکھے ہوئے تھا اس پر عمل پیرا رہتے ہوئے میں نے دروازے کی جانب اپنی پیش قدمی جاری رکھی اور بالآخر دروازہ دھکیلتا ہوا باہر نکل آیا۔

سپیدۂ سحر نمودار ہو چکا تھا۔ چند لوگوں کو میں نے دفتر وغیرہ جانے کے لیے گھروں سے نکلتے دیکھا۔ میں لڑکھڑاتے قدموں سے مختصر سے باغیچے سے گزرتا ہوا کار تک پہنچا۔ چابی اگنیشن سوئچ میں لگی ہوئی تھی۔ میں ان دونوں منحوس اور بدطینت بھائی بہن کے نرغے سے دور نکل جانا چاہتا تھا جو مجھے اپنے مفاد کی خاطر کاسپا کو جیسے خطرناک آدمی کے حوالے کرنے کا پختہ ارادہ کر چکے تھے۔ میں کار میں سوار ہونا چاہتا تھا مگر کہاں جاتا؟ اور کیا میں اس حالت میں ڈرائیونگ کرسکتا تھا؟ جبکہ میرے پاس نہ کوئی لائسنس تھا نہ ہی اور کچھ جبکہ میرے تھائی لینڈ تک کے سفری کاغذات کاؤشی کے فلیٹ میں رہ گئے تھے۔ میں بالکل پھنس کے رہ گیا تھا۔ وزیر جان جیسا موذی دشمن میری راہ پہ لگا ہوا تھا۔ بینکاک کا انڈرورلڈ ڈان کاسپا کو، الگ میرے پیچھے دانت نکوسے پڑا ہوا تھا۔ میری امریکا روانگی کا معاملہ سخت کھٹائی میں پڑ چکا تھا۔ کاؤشی کی ہلاکت نے مجھے بینکاک میں بالکل ہی تہی داماں اور خانماں برباد کر کے رکھ دیا تھا۔ میرے سفری کاغذات داؤ پر لگے ہوئے تھے۔ دیارِ غیر میں یہاں میرا کون مونس وغم خوار تھا جس کے پاس جا کر میں پناہ لیتا۔ اپنے دیس کا کوئی شہر یا علاقہ ہوتا تو اور بات تھی۔ چاہے اجنبی علاقہ ہی کیوں نہ ہوتا، مگر یہاں پردیس میں کون تھا میرا؟ غریب الوطنی کی اس حالت زار میں کون میرا پرسانِ حال ہوتا؟ اگر پولیس کے ہتھے چڑھ جاتا تو جو تھوڑا بہت معاملہ ہاتھ میں تھا وہ بھی نکل جاتا۔ فضول چکروں میں پڑ جاتا اور اصل مقصد سے ہٹ کر رہ جاتا۔ ابھی جو تھوڑا بہت معاملہ تھا وہ میرے ہاتھ میں تو تھا۔ پھر وزیر جان کو بھی میں نے جہنم واصل کرنے کا پختہ عزم کر رکھا تھا۔ مگر ابھی تو میں خود مصیبتوں کا شکار تھا اور مجھے اپنی پڑی ہوئی تھی۔

یہ سب سوچتے ہوئے میرا دل دکھ سے بھر گیا۔ میں بھی آخر گوشت پوست کا عام سا انسان تھا، رقیق بھرے جذبات نے بے اختیار میری آنکھوں میں نمی سی اتار دی تھی۔ مگر میں اللہ کی رحمت اور مدد سے مایوس ہونے والا کہاں تھا۔ دکھ اور آزردگی کے اس چند لمحاتی سفر کے دوران میں نے اپنا دل مضبوط کیا۔

یہاں زیادہ دیر میرا کھڑے رہنا مناسب نہ تھا، میں آگے بڑھ گیا۔ میں فرنا کی اس منحوس رہائش گاہ سے دور نکل گیا تھا۔ دوا کی آدھی ڈوز نے بھی مجھے نڈھال سا کر کے رکھ دیا تھا۔ دیکھنے والے مجھے کوئی شرابی ہی سمجھتے۔ زخمی ٹانگ کی وجہ سے میں بدستور لنگڑا کر چل رہا تھا۔ حالت میری ایسی ہی تھی کہ میری ایک ٹانگ برہنہ تھی۔ زخم کی وجہ سے فرنا نے پٹی وغیرہ کرتے وقت پینٹ کا وہ حصہ کاٹ ڈالا تھا، پٹی صاف نظر آرہی تھی۔ بڑی ہی عجیب حالت تھی میری۔ دل چاہ رہا تھا کہ یہاں کسی کے بھی گھر کا دروازہ کھٹکھٹا کر اندر گھس جاؤں اور مدد کی درخواست کر ڈالوں، مگر کون میری مدد کرتا؟ بلکہ میری اس ہیئت کذائی کو دیکھتے ہی مجھے شبہے کی نگاہ سے دیکھا جاتا اور پولیس کو فون کرنے میں بھی دیر نہیں لگائی جاتی۔ میں بس بے منزل اور بے مقصد لنگڑاتا چلتا رہا۔

گھر سے باہر نکل آنے کے بعد میرا خیال تھا کہ فرنا میرے تعاقب میں آئے گی مگر وہ نہیں آئی۔ شاید میرے اس حالت میں باہر نکل جانے سے وہ بھی مجھ سے کترا گئی تھی۔

''اے مسٹر! تم ٹھیک تو ہو......؟'' اچانک ایک شستہ اردو میں کسی نے عقب سے مجھے پکارا...... میں حیران ہو کے رک کر پلٹا۔ میرے سامنے ایک سانولے رنگ کا دراز قامت انڈین کھڑا تھا، عمر چالیس، پینتالیس سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ کار میں بیٹھا تھا جو عقب سے رینگتی ہوئی اب میرے .... قریب آکر رک گئی تھی۔ مجھے اس سے مدد کی کچھ امید ہوئی، میں رک گیا اور اس سے کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ اس نے پیچھے ہاتھ گھما کر دروازہ کھول دیا۔

''میرا خیال ہے تم پہلے کار میں آجاؤ......''

میں اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے عقبی نشست پر بیٹھ گیا۔ اس نے کار آگے بڑھا دی۔

''انڈین ہو؟'' اس نے کار کی رفتار بڑھاتے ہوئے بیک ویو مرر میں مجھے دیکھ کر پوچھا۔

''بنگلہ دیشی......''

''او...... مسلم؟''

''یس۔''

''میں انڈین ہوں۔ میرا نام منوج کمار ہے۔ تم سے مل کر خوشی ہوئی۔'' اس نے اپنا مختصراً تعارف کروایا۔

''شکریہ! میں ریاض خان ہوں، مجھے بھی تم سے مل کر بے حد خوشی ہو رہی ہے۔'' میں نے بھی ونڈ اسکرین کے اوپر

لگے مرر میں اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ میں نے دانستہ اسے اپنا نام غلط بتایا تھا۔

''تم ٹھیک تو ہوں ناں...... تمہاری ٹانگ...... میں نے اسی لیے تمہیں پچھلی نشست پر بیٹھنے کے لیے کہا تھا تاکہ تم اپنی زخمی ٹانگ پھیلا کر آرام سے بیٹھ سکو۔'' وہ بولا۔ ساتھ ہی اس نے ایک موڑ کاٹا اور مین روڈ پر آ گیا۔

''میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے مختصراً کہا۔ اس کا چہرہ خاصا چوڑا اور بھاری تھا۔ اس کی آنکھوں میں، میں نے عجیب سے تاثرات محسوس کیے تھے۔ بظاہر وہ خوش اخلاق اور نرم دل دکھائی پڑتا تھا۔

''تم شاید کسی مشکل میں ہو......؟'' اس نے بیک ویو میں بدستور بھانپتی ہوئی نظروں سے میرے چہرے کو تکتے ہوئے کہا۔ ''ویسے...... تم پیے ہوئے ہو شاید......؟''

''ہاں دوست! میں واقعی ایک مشکل میں ہوں......'' میں نے ژولیدہ سے لہجے میں جواب دیا۔ ''لیکن...... میں پیے ہوئے نہیں ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''کسی نے مجھے زبردستی نیند کی دوا دے ڈالی تھی۔''

''دوست کہا ہے تو پھر اب کسی بات کی چنتا مت کرو، میرے ساتھ چلو، مجھے تمہاری مدد کر کے خوشی ہوگی۔''

''میں تہ دل سے مشکور ہوں تمہارا......''

''چلو پھر باقی باتیں گھر چل کر ہوں گی۔ تم آرام سے بیٹھو......'' اس نے کھلے دل سے کہا اور کار کی رفتار مزید بڑھا دی۔ میں پچھلی خالی سیٹ پر زخمی ٹانگ پھیلا کر آرام سے بیٹھ گیا۔ کار زیادہ قیمتی یا نئے ماڈل کی نہیں تھی۔ بس ٹھیک تھی۔ ہلکے سبز رنگ کی تھی۔ خود اس نے بھی عام سی پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی۔ میں یہی سمجھا تھا کہ وہ جاب پر جانے کے لیے نکلا ہوگا لیکن اب شاید ارادہ بدل کے گھر لوٹ رہا تھا۔

''تم شاید کام پر جا رہے تھے۔ میری وجہ سے تمہیں اب واپس گھر لوٹنا پڑ رہا ہے۔'' میں نے معذرتی انداز میں کہا۔

''نہیں، میں گھر ہی جا رہا تھا۔ میں کوئی کام نہیں کرتا۔'' اس نے جواب دیا۔ پھر سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ ایک مجھے تھمائی اور دوسری اپنے ہونٹوں میں داب لی۔ لائٹر سے سلگانے کے بعد اس نے ہاتھ گھما کر وہ میری طرف بڑھا دیا۔ میں باقاعدہ سگریٹ تو نہیں پیتا تھا، مگر ذہنی دباؤ کے وقت کبھی کبھار پی لیا کرتا تھا۔ سو لائٹر لے کر میں نے ہونٹوں میں سگریٹ داب کر سلگا لیا۔

سگریٹ کا گہرا کش لینے کے بعد مجھے اپنے اعصاب میں تناؤ اور ذہنی کھنچاؤ میں کچھ کمی محسوس ہوئی تھی۔ میں نے اضطراری انداز میں دو تین کش یکے بعد دیگرے لیے۔ میں نے دیکھا بیک ویو سے وہ میرے چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا، مجھے اپنی جانب تکتا پا کر اس نے فوراً نظریں ہٹا کر سامنے ونڈ اسکرین پر جما دیں۔

یہ سفر بہ مشکل نصف گھنٹے تک جاری رہا تھا۔ اس کے بعد ایک عام سی رہائشی کالونی میں کار داخل ہوتے ہی ایک چھوٹے سے مکان کے سامنے رک گئی۔ اس نے سوئچ آف کیا اور اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ میں نے بھی اپنی طرف کا دروازہ کھولا تو اس بھلے مانس نے مجھے سہارا دے کر نیچے اتار دیا۔ سگریٹ پینے کے بعد میرے دماغ سے شاید نشہ آور دوا کا اثر زائل ہونے لگا تھا۔

وہ مجھے اندر لے آیا۔ یہ گھر بھی ایسا ہی تھا جیسا کہ کاؤشی کا تھا۔ دو چھوٹے کمرے، ایک گھٹا گھٹا سا لاؤنج اور تیسرا ایک اسٹور نما سا کمرا ساتھ ہی نظر آ رہا تھا۔ گھر سارا تلپٹ پڑا ہوا تھا۔ نجانے کیا کیا الا بلا بکھرا ہوا تھا۔ پہلا احساس مجھے یہی ہوا تھا کہ یہاں یہ شخص اکیلا رہتا ہوگا۔

''معاف کرنا، بس میرا گھر ایسا...ہی ہے، کرائے کا ہے، مجھ اکیلے کے لیے کافی ہے۔'' منوج خفیف سا ہو کے بولا اور مجھے ایک چھوٹے سے صوفے پر بیٹھنے کا کہا۔

''میں تمہارے لیے ناشتا تیار کرتا ہوں۔''

''نہیں اس کی ضرورت نہیں، وہ میں کر چکا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''چلو، کافی بنا لیتا ہوں۔'' اس نے کہا اور قریب بنے کھلے کچن کی طرف بڑھ گیا۔ میں لاؤنج کا جائزہ لینے لگا۔ ٹی وی رکھا ہوا تھا۔ دو کرسیاں تھیں، ایک ہی صوفہ بچھا ہوا تھا۔ ساتھ ساتھ دو کمرے تھے۔ وہ بھی اندر سے بکھرے بکھرے نظر آ رہے تھے، البتہ وہاں مجھے کچھ عجیب سی چیزوں کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ فٹ اسکیل، وائٹ چارٹ، پنسلوں کا ہولڈر، جیومیٹریکل کا سامان اور کچھ ایسے آلات جو خاصے کند تھے۔ یعنی ایک بڑی سی ڈرل مشین، اوزاروں کا باکس وغیرہ۔

تھوڑی دیر بعد وہ کافی کے دو مگ اپنے ہاتھ میں اٹھائے آ گیا۔ ایک مجھے تھمانے کے بعد خود میرے سامنے دھری کرسی پر بیٹھ گیا۔

''ہاں! اب تم اپنے بارے میں کچھ بتانا پسند کرو تو بہ خوشی بتا سکتے ہو۔'' وہ گرما گرم کافی کا ایک گھونٹ بھرتے

ہوئے بولا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ غور غور سے میرا چہرہ بھی تکے جاتا تھا۔

میں ہولے سے مسکرایا۔ کافی کا ایک گھونٹ بھرا۔ یہاں آنے تک میں سوچ چکا تھا کہ مجھے کیا کہنا تھا، لہٰذا محتاط لہجہ اختیار کرتے ہوئے بظاہر عام سے لب و لہجے میں بتانے لگا۔ ''میں بنگلہ دیش سے اپنی قسمت آزمانے یہاں آیا تھا۔ کسی ایجنٹ کو اپنی جمع پونجی کے پیسے کھلائے تھے کہ وہ مجھے تھائی لینڈ کے راستے امریکا یا کسی اور بڑے ملک پہنچا دے گا، مگر میرے ساتھ شاید دھوکا ہو گیا۔ ایجنٹ نے یہاں آکر مجھے بے دست و پا اور بے یار و مددگار کر کے چھوڑ دیا۔ پھر ایک رات میں منشیات کے مارے پیوں کے گروہ میں پھنس گیا۔ لڑائی بھی ہوئی، چاقو میری ران پر لگا، مرہم پٹی بھی ہوئی مگر صبح ہوتے ہی میں وہاں سے بھاگ نکلا تو تم مل گئے۔''

میں اتنا بتا کر چپ ہو رہا۔ وہ بڑے غور سے میری یہ جھوٹی کتھا سنتا رہا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ اس کے چہرے پر مسرت آمیز سے جوش بھرے تاثرات مترشح ہونے لگے تھے۔ آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک عود کر آئی تھی۔

''بہت دکھ ہوا مجھے تمہاری کہانی سن کر، لیکن شاید ایک طرح سے اچھا بھی ہوا۔'' وہ عجیب سے لہجے اور اسی مسکراہٹ تلے میری جانب تک کر بولا۔

''کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں......؟'' میں نے دانستہ الجھن آمیز اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کچھ نہیں۔'' وہ سر جھٹک کر بولا۔ ''دراصل تمہاری کہانی مجھ سے مختلف نہیں ہے، جس طرح تم دیارِ غیر میں اچانک جن مصیبتوں کا شکار ہو گئے ہو، کبھی میں بھی اسی طرح شکار ہو گیا تھا۔ لیکن پھر دھیرے دھیرے میں نے اپنی ان پریشانیوں پر قابو پالیا، نہ صرف یہ بلکہ بہت جلد میں ایک بڑی کامیابی حاصل کرنے والا ہوں۔'' اس نے کہا۔ مجھے اس کی یہی آخری بات سمجھ نہ آسکی کہ وہ ایک طرف اپنی ''میرے جیسی'' کہانی پر قابو پا چکا تھا اور اب کوئی بہت بڑی کامیابی بھی حاصل کرنے والا تھا لیکن مجھے اس کی باتوں سے کیا غرض؟ میں تو بس اپنے حوالے سے یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ شخص میرے کس حد تک کام آسکتا تھا۔ لہٰذا خفیف سی مسکراہٹ سے بولا۔

''شاید ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں، تمہارا شکریہ دوست! لیکن مجھے تمہاری آخری بات سمجھ نہیں آئی، تم کون سی کامیابی کی بات کر رہے ہو؟''

میری بات پر وہ اسرار بھرے انداز میں مسکرایا اور بولا۔ ''میں تمہیں اس کے بارے میں ضرور بتاؤں گا لیکن پہلے میرے ایک سوال کا جواب دو۔ کیا تم واپس اپنے ملک لوٹ جانا چاہتے ہو یا ابھی تک تمہارے سر پر یہی دھن سوار ہے کہ تم اور لوگوں کی طرح اپنی زندگی بنانے کے لیے کسی اچھے اور بڑے ملک کی طرف کوچ کرنا چاہتے ہو۔ دیکھو دوست! بات تلخ اور کڑوی ضرور ہے مگر فی زمانہ حقیقت یہی ہے کہ بنگلہ دیش، پاکستان اور انڈیا کے سماجی، سیاسی، معاشی اور داخلی مسائل ایسے ہی ہیں کہ ہر سال نجانے کتنے ہی لوگ دوسرے مغربی ملکوں کی طرف امیگریشن کروا چکے ہیں اور کروا رہے ہیں۔ تم اور میں بھی انہی لوگوں میں سے ہیں۔ کیا میں نے غلط کہا؟''

اس نے آخر میں تائید طلب لہجے میں مجھ سے استفساریہ کہا۔ میں کیا جواب دیتا غلط وہ بھی نہیں کہہ رہا تھا لیکن میں اس کی بات سے متفق نہیں ہو سکتا تھا۔ اپنا ملک اور اپنے وطن کی مٹی کی اور بات ہوتی ہے۔ جو سکون اور آرام اپنے ملک کی فضاؤں میں ہے وہ دیگر ترقی یافتہ ممالک میں کہاں ہے، بس، دور کے ڈھول سہانے والی بات ہے، ورنہ وہاں جانے والے اور وہاں کی نیشنلٹی حاصل کرنے والے لوگوں کا سکون غارت ہے۔ صبح سے رات تک وہ مشینی انداز میں کام کرتے ہیں۔ ایک ہی گھر کے رہنے والے افراد تک کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ دو گھڑی بیٹھ کر بات کر سکیں۔ خیر، میرا یہ موضوع نہیں تھا، میں تو اپنے مطلب کی بر آری چاہتا تھا، لہٰذا بولا۔

''ہاں! تم نے ٹھیک سمجھا۔ جب آگے کا سفر شروع کیا ہے تو واپس کیوں جاؤں؟ میں اب بھی اپنی زندگی بنانے کے لیے کسی بڑے اور ترقی یافتہ ملک کی طرف نکل جانا چاہتا ہوں۔ لیکن تم نے جب اپنی ان مشکلات پر قابو پالیا تھا تو پھر تم آگے کیوں نہیں بڑھے ادھر کے ہی کیوں ہو کے رہ گئے؟'' میں نے آخر میں سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''تم نے ٹھیک سوچا ہے، اب ہم کھل کر بات کر سکتے ہیں۔'' وہ بولا، مگر چپ ہو رہا۔ میری نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کچھ کہنے کے لیے مناسب الفاظ تلاشنے کی کوشش میں تھا۔ بالآخر بولا۔

''دیکھو دوست! باہر کے ممالک میں بھی نوٹ

درختوں میں نہیں لگے ہوئے ہیں۔ اس کے لیے انسان کو مشین بننا پڑتا ہے۔ ایک عمر تمام کرنا پڑتی ہے، تب بھی کوئی گارنٹی نہیں ہوتی کہ باقی ماندہ زندگی سکون سے گزرے گی یا پھر اسی طرح ساری عمر خوار...... رہنا پڑے گا۔ زندگی ایک بار ملتی ہے۔ اگر کسی شارٹ کٹ اور آسان راستے کے عوض یہ زندگی ایک دم پُرآسائش ہوجائے تو اور کیا چاہیے۔''
وہ اتنا کہہ کر رکا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ مجھ سے آخر کہنا کیا چاہ رہا تھا؟ اس نے میرے بارے میں سرے سے غلط اندازہ قائم کیا تھا اور اس میں اس کا بھی کوئی قصور نہ تھا، کیونکہ میں نے ہی اسے غلط بتایا تھا اپنے بارے میں۔ جبکہ مجھے دیکھنا یہ تھا کہ یہ میرے کس کام کا ہوسکتا تھا؟ اس لیے میں خاموشی سے اس کے آگے بولنے کا منتظر رہا۔

چند ثانیے کے توقف کے بعد اس نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔

''مجھے پُرآسائش اور آسان زندگی کے لیے جس راستے کی ضرورت تھی وہ مجھے مل تو گیا ہے مگر میں اکیلا کچھ نہیں کرسکتا۔ سب سے پہلے تو مجھے اپنے جیسے دوست کی تلاش تھی، جو میرا خیال ہے تمہاری صورت میں مجھے مل گیا ہے، اس کے بعد مجھے دو پروفیشنل افراد چاہیے ہوں گے، جنہیں مجھے باقاعدہ ''ہائر'' کرنا پڑے گا۔ جو اس کام کو رازداری سے نمٹائیں اور کامیابی سے بھی......''

''وہ کون سا کام ہے؟'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ان حالات میں جبکہ میں بالکل بے دست و پا ہوچکا تھا ایسے میں منوج کمار کا ساتھ میرے لیے نعمتِ غیر مترقبہ ہی تھا۔ اگر وہ میرے کسی کام آنے والا تھا تو مجھے اس کے کام آنے میں کیا حرج تھا؟

''کام مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں۔ ہم دونوں اس منصوبے میں پارٹنرشپ کی بنیاد پر ہوں گے۔ اس لیے کہ تم میرے ساتھ ہوگے۔ تمہارا سارا خرچہ پانی میرے ذمّے ہوگا۔ حتیٰ کہ کامیابی اور بے تحاشا ملنے والی رقم کے بعد تم جس ملک میں بھی جانا چاہو وہاں تک پہنچانے میں بھی میں تمہاری پوری مدد کروں گا۔ میرا ساتھ دینا چاہتے ہو تو میں تمہیں اس ہم راز اور کام سے آگاہ کردوں......؟''

میں نے محتاط لہجے میں کہا۔ ''اگر تم مجھے قابلِ بھروسا سمجھتے ہو تو بتادو، رہی بات یہ کہ میں تمہارے کس کام آسکتا دوں جس سے مجھے بھی فائدہ پہنچے اور کسی بے گناہ کی جان جانے کا اندیشہ یا کوئی غیر قانونی نہ ہو تو مجھے تم اپنے ساتھ پاؤ گے۔''

''ویٹس اٹ......!'' وہ یک دم چمک کر بولا۔ ''میری توقع کے عین مطابق تم ایک شریف، نیک نیت اور صاف گو انسان ہو۔ مجھے بھی ایسے ہی ساتھی کی ضرورت تھی۔ بے فکر رہو، اس کام میں نہ کسی کی جان کو خطرہ ہے اور نہ ہی کسی کا نقصان...... ہاں! رہی بات غیر قانونی کی تو...... آسان راستوں کے ذریعے تھوڑا بہت قانون سے ہٹ کر بھی کام کرنا پڑتا ہے اور خطرے کا رسک بھی لینا پڑتا ہے۔ مجھے شاید اب تمہیں ساری بات تفصیل سے بتادینا چاہیے، لیکن ابھی نہیں......تم تھوڑا آرام کرلو اور ساتھ ہی ذہنی طور پر خود کو میرا ساتھ دینے پر بھی آمادہ کرلو۔ کوئی جلدی نہیں، ابھی میں ایک ضروری کام سے باہر جارہا ہوں۔ رات کو تفصیل سے میں تمہیں اپنے اس منصوبے سے آگاہ کردوں گا۔ مگر رازداری اولین شرط ہے۔''

یہ کہتے ہوئے وہ ایک دم سنجیدہ سا نظر آنے لگا، میں نے کچھ سوچ کر اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی تھی۔ اس کا منصوبہ جو بھی تھا، اس میں مجھے دولت والی بات سے کوئی غرض نہ تھی۔ مجھے تو بس عارضی طور پر اس کا ساتھ چاہیے تھا رہنے کے لیے۔ اس دوران میں اپنی امریکا روانگی کی کوئی راہ نکالنے کی کوشش کرسکتا تھا۔ یہیں رہتے ہوئے وزیر جان کو بھی میں نے ٹھکانے لگانا تھا۔ تاہم مجھے ایسی دولت سے کوئی غرض نہ تھی جو چوری اور حرام کی ہو، تاہم مجھے اگر اس بہانے بینکاک میں اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے اگر پاؤں جمانے کا موقع مل رہا تھا میرا تو خیال تھا کہ مجھے اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ منصوبے کی کامیابی کے بعد وہ مجھ سمیت انتہائی محفوظ طریقے سے امریکا روانگی کا بھی ارادہ رکھے ہوئے تھا۔ وہاں بھی وہ میرے ساتھ ہی رکنے کے لیے پُرعزم تھا۔ خیر، تب کی جب دیکھی جاتی، ابھی تو ابتدا تھی اور مجھے بھی فوری طور پر کوئی ٹھکانا مل گیا تھا۔

لہٰذا اس کی بات سُن کر میں نے بھی اپنے چہرے پر مصنوعی جوش، دلچسپی اور مسرتوں کے ڈونگرے سجاتے ہوئے اس سے کہا۔ ''میں تمہارے اس منصوبے میں پارٹنرشپ کے لیے تیار ہوں۔ جیسا کہ تم نے کہا کہ اس منصوبے کے لیے چند ماہر اور پروفیشنل افراد کی بھی ضرورت پڑسکتی ہے لہٰذا اب تم باقی افراد کو بھی اکٹھا کرلو جو اس منصوبے میں ہمارا ساتھ دے سکیں۔ لیکن یہ کام بہت محتاط ہو کے کرنا پڑے گا تمہیں، میرا مطلب ہے پروفیشنل آدمیوں کی تلاش۔'' میری بات پر وہ بولا۔

''ضرورت منداور کڑے حالات کے ستائے ہوئے افراد ہمیشہ سے میرا ٹارگٹ رہے ہیں۔ میں ایسوں کو تاڑنے اور تلاشنے کے فن سے خوب اچھی طرح واقف ہوں۔''

''جیسے تم نے مجھے تلاشا.....'' میں نے مسکرا کر کہا تو اس نے دوستانہ انداز میں ایک قہقہہ خارج کر دیا، میں بھی ہنس دیا۔

''اچھا اب تم ذرا دیر آرام کرو، میں ایک ضروری کام سے باہر جا رہا ہوں۔'' تھوڑی دیر بعد اس نے مجھ سے کہا۔ ''کچن میں ریڈی ٹو ایٹ کھانا پینا سب موجود ہے، بس، گوشت نہیں ہوگا۔ شراب بھی ہے۔ بے دھڑک کچھ بھی کھانا چاہو کھا لینا، میں شام تک ہی لوٹوں گا، ہاں! مجھے واپسی میں ذرا دیر بھی ہو جائے تو پریشان مت ہونا۔'' میں نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ چلا گیا۔ میں سونے کے لیے لیٹ گیا۔ شام کو جاگا تو کچن کا رخ کیا۔ ڈبے میں مٹر کے ابلے ہوئے دانے پڑے تھے۔ سبزی تھی۔ ابلے ہوئے چاول تھے، بس یہی کچھ فرائیڈ کر کے میں نے پیٹ بھرا اور تھوڑا بہت آئینے کے سامنے جا کر اپنا گیٹ اپ چینج کیا۔ وارڈروب سے اپنے سائز کے کپڑے نکال کر پہنے۔ ایک ہیٹ بھی تھا، وہ بھی میں نے سر پہ لگا دیا۔ پھٹی ہوئی پینٹ اتار دی تھی میں نے۔ اس کے بعد میں مکان کو لاک کر کے باہر آ گیا۔ ایک ڈپلی کیٹ چابی منوج نے مجھے دے رکھی تھی۔

میں نے ٹیکسی روکی اور اسے کاؤشی والے علاقے کا پتا بتا کر چلنے کا کہا۔ ڈرائیور سکھ تھا اور باتونی بھی۔ وہ نجانے کیا کیا ادھر ادھر کی سارے راستے ہانکتا رہا، میں بھی ہوں ہاں کرتا رہا۔ شکر کیا جب میری منزل قریب آ گئی۔

میں نے اسے کرایہ دے کر فارغ کیا۔ میرے پاس پیسے بھی ختم ہونے کو تھے۔ سفری کاغذات کے ساتھ وہ کارڈ اور سلپس وغیرہ بھی اسی کے ساتھ ایک پاؤچ میں رکھے رہ گئے تھے۔ جن کے ذریعے میں یہاں کے کسی بھی بینک سے ویسٹرن یونین منی ٹرانزیکشن کر سکتا تھا۔

مجھے سب سے زیادہ فکر اپنے اسی پاؤچ کی تھی۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ کاؤشی کی رہائش گاہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ آسمان پر کہیں کہیں سفید بادلوں کے ٹکڑے تیرتے نظر آ رہے تھے۔ لوگ باگ ادھر ادھر آتے جاتے نظر آ رہے تھے۔ میں نے فلیٹ ہیٹ سر پہ لگائے رکھا تھا اور عام سے کوٹ پینٹ میں ملبوس تھا۔ کاؤشی کے مکان کے قریب پہنچا تو دل بے اختیار مسرت تلے یکبارگی زور سے دھڑکا تھا، کیونکہ مجھے وہاں کوئی غیر معمولی پن محسوس نہیں ہوا تھا، تاہم میں رکا نہیں تھا اور آگے نکلتا چلا گیا تھا کہ کہیں وزیر جان کا کوئی آدمی یہاں کہیں آس پاس خفیہ طور پر تعینات نہ کر دیا گیا ہو، ظاہر ہے اب تک وزیر جان کو اس کے تہ خانے والے قید خانے سے میرے فرار ہونے کا پتا چل چکا ہوگا اور اسے پہلا خیال یہی ہو سکتا تھا کہ ممکن ہے میں اس مکان کا رخ کروں، جہاں گزشتہ شب میری تلاش میں اس کے درندہ صفت آدمیوں نے شب خون مار کے بے چارے کاؤشی کو بیدردی سے ہلاک کر ڈالا تھا اور میری تاک میں وہیں چھپ کر بیٹھ گئے تھے۔

میں نے حفظِ ماتقدم کے طور پر یہی کچھ کیا اور متر گشت کے انداز میں ادھر ادھر اطراف میں اچھی طرح کسی مشکوک ذی نفس کی غیر موجودگی کا اپنے تئیں یقین کر لینے کے بعد میں نے مطلوبہ مکان کی طرف قدم بڑھا دیے۔ گھر کی چابی میرے پاس نہیں تھی مگر مجھے معلوم تھا کہ کاؤشی اسے کہاں رکھتا تھا۔ یہاں عموماً لوگ گھروں کی چابیوں کو اسی طرح ہی رکھتے تھے، پائدان کے نیچے، باہر کسی پودوں یا گلدان کے اندر۔ کاؤشی کو بھی میں نے مکان کے پائدان اور بھی دروازے کی چوبی چوکھٹ کے اوپر بنے باریک رخنے سے چابی اٹھاتے بارہا دیکھا تھا۔

مجھے اس بات پر ایک سنسنی خیز حیرت ہی ہوتی اگر مکان کے اندر کاؤشی کی لاش اسی طرح ہی پڑی ہوئی ہوتی۔ بہت عجیب ہی لگ رہا تھا مجھے یہ سب۔ اندر کاؤشی کی ایک روز پرانی لاش پڑی تھی۔ پاس پڑوس یا پولیس کو ابھی تک اس کا کچھ علم نہ ہو سکا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ زیادہ دن گزر جانے کے سبب لاش سے بدبو اٹھتی تو اریب قریب کے لوگ باگ اس طرف متوجہ ہوتے۔ ایسے کئی لرزہ خیز واقعات کا دیدہ وشنیدہ ہر کوئی تھا کہ ایک مکان میں قتل ہو جاتا تھا۔ کئی دنوں تک بسا اوقات تو کئی ہفتوں تک کسی کو بھی نہیں پتا چلتا تھا۔ لیکن جب لاش زیادہ پرانی ہو جانے کے باعث بدبو چھوڑنے لگتی تب ہی واقعے کا پتا چلتا۔

بہرطور میں دھڑکتے دل کے ساتھ آگے بڑھا اور دروازے کے قریب پہنچا۔ جھک کر پائدان الٹ کر دیکھا مگر چابی وہاں نہیں تھی۔ دروازہ بند تھا۔ یہ انٹرلاک ڈور تھا۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ چوکھٹ کے رخنے میں انگلیاں ڈالیں تو چابی کو چھوتے ہی میرے اندر مسرت بھری بجلیاں دوڑ گئیں، میں نے پھر دروازہ کھولنے اور اندر داخل ہونے میں ذرا بھی دیر نہیں لگائی تھی۔

اندر داخل ہوتے ہی میں نے احتیاط کے پیش نظر ایک اور دانشمندانہ حرکت کی، آگے بڑھنے کے بجائے پلٹ کر میں نے باہر جھانکا اور ایسا چند سیکنڈ تک کرتا رہا تاکہ اگر کوئی باہر میری نظروں سے چوک بھی گیا ہو تو کہیں چھپا ہوا شخص مجھے اندر داخل ہوتے دیکھتے ہی اس طرف کو ضرور لپکے گا۔ دوسرے ہی لمحے میرے بدن میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے دو افراد کو بالکل سامنے والے مکان سے تیر کی طرح نکلتے ہوئے دیکھا، وہ اسی مکان کی طرف تیز تیز قدموں سے بڑھے چلے آرہے تھے، جس کے اندر میں داخل ہوا تھا۔ مجھے اپنی اس ''احتیاط'' پسندی کے اس قدر جلد نتائج کے برآمد ہونے کا بالکل بھی اندازہ نہ تھا۔ میرے اعصاب یکلخت تن گئے اور مجھے پہلے سے بھی زیادہ محتاط ہونا پڑا۔ میں نے ایک کام یہ کیا کہ دروازے کو اندر سے کنڈی نہیں لگائی تھی اور دائیں جانب رکھے فریج کے پیچھے جا چھپا۔ اس طرح کہ میری نظریں دروازے پر جمی رہی تھیں۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ دروازہ ہلکی سی چرچراہٹ سے کھلا اور دوسرے ہی لمحے دو افراد جن کے ہاتھوں میں اب پستول نظر آنے لگے تھے، الگ الگ ہوکے کمروں کی طرف بڑھے، میں نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنی جگہ سے حرکت کی اور جست بھری۔ میری ٹانگ ایک کی پشت پر لگی۔ ضرب زوردار ثابت ہوئی، اس کی شاید ریڑھ کی ہڈی سرک گئی تھی، وہ تقریباً اچھل کر کمرے کے دروازے سے ٹکرایا اور دھڑام سے فرش پر گرا، اس میں دوبارہ اٹھ کھڑے ہونے کی سکت نہیں رہی تھی یہی سبب تھا کہ وہ گرتے ہی کراہنے اور تڑپنے لگا تھا۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر پرے کہیں جا گرا تھا۔ اس افتاد پر اس کا دوسرا ساتھی پلٹا، تب تک سنبھلتے ہی میری دوسری ٹانگ بھی حرکت میں آچکی تھی، یہ میری زخمی ٹانگ تھی، اسی سبب اس کی ضرب میں وہ زور نہ تھا، اس کے پیٹ پر پڑی تھی۔ وہ بس تھوڑا سا ہی عقب میں لڑکھڑایا تھا اور تب ہی مجھے اپنی بھیانک غلطی کا احساس ہوا تھا۔ میں اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کی زد میں آچکا تھا۔ میری ٹانگ میں درد کی ٹیس دوبارہ جاگ اٹھی تھی، بس ایک جوش تلے میں نے یہ حرکت کر ڈالی تھی۔ ضرب ''ہلکی'' جانے کے باعث پستول بھی اس کی گرفت سے نہ نکل سکا تھا اور یہی میرے لیے خطرناک ثابت ہوا تھا۔

اس نے فائر کردیا۔ میں تب تک اس مہیب صورت حال کو بھانپتے ہی بجلی کی سی تیزی کے ساتھ جھکائی دے گیا تھا۔ گولی خطا گئی تھی، مگر ہر بار ایسا نہیں ہوسکتا تھا۔ اس کے فوری تدارک کے طور پر میں نے جھکائی لگاتے ہی خود کو فرش پر گراتے ہی ایک الٹی قلابازی کھائی تھی، جس کے نتیجے میں میری دونوں ٹانگیں اس کے سینے پر پڑی تھیں۔ اس ضرب نے اسے سنبھلنے نہ دیا اور نہ ہی دوسری گولی داغنے کی نوبت آئی۔ وہ میرے تلے اوپر دو حملوں کی زد میں آگیا تھا۔ پہلا حملہ ہلکا جانے کے باوجود یہ دوسرا حملہ اس کے لیے نقصان دہ ثابت ہوا اور وہ بڑے زور سے عقب میں لڑکھراتے ہوئے دیوار سے جا ٹکرایا۔ پستول اس کے ہاتھ چھوٹا تو وہ آپوں آپ میرے اوپر آرہا۔ میں نے لاؤنج کے فرش پر لیٹے لیٹے اسے کھینچ کیا اور اس پر تان لیا، لیکن بدقسمتی سے تب تک میری اپنی حالت پتلی ہونے لگی تھی۔ میری زخمی ران کے ٹانکے شاید اس اٹھا پٹخ میں کھل گئے تھے اور اب اس میں سے خون رسنے لگا تھا۔ درد تو جیسے اس طرح دوبارہ جاگ اٹھا تھا کہ پورا وجود ہی ٹیس بن کر رہ گیا تھا۔ یہی سبب تھا کہ اب میرے اندر کمزوری جنم لینے لگی تھی۔ اب تک جو کیا وہ خوداعتمادی اور ایک جوش تلے ہی کیا تھا۔ یہ بھی شکر تھا کہ اس آخری وقت میں جبکہ میں زخم کھل جانے اور جریان کے باعث کمزور پڑنے لگا تھا کہ حملہ آور کا پستول میرے ہاتھ میں آچکا تھا۔

''اپنا چہرہ دوسری طرف کرلو۔'' میں نے تحکمانہ درشتی سے کہا۔ ساتھ ہی کن انکھیوں سے قریب ہی بے سدھ پڑے اس کے ساتھی کی طرف بھی دیکھا۔ وہ اب بالکل ہی بے حس و حرکت پڑا نظر آرہا تھا۔

''خبردار! ذرا بھی حرکت کی تو گولی چلادوں گا۔'' میں خوف ناک انداز میں غرایا اور پھر نہایت محتاط انداز میں دھیرے دھیرے کھڑا ہوگیا۔ تھوڑا لنگڑایا بھی تھا۔ وہ پشت کے بل دیوار سے چپکا میری اس کمزوری کو بھانپنے کی کوشش کررہا تھا۔ مگر آتشیں ہتھیار میرے ہاتھ میں تنا ہوا دیکھ کر اس میں کسی قسم کی جارحانہ حرکت کرنے کی ہمت نہ ہو پائی تھی۔

میرے جارحانہ تیور دیکھ کر اس نے چاروناچار ہی سہی، میری ہدایت پر عمل کیا تھا اور پھر جیسے ہی وہ دیوار کی جانب پلٹا، میں نے اچانک ہی پستول کے آہنی دستے سے اس کے سر کے پچھلے حصے پر وار کیا۔ اس کے حلق سے کراہ آمیز چیخ خارج ہوئی اور وہ لہرا کر گر پڑا۔

دوسرے حملہ آور کو بھی اتنا غنفیل کرنے کے بعد میں نے چند ثانیے کے لیے ہی سنبھالا لیا تھا۔ میرے پاس اتنا

وقت نہ تھا کہ اس سے پوچھ تاچھ کرتا کہ وہ کون تھا اور کس کا بھیجا ہوا تھا؟ بھلا اس میں کیا شک تھا کہ یہ دونوں وزیر جان کے ہی آدمی ہو سکتے تھے۔ انہیں اندازہ تھا کہ میں دوبارہ یہاں کا رخ کر سکتا تھا۔

بدنصیب کاؤشی کی لاش صوفے سے لڑھک کر آڑی ترچھی پڑی ہوئی تھی۔ میں نے جلدی کمرے کا رخ کیا اور دھڑکتے دل کے ساتھ اپنے ضروری کاغذات تلاشنے لگا۔ مجھے تشویش بھی تھی کہ کہیں وہ اِدھر اُدھر نہ ہو گئے ہوں، شکر تھا کہ وہ مجھے ایک دراز میں پڑے مل گئے۔ میرا کام ختم ہو گیا، میں وہاں سے جانے لگا تو اچانک ایک خیال کے تحت میں نے دل کڑا کر کے کاؤشی کی جیبوں کی تلاشی لے ڈالی۔ دل ''کڑا'' اسی لیے کیا کہ کئی گھنٹے بیت جانے کے باعث اس کی لاش سے بدبو اٹھ سکتی تھی۔ مگر ابھی ایسا کچھ نہیں تھا، یوں تلاشی کے دوران میں نے اپنی سانس روکے رکھی تھی۔

کاؤشی کا سیل فون اور ایک عدد جیبی سائز ڈیجیٹل ڈائری میرے ہاتھ لگی، وہ میں نے کسی خیال کے تحت اپنے پاس رکھ لی۔ اچانک میری نظر فرش پر پڑی۔ وہاں خون کی لکیر سی بنی ہوئی تھی۔ یہ خون میری زخمی ران سے بہہ رہا تھا اور مجھے درد کا شدید احساس ہونے لگا تھا۔ میں نے فوراً واش روم کا رخ کیا۔ میرے پاس زیادہ وقت تو نہیں تھا مگر اس طرح خون بہاتی ٹانگ کے ساتھ میں باہر بھی نہیں نکل سکتا تھا۔ پتلون کا رنگ ڈارک تھا اسی لیے خون نظر نہیں آرہا تھا، تاہم میرا بوٹ خون سے بھر گیا تھا۔ واش روم میں حسب توقع کیبنٹ میں رکھا فرسٹ ایڈ سے متعلق کچھ نہ کچھ سامان نظر آ ہی گیا اس میں بینڈیج بھی رکھی تھی۔ میں نے جیسے تیسے چند منٹوں میں بیلٹ کھول کر پینٹ نیچے سرکائی اور زخم کا جائزہ لے کر اس پر دوا لگا کے پٹی باندھ دی۔ یہ کام نمٹا کر میں واش روم سے نکل آیا پھر دروازے کی جانب بڑھا۔ پہلے جھری سے باہر جھانکا۔

سب کچھ ''ٹھیک'' پا کر میں باہر نکلا اور تیز تیز قدم اٹھاتا، دزدیدہ نظریں اپنے گردوپیش پر ڈالتا ہوا میں نے جیسے ہی پاس کی ایک گلی میں داخل ہونے کا ارادہ کیا تھا کہ اچانک میری نظر ایک سیاہ رنگ کی مسٹینگ پر پڑی، میں اسے دیکھ کر بری طرح چونکا تھا، یہ وہی سنگل ڈور اسپورٹس کار تھی جسے ائرپورٹ سے آتے ہوئے پہلے کاؤشی اور پھر میں نے دیکھا تھا، اس کے بعد وزیر جان کے ٹھکانے کا پتا چلانے کی غرض سے اور میرے ایما پر کاؤشی نے بڑی مہارت سے اس کا سراغ لگا کر تعاقب کیا تھا۔

''تو کیا وزیر جان اِدھر ہی کہیں موجود تھا......؟''

یہ خیال آتے ہی میرے پورے بدن میں جھرجھراہٹ سی دوڑ گئی، میں فوراً ایک طرف کو ہو گیا، میرے سیدھے ہاتھ پر کسی گھر کا بیک یارڈ تھا، وہاں کاٹھ کباڑ کے اور کچھ نہیں تھا۔ جگہیں ویسے ہی تنگ تھیں۔ میں نے سوچا، ممکن ہے کہ اس کار میں وہی دونوں حملہ آور آئے تھے، جنہیں کاؤشی کے گھر میں ہی انٹاغفیل کر چکا تھا۔

اس وقت میرا ذہن تیزی سے کچھ سوچ رہا تھا اور ایک لائحہ عمل میرے ذہن میں نمو پانے لگا تھا۔ بس جی میں آئی کہ یہ بات کنفرم ہونی چاہیے کہ آیا یہ لوگ وزیر جان کے ہی بھیجے ہوئے آدمی تھے یا کسی اور کے، کیونکہ وزیر جان کے علاوہ تو اور کوئی میرا بینکاک میں دشمن نہ تھا، البتہ گینگسٹر کاسپاکو کی بات الگ تھی۔ اس سے ابھی میرا کسی قسم کا براہِ راست سامنا نہیں ہوا تھا اور میں اس سے کترانے کی کوششوں میں تھا، حتیٰ کہ من موہنی صورت والی ساپچی کو بھی میں خاطر میں نہیں لایا تھا۔ پرائے دیس میں پرائی بلا اپنے سر لینے کا میں یوں بھی متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ ایسے میں جبکہ میری امریکا روانگی کا معاملہ بھی کاؤشی کی موت (قتل) کے بعد کھٹائی میں پڑ چکا تھا۔ وزیر جان میرے اس اہم ترین مشن کی تمام راہیں مسدود کرنے کی اپنی سی بھرپور کوششوں میں معروف کار تھا۔ اگر ایسا تھا تو وہ یقیناً ایک طرح سے اپنی موت کے پروانے پر ہی دستخط کر رہا تھا کیونکہ اس سے تازہ ٹکراؤ اور پاکستان میں نوشابہ کے ذریعے اسپیکٹرم کی مردہ لاش میں نئی روح پھونکنے کے اس کے ناپاک عزائم کے اظہار نے اس کی موت کو اور بھی قریب کر دیا تھا۔ چنانچہ یہی سب کچھ سوچتے ہوئے میں وزیر جان کا قضیہ نمٹانے کی آخری کوشش کرنا چاہتا تھا۔

قوی خیال میرا یہی تھا کہ یہ دونوں مذکورہ حملہ آور وزیر جان کے ہی آدمی ہو سکتے تھے، کیونکہ پہلے بھی اسی مردود کے آدمیوں نے ہی کاؤشی کے گھر پر شب خون مارا تھا اور بعد میں مجھے بھی دھوکے سے بے بس کر کے لے گئے تھے۔ ان کے گمان میں یقینی یہ بات آنا کہ میں دوبارہ کسی وقت بھی یہاں کا رخ کر سکتا تھا، انہوں نے اِدھر ہی کاؤشی کے گھر کے سامنے اپنا کوئی عارضی ٹھکانا بنا لیا ہوگا تاکہ کاؤشی کے گھر پر چوبیس گھنٹے نظر رکھی جا سکے۔

چنانچہ فوری قوتِ فیصلہ کے طور پر میں واپسی کا ارادہ ترک کر کے وہیں ٹھہر گیا۔ اب میری ٹھٹکی ہوئی نظریں گاہے بہ گاہے گردوپیش کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ کاؤشی کے

JBD

نسیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

جہانگیر بُکس

آخری معرکہ 550/-
جب سومنات کے بڑے بت کو توڑنے کی باری آئی تو ہندو راجے اور پجاری سلطان کے قدموں میں گر پڑے اور کہا ہم اس کے وزن کے برابر سونا دینے کیلئے تیار ہیں۔ سلطان کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا اور اس نے جواب دیا میں بت فروش نہیں، بت شکن کہلانا چاہتا ہوں" نسیم حجازی کی ایک ولولہ انگیز تحریر

اندھیری رات کے مسافر 475/-
اندلس میں مسلمانوں کی آخری سلطنت غرناطہ کی تباہی کے لرزہ خیز مناظر، بوڑھوں، عورتوں اور جوانوں کی ذلت ورسوائی کی الم ناک داستان

ثقافت کی تلاش 300/-
نام نہاد ثقافت کا پرچار کرنے والوں پر ایک تحریر، جنہوں نے ملک کی اخلاقی و روحانی قدروں کو طبلوں کی تھاپ، گھنگھروؤں کی چھنا چھن کے ساتھ پامال کیا

قیصر و کسریٰ 625/-
ظہور اسلام سے قبل عرب و عجم کے تاریخی، سیاسی، اخلاقی تہذیبی اور مذہبی حالات زندگی اور فرزندان اسلام کے ابتدائی نقوش کی داستان

اور تلوار ٹوٹ گئی 550/-
شیر میسور (ٹیپو سلطان شہید) کی داستان شجاعت، جس نے محمد بن قاسم کی غیرت محمود غزنوی کے جاہ و جلال اور احمد شاہ ابدالی کے عزم واستقلال کی یاد تازہ کر دی

گمشدہ قافلے 500/-
انگریز کی اسلام دشمنی، بنیے کی عیاری و مکاری اور سکھوں کی معصوم بچوں اور مظلوم عورتوں کو خون میں نہلانے کی لرزہ خیز سچی داستان

داستان مجاہد 300/-
فتح دیبل کے بعد راجہ داہر نے راجوں مہاراجوں کی مدد سے دو سو ہاتھیوں کے علاوہ 50 ہزار سوار اور پیادوں کی نئی فوج بنائی، فاتح سندھ کی معرکۃ الآرا داستان

پردیسی درخت 450/-
اسلام دشمنی پر مبنی ہندوؤں اور سکھوں کے گٹھ جوڑ کی کہانی جنہوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کیلئے تمام اخلاقی حدود کو پامال کرنے سے بھی گریز نہ کیا

یوسف بن تاشفین 500/-
اندلس کے مسلمانوں کی آزادی کیلئے آلام و مصائب کی تاریک راتوں میں امید کی قندیلیں بلند کرنے والے گمنام سپاہی کی داستان

معظم علی 475/-
لارڈ کلائیو کی اسلام دشمنی، میر جعفر کی غداری، بنگال کی آزادی و حریت کے ایک مجاہد معظم علی کی داستان شجاعت

خاک اور خون 550/-
سسکتی، تڑپتی انسانیت، قیامت خیز مناظر، تقسیم برصغیر کے پس منظر میں داستان خونچکاں

کلیسا اور آگ 450/-
فرڈی نینڈ کی عیاری، مسلمان سپہ سالاروں کی غداری، سقوط غرناطہ اور اندلس میں مسلمانوں کی شکست کی داستان

قافلہ حجاز 599/-
راہ حق کے مسافروں کی ایک بے مثال داستان

محمد بن قاسم 425/-
عالم اسلام کے 17 سالہ ہیرو کی تاریخی داستان، جس کے حوصلے اور حکمت عملی نے ستاروں پر کمندیں ڈال دیں

پورس کے ہاتھی 300/-
1965 کی جنگ کے پس منظر میں ہنود اور ہندو کے سامراجی عزائم کی شکست کی داستان، جنہیں منہ کی کھانی پڑی

انسان اور دیوتا 450/-
برہمنی سامراج کے ظلم و بربریت کی صدیوں پرانی داستان، جس نے اچھوتوں کو راہ عمل اختیار کرنے پر مجبور کیا

پاکستان سے دیارِ حرم تک 300/-
تاریخی پس منظر میں لکھا جانے والا ایک دلچسپ سفرنامہ حجاز

آخری چٹان 450/-
سلطان خوارزم جلال الدین خوارزمی کی داستان شجاعت جو تاتاریوں کے سیل رواں کے لیے ایک چٹان ثابت ہوا

سو سال بعد 225/-
گاندھی جی کی مہاتمائیت، اچھوتوں اور مسلمانوں کے خلاف سامراجی مقاصد کی منہ بولتی تصویر

سفید جزیرہ 325/-
بحر اکاہل کے کسی نامعلوم جزیرے کی داستان

شاہین 475/-
اُندلس میں مسلمانوں کے نشیب و فراز کی کہانی

سبق آموز کُتب سلسلہ
دو رنگی طباعت اور تصویری خاکوں سے مزین

- اقوالِ حضرت علی المرتضیٰؓ 165/-
- اقوالِ آئمہ کرامؒ 165/-
- حکایاتِ گلستانِ سعدیؒ 195/-
- اقوالِ شیخ سعدیؒ 140/-
- حکایاتِ رومیؒ 180/-
- دلچسپ و عجیب حقائق 170/-
- حکایاتِ بوستانِ سعدیؒ 199/-
- دلچسپ و حیرت انگیز باتیں 150/-
- ایمان افروز و سبق آموز سچے واقعات 180/-
- بڑے لوگوں کے روشن واقعات 165/-

جہانگیر
اُردو لُغت
(جامع ترین)
ملفوظی طریقے سے تلفظ کے اندراج کے ساتھ اردو زبان کی پہلی لغت

جہانگیر بُک ڈپو
022-2780128 042-35757086
042-37220879 051-5539609 021-32765086

گھر کے دروازے پر بھی پڑ جاتی تھیں اور میری توقع کے عین کے مطابق تھوڑی ہی دیر بعد میں انہی دونوں حملہ آوروں کا لڑکھڑاتا ہوا وجود نمودار ہوتے دیکھ رہا تھا۔ پہلے والے کی تو میں نے ایک دو جھٹکوں میں ہی دُرگت بنا ڈالی تھی اسی لیے اس کی حالت کچھ زیادہ ہی پتلی تھی، البتہ دوسرا کچھ بہتر نظر آتا تھا جس کے سر پر میں نے پستول کے دستے سے وار کیا تھا۔ اسی نے اپنے ساتھی کو سہارا دیا ہوا تھا اور دونوں اب اسی طرح گرتے پڑتے ہوئے سڑک پر آئے اور پھر ان کا رخ اس طرف کو ہو گیا جہاں ایک تنگ سی گلی کے سرے پر قدرے تاریکی میں سیاہ مسٹینگ کھڑی تھی۔

انہیں کار کی سمت آتے دیکھ کر میں بیک یارڈ کی اس بوسیدہ سی دیوار کے ذرا اور اندر کی طرف تاریکی میں دُبک گیا۔ وہ دونوں کار کے نزدیک آکر رکے، میں ان پر حملہ کرنے کی ٹھانے ہوئے تھا۔ دوسرے والے نے جیب سے چابی نکالی تھی، کی چین میں لگے الارمنگ ریموٹ سسٹم کے ذریعے اس نے شاید کوئی بٹن دبایا تھا کیونکہ اگلے ہی لمحے کار سے ایک ہلکی سی میوزیکل آواز ابھری تھی اور ساتھ ہی بیک اور سائڈ لائٹس نے بھی ایک دو بار جل بجھ کر کار کے لاک کھلنے کا کاشن دیا تھا۔ اس نے اپنے ساتھی کو ڈرائیونگ کے برابر والی سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر بٹھا دیا۔ میں اب ان پر حملہ کرنے کے لیے اپنی جگہ سے ذرا سرکا تو مجھے اس کی بھرائی ہوئی آواز آئی۔ وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا۔

''گرے! تم ذرا ریلیکس ہو جاؤ، میں ابھی اندر جا کر آتا ہوں۔''

''میری حالت درست نہیں ہے جان، مجھ پر غشی طاری ہو رہی ہے، مجھے فرسٹ ایڈ کی سخت ضرورت ہے۔ جلدی نکل چلو۔ اب ہمارا شکار یہاں دوبارہ نہیں آئے گا۔'' اس کے ساتھی کی آواز اُبھری، میں اپنی جگہ سے ان کی طرف بڑھتا ہوا ذرا رکا تھا۔ گرے نامی اس کا ساتھی بولا۔

''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ اب چونکہ دوبارہ ہم یہاں کا رخ نہیں کر سکتے، میں ذرا اندر جا کر کچھ ضروری سامان سمیٹ لوں...... بس، چند منٹ دے دو۔'' جون نے کہا۔

''او کے جاؤ......'' گرے کی بیزار اور چڑچڑی سی آواز اُبھری اور جان تیزی سے اسی مکان کے دروازے کی طرف بڑھتا چلا گیا جہاں سے میں نے کاؤشی کے گھر کی کھڑکی سے انہیں نمودار ہوتے دیکھا تھا۔

یہی وہ وقت تھا جب مجھے اپنے لائحہ عمل میں تھوڑی ترمیم کرنا پڑی اور نیچے کو جھک کر کار کی ڈکی والی سائڈ پر آ گیا۔ میں نے ذرا سر ابھار کر دیکھا، گرے کی حالت واقعی ناگفتہ بہ ہو رہی تھی۔ اس نے ڈرائیونگ کے برابر والی سیٹ سے اب اپنا سر ٹکا دیا تھا، میں تھوڑا سرکتا ہوا اور آگے آیا تو مجھے اس کی آنکھیں بھی موندی ہوئی نظر آنے لگیں۔ اس کا ساتھی جون مذکورہ مکان کے اندر داخل ہو چکا تھا اور کوئی دم کو باہر آنے والا تھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ ان دونوں پر اس وقت قابو پانا میرے لیے کوئی مشکل بات نہیں تھی مگر اب میں نے انہیں چھیڑنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔

میں نے دیکھا کہ اب گرے کا سر ایک طرف کو ڈھلک چکا تھا۔ اس پر شاید غشی کا دورہ غالب تھا۔ میں نے موقع تاک کر آہستگی سے ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولا (کیونکہ جیسا کہ مذکورہ ہوا کار سنگل ڈور تھی) اس کے بعد سیٹ تھوڑا آگے سرکا کر میں عقبی سیٹ پر چلا گیا اور دروازہ بھی آہستگی سے جہاں تک بند ہو سکتا تھا، بند کیا اور نیچے کو دبک گیا۔ گرے کا سر اسی طرح ڈھلکا ہوا تھا۔ چند ہی منٹوں بعد مجھے دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ جان لوٹ آیا تھا۔ اس نے گرے کو دو تین بار پکارا مگر جواب ندارد۔ پھر جان کی مجھے بڑبڑانے کی آواز سنائی دی۔

''اوہو...... شاید یہ دوبارہ بے ہوش ہو گیا ہے۔'' کہتے ہوئے اس نے کار اسٹارٹ کی اور ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔ رات کے سناٹے میں کار کے ٹائر سمع خراش آواز سے چرچرائے تھے اور پھر وہ پستول سے نکلی گولی کی طرح دوڑنے لگی۔ مین شاہراہ پر آتے آتے اس نے تیزی سے ایک موڑ کاٹا تھا اور میں پیچھے سیٹ کے نیچے دُبکا ہوا تھوڑا گڑبڑا سا گیا تھا۔

کار چلاتے ہوئے جان کے سان و گمان میں بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ جس ''شکار'' سے مایوس ہو کر اب اپنی ''گھات'' والی جگہ سے واپس لوٹ رہے تھے، وہی شکار انہیں شکار کرنے کے لیے اب پیچھے ان کی گھات میں چھپا .... بیٹھا تھا۔

ان کا چھینا ہوا پستول ہنوز میری پینٹ کی بیلٹ میں اڑسا ہوا تھا۔ کار تیزی سے منزلیں طے کرتی لگ بھگ کوئی نصف گھنٹے بعد ایک مقام پر پہنچ کر رک گئی۔ میں اسی طرح عقبی سیٹ کے درمیان نیچے دبکا لیٹا رہا۔ جان نے منزل قریب آنے سے محض چند سیکنڈ پہلے وزیر جان سے سیل فون پر رابطہ کر کے اسے اپنی ناکامی اور اب واپسی کی رپورٹ کے ساتھ گرے کی میرے ہاتھوں حالتِ زار کی بھی رپورٹ

دے دی تھی۔ جواب میں اسے وزیر جان کی شاید بے نقط بھی سنانا پڑی تھی، کیونکہ جان نے فوراً ہی خوف زدہ سے لہجے میں شرمندگی سموتے ہوئے آئندہ نئے عزم کے ساتھ میری کھوج لگانے کا ''دلاسا'' بھی .... دینے کی کوشش کی تھی۔

یہی وجہ تھی کہ کار رکتے ہی چند افراد ڈرائیونگ سیٹ والے دروازے کی طرف لپکے .... اور انہوں نے سیٹ پر بے ہوش پڑے گرے کو سنبھالا دے کر کار سے نکال لیا... اور دروازہ بند کر دیا --- میں اس دوران میں تھوڑا اور نیچے کو دبک گیا تھا تا کہ ان میں سے کسی کی نگاہ نہ پڑ جائے۔ شکر ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ ان لوگوں کے جاتے ہوئے قدموں کی آواز کے بعد طاری ہو جانے والی خاموشی کے چند منٹ بعد میں احتیاط کے پیشِ نظر اسی طرح نیچے دبکا پڑا رہا۔ اس کے بعد پہلے ذرا سر اونچا کر کے کھڑکی سے اطراف کا جائزہ لیا۔ کار خالی تھی۔ باہر کا منظر بھانپتے ہی میرا دل یکبارگی مسرت تلے زور سے دھڑکا تھا۔ کیونکہ یہ ایک وسیع کارپورٹیکو تھا۔ جہاں دو تین اور بھی چھوٹی بڑی گاڑیاں کھڑی نظر آ رہی تھیں اور یہ مجھے وزیر جان کے ہل ٹاپ والے علاقے ''فوکٹ پیلس'' میں واقع اسی محل نما رہائش گاہ کا حصہ لگتا تھا جہاں میں ایک بار بے ہوشی کی حالت میں یرغمال بنا کے لایا گیا تھا اور پھر ''بندی خانے'' کا قیدی بنا دیا گیا تھا۔ لیکن...... اب میں یہاں آزاد تھا۔ اپنے ازلی اور دشمن دیرینہ کے اتنے قریب خود کو پا کر میرا روم روم جوش سے بھر گیا تھا۔ مگر اس کا یہ بھی مطلب نہیں تھا کہ وہ سینہ لگا لے میرا منتظر ہو گا کہ..... ''آؤ شہزی! میرے سینے میں گولی اتار کر اپنے سینے کی برسوں پرانی آگ سرد کر لو.....''

میں نہایت آہستگی کے ساتھ اور بغیر کوئی آواز پیدا کیے کار سے نیچے اُترا اور اسی طرح جھکے جھکے انداز میں دیگر کھڑی گاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا ایک محتاط اندازے سے آگے بڑھنے لگا۔ ایک جگہ میں ذرا ٹھہرا۔ اطراف میں دیکھا۔ رات کافی اُتر آئی تھی۔ سامنے وسیع و عریض لان تھا، کشادہ کمپاؤنڈ وال میں روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ وہاں سناٹا تھا۔ مرکزی دروازے پر دیدہ زیب عمارتی لکڑی کا کام کیا ہوا تھا اور بڑی خوب صورتی سے محراب بنائی ہوئی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں کوئی پالتو خونخوار جانور اچانک مجھ پر حملہ نہ کر دے کیونکہ ایسی عظیم الشان رہائش گاہوں پر خطرناک کتوں کی موجودگی کو جھٹلایا نہیں جا سکتا..... یہاں چونکہ وزیر جان کو اپنے کسی دشمن سے کوئی خطرہ نہ تھا، میرے سلسلے میں بھی وہ شاید ایک زعم آمیز تشفی میں مبتلا ہو گا کہ بھلا میں یہاں تن تنہا اس کا کیا بگاڑ لوں گا۔ جبکہ اس کے فرشتوں کو بھی نہیں معلوم تھا کہ میں اس کی عظیم الشان رہائش گاہ میں نقب لگا چکا تھا۔ بلکہ اس کے زرخرید کتوں کی ناک کے نیچے سے ہو کر یہاں چلا آیا تھا۔

لیکن دوسرے ہی لمحے میں چونکا۔ میں نے دو سوٹ پوش افراد کو ایک طرف سے نمودار ہوتے دیکھا۔ وہ یقیناً مسلح بھی ہوں گے، تاہم ان کا چوکنا انداز بتاتا تھا کہ وہ پہرے دار ٹائپ کی ہی کوئی شے تھے۔ کیونکہ اب وہ دونوں مین گیٹ کی طرف جا کر کھڑے ہو گئے تھے۔ اگلے ہی لمحے مجھے ان کے اس طرح اچانک نمودار ہو کے گیٹ کے پاس جا کر چوکنا کھڑے ہونے کا مقصد سمجھ آ گیا۔ کیونکہ اسی وقت گیٹ خودکار انداز میں سلائیڈ ہوا تھا اور ایک بھاری بھرکم انٹرکولر ٹائپ کی گاڑی اندر داخل ہوئی اور کار پورچ کی طرف آنے کے بجائے مرکزی دروازے کے سامنے جا رکی۔ وہ دونوں سوٹ پوش گارڈز اس کی جانب لپکے تھے۔ گاڑی کے اگلے پچھلے دروازے یک بیک کھلے اور اس میں سے تین افراد برآمد ہوئے۔ دو خاصے لحیم شحیم تھے اور ان کا انداز بھی یہی بتاتا تھا کہ وہ کسی کے فرستادہ تھے، جبکہ تیسرا آدمی بھی دراز قامت ہی تھا مگر اس کا جسم کسی بھینسے کی طرح خوب گٹھا ہوا اور گینڈے جیسا مضبوط اور کسا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ سر بالکل گنجا تھا۔ رنگت تانبے کی طرح تھی۔ وہ بہترین تراش کے سوٹ میں ملفوف تھا۔ چہرے سے بڑی خطرناک قسم کی درشتی مترشح ہوتی تھی، آنکھوں کے پپوٹے سوجے سوجے تھے جس کے باعث اس کی آنکھیں ''میچی'' ہوئی لگتی تھیں، بہ ہیئتِ مجموعی اس کی شخصیت خاصی رعب داب والی اور کسی مافیائی چیف سے ملتی جلتی دکھائی پڑتی تھی۔ وزیر جان کے بھیجے ہوئے وہ دونوں فرستادہ بڑے ہی مودبانہ انداز میں اس کی طرف تعظیم والے انداز میں بڑھے تھے، مگر اس گینڈے نما شخص نے ان کی طرف صرف اک ابروئے جنبش سے ہی دیکھنا گوارا کیا تھا اس کے بعد وہ دروازے کی طرف بڑھا تھا۔ ایک فرستادہ تیزی سے اس سے پہلے ہی دوڑ کر دروازے تک پہنچا تھا اور دروازہ کھول دیا تھا۔ گینڈا نما آدمی بڑے کروفر کے ساتھ اندر داخل ہو چکا تھا اور اس کے دونوں گارڈز بھی۔ بعد میں وزیر جان کا ایک آدمی واپس گیٹ کی طرف پلٹ آیا تھا۔ اس مختصر سی ہلچل کے بعد میں عقبی سمت کو پلٹا اور ایک گیلری کو تاک کر میں نسبتاً ایک اونچی چھت والی گاڑی کو تاڑ کر اس پر چڑھا اور گیلری میں آ گیا۔ یہاں گھنے پتوں اور پودوں والی بیلیں اوپر تک چلی گئی

تھیں۔ میں گیلری میں آیا تو سامنے کا منظر واضح تھا۔ ایک ہال اور اس کے دائیں بائیں قدِ آدم گملے ایستادہ نظر آرہے تھے۔ یہ کوئی راہداری تھی جو اس دروازے کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ میں چند ثانیے کے لیے وہیں رُکا رہا اس کے بعد کسی ممکنہ خطرے یا دیکھ لیے جانے کا خدشہ فرو ہوتے ہی میں نے قدم آگے بڑھا دیے۔ راہداری کے دونوں طرف میں نے جھانکا وہ سنسان پڑی تھی۔ وہاں مدھم سی روشنی تھی۔ مختلف کمروں کے دروازے بھی نظر آرہے تھے۔ میں نے متوقع ہال نما کمرے کے دروازے کے قریب آکر ایک کان چپکا کر اندر کی سُن گُن لینا چاہی تھی مگر اتھاہ خاموشی کے سوا کچھ نہ تھا۔ پھر میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ دروازے کو معمولی سا اندر کی طرف دھکیلا تو وہ تھوڑا سا کھلا میں نے پھر احتیاطاً ایک آنکھ جھری سے چپکا دی، اندر مدھم سی روشنی کے سوا کچھ نہ تھا لیکن جیسے ہی میں دروازے کو پورا دھکیل کر اندر داخل ہوا تو اسی وقت میری چھٹی حس نے خطرے کا الارم بجایا......مجھے یوں لگا جیسے میرے عقب میں کوئی ایک دم نمودار ہوا، کوئی ''جھپک'' سی مجھے محسوس ہوئی تھی اور میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ پلٹا تھا، ایک تنومند سا مگر قدرے ٹھگنا شخص مجھ پر ایک بھاری گن کے دستے سے حملہ کرنے والا--- میں نے بروقت جھکائی دیتے ہی اس کے پیٹ میں ٹکر ماردی۔ اس کا وار خالی گیا اور پیٹ میں ضرب کھا کے وہ ہولے سے کراہ......لیکن اس نے سنبھلنے میں بھی چنداں دیر نہیں لگائی اور ہاتھ میں پکڑی ہوئی گن کو لٹھ کی طرح گھما کے میرے سر پر مارنے کی کوشش چاہی تھی کہ میں نے برق کی طرح پینترا بدل کے یہ وار بھی اس کا خطا کیا اور ساتھ ہی کھڑی ہتھیلی کا وار اس کی گردن پر کیا۔ وار زوردار ثابت ہوا اور اس کے دوررس نتائج بھی ظاہر ہوئے۔ وہ یتورا کر گرا اور ڈھیر ہوگیا۔ اس کی ہنسلی کی ہڈی تڑخ چکی تھی۔ میں نے اس کی گن جھپٹی اور جھک کر اس کی گردن میں ہاتھ ڈال کر رگِ حساس مسل ڈالی۔

ہلکی ساخت کی یہ مشین گن ایم پی فائیو کی طرح تھی جس کا میگزین لمبا تھا۔ اپنے طاقت ور دشمن کے گھر میں دو ہتھیار میرے قبضے میں آتے ہی میری ہمت کو سوا کر گئے تھے، تاہم مجھے اپنی زخمی ٹانگ کا بھی درد تھا۔ اگرچہ میں نے اس کے کھلے ٹانکوں والے زخم پر پٹی باندھ لی تھی، مگر میں جانتا تھا کہ پراپر بینڈیج کے بغیر یہ زخم رستا رہے گا اور شاید یہی وجہ تھی کہ جب میری اچانک فرش پر نگاہ پڑی تو میرا چہرہ ایک پریشان کن تشویش تلے ست کر رہ گیا۔

میں اپنے پیچھے خون کی لکیر چھوڑتا چلا آیا تھا۔ حملہ آور یقیناً اسی کی ''رہنمائی'' پر... میرے تعاقب میں یہاں تک چلا آیا تھا اور خطرہ تھا کہ یہ لکیر وزیر جان کے کتوں کو میری (ا) دیتی ہوئی یہاں تک کھینچ لاسکتی تھی۔ گویا مجھے ...اب جو کچھ کرنا تھا فوراً ہی کرنا تھا۔ میں گویا اصل وقت سے پہلے ہی ایک خطرناک صورتِ حال کا شکار ہوگیا تھا۔

میں نے تیزی سے ہال کا جائزہ لیا۔ ہال کا ماحول مدھم روشنی میں مدغم تھا۔ میں دبے پاؤں آگے بڑھا۔ ایک دروازے کے قریب پہنچا تو اس کے پار مجھے گونجدار آوازیں آتی سنائی دیں۔ برہمی کا تاثر دیتی یہ گونج مجھے کسی ''چپقلش'' ہنگامے کا پتا دیتی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے دروازے پر ایک کان لگا کر دوسری جانب کی سُن گُن لینا چاہی، اس کے بعد اسے بے آواز تھوڑا سا کھول کر جھری بنائی تو سامنے ہی مجھے ایک اور کشادہ اور پُرتزئین و آراستہ کمرے کا تقریباً تین چوتھائی منظر نظر آیا اور میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہوگئی۔

نفیس، دیدہ زیب اور شاہانہ طرز کا فرنیچر بچھا ہوا تھا اور وہاں مجھے وہی گینڈا نما شخص صوفے کی پشت گاہ سے ٹیک لگائے بیٹھا نظر آیا۔ اس کی انگلیوں میں کتھئی رنگ کا موٹا سگار تھا۔ دو اس کے دو ساتھی اس کے دائیں بائیں کھڑے تھے۔ چار افراد دیگر بھی اسی طرح تنے کھڑے نظر آرہے تھے، جو اس کے سامنے والے صوفے پر بڑے کروفر سے براجمان وزیر جان کے ہی آدمی تھے۔ گینڈے نما شخص کا چہرہ ٹماٹر کی طرح سرخ ہورہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے شدید قسم کی برہمی عیاں تھی، جبکہ وزیر جان کے چہرے پر سرد تاثرات تھے۔ ان کے درمیان ..... بڑی سی گلاس ٹاپ ٹیبل پر اعلیٰ درجے کی شمپئین اور آئرلینڈ کی اسکاچ وھسکی کی بوتلیں اور بلوریں پیگز رکھے ہوئے تھے۔ گفتگو کرنے سے پہلے وہ شاید ایک آدھ پیگ لگا چکے تھے۔

''مسٹر وزیر جان! تم جو کچھ بھی ہو، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔'' گینڈے نما شخص نے سگار کا ایک کش لیتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز غراہٹ سے مشابہ تھی۔

''میری بذاتِ خود یہاں آمد، معاملے کو ادھر ہی ختم کرنے کے لیے کافی سمجھو۔ میری معلومات کبھی غیر مستند نہیں ہوتیں۔ ہمارا شکار تمہاری قید میں ہے اور اس کے بدلے میں تمہیں منہ مانگی رقم بھی دینے کو تیار ہوں۔ ورنہ یہ کام میں اپنے دوسرے طریقے سے بھی کرسکتا تھا۔ تم اس شہر میں مہمان ہو اسی لیے تم مجھے نہیں جانتے کہ بینکاک میں، میں

میں نام سے مشہور ہوں۔'' اس کے لہجے میں دھمکی پوشیدہ تھی۔ وہ فطرتاً انتہا کی حد تک گزر جانے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔ جواب میں وزیر جان نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''مسٹر کاسپاکو......! اپنا لہجہ درست رکھو، تم مجھے نہ جاننے کی ایک بھیانک غلطی کر رہے ہو، سمجھو تو تمہارے لیے اتنا ہی کافی ہے، تمہارے جیسے کتنے ہی گینگسٹر میری جیب میں رہتے ہیں۔ باقی مجھے بھی تم سے اور تمہارے معاملات سے کوئی غرض نہیں ہے۔ شہزاد نامی وہ نوجوان تم سے پہلے ہمارا شکار ہے۔ تم نہیں جانتے کہ میں پاکستان سے اس کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک پہنچا ہوں مگر تمہارے آدمی کی مداخلت سے وہ یہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ باقی یہ دھمکیاں اپنی جیب میں سنبھال کر رکھو...... میری چھت کے نیچے ہو اسی لیے تم یہ سب کہنے کے بعد زندہ ہو......'' کہتے ہوئے وزیر جان نے اپنے ایک آدمی کو مخصوص اشارہ کیا۔ وہ فوراً حرکت میں آیا اور پلٹ گیا، چند ہی سیکنڈوں میں اس کی واپسی ہوئی تھی اور اب اس کے ہاتھ میں ایک پاؤچ نظر آرہا تھا، جس میں سے اس نے ایک لائٹ براؤن کلر کا پائپ نکالا اور ایک تھیلی سے نفیس قسم کے تمباکو کا گرین مکسچر نکال کر پائپ کے باؤل (bowl) میں بھرا کا اور پھر وہ نہایت احترام کے ساتھ وزیر جان کی طرف بڑھا دیا۔ جسے وہ اپنے سنہرے رنگ کے میوزیکل لائٹر سے سلگانے لگا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے کاسپاکو کی تہدید کو خاطر میں ہی نہیں لا رہا ہو۔

میں ان کی گفتگو سن کر ہولا کر رہ گیا تھا۔ ان کے ''شکار'' سے مراد یقیناً میں ہی تھا اور سامنے بیٹھا ہوا آدمی ہلاک کا وہی خطرناک گینگسٹر کاسپاکو تھا جو میرے خون کا پیاسا ہو رہا تھا، میرے سلسلے میں اس کی ادھوری معلومات کہ میں ابھی تک وزیر جان کی قید میں تھا، ان کے لیے خطرناک جنگ کا سبب بن سکتی تھی۔ مجھے کس حد تک ان دو ہاتھیوں کی جنگ میں فائدہ پہنچ سکتا تھا، اس کے انتظار میں رہنا فضول ہی ہوتا۔ تھوڑا غور کرنے پر مجھے ادراک ہوا تھا کہ جس طرح موتو... نے وزیر جان کے لوکاس نامی آدمی کے ذریعے میرا اسراغ لگایا تھا یقیناً اسی طرح کاسپاکو کے لیے پتا لگانا کیا مشکل تھا، یہ الگ بات تھی کہ اسے تاخیر ہو گئی تھی اور اب وہ وزیر جان کی بات کا یقین کرنے پر تیار نہ تھا۔ کاسپاکو کو اندازہ تھا کہ میں ابھی تک وزیر جان کی قید میں ہی ہوں۔

میں نے دیکھا وزیر جان کی اس بات پر کاسپاکو کا چہرہ لال بن گیا۔ وہ پُرطیش انداز میں یک دم اٹھ کھڑا ہوا اور غراتے ہوئے بولا۔''اس کا مطلب ہے میں نے یہاں آکر غلطی کی ہے۔ تم اب اس شہر میں ہی نہیں، دنیا میں بھی چند دنوں کے مہمان ہو...... اب بھی وقت ہے، قیدی میرے حوالے کر دو، میں یہاں سے چلا گیا تو تمہارے اس محل میں زلزلہ آجائے گا۔''

''شکر کرو اس بات کا کہ زندہ جا رہے ہو۔'' وزیر جان نے اسی اطمینان اور بے پروا... انداز میں پائپ کا کش لگاتے ہوئے کہا مگر اس کی آواز میں اژدھے کی سی خوفناک جھپک تھی۔

کاسپاکو چند ثانیے کے لیے اسی طرح بپھرا ہوا کھڑا وزیر جان کو خونیں نظروں سے گھورتا رہا اس کے بعد وہ پلٹ کر واپس مڑ گیا۔ دروازے تک پہنچا۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ کوٹ کی جیب میں ڈال لیا تھا پھر وہ دروازے سے باہر قدم نکالنے کے بجائے حیرت انگیز پھرتی سے پلٹا تو ایک دس ایم ایم کا ٹرپل تھری فال آؤٹ تباہ کن پسٹل اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے پلٹتے ہی وزیر جان پر فائر داغنا چاہا تھا...... مگر شاید اس نے حد درجہ طیش اور خطرناک زعم میں مبتلا ہو کے وزیر جان کو واقعی معمولی آدمی سمجھنے کی غلطی کر ڈالی تھی، نہیں جانتا تھا کاسپاکو... کہ اس وقت اس کی سانسوں کی رفتار پر بھی، وہاں چوکس کھڑے وزیر جان کے مستعد آدمی نظر رکھے ہوئے تھے، لیکن...... ان چاروں نے کوئی حرکت نہیں کی تھی نہ ہی وزیر جان اپنی جگہ سے ایک انچ... ہلا تھا۔ میری دم بہ خود سی نظریں تو کیا مجھے تو اپنا دل بھی یک دم ٹھہرا ہوا لگا تھا۔

کاسپاکو غیظ و غضب کے مارے بلاخیز پھرتی کے ساتھ خطرناک ہتھیار نکالتے ہی وزیر جان کی طرف گھوما ہی تھا کہ اس کے گینڈے جیسے جسم کو ایک زبردست جھٹکا لگا تھا۔ دس ایم ایم کا ٹرپل تھری فال آؤٹ جیسا خطرناک پسٹل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرا، اس کا وہ ہاتھ خون آلودہ نظر آنے لگا، دوسرا خون کا ابلتا فوارہ میں نے اس کی دائیں ٹانگ سے اڈتا دیکھا۔ مگر اس سے بھی پہلے میری چست نظروں نے دائیں بائیں سے یک بیک دو بار شعلوں کی ''جھپک'' پھوٹتے ضرور دیکھی تھی۔ میں یک دم محتاط ہو گیا۔ وزیر جان کے نجانے کتنے اور مسلح آدمی پردوں کے پیچھے سے وزیر جان سمیت کمرے کی ایک ایک شے پر خفیہ طور، بڑی مستعد اور چوکس نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ میرے حساب سے کاسپاکو خوش قسمت آدمی ثابت ہوا تھا کہ وزیر جان کے خفیہ پردوں کے پیچھے چھپے ہوئے مسلح گماشتوں نے اس کے

پستول والے ہاتھ اور ایک ٹانگ کو نشانہ بنایا تھا، وہ اس کے سر کا بھی نشانہ لے سکتے تھے۔ وزیر جان اپنے قبیل کے آدمیوں سے کم از کم اتنی رعایت تو ضرور کرتا تھا، ورنہ وہ اپنے دشمنوں کو کہاں چھوڑنے والا تھا۔

لیکن اس انکشاف نے مجھے ضرور محتاط کر دیا تھا۔ میرے تو سان گمان میں بھی نہ تھا کہ وزیر جان کے ''شوٹرز'' اس طرح خفیہ طور پر پردوں کے پیچھے چھپے بیٹھے اس کی حفاظت پر مامور ہوں گے، یہ میرے لیے بھی ایک طرح سے اچھا ہی ہوا تھا۔ چونکہ میں اب ان دونوں چھپے ہوئے شوٹرز کی کمین گاہ سے واقف ہو چکا تھا اور یہی وہ وقت تھا جب میری رگ رگ میں جوشِ جنوں کا ایک طوفان امڈ پڑتا ہے اور پکار پکار کر میرے اندر ''آر یا پار'' یا ''ابھی نہیں تو کبھی'' نہیں کی گردان شروع کر دیتا ہے تو میں پھر اپنے آپ میں نہیں رہتا۔ یہی وہ ایک موقع ہوتا ہے جب میں کسی دشمن کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کے لیے تیار ہو جاتا ہوں۔ جب میں دیکھتا ہوں کہ حالات کی چند مستعار گھڑیاں اب میرے ہاتھ میں ہیں۔ یہی سبب تھا کہ جب زخمی کاساپاکو اس کے ساتھ آئے ہوئے وہ دو دونوں آدمی سنبھال رہے تھے اور وزیر جان غرور تلے قہقہے لگائے جا رہا تھا تو میں نے اپنے دونوں پستول ہاتھوں میں پکڑ لیے تھے۔ میرے سیدھے ہاتھ میں یہاں کے حملہ آور سے چھینی ہوئی ایم پی فائیو کی ہلکی ساخت کی مشین گن اور دوسرے ہاتھ میں کاوشی کے گھر میں حملہ کرنے والے وزیر جان کے دو گماشتوں گرے اور جان کا پسٹل لوگر تھا۔ ادھر جب وزیر جان پُرغرور لہجے میں کاساپاکو سے کچھ کہنے میں معروف تھا، میں دروازہ پار کر چکا تھا، جب تک یہ لوگ سنبھلتے، میں نے دونوں ہاتھ دائیں بائیں پھیلا کر اپنے ہتھیاروں سے شعلے اگلنا شروع کر دیے۔ ہولناک گرج کے ساتھ گولیوں کی بوچھاڑ امڈی اور دو چیخیں مجھے دونوں طرف کی بالکونیوں سے آتی سنائی دیں، یہی نہیں دو افراد تڑپ کر نیچے بھی لڑھکتے ہوئے آتے دیے۔

نیچے والے جب تک سنبھلتے میں نے کاساپاکو اور اس کے دونوں آدمیوں کو نشانہ بنانے کے بجائے وزیر جان کے چاروں آدمیوں کو، جن کے ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں رینگ گئے تھے، اپنی شعلے اگلتی گنوں سے نشانہ بنایا۔ وہ مجھ پر ہتھیار اٹھانے کی خواہش تو پوری کر چکے تھے، مگر فائر کرنے کی حسرت دل میں لیے چھلنی ہو کر گرتے چلے گئے۔ وزیر جان کے بدمست قہقہوں کو یک دم بریک لگ گئے۔ کاساپاکو کا چہرہ تھوڑی دیر پہلے نہایت غضب انگیزی کا عکاس نظر آتا تھا وہ اب ایک عجیب سی حیرت کی غمازی کرتا دکھائی دے رہا تھا۔

''خبردار......! وزیر جان! کوئی حرکت مت کرنا، تمہارا آخری وقت قریب آ چکا ہے۔''

میں نے اپنے دل و دماغ کی ساری حسرتوں کو ایک غضب ناک جنوں تلے سموتے ہوئے لہجے کی پوری گھن گرج کے ساتھ دہاڑ کر کہا۔ اس کا منہ حیرت و خوف کے باعث کھلا رہ گیا تھا۔ اس میں اتنی جرأت ہی نہ ہو سکی تھی کہ وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس بھی ہوتا۔ پائپ اس کے منہ سے لڑھک کر اس کی گود میں گر پڑا تھا۔ وہ میری جنوں خیزی اور وحشت لہو رنگ فطرت سے خوب اچھی طرح واقف تھا۔

''شش......شہزی......! تت......تم......'' اس کے منہ سے اتنا ہی نکلا تھا کہ دوسرے ہی لمحے اس کا صوفہ الٹا گیا۔ میں یہ دیکھتا ہی رہ گیا کہ ہوا کیا تھا؟ صوفے والی زمین برابر ہوگئی تھی۔ ناکامی اور احساسِ شکست تلے میرا چہرہ مسخ ہو کر رہ گیا، ادھر کاساپاکو کے دونوں آدمی مجھے نجانے کیا سمجھ کر اپنے سرغنہ کو فوراً گھسیٹتے ہوئے دروازے سے باہر نکل گئے۔

ٹھیک اسی وقت دائیں جانب سے میں نے دو مسلح افراد کو نمودار ہوتے دیکھا۔ وہ مجھ پر اپنی گنز کے دہانے کھول چکے تھے۔ گولیوں کی تڑتڑ کی آواز ابھرتے ہی میں نے بہ سرعت فرش پر سوئپ کیا اور گھسٹتا ہوا ان کی فائرنگ کی زد سے نکلا تو موقع پاتے ہی میں نے اپنے دونوں ہاتھوں میں دبے ہتھیاروں کا رخ ان کی جانب کر دیا۔ دونوں نالیں یک بیک آتشیں قہقہے اگلتی ہوئی گرجیں، ایک کو میں نے چھلنی ہو کے گرتے دیکھا دوسرے نے بھاگنے کی کوشش چاہی تھی، مگر وہ بھی گولیوں کی باڑ کی زد میں آ کر کریہہ ناک چیخ خارج کرتے ہوئے گرا۔

وزیر جان میری نظروں سے کسی بدروح کی طرح اچانک غائب ہو گیا تھا اور میں جو اسے جہنم واصل کرنے کی خواہش ...... تلے درانہ وار خود کو ایک خطرناک اور جان لیوا رسک میں ڈال چکا تھا، اب .... تلملا کر رہ گیا۔ یہی وہ وقت تھا جب میں نے باہر کسی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔ میرے انگ انگ میں جیسے برقی رو دوڑ گئی۔ میں تیزی سے دوڑتا ہوا باہر نکلا۔ یہ وہی دروازہ تھا جس سے میں اندر داخل ہوا تھا کیونکہ یہی وہ راستہ تھا جو نسبتاً کار پورچ کے نزدیک تھا۔ میں بے تحاشا دوڑتا ہوا پہلے اسی ہال میں پہنچا اور پھر وہاں سے گیلری کی ریلنگ پھلانگ کر سیدھا سیاہ مسٹنگ کی چھت پر گرا۔ کیونکہ چھلانگ لگاتے وقت میں نے وزیر جان کا بھاری بھرکم ہیولا کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان ہوتے دیکھ لیا تھا۔ کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھی، تھوڑی بیک ہوئی اور پھر پھاٹک کی طرف گولی

کی طرح آگے کو بڑھی تو میں اس کی چھت پر سے لڑھکتا ہوا پورچ کے کنکریٹ والے پختہ فرش پر آن گرا...... مگر اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی میں نے۔ سیاہ مسٹینگ پام اور باڑھ کے درختوں کے درمیان سے گزرتی کنکریٹ کی بل کھاتی روش سے نکلی جا رہی تھی اور اب میں اس کی بیک لائٹ دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کر پا رہا تھا، لیکن دوسرے ہی لمحے میرے جوش جنوں نے مجھے بری طرح کھدیڑ کر رکھ دیا۔ میں نے پاس کھڑی ایک کار کی ڈرائیونگ سیٹ کی طرف کی کھڑکی کا شیشہ گن کے دستے سے توڑا اور لاک کھول کر میں نے اگنیشن سوئچ کی طرف دیکھا، چابی لگی ہوئی تھی، نہ بھی لگی ہوتی تو میرے لیے بغیر چابی کے کار اسٹارٹ کرنا معمولی بات ہوتی۔ اسٹیئرنگ سنبھالتے ہی میں نے کار اسٹارٹ کر کے گیئر میں ڈال کر آگے بڑھا دی۔ پورچ کے فرش پر کار کے ٹائرز زور سے چرچرائے تھے۔ میری کار کے سامنے کاسپاکو کی بھاری بھرکم گاڑی کا پچھلا حصہ آ گیا۔ میں اسے ٹکر مارتے ہوئے گیٹ کی طرف آ گیا۔ عقب سے میری کار پر کسی نے گولیاں برسائی تھیں مگر میں کار دوڑاتا ہوا سڑک پر آ گیا۔ ذرا ہی دور ایک قوس کی صورت میں جاتی ویران اور تاریک سڑک پر مجھے وزیر جان کی سیاہ مسٹینگ کی سرخ بتیاں نظر آ گئیں اور تیزی سے دور ہوتی غائب ہونے لگی تھیں کہ میں نے اپنی کار کا ایکسلیریٹر پورا دبا دیا۔ کار کا انجن غرایا اور وہ طوفانی رفتار سے دوڑنے لگی۔ ذرا ہی دیر بعد میں نے وزیر جان کی سیاہ مسٹینگ کو جالیا۔ میرے اعصاب پوری طرح تنے ہوئے تھے اور سینہ ایک بھڑکتی آگ تلے سلگ رہا تھا۔ رگوں میں لہو اس وقت مثلِ لاوا کے گردش کر رہا تھا۔ ایک ہی دھن اس وقت میرے سر پر سوار تھی کہ موت بن کر وزیر جان کو جالوں......

دونوں کاریں مین شاہراہ پر آ گئی تھیں اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ وزیر جان اس وقت اپنے کون سے اگلے ٹھکانے کا رخ کرنا چاہتا تھا یا پھر اس وقت محض مجھ سے پیچھا چھڑانے کی جستجو میں تھا۔

مسٹینگ نے ایک موڑ کاٹا اور انڈر پاس میں جاتی ہوئی ذیلی سڑک پر جا اتری۔ میں نے بھی اپنی کار کا اسٹیئرنگ موڑا تو ایک جھٹکا لگا اور کار یہ تنگ موڑ کاٹتے ہوئے ایک طرف سے اونچی ہو کر دو پہیوں پر آ گئی، لیکن پھر فوراً اس کے چاروں ٹائروں نے سڑک پکڑ لی۔ مجھے ایک جھٹکا لگا مگر اسٹیئرنگ سے میری گرفت کمزور نہ پڑی۔ میری زخمی ٹانگ کا درد پھر جاگنے لگا تھا اور کوئی بعید نہ تھا کہ کسی وقت بھی زخم دوبارہ کھل کر جریانِ خون کا باعث بن سکتا تھا۔ لیکن مجھے ابھی کسی زخم کی پروا ہی کب رہی تھی۔

انڈر پاس پورا ایک کلو میٹر تھا اور یہاں دو رویہ سڑک تھی۔ آتی جاتی ٹریفک کا سیلِ رواں تھا۔ شکر تھا کہ کوئی پولیس کار ابھی تعاقب میں نہیں لگی تھی۔ مجھے وزیر جان کو زیادہ موقع نہیں دینا چاہیے تھا۔ اپنی جان بچانے کے لیے وہ بزدلی پر بھی اترنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا تھا، یوں وہ پولیس کی پناہ میں بھی خود کو دے سکتا تھا اور اپنا تعارف کسی ڈان کی حیثیت سے کرانے کے بجائے ایک معتبر بین الاقوامی ادارے (اسپیکٹرم) کے ایک معزز رکن کی حیثیت سے کروا کے میری جان پھنسا کر اپنی چھڑا سکتا تھا۔

اچانک مجھے ایک اور ایسی ذیلی سڑک نظر آ گئی جو اس سڑک کو آگے سے جا کر ''ٹچ'' کرتی تھی۔ ٹریفک ہونے کے سبب میں سیاہ مسٹینگ کے زیادہ قریب نہیں پہنچ سکا تھا۔ لہٰذا میں نے ایک دم اسٹیئرنگ کاٹا، اس کے لیے مجھے رانگ وے پر آنا پڑا تھا۔ دو ایک گاڑیاں میرے سامنے بھی آ گئی تھیں، ان کی تیز ہیڈ لائٹس سے میری آنکھیں بھی چندھیا گئی تھیں، مجھے یقین تھا کہ ان کے سوار مجھے بے نقط سنانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی گاڑیوں کے ہارن کریہہ ناک انداز میں چلائے بھی تھے اور بریک لگانے کے سبب ٹائر بھی چیخے تھے۔ مگر میں کار تیزی سے دوڑاتا ہوا مطلوبہ سڑک پر آ گیا۔ اب میرے دائیں جانب ایک وسیع پارک تھا جہاں پام کے درختوں کی بہتات نظر آتی تھی اور اس کے دوسری جانب وہ دو رویہ سڑک تھی جس پر وزیر جان اپنی مسٹینگ کو طوفانی رفتار سے دوڑائے جا رہا تھا۔ میں نے ایکسلیریٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا۔ کار غرانے لگی۔ جہاں دونوں سڑکوں کا اتصال ہوتا تھا عین اس کے بائیں جانب ہی ایک برج تھا اور اس کے نیچے جھلملاتا پانی اور اس پر تیرتی ہوئی کشتیاں صاف نظر آتی تھیں۔

میں نے جوش تلے اسی مقام اتصال پر اپنی کار دائیں جانب سے آتی ہوئی مسٹینگ سے ٹکرا دی، اسی وقت وزیر جان نے بھی شاید دور سے ہی خطرہ بھانپتے ہوئے اپنی مسٹینگ کا اسٹیئرنگ کاٹا تھا اور یوں ہم دونوں ہی کی گاڑیاں بے قابو ہو کر برج کی طرف کو گھوم گئیں اور وہاں سے لہراتی ہوئی برج سے نیچے جھلملاتے پانی میں جا گریں۔

مجھے ایک زوردار چھپاکے کی آواز سنائی دی اور پھر یوں لگا جیسے کوئی غرارے کر رہا ہو۔ کار کے شیشے بند تھے، مگر پانی میں ڈوبنے کے سبب اندر بھی پانی بھر سکتا تھا۔ میں نے دائیں جانب سر گھما کر دیکھا، وزیر جان کی مسٹینگ کی ہیڈ لائٹس پانی کے اندر جلتی ہوئی عجیب ہولناکی کا تاثر دیتی محسوس ہوئیں، ہم

دونوں ہی تہ آب ہو چکے تھے، مگر تہ میں پہنچتے ہی میں نے لات مار کر دروازہ کھولا اور پانی کے اندر تیرتا ہوا وزیر جان کی کار کی طرف بڑھا۔

پانی کے اندر میری اور وزیر جان کی زندگی اور موت کی یہ جنگ مجھے آخری جنگ محسوس ہو رہی تھی، ایسا لگتا تھا جیسے آج وہ ہمو گا یا میں...... یا پھر دونوں نے ہی ڈوب مرنا تھا۔

وزیر جان بھی اپنی کار کا دروازہ کھولنے کی تگ و دو میں تھا، لیکن میں نے اس کی کوشش ناکام بنادی۔ اس کی کار میں تیزی سے پانی بھرتا جارہا تھا۔ مجھے حبسِ دم کی خاصی مشق تھی اور میں آج اسے بروئے کار لاتے ہوئے وزیر جان کی موت کا پیامبر بنا ہوا تھا۔ وہ جس دروازے کا رخ کرتا میں تیر کر اس طرف چلا جاتا اور اس کی کوشش کو ناکام بنا ڈالتا۔ جلد ہی اس نے ہمت ہار دی۔ پانی اس کی کار کے اندر چھت تک سے ٹکرانے لگا۔ وہ اس میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہم دونوں کھڑکی کے شیشے سے ایک دوسرے کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ میری آنکھوں میں نفرت اور انتقام تھا تو وزیر جان جو کبھی اپنی ناک پہ مکھی نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ بڑی بے لاچارگی اور رحم کی بھیک مانگتا ہوا چہرہ لیے مجھے تکے جارہا تھا۔ اس کے چہرے پر موت کی زردی تھی۔ اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ آنکھوں میں رحم کی اپیل تھی۔ میں اسے شیشے کے پار گھور رہا تھا اور نفی میں اپنا سر ہلا رہا تھا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ کھڑکی کے شیشے پر مارے جارہا تھا۔ کبھی اپنے دونوں ہاتھ جوڑ رہا تھا اور میں بدستور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بار بار نفی میں اپنا سر ہلائے جارہا تھا۔ اس کے منہ سے بلبلے بن کے چھوٹ رہے تھے۔ اور کچھ ہی دیر میں اس کی روح بھی اسی طرح بلبلا بن کر پرواز کرنے والی تھی۔

بالآخر اس کا دم اکھڑنے لگا۔ اسے جھٹکے لگنا شروع ہو گئے۔ وہ جان کنی کے عمل سے گزر رہا تھا۔ خود میرا بھی دم گھٹنے لگا تھا، مگر میں نے سانس روکی ہوئی تھی ..... دوسرے ہی لمحے مجھے سطح آب پر سانس لینے کے لیے آنا پڑا اور ایک بڑا سانس کھینچ کر میں دوبارہ تیرتا ہوا گہرائی میں اتر گیا۔ نہر زیادہ گہری نہیں تھی۔ میں دوبارہ تیرتا ہوا وزیر جان کی مسٹینگ کے قریب آیا تو دیکھا اس کا ناپاک وجود پانی بھری کار کی چھت سے پشت کے بل لگا ہوا معلق سا نظر آ رہا تھا اور اس کے ہاتھ پاؤں نیچے کو جھول رہے تھے۔ وہ ختم ہو چکا تھا۔

میرے ماضی کا ایک خوفناک کریکٹر، ایک چیلنج، ایک قابلِ نفرت انسان، ملک دشمن، دھوکے باز، اسپیکٹرم کا ایک اعلیٰ عہدے دار اور لولووش کا سب سے زیادہ چہیتا اور کارآمد مقرب خاص کارپرداز آج اپنے اس بھیانک انجام کو پہنچ چکا تھا جس کا اس نے تصور بھی نہیں کیا ہوگا کہ ہل ٹاپ کے ایک شاہانہ پوش علاقے فوکٹ پیلس کے عظیم الشان محل میں فروکش، یوں اپنے عبرت ناک انجام کو بھی پہنچ سکتا تھا۔ پاکستان میں وہ کسی چوہے کی طرح میری تاک میں چھپا بیٹھا تھا اور پھر مجھے بہ آسانی ہلاک کرنے کی آس لیے وہ بھی میرے ساتھ ہی بینکاک آپہنچا تھا۔ مگر اسے کیا پتا تھا کہ میری نہیں بلکہ اس کی موت اسے یہاں کھینچ لائی تھی۔

اس کی موت کی اچھی طرح تسلی کرنے کے بعد میں دوبارہ سطحِ آب پر ابھرا تو کنارے پر اور برج کی ریلنگ کے قریب جہاں پول پر روشنیاں جگمگا رہی تھیں، لوگوں کا ہجوم اور پولیس گاڑیوں کے نیلے پیلے گردشی ہوٹرز سائرن دیتے دکھائی دیے، میں دوبارہ پانی میں ڈبکی لگا گیا اور اندر ہی اندر تیزی سے تیرتا ہوا ایک محتاط اندازے سے کافی دور جا نکلا۔ میں جانتا تھا کہ کسی وقت بھی ہیلی کاپٹر کی ریسکیو پارٹی یہاں اترنے والی تھی۔ اس معاملے میں ان کا متعلقہ عملہ نہایت مستعد ہو جاتا تھا۔ وہ اسے ایک حادثے کا ہی رنگ دیتے۔ میں کافی دور نکل کر ابھرا تھا اور تیرتا ہوا کنارے پر آ کر بے دم سا ہو کر گر پڑا۔ چند ثانیے میں نے لمبے لمبے سانس لیے اس کے بعد اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے اردگرد پام کے درخت تھے، ان کے پار مجھے روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ میں نے دونوں ہتھیار پانی میں ہی غرق کر دیے تھے۔ میرا پاؤچ جو واٹر پروف تھا میرے پاس محفوظ تھا۔ میں تھکے تھکے انداز سے آگے بڑھا اور ایک اور لمبا چکر کاٹ کر سڑک پر آ گیا۔ مجھے کسی ٹیکسی کا انتظار تھا۔ جلد ہی مجھے ایک ٹیکسی نظر آ گئی۔ میں نے اسے ہاتھ دیا اور منوج کمار کے گھر کا پتا بتا کر عقبی نشست پر براجمان ہو گیا۔ ڈرائیور ایک تھائی خاتون تھی۔ میں نے اسے یہی بتایا تھا کہ مچھلی کا شکار کرتے ہوئے میں دریا میں جا گرا تھا۔ وہ مسکرا کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

میں ایک مشکل اور اہم ترین مرحلہ، مختصر مگر اعصاب شکن جنگ کے بعد کامیابی سے طے کر آیا تھا۔ وزیر جان کو اس کے عبرناک انجام سے دوچار کرنے

کے بعد میں خود کو کافی ہلکا پھلکا اور طمانیت بھرا محسوس کرنے لگا تھا۔ ایک پہاڑ جیسا بوجھ تھا جو سر سے اتر گیا تھا آج لہٰذا ایک فکر تو سر سے اتر ہی چکی تھی کہ اب پاکستان میں اسپیکٹرم ایک بڑے عرصے تک اپنے کسی "ٹینٹیکل" کی داغ بیل ڈالنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ "را" والے بھی اپنے دیرینہ ناپاک ارادوں کی حسرت لیے ایک طویل انتظار کی آگ میں سلگتے ہوئے اپنے ہی زخم چاٹتے رہیں گے۔ نوشابہ اور چوہدری ممتاز جس کے بل بوتے پر اینڈتے پھر رہے تھے، اب وزیر جان جیسے ناسور کی ہلاکت کے بعد ان کی کمر ٹوٹ کر رہ گئی تھی۔

تاہم ان سب باتوں کے باوصف وزیر جان جیسا موذی مرتے مرتے بھی مجھے ایک بڑی مصیبت میں ڈال گیا تھا، یعنی کاؤشی کی ہلاکت۔ اب مجھے اپنا راستہ صاف کرنا تھا، چنانچہ دیکھنا یہ تھا کہ اب منوج کمار میرے کہاں تک کام آسکتا تھا؟

منوج کمار کے گھر پر مرہم پٹی سے متعلق جو کچھ بھی تھوڑا بہت سامان تھا اس سے میں نے اپنے زخم کی خود ہی پٹی کردی، لیکن زخم کا جائزہ لینے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ ٹانکے کھلنے کی وجہ سے زخم کا منہ نہیں بند ہو پا رہا تھا۔ شاید منوج کمار سے ہی اس سلسلے میں کوئی خاطر خواہ مدد مل سکے۔ میں نے سوچ کر خود کو تسلی دی۔

وہ ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔ میں نے پانی پیا اور ذرا دیر تک بیٹھا پُرسکون ہونے کی کوشش کرتا رہا، اس کے بعد میں نے کاؤشی کے سیل فون کا جائزہ لیا تو مجھے مایوسی ہوئی۔ وہ کی پیڈ لاکڈ تھا اور پانی میں بھیگ جانے کے سبب خراب ہوگیا تھا۔ اس کے بعد اس کی ڈیجیٹل ڈائری کا جائزہ لیا تو اس کا بھی کم و بیش یہی حال تھا۔ تھوڑی دیر اس نے کام کیا اس کے بعد آف ہوگیا۔ مجھے توقع تو تھی کہ اس میں ناموں کے ساتھ مختلف لوگوں کے پتے اور ساتھ میں ٹیلی فون نمبرز درج ہوں گے، مگر میں بھلا کس طرح پتے مطلوبہ افراد پہچان سکتا تھا؟

میں کاؤشی کے ان تینوں "ایکسپرٹس" سے رابطہ کرنے کی سوچ رہا تھا جنھیں کاؤشی نے خاص طور پر میرے لیے اپنے گھر بلایا تھا۔ وہ تینوں ایک جوان لڑکی لڑکا اور ایک پختہ العمر شخص پر مشتمل کاؤشی سے تعلق رکھنے والے گروپ کا ایک ٹاپ پروفیشنل ٹولا تھا۔ انہوں نے میرا تفصیلی جائزہ لیا تھا تاکہ مجھے راجیش کمار جیسی شکل و صورت کا بنایا

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

ماہنامہ سرگزشت کراچی

شمارہ دسمبر 2017ء کی جھلکیاں

عمر خیام

ضیا تسنیم بلگرامی کے قلم سے اس شخصیت کا احوال جسے سائنسی علوم پر دسترس تھا لیکن دنیا والے اسے شاعر سمجھتے رہے

پرائی سانس

کاشف زبیر کے قلم سے ایک اچھوتا موضوع

کلاچی سے کراچی

محمد اقبال مانڈویا کے جادو اثر قلم سے تاریخ کراچی

رسم سال نو

وسیم بن اشرف کی دلچسپ تحریر، دنیا بھر میں سال نو کا استقبال کیسے کیا جاتا ہے

عشق گزیدہ

زویا اعجاز کی ایک دلچسپ مگر انوکھی سچ بیانی جس میں انتہائی انوکھی سزا تجویز ہوئی تھی

اس کے علاوہ

بہت سی سچ بیانیاں دلچسپ سچے قصے اور تاریخی واقعات

جا سکے۔ چند روز میں ان کو... اپنا ''کام'' شروع کر دینا تھا کہ درمیان میں اس خبیث اور موذی وزیر جان نے سب کچھ الٹ پلٹ کر رکھ دیا۔ نیز کاوشی نے مجھے ایک سستا سا جو سیل فون دے رکھا تھا جس میں صرف اسی کا نمبر سیو تھا وہ بھی کھو چکا تھا۔ مجھے اپنی ایک غلطی کا سختی کے ساتھ احساس ہونے لگا کہ کاش! میں اس وقت ان تینوں ایکسپرٹس کے کم از کم ناموں سے ہی واقفیت حاصل کر لیتا تو یہ آج ڈائری میرے لیے معاون ثابت ہوتی۔ میں اس کی بیٹری نکال کر اسے خشک کرنے کے بعد استعمال میں لانے کی کوشش تو کر سکتا تھا۔ نیز میں ان کے نام دیکھ کر انہیں کال کر سکتا تھا، تاہم اس بات سے قطع نظر کہ اب ان حالات میں جبکہ کاوشی بھی ہلاک کیا جا چکا تھا، وہ کس قدر میری مدد کر سکتے تھے؟

اندھیرے میں بھی تیر نہیں چھوڑا جا سکتا تھا کہ میں ڈائری میں درج ہر نمبر پر رابطہ کر سکتا اور ایک ایک سے پوچھتا کہ ''بھائی! کیا آپ ہی وہ تینوں افراد تھے جو اس روز کاوشی کے ہاں مجھے راجیش کمار کا بہروپ بھرنے کے لیے دیکھنے آئے تھے۔'' یہ ایک بے وقوفانہ عمل ہوتا۔

جھنجلا کر میں نے وہ ڈائری ایک طرف پھینک دی۔ سیل فون بھی میں نے بے دلی سے ایک طرف ڈال دیا اور صوفے کی پشت گاہ سے کمر اور سر لگا کر سوچنے لگا کہ کیا واقعی وزیر جان کی یہ بات درست تھی کہ پاکستان میں زورآور خان کو بھی انہوں نے کاوشی کی طرح موت کے گھاٹ اتار ڈالا تھا؟ یقیناً ایسا ہی ہوا ہوگا، ورنہ وزیر جان کو یہ جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟ میں پھر بھی زہرہ بانو سے کم از کم ایک ٹیلی فونک رابطہ کرنا چاہتا تھا۔ زورآور خان سمیت مجھے کھبیل دادا اور شکیلہ کی بھی خیر خبر لینا تھی۔ وزیر جان کے خاتمے کی بھی خوش خبری سنانا چاہتا تھا۔ لیکن میں بلاوجہ باہر بھی نہیں نکلنا چاہتا تھا۔ البتہ اس سلسلے میں منوج کمار میرے لیے بہترین مددگار ثابت ہو سکتا تھا۔ میں اس کا سیل فون استعمال کر سکتا تھا۔ گھر میں اس کے ٹیلیفون نہیں تھا۔ منوج کمار کا نام ذہن میں آتے ہی میں اس کے بارے میں بھی غور کرنے لگا اور اس سے زیادہ اس کے اس خطرناک منصوبے کے بارے میں بھی جو اس نے اپنی آئندہ زندگی کو خوش حال بنانے کے لیے بنا رکھا تھا۔

اس کا وہ منصوبہ کیا ہو سکتا تھا، یہ ابھی اس نے نہیں بتایا تھا، تاہم اس کی باتوں سے لگتا تھا کہ وہ کم از کم یہاں بینک روبری نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مجھے اس کے منصوبے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میں تو بس عارضی طور پر پناہ چاہتا تھا۔

بہرطور میں اس کے لوٹنے کا انتظار کرتا رہا اور یہ سوچتا رہا کہ منوج کمار ان حالات میں میرے کیا کام آ سکتا تھا۔ نیز یہ بھی سوچ رہا تھا کہ کیا مجھے اسے یہ بتانا پڑتا کہ بینکاک کا ایک بڑا گینگسٹر کاسپا کو میرا دشمن تھا۔ اس صورت میں شاید منوج کمار مجھ سے بدک سکتا تھا۔ بہتر یہی تھا کہ ابھی اسے کوئی حقیقت سرے سے بتائی ہی نہیں جاتی، یوں بھی وزیر جان کی رہائش گاہ پر اس نے میرا روپ دیکھ لیا تھا، بے شک ابتدا میں وہ مجھے نہیں پہچان سکا ہوگا مگر وزیر جان کے مجھے تخاطب کرنے کے انداز پر وہ چونکا تو ہوگا۔ بعد میں اس کے سامنے بھی میری حقیقت کھل گئی ہوگی۔ کوئی بعید نہ تھا کہ اب وزیر جان کی میرے ہاتھوں ہلاکت کے بعد وہ...... مجھ سے دشمنی بھی ترک کر دے، کیونکہ وزیر جان نے اپنی رہائش گاہ میں اس کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔ یہ بھی تھا کہ مجھے اس طرح سامنے دیکھ کر اسے اس کی بات کا یقین آیا ہوگا کہ میں واقعی وزیر جان کی قید میں تھا ہی نہیں۔ تو پھر اب کاسپا کو میرے سلسلے میں کیا قدم اٹھا سکتا تھا؟ مجھے کوئی ایسی خوش فہمی بھی نہیں تھی کہ وہ میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائے۔ تاہم مجھے سانچی کے سلسلے میں افسوس ضرور ہو رہا تھا کہ نجانے اس بے چاری کے ساتھ کیا حشر ہوا ہو......؟ خود سانچی اور اس کے بوائے فرینڈ، دونوں نے ہی بے وقوفی سے کام لیا تھا۔ سانچی اس وقت میری بات مان لیتی اور ہلینا اور میرے ساتھ ہی چلی آتی تو دونوں کے لیے بہتر ہوتا یہ۔

میں ایک بڑی جنگ اور اہم ترین مشن کو کامیابی سے سر کرنے کے بعد تھوڑا آرام کرنے کے لیے اندر کمرے میں بیڈ پر جا کے لیٹ گیا۔ اس قدر تھکا ہوا تھا کہ لیٹتے ہی میری آنکھ لگ گئی تھی۔ پتا نہیں میں کتنی دیر سویا تھا کہ یا شاید خود ہی کسی آہٹ سے میری آنکھ کھل گئی تھی۔ مگر ایسا کچھ نہیں تھا...... مجھے ٹھوکا دے کر جگایا گیا تھا۔

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

رقیب

شاکر لطیف

آگ کے شعلے بھڑک کر بالآخر بجھ ہی جاتے ہیں مگر رقابت... حسد اور پچھتاوؤں کے شعلے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دامنِ دل کو سُلگاتے رہتے ہیں... محبت جیسے جذبے سے سرشار ایک مسیحا کی مسیحائی... اس نے اپنے پیشے کے تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر عداوت... خیانت اور شقاوت کو اولیت دی تھی...

جرم و سزا کے موضوع پر دردناک کہانی کے اسرار......

''آخر مارتھا کو یہ بات سمجھ میں کیوں نہیں آتی، کہ اب وہ بیس برس کی ہوچکی ہے۔ اسے اب ایسی بچگانہ حرکتیں زیب نہیں دیتیں۔ وہ اب بھی مردوں کی طرح بال کٹوا کر رکھتی ہے اور اس کے چلنے کا انداز بھی مردانہ ہے۔ عورت ہونے کے باوجود اسے نسوانیت چھو کر بھی نہیں گزری۔ اس طرح تو اس کی شادی بھی نہیں ہوسکتی۔'' ریمنڈ کی آواز

خاصی بلند اور غصے سے بھرپور تھی۔ وہ اس وقت فون پر اپنی ماں سے باتیں کر رہا تھا جو اس کی چھوٹی بہن مارتھا کے ہمراہ لاس ویگاس میں رہائش پذیر تھیں جبکہ ریمنڈے خود لاس اینجلس میں رہتا تھا۔

ریمنڈے کافی عرصے سے اپنی ماں اور بہن سے دور یہاں رہ رہا تھا۔ اسے اپنی چھوٹی بہن مارتھا سے بے انتہا محبت تھی۔ ریمنڈے کے والد اس کے بچپن میں ہی وفات پا گئے تھے مگر ریمنڈے نے کبھی مارتھا کو باپ کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا اور اپنی بساط کے مطابق اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھا۔ اب وہ ایک پروفیشنل ڈاکٹر بن چکا تھا۔ اس کی آمدنی بھی اچھی تھی۔ اس لیے وہ ہر ماہ ایک معقول رقم اخراجات کی مد میں اپنی والدہ کو بھجواتا تھا۔ اس کی والدہ نے ایک طویل عرصے تک نوکری کر کے نہ صرف ان دونوں کو پالا تھا بلکہ ریمنڈے کے ڈاکٹر بننے تک گھر کی کفالت کی تمام تر ذمّے داری بھی اٹھائی تھی۔ اب ریمنڈے کے اصرار پر انہوں نے اپنی ملازمت چھوڑ دی تھی اور گھریلو اخراجات کی ذمّے داریاں ریمنڈے کو منتقل کی تھیں۔ اس کی بہن مارتھا نے اپنی تعلیم مکمل نہیں کی تھی۔ وہ لاابالی طبیعت کی مالک تھی اسی لیے پڑھائی میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لیتی تھی۔

ریمنڈے جب تک لاس ویگاس میں رہا، مارتھا کو قابو میں رکھتا تھا مگر بڑے بھائی کے جاتے ہی وہ گویا آزاد سی ہو گئی۔ جو دل میں آتا کر گزرتی۔ ریمنڈے کو آئے دن اپنی ماں کے توسط سے اس کی شکایتیں موصول ہوتی رہتی تھیں۔

آج بھی اس نے ایک خطرناک حرکت کی تھی۔ اس نے گھونسا مار کر اپنی ایک قریبی سہیلی کی ناک توڑ ڈالی تھی۔ ریمنڈے کی والدہ نے بڑی مشکل اور منت سماجت کے بعد یہ معاملہ رفع دفع کرایا تھا۔ ورنہ متاثرہ لڑکی کے والدین یہ معاملہ پولیس کے پاس لے کر جانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ مارتھا کی حرکتیں اب ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی تھیں۔ اسے لگام ڈالنا ضروری ہو گیا تھا مگر کیسے، یہ ریمنڈے کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس کے سیل نمبر پر فون کرنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ مارتھا اس کا فون اٹینڈ ہی نہیں کرے گی۔ ریمنڈے کی سخت باز پُرس اور سرزنش سے بچنے کے لیے وہ یہی حربہ اختیار کرتی تھی۔ وہ ریمنڈے کی بہن ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی رمزشناس بھی تھی۔ اچھی طرح جانتی تھی کہ کب بھائی سے بات کرنی ہے اور کب نہیں۔

"مام میرے خیال میں اب اس کی شادی کر دی جانی چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ موجودہ حالات کے تناظر میں ایسا کیا جائے تو یہی بہتر ہوگا۔" ریمنڈے نے کہا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" اس کی ماں نے جواب دیا۔ "مگر یہ اس وقت ہی ممکن ہے جب مارتھا کو کوئی لڑکا پسند آ جائے۔ فی الحال اپنی ظاہری وضع قطع سے تو وہ خود ایک لڑکا دکھائی دیتی ہے۔"

"آپ اُسے میری طرف سے وارننگ دے دیں کہ فوری طور پر اپنے لیے کوئی لڑکا پسند کر لے ورنہ میں اس بار لاس ویگاس آتے ہی اس کی شادی کروا دوں گا۔" بات کرتے ہوئے ریمنڈے کو خود بھی اپنا لہجہ کھوکھلا محسوس ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ امریکا جیسے ملک میں قانوناً کسی کی زبردستی شادی کروانا ناممکن تھا۔

"تم زیادہ پریشان مت ہو۔" اس کی ماں نے تسلی دی۔ "میں مارتھا کو سمجھا دوں گی۔ یہ بتاؤ کہ اپنے لیے بھی کوئی لڑکی پسند کی ہے؟"

"ہاں۔" ریمنڈے نے مسکرا کر جواب دیا۔ "جلد ہی آپ کو خوش خبری سناؤں گا۔" اپنی شادی کا ذکر آتے ہی اس کے چہرے پر موجود کبیدگی کے تاثرات چھٹ سے گئے۔

"چلو اچھا ہے۔" اس کی والدہ کی مسرت بھری آواز سنائی دی۔ "تم دونوں کی شادی ہو جائے تو مجھے بھی سکون کی سانس نصیب ہو۔ یہ بتاؤ اسپتال کی جاب بھی چل رہی ہے اور تمہارے اس کھلنڈرے دوست جوزف کا کیا حال ہے۔"

"یہاں سب ٹھیک ہے، جوزف آج کل خاصا مصروف ہے اسی لیے ملاقات ذرا کم ہی ہوتی ہے۔" ریمنڈے نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ جوزف کا ذکر آتے ہی اس نے اس طرح منہ بنا لیا تھا جیسے بہت سی کڑوی گولیاں ایک ساتھ نگل لی ہوں۔

"جوزف تمہارے بچپن کا دوست ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھا انسان بھی ہے۔ تمہیں یاد ہوگا کہ بچپن میں دریا میں نہاتے ہوئے تم غلطی سے گہرے پانی میں چلے گئے تھے اور غوطے کھانے لگے تھے، اس وقت جوزف نے ہی تمہاری جان بچائی تھی۔" اس کی ماں نے اس کے بچپن کا ایک واقعہ دہرایا۔

"مام مجھے ڈیوٹی پر جانا ہے...... پھر بات کریں گے۔" یہ کہتے ہوئے ریمنڈے نے فون کریڈل پر رکھ دیا۔ وہ ابھی اپنی ماں سے بات چیت جاری رکھنا چاہتا تھا

جوزف کا ذکر آتے ہی اسے بیزاری ہونے لگی۔ اسی لیے اس نے بات چیت کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ اب وہ اپنی ماں کو یہ تو نہیں بتا سکتا تھا کہ جوزف وہ شخص ہے جس سے وہ بے انتہا نفرت کرتا ہے۔ اگرچہ اس کی یہ نفرت یک طرفہ تھی اور جوزف اپنی بابت اس کی نفرت سے یکسر لاعلم تھا۔

چند سال پہلے تک ریمنڈے کے دل میں جوزف کے لیے ایسا کوئی جذبہ موجود نہیں تھا۔ جوزف اس کے بچپن کا سب سے قریبی دوست تھا اور لاس ویگاس میں ان کی دوستی کی آج بھی مثالیں دی جاتی تھیں۔ لاس اینجلس میں بہ سلسلۂ روزگار وہ دونوں ایک ساتھ ہی آئے تھے۔ ریمنڈے ڈاکٹر تھا اور ایک سرکاری اسپتال میں ملازمت کرتا تھا جبکہ جوزف ایک میڈیسن بنانے والی کمپنی میں سیل منیجر کے عہدے پر فائز تھا۔ دونوں کی تقریباً ہر دوسرے دن ہی ملاقات ہوتی تھی۔ جوزف شام کے وقت کبھی ریمنڈے کے فلیٹ میں آجاتا، تو کبھی دوپہر کے وقت اس کے کلینک آدھمکتا۔ اسپتال کی کینٹین سے دوپہر کا کھانا وہ دونوں اکٹھے ہی کھاتے، اس دوران ہلکی پھلکی گپ شپ بھی ہو جاتی۔ جوزف اور ریمنڈے ابھی تک غیر شادی شدہ تھے۔ دونوں کے شوق بھی مشترکہ تھے اس لیے آپس میں خوب جمتی تھی۔

ان کی دوستی میں پہلی دراڑ اس وقت پیدا ہوئی جب ریمنڈے کے اسپتال میں ڈاکٹر جولیا کی آمد ہوئی۔ سنہرے بالوں والی یہ دلکش اور خوب صورت حسینہ ریمنڈے کو پہلی ہی نظر میں بھا گئی۔ اسے لگا کہ یہی وہ لڑکی ہے جس کی اسے تلاش تھی۔ اس نے آہستہ آہستہ جولیا کے قریب ہونا شروع کر دیا اور جلد ہی وہ دونوں بے تکلف دوست بن گئے۔ تاہم بات ابھی دوستی سے آگے نہیں بڑھی تھی۔ جوزف اور جولیا کا آپس میں تعارف بھی اسی نے کروایا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جلد ہی جوزف کو بھی بتا دے گا کہ وہ جولیا کو پسند کرنے لگا ہے مگر کچھ ہی دنوں میں اس نے جولیا میں جوزف کی بڑھتی ہوئی دلچسپی کو محسوس کر لیا۔ جوزف کا آفس اس کے اسپتال سے زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ ہر روز دوپہر کے کھانے پر اسپتال کی کینٹین میں آدھمکتا، کیونکہ ریمنڈے اور جولیا بھی دوپہر کا کھانا اسی جگہ سے کھاتے تھے۔ کھانے کے دوران ان تینوں میں نوک جھوک بھی جاری رہتی۔ آہستہ آہستہ ریمنڈے کو اس کی روزانہ آمد کھٹکنے لگی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ جوزف بہت تیزی سے پیش قدمی کر رہا ہے اگر فوری طور پر اسے نہ روکا گیا تو وہ جولیا کو اس سے چھین کر لے جائے گا۔ ریمنڈے کو اس بات کا بھی ادراک ہو گیا تھا کہ جولیا بھی اس میں کچھ نہ کچھ دلچسپی لینے لگی تھی اور پھر دراز قد اور وجیہہ جوزف ایسی شخصیت کا مالک تھا کہ کوئی بھی عورت اس سے متاثر ہو سکتی تھی۔

یہی وہ وقت تھا جب ریمنڈے نے پہلی بار اپنے بچپن کے دوست سے رقابت کا جذبہ محسوس کیا اور پھر ایک دن اس کے دل میں رقابت و نفرت کا کھولتا ہوا یہ لاوا آتش فشاں بن کر پھٹ پڑا، اس نے وہ کام کر دیا جو بطور ایک ڈاکٹر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

اس نے ایک دفعہ باتوں باتوں میں جولیا سے پوچھا تھا کہ کیا اس نے اپنے لیے کسی لائف پارٹنر کا انتخاب کر لیا ہے۔ آخر ایک دن تو اسے شادی کرنی ہی ہے۔

''میں جب تک اپنا اسپیشل کورس مکمل نہیں کر لیتی شادی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔'' جولیا نے اسے دوٹوک لہجے میں باور کرا دیا تھا۔ ریمنڈے کو جولیا کے لہجے سے اندازہ ہو گیا کہ کورس مکمل ہونے تک وہ اس بارے میں بات کرنا پسند نہیں کرے گی، بہرحال وہ چاہتا تھا کہ جب وہ شادی کے بارے میں سوچنا شروع کرے تو اس کی پہلی ترجیح جوزف نہیں، بلکہ وہ ہو اور یہ اسی صورت ممکن تھا جب جولیا، جوزف میں دلچسپی لینا چھوڑ دیتی۔ بادی النظر میں تو اس بات کے امکانات کم ہی نظر آرہے تھے۔ کیونکہ ریمنڈے صاف طور پر محسوس کر چکا تھا کہ جولیا کا جھکاؤ جوزف کی جانب بڑھتا جا رہا ہے۔

جولیا، ریمنڈے کی باتوں کا جواب سنجیدگی سے دیتی تھی، اگر کبھی وہ کوئی مذاق کر بھی لیتا تو بس مسکرا کر رہ جاتی، تاہم اس کے برعکس جوزف کے مذاق کا جواب مذاق سے دیتی۔ اس کی باتوں پر کھلکھلا کر ہنستی، جس دن جوزف نہ آتا، اس کی آنکھوں میں بے چینی سی نظر آتی۔ ریمنڈے دل ہی دل میں جولیا کو بے انتہا چاہنے لگا تھا۔ یہ سب اس کی برداشت سے باہر ہو رہا تھا۔ اس کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جو محبت اور جنگ میں سب جائز سمجھتے تھے اسی لیے اس نے چھ ماہ پہلے ایک ایسا خوفناک اقدام کیا تھا جو شاید عام حالات میں وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا مگر اس کے پاس اور کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔ جولیا کو جوزف سے دور کرنے کے لیے یہ بھیانک اقدام اٹھانا ضروری ہو گیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کی چال کامیاب رہے گی اور جلد ہی جولیا کے دل میں جوزف کے لیے موجود پسندیدگی کے جذبات محض ہمدردی میں تبدیل ہو کر رہ جائیں گے۔

یہ تقریباً چھ ماہ پہلے کا واقعہ تھا۔ وہ تینوں اپنے معمول کے مطابق دوپہر کے وقت اسپتال کی کینٹین میں موجود

تھے۔ شکم پروری کے ساتھ ساتھ گپ شپ بھی جاری تھی۔ تاہم جوزف آج کچھ چپ چپ تھا، اس کی طبیعت کچھ مضمحل لگ رہی تھی۔ یہ بات جولیا نے بھی محسوس کرلی۔ ''کیا بات ہے جوزف، مجھے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔'' اس نے پوچھ ہی لیا۔

''ہاں۔'' جوزف نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ ''دراصل کل رات سے میں بخار میں مبتلا ہوں، دوا کھانے سے اب کچھ طبیعت بہتر ہے مگر جسمانی طور پر خاصی کمزوری محسوس کررہا ہوں۔''

''تو ڈرپ لگوالو۔'' جولیا نے فوراً ہی مشورہ دیا۔ اس کا ہمدردانہ لہجہ سن کر ریمنڈے کا خون کھول اٹھا۔ تاہم اس نے اپنے چہرے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اسے اپنے جذبات چھپانے میں ملکہ حاصل تھا اسی لیے جوزف بھی اپنے بارے میں اس کے دل میں چھپی نفرت سے کبھی آگاہ نہیں ہو سکا تھا۔

''ڈرپ سے کیا میں ٹھیک ہوجاؤں گا؟'' جوزف نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بالکل۔'' جولیا اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''آج کل موسم میں تبدیلی رونما ہورہی ہے، اس قسم کے موسمی بخار اور بیماریاں عام ہیں۔ اسپتال میں بھی اس نوعیت کے مریضوں کا آج کل تانتا بندھا ہوا ہے۔ میں یہ تو نہیں کہتی کہ ڈرپ لگنے سے تم بالکل ٹھیک ہوجاؤ گے مگر تمہاری جسمانی قوت بحال ہو ہی جائے گی۔ تمہاری مکمل صحت یابی میں چند دن مزید لگیں گے۔''

''ٹھیک ہے تو پھر ڈرپ بھی تم ہی لگا دو۔'' جوزف نے لگاوٹ بھرے لہجے میں کہا۔

''میری وارڈ میں ڈیوٹی ہے۔'' جولیا نے صاف جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''مگر ریمنڈے آج فری ہے یہ تمہیں کسی علیٰحدہ اور آرام دہ کمرے میں ڈرپ لگوانے کا انتظام کردے گا، کیوں ریمنڈے؟'' وہ بات کرتے ہوئے ریمنڈے کی جانب متوجہ ہوکر سوالیہ لہجے میں بولی۔

''ضرور۔'' ریمنڈے نے بناوٹی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ ہمیشہ کی طرح اس نے اس بار بھی اپنے دلی جذبات ان دونوں پر عیاں نہیں ہونے دیے تھے۔

''تو پھر یہ کام ابھی ہوجانا چاہیے۔'' جولیا تفہیمی لہجے میں بولی۔ ''اور جوزف تم بھی اس بیماری کو ایزی مت لینا، ڈرپ ضرور لگوالینا مجھے وارڈ میں جانا ہے، دیر ہورہی ہے اب میں چلتی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ارے چائے تو پی لیتیں؟'' ریمنڈے تیز لہجے میں بولا۔

''نہیں، میرا موڈ نہیں ہے۔'' جولیا نے دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا اور پھر ان دونوں کو الوداع کہتے ہوئے کینٹین کے خارجی دروازے کی جانب بڑھ گئی۔

وہ دونوں خاموشی سے اُسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔

''اگر تم ڈرپ نہیں لگوانا چاہتے تو کوئی مسئلہ نہیں' میں جولیا سے جھوٹ بول دوں گا۔'' جولیا کے جاتے ہی ریمنڈے نے کہا۔

''نہیں، اب جولیا نے حکم دیا ہے تعمیل تو کرنا ہی پڑے گی۔ ویسے میں حقیقتاً بھی خاصی کمزوری محسوس کررہا ہوں۔'' جوزف نے ریمنڈے کو باقاعدہ آنکھ مارتے ہوئے جواب دیا۔

اس کے اس اوباشانہ انداز پر لمحہ بھر کے لیے ریمنڈے کا دل چاہا کہ گھونسا مار کر اس کا منہ توڑ ڈالے۔ تاہم وہ اپنے خیالات کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتا تھا۔ اس نے آج تک اپنے دل میں چھپی نفرت جوزف پر آشکارہ نہیں ہونے دی تھی۔ وہ کھانا کھا چکے تھے۔ ''اوکے، تو پھر آجاؤ میں تمہارے لیے علیٰحدہ روم کا انتظام کردا دیتا ہوں۔'' ریمنڈے نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا تو جوزف نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

کچھ ہی دیر میں جوزف اسپتال کے ایک علیٰحدہ کمرے میں بیڈ پر لیٹا ہوا تھا جبکہ نرس اُسے ڈرپ لگا رہی تھی۔ ریمنڈے، جوزف کے پاس ہی کھڑا تھا۔ اس نے ڈرپ میں انجکشن کے ذریعے ایک مخصوص دوا بھی انجیکٹ کروائی تھی۔ اس دوا سے انسان کی قوتِ مدافعت بڑی تیزی سے بحال ہوجاتی تھی۔ تاہم وقتی طور پر اس سے نیند بھی آجاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جیسے جیسے ڈرپ میں موجود محلول جوزف کے جسم میں منتقل ہوتا جارہا تھا، اس پر نیند طاری ہوتی جارہی تھی، کچھ ہی دیر میں وہ گہری نیند سو چکا تھا۔ نرس جا چکی تھی۔ ریمنڈے خاموشی سے کھڑا جوزف کے چہرے کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ یہ وہ شخص تھا جو اس سے اس کی محبت چھین لینا چاہتا تھا۔ نفرت کی ایک تیز لہر نے ریمنڈے کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جوزف کی نفرت اب اس کے رگ و پے میں سرایت کرچکی تھی۔ ''نہیں جوزف میں تمہیں اتنی آسانی سے جولیا کو چھین کر لے جانے نہیں دوں گا۔' اس

نے دل ہی دل میں سوچا اور پھر کمرے سے باہر نکل آیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ایک طرف بڑھنے لگا۔ اس کے ذہن میں اس وقت ایک منصوبہ زیرِ گردش تھا۔ اس نے اپنے ذہن میں پنپنے والے اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

وہ چلتے چلتے ایک وارڈ کے سامنے جاکر رک گیا۔ وارڈ کے باہر ایک چھوٹا سا بورڈ لگا ہوا تھا 'غیر متعلقہ افراد کا داخلہ سختی سے ممنوع ہے۔ یہاں انتہائی مہلک امراض میں مبتلا مریضوں کو رکھا جاتا ہے' ریمنڈے ایک ڈاکٹر تھا۔ وہ اسپتال میں کہیں بھی آجاسکتا تھا۔ وہ وارڈ میں داخل ہوگیا۔ یہ اتفاق تھا کہ اس وقت وہاں کوئی ڈاکٹر موجود نہیں تھا اور ریمنڈے یہی چاہتا تھا۔ اسے ایسا ہی کوئی موقع درکار تھا۔ کچھ ہی دیر میں جب وہ وارڈ سے باہر نکلا تو اس کی جیب میں ایک خطرناک اور مہلک مریض کے جسم سے حاصل کیا گیا خون تھا۔ ریمنڈے نے بہ آسانی اس وائرس زدہ خون کو ایک چھوٹی سی سرنج میں منتقل کرلیا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے واپس اس کمرے کے سامنے آگیا جہاں جوزف موجود تھا۔ اس نے دروازے کا ہینڈل گھمایا اور پھر اندر داخل ہوتے ہی دروازہ بند کردیا۔

جوزف دوا کے زیرِ اثر ہر چیز سے بے نیاز بدستور آنکھیں بند کیے سورہا تھا۔ اس کے چہرے پر گہرے اطمینان کے تاثرات موجود تھے۔ ریمنڈے کچھ دیر تک خاموشی سے کھڑا نفرت بھرے انداز میں اسے دیکھتا رہا اور پھر اپنی جیب سے وہ سرنج نکال لی۔ سرنج نکال کر وہ کچھ دیر تک اس میں موجود خون کو دیکھتا رہا۔ خون کا رنگ ہمیشہ ایک جیسا ہی ہوتا ہے لال۔ مگر ریمنڈے ایک ڈاکٹر تھا، وہ جانتا تھا کہ اس لال خون کے اندر کیسی تباہی چھپی ہوئی ہے، کیسا خطرناک وائرس موجود ہے۔ وہ آگے بڑھا اور پھر اس نے سرنج میں موجود خون جوزف کی ڈرپ میں انجیکٹ کردیا۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے ہاتھوں میں ہلکی سی کپکپاہٹ طاری ہوگئی۔ اس نے اپنے بچپن کے دوست کو ایک ایسے جراثیم سے آلودہ کردیا تھا جس کا کوئی علاج نہیں تھا۔ جوزف کی چند سالوں میں موت یقینی تھی۔ تاہم جسم میں اس وائرس کے ظاہر ہوتے ہی ایک اذیت ناک زندگی بھی یقینی تھی۔ ڈرپ کے ذریعے وائرس زدہ خون قطرہ بہ قطرہ جوزف کے جسم میں منتقل ہورہا تھا۔ گویا موت اس کے جسم میں قطرہ بہ قطرہ داخل ہورہی تھی۔ ریمنڈے کے چہرے کے تاثرات بہت عجیب تھے۔ وہ ایک ڈاکٹر تھا۔ مسیحائی اس کا پیشہ تھا مگر آج اس نے

"التجا"

بیگم کار لے کر روانہ ہونے لگیں تو شوہر نے التجائیہ سے لہجے میں کہا۔ "اگر تم محسوس کرو کہ گاڑی قابو سے باہر ہونے لگی ہے تو کم از کم اتنی کوشش ضرور کرنا کہ کسی سستی سی چیز کو ٹکر مارنا۔"

"حل"

لبنیٰ ایک روز دفتر سے گھر پہنچیں تو خاصا بڑا ایک کارٹن اٹھائے ہوئے تھیں جس میں چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے۔

"یہ کیا اٹھا لائیں؟" بہن نے پوچھا۔

"تمہیں معلوم ہے مجھے خواب میں چوہے نظر آتے ہیں۔ انہیں پکڑنے کے لیے بلی لائی ہوں۔" لبنیٰ نے بتایا۔

"لیکن خواب میں نظر آنے والے چوہے تو خیالی ہوتے ہیں۔" بہن نے حیرت سے کہا۔

"کوئی بات نہیں... بلی بھی خیالی ہے۔" لبنیٰ نے اطمینان سے جواب دیا۔

"راهنمائی"

گاڑی میں سفر کرتے ہوئے ایک صاحب راستہ بھول گئے۔ انہوں نے ایک سائیکل سوار کو روک کر پوچھا۔ "بھائی گلستانِ جوہر کی طرف کون سی سڑک جاتی ہے؟"

"مجھے معلوم نہیں۔" سائیکل سوار نے جواب دیا۔

"اچھا... یونیورسٹی روڈ کس طرف ہے؟"

"مجھے معلوم نہیں۔"

"تمہیں کچھ معلوم بھی ہے؟" کار والے صاحب ذرا جل کر بولے۔

"مجھے یہ معلوم ہے کہ میں اپنے راستے پر صحیح جارہا ہوں اور راستہ نہیں بھولا ہوں۔" سائیکل سوار نے اطمینان سے جواب دیا۔

نظارہ

ایک جہاز سمندر پر سے اڑتے ہوئے فضا میں ہچکولے کھانے لگا۔ جس پر مسافروں نے چیخنا چلانا شروع کردیا اور ہر طرف بھگدڑ سی مچ گئی۔ اسی دوران اسپیکر پر جہاز کے کپتان کی آواز سنائی دی۔ "خواتین و حضرات! گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں، یہ ایک بہترین امپورٹڈ جہاز ہے۔ غیر ملکی ماہرین روزانہ اس کی دیکھ بھال کرتے ہیں، لہٰذا آپ بالکل مطمئن ہوکر سفر کریں۔ آپ کھڑکی سے باہر دیکھیں نہایت خوب صورت نظارہ ہے، شام ہونے کو ہے سورج کا سرخ گولا سمندر میں غروب ہورہا ہے۔ لوگ رنگ برنگی کشتیوں میں سمندر کی سیر کررہے ہیں۔ آپ ایک لال رنگ کی کشتی دیکھ رہے ہیں... میں اسی کشتی سے بول رہا ہوں!"

(محمد محمود احمد آکاش کی سوغات، حیدرآباد سے)

رقابت ونفرت کی آگ میں جھلس کر اپنے ہی ہاتھوں پیشے کا تقدس پامال کر ڈالا تھا۔ لمحہ بھر کے لیے ندامت کی ایک تیز لہر نے اس کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لیا۔ بچپن میں جوزف نے اپنی جان پر کھیل کر اسے دریا میں ڈوبنے سے بچایا تھا۔ جس شخص نے اپنی جان پر کھیل کر اسے زندگی کا تحفہ دیا تھا، آج اس نے بدلے میں اسے موت دے ڈالی تھی اور موت بھی ایسی کہ وہ ہر روز جیتا اور ہر روز مرتا......

اب اس واقعے کو چھ ماہ سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ ریمنڈے جانتا تھا کہ وہ خطرناک وائرس جوزف کے خون میں اپنی جگہ بنا چکا ہوگا۔ اسے جوزف کی روز بروز گرتی ہوئی صحت سے بھی اس بات کا اندازہ ہو رہا تھا۔ اس مرض کے مضمرات آہستہ آہستہ سامنے آنے لگے تھے۔ اب زیادہ دیر کرنا مناسب نہیں تھا۔ اس کے اس منصوبے کو فائنل ٹچ دینے کا وقت آ گیا تھا۔ کیونکہ جولیا کا طب سے متعلق اسپیشل کورس مکمل ہونے والا تھا اور اس کے بعد شاید وہ بھی شادی کے متعلق سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیتی۔ ریمنڈے چاہتا تھا کہ ایسے وقت وہ صرف اس کے بارے میں سوچے۔

اسپتال جانے کا وقت ہو رہا تھا۔ ریمنڈے نے فلیٹ کو تالا لگایا اور گیراج سے اپنی گاڑی نکال کر روانہ ہو گیا۔ اسپتال اس کے فلیٹ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ دس منٹ میں پہنچ گیا۔

دوپہر کے کھانے پر وہ تینوں حسب معمول کینٹین میں یکجا ہو گئے۔ تاہم آج شاید جولیا کو کچھ جلدی تھی۔ ''معاف کرنا دوستو! مجھے آج وارڈ میں جلدی جانا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر انہیں الوداع کہتے ہوئے کینٹین کے خارجی دروازے کی جانب بڑھ گئی۔

''جوزف یہ تمہاری صحت کو کیا ہوتا جا رہا ہے؟'' اس کے جاتے ہی ریمنڈے نے اپنے ذہن میں پنپنے والے پلان کے تحت جوزف کے چہرے کا بغور جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

''کیوں کیا ہوا ہے میری صحت کو؟'' جوزف اس کی بات سن کر گھبرا سا گیا۔ ریمنڈے نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ بس خاموشی سے اس کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا۔

''تم میرے چہرے کو اتنے غور سے کیوں دیکھ رہے ہو؟'' اس کے اس طرح دیکھنے پر جوزف کی گھبراہٹ دو چند ہو گئی۔

''تمہارے چہرے کی رنگت بہت زیادہ زرد پڑ گئی ہے۔ وزن میں بھی نمایاں کمی محسوس ہو رہی ہے۔ عام طور پر ایسا اسی وقت ہوتا ہے جب انسان کسی بیماری کا شکار ہو جائے۔'' ریمنڈے نے کہا۔

''نہیں، نہیں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' جوزف پُرزور لہجے میں بولا۔

''مجھے نہیں لگتا۔'' ریمنڈے نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ ممکن ہے کہ میرا وہم ہو لیکن میرا تم کو مشورہ ہے کہ تم ایک مرتبہ اپنا مکمل میڈیکل چیک اپ کروالو۔''

''آخر تمہیں میرے چہرے میں کیا نظر آ گیا جو تمہیں یہ شک گزرا کہ کوئی بیماری ہے؟'' جوزف نے پریشان کن لہجے میں استفسار کیا۔ ریمنڈے ایک ڈاکٹر تھا، اس کی باتوں کو نظر انداز کر دینا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے جوزف ضرورت سے زیادہ پریشان ہو گیا۔

''میں وثوق سے فی الحال کچھ نہیں کہہ رہا۔'' ریمنڈے نے جواب دیا۔ ''اور پھر میڈیکل ٹیسٹ کروانے میں حرج ہی کیا ہے۔ رپورٹس دیکھ کر میری تسلی ہو جائے گی۔ اگر کوئی بات ہوئی تو میں تمہیں آگاہ کر دوں گا۔ اگر تمہیں واقعی میں کوئی مرض لاحق ہوا تو مرض کی بروقت تشخیص علاج میں ہمیشہ معاون ثابت ہوتی ہے۔''

''مگر مجھے کیا بیماری ہو سکتی ہے؟'' جوزف متفکر لہجے میں بولا۔ وہ اپنی صحت کے بارے میں خاصا حساس واقع ہوا تھا۔ اس وقت بہت سے توہمات اور وسوسے اس کے ذہن میں جگہ بنا رہے تھے۔ اسے لگ رہا تھا کہ کوئی روح فرسا خبر اس کی منتظر ہے۔

''ارے تم تو حد سے زیادہ ہی پریشان ہو گئے ہو۔ مجھے غلط فہمی بھی تو ہو سکتی ہے۔'' ریمنڈے ہنستے ہوئے بولا۔ ''تم میرے بچپن کے دوست ہو۔ تمہاری صحت کے بارے میں فکرمند نہیں ہوں گا تو کون ہوگا۔ تم ٹیسٹ کروالو۔ میں اسی اسپتال میں ٹیسٹ کروانے کا بندوبست کروا دیتا ہوں، وہ بھی بالکل فری میں۔ مجھے تو بس تمہاری صحت دیکھ کر یہ گمان گزرا ہے اس طرح کم از کم میری تسلی تو ہو جائے گی۔''

''تم واقعی میں ایک بہترین اور مخلص دوست ہو۔'' جوزف احسان مند لہجے میں بولا۔ ''ویسے یہ کام ابھی ہو جائے تو بہتر ہے، تم میری بے چین طبیعت سے تو واقف ہو۔ جب تک میری رپورٹس نہیں آئیں گی، مجھے اب چین نصیب نہیں ہوگا۔''

''ٹیسٹ تو ابھی ہو جائیں گے۔ میں انتظام کروا لوں گا مگر رپورٹس دو دن بعد مل سکیں گی۔ میں وصول کر لوں گا، اگر

کوئی بات ہوئی تو تمہیں مطلع کر دوں گا۔'' ریمنڈے نے جواب دیتے ہوئے کہا۔''ویسے ایک بات ہے، تمہاری بچپن کی عادتوں نے ابھی تک تمہارا پیچھا نہیں چھوڑا، بچپن میں بھی تم چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوامخواہ پریشان ہو جاتے تھے۔''

جوزف نے اس بار اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا بس کھسیانی سی ہنسی ہنس کر رہ گیا۔

کھانا کھانے کے بعد جوزف نے اسی اسپتال میں اپنے ٹیسٹ کروائے، جو ریمنڈے کی وساطت سے فوری طور پر ہو گئے۔

''رپورٹ ملتے ہی مجھے مطلع کرنا۔'' جوزف نے جاتے ہوئے اسے تلقین کی تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

جوزف چلا گیا جبکہ ریمنڈے کا باقی دن مریضوں کو دیکھتے ہوئے گزرا۔ مصروفیت کی وجہ سے اس کی جولیا سے بھی دوبارہ ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ آج وہ اسپتال سے بھی خاصی دیر سے فارغ ہوا تھا۔ جب وہ اپنے فلیٹ پر پہنچا تو رات ہو چکی تھی۔ ابھی وہ فلیٹ کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا ہی تھا کہ اس کے موبائل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ نمبر دیکھتے ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ فون اس کی ماں کا ہے۔ وہ عام طور پر اس کے سیل نمبر کے بجائے فلیٹ کے فون پر کال کرنے کو ترجیح دیتی تھیں۔ شاید کوئی مجبوری تھی اسی لیے انہوں نے ریمنڈے کے موبائل پر کال کی تھی۔

''ہیلو۔'' ریمنڈے نے فون کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

''میں کافی دیر سے فون پر کالز کر رہی ہوں مگر تم فون ہی نہیں اٹھا رہے تھے؟'' اس کی ماں کی جھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔

''آئی ایم سوری مام......'' ریمنڈے نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔''دراصل میں ابھی ابھی فلیٹ پر پہنچا ہوں۔ بہرحال بتائیں کیا مسئلہ ہے جو آپ بار بار فون کر رہی تھیں؟''

''مسئلہ ایک ہی ہے۔'' اس کی ماں نے غصیلے لہجے میں کہا۔''اور وہ ہے تمہاری بہن مارتھا۔ اس نے آج پھر اپنی ایک سہیلی سے جھگڑا کیا ہے۔ اس بار معاملہ پولیس تک بھی جا پہنچا ہے۔ معاملہ رفع دفع تو ہو گیا ہے مگر پولیس کی طرف سے وارننگ دے دی گئی ہے کہ اگر آئندہ مارتھا نے دوبارہ ایسی حرکت کی تو اسے جیل بھجوا دیا جائے گا۔''

''آخر اس بے وقوف لڑکی کو کوئی بات سمجھ میں کیوں نہیں آتی۔'' ماں کی بات سنتے ہی ریمنڈے پھٹ پڑا۔

''میری سرزنش سے بچنے کے لیے وہ میرا فون اٹھاتی ہی نہیں اور میں کام کی مصروفیت کی وجہ سے وہاں آ نہیں سکتا۔ اُسے میری طرف سے فائنل وارننگ دے دیں۔ اگر وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آئی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔''

''میں تمہاری یہ فائنل وارننگ اسے متعدد بار پہلے بھی دے چکی ہوں مگر کیا کوئی فرق پڑا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ تمہاری کسی دھمکی کو خاطر میں نہیں لاتی۔ کیونکہ وہ جانتی ہے کہ اس سے آگے تم کچھ نہیں کر سکتے۔ اس کی ماں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''تو پھر اس بار اسے میری طرف سے آخری بار متنبہ کر دیں اور یہ بھی کہہ دیں کہ اپنے لیے لڑکا پسند کر لے، میں جلد ہی اسپتال سے چھٹیاں لے کر آؤں گا اور پھر اس وقت تک واپس نہیں لوٹوں گا جب تک اس کی شادی نہ کرا دوں۔'' ماں کا استہزائیہ لہجہ سن کر ریمنڈے کو بھی غصہ آ گیا۔

''ٹھیک ہے بیٹا میں اسے کہہ دوں گی۔'' اس کی والدہ ٹھنڈے اور مایوس لہجے میں بولیں۔''مگر حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے اس کی اصلاح کی کوئی امید نہیں۔ وہ بہت زیادہ بگڑ چکی ہے۔ شاید میری تربیت میں ہی کوئی کمی رہ گئی تھی۔''

''آپ زیادہ پریشان نہ ہوں۔'' ریمنڈے نے ماں کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔''اس بار میں مارتھا کے معاملے کو سنجیدگی سے دیکھوں گا۔ بس میرے آنے کی دیر ہے.... فی الحال گڈ بائے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

آج وہ خاصا تھک گیا تھا اسی لیے اس نے اپنی ماں سے بھی زیادہ لمبی بات چیت نہیں کی۔ اسے اس وقت کافی کی طلب ہو رہی تھی۔ اس نے کچن میں جا کر اپنے لیے کافی بنائی اور پھر ڈرائنگ روم میں آ کر ایک آرام دہ کرسی پر براجمان ہو گیا۔

کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا۔ چھ ماہ پہلے اس نے جوزف کے ساتھ جو کھیل کھیلا تھا، اس کا نتیجہ اب ظاہر ہونے والا ہے۔ اسے یقین تھا کہ رپورٹس اس کے منشا کے مطابق ہی ہوں گی۔ اس نے سرنج کے ذریعے جراثیم سے آلودہ خون ڈرپ میں انجیکٹ کیا تھا جو قطرہ قطرہ جوزف کے جسم میں سرایت کر گیا تھا۔ اب اس کے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگرچہ اس مرض کے سنگین مضمرات چند سال بعد ظاہر ہوتے مگر جوزف اس مرض میں مبتلا ہو جاتا۔ ریمنڈے کے پلان کی کامیابی کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔

دو دن بھی گزر ہی گئے۔ ریمنڈے نے اسپتال سے جوزف کی رپورٹس حاصل کر لیں، نتیجہ اس کی توقع کے عین مطابق تھا۔ جوزف کے خون میں اس مہلک اور خطرناک

مرض کا وائرس موجود تھا۔ اس وقت وہ تینوں دوپہر کے کھانے پر یکجا تھے۔ ریمنڈے جانتا تھا کہ جوزف بھی اپنی رپورٹس کے بارے ضرور جاننا چاہے گا مگر شاید وہ جولیا کے سامنے بات نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔

''اوکے فرینڈ، مجھے وارڈ میں جانا ہے۔ آج بل میں پے کروں گی۔'' جولیا نے اٹھتے ہوئے کہا اور پھر خاموشی سے کاؤنٹر کی جانب بڑھ گئی۔ اس نے کھانے کا بل پے کیا اور پھر ان دونوں کو الوداعی ہاتھ ہلاتے ہوئے کینٹین سے باہر نکل گئی۔ اس کے بل پے کرنے پر ریمنڈے اور جوزف نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ وہ تینوں کافی عرصے سے ایک ساتھ دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے مگر ایک دوسرے پر بوجھ بننا کسی کو بھی گوارا نہیں تھا۔ اس لیے باری باری پے منٹ کرتے رہتے تھے۔ ایک طرح سے یہ ایک خاموش معاہدہ تھا جس پر وہ تینوں عمل پیرا تھے۔

''ریمنڈے کیا میری رپورٹس آگئیں؟'' جولیا کے جاتے ہی جوزف نے پُرتجسس لہجے میں سوال کیا۔

''ہاں۔'' ریمنڈے نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''کہاں ہیں؟'' جوزف نے بے چین سے لہجے میں استفسار کیا۔

''کچرے کے ڈبے میں۔'' ریمنڈے نے جواب دیا۔

''کیا مطلب؟'' جوزف نے حیرت سے پوچھا۔

''مطلب یہ میرے دوست کہ تمہاری بابت میرے تمام خدشات غلط ثابت ہوئے ہیں۔ تمہاری رپورٹ بالکل اوکے ہیں۔ پھلوں وغیرہ کا جوس پیا کرو، اس سے تمہاری یہ زرد رنگت بھی ٹھیک ہو جائے گی۔ مجھے لگتا ہے تمہاری یہ گرتی ہوئی صحت کھانے پینے میں بے احتیاطی کا نتیجہ ہے۔''

''مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ مجھے کوئی مرض لاحق نہیں ہے۔'' جوزف نے چہکتے ہوئے کہا۔ ''ریمنڈے کا جواب سن کر اس کے چہرے پر گہرے اطمینان کے تاثرات عود کر آئے تھے۔

''بھئی تسلی کر لینے میں کیا حرج تھا۔'' ریمنڈے نے تفہیمی لہجے میں کہا۔ ''میں ایک ڈاکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ تمہارا دوست بھی ہوں اور تمہارے بارے میں فکرمند بھی رہتا ہوں۔ مجھے بس تمہاری زرد رنگت اور گرتی ہوئی صحت دیکھ کر شک گزرا تھا اس لیے میں نے اپنا شک دور کر لینا مناسب سمجھا۔''

''تم واقعی ایک سچے اور پُرخلوص دوست ہو، مجھے تمہاری دوستی پر فخر ہے۔'' جوزف نے عقیدت مندانہ لہجے میں کہا۔

''بس، بس زیادہ مکھن لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' ریمنڈے ہنستے ہوئے بولا۔ ''اب اس موضوع پر دوبارہ بات نہیں ہوگی، یہ بتاؤ کہ تمہاری جاب کیسی چل رہی ہے؟''

''بالکل ٹھیک چل رہی ہے اور پھر میں نے کون سا تمہاری طرح اپنی ماں کو پیسے بھجوانے ہوتے ہیں اس لیے ہر ماہ بچت بھی ہو جاتی ہے جو میں بینک میں جمع کروا دیتا ہوں۔'' جوزف نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

ریمنڈے جانتا تھا کہ وہ غلط نہیں کہہ رہا، اس کے ماں باپ کافی عرصہ پہلے وفات پا چکے تھے اور بہن بھائی بھی کوئی نہیں تھا اسی لیے سر پر صرف اپنی ذات کی ذمے داری تھی۔

کھانا ختم کرنے کے بعد جوزف اس سے رخصت ہو گیا جبکہ ریمنڈے اپنے آفس میں آ گیا۔ چھ ماہ پہلے جو کھیل، اس نے کھیلا تھا اب اس کے اختتام کا وقت آ گیا تھا۔ اس نے اپنا فون نکالا اور جولیا کا سیل نمبر ملایا۔ وہ جانتا تھا کہ جولیا اس وقت اسپتال کے پانچویں فلور پر اپنی ڈیوٹی سرانجام دے رہی ہوگی۔

''ہیلو۔'' کچھ ہی دیر میں جولیا کی آواز سنائی دی۔

''جولیا کیا تم کچھ دیر کے لیے میرے آفس میں آسکتی ہو، مجھے تم سے بہت اہم باتیں کرنا ہیں۔''

''مگر میں ڈیوٹی پر ہوں۔'' جولیا معترض لہجے میں بولی۔ ''اور اس وقت وارڈ میں کوئی دوسرا ڈاکٹر بھی موجود نہیں۔ ایسی کون سی بات ہے جو فون پر نہیں ہوسکتی؟''

''میں صرف تمہارے چند منٹ لوں گا، یہ بات فون پر کرنے والی نہیں ہے۔'' ریمنڈے نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے، میں آ رہی ہوں۔'' ریمنڈے کے لہجے کا گمبھیر پن محسوس کرتے ہی وہ بولی تو ریمنڈے نے فون آف کر دیا۔

کچھ ہی دیر میں، وہ ریمنڈے کے آفس میں تھی۔

''اب بتاؤ کیا بات ہے جو تم نے اتنی عجلت میں مجھے بلایا۔'' وہ ریمنڈے کے سامنے موجود کرسی پر بیٹھتے ہوئے متجسس لہجے میں بولی۔

''بات دراصل یہ ہے جولیا۔'' ریمنڈے نے تمہید باندھتے ہوئے جواب دیا۔ ''دو دن پہلے میں نے اس اسپتال سے جوزف کا میڈیکل ٹیسٹ کروایا تھا۔ یہ ٹیسٹ اس کے لیے میں نے ہی تجویز کیے تھے۔ مجھے اس کی تیزی

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مرگِ ناگہاں نمبر

اس خاص شمارے میں وہ سب کچھ ہے جو
آپ پڑھنا چاہتے ہیں، آپ کو پڑھنا چاہیے

ان مشہور و مقبول شخصیات کی روداد جو بے وقت موت کا
شکار ہوئے جنہیں عہدِ شباب میں موت اپنے ساتھ لے گئی

جنوری 2018ء کے اس شمارے
کو آپ مجلد کرا کر رکھنے پر مجبور ہوں گے

سال کا پہلا شمارہ سب سے اہم شمارہ

آج ہی اپنے نزدیکی بک اسٹال پر اپنا شمارہ مختص کرالیں

سے گرتی ہوئی صحت اور بدلتی ہوئی رنگت دیکھ کر یہ شک گزرا تھا کہ وہ کسی مرض میں مبتلا ہوگیا ہے۔ اس کی رپورٹس آگئی ہیں اور میرا اس کی بابت گمان درست ثابت ہوا ہے۔ تم اس کی رپورٹس خود دیکھ لو۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے ٹیبل پر رکھی ہوئی فائل جولیا کی جانب بڑھادی۔

جولیا نے حیرت بھرے چہرے کے ساتھ فائل تھامی اور پھر اسے پڑھنا شروع کردیا۔ جیسے جیسے وہ پڑھتی گئی، اس کے چہرے پر سراسیمگی کے تاثرات اُمنڈتے چلے گئے۔

''اوہ نو۔'' فائل پڑھتے ہی اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔''یہ تو بہت خطرناک اور مہلک مرض ہے۔ کیا تم نے اس بارے میں جوزف کو آگاہ کیا؟''

''نہیں۔'' ریمنڈے نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔''تم جوزف کی جذباتی طبیعت سے تو واقف ہی ہو۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر میں نے اس بارے میں اسے مطلع کیا تو وہ خودکشی کرلے گا۔''

''شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' جولیا افسردہ سے لہجے میں بولی۔''مگر کسی مریض سے اس کی بیماری چھپانا ہمارے پروفیشنلزم کے خلاف ہے۔''

''میں آہستہ آہستہ اس بارے میں بریف کردوں گا۔ تم اس بارے میں سوچ کر ہلکان مت ہونا۔'' ریمنڈے نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔ اسے جولیا کے چہرے پر موجود تاثرات دیکھ کر اندازہ ہوگیا تھا کہ اگر اس کے دل میں جوزف کے لیے پسندیدگی کے جذبات تھے بھی تو وہ اب ازخود ہمدردی میں تبدیل ہوجائیں گے۔

''یہ کام تم ہی بہتر طریقے سے کرسکتے ہو۔'' جولیا تفہیمی لہجے میں بولی۔''مجھ میں تو ہمت نہیں۔ ویسے زیادہ دیر مت کرنا کیونکہ جوزف کو اب علاج کی بھی ضرورت ہے اور پھر یہ مرض ازدواجی تعلقات سے بھی ایک دوسرے میں منتقل ہو جاتا ہے۔ اس لیے اب جوزف کو شادی بھی نہیں کرنی چاہیے۔ خوامخواہ کسی لڑکی کی زندگی تباہ ہوجائے گی۔''

''تم بے فکر رہو، میں چند ماہ کے اندر اندر اُسے حقیقت سے آگاہ کردوں گا۔'' ریمنڈے نے تیز لہجے میں کہا۔ جوزف کا یہ مرض ازدواجی تعلقات سے بھی دوسرے فریق میں منتقل ہوجاتا ہے، یہی حقیقت تو وہ جولیا کو باور کروانا چاہتا تھا اور کہے بغیر ہی اس کا مقصد پورا ہوچکا تھا۔ اسے اب سو فیصد یقین ہوگیا تھا کہ جولیا، جوزف کے بارے میں کبھی سوچے گی بھی نہیں۔ اس کی چال کامیابی سے ہمکنار ہوچکی تھی۔ اگرچہ اس کے لیے اسے ایسا کام کرنا پڑا تھا جس پر شاید اس کا ضمیر کبھی مطمئن نہ ہوتا۔ اسے عمر بھر کچوکے لگاتا رہتا مگر جولیا تک پہنچنے کا اسے یہی ایک راستہ نظر آیا تھا اور وہ جولیا کو کھونے پر کسی صورت بھی آمادہ نہ تھا۔

اگلے چند دنوں تک ریمنڈے نے واضح طور پر جوزف کے ساتھ جولیا کا رویہ تبدیل ہوتے دیکھا۔ وہی جولیا جو کبھی جوزف کے نہ آنے پر بے چین ہوجاتی تھی، اب اس کی آمد پر بے چین دکھائی دینے لگی تھی۔ کبھی جوزف کی باتوں پر کھلکھلا کر ہنس دیا کرتی تھی مگر اب اس کے کسی مذاق کا جواب بس ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ دے دیتی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کا رویہ سرد مہر اور روکھا سا ہوگیا۔ شاید وہ جان بوجھ کر ایسا کررہی تھی تاکہ جوزف کی اپنی طرف بڑھتی ہوئی پیش قدمی کو وہیں روک دے اور پھر اس کے مہلک مرض کے بارے میں جاننے کے بعد اس میں دلچسپی لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جولیا کی اس عدم توجہی کو جلد ہی جوزف نے بھی محسوس کرلیا۔ وہ اپنے مرض سے لاعلم تھا اس لیے جولیا کے رویے کی تبدیلی کی اصل وجہ جاننے سے بھی قاصر تھا۔

جولیا کے رویے نے اسے بھی مایوس کردیا تھا۔ پہلے پہل وہ روزانہ آتا تھا اب ہفتوں بعد ہی اس کی شکل نظر آتی۔

اگلے چند ماہ یونہی گزر گئے۔ جولیا نے اپنا اسپیشل کورس بھی مکمل کرلیا۔

یہ دسمبر کی ایک خوب صورت صبح تھی جب ریمنڈے نے جولیا کو پروپوز کیا اور اس نے بھی خوش دلی سے ہاں کر دی۔

اس ہاں کو سننے کے لیے ریمنڈے کے کان ترس گئے تھے۔ اس ہاں کو سننے کے لیے اس نے بڑے جتن کیے تھے بڑے پاپڑ بیلے تھے، ایک ایسا بھیانک کھیل کھیلا تھا جس کے بارے میں سوچ کر ہی انسان لرز جاتا۔ اس نے اپنی محبت کو پانے کے لیے انسان سے حیوان کا روپ دھار لیا تھا۔ جوزف کو ایسی موت کا تحفہ دیا تھا جس میں وہ سسک سسک کر مرتا۔ اس کی زندگی، موت سے بھی بدتر ہوجاتی مگر جولیا کی ہاں سننے کے بعد اسے کسی چیز کی پروا نہیں رہی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے وہ ہواؤں میں محوِ پرواز ہو، زندگی یکلخت بہت خوب صورت اور حسین لگنے لگی تھی۔ سب سے اچھی بات یہ تھی کہ جولیا نے اس سنڈے کو چرچ میں اس کے ساتھ شادی کرنے کی حامی بھرلی تھی۔ انہوں نے طے کیا تھا کہ رشتے داروں کو مدعو کرنے کے لیے ہنی مون کے بعد

ایک پُروقار تقریب کا اہتمام کیا جائے گا اور یہ تقریب ریمنڈے کے آبائی شہر لاس ویگاس میں منعقد کی جائے گی۔

اس شام اس نے یہ خوش خبری سنانے کے لیے اپنی ماں کو بھی فون کیا۔

''مگر بیٹا کیا تم اپنی ماں اور بہن کے بغیر ہی شادی کر لو گے؟ اور پھر دیگر رشتے داروں کو مدعو کرنا بھی تو ضروری ہے۔'' ریمنڈے کا اچانک فیصلہ سن کر اس کی ماں کچھ معترض ہوئی۔

''ماما یہ سب ہنی مون کے بعد ہوگا۔ فی الحال ہم صرف شادی کر رہے ہیں۔ ہنی مون کے بعد میں اور جولیا لاس ویگاس آئیں گے۔ وہاں ہم ایک بڑی تقریب کا انعقاد کریں گے جس میں میرے اور جولیا کے تمام رشتے داروں کو مدعو کیا جائے گا۔ میں مارتھا کو سرپرائز دینا چاہتا ہوں اس لیے فی الحال آپ اُسے اس شادی کے متعلق کچھ نہیں بتائیں گی۔''

''ٹھیک ہے بیٹا جیسی تمہاری مرضی۔'' اس کی والدہ نے تفہیمی لہجے میں جواب دیا۔ میں مارتھا کو اس بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔ میں اسی بات پر خوش ہوں کہ تم شادی تو کر رہے ہو۔ مگر تم لاس ویگاس آؤ گے کب؟''

''بس کچھ ہی عرصے میں۔'' ریمنڈے نے کہا اور پھر الوداع کہتے ہوئے فون کاٹ دیا۔

آج وہ بہت خوش تھا۔ دو دن بعد اسے اس کی محنت کا ثمر ملنے والا تھا۔ اس نے جوزف کو راستے سے ہٹانے کے لیے کس قدر شاندار پلان بنایا تھا اور پھر کتنی چالاکی سے اس پلان کو عملی جامہ پہنایا تھا۔ آج اسے اپنی ذہانت پر ناز ہونے لگا تھا۔

اگرچہ ریمنڈے اور جولیا طے کر چکے تھے کہ اپنے رشتے داروں کو علیحدہ تقریب میں مدعو کریں گے مگر پھر بھی شادی میں کچھ مہمانوں کی شرکت تو ضروری تھی۔ یہ کمی اسپتال کے عملے اور ڈاکٹرز نے پوری کر دی۔ جوزف کو بھی مدعو کیا گیا۔ تقریب کا انعقاد قریبی چرچ میں کیا گیا تھا۔

جولیا اور ریمنڈے بہت خوش نظر آ رہے تھے جبکہ جوزف خاصا بجھا بجھا سا لگ رہا تھا۔ شروع شروع میں اسے لگا تھا کہ جولیا اس میں دلچسپی لے رہی ہے۔ سنہرے بالوں والی اس حسینہ کی دلچسپی محسوس کر کے جوزف نے پہلی مرتبہ شادی کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا تھا مگر پھر اچانک ہی جولیا کا رویّہ تبدیل ہو گیا، کیوں؟ یہ جوزف نہیں جانتا تھا، شاید اس نے ریمنڈے کو ایک ڈاکٹر ہونے کی وجہ سے اس پر ترجیح دی تھی۔ بات جو بھی تھی، جولیا اب ہمیشہ کے لیے ریمنڈے کی ہو چکی تھی۔ اب اسے بھول جانا ہی بہتر تھا۔

سب آگے بڑھ بڑھ کر ان دونوں کو شادی کی مبارک باد دے رہے تھے۔ جوزف نے ایک نظر ان دونوں کے پُرمسرت چہروں پر ڈالی اور پھر چرچ سے باہر نکل گیا۔

ریمنڈے اور جولیا شادی کے بعد اسپتال سے چھٹیاں لے کر امریکا کے ایک پُرفضا مقام پر ہنی مون منانے کے لیے چلے گئے۔ تقریباً ایک ماہ بعد ان کی واپسی ہوئی۔ جولیا اب ریمنڈے کے فلیٹ میں ہی منتقل ہو گئی تھی۔ وہ دونوں اب اپنے تابناک مستقبل کے لیے پلاننگ کر رہے تھے۔ انہوں نے جلد ہی پارٹ ٹائم میں اپنا ایک پرائیویٹ کلینک بنانے کا بھی فیصلہ کر لیا۔

اس وقت شام کا وقت تھا۔ ریمنڈے اور جولیا اپنے فلیٹ کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے کافی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ''ریمنڈے کیا جوزف سے کوئی رابطہ ہوا؟'' جولیا نے اچانک اس سے پوچھا۔

ریمنڈے نے کافی عرصے بعد اس کے منہ سے جوزف کا ذکر سنا تھا۔ تاہم اتنے عرصے بعد بھی اس کے منہ سے جوزف کا ذکر سن کر اسے اچھا نہیں لگا۔

''میرا اس سے کوئی رابطہ نہیں ہوا۔'' وہ ناگوار لہجے میں بولا۔ ''اس نے بھی مجھ سے رابطہ نہیں کیا۔ شاید اس لیے کہ وہ جانتا تھا کہ ہم دونوں ہنی مون منانے گئے ہوئے ہیں اور ہمیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں ہے۔ ویسے تمہیں اس کا خیال کیوں آیا؟''

''میرا خیال ہے اب تمہیں اسے اس کے مرض کے بارے میں آگاہ کر دینا چاہیے۔ کیونکہ یہ اس کے لیے بہتر ہوگا اور وہ احتیاط بھی کرے گا۔ تم ایک ڈاکٹر ہو اور یہ حقیقت تم سے مخفی نہیں ہے کہ یہ مرض ازدواجی تعلقات سے بھی منتقل ہو جاتا ہے۔ اگر اس کی زندگی میں کوئی گرل فرینڈ وارد ہو گئی تو اس کی بھی زندگی برباد ہو جائے گی۔ جوزف ایک آزاد معاشرے کا فرد ہے اسے اپنی زندگی مرضی سے گزارنے کا پورا حق حاصل ہے مگر کسی دوسرے کی زندگی برباد کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ تاہم وہ اس بارے میں احتیاط سے اسی وقت کام لے گا جب اپنے مہلک مرض کے بارے میں اسے مکمل آگاہی حاصل ہو گی۔'' جولیا پُرخیال لہجے میں بولی۔

جولیا کے دلائل سے صرف نظر ممکن نہیں تھا۔ ''تم

ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' ریمنڈے قائل ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں اس سلسلے میں اس سے ایک خصوصی ملاقات کروں گا۔ تاکہ اسے اس مرض کے بارے میں مکمل طور پر بریف کر دوں اور ساتھ ہی ساتھ احتیاطی تدابیر بھی بتا دوں۔ اسے اچھی طرح تسلی دینی پڑے گی۔ وہ بہت حساس اور زود رنج طبیعت کا مالک ہے اور اپنی بیماری کے بارے میں جاننے کے بعد اس کا ردِعمل بھی خاصا ہیجانی اور جذباتی ہوگا۔''

''ہمیں اس کے ردِعمل سے اب کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ میں بس یہ چاہتی ہوں کہ اسے خبردار کر دیا جائے۔'' جولیا ناصحانہ لہجے میں بولی۔

''او کے ڈارلنگ، جیسا تم چاہوگی ویسے ہی ہوگا۔ کیا اب کافی کا ایک اور کپ مل سکتا ہے؟'' ریمنڈے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کافی تو میں بنا دیتی ہوں مگر میں تمہاری حد سے زیادہ کافی پینے کی عادت سے بہت تنگ ہوں۔'' جولیا نے شکوہ کناں لہجے میں کہا اور پھر اٹھ کر کچن کی جانب بڑھ گئی۔

وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ اب جوزف کو اس کی بیماری کے بارے میں آگاہ کر دینا چاہیے تھا۔ ریمنڈے سوچ رہا تھا کہ کل کسی وقت جوزف سے ملاقات کرلے۔ اس نے اپنا موبائل فون اٹھایا اور جوزف کا نمبر ملایا مگر اس کا سیل فون آف جا رہا تھا۔ وہ کچھ دیر تک خالی خالی نگاہوں سے اپنے فون کو تکتا رہا اور پھر اس نے اپنے گھر کا نمبر ملایا، کافی عرصہ ہوگیا تھا اپنی ماں سے بات کیے۔ ''ہیلو۔'' توقع کے مطابق اس کی والدہ نے فون اٹھالیا۔

''ہیلو مام کیسی ہیں آپ؟'' ریمنڈے نے ماں کی خیریت دریافت کی۔

''ٹھیک ہوں۔''

'''ہنی مون پر کیا گئے ماں اور بہن کو بھول ہی گئے۔'' ماں نے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔

''ایسی بات نہیں ہے، مام۔'' ریمنڈے کھسیانے سے لہجے میں بولا۔ ''میں اور جولیا چند دنوں تک لاس ویگاس آرہے ہیں، اور پھر مجھے مارتھا کو سرپرائز بھی تو دینا ہے۔ آپ نے اسے کچھ بتایا تو نہیں؟''

''نہیں، میں نے اسے کچھ نہیں بتایا مگر تمہیں بتا رہی ہوں کہ مارتھا بھی ایک سرپرائز تمہیں دینا چاہتی ہے۔''

''کیا مطلب؟'' ریمنڈے نے حیرت سے استفسار کیا۔

''مطلب یہ کہ تمہارے ہنی مون پر جانے کے چند دن بعد مارتھا کو بھی ایک لڑکا پسند آگیا تھا اور انہوں نے چرچ میں شادی بھی کرلی ہے، اب وہ دونوں ہنی مون منانے کے لیے ایک پُرفضا مقام پر گئے ہوئے ہیں۔''

''کیا؟'' ریمنڈے نے خوشگوار حیرت کے ساتھ کہا۔ ''اور آپ نے مجھے مطلع کرنا تک گوارا نہیں کیا۔''

''کیا تم نے اپنی شادی کے بارے میں اسے مطلع کیا تھا؟'' ماں کے جواب نے ریمنڈے کو لاجواب کر دیا۔

''تم دونوں بہن بھائی ہو اور تمہارے ذہن بھی آپس میں کتنے ملتے جلتے ہیں۔ شاید اسی لیے دونوں ہی ایک دوسرے کو سرپرائز دینے کا پلان بنائے بیٹھے ہو مگر میں نے مارتھا سے وعدہ خلافی کرتے ہوئے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہے۔''

''مگر مام لڑکا کون ہے اور کیا کرتا ہے؟'' ریمنڈے نے سوال کیا۔

اس کا سوال سن کر ریمنڈے کی ماں بے اختیار ہنس دیں اور پھر بولیں۔ ''لڑکا میرا اور تمہارا دیکھا بھالا ہے، تمہارے بچپن کا دوست جوزف، ایک ماہ پہلے وہ واپس لاس ویگاس آگیا تھا، نہ جانے کب اس کے اور مارتھا کے درمیان قربتیں بڑھیں اور انہوں نے شادی کا فیصلہ کرلیا۔''

''کیا؟'' ریمنڈے نے حیرت و خوف زدہ لہجے میں کہا۔ اس نے جوزف کو اپنے ہاتھوں سے جراثیم سے آلودہ کیا تھا، اس کی زندگی برباد کی تھی۔ یہ خوفناک مرض ازدواجی تعلقات سے بھی منتقل ہوجاتا تھا تو گویا جس بربادی میں اس نے جوزف کو مبتلا کیا تھا، وہ بربادی اس کے گھر تک بھی پہنچ گئی تھی۔

''مام یہ مارتھا نے کیا کر دیا؟'' وہ گرجتے ہوئے بولا۔ ''اس نے اس حرام زادے جوزف سے شادی کر لی۔''

''یہ تم کس لہجے میں بات کررہے ہو؟'' اس کی ماں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

''ہمیں تو خوش ہونا چاہیے کہ مارتھا کا گھر بس گیا ہے اور سنو میں تمہیں وارننگ دے رہی ہوں کہ آئندہ جوزف کا نام ادب سے لینا کیونکہ اب وہ تمہارا بہنوئی ہے۔''

ریمنڈے نے تاسف سے فون بند کردیا...... جو گڑھا اس نے دوست کے لیے کھودا تھا اس میں اس کا اپنا آشیانہ آگیا تھا۔ اس کے جذبۂ رقابت نے دو زندگیوں کو موت سے ہمکنار کردیا تھا۔

پُراسرار اور دلچسپ کتابیں انسانی ذہن پر دیرپا اثرات مرتب کرتی ہیں... اس کے دماغ پر بھی بوجھ تھا... وہ کتب بینی میں اپنا دھیان بٹانا چاہتا تھا... اور پھر اسے ایک ایسی کتاب مل گئی جس نے اسے اپنے سحر میں جکڑنا شروع کر دیا... جرم سے پہلے رونما ہونے والے جرم کی خبر رکھنے والے ایک دشمن دوست کی بھیانک غلطی...

قتل کی ایک انوکھی واردات جس کی پیشگی اطلاع مل چکی تھی...

زرد کتاب

عکسِ فاطمہ

ڈینئل راسکن نے چھت کی روشنیاں بجھائیں تو کمرے میں نیم تاریکی چھا گئی۔ ایک لمحے کے لیے تو یوں محسوس ہوا کہ باہر کی طرح اندر بھی اندھیرا چھا گیا ہے۔

ورڈون کے مضافات میں واقع میل مورٹ نامی گاؤں کو برف باری نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا اور گہرے بادلوں کی وجہ سے شام سے پہلے ہی اندھیرا پھیل گیا تھا۔ موم بتیوں

کی زرد روشنی میں ان سب کے چہروں کی رنگت تانبے جیسی نظر آرہی تھی۔ وہ پانچوں ایک گول میز کے گرد بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں میز کی سطح پر پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ ان کے لیے کوئی نیا تجربہ نہیں تھا۔ وہ مہینے میں ایک یا دو بار اپنے پیاروں کی روحوں کو طلب کرنے کے لیے ایک جگہ جمع ہوتے جو بیس سال پہلے جنگِ عظیم کے دوران اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔ ان کا ایک ساتھی مارک سانترے اس جنگ میں بچ گیا تھا تاہم اس شام وہ یہاں موجود نہیں تھا۔ ایک پرانی فرانسیسی کہاوت ہے کہ غیر حاضر رہنے والے ہمیشہ غلطی پر ہوتے ہیں اور بہت جلد یہ بات سچ ثابت ہوگئی۔

اس طرح کی محفلوں میں روحیں اپنی موجودگی کا احساس میز کے جھٹکوں سے دلاتی تھیں جن کی شدت کا انحصار ان کے موڈ پر ہوتا تھا۔ کبھی کبھی ان جھٹکوں کی آواز بہت زیادہ ہوتی جب کسی فوری پیغام کا جواب دیا جاتا جیسا کہ اس کیس میں نظر آرہا تھا۔ راسکن کی نوجوان اور خوب صورت بیٹی مچل کے ایک سوال کے جواب میں ایک زوردار جھٹکے کی آواز آئی جس کا مطلب تھا کہ روحوں سے رابطہ ہوگیا ہے۔ ایک آواز کا مطلب مثبت اور دو آوازوں کا مطلب منفی ہوتا تھا۔ اگلے چند سوالوں کے جواب میں اس طرح کی دو آوازیں آئیں تبھی مچل نے پوچھا۔

''کیا کوئی اہم واقعہ پیش آیا ہے جس کا تعلق یہاں پر موجود لوگوں سے ہو؟'' جواب میں دو آوازیں سنائی دیں۔

''ہمارا کوئی دوست؟'' ایک آواز جس کا مطلب ہاں تھا۔

''کیپٹن سانترے؟'' جواب ہاں میں آیا۔

سب لوگوں کے چہروں پر پریشانی کے آثار نمودار ہوئے۔ اس بارے میں مچل نے مزید سوالات کیے اور جب اس نے پوچھا کہ کیا اسے کوئی حادثہ آیا ہے تو اس کا جواب ہاں میں آیا۔

''کیا اس کا قتل ہوگیا ہے؟'' جواب ہاں میں تھا۔

''کب، آج سہ پہر میں؟'' (نہیں)

''ابھی۔ تھوڑی دیر پہلے؟'' (ہاں)

''یہ مضحکہ خیز بات ہے۔'' ڈاکٹر تھیوڈور برنارڈ نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ جس کی عمر ستر برس سے زیادہ تھی۔ اس نے دوسرے لوگوں کی طرح کلاک پر نظر نہیں ڈالی جو چھ بجنے میں پانچ منٹ کا وقت بتا رہی تھی۔ راسکن نے لوگوں کو خاموش کرنے کے لیے اپنا ہاتھ فضا میں بلند کیا اور بیٹی سے کہا کہ وہ گفتگو جاری رکھے تاہم روحوں کا اصرار تھا کہ اس علاقے میں ایک جرم سرزد ہو چکا ہے لیکن انہوں نے قاتل کا نام نہیں بتایا سوائے اس کے کہ وہ وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے بھی ایک ہو سکتا تھا۔ یہ اتنی احمقانہ بات تھی کہ اس پر کسی نے یقین نہیں کیا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' جیردم سانترے نے کہا۔ وہ کیپٹن سانترے کا بھتیجا تھا۔

''کوئی بھی شخص ایک ہی وقت میں یہاں اور وہاں نہیں ہو سکتا۔''

''میں بھی اس سے اتفاق نہیں کرتی۔'' اگاتھی میلیٹ بولی۔ وہ ایک چالیس سالہ پُرکشش اسکول ٹیچر تھی۔

''بالکل فضول بات ہے۔'' ڈاکٹر برنارڈ نے اپنا جملہ دہرایا۔ ''سانترے سے کسی کی کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔''

کسی نے اس کی بات پر توجہ نہیں دی جبکہ مچل کے سوالات کا سلسلہ جاری تھا لیکن اسے کوئی جواب نہیں مل رہا تھا پھر اس نے آلۂ قتل کے بارے میں پوچھا۔ اس کے لیے اس نے حروف تہجی کا طریقہ اختیار کیا۔ وہ باری باری مختلف حروف کو ملا کر لفظ بناتی رہی۔ بالآخر ایک اجنبی نام راپا۔ یوگ پر آواز سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی یہ محفل ختم ہوگئی۔

''یہ نام جانا پہچانا لگتا ہے۔'' اسکول ٹیچر نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''کیا اس کا تعلق قدیم پولی نیشیائی تہذیب سے نہیں ہے۔ جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ بحرالکاہل کے یہ چھوٹے جزیرے آسٹریلیا کے مشرق میں ہیں۔''

''میں نے بھی یہ نام کہیں سنا ہے۔'' ڈاکٹر برنارڈ نے کہا۔ ''لیکن یہ نہیں معلوم کہ کس نے مجھے اس بارے میں بتایا تھا۔''

مچل نے اپنے باپ کی طرف دیکھا جو قدیم نوادرات کا تاجر تھا۔ اس نے تائید میں سر ہلا دیا۔

''میں نے ہی بتایا ہوگا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میرے ذخیرے میں ایسا ایک......''

''وہ خنجر!'' مچل اچانک بول پڑی۔ ''جو شیشے کے کیس میں رکھا ہے۔'' وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ''میں جا کر دیکھتی ہوں۔''

''کیوں نہیں۔ ضرور دیکھو۔ یہ سچ ہے کہ وہ آلۂ قتل کے طور پر استعمال ہو سکتا ہے لیکن میں نے آج سہ پہر میں ہی دیکھا۔ وہ اپنی جگہ پر موجود تھا۔''

مچل ایک منٹ سے بھی کم وقت میں واپس آگئی اور اس نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ ''وہ خنجر اپنی جگہ پر نہیں

ہے۔‘‘

’’کیا تمہیں یقین ہے ڈارلنگ؟‘‘ جیروم اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

راسکن کمرے سے باہر گیا اور تقریباً فوراً ہی واپس آ گیا۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔

’’ہمیں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہاں پر کسی نے چوری چھپے وہ خنجر اٹھا لیا ہے لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیسے ممکن ہے۔ نہیں یہ فضول بات ہے۔‘‘

’’فضول ہے یا نہیں۔ ہمیں جا کر دیکھنا چاہیے۔‘‘ جیروم نے کہا۔

’’ٹھیک ہے۔ ہم سب چلتے ہیں۔‘‘ مچل کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

’’ایک منٹ ٹھہرو۔‘‘ راسکن نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ’’ایک آدمی کافی ہے گو کہ ایک لمحہ کے لیے مجھے بھی یقین نہیں آیا کہ ایسا کوئی واقعہ پیش آیا ہے لیکن خنجر کی گمشدگی سے لگ رہا ہے کہ یہ سچ ہے۔ ہمیں اپنا اطمینان کر لینا چاہیے۔ جیروم تم جا کر دیکھو کہ کیا بات ہے اور جلدی سے واپس آ کر ہمیں بتاؤ۔‘‘

کیپٹن سانترے، ایک چھوٹے سے الگ تھلگ گھر میں رہتا تھا جو راسکن کے مکان سے بمشکل پانچ منٹ کے فاصلے پر تھا۔ جیروم دس منٹ بعد ہی واپس آ گیا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی اور آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔

’’اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ تمام روشنیاں بند تھیں جبکہ دروازے کو اندر سے چٹخنی لگی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ضرور کوئی حادثہ پیش آیا ہے۔‘‘

پندرہ منٹ بعد وہ سب کیپٹن سانترے کے بوسیدہ مکان کے بیرونی دروازے کے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر برنارڈ نے اردگرد کا بغور جائزہ لینے کے بعد کہا۔

’’جیروم کے علاوہ برف پر کسی کے قدموں کے نشان نہیں ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ کوئی بھی یہاں نہیں آیا۔ اب ہمارے پاس ایک ہی راستہ ہے کہ دروازے پر زوردار ضرب لگائیں تاکہ کیپٹن جاگ جائے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ وہ نشے کا عادی ہے۔‘‘

اگلے چند منٹ تک وہ بہ آوازِ بلند چلاتے اور دروازے پر زوردار ضرب لگاتے رہے لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ تب ڈاکٹر برنارڈ نے جیروم کو مخاطب کر کے کہا۔ ’’اگر ہم دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو جائیں تو اس کی مرمت پر معمولی خرچ آئے گا لیکن اس طرح ہم مطمئن ہو سکیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم اسے نشے کی حالت میں صوفے پر لیٹا ہوا دیکھیں گے۔‘‘

’’مجھے یقین نہیں۔‘‘ اگاتھی میلیٹ نے شائستگی سے کہا۔ ’’مانتی ہوں کہ مارک میں بہت سی کمزوریاں ہیں لیکن میں نے کبھی اسے نشے میں دھت نہیں دیکھا۔‘‘

’’ٹھیک ہے لیکن ہمیں دروازہ توڑنا ہی ہوگا۔‘‘ ڈاکٹر نے کہا۔ ’’جیروم، تم ہم سب میں زیادہ طاقت ور اور جوان ہو اور ممکن ہے کہ مارک تمہیں اس حرکت پر معاف کر دے۔‘‘

جیروم چند قدم پیچھے ہٹا اور زور سے دروازے کو ٹکر ماری۔ تیسری ٹکر پر لکڑی کے چرچرانے کی آواز آئی۔ اس کے بعد اس نے دو لاتیں رسید کیں اور دروازہ الگ ہو گیا۔

روشنی ہونے سے پہلے ہی انہوں نے فرش پر چند چیزیں بکھری ہوئی دیکھیں۔ روشنی ہونے پر انہوں نے دیکھا کہ کیپٹن سانترے صوفے پر چت لیٹا ہوا ہے لیکن وہ نشے میں نہیں بلکہ اس سے بھی بدتر حالت میں تھا۔ وہ خون میں لت پت تھا اور آنکھوں کی پتلیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے پر خراشیں تھیں اور پیٹ میں ایک گہرا زخم تھا جو کسی تیز دھار ہتھیار سے لگا تھا۔ آتش دان کے پاس ہی خون میں ڈوبا ہوا ایک خنجر پڑا ہوا تھا جسے مچل اور اس کے باپ نے فوراً پہچان لیا۔

☆☆☆

پولیس آفیسر انتونی بولینگر کے دفتر میں بیٹھے ہوئے ڈاکٹر ٹوئسٹ نے پوری بات بڑے غور سے سنی اور بولا۔ ’’یہ بڑی حیران کن بات ہے کہ میری یہاں موجودگی میں یہ واقعہ پیش آیا۔‘‘

’’کیا مطلب ہے تمہارا؟‘‘

’’میں جب بھی کہیں جانے کا پروگرام بناتا ہوں تو کچھ نہ کچھ ہو جاتا ہے جیسے یہ واقعہ رونما ہوا۔‘‘

’’یہ شہرت کی قیمت ہے۔ جیسے ہی میں نے سنا کہ تم اس علاقے میں موجود ہو تو میں نے تمہاری مدد لینے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ یہ مسئلہ میری سمجھ سے باہر ہے۔‘‘

جب ڈاکٹر ٹوئسٹ تائید میں سر ہلا رہا تھا تو پولیس آفیسر نے بڑی دلچسپی سے اس نامور برطانوی سراغ رساں کو دیکھا۔ دبلا پتلا ہونے کے باوجود اس کی آنکھوں میں ایک ایسے مثالی شخص کی چمک تھی جو ہمیشہ انصاف کی تلاش میں رہتا ہو۔

’’میں تمہیں پولیس کی فراہم کردہ تفصیلات بتانا چاہتا

ہوں تاکہ تم حقائق کی بنیاد پر تحقیقات شروع کرسکو۔'' پولیس آفیسر نے کہا۔ ''سب سے پہلے ہم موت کے وقت کی بات کرتے ہیں جو میڈیکل آفیسر اور ڈاکٹر برنارڈ نے بتایا ہے۔ ڈاکٹر اپنے دوستوں کے ساتھ تقریباً ساڑھے چھ بجے وہاں پہنچا تھا۔ اس نے تصدیق کی ہے کہ اس وقت سانترے کی موت کو تقریباً آدھا گھنٹا ہوچکا تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق موت کا وقت غالباً......''

''مجھے اندازہ لگانے دو۔ چھ بجنے میں پانچ منٹ کم؟''

''بالکل ٹھیک لیکن یہ بھی سوچا جاسکتا ہے کہ وہ روحوں کی محفل سے متاثر تھا اس لیے میڈیکل آفیسر کا بیان زیادہ اہم ہے۔ اس نے بھی موت کا یہی وقت بتایا ہے۔''

''آخری بار برف باری اس حادثے سے ایک روز قبل ہوئی تھی جس کا مطلب ہے کہ کیپٹن کے گھر کے اردگرد سو میٹر کا علاقہ برف سے ڈھک گیا تھا اور اس پر گواہوں کے قدموں کے علاوہ کسی اور کے نشان نظر نہیں آئے۔ سانترے کو آخری بار زندہ حالت میں اس وقت دیکھا گیا جب وہ مقامی دکان دار سے تمباکو کا پیکٹ خریدنے گیا۔ اس کی آواز سننے والا آخری شخص راسکن تھا جب کیپٹن نے مرنے سے پہلے دوپہر میں اسے فون کرکے بتایا کہ وہ روحوں کی محفل میں نہیں آسکے گا۔ کیونکہ وہ کافی تھکن محسوس کررہا تھا۔ اس کی تصدیق سوئچ بورڈ آپریٹر نے بھی کی جس نے کال کا وقت تین بجنے میں تیئس منٹ نوٹ کیا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اس کے بعد کیپٹن نے کوئی کال وصول کی اور نہ ہی کوئی اور فون کیا۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ اس وقت تک وہ خنجر راسکن کی لائبریری میں اپنی جگہ پر موجود تھا۔ اس نے حلفیہ یہ بیان دیا ہے۔ تقریباً پانچ بجے اس کے دوست آنا شروع ہوئے۔ سب سے پہلے اگاتھی میلیٹ پھر ڈاکٹر برنارڈ اور آخر میں جیروم .... آیا۔ یہ محفل ساڑھے پانچ بجے شروع ہوئی۔ اس دوران اگر کوئی خنجر لے جانا چاہتا تو اسے صرف ایک منٹ لگتا۔ چھ بجنے میں پانچ منٹ پر روح نے کیپٹن سانترے کے قتل کا انکشاف کیا۔ اس کے فوراً بعد معلوم ہوا کہ خنجر اپنی جگہ پر نہیں ہے۔ جیروم پریشانی کے عالم میں سانترے کو دیکھنے گیا۔ وہ چھ بج کر دس منٹ پر وہاں پہنچا۔ دروازہ اور کھڑکیاں بند تھیں اور اندر سے کوئی جواب نہیں آرہا تھا۔ ساڑھے چھ بجے وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ دوبارہ وہاں گیا۔ انہوں نے دروازہ توڑا تو ان کی نظر لاش کے ساتھ ساتھ خنجر پر بھی گئی۔ وہاں کی صورتِ حال دیکھ کر انہیں شک ہوا کہ شاید قاتل ابھی تک گھر میں موجود ہو لیکن اچھی طرح تلاشی لینے کے باوجود وہاں کوئی نہیں ملا۔ انہوں نے یہ بھی نوٹ کیا کہ مقتول کا فون کام نہیں کررہا تھا چنانچہ وہ واپس راسکن کے گھر آئے اور پولیس کو اطلاع دی۔

میں ایک گھنٹے بعد جائے وقوعہ پر پہنچا اور میں نے دیکھا کہ سب کچھ اسی حالت میں تھا۔ ڈاکٹر برنارڈ نے اس سلسلے میں پوری احتیاط کی تھی کہ کوئی چیز اِدھراُدھر نہ ہو۔

پولیس آفیسر نے لمحہ بھر توقف کرنے کے بعد ایک فائل کھولی اور اس میں سے چند صفحے نکال کر ڈاکٹر ٹوئسٹ کے سامنے رکھ دیے۔

''یہ کچھ خاکے ہیں...... میری عادت ہے کہ دوران تفتیش ہر اس چیز کا خاکہ بناتا ہوں جو میری نظر میں اہمیت رکھتی ہے اور کئی موقعوں پر یہ خاکے بہت مفید ثابت ہوتے ہیں۔ ان میں جائے وقوعہ، آلۂ قتل اور کئی چیزوں کے خاکے موجود ہیں۔''

''حیرت انگیز۔'' ڈاکٹر ٹوئسٹ نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ ''تم پنسل کا بہت اچھا استعمال کرتے ہو۔''

''تم کہہ سکتے ہو کہ مجھے مشاہدے کا شوق ہے۔'' پولیس آفیسر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تم یہاں اس مکان کا نقشہ دیکھ سکتے ہو۔ اندر جانے کے لیے عمارت کے مشرق میں صرف ایک دروازہ ہے جو ایک پرانے پہاڑی بنگلے کی طرف پر بنی ہوئی ہے۔ یہ دروازہ ایک بہت بڑے کمرے میں کھلتا ہے۔ جس کے آتش دان کے پاس خنجر پڑا ہوا تھا۔ دروازے کے بائیں جانب اوپری منزل پر جانے کے لیے سیڑھیاں ہیں جہاں ایک بیڈروم اور اسٹور ہے۔ دروازے کے دائیں جانب ایک کمرا ہے جس میں کتابوں کی الماریاں ہیں۔ وہاں کافی بے ترتیبی تھی اور فرش پر چاروں طرف کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔ میز پر ٹیلی فون رکھا ہوا تھا لیکن وہ بھی درست حالت میں نہیں تھا۔ ضرور سانترے اور حملہ آور کے درمیان لڑائی ہوئی ہوگی فرش پر خون کے دھبے اور کچھ بکھری ہوئی چیزیں بھی دیکھی گئیں۔ یوں لگتا ہے کہ کیپٹن کو کافی جدوجہد کرنا پڑی کیونکہ اس کے بازوؤں، ٹانگوں، کمر اور سر پر زخم تھے۔ میڈیکل آفیسر نے کم از کم مختلف شکل اور سائز کے پندرہ زخم گنے جو یقیناً خنجر سے نہیں بلکہ کسی کند آلے سے لگے ہوں گے۔ خنجر سے اس کے پیٹ میں مہلک زخم آیا۔ فرش پر خون کے قطروں سے لگتا ہے کہ سانترے اپنے آپ کو صوفے تک گھسیٹ کر لے جانے میں کامیاب ہوگیا جبکہ قاتل نے وہ خنجر آتش دان کے

پاس پھینک دیا۔"

"میرا خیال ہے کہ اس پر انگلیوں کے نشانات نہیں ہوں گے؟"

"نہیں۔ البتہ اس کے پھل پر کچھ غیر واضح نشانات ہیں لیکن دستے پر کچھ نہیں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قاتل نے دستانے پہن رکھے تھے۔ اب تم اس مسئلے پر غور کرو، کیپٹن سانترے کا قتل اپنے گھر میں ہوا جس کا دروازہ اور کھڑکیاں اندر سے بند تھیں، باہر برف کی دبیز تہ جمی ہوئی تھی۔ اس لیے بظاہر کسی شخص کی آمد ناممکن دکھائی دیتی ہے لیکن حقائق یہی ہیں۔ زخموں کی نوعیت دیکھتے ہوئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مرنے والے نے خودکشی کی ہوگی۔ آلۂ قتل کی وہاں موجودگی بھی ایک سوالیہ نشان ہے۔ یہ وہاں کیسے پہنچا؟ پہلے میں نے سوچا کہ شاید قاتل نے اپنے کسی ساتھی کی مدد سے کوئی مختلف ہتھیار استعمال کیا ہو اور بعد میں جب لوگ وہاں پہنچے تو اس کی جگہ خنجر رکھ دیا ہو لیکن خنجر اس سے پہلے غائب ہو چکا تھا جب یہ سب لوگ راسکن کے گھر میں موجود تھے پھر یہ کہ خنجر کی نوک کا ایک ٹکڑا مرنے والے کی ریڑھ کی ہڈی سے برآمد ہوا۔ اس لیے یہ طے ہے کہ قتل اسی خنجر سے کیا گیا تھا۔ بظاہر یہی لگتا ہے کہ قاتل اسی گروپ کا کوئی فرد یا اس کا ساتھی ہے۔"

"میں تم سے ضرور اتفاق کرتا۔" ڈاکٹر ٹوئسٹ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن عملاً یہ ممکن نہیں کہ محفل کے شرکا میں سے کوئی ایک قتل کر کے واپس آجائے اور کسی کو خبر نہ ہو۔"

"بالکل، تمام گواہان اس نکتے پر متفق ہیں کہ محفل کے دوران کوئی شخص بھی لمحہ بھر کے لیے نظروں سے اوجھل نہیں ہوا۔"

"ایک بات مجھے حیران کر رہی ہے۔" ڈاکٹر ٹوئسٹ نے فکرمندی سے کہا۔ "اور وہ یہ کہ تم نے اس معمے کے واحد ممکنہ حل کے بارے میں نہیں سوچا۔"

"تمہارا اشارہ اس شخص کی جانب ہے جو کیپٹن کی خیریت معلوم کرنے اس کے مکان پر آیا تھا؟"

"ہاں اور وہی مقتول کے ترکہ کا وارث ہے؟"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ جیروم سانترے ہی مقتول کے اثاثوں کا وارث ہے خواہ وہ کتنے ہی معمولی کیوں نہ ہوں۔ ان میں ایک پرانا مکان اور تقریباً اسی مالیت کے حصص شامل ہیں۔ ہم اس پہلو پر غور کر چکے ہیں۔"

"اس نظریے کے مطابق تو یہی لگتا ہے کہ جیروم نے وہ خنجر چرایا اور سب سے نظریں بچا کر میز کو اس طرح جنبش دی جس سے ظاہر ہو کہ کیپٹن سانترے کا قتل ہو گیا ہے۔ پھر وہ گھبراہٹ کے عالم میں اس کی خیریت معلوم کرنے گیا اور اسے قتل کر کے واپس آگیا۔ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں دوسرے لوگوں کو بتایا کہ اس کے بار بار دستک دینے کے باوجود اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ عام حالات میں یہ اس مسئلے کا واحد ممکنہ حل ہوتا لیکن اس میں دو مسئلے ہیں۔ ہم نے بڑی تندہی سے مکان کے اردگرد برف کی تہ پر قدموں کے نشانات کا معائنہ کیا جو تمام گواہوں کے نشانات سے مطابقت رکھتے تھے۔ ان میں جیروم کے قدموں کے نشان بھی شامل ہیں جس نے بنگلے کے گرد ایک چکر لگایا اور بیرونی دروازے پر

"تبدیلی"

"اپنی بیوی کی وجہ سے میں کچھ مذہبی ہو گیا ہوں۔"

"وہ کیسے؟"

"شادی سے پہلے مجھے جہنم پر کچھ زیادہ یقین نہیں تھا۔"

مجبوری

وقار کی بھتیجی نے پچھلے دنوں اس سے کہا۔ "انکل! میں آپ کی سالگرہ پر تحفے میں دینے کے لیے رومال خریدنے گئی تھی لیکن مجھے آپ کی ناک کا سائز ہی یاد نہیں رہا۔"

"کم از کم"

ٹیم سات وکٹوں سے ہار گئی۔ کھلاڑی منہ لٹکائے ڈریسنگ روم میں واپس آرہے تھے۔ منیجر نے انہیں حوصلہ دیا۔ "اتنا غمزدہ ہونے کی ضرورت نہیں... ایک چیز تو بہرحال ہم نے جیتی تھی۔"

"کیا...؟" ایک کھلاڑی نے ذرا چونک کر پوچھا۔

"ٹاس۔" منیجر نے جواب دیا۔

"بروقت"

شوہر نے دفتر سے بیگم کو گھر فون کیا۔ "بیگم! مجھے عمر شریف کے ڈرامے کے لیے دو پاس ملے ہیں۔"

"میں جانے کے لیے تیار ہونا شروع کرتی ہوں۔" بیگم نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"ہاں... فوراً تیار ہونا شروع کر دو۔ پاس کل کے لیے ہیں۔" شوہر نے کہا۔

"مصرف"

کلاس روم میں ٹیچر نے بچوں سے پوچھا۔ "گائے کی کھال کا سب سے بڑا استعمال کیا ہے؟"

"وہ گائے کو ایک جگہ رکھتی ہے۔" ایک بچے نے جواب دیا۔

واپس آ گیا۔ ہمیں کھڑکیوں کے پاس ایسے کوئی آثار نہیں ملے جن سے ظاہر ہوتا ہو کہ انہیں کھولنے کے لیے کوئی تدبیر کی گئی ہو۔ ٹوٹے ہوئے دروازے اور کھڑکیوں کا محدب عدسہ سے معائنہ کیا گیا اور وہاں کوئی مشتبہ نشان نہیں ملا۔ جن لوگوں نے دروازہ توڑنے کی کوشش کی، ان کا کہنا ہے کہ وہ اندر سے بند تھا اور اس میں ایک بڑی چٹخنی لگی ہوئی تھی۔ مزید یہ کہ جیروم صرف دس منٹ میں واپس آ گیا تھا اور قدموں کے نشانات سے پتا چلتا ہے کہ اس نے آنے جانے کے لیے دوڑ نہیں لگائی۔ اتنے کم وقت میں یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ کیپٹن پر حملہ کر سکتا پھر یہ کہ اس کے اپنے جسم پر کوئی معمولی خراش بھی نہیں آئی۔''

پولیس آفیسر کے بنائے ہوئے خاکوں کا دوبارہ معائنہ کرنے کے بعد ڈاکٹر ٹوئسٹ نے کہا۔ ''مجھے یہ جان لینا چاہیے کہ تم نے ہر زاویے کا بغور معائنہ کیا ہے اور تمہارے خاکوں سے بہت کچھ معلوم ہو رہا ہے لیکن ایک بات بتاؤ۔ کیا اس شے کا بھی تمہاری تفتیش سے کوئی تعلق ہے؟''

''ہاں، یہ ان کتابوں میں سے ایک ہے جو کتابوں کی الماری کے نیچے پڑی ہوئی تھیں۔''

''تم نے اسی کتاب کا خاکہ کیوں بنایا؟''

''میں نہیں جانتا۔ بعض معاملات میں میرا ردِعمل فطری ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ وہاں ہونے والی جدوجہد کی علامت ہے اور اس کا رنگ بھی میری توجہ کا سبب بن گیا۔''

''میرا خیال ہے کہ یہ زرد رنگ ہے۔''

پولیس آفیسر چونکتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں کیسے معلوم ہوا۔ یہ تو پنسل سے بنا ہوا سیاہ اور سفید خاکہ ہے۔''

''کتاب کے عنوان سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے۔ ''دا کنگ از ییلو۔''

''کیا اس عنوان کی کوئی اہمیت ہے؟''

''تمہارے سوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم نے کبھی اس کتاب کا نام نہیں سنا جو کہ سمجھ میں آتا ہے۔ کیونکہ فرانس میں بہت کم لوگ اس کے بارے میں جانتے ہیں۔ تمہارے خاکے میں یہ واضح نہیں کہ یہی اصل مصنف رابرٹ چیمبرز ہے اور یہ بات بہت اہم ہے۔''

''میں سمجھا نہیں۔'' پولیس افسر نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

''کیا یہ کتاب اب بھی تمہارے پاس ہے؟''

''مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم اس کے بارے میں پوچھو گے۔ تمہاری طرح میرے ایک ساتھی کو بھی کتابیں پڑھنے کا شوق ہے۔ وہ مجھ سے مانگ کر لے گیا تھا۔ لیکن اب وہ مجھے کبھی واپس نہیں ملے گی کیونکہ اس نے دریا میں کود کر خودکشی کر لی۔ اس کی لاش ایک درخت کی شاخوں میں پھنسی ہوئی ملی۔ گزشتہ ماہ اس کی بیوی ایک ٹرین حادثے میں چل بسی تھی۔ اس کے بعد سے وہ بہت مایوس اور دل برداشتہ رہنے لگا تھا۔

''کیا تم نے کتاب اور آلۂ قتل کے خاکوں میں کوئی مماثلت دیکھی؟ خنجر کے دستے اور کتاب کے سرورق پر ایک ہی نشان نظر آ رہا ہے گو کہ تمہارے خاکے بہت زیادہ واضح نہیں ہیں لیکن تم ان میں مشابہت دیکھ سکتے ہو جیسے کوئی عجیب الخلقت سمندری مخلوق کا سر۔''

پولیس آفیسر بولنگر نے جب غور سے دونوں خاکوں کا موازنہ کیا تو اسے شرمندگی محسوس ہونے لگی۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ ''واقعی میں نے اس پر غور نہیں کیا۔ جیسا کہ میں نے بتایا کہ خاکے بنانے سے مجھے اپنے کام پر توجہ مرکوز کرنے میں مدد ملتی ہے اور میں سوچے سمجھے بغیر یہ کام کرتا ہوں۔''

''اس کا سہرا بھی تمہارے سر ہے اور اس سے تمہاری غیر جانبدار گواہی ظاہر ہوتی ہے۔ کتاب کی حالت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بالکل نئی ہے گو کہ اس کی حالت قابلِ رحم ہے۔ اس کے چاروں کونے مڑے ہوئے ہیں اور سرورق پر ایک گہری سلوٹ ہے۔''

''میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ مجھے اسی حالت میں ملی تھی لیکن اس بات کا ہماری تحقیقات سے کیا تعلق ہے؟''

ڈاکٹر نے کچھ سوچتے ہوئے سر ہلایا پھر مضبوط لہجے میں بولا۔ ''اس پر میں بعد میں بات کروں گا، پہلے تم مجھے تمام مشتبہ لوگوں کی شخصیت اور مقتول کے ساتھ ان کے تعلق کے بارے میں بتاؤ۔''

''بالکل۔ میں خود ہی بتانے والا تھا۔ سب سے پہلے میں مقتول کیپٹن مارک سانترے کی بات کروں گا جس نے جنگ عظیم میں حصہ لیا اور بم کا گولہ لگنے سے زخمی ہو گیا۔ ڈاکٹروں نے اس کی ٹانگ تو بچا لی لیکن وہ لنگڑا ہو گیا۔ اس کے علاوہ اس کا اعصابی نظام بھی متاثر ہوا تھا جس کی وجہ سے وہ طویل عرصہ تک زیرِ علاج رہا۔ جب وہ چار سال پہلے یہاں آیا تو وہ مکمل طور پر صحت یاب ہو چکا تھا لیکن اس کی لنگڑاہٹ باقی تھی۔ اس نے اپنے باپ کے چھوڑے ہوئے مکان میں رہائش اختیار کی اور علاقے کے لوگوں نے کالج سے متصل لائبریری میں اس کے لیے جز وقتی ملازمت کا

انتظام کر دیا۔ اسی کالج میں اگاتھی میلیٹ بھی کام کرتی تھی۔

وہ دونوں دوست بن گئے۔ یہاں تک کہ ان کے درمیان شادی کی بات ہونے لگی۔ لیکن گزشتہ چند ماہ سے کسی نے انہیں ایک ساتھ نہیں دیکھا۔ سانترے پیچھے ہٹ گیا۔ یہاں تک کہ اس نے اپنی جزوقتی ملازمت بھی ترک کر دی۔ ایسا لگتا تھا کہ جنگ کے مابعد اثرات ایک بار پھر اس پر حاوی ہو گئے۔ وہ اپنے آپ کو کٹہرے میں کھڑا ہوا محسوس کرتا اور اسے ہر طرف دشمن نظر آتے۔ بالخصوص حکومت اور بینکوں میں، جن کے بارے میں اسے یقین تھا کہ یہی تمام جنگوں کے ذمے دار ہیں۔ وہ مکمل طور پر پاگل تو نہیں ہوا لیکن بہکی بہکی باتیں کرنے لگا تھا البتہ ڈاکٹر برنارڈ اور راسکن سے اس کی دوستی برقرار تھی۔ نشہ کرنے کے بعد وہ اکثر غصے میں آجاتا لیکن کبھی کسی نے اسے مکمل طور پر نشے میں دھت نہیں دیکھا۔

''اسے ہر جگہ دشمن نظر آتے تھے؟'' ڈاکٹر ٹوئسٹ نے پوچھا۔

''ہاں ایسے دشمن جنہیں صرف وہی دیکھ سکتا تھا۔''

''تو تمہارا کہنا ہے کہ اسے بے رحمی سے قتل کیا گیا۔''

''شاید تم کسی رینگنے والے جانور کے بارے میں سوچ رہے ہو؟'' پولیس آفیسر نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

''حقیقت تو یہ ہے کہ میرے ذہن میں ایسا ہی خیال آیا تھا۔''

''اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ ہمیں برف پر کسی کے قدموں کے نشان نظر نہیں آئے لیکن میں نہیں سمجھتا کہ افسرانِ بالا اس حل کو قبول کرلیں گے۔''

''شاید برطانوی پولیس بھی اسے تسلیم نہیں کرے گی۔ اور جب بھی انہوں نے بلایا تو مجھے معقول وضاحت دینا ہو گی۔''

''ٹھیک ہے۔ اب میں آگے بڑھتا ہوں۔ ڈینئل راسکن قدیم اشیا کا تاجر ہے۔ وہ ایک ہوشیار کاروباری شخص ہے اور پیرس میں ایک گیلری کے علاوہ اس قصبے میں بھی اس کی دکان ہے۔ اس کے سانترے سے اچھے تعلقات تھے جس سے وہ باقاعدگی سے ملتا تھا۔ ان کے درمیان کسی اختلاف کا اشارہ نہیں ملا۔ اس کے برعکس وہ دونوں قدیم تہذیب میں دلچسپی لیتے تھے۔ سانترے پرانے کوبین آرٹ کا ماہر تھا۔ راسکن کے کہنے کے مطابق جب وقوعہ کے روز سہ پہر میں سانترے نے اسے فون کیا تو وہ تھوڑا سا چڑچڑا ہو رہا تھا جو کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ اس لیے اس نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی اور شام کی محفل کے لیے خریداری کرنے باہر چلا گیا۔ اس کی واپسی تین بجے ہوئی۔''

''کیا تم نے اس سے خنجر کے بارے میں پوچھا تھا؟''

''بالکل گو کہ اس نے واضح طور پر اعتراف نہیں کیا لیکن لگتا تھا کہ اسے اپنے دوست کے بچھڑنے سے زیادہ قیمتی خنجر کے نقصان کی پریشانی ہے۔ میں نے بھی اپنے طور پر اندازہ لگایا وہ واقعی بہت قیمتی خنجر ہے۔''

''ڈاکٹر برنارڈ کے بارے میں کیا کہو گے؟''

''اس نے زندگی کا بڑا حصہ لوگوں کا علاج کرتے ہوئے گزارا ہے اور اس کی ساکھ بہت اچھی ہے۔ سانترے اس کا مستقل مریض تھا اور ان کے آپس میں بہت اچھے تعلقات تھے۔ دونوں ہر اتوار کو ملا کرتے تھے۔ جس دن سانترے کی موت واقع ہوئی۔ ڈاکٹر برنارڈ محفل شروع ہونے تک مریضوں کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ ڈاکٹر ہوتے ہوئے بھی روحوں پر یقین رکھتا ہے۔''

''کیوں نہیں؟ شرلاک ہومز کا خالق ایک ڈاکٹر ہونے کے باوجود روحانیت پر یقین رکھتا تھا۔''

''بہرحال جہاں تک ڈاکٹر برنارڈ کا تعلق ہے تو مجھے ایسی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ وہ سانترے کو قتل کرسکتا ہے۔ اب میں مچل کے بارے میں کچھ کہنا چاہوں گا۔ یہ خوب صورت لڑکی اپنے باپ سے بالکل نہیں ملتی۔ وہ جیروم سے شادی کرنا چاہتی تھی لیکن راسکن اس کے حق میں نہیں تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ کسی اور معزز شخص کو اپنا داماد بنانا چاہ رہا تھا لیکن وہ کھل کر جیروم کی مخالفت نہیں کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا منفی نتیجہ برآمد ہوسکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جیروم ایک مثالیت پسند اور بے پروا شخص ہونے کی وجہ سے راسکن کے معیار پر پورا نہیں اترتا تھا۔ وہ اپنے چچا سے بہت محبت کرتا تھا۔ اس لیے میں نہیں سمجھتا کہ اس قتل میں اس کا کوئی ہاتھ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ چچا کی موت کے بعد وہی اس کے ترکہ کا واحد وارث ہے۔''

''کیا وہ اپنے چچا کے ساتھ رہ رہا تھا؟''

''نہیں، وہ قصبے میں اپنے دوست کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔ جس دن یہ واقعہ پیش آیا وہ دونوں گھومنے گئے ہوئے تھے۔ وہ سہ پہر میں واپس آیا اور اس کے پاس بمشکل اتنا وقت تھا کہ وہ محفل میں جانے کے لیے لباس تبدیل کرسکے۔ جہاں تک مچل کا تعلق ہے وہ پورے دن گھر سے باہر نہیں گئی اور تین بجے سے لے کر لاش دریافت ہونے تک وہ اپنے باپ کے ساتھ ہی رہی۔''

البتہ اس نے سانترے کے بارے میں ایک عجیب

بات بتائی۔ اس نے محسوس کیا کہ کچھ دنوں سے وہ اسے عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کی وضاحت نہیں کرسکی بس اتنا کہا کہ سانترے بدل گیا ہے۔ اس کی تصدیق اگاتھی میلیٹ نے بھی کی کیونکہ سانترے نے اچانک ہی اس کے ساتھ تعلقات منقطع کر لیے تھے۔

''کیا درمیان میں کوئی اور عورت آگئی تھی؟''

''میلیٹ کا کہنا ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ سب لوگ ان کے تعلقات کے بارے میں جانتے ہیں۔ ہم نے بھی اپنی طرف سے معلومات کی ہیں جن کے مطابق وہ تنہائی پسند ہوگیا تھا۔''

''میں سمجھ سکتا ہوں کہ وہ کافی پریشان ہوگی۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے لیکن وہ ان عورتوں میں سے نہیں جو اپنا دل ہاتھوں میں لیے پھرتی ہیں۔ اس کے مطابق سانترے کسی برائی کے زیرِاثر تھا جس کا ذمے دار وہ اس کی کتابوں کو قرار دیتی ہے۔ وہ عام کہانیوں کے بجائے سازشی اور سیاسی جوڑتوڑ کے قصے پڑھنے لگا تھا۔''

''اب میں تم سے ایک آخری سوال پوچھوں گا۔ گواہوں کے کہنے کے مطابق جب سانترے کی لاش دریافت ہوئی تو اس کا ٹیلی فون کام نہیں کررہا تھا۔ کیا کسی نے معلوم کیا کہ ایسا کیوں ہوا؟''

''نہیں لیکن اگلے روز وہ دوبارہ کام کرنے لگا۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے، ایسے موسم میں اس طرح کی خرابیاں ہوتی رہتی ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ تم کن خطوط پر سوچ رہے ہو۔ یہی کہ قاتل کوئی کرتب باز تھا جو ٹیلی فون کے تار کے ذریعے مکان میں اترا اور اسی طرح واپس چلا گیا۔''

''بالکل نہیں۔''

''کیونکہ ٹیلی فون کا تار کسی انسان کا بوجھ برداشت نہیں کرسکتا۔ بہرحال میں نے تمہیں اس جرم کے بارے میں تمام معلوم حقائق بتا دیے ہیں۔ میں نے اپنی پوری ملازمت میں ایسا پیچیدہ کیس نہیں دیکھا۔''

''یہ سچ ہے کہ تم نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے لیکن ایسا کوئی جرم نہیں جو نا قابلِ تشریح ہو۔''

''میں تمہاری بات نہیں سمجھ سکا۔'' پولیس آفیسر بولا۔ ''شاید یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ تم نے یہ کیس حل کرلیا ہے۔''

''سب کچھ آئینے کی طرح شفاف ہے جس کی وجہ تمہارا غیر معمولی مشاہدہ ہے۔ تم نے مجھے تمام ضروری تفصیلات فراہم کردی ہیں اور میں آسان زبان میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ اس کی قاتل یہ تھی......''

یہ کہہ کر ڈاکٹر ٹوئسٹ نے زرد کتاب کا خاکہ فضا میں لہرایا۔ ''یہ کتاب دا کنگ ان ییلو'' گزشتہ صدی کے آخر میں رابرٹ چیمبر نے لکھی تھی۔ یہ مختصر کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں سے ایک کہانی اسٹیج ڈرامے کی شکل میں اسی نام سے پیش کی گئی تھی جس میں ہر کردار دوسرے ایکٹ کے آخر میں مرجاتا ہے۔ چیمبر خود اتنا محتاط تھا کہ اس نے اس دیو مالائی ڈرامے کا متن فراہم نہیں کیا لیکن دوسرے مصنفین نے ایسی کوشش کی جس کی وجہ سے میں اس کتاب کی اہمیت سمجھ گیا جس پر کسی دوسرے مصنف کا نام ہے۔''

''یعنی یہ ایک لعنتی ڈراما تھا۔''

''میں یہ بھی بتادوں کہ چیمبر کا نام اکثر امریکی مصنف لوکرافٹ کے ساتھ جوڑا گیا جو اپنی مافوق الفطرت تخلیقات کی وجہ سے پہچانا جاتا تھا۔''

''میں سمجھ گیا۔ سانترے نے یہ سارا مواد اپنے ذہن میں بٹھالیا جس کا اس کی نازک طبیعت پر بُرا اثر پڑا۔''

''یہ کتاب اس کا واضح ثبوت ہے جو بدقسمتی سے گم ہو گئی لیکن اس خاکے سے بھی بہت کچھ معلوم ہورہا ہے اور اس سے اس پیچیدہ مسئلے کا حل ظاہر ہورہا ہے۔''

پولیس آفیسر نے وہ خاکہ اٹھایا اور اسے غور سے دیکھنے لگا۔ ''مجھے تو اس میں کچھ نظر نہیں آرہا۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ ''سوائے سرورق اور اس کی خراب حالت کے......''

''اسی سے پتا چلتا ہے۔ کیا تم نے کبھی کوئی کتاب اس حالت میں دیکھی ہے؟ اگر کوئی کتاب بوسیدہ، پھٹی ہوئی، مڑی تڑی ہوئی ہو تو وہ قابلِ افسوس ہے لیکن اس کے چاروں کونے مڑے ہوئے ہیں جو کہ میں نے کبھی دیکھے اور نہ سنے...... یا تو ایسا جان بوجھ کر کیا گیا ہے یا پھر اس طرح ہوا جیسا میں سوچ رہا ہوں۔''

''مجھے بالکل اندازہ نہیں کہ تم کس بارے میں بات کررہے ہو۔ تمہارے خیال میں کیا ہوا ہوگا؟''

ڈاکٹر ٹوئسٹ نے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ ''ایک گھناؤنے شخص نے اپنے ناپسندیدہ شخص سے جان چھڑانے کے لیے اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھایا۔ یہی اس معمے کی چابی ہے۔ جس کی بنیاد لوگوں پر مختلف باتوں کا اثر ہے۔ تم نے خود تسلیم کیا کہ جب میں نے تمہارے دماغ میں رینگنے والے جانوروں کی بات بٹھائی تو تمہیں ہر طرف چھپکلیاں نظر آنے لگیں۔ اسی طرح جب کیپٹن سانترے نے مافوق الفطرت کہانیاں پڑھنا شروع کیں تو اسے بھی عجیب الخلقت مخلوقات نظر آنے لگیں جس سے اس کی ذہنی کیفیت کا

رنگارنگ سلسلوں اور دلکش تحریروں کا مرقع دسمبر 2017 کا پُرلطف شمارہ

ماہنامہ **پاکیزہ** کراچی

معروف رائٹر **حیا بخاری** کا خوب صورت ناولٹ...... **محبت لفظ ہے لیکن**......

بنت سحر کا دلگداز ناولٹ...... **جو دھڑکا وہ دل تھا**......

متنوع تحریر نگار **سدرۃ المنتہیٰ** کا...... دل پزیر ناول...... **تیری چاہ سے**

معروف افسانہ نگار اور آج کی

مصروف ترین ڈراما نگار **سیما مناف**

کی ہماری بزم میں خوشگوار آمد......

غزالہ عزیز کے قلم کے جوہر...... **بدلتے رشتے**...... ناولٹ کی صورت......

”آپ کی کوئی نادانی یا حماقت جس پر آج بھی ہنسی آتی ہو“ **شائستہ زرین** کا کھلکھلاتا **سروے** آپ کی خوش ذوقی کی نذر

طیبہ عنصر مغل، بشریٰ سیال، شمائلہ دلعباد، ہالہ احمد،
غزالہ جلیل راؤ، ہما بیگ، عقیلہ حق و دیگر مایہ ناز رائٹرز کی پُرحیرت کہانیاں

اس کے علاوہ

متاثر کن مستقل سلسلے، مستند معلومات اور دلنواز شاعری کے ساتھ، ساتھ خوش ذائقہ پکوان اور حسن کی آرائش کے آزمودہ نسخے صرف آپ جیسے پُرذوق قارئین کے لیے......

اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اسی طرح راسکن کی بیٹی بھی یہی سمجھتی رہی کہ خنجر اس روز سہ پہر تک الماری میں موجود تھا جبکہ یہ بالکل غلط ہے کیونکہ کئی روز پہلے اس کے باپ نے اسے عاریتاً اپنے دوست کیپٹن سانترے کو دے دیا تھا کیونکہ اسے یقین تھا کہ وہ اس خنجر کے ذریعے شیطانی قوتوں کا مقابلہ کر سکتا ہے۔''

''ایک منٹ۔'' بولنگر نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم یہ کہہ رہے ہو کہ راسکن ہی وہ مکروہ قاتل ہے؟''

''ایسا ہی ہے۔ تم نے بھی اس پر شبہ ظاہر کیا تھا اور اس سے مجھے صحیح سمت میں جانے کا اشارہ ملا۔ لیکن یہ پہلے سے سوچا سمجھا قتل نہیں تھا۔ بظاہر اس نے اپنے دوست کو وہ خنجر دیا۔ یہ جانتے ہوئے کہ وہ پاگل پن کی حدوں کو چھو رہا ہے۔ اس مرحلے پر مجھے اپنے تجربے سے بھی مدد ملی کیونکہ میں ماضی میں بھی اس طرح کے جرم سے نمٹ چکا ہوں۔''

''اب ہم اس کتاب کی بات کرتے ہیں جو سیڑھیوں کے پاس پڑی ہوئی ملی تھی اور اسے کتابوں کی الماری سے نکالا گیا تھا۔ مارک سانترے جس کے قدم لنگڑاہٹ کی وجہ سے ڈگمگاتے تھے۔ وہ بالائی منزل سے اتر رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں کتاب اور دوسرے ہاتھ میں خنجر تھا۔ وہ پہلی سیڑھی پر لڑکھڑایا اور لڑھکتا ہوا نیچے آن گرا۔ اس کے ساتھ ہی خنجر کی نوک اس کے پیٹ میں اتر گئی اور اس کے جسم پر خراشیں آئیں، کتاب اس کے پیچھے جا گری۔ گوکہ اس کے زخم میں شدید تکلیف ہو رہی تھی لیکن ابھی اس میں اتنی طاقت تھی کہ وہ خنجر باہر نکال سکے۔ اس نے صورتِ حال کو محسوس کرتے ہوئے اپنے دوست راسکن کو فون کیا اور یہی اس کی بھیانک غلطی تھی۔ راسکن نے پورا واقعہ سننے کے بعد اسے یقین دلایا کہ وہ ہر طرح اس کی مدد کرے گا لیکن اس کے بجائے وہ روحوں کی محفل کے انتظامات کی غرض سے بازار چلا گیا اور سانترے کی فون لائن منقطع کر دی تاکہ وہ کسی اور سے رابطہ نہ کر سکے اور دو تین گھنٹوں میں اس کی موت واقع ہو جائے گی۔

راسکن کو سانترے سے کوئی پرخاش نہیں تھی لیکن اس نے سوچا کہ اس کے بھتیجے سے جان چھڑانے کا یہ اچھا موقع ہے جس نے اس کی بیٹی کے دل پر قبضہ کیا ہوا ہے۔ گول میز کے گرد ہونے والی روحوں کی محفل جسے وہ اپنے پاؤں سے کنٹرول کرتا تھا۔ جیروم کو کارروائی کرنے پر مجبور کر دے گی۔ اس کا منصوبہ کامیاب رہا اور جیروم اپنے چچا کی خیریت معلوم کرنے چلا گیا۔ تمہیں یاد ہے کہ جب چپل نے اس کے ساتھ جانے کے لیے کہا تو راسکن نے اسے سختی سے منع کر دیا اور وہیں ٹھہرنے کی ہدایت کی۔

اس کا منصوبہ یہ تھا کہ جیروم زور آزمائی کر کے مکان کا دروازہ توڑے اور لاش کو دریافت کرنے والا پہلا شخص کہلائے۔ ان حالات میں اس کا قوی امکان تھا کہ اس پر قتل کا الزام عائد ہو جائے۔ اگر ایسا نہ ہو تب بھی اس پر کئی جانب سے شک کیا جائے گا اور اس طرح وہ اپنی بیٹی کو بہ آسانی اس سے بدظن کر سکے گا۔ لیکن جیروم دروازہ توڑنے کی ہمت نہ کر سکا اور واپس آ گیا۔ اس کے بعد سب لوگ وہاں گئے اور انہوں نے دروازہ توڑا تو انہیں وہاں سانترے کی لاش نظر آئی۔ راسکن سے یہی ایک غلطی سرزد ہوئی۔''

تاہم ڈاکٹر برنارڈ کے اعلان کرنے پر کہ سانترے کی کچھ دیر قبل موت واقع ہو چکی ہے۔ اس نے سکون کا سانس لیا۔ گوکہ جیروم کہہ چکا تھا کہ وہ پہلے چکر میں مکان کے اندر نہیں گیا لیکن اسی پر قتل کا شبہ ظاہر کیا جا رہا تھا۔ راسکن جانتا تھا کہ خنجر کے دستے پر مقتول کی انگلیوں کے نشان ہوں گے۔ اس واردات کو قتل کا رنگ دینے کے لیے ضروری تھا کہ یہ نشانات صاف کر دیے جائیں۔ جب سب لوگ مکان کی تلاشی میں مصروف تھے تو اسے موقع مل گیا اور اس نے یہ نشانات صاف کر دیے۔ اگلے دن فون لائن بھی بحال ہو گئی۔''

ایک طویل خاموشی کے بعد بولنگر بولا۔ ''یہ سب ناقابلِ یقین لگتا ہے۔ تم نے ایک گھنٹے میں کرسی پر بیٹھے بیٹھے یہ معاملہ حل کر دیا جس نے دو ہفتوں سے میری نیندیں اڑا رکھی تھیں۔''

''اس کے لیے میں تمہارے خاکوں اور غیر معمولی قوتِ مشاہدہ کا شکر گزار ہوں۔''

''تم نے یہ کیوں کہا کہ راسکن نے خنجر کا ہینڈل صاف کر کے غلطی کی؟ میں سمجھتا ہوں کہ اس نے دستانے استعمال کیے ہوں گے جو اس نے بعد میں کہیں پھینک دیے۔''

''بالکل لیکن اگر تم اس سے وہ دستانے مانگو گے تو وہ نہیں دے سکے گا پھر تمہیں چاہیے کہ اس کے کوٹ کی جیبوں کی تلاشی لو، جہاں اس نے یہ دستانے رکھے ہوئے ہیں۔ ان پر مرنے والے کے خون کے دھبے بھی ہوں گے خواہ وہ کتنے ہی مدھم کیوں نہ ہوں۔ تم نے اس کی کفایت شعاری کا جو نقشہ کھینچا ہے، اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس کوٹ کو کبھی نہیں پھینکے گا۔''

ترپ چال

عمران قریشی

راتوں رات دولت مند بننے کے خواب ہر ایک کی آنکھوں میں بسے ہوتے ہیں... وہ بھی کم وقت میں دولت مند بننا چاہتا تھا... اس نے نہایت چالاکی سے اپنا ہنر آزمایا تھا... خاص جگہوں پر پھندا لگائے وہ نئے نئے شکار پھانسنے کے لیے چوکس تھا...

تجسس سے بھرپور چونکا دینے والے انجام سے مزین ایک چال باز کی چال بازیاں......

چوہدری ہاشم نے سامنے بیٹھے مسافر کے چہرے کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ لیمپ کی زرد روشنی میں وہ کچھ زیادہ نہیں دیکھ پایا۔ تاہم شکل وصورت کے غیر واضح نقوش کے باوجود پڑھا لکھا اور سادہ شخصیت کا مالک دکھائی دیتا تھا۔ وہ سفید کرتے اور دھوتی میں ملبوس تھا۔ چوہدری نے مسافر سے پوچھا۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟''

مسافر نے بتایا۔ ''عبیداللہ...... دوست یار بیدو کے نام سے مخاطب کرتے ہیں۔ چک پینتالیس سے آپ سے ملاقات کے لیے آیا ہوں۔ یقیناً آپ مجھے ناامید نہیں کریں گے۔''

چوہدری ہاشم بولا۔ ''میں ان توہماتی اور جاہلانہ باتوں پر اعتبار نہیں کرتا۔ تم اپنا وقت ضائع کررہے ہو۔''

بیدو سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''کبیروالا کے چوہدری کرم داد اور فیض آباد کے چوہدری فضل الحق ان واقعات کے چشم دید گواہ ہیں۔ آپ ان سے رابطہ کرسکتے ہیں۔ چوہدری فضل الحق کا لڑکا چند ماہ قبل دشمنوں کے ہاتھوں ہلاک ہوا تھا۔ ہمارے علاج کی بدولت وہ آج اپنے گھر میں خوش حال زندگی بسر کررہا ہے۔ چوہدری کرم داد کا لڑکا حادثے کی نذر ہوا۔ وہ بھی ہمارے علاج کے بعد روبصحت ہوا۔''

''اگر تمہاری کہی ہوئی باتوں پر اعتبار کرلیا جائے تو حادثاتی اموات کا سلسلہ تو تقریباً ختم ہوکر رہ جائے گا۔ میں پوچھ سکتا ہوں، تمہارا طریقۂ علاج کیا ہے؟''

''یہ بتانا ممکن نہیں۔ ہمیں اپنے مطالبے سے مطلب ہے اور آپ کو لڑکے سے ہونا چاہیے۔ فضول باتوں میں اپنا وقت ضائع نہ کیجیے۔ کل صبح کبیروالا اور فیض آباد کا دورہ کیجیے۔ وہاں بچے بچے کی زبان پر ہمارے علاج کے چرچے پائے جاتے ہیں۔''

چوہدری ہاشم نے سوالیہ لہجے میں پوچھا۔ ''تمہارا مطالبہ کیا ہے؟''

بیدو کرسی کو چھوڑتے ہوئے بولا۔ ''اس کے متعلق بات چیت بعد میں ہوگی۔ اس وقت آپ کا مطمئن ہونا نہایت ضروری ہے۔ تاہم چوہدری کرم داد اور فضل الحق سے ملاقات کے بعد آپ کو معلوم ہوجائے گا کہ مطالبہ کیا ہے؟''

وہ جواب سنے بغیر باغ سے باہر نکل گیا۔ نوکر نے کھانا میز پر لگانا شروع کردیا۔ یہ حویلی کے پچھواڑے میں واقع باغ تھا۔ چوہدری کا زیادہ وقت یہیں گزرتا تھا۔ تاہم جب سے اس کے لڑکے نورالٰہی کا انتقال ہوا تھا تب سے اس نے ہر قسم کی مصروفیات میں دلچسپی لینا ترک کردیا تھا۔ نورالٰہی پچھلے ماہ کار ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہوا تھا۔ اس کا چہرہ اور جسم بری طرح مسخ ہوکر رہ گیا تھا۔ اگر وہ اس کی اکلوتی اولاد نہ ہوتا تب اسے اتنا غم نہیں ہوتا۔ لیکن وہ نہایت منتوں اور مرادوں کے بعد پیدا ہوا تھا۔ پیدائش کے دوران چوہدری کی بیوی کا انتقال ہوگیا تھا۔ لڑکے کی حادثاتی موت نے اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا اور اس نے اپنے آپ کو حویلی تک محدود کردیا تھا۔ کھانا لگانے کے بعد نوکر واپس چلا گیا اور وہ خاموشی کے ساتھ کھانا تناول کرنے لگا۔ چند عرصہ قبل اسے اڑتی ہوئی خبریں موصول ہوئی تھیں کہ کبیروالا کے چوہدری کا لڑکا دوبارہ زندہ ہوگیا تھا لیکن اس نے اس خبر کو اس لیے نظرانداز کردیا تھا کہ گاؤں میں آدھی سے زیادہ خبروں کی تشہیر جھوٹ پر مبنی ہوتی تھی۔ بات چیت کو ٹائم پاس کے لیے اپنے مطلب کے مطابق ترتیب دینا ان کی گھٹی میں شامل ہوتا ہے لیکن اب بیدو کی آمد کے بعد اس نے دوسرے دن فیض آباد اور کبیروالا جانے کا پکا تہیہ کرلیا تھا۔

فیض آباد کے چوہدری فضل الحق سے چوہدری ہاشم کے دیرینہ تعلقات تھے۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ اس نے لڑکے کی صحت یابی کی خبر کو چوہدری ہاشم سے پوشیدہ رکھا تھا۔ اس کے متعلق جب اس نے دوسرے دن فضل الحق سے دریافت کیا تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''کیا تم اس بات پر یقین کروگے کہ ایک مرا ہوا وجود دوبارہ زندہ ہوسکتا ہے۔ اگر سچ پوچھو تو اب تک میں بھی شش و پنج میں مبتلا ہوں۔ میں نے اس کے زندہ ہونے کے بعد ہر طرح سے اپنا اطمینان کرنے کی کوشش کی۔ اس کے بچپن کی متعدد باتیں ایسی تھیں جن کے متعلق اس کے اور میرے سوا اور کوئی نہیں جانتا تھا۔ وہ اسے بخوبی یاد تھیں۔ حتیٰ کہ اس کے ہاتھوں کے نشانات بھی میرے پاس محفوظ تھے۔ انہوں نے بھی اس بات کی تصدیق کردی کہ وہ واقعی میرا بیٹا عبدالحق ہے لیکن مجھے یقین نہیں کہ وہ عبدالحق ہے۔''

''علاج کے بعد وہ تمہیں کہاں سے ملا؟''

''اپنی قبر کے پاس کفن میں ملبوس لیٹا ہوا تھا۔ وقتِ فجر سے کچھ پہلے کا تھا۔ قبرستان سنسان پڑا تھا۔ میں نے اسے گاڑی میں منتقل کیا اور حویلی میں لے آیا۔ وہ سانس لے رہا تھا۔ تاہم ہوش و حواس سے بیگانہ تھا۔'' چوہدری فضل الحق خاموش ہوگیا۔

''علاج کے بعد مجرموں نے تم سے تگڑی رقم کا مطالبہ کیا ہوگا۔ یقیناً رقم کروڑوں میں ہوگی۔''

فضل الحق نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ''مطالبہ کروڑوں پر مشتمل نہیں تھا۔ مجھے زمینوں اور جائداد سے ہاتھ دھونا پڑے۔''

''عبدالحق کے علاج کے بعد تم نے اس کی قبر کو کھود کر چیک کیا۔ وہاں مردہ موجود تھا یا نہیں؟''

فضل الحق نے پریشان لہجے میں بتایا۔ ''میں نے

اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ تاہم قبر ضرور کھدی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔''

چوہدری ہاشم نے فضل الحق کے لڑکے عبدالحق سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ فضل الحق اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد عبدالحق کے ساتھ وہ کمرے میں داخل ہوا۔ چوہدری نے لڑکے کے سراپا... کا جائزہ لیا۔ عمر پچیس سے تیس کے درمیان تھی۔ وہ سفید شلوار قمیص میں ملبوس تھا۔ چوہدری ہاشم کو سلام کرنے کے بعد وہ سامنے رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد چوہدری ہاشم نے پوچھا۔

''مجھے تفصیل کے ساتھ بتاؤ۔ معاملہ کیوں اور کیسے پیش آیا۔ یقیناً تمہیں اس کے متعلق بہت کچھ معلوم ہوگا۔''

عبدالحق انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں کچھ زیادہ نہیں جانتا ہوں۔ مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ شیروں والے چوہدری کے آدمیوں نے اچانک ہی مجھے گھیرے میں لے لیا۔ میں نے دفاع کی بھی کوشش کی۔ لیکن تعداد میں زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ مجھ پر حاوی ہوتے چلے گئے۔ ان کی رائفلیں بے تحاشا گولیاں اگل رہی تھیں۔ پھر ان میں سے ایک نے رائفل کا پچھلا حصہ میرے سر پر رسید کیا اور میں بے ہوش ہو کر زمین پر گر گیا۔ دوبارہ جب آنکھ کھلی تو میں نے اپنے آپ کو حویلی کے دالان میں لیٹے ہوئے پایا۔''

''تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ شیروں والے چوہدری کے آدمی تھے۔ کیا وہ چہرہ چھپائے ہوئے نہیں تھے؟''

''بے شک ان کے چہرے نقابوں کے پیچھے پوشیدہ تھے۔ لیکن میں ان کی رائفلوں کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ وہ شیر دلی والے چوہدری کے ہی آدمی تھے۔''

چوہدری ہاشم نے فضل الحق سے پوچھا۔ ''شیروں والا چوہدری کون ہے؟ اور اس کے ساتھ تمہاری کیا دشمنی ہے؟''

فضل الحق نے بتایا۔ ''چوہدری بشیر جسے عرف عام میں شیروں والا چوہدری کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اس کے ایرے پر شیر ہر وقت بندھے رہتے ہیں۔ اس کی زمینیں ہماری زمینوں سے متصل ہیں۔ پانی کے بٹوارے پر میرے اور اس کے آدمیوں کے درمیان جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں۔ دو سال قبل ان جھڑپوں کے دوران اس کا لڑکا میرے آدمیوں کے ہاتھوں غیر ارادی طور پر ہلاک ہو گیا تب سے ہم نے زمینوں کے گرد باڑھ لگا کر حدود بندی کر دی۔ چوہدری بشیر کے آدمی تب سے عبدالحق کی تاک میں تھے۔ انہوں نے عبدالحق کو ہماری زمینوں کے پاس گھیر کر ہلاک کیا۔''

چوہدری نے پوچھا۔ ''علاج کے بعد عبدالحق کے جسم پر گولیوں کے نشان تھے۔''

فضل الحق نے انکار میں سر ہلایا اور چوہدری ہاشم اٹھ کر اپنی جیپ کی طرف چلا آیا۔ معاملہ ناقابلِ فہم تھا۔ انسانی وجود ہفتے بھر کے دوران مٹی میں ملنا شروع ہو جاتا ہے۔ ایسے علاج کے ذریعے مکمل کرنے والی بات قابلِ ہضم نہیں تھی۔ عبدالحق کے چہرے پر پلاسٹک سرجری کے اثرات بھی دکھائی نہیں دیتے تھے۔ خدوخال قدرتی تھے۔ سازش کی گہرائی کا اندازہ معاملے کی شروعات کے دوران لگانا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے اس نے سوچنے کے سلسلے کو ترک کر کے اپنی نگاہیں سڑک پر مرکوز کر دیں۔ فیض آباد سے کبیر والا کا فاصلہ گھنٹے سے کچھ زیادہ کا تھا۔ چوہدری کرم داد سے اس کی واقفیت صرف نام کی حد تک محدود تھی۔ مہمان خانے میں بیٹھنے کے بعد اس نے جب بچے کے متعلق دریافت کیا تو کرم داد افسردہ لہجے میں بولا۔

''میری تمام زندگی کی محنت پر پانی پھر گیا۔ یہ جائداد اور زمینیں میں نے بچے کے لیے بنائی تھیں۔ اس کی زندگی پر نچھاور کر دیں۔''

''کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ تمہاری اولاد ہے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ سرجری کے ذریعے اس کے چہرے کو تمہارے بچے کے چہرے سے مشابہ کر دیا گیا ہو۔''

کرم داد انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں اپنا اطمینان کر چکا ہوں۔ اس کے لیے مجھے زیادہ کوشش نہیں کرنی پڑی۔ میرے لڑکے عبداللہ کی ہارٹ سرجری ایک سال قبل ہوئی تھی۔ جسم پر ٹانکوں کے نشان اب بھی ہیں۔ اس کے علاوہ اس کے سیدھے ہاتھ کی ایک انگلی اضافی تھی۔ وہ بھی چھوٹی انگلی کے ساتھ موجود ہے۔''

''پچھلے ماہ میرا لڑکا بھی ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہوا ہے۔ کل رات چک پینتالیس کے عبداللہ نے میرے ساتھ رابطہ کیا اور اس نے یقین دہانی کروائی کہ وہ میرے لڑکے کو دوبارہ زندہ کر سکتا ہے اور مجھے معلومات کے لیے تمہارا اور فضل الحق کا نام بتایا تاکہ میں اطمینان کر سکوں۔'' چوہدری ہاشم بولا۔

کرم داد اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''وہ واقعی ایسا کر سکتا ہے۔ میرے لڑکے عبداللہ کا علاج اس نے بخوبی کیا۔ کار ایکسیڈنٹ کے دوران اس کی ہڈی پسلی ایک ہو کر رہ گئی تھی۔ بعد ازاں مجھے اپنی قبر کے پاس نہ صرف زندہ

حالت میں ملا بلکہ جسم بھی مکمل طور پر صحت مند تھا۔‘‘
’’ایکسیڈنٹ کے بعد اس کے چہرے کی کیفیت کیا تھی؟‘‘

کرم داد کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔’’بس مت پوچھیے۔ چہرہ مکمل طور پر کچومر بن کر رہ گیا تھا۔ اسے پہچاننا ممکن نہیں تھا۔ تاہم کپڑوں اور چند مختلف نشانیوں کی بدولت ہمیں جاننے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ عبداللہ ہی ہے۔‘‘

’’کیا تم نے اس کی اضافی انگلی کو چیک کیا تھا؟‘‘
کرم داد نے انکار میں سر ہلایا۔’’اس کے ہاتھ پاؤں اس قابل نہیں تھے کہ انگلی کو شناخت کیا جاسکتا۔‘‘
چوہدری ہاشم کے ماتھے پر سوچ کی لکیریں نمودار ہوئیں۔ اب تک ملنے والی دونوں لاشوں کے چہروں کو تباہ کر کے رکھ دیا گیا تھا تا کہ انہیں شناخت نہ کیا جاسکے۔ یعنی یہ کہنا ممکن نہیں تھا کہ وہ واقعی ان گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے جن سے انہیں تشبیہ دی جارہی تھی۔ بہرحال کبیر والا کے چوہدری سے قابلِ قدر معلومات حاصل نہیں ہو پائی تھیں۔ چوہدری ہاشم مصافحہ کرنے کے بعد جیپ کی طرف آ گیا۔ اس نے جیپ کا رخ چک پینتالیس کی طرف موڑ دیا۔ اسے سمجھنے میں دشواری پیش آرہی تھی کہ یکلخت چوہدریوں کے بچوں کا دشمن کون پیدا ہو گیا تھا۔ زمین داروں اور مزارعوں کے درمیان ظلم ونفرت کا سلسلہ ازل سے چلتا آرہا تھا۔ یہ سب اس نفرت کا شاخسانہ ہوسکتا تھا۔ سوچنے کی بات تو یہ تھی کہ اگر دشمنی کی بدولت بچوں کو قتل کرنا مقصود تھا تب انہیں دوبارہ زندہ کیونکر کیا جاتا تھا۔ بچوں کو واپس حاصل کرنے کے لیے کسی بھی زمیندار کا اپنی زمینوں سے دستبردار ہونا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ لیکن دستبرداری سے قبل اعتماد کا ہونا ضروری تھا۔ کوئی بھی زمین دار آنکھیں بند کر کے زمینوں سے محروم ہونے کے لیے تیار نہیں ہوسکتا تھا۔ یقیناً اس تمام معاملے کے درمیان کوئی تیسرا آدمی موجود تھا۔ جسے چوہدریوں کو مطمئن کرنے کے لیے ڈمی کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ وہ متاثرہ خاندان کو اس بات کا یقین دلاتا تھا کہ مجرم کسی بھی انسان کو زندہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ فضل الحق سے اس کی دیرینہ شناسائی تھی لیکن کرم داد کی شخصیت مشکوک تھی۔ اسے نہ صرف مجرم کے وجود پر اعتماد تھا بلکہ وہ اس کی حیثیت سے مطمئن بھی تھا۔ علاوہ ازیں بیدو کو اٹھوا کر اپنے ڈیرے پر منتقل کرنا کسی بھی چوہدری کے لیے مشکل نہیں تھا۔ وہ ایسا کر کے اپنی زمینیں دوبارہ حاصل کر سکتے تھے۔ کوئی ایسی مجبوری ضرور تھی جس کی وجہ سے انہوں نے ایسا نہیں کیا تھا۔ یہ وہ چند نکات تھے جو دورانِ ڈرائیونگ اس کے دماغ میں بگولے کی طرح گردش کرتے رہے۔ لیکن وہ توجیہہ تلاش کرنے سے قاصر رہا۔ بہرکیف چک پینتالیس مختصر اور خشک زمینوں پر مشتمل گاؤں تھا۔ اسے بیدو کا گھر تلاش کرنے میں چنداں دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ دروازے پر دستک دینے پر دروازہ اسی نے کھولا۔ چوہدری کو سامنے کھڑا دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے ایک طرف ہٹتے ہوئے اس کے اندر آنے کے لیے راستہ دے دیا، پھر بولا۔
’’مجھے یقین تھا کہ آپ دونوں چوہدریوں سے ملاقات کے بعد چک پینتالیس ضرور آئیں گے۔ حالانکہ میری اور آپ کی ملاقات کا فائدہ کچھ نہیں۔ پھر بھی آپ کے اطمینان کے لیے یہ ضروری ہے۔‘‘
چوہدری نے کمرے میں قدم رکھ دیا۔ کمرا دیہاتی طرز کے مطابق چارپائی، پرچھتی اور چند برتنوں پر مشتمل تھا۔ بیدو نے اسے چارپائی پر بیٹھنے کے لیے کہا اور خود زمین پر بیٹھ گیا۔
چوہدری نے کمرے کا طائرانہ نگاہوں سے جائزہ لیتے ہوئے نخوت بھرے لہجے میں کہا۔’’چوہدری فضل الحق اور کرم داد کی جائداد کا مالک بننے کے بعد بھی تمہاری مالی حیثیت پر رتی برابر فرق نہیں پڑا۔ شاید درپردہ تمہارے پیچھے تیسرا ہاتھ کارفرما ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ دونوں چوہدریوں میں سے کوئی ایک ہو۔‘‘
بیدو مسکراتے ہوئے بولا۔’’آپ کی غلط فہمی ہے۔ میرے پیچھے کسی کا ہاتھ نہیں۔ رہی مالی حالت میں تبدیلی کی بات...... تو اتنی جائداد کے ساتھ یکدم منظرعام پر آنا پولیس کو شک میں مبتلا کرنے کے لیے کافی ہوگا۔ چوہدری فضل الحق اور کرم داد کی جائدادوں کو میں فروخت کر چکا ہوں۔ حالات مناسب ہونے کے بعد نئے سرے سے زمینوں کا تعین کر کے انہیں خریدوں گا۔ تا کہ نوآموز زمیں داروں کے طور پر اپنے آپ کو سامنے لا سکوں۔‘‘
چوہدری نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔’’مردوں کو زندہ کرنے کا کام اس کچے کمرے میں کرتے ہو یا پھر اس کے نیچے کوئی لیبارٹری پوشیدہ ہے۔‘‘
بیدو نے زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ ’’میں جو کچھ کر رہا ہوں، اس کے لیے کسی مطب یا لیبارٹری کی ضرورت نہیں۔ مجھے علاج کے لیے صرف متاثرہ وجود

درکار ہوتا ہے۔''

''اور اگر میں گجن سنگھ جانے کے بعد لڑکے کی قبر کو کھود کر مردے کو حویلی میں منتقل کردوں۔ ایسی صورت میں تمہارا لائحہ عمل کیا ہوگا؟''

بیدو نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔ ''میں پہلے ہی ایسا کرچکا ہوں۔ نورالٰہی کا لاشہ علاج کے کافی مراحل سے گزر چکا ہے۔ آپ ٹھہریے میں آپ کو اس کی ویڈیو دکھاتا ہوں۔'' وہ اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب کمرے میں داخل ہوا تو اس نے ہاتھوں میں ٹی وی اور وی سی آر پکڑا ہوا تھا۔ اس نے انہیں زمین پر رکھ دیا اور تار کو دروازے کے پاس لگے ہوئے پلگ میں لگا دیا۔ وی سی آر میں کیسٹ لگی ہوئی تھی۔ ٹی وی پر چند جھما کے ہوئے اور پھر ایک اندھیرے کمرے کا منظر اسکرین پر ابھرا۔ کمرے میں روشنی محدود تھی اور مختصر روشنی بستر پر لیٹے ہوئے وجود کا محاصرہ کیے ہوئے تھی۔ بستر پر نورالٰہی کفن اوڑھے لیٹا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور چہرہ خون کی کمی کی بدولت زرد ہو رہا تھا۔ بستر کے پیچھے بیدو کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں مائک تھا۔ کیمرے کے آن ہوتے ہی بولا۔

''چوہدری صاحب آپ یقیناً کفن میں پوشیدہ اپنے لڑکے کے مردہ جسم کو دیکھ رہے ہوں گے۔ ہم اسے قبر سے نکال کر یہاں لے آئے ہیں۔ اس کا علاج شروع ہو چکا ہے۔ میں کفن ہٹا کر آپ کو دکھاتا ہوں۔ اس نے نورالٰہی کے جسم سے کفن ہٹا دیا۔ چوہدری ہاشم کو اپنا سانس حلق میں اٹکتا ہوا محسوس ہوا۔ جسم بے داغ تھا۔ اسے وہ وقت اچھی طرح یاد تھا جب اس نے نورالٰہی کے خون آلود جسم کو ہاتھوں میں لے کر تابوت کے اندر منتقل کیا تھا۔ اس کے جسم کی تمام ہڈیاں ٹوٹ کر چکنا چور ہوگئی تھیں۔ ایکسیڈنٹ کے دوران اس کی گاڑی کھائی میں جا گری تھی۔ گجن سنگھ کے لوگوں نے بمشکل تمام دروازے کو کاٹ کر اسے باہر نکالا تھا لیکن ویڈیو میں نہ صرف اس کا چہرہ مکمل تھا بلکہ جسم پر زخم بھی نہیں تھا۔ تاہم حرکت مفقود ہونے کی وجہ سے یہ کہنا ممکن نہیں تھا کہ وہ زندہ ہے یا مردہ۔ بیدو کی آواز سنائی دی۔

''یہ ابھی تک سانس لینے کے قابل نہیں ہے۔ لیکن جلد سانس لینے کے قابل ہو جائے گا۔ اس کے لیے ہمیں آپ کی جائداد کی ضرورت ہے۔ اگر آپ نے ہمارا مطالبہ ماننے سے انکار کیا تو نورالٰہی کی لاش کو دوبارہ قبر میں منتقل کر دیا جائے گا۔'' کیسٹ ختم ہوگئی۔ بیدو نے ٹی وی بند کر دیا۔

عطاء الحق قاسمی کی تصنیف "وصیت نامے" سے انتخاب

پیر صاحب ہتھوڑا شریف کا وصیت نامہ

پیارے بیٹے، ایک بات ہمیشہ یاد رکھو اور وہ یہ کہ ہم صرف پیر نہیں بلکہ روحانی اور دنیاوی طاقت کے سارے سرچشمے ہمارے قبضے میں ہیں یعنی ہم پیر بھی ہیں، سیاست داں بھی ہیں، حکمران بھی ہیں، اس کے علاوہ جاگیریں انگریز کے وقت سے ہمیں ملی ہوئی ہیں۔ یوں اللہ کا دیا سب کچھ ہمارے پاس ہے بینک بیلنس ہے، ڈھور ڈنگر ہیں، مرید ہیں۔ ان سب نعمتوں کی قدر کرو خصوصاً مریدوں کا خاص خیال رکھو کہ ہماری ساری شان و شوکت ان کے دم سے ہے، اگر وہ تمہارے ہاتھ چومنا چاہیں تو کسی بخل سے کام نہ لو۔ اگر تم اس وقت دوستوں سے مصروف گفتگو ہو تو بھی انہیں مایوس نہ کرو بلکہ اپنا بایاں ہاتھ ان کی طرف بڑھا دو، وہ ہاتھ چومتے رہیں! تم باتیں کرتے رہو۔ ایسے مواقع پر تم انہیں لائن بنانے کے لیے کہو، وہ لائن میں آئیں اور ایک ایک کرکے ہاتھ چومتے جائیں، ان کے جانے کے بعد جیب سے ٹشو پیپر نکال کر ہاتھ کو اچھی طرح صاف کرلیا کرو اور گھر پہنچتے ہی ڈیٹول سے ہاتھ دھونا بھی نہ بھولو۔ مریدوں کا اظہارِ عقیدت اپنی جگہ اور حفظانِ صحت کے اصول اپنی جگہ، دونوں کو کبھی گڈمڈ نہ کرو!

فلم دیکھنے کے بعد چوہدری کی دماغی کیفیت میں زلزلے جیسا ارتعاش پیدا ہوگیا تھا۔ یقیناً کچھ ایسی ہی کیفیت سے دوچار اس وقت دونوں چوہدری رہے ہوں گے جب انہوں نے کفن میں پوشیدہ اپنے لڑکوں کی مووی کو دیکھا ہوگا۔ وہ دونوں بھی چوہدری ہاشم کی طرح تقریباً مفلوج ہوکر رہ گئے ہوں گے اور اپنی جائدادوں کو بیدو کے نام منتقل کرنے کے لیے فوراً رضامند ہوگئے ہوں گے۔

بیدو بول رہا تھا۔ ''معاہدے کے مطابق ہامی بھرنے کے بعد آپ کو تمام جائداد میرے نام منتقل کرنی ہوگی۔ معاہدے کی تکمیل کے دوسرے دن فجر سے قبل آپ کو نورالٰہی کا جیتا جاگتا وجود اس کی قبر کے پاس سے مل جائے گا۔ اس بات کو ذہن نشین کرلیجیے کہ اگر آپ نے اپنے آدمیوں کے ذریعے مجھ پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کی تو چک پینتالیس کا ہر فرد میری پشت پناہی کے لیے تیار ہو سکتا ہے۔ آپ کو اس کا اندازہ کمرے سے باہر نکلنے کے بعد بخوبی ہو جائے گا۔'' بیدو نے بات کے اختتام پر اٹھ کر کمرے کا دروازہ کھول دیا اور چوہدری باہر نکل آیا۔ اس کی جیپ کے پاس چک کے تمام مرد ہاتھوں میں رائفلیں تھامے بت بنے

کھڑے تھے۔ چوہدری نے جیپ میں بیٹھنے کے بعد اسے اسٹارٹ کیا تو بیدو کھڑکی میں سے سر اندر کرتے ہوئے سرد لہجے میں بولا۔

''آپ کی حویلی کی نگرانی پر کچھ بندوں کو مامور کر دیا گیا ہے۔ حویلی کا فون بھی ریکارڈ کیا جا رہا ہے۔ اگر پولیس کو معاملے میں ملوث کرنے کی کوشش کی گئی تو آپ اپنے بچے کی زندگی سے محروم ہو جائیں گے۔''

چوہدری ہاشم نے جھٹکے کے ساتھ جیپ آگے بڑھا دی۔

☆☆☆

اگلے دو دنوں کے دوران اس نے اپنی تمام جائداد بیدو کے نام منتقل کر دی اور پھر اس کے کہنے کے مطابق جیپ میں بیٹھا قبرستان کی طرف جا رہا تھا۔ صبح کے پونے پانچ بجنے والے تھے۔ گاؤں میں ہو کا عالم طاری تھا۔ لیکن قبرستان کا ماحول کتوں کے بھونکنے کی آوازوں سے گونج رہا تھا۔ بیدو کے آدمی واقعی حویلی کی نگرانی پر مامور تھے۔ اس لیے وہ قانونی کارروائی سے قاصر رہا تھا لیکن دل میں پکا تہیہ کر چکا تھا کہ نور الٰہی کے ملنے کے فوراً بعد چک پینتالیس پر دھاوا بول دے گا۔ بیدو کو اٹھوا کر زبردستی جائداد کے کاغذات واپس حاصل کرنا اس کے لیے قطعاً مشکل نہیں تھا۔ قبرستان گاؤں سے کچھ ہٹ کر کھیتوں کے درمیان واقع تھا۔ جب اس نے قبرستان میں داخل ہونے کے بعد نور الٰہی کی قبر کا رخ کیا۔ اسے دور ہی سے کفن میں ملفوف وجود قبر کے پاس لیٹا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے طائرانہ نگاہ قبرستان کے ماحول پر ڈالی۔ اردگرد کوئی نہیں تھا۔ آوارہ کتے دور کھڑے بھونک رہے تھے۔ چوہدری نے جیپ کا دروازہ کھولا اور عجلت کے عالم میں نیچے اتر کر نور الٰہی کی طرف آگیا۔ اس کا چہرہ کفن میں لپٹا ہوا تھا۔ چوہدری نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کفن کھولا۔ تب نور الٰہی کا سانس لیتا ہوا چہرہ نمودار ہو گیا۔ چوہدری نے خوشی سے مغلوب ہوتے ہوئے نور الٰہی کو ہاتھوں میں اٹھا لیا۔ اس کا وزن کم ہو کر آدھا رہ گیا تھا اس لیے اسے دقت محسوس نہیں ہوئی۔ لڑکے کو جیپ میں ڈال کر وہ حویلی میں آگیا۔ نوکر چاکر صحن سے متصل اپنے کمروں میں خوابِ خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے۔ چوہدری نے نور الٰہی کو آرام گاہ میں منتقل کیا اور ڈاکٹر جبار کو فون کرنے لگا۔ وہ حویلی کا مستقل ڈاکٹر تھا۔ اس کی رہائش لچھن سنگھ ڈسپنسری کے پچھواڑے میں واقع تھی۔ اتنی صبح سویرے اس کے فون اٹھانے کی توقع نہیں تھی لیکن تیسری بیل پر اس نے غیر متوقع طور پر کال ریسیو کر لی۔ چوہدری نے اسے حویلی آنے کے لیے کہا اور ریسیور کریڈل پر رکھنے کے بعد واپس نور الٰہی کے پاس آگیا۔ اس نے کفن اتار کر لڑکے کو سلیپنگ گاؤن پہنایا پھر اسے ہوش میں لانے کی تدابیر میں مصروف ہو گیا لیکن مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ ڈاکٹر جبار کو حویلی آنے میں آدھا گھنٹا لگا۔ اس نے صبح سویرے کال کر کے حویلی بلانے کی وجہ دریافت کی۔ تب چوہدری نے اسے حالات سے آگاہی کے بعد نور الٰہی کا معائنہ کرنے کے لیے کہا۔ ڈاکٹر جبار نے نور الٰہی کا چیک اپ کرنے کے بعد اسے بتایا۔

''اسے بے ہوشی کا انجکشن دیا گیا ہے۔ انجکشن کا اثر ختم ہونے کے بعد خود ہی ہوش میں آجائے گا۔''

چوہدری نے پوچھا۔ ''اسے کب بے ہوش کیا گیا ہے اور اس کے چہرے کی پیلاہٹ نالی کے ذریعے خوراک دینے کی مرہونِ منت ہے یا وجہ کچھ اور ہے؟''

''یہاں کچھ کہنا ممکن نہیں۔ اس کو شہر لے جانا ہوگا۔ وہاں تفصیلی چیک اپ کے بعد سب کچھ سامنے آجائے گا۔''

چوہدری نے اثبات میں سر ہلایا اور ناشتا کرنے کے بعد دونوں شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔ سینٹرل اسپتال میں ڈاکٹر جبار کی واقفیت تھی۔ نور الٰہی کو وارڈ میں منتقل کر دیا گیا۔ کچھ فراغت نصیب ہوئی تو چوہدری معلوماتی کاؤنٹر کی طرف چلا آیا۔ اس نے فون پر اپنے آدمیوں سے رابطہ کیا اور انہیں بیدو کو اغوا کر کے خفیہ مقام پر منتقل کرنے کی ہدایات دینے کے بعد جلد اسے مطلع کرنے کے لیے کہا پھر اسپتال کا فون نمبر انہیں لکھوا دیا۔ ایک گھنٹے کے انتظار کے بعد اطلاع موصول ہوئی کہ بیدو بیرونِ ملک روانہ ہو گیا ہے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس نے کون سے ملک کا انتخاب کیا ہے۔ چوہدری نے اپنے آدمیوں کو کچہری جا کر اس آدمی کے متعلق معلوم کرنے کے لیے کہا جس کے ہاتھ بیدو نے چوہدریوں کی جائدادیں فروخت کی تھیں۔ بات کے اختتام پر اس نے ریسیور نیچے رکھا اور وارڈ میں آگیا۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر جبار نے اسے بتایا کہ نور الٰہی کا چیک اپ مکمل ہو گیا ہے اور اس خدشے کی تصدیق ہو چکی ہے کہ اسے کافی دنوں تک بے ہوشی کی حالت میں نالی کے ذریعے خوراک دی جاتی رہی ہے۔ وہ اس وقت ہوش میں ہے اور اسے خون دینے کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔

چوہدری نے پوچھا۔ ''اس کی دماغی کیفیت کیسی ہے؟''

''وہ کافی حد تک بہتر ہے۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔
''اور آپ کے سوالوں کا جواب بہ احسن وخوبی دینے کے قابل ہے۔''

چوہدری لڑکے کے بیڈ کی طرف چلا آیا۔ وہ آنکھیں بند کیے ہوئے لیٹا تھا۔ چوہدری کے پکارنے پر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ پھر نقاہت بھرے لہجے میں بولا۔
''مجھے سر میں شدید درد محسوس ہو رہا ہے۔ میں واپس حویلی جانا چاہتا ہوں۔''

چوہدری نے اسے دلاسا دینے کے بعد پوچھا۔ ''مجھے حادثے کے متعلق تفصیل سے بتاؤ۔ تمہاری گاڑی کھائی سے نیچے کیسے گری تھی؟''

نورالٰہی نے بتایا۔ ''گجن سنگھ سے باہر نکلتے ہی بڑے دریا کے موڑ کے پاس سے اچانک ہی ٹرک نمودار ہوا۔ میں نے سائڈ سے بچ کر نکلنے کی کوشش کی لیکن ٹرک ڈرائیور نشے میں دھت تھا۔ اس نے ٹرک کو گاڑی پر چڑھا دیا۔ اس کے بعد مجھے کچھ معلوم نہیں۔ ہوش میں آنے کے بعد میری آنکھ اسپتال میں کھلی۔ چوہدری نے اسے آرام کرنے کی تلقین کی اور واپس معلوماتی کاؤنٹر کی طرف آگیا۔ پندرہ منٹ کے بعد اسے اپنے آدمیوں کی کال موصول ہوئی۔

انہوں نے بتایا کہ بیدو نے تمام زمینیں فیروز آباد کے چوہدری نثار کے ہاتھوں فروخت کی ہیں۔ چوہدری ہاشم کو اتنی جلدی جائدادوں کی خرید وفروخت پر حیرت محسوس ہوئی۔ اس کے آدمیوں نے اسے مزید بتایا کہ کچہری کے آدھے سے زیادہ ملازمین چوہدری نثار کے آدمی ہیں۔ اس کے باوجود بھی ایک دن میں کاغذات بننا ناممکن ہے۔ اس لیے بیدو رقم کی وصولی اور چیدہ چیدہ کاغذات پر دستخط کرنے کے بعد بیرون ملک روانہ ہوگیا ہے۔ باقی کا کام چوہدری نثار کے آدمیوں نے بخوبی سنبھال لیا ہے۔ چونکہ کاغذات اصلی ہیں اس لیے چوہدری نثار کے خلاف قانونی کارروائی نہیں ہوسکتی۔ چوہدری نے جھنجلائے ہوئے انداز میں ریسیور واپس رکھ دیا اور وارڈ میں آگیا۔

دوسرے دن شام کو چوہدری ہاشم کو بیدو کا فون موصول ہوا۔ اس نے چوہدری کو بتایا کہ وہ تینوں چوہدریوں کی جائدادوں سے فروخت ہونے والی رقم پر عیش کر رہا ہے اور اس کا ملک واپس آنے کا کوئی پروگرام نہیں ہے۔ تاہم اس نے صرف یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ درحقیقت معاملہ کیا ہے؟ سچ یہ ہے کہ معاملے میں کسی بھی لڑکے کی موت واقع نہیں ہوئی۔ پہلے سے ترتیب دیے ہوئے حادثات اصل لیکن بے ضرر تھے۔ ان حادثات کے دوران لڑکوں کو بے ہوشی کی صورت میں گاڑی سے نکال کر خفیہ مقامات پر منتقل کر دیا جاتا تھا۔ پھر پہلے سے حاصل شدہ لاوارث لاشوں کو اغوا کردہ لڑکوں کے کپڑے پہنا کر باقاعدہ حادثے کی شکل دی جاتی۔ اس سے قبل لاشوں کے چہروں کو تباہ کر دیا جاتا تھا تاکہ پہچان نہ ہوسکے۔ جب ورثا ان لاوارث لاشوں کو دفنا دیتے تب میں ان سے رابطہ کرنے کے بعد لڑکوں کو دوبارہ زندہ کرنے کا یقین دلاتا اور بدلے میں تمام جائداد اپنے نام منتقل کرنے کا مطالبہ کرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ صاف انکار کر دیتے تھے تب میں کفن میں ملبوس ان کے لڑکوں کی مووی انہیں ارسال کرتا تھا۔ اس مووی کو دیکھنے کے بعد انہیں شدید ذہنی دھچکا پہنچتا تھا اور وہ میرا مطالبہ ماننے کے لیے راضی ہو جاتے تھے۔ وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوا تو چوہدری ہاشم نے پوچھا۔
''تم جائدادوں کی فروخت سے حاصل کردہ رقم کو لے کر بیرونِ ملک کیسے گئے۔ یقیناً اپنے ہمراہ لے جانا ممکن نہیں۔''

بیدو قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے رقم ہمراہ لے جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ایک سال قبل میرے اور چوہدری نثار کے درمیان معاہدہ طے پایا تھا کہ اگر میں تین گاؤں کے چوہدریوں کی زمینیں اس کے نام منتقل کر دوں تو وہ نہ صرف مجھے بیرون ملک لگژری فلیٹ دلوائے گا بلکہ چلتے ہوئے ریسٹورنٹ کا انتظام بھی کر کے دے گا۔ اس نے کام کی تکمیل کے بعد ایسا بخوبی کیا۔ دراصل وہ ایک بے ضرر انسان ہے۔ اسے دوسرے زمیں داروں کی طرح صرف زمینوں میں اضافے کا شوق ہے۔ اس کے پاس دولت کی فراوانی تھی۔ میں نے اس کے پیسے کو استعمال کر کے چوہدری کرم داد، چوہدری فضل الحق اور آپ کی زمینیں اس کے نام منتقل کر دیں۔ اگر وہ زمینیں میں اپنے پاس رکھتا تو آپ اپنے آدمیوں کے ذریعے مجھے اٹھوا کر زبردستی زمینوں کے کاغذات حاصل کرنے کی کوشش کرتے لیکن چوہدری نثار کا آپ کچھ بھی بگاڑنے کے قابل نہیں ہیں۔'' چند لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ دوبارہ بولا۔
''میری تلاش میں بیرونِ ملک دربدر ہونے کی کوشش نہ کیجیے گا۔ مجھے یہاں کی حکومت کا مکمل تحفظ حاصل ہے۔'' لائن آف ہوگئی۔ چوہدری نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

ہم قدم

روبینہ رشید

جیسے جیسے وقت گزر رہا ہے... ہر شے میں نمایاں تبدیلیاں ہوتی جارہی ہیں... کائنات کی فطرت سے انسانی فطرت تک وہ تغیر و تبدل سامنے آرہا ہے... جو صاحبِ عالم و عاقل کے لیے مانندِ محوِ تماشا ہے... جیسے کہ سالوں سے سچ اور جھوٹ شانہ بہ شانہ مصروفِ سفر ہیں... سچ نے سیدھی اور چوڑی شاہراہیں اپنائیں جن پر وہ شاہانہ آن بان کے ساتھ چلتا رہا... جھوٹ کے قہقہے فضا میں گونجتے رہے لیکن سچ افسردہ افسردہ چلتا رہا... کیونکہ اب جہاں بھی جھوٹ کے قدم گئے، لوگ زیادہ مطمئن اور پُرسکون نظر آنے لگے... ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ملا کے جھوٹ بولتے رہے اور سچ سے نظریں چرانے لگے... جھوٹ بول کے زندگی زیادہ آسان اور خوش دلی سے گزرنے لگی... سچ کے ساتھ تو صعوبتیں جھیلنا پڑ رہی ہیں... فی زمانہ جھوٹ زیادہ ضروری اور سودمند ثابت ہو رہا ہے... سچائی اور فریبِ زمانہ کے تناظر میں لکھی گئی کہانی کے پیچ و خم...

کٹھن و دشوار گزار راستوں پر ہم قدم رہنے والے ساتھیوں کا پُر تجسس کھیل...... سرورق کی تیسری کہانی......

موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔
مسلسل تیزی سے حرکت کرتے وائپرز کے باوجود باہر کا منظر صاف نظر نہیں آرہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی بالٹیاں بھر کے پانی الٹ رہا ہو۔ صاف ستھری پختہ سڑک پر چھوٹی چھوٹی جھیلیں سی بن گئی تھیں جس کی وجہ سے رفتار تیز کرنا مزید خطرناک ہو گیا تھا۔

سارہ نے اسٹیئرنگ کو سختی سے تھاما ہوا تھا۔ ”بڑی غلطی ہوئی۔“ اس نے افسوس کے انداز میں گردن ہلائی۔ کیا تھا اگر وہ اپنی گاڑی لے آئی ہوتی مگر بابا کی یہ پرانی کار اسے اپنی نوجوانی کی یاد دلاتی تھی۔

’ان دنوں کی جب سب بہت اچھا تھا‘ وہ پھیکے سے انداز میں مسکرائی اور گردن پر ایک ہاتھ رکھ کر اسے دبایا۔ کندھے میں ابھرنے والے درد نے فوراً اسے اپنا ہاتھ ہٹانے پر مجبور کیا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے بے اختیار ہلکی سی کراہ نکل گئی۔ گزشتہ کچھ دنوں سے اس تکلیف زدہ کاندھے کے ساتھ وہ جو کر رہی تھی اگر اس کی خبر اس کی فزیوتھراپسٹ رخسانہ کو ہو جاتی تو شاید وہ اسے گولی ہی مار دیتی۔ روزانہ اتنے سارے سامان میں الجھنا، یادگار چیزوں کو ڈبوں میں بند کر کے ان میں حفاظت سے پہنچانا آسان کام نہیں تھا۔ خاص طور پر اس وقت جب ہر چیز سے کئی یادیں وابستہ ہوں۔

بابا اور اماں دونوں کو ہی شہر کے اس مہنگے گر مضافاتی علاقے میں بنے اپنے اس گھر سے بہت محبت تھی۔ انہوں

نے اپنی آدھی سے زیادہ عمر اسی گھر میں گزاری تھی۔ ان دونوں کو چیزیں جمع کرنے اور گھر سجانے کا شوق تھا۔ ان کی دو ہی بیٹیاں تھیں۔ ردا کی شادی اور سارہ کے اپنے کام کی وجہ سے شہر میں رہنے کے باوجود ان دونوں نے یہیں رہنا پسند کیا تھا۔

زندگی اللہ کی سب سے بڑی نعمتوں میں سے ایک ہے اور انسان کو شاید اس سے پیارا اور کچھ نہیں ہوتا کیونکہ تمام رشتے، تعلق اور سب ہی کچھ اسی کے دم سے ہوتے ہیں مگر اس سے زیادہ بے وفا بھی کچھ اور نہیں ہوتا۔

اماں اور بابا نے امریکا جاتے وقت خالہ خالو اور دوسرے دوستوں کے ساتھ اچھا وقت گزارنے اور سیر و سیاحت کے علاوہ شاید کچھ اور سوچا بھی نہیں ہوگا مگر کاتب تقدیر نے ان کے لیے کچھ اور ہی لکھ رکھا تھا۔

امریکا جانے کا فیصلہ دراصل نیویارک کی ایک مصروف سڑک پر ایک انجان تیز رفتار کار کی ٹکر سے ہونے والے حادثے کے ذریعے ان کی طے شدہ واپسی کا یکطرفہ ٹکٹ تھا۔ دونوں کے ایک ساتھ واپس نہ آنے والے سفر پر روانگی کے بعد ہفتوں تک تو ان دونوں بہنوں کو ان کے گھر کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی تھی۔ سارہ چھٹیوں پر ہونے کی وجہ سے وہیں رہ رہی تھی۔ ردا بھی ویک اینڈ پر اس کے پاس آجاتی مگر اب اس کی چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں۔ ردا کو مہینے کے آخر میں شہر سے باہر جانا تھا لہٰذا ان دونوں نے چند دن ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ آج اسے ایک ضروری کام کے چکر میں دفتر جانا پڑا تھا اور اب شام کے گہرے ہوتے سایوں کے ساتھ موسلا دھار بارش اس کا مزاج پوچھ رہی تھی۔

ایک زوردار آواز کے ساتھ تیز چمکتی بجلی نے اسے چونکا دیا۔ دور سڑک پر کچھ موجود تھا۔ پہلی نظر میں اسے وہ کوئی درخت لگا پھر...... مگر فاصلہ کم ہوتے ہی اسے پھر اپنی رائے کی تصحیح کرنا پڑی۔ سڑک کے بیچوں بیچ لاش پڑی ہوئی تھی۔

☆☆☆

سارہ نے گاڑی کا رخ قدرے دائیں جانب کرتے ہوئے پوری طاقت سے بریک دبایا۔ گاڑی نے کریچ کی آواز کے ساتھ ایک زبردست جھٹکا کھایا اور سڑک کی انتہائی جانب فٹ پاتھ نما جگہ کے قریب آکر رک گئی۔ اس جھٹکے نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔ خصوصاً اس کے بازو میں درد کی شدید لہر سی اٹھی تھی۔ وائپر اب بھی اسی تیز رفتار سے دائیں بائیں گھوم رہے تھے۔ وہ ایک لمحے کے لیے ان کے درمیان سے سڑک پر پڑی لاش کو گھورتی رہی پھر تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکلی۔ تیز برستی بارش نے اسے لمحے بھر میں نہلا دیا تھا۔ اپنے درد والے بازو کو دوسرے ہاتھ سے دبائے وہ زمین پر پڑی لاش کی جانب لپکی۔ وہ زمین پر الٹا پڑا ہوا تھا۔ پہلے تو اسے کچھ محسوس نہیں ہوا مگر پھر اس کی سانس چلتی محسوس ہوئی۔

سارہ نے گہری سانس لی۔ وہ زندہ تھا۔ اس نے اس شخص کا جائزہ لیا۔ وہ ایک لمبے قد و قامت اور کسرتی جسم کا مالک نظر آرہا تھا اس نے جینز اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی جو موسم کے لحاظ سے بالکل ناکافی تھی۔ اسے سڑک کے بیچوں بیچ اس طرح بے ہوش پڑے ہونے کی وجوہات کا علم تو نہیں تھا مگر یہ طے تھا کہ اگر وہ تیز بارش اور طوفانی ہواؤں میں اسی طرح پڑا رہا تو کسی بھی لمحے اس کی موت واقع ہوسکتی تھی۔

''اسے اس کی مدد کرنا تھی۔'' وہ کھڑی ہوئی اور دوڑتی ہوئی دوبارہ کار کے پاس آئی۔ اپنی سیٹ پر بیٹھ کر اس نے ڈیش بورڈ پر رکھے موبائل کو اٹھایا۔

''اووف......'' اسکرین کے کونے پر چمکتے نو سگنل کے نشان نے اسے لمحے بھر کے لیے بوکھلا دیا۔ شام کے اس پہر اور طوفانی بارش میں اس سڑک پر کسی دوسری گاڑی کا انتظار لاٹری کے ٹکٹ خریدنے جیسا ہی تھا۔ اس نے فون کو ڈیش بورڈ پر رکھتے ہوئے سوچا۔ 'اب تو جو کرنا ہے خود ہی کرنا ہے۔' ایک اچھے خاصے لمبے چوڑے بھاری بے ہوش وجود کو گھسیٹ کر گاڑی میں ڈالنا اس وقت اس کے لیے بھی کوئی آسان ہدف نہیں تھا۔ سارہ نے اپنے بازو کی طرف دیکھا پھر کندھے اچکا کر ایک گہری سانس لی اور دوبارہ گاڑی سے اتر گئی۔ پہلے اس نے پچھلی نشست کا دروازہ کھولا پھر سڑک پر پڑے بے حس و حرکت جسم کی طرف بڑھی۔ شام کا سرمئی پن موسم اور گہرے بادلوں کی وجہ سے رات کے اندھیرے سے تقریباً شکست کھا چکا تھا۔ اس شخص کے قریب پہنچ کر وہ جھکی، اس کے دونوں ہاتھوں کو کندھوں کے پاس سے مضبوطی سے تھاما اور دھیرے دھیرے گھسیٹتی ہوئی گاڑی کی طرف لے جانے لگی۔ گاڑی کی پچھلی نشست کے پاس پہنچ کر اس نے اسے بمشکل گاڑی میں چڑھایا۔ پھر گھوم کر دوسری جانب کا دروازہ کھولا اور اس جانب سے اسے اندر گھسیٹا۔ اس کے پیر اب بھی ایک طرف سے باہر تھے۔ سارہ اتنی دیر میں بری طرح ہانپ چکی تھی۔ اس طرف کا دروازہ احتیاط سے بند کر کے وہ دوسری طرف آئی۔ اس کے پیروں کو اندر موڑ کر بمشکل اس نے دروازہ بند کیا۔ اس کوشش میں اسے اس کو اندر دھکیلنا بھی پڑا تھا۔

اپنی سیٹ پر بیٹھ کر چند لمحے اسے خود کو سنبھالنے میں لگ گئے تھے۔ اس کے بازو کا درد بہت زیادہ بڑھ چکا تھا۔ بری طرح بھیگنے کی وجہ سے اسے سردی بھی لگ رہی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرے کو پونچھنا چاہا مگر اسے اپنے ہاتھوں میں عجیب سی چپچپاہٹ محسوس ہوئی۔

'بارش کا پانی ہاتھ گیلے تو کرسکتا ہے مگر یہ چپچپاہٹ۔'

اس نے حیران ہو کر سوچا اور کار کی اندرونی لائٹ آن کی۔ اپنے ہاتھوں پر نظر ڈالتے ہی وہ یک دم ساکت سی ہوگئی تھی۔ اس کے ہاتھ خون میں بھرے ہوئے تھے۔ اس نے پلٹ کر پچھلی سیٹ پر بے حس و حرکت وجود کی طرف دیکھا پھر تیر کے مانند گاڑی سے نکلی۔ پچھلا دروازہ کھولا، جس قدر ممکن ہوا اسے سیدھا کر کے اس کی قمیص کو ہٹایا اس کا شک بالکل درست نکلا تھا، اس کی بائیں پسلی کے نیچے ایک زخم موجود تھا۔ اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ گولی، زخم، قتل، جرم، ان سے وہ کتنا بھی دور بھاگے لیکن وہ اس کا پیچھا چھوڑنے والے نہیں تھے۔ اس زخم کو دیکھنے کے بعد وہ آنکھیں بند کر کے بتاسکتی تھی کہ یہ گولی لگ کر گزر جانے کا نشان تھا۔ وہ اپنی دس سال کی اسپیشل برانچ کی نوکری میں ایسے بہت سے زخم دیکھ چکی تھی اور کھا بھی چکی تھی۔ اس نے اپنے بازو پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے زخم پر گاڑی میں موجود موٹے دوپٹے کو باندھنے کے بعد اس نے کچھ سوچے بغیر اس کا چہرہ اپنی جانب گھمایا۔ حیرت کا تازہ جھٹکا پہلے سے کہیں زیادہ طاقتور تھا جو اسے کسی سونامی کے مانند اپنے ساتھ بہا کر لے گیا تھا۔

☆☆☆

یونیورسٹی کے امتحان ختم ہوچکے تھے۔ کرمنالوجی میں ماسٹرز کے بعد اس کا ارادہ ملک سے باہر جا کر اسپیشلائزیشن کرنا اور پھر واپس آکر اپنے ملک کی پولیس فورس کا حصہ بننے کا تھا۔ یونیورسٹی کے ہر سیمسٹر میں اس کے نمبر بہت اچھے آتے تھے مگر بہلول ہمیشہ اس سے ایک نمبر آگے رہتا۔ وہ کرمنالوجی ڈپارٹمنٹ کی پہچان تھا۔ قابل تو وہ خیر تھا ہی مگر اس کے ساتھ ساتھ بہترین مقرر، ٹینس کا شاندار کھلاڑی تھا۔ استادوں کا وہ لاڈلا اور چہیتا شاگرد تھا۔ سارہ اور وہ پہلے سیمسٹر سے اچھے دوست تھے۔ دونوں ہی پڑھائی میں بہت تیز تھے اور دونوں کے سامنے ایک روشن مستقبل تھا۔ بہلول اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کی والدہ فیشن ڈیزائنر تھیں اور والد ڈاکٹر...... سب کچھ بہت اچھا جارہا تھا کہ اچانک اس کے والد کا انتقال ہوگیا دیگر دوستوں کے ساتھ سارہ بھی تعزیت کے لیے اس کے گھر گئی تھی۔ وہ اس دن بہت بدلا بدلا سا لگ رہا تھا۔ سب نے اسے صدمے کا اثر ہی گردانا تھا مگر اس روز کے بعد سے ہی وہ پرانا بہلول نہیں رہا تھا۔ پھر وہ اچانک غائب ہوگیا۔ دوستوں کے حلقوں میں اکثر اس کے بارے میں قیاس آرائیاں ہوتی رہتیں

مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں گیا...... کچھ عرصے بعد سارہ لندن چلی گئی جس روز اس نے اپنی اسپشلائزیشن مکمل کی، اسے اس دن بہلول بہت یاد آیا تھا۔ واپس آکر اسے ملازمت مل گئی تھی۔ بابا نے اپنی دونوں بیٹیوں پر کبھی کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں لگائی تھی۔ مگر انہیں اس کی یہ ملازمت پسند نہیں تھی۔ ردا کے ایم بی بی ایس سے فراغت کے بعد اس کی اپنی پسند کے مطابق بابا کے ایک ایم پی اے دوست کے بیٹے سے جو خود بھی ڈاکٹر تھا بات پکی ہوگئی تھی جس کے بعد بابا اور اماں کا سارا فوکس سارہ کی شادی پر مرکوز ہوگیا تھا اس کے پاس بھی انکار کی کوئی وجہ نہیں تھی لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ شادی کے ذکر سے اسے ہمیشہ بہلول کی یاد آتی تھی۔

لندن سے واپسی کے بعد اسے معلوم ہوا تھا کہ بہلول اپنی والدہ کے انتقال پر چند دن کے لیے واپس آیا تھا مگر اس کے بعد وہ دوبارہ کہاں گیا، اس کی کسی کو کوئی خبر نہیں تھی۔

اچانک بجلی کی تیز کڑک گویا سارہ کو واپس حال کے فریم میں کھینچ لائی۔ اس نے بہلول کو کار میں موجود شال اوڑھائی اور اگلی نشست پر بیٹھ کر اگنیشن میں چابی گھمائی۔ اس کا ذہن بہلول میں الجھا ہوا تھا۔ آج اتنے برسوں بعد سے وہ مل گیا تھا۔ سڑک پر اس طرح بے ہوش اور زخمی حالت میں پڑا...... آخر اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟

''اسے کہاں جانا چاہیے؟'' سارہ نے سوچا، بہلول کو اسپتال لے جانے کے لیے اسے دوبارہ شہر کی طرف جانا تھا اور اس کے لیے اسے تیرہ کلومیٹر کا سفر کرنا تھا جبکہ موسم مزید خراب سے خراب ہوتا جارہا تھا اور بہلول کو فوراً گرم بستر اور دواؤں کی ضرورت تھی۔ اس نے چند لمحے سوچنے کے بعد گھر جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ وہاں پہنچنے کے بعد ضرورت پڑنے پر ایمبولینس منگوا سکتی تھی۔ فوری طبی امداد کے لیے ردا وہاں موجود ہی تھی۔

☆☆☆

وہ ایک شاندار بنگلا تھا۔

سیاہ لمبے گیٹ کو عبور کر کے لان اور برآمدے سے گزرتے ہوئے اندر داخل ہوں تو لمبی راہداری اور کمروں کے دروازے نظر آتے تھے۔ ہر دروازے کو کھولنے سے ایک پرتعیش اور پُرآسائش کمرے کا منظر نظر آتا۔ وہیں راہداری کے کونے پر موجود سجی سجائی اسٹڈی میں روز ڈوڈ سے بنی قیمتی اور مرصع میز کے ساتھ رکھی قیمتی کرسی پر وہ بیٹھا ہوا تھا۔

اس کی عمر چالیس پینتالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ صحت مند اور قدرے فربہ جسم، موٹے نقوش اور درمیانی قدوقامت کا مالک تھا۔ سر پر بال بالکل نہیں تھے۔ گول فریم کے چشمے سے جھانکتی اس کی آنکھوں میں اس وقت مکاری چھلک رہی تھی۔ اس وقت اس کے ہاتھ میں مہنگا موبائل فون تھا۔

''تم نے اپنا کام مکمل کرلیا ہے؟'' وہ دھیمی مگر سرد آواز میں بولا۔ جسامت کے مقابلے میں اس کی آواز قدرے پتلی سی تھی۔

''سر...... وہ ہمارے قبضے میں تھا...... مگر......'' دوسری جانب سے ہچکچاتے ہوئے کہا گیا۔

''کیا...... مگر......؟ کیا بکواس ہے یہ؟ اب کہاں ہے وہ؟'' وہ اس کی بات کاٹ کر زور سے بولا۔

''وہ ہمارے قبضے سے نکل بھاگا ہے۔''

''بھاگ گیا؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ کیا میں نے تم لوگوں کو منہ مانگی قیمت یہ سننے کے لیے دی تھی؟'' اس نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

''سر......''

''بکواس بند کرو اور کان کھول کر سنو، مجھے وہ چاہیے زندہ یا مردہ...... اس کے سوا کوئی اگر مگر سننا نہیں چاہتا میں......'' وہ دہاڑا۔

''جمشید اور شاہجہاں اس کے پیچھے ہیں، آپ بہت جلد اچھی خبر سنیں گے۔'' دوسری جانب سے کہا گیا۔

''میں انتظار کررہا ہوں۔'' اس نے یہ کہہ کر فون بند کردیا۔

اس کے ماتھے پر شکنیں سی پڑ گئی تھیں اور آنکھوں میں اضطراب کی لہریں نظر آرہی تھیں۔ اس نے چشمہ اتار کر میز پر رکھا اور چند لمحے کسی غیر مرئی چیز کو گھورتا رہا پھر وہ مسکرا دیا۔

☆☆☆

بارش، درد، ذہنی تناؤ...... ان تینوں کے ساتھ ڈرائیونگ آسان کام نہیں ہوتا، سارہ کو یہ پانچ کلومیٹر کا فاصلہ بہت طویل لگ رہا تھا۔ ہر چند لمحوں بعد وہ پلٹ کر بہلول کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا زخم خطرناک نہیں لگ رہا تھا پھر وہ اب تک بے ہوش کیوں تھا؟ یہ سوال اُسے پریشان کررہا تھا۔

گھر کے گیٹ پر پہنچ کر اس نے زور سے ہارن بجایا۔ وہ جانتی تھی کہ ردا اس کے انتظار میں ہوگی۔ وہ بہت جلد پریشان اور پھر ہائپر ہونے کی یوں بھی بہت ماہر تھی۔ اماں، بابا کے انتقال کے بعد سے اس کی اس صلاحیت میں

مزید اضافہ ہوگیا تھا۔ عام حالات میں بھی اگر اس کا شوہر اشرف یا سارہ کچھ دیر تک اس کا فون ریسیو نہیں کر پاتے تو وہ سارے جاننے والوں کو فون گھمانا شروع کر دیتی تھی پھر یہاں تو بارش، تاخیر، قدرے ویران سڑک اور پھر سگنلز کے نہ ہونے نے پورا گراؤنڈ بنا رکھا تھا۔

مراد خان نے دوسرے ہارن پر گیٹ کھول دیا۔ برساتی پہنے عمر کی پچاسویں دہائی کو عبور کرتا مراد خان ان کے بچپن سے اس گھر میں موجود تھا۔ بابا، اماں اور ان دونوں کے لیے اس کی حیثیت گھر کے کسی رکن سے کم نہیں تھی۔ وہ چوکیداری کے علاوہ گھر کے تمام چھوٹے بڑے کاموں کے لیے ون مین کی حیثیت رکھتا تھا۔ گیٹ کھلتے ہی سارہ تیزی سے گاڑی کو اندر لے آئی۔ پورچ میں پارکنگ کے بجائے اس نے برآمدے کے سامنے گاڑی کو روک لیا اور لپک کر نیچے اتری۔

''تم نے اتنی دیر کہاں لگا دی؟ تمہیں معلوم ہے نا کہ میں کس قدر پریشان ہو جاتی ہوں، ایک کال کر دیتیں......'' اس کی توقع کے مطابق ردا گویا برآمدے کے دروازے کے پاس ہی موجود تھی اور گاڑی کی آواز سنتے ہی باہر نکل آئی تھی۔

''ردا سگنل نہیں مل رہے تھے......'' اس نے جواب دیا۔

''ہاں...... تب ہی تو...... میں تم کو مسلسل فون کر رہی تھی مگر سگنل نہیں مل رہے تھے۔'' اس نے منہ بنایا۔ اس کے اس جواب پر سارہ نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھ کر ایک ابرو اچکایا اور پھر پچھلی نشست کا دروازہ کھولا۔

''یہ...... یہ کون ہے؟'' ردا کی نظر اب کھلے دروازے سے باہر آتے پیر پر پڑی۔ ''اللہ اللہ سارہ کہیں تم سے کوئی حادثہ تو نہیں ہوگیا...... میرا دل اسی لیے اتنا ہول رہا تھا۔ یہ تم کسے اٹھا لائی ہو......؟''

''ایک منٹ ردا......'' وہ مڑ کر بولی۔ ''کوئی حادثہ نہیں ہوا ہے میں ابھی تم کو ساری تفصیل بتاتی ہوں۔'' اتنی دیر میں مراد خان بھی گیٹ بند کر کے ان کے پاس آ پہنچا تھا۔

''مراد! اسے نکالنے میں اور اندر لے جانے میں مدد کیجیے۔'' وہ بولی۔

''تم ہٹ جاؤ۔'' ردا برآمدے سے اترتے ہوئے بولی۔ ''تمہارے اپنے بازو میں تکلیف ہے، میں مراد کی مدد کر دیتی ہوں۔ مگر اسے ہوا کیا ہے؟ اور یہ ہے کون......؟''

وہ ایک جانب سے بہلول کو تھامتے ہوئے مسلسل سوال کر رہی تھی۔

سارہ نے ہاتھ کے اشارے سے اسے صبر کرنے کو کہا۔ مراد خان اور ردا کی مدد سے بہلول کو گیسٹ روم تک پہنچا دیا تھا۔ مراد خان بابا کے کمرے سے ان کی شلوار قمیص لے آیا تھا۔

''مراد احتیاط کے ساتھ...... اسے چوٹ لگی ہوئی ہے۔'' سارہ مراد کو تنبیہ کرتے ہوئے ردا کو لے کر کمرے سے باہر آ گئی۔

''آخر یہ سب کیا ہے سارہ؟ اسے کیا چوٹ لگی ہے؟ اور تم اسے یہاں کیوں لائی ہو؟'' باہر نکلتے ہی ردا نے پوچھا۔

''میں سب بتاتی ہوں تمہیں......'' سارہ اس کا بازو پکڑ کر لاؤنج کی طرف جاتے ہوئے بولی۔

''رک جاؤ...... تم تو پوری بھیگی ہوئی ہو، پہلے جا کر کپڑے بدلو، کار میں بیٹھے بیٹھے تم اس قدر بھیگ کیسے گئیں؟'' ردا بولی۔

سارہ کپڑے بدل کر آئی تو ردا لاؤنج میں ٹہل رہی تھی۔ اس دوران وہ دو کپ کافی بنا چکی تھی۔ سارہ کو دیکھتے ہی اس نے کافی کا کپ اس کے ہاتھ میں تھمایا اور بولی۔

''سارہ کیا یہ کار کا حادثہ ہے؟ مجھے سچ سچ بتاؤ، کیا ہوا ہے؟ میں پریشان نہیں ہوں گی...... بولو۔''

''تم پہلے یہاں بیٹھو۔'' سارہ نے ہاتھ پکڑ کر اسے صوفے پر بٹھایا۔ ''اتنی پریشان مت ہو، یہ حادثہ نہیں ہے نہ ہی میں نے اسے ٹکر ماری ہے اور نہ ہی میں کسی پریشانی میں ہوں، یہ مجھے سڑک پر پڑا ہوا ملا ہے۔''

''کیا......؟ پھر تم اسے گھر کیوں اٹھا لائی ہو؟ ہے کون یہ......؟'' اس نے اسے گھور کر پوچھا۔

''ردا...... ردا یہ بہلول ہے۔'' سارہ نے دھیرے سے کہا۔

''وہ...... تمہارا کلاس فیلو جو شاید کہیں چلا گیا تھا؟'' ردا نے پوچھا۔

سارہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

''یہ تمہیں کہاں ملا؟ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم، یہ بے ہوش ہے، اس کی بائیں بغل کے نیچے ایک زخم موجود ہے جو میرا خیال ہے کہ گولی کا ہے...... مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے، تم اسے چیک کر لو، پھر اگر ضرورت ہوئی تو ہم ایمبولینس کو کال کریں گے۔''

''گولی کا زخم...... اور تم مجھے اب بتا رہی ہو؟'' ردا تیزی سے کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ''میں اپنا باکس لے کر آتی ہوں۔''

مراد خان اتنی دیر میں بہلول کا لباس بدل کر اس کے بال خشک کر چکا تھا۔

''ردا بٹیا! اس کا پیٹ میں اور بائیں گھٹنے میں چوٹیں ہیں۔'' ان کو اندر آتا دیکھ کر اس نے اپنی رپورٹ پیش کی۔ ''لگتا ہے کہ اس کا کسی سے جھگڑا مگوا بھی ہوا ہے کیونکہ ہلکی پھلکی خراشیں بھی ہیں۔''

''اس کو ہوش آیا تھا؟'' ردا اسٹیتھوا سکوپ کانوں میں لگاتے ہوئے اس کی طرف بڑھی۔

''ہلکا ہلکا سا آیا تھا پھر بے ہوش ہو گیا، ام کو لگ رہا ہے کہ اس کو نشہ وشہ کرایا گیا ہے ورنہ اتنی دیر میں تو ہوش آ جانا چاہیے تھا۔'' مراد خان کی تشخیص جاری تھی۔

''مراد آپ گرم پانی لے کر آئیں، ہمیں سب سے پہلے اس کی ڈریسنگ کرنا ہوگی۔'' ردا سنجیدگی سے بولی۔

''ردا یہ بے ہوش کیوں ہے؟'' سارہ نے پوچھا۔

''مراد خان کا خیال صحیح لگ رہا ہے، اسے یقیناً کوئی نشہ آور دوا دی گئی تھی۔''

''دی گئی تھی؟ یہ تم یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو؟''

''یہ دیکھو اس کے ہاتھ...... پیر......'' ردا نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

بہلول کے ہاتھوں اور پیروں پر رسی کے نشان نظر آ رہے تھے۔ ہاتھ کی پچھلی جانب ہلکے ہلکے کٹ اور خراشیں بھی تھیں۔ ''یوں لگ رہا ہے جیسے کسی نے اسے باندھ کر رکھا تھا اور اس نے کسی چاقو یا بلیڈ کی مدد سے خود ہاتھوں کی رسی کاٹی ہے جس کی وجہ سے یہ خراشیں آئی ہیں۔'' سارہ اس کا جائزہ لیتے ہوئے بڑبڑائی۔ ''اور غالباً فرار ہوتے ہوئے اس کو گولی ماری گئی ہے۔''

''ہاں...... یہ تو شکر ہے کہ گولی چھو کر نکل گئی ہے۔ پانی میں بھیگنے کی وجہ سے البتہ زخم میں انفیکشن کا خطرہ ہے۔ گھٹنے میں آنے والا یہ زخم شاید گرنے کی وجہ سے آیا ہے۔'' ردا نے کہا۔

تھوڑی دیر میں بہلول کی ڈریسنگ مکمل ہو گئی تھی۔ اس دوران وہ کئی بار زور سے کراہا تھا مگر اس کے باوجود اسے ہوش نہیں آیا تھا۔ اتنی دیر میں مراد خان ردا کی لکھی ہوئی دوائیں، ڈرپس اور دوسرا سامان لے آیا تھا۔

سارہ ان دونوں کو اندر مصروف چھوڑ کر دوبارہ لاؤنج میں جا بیٹھی تھی۔ اس کا ذہن متفرق سوچوں کا اکھاڑا بنا ہوا تھا۔ یہ تو طے تھا کہ یہ جو کچھ بھی تھا بہر حال پولیس کیس تھا جس کی فوری رپورٹنگ ضروری تھی مگر اس کا دل کہہ رہا تھا کہ اسے بہلول سے بات کیے بغیر کچھ نہیں کرنا چاہیے۔

بہلول نو سال بعد واپس آیا تھا۔ یہ عرصہ اس نے کہاں، کن لوگوں کے ساتھ گزارا؟ اس کا ذریعۂ معاش کیا رہا؟ وہ اس بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ اس کے ذہن میں اپنے استاد کا جملہ گونج رہا تھا کہ کرمنالوجی کا ماہر بدترین مجرم بھی بن سکتا ہے۔ بہلول نے ان سالوں میں کون سی راہ اختیار کی، یہ اس کے علم میں نہیں تھا مگر جن حالات اور جس حالت میں وہ اسے ملا تھا، وہ سب کے سب مشکوک تھے اور اس شک کی زد سے وہ خود بھی باہر نہیں تھا۔

بہلول مجرم ہو سکتا ہے؟ اس کا دل یہ سوچتے ہوئے لمحے بھر کے لیے گویا ساکت سا ہو گیا۔

بہلول اور وہ یونیورسٹی میں کئی سال اچھے دوست رہے تھے مگر اس سے زیادہ ان دونوں میں سے کسی نے سوچا تھا نہ ہی اس حوالے سے کبھی اشارے کنائے میں بھی کوئی بات کی تھی۔

اس کے غائب ہو جانے کے بعد اپنی بے چینی کو خود سارہ نے بھی سالوں کی دوستی سے تعبیر کیا تھا۔ وہ تو جب بابا نے تیمور کو اس کی زندگی میں لانا چاہا تب وہ خود اپنے آپ کو سمجھ پائی تھی۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا سارہ کہ تمہیں کتنا مزید وقت درکار ہے، تمہاری پڑھائی مکمل ہو گئی ہے۔ تمہیں ملازمت کرتے ہوئے بھی تین سال سے زائد ہو چکے ہیں...... پھر تیمور میں آخر برائی کیا ہے؟ اچھے خاندان کا لڑکا ہے، اس عمر میں 21ویں گریڈ میں ہے، اس کا مستقبل بہت روشن ہے۔ پاور کوریڈورز میں اس کی سنی جاتی ہے۔ اسمارٹ ہے اور سب سے بڑھ کر تم سے شادی کرنے میں بہت زیادہ سنجیدہ ہے۔'' اماں نے اس کے مسلسل ٹالنے پر اس روز براہِ راست حملے کی پالیسی اختیار کی تھی۔

''مگر مجھے آپ کو چھوڑ کر کہیں جانا ہی نہیں ہے اماں، دیکھیے آپ نے ردا کی شادی کی، کتنا کم آتی ہے وہ......'' اس نے لاڈ دکھاتے ہوئے بات پلٹنے کی کوشش کی۔

''مگر وہ اپنے گھر میں خوش ہے اور یہ ہم دونوں کے اطمینان کے لیے بہت ہے، ہم تمہیں بھی اپنے گھر میں خوش دیکھنا چاہتے ہیں سارہ، تمہارے بابا تمہارے لیے بہت

پریشان ہیں۔'' انہوں نے اسے سمجھایا۔

''کیوں اماں، اچھا مجھے تھوڑا وقت دے دیجیے۔''

''نہیں سارہ، اب وقت نہیں ملے گا، تمہیں تیمور پسند نہیں ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔ ''اگر نہیں تو کوئی بات نہیں، ہم کوئی اور رشتہ تلاش کرلیں گے۔''

''نہیں اماں یہ بات نہیں ہے۔'' وہ بولی۔ تیمور سے اس کی اچھی دوستی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ ایک اچھا انسان ہے اس کے ساتھ مخلص ہے مگر پھر بھی یہ فیصلہ اس کے لیے مشکل ثابت ہورہا تھا۔

''پھر کیا بات ہے؟ ہم چاہتے ہیں کہ تم آج رات سوچ لو، کل تیمور کے والد آرہے ہیں اگر کوئی خاص مسئلہ نہ ہوتو کل اس بات کو طے کردیا جائے۔''

''اماں......'' وہ احتجاج کرتی رہ گئی مگر کسی مضبوط دلیل کی غیر موجودگی میں وہ ان دونوں کو تو کیا خود اپنے آپ کو بھی انکار پر قائل نہیں کرپاتی۔

یہ ٹھیک تھا کہ وہ تیمور سے محبت نہیں کرتی تھی مگر ردا کے بقول شادی کے لیے محبت ضروری نہیں ہے، یہ بعد میں بھی ہوسکتی ہے اس کے پاس کوئی جواز نہیں بچا تھا۔

اگلی شام ایک غیر رسمی سی تقریب میں اس کی اور تیمور کی منگنی کردی گئی۔

یہ اس کے لیے فرار کا واحد راستہ تھا مگر یہ راستہ اسے مزید بے چین کرگیا تھا جب بھی وہ اس بارے میں سوچتی، ایک عجب سی گھبراہٹ اور اضطراب اس کا دامن پکڑلیتا۔

اس نے خود کو بدلنا چاہا، تیمور کے ساتھ چائے، لنچ اور ڈنر کرنے شروع کیے۔ اس کے ساتھ فون پر باتیں بھی کیں اور تقریبات میں اکٹھے شرکت بھی مگر اس سب کے باوجود اس کے وجود میں موجود تنہائی میں اضافہ ہی ہوتا گیا تو اس نے تیمور سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

''تیمور مجھے نہیں لگتا کہ ہم نے درست فیصلہ کیا ہے، میں تمہیں وہ خوشیاں نہیں دے پاؤں گی جن کے تم حق دار ہو۔'' اس شام اس نے بالآخر اس سے بات کرلی تھی۔

''کیوں، تمہیں ایسا کیوں لگ رہا ہے، میں تو تمہارے ساتھ بہت خوش ہوں سارہ۔'' وہ ایک منٹ کے لیے بھونچکا سارہ گیا۔

''کیونکہ میں خود خوش نہیں ہوں، مجھے یہ سب اداکاری سی لگ رہی ہے۔''

''تم خوش کیوں نہیں ہو؟ کیا مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں، تم بہت اچھے ہو اور یہی چیز مجھے اور تکلیف دے رہی ہے۔'' سارہ نے جواب دیا۔

''میرا اچھا ہونا......؟'' وہ ہنس پڑا۔ ''دیکھو، سارہ، ہم صرف منگیتر نہیں ہیں اچھے دوست بھی ہیں، پڑھے لکھے ہیں، ایک دوسرے کو اچھا خاصا سمجھتے ہیں، تمہارا جو بھی مسئلہ ہو تم مجھ سے کھل کر کہہ سکتی ہو...... کیا تم کسی کو پسند کرتی ہو؟''

اس کے اس سوال پر سارہ نے چمک کر سر اٹھایا اور بولی۔ ''کیا احمقانہ سوال ہے اگر ایسا کچھ ہوتا تو کیا میں تم سے منگنی کرتی؟''

''جواب دینے میں جلدی مت کرو سارہ، بعض اوقات ہمیں خود بھی اپنے جذبوں کے بارے میں علم نہیں ہوتا۔ تم اس بارے میں اچھی طرح سوچو اور جہاں تک میری بات ہے میں ہر صورت میں تمہارا دوست ہوں اور رہوں گا، تمہاری اس بات سے مجھے بھی اتفاق ہے کہ اگر دل نہ مانے تو رشتے صرف بھگتائے ہی جاتے ہیں اور وہ بہرحال دونوں کے ساتھ زیادتی ہے۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ''ہم پھر ملیں گے اگر تب بھی تمہارا یہی خیال ہوا تو تم میری ڈی موشن کردینا۔'' وہ مسکرایا۔ ''ہم پھر سے اپنے سنگل رشتے پر آجائیں گے۔''

''یعنی......؟'' سارہ نے اس کی جانب دیکھا۔

''یعنی دوستی......'' وہ پھر مسکرایا۔

اس رات پہلی بار اس پر یہ راز کھلا تھا کہ اس کا دل ایک گمشدہ انسان کی یکطرفہ محبت میں مبتلا ہے اور کم از کم فی الحال کسی کو اس کی جگہ دینے پر آمادہ نہیں ہے۔

تیمور نے اپنا وعدہ پورا کیا تھا، اماں اور ردا بھی کچھ بحث ومباحثے کے بعد مان گئی تھیں اگرچہ انہیں اس کی وجہ معلوم نہیں تھی مگر بابا کو اس کا منگنی توڑنے کا فیصلہ بالکل پسند نہیں آیا تھا۔ انہوں نے غصے کے اظہار کے طور پر سارہ سے بات چیت کرنا بند کردی تھی۔ کافی مہینوں کی کوشش کے بعد وہ انہیں منانے میں کامیاب ہوئی تھی مگر جب بھی تیمور ان کے گھر آتا یا کسی تقریب میں اس سے ملاقات ہوتی ان کی آنکھوں میں تاسف جھلکنے لگتا۔

''سارہ......'' ردا کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ تیزی سے کمرے کی طرف لپکی۔

''سارہ اسے ہوش آیا تھا ایک لمحے کے لیے...... اس نے آنکھیں کھولی تھیں۔'' ردا اسے دروازے پر ہی مل گئی۔

''اوکے، مگر اب تو پھر سے سو گیا ہے۔'' وہ بہلول کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''ہاں، ایک تو پہلے ہی اسے کوئی ہائی ڈوز دوا دی گئی تھی پھر میں نے جو انجکشن دیے ہیں، ان میں بھی مسکن دوائیں موجود ہیں اس لیے یہ صبح تک آرام سے سوتا رہے گا۔ میں ڈنر کے لیے کچھ بتانے جارہی ہوں تب تک تم یہاں بیٹھو پھر ہم مراد کو یہاں چھوڑ دیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' سارہ نے سر ہلایا۔ ردا کے جانے کے بعد اس نے بستر پر سوتے ہوئے بہلول کو غور سے دیکھا۔ ان برسوں میں وہ بہت کم تبدیل ہوا تھا۔ اس کا کسرتی جسم اور بازو پہلے سے زیادہ مضبوط اور توانا لگ رہے تھے۔ چہرے پر ہلکی سی داڑھی تھی۔ بھورے بال بالکل پہلے جیسے انداز میں اس کی پیشانی پر پڑے تھے، ہاں اس کی رنگت پہلے کے مقابلے میں زیادہ سنولا گئی تھی۔ چہرے پر پیشانی کے دائیں جانب کسی پرانی چوٹ کا نشان نمایاں تھا۔

''بہلول......'' اس نے آہستگی سے اُسے پکارا۔ وہ جواب میں اسی طرح بے سدھ پڑا رہا تھا۔ سارہ چند لمحوں تک اسے دیکھتی رہی پھر کرسی کی پشت پر سر رکھ کر آنکھیں بند کرلیں۔

☆☆☆

سارہ نے سونے سے قبل مراد خان کو بہلول کا خیال رکھنے کے لیے اس کے کمرے میں چھوڑا تھا اور خود اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی تھی۔ وہ اور ردا آج کل اماں بابا کے کمرے میں ہی سو رہے تھے۔ اس کے بازو میں شدید درد تھا۔ اگلے روز چاق و چوبند رہنے کے لیے ایک اچھی نیند لینا ضروری تھا۔ بستر پر لیٹنے تک اس کا ذہن خیالات، یادوں اور اندیشوں سے بھرا ہوا تھا پھر نہ جانے کس وقت نیند کی شفقت بھری بانہوں نے اسے خود میں سمیٹ لیا۔ اس کی آنکھ ردا کی آواز سے کھلی تھی۔

''کک...... کیا ہوا......؟'' اس نے بوکھلا کر اس کی طرف دیکھا۔

''پتا نہیں، مراد خان کا فون آیا ہے...... نیچے کچھ ہوا ہے۔'' ردا سلیپر میں پیر ڈالتے ہوئے بولی۔ اس کے اس جملے کے ساتھ ہی سارہ اچھل کر بستر سے کھڑی ہوگئی اور ردا سے پہلے باہر نکل گئی۔

بہلول والے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ بہلول بستر سے چند قدم کے فاصلے پر زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اس کی قمیص کے دامن پر خون کے دھبے نظر آرہے تھے جبکہ مراد خان کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں دروازے پر ایستادہ تھا۔

''یہ کیا ہورہا ہے مراد...... یہ نیچے کیسے آگیا؟'' اس نے زور سے پوچھا اور زمین پر پڑے بہلول کی طرف لپکی۔

''کچھ پتا نہیں سارہ بی بی...... میرا ایک منٹ کو آنکھ لگ گیا تھا۔ کھٹکے کی آواز سے آنکھ کھلا تو دیکھا کہ یہ کھڑا ہوا ہے...... ام نے بولا بھی کہ بائی تم ابھی بستر میں پڑا رہو مگر یہ لنگڑاتے ہوئے چلنے لگا...... یہ باہر نکلنا چاہ رہا تھا۔ ام نے اس کو پکڑا اور یہ پھر بے ہوش ہوگیا۔'' وہ سادگی سے بولا۔

''اوہو، اس کا خون دوبارہ بہنے لگا ہے۔'' ردا نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''اِدھر آؤ مراد اسے احتیاط سے بستر پر لٹانا ہے۔''

ردا اور مراد نے بہلول کو بستر پر پہنچایا، اس کے ہونٹوں سے ہلکی ہلکی کراہیں برآمد ہورہی تھیں۔ سارہ باہر لاؤنج میں آبیٹھی تھی۔ ردا اور مراد خان کو بہلول کی دوبارہ ڈریسنگ اور ڈرپ وغیرہ لگانے میں آدھا گھنٹا لگ گیا۔

''اسے کسی حد تک ہوش آگیا ہے اگرچہ غنودگی ہورہی ہے مگر بے ہوش نہیں ہے۔'' ردا اس کے پاس آکر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''میرا خیال ہے کہ اب تمہیں اس سے بات کرلینی چاہیے۔''

''اس وقت......؟ کیا اس نے کچھ کہا ہے؟''

''ہاں وہ یہاں سے جانا چاہتا ہے۔''

''اس حال میں......؟'' سارہ نے آنکھیں پھیلائیں۔

''ہاں اسی لیے میں چاہتی ہوں کہ تم اس سے بات کرو......'' ردا بولی۔ ردا کے جانے کے بعد بھی سارہ چند لمحے وہیں بیٹھی رہی پھر کمرے کی جانب بڑھی۔

بہلول ہوش میں تھا۔ اس کو دیکھتے ہی اس کے ہونٹ ایک دم کھلے تھے پھر اس نے ہونٹوں کو بھینچ کر صرف اتنا کہا۔

''سارہ...... تم......''

''ہاں، بہلول میں......'' وہ شگفتگی سے مسکرائی۔ ''شکر ہے کہ میں تمہیں یاد ہوں۔ ہم سب نے تم کو بہت مس کیا ہے۔ تم ذرا ٹھیک ہوجاؤ پھر میں تم سے سب پوچھوں گی کہ آخر تم چلے کہاں گئے تھے؟''

اس سوال کے پوچھنے کے فوراً بعد اسے اندازہ ہوگیا کہ اس وقت اسے یہ بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔

''سارہ مجھے سب یاد ہے اور میں اپنے ذاتی کاموں میں مصروف تھا۔'' وہ سرد لہجے میں بولا۔ ''تم مجھے یہاں لائی

ہو؟''

''ہاں، تم مجھے سڑک پر پڑے ہوئے ملے تھے زخمی اور بے ہوش۔'' اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''تم نے میری جان بچائی...... بہت شکریہ۔'' وہ اس کے انداز کو نظرانداز کرتے ہوئے بولا۔

''کیا غیروں جیسی باتیں کررہے ہو بہلول، ہم دوست ہیں مگر یہ سب کیا ہے؟ تم وہاں کیسے پہنچے؟ کس نے تم کو زخمی کیا ہے؟''

''سارہ میں دل سے تمہارا مشکور ہوں تم یہ سب بھول جاؤ۔ میں رات بھر یہاں ہوں صبح ہوتے ہی یہاں سے نکل جاؤں گا۔'' وہ نرمی سے بولا۔

''خبردار، اس حالت میں تم یہ سوچنے کی غلطی بھی مت کرنا۔ دروازے تک بھی نہیں پہنچ سکو گے۔ اگر اس طرح بار بار خون بہتا رہا تو شاید مجھے تمہیں اسپتال لے جانا پڑے۔'' اس نے سختی سے کہا۔ ''اور دوسری بات یہ ہے کہ تمہیں گولی لگی ہے۔ ہمیں پولیس میں رپورٹ کرنا ہوگی۔''

''نہیں...... نہ پولیس نہ اسپتال......'' وہ یک دم اتنی تیزی سے بولا کہ سارہ حیران رہ گئی۔ اس کے دل پر جیسے خراش سی پڑ گئی۔ ''پلیز سارہ پولیس یا کسی اور کو میرے یہاں ہونے کی خبر نہیں ہونی چاہیے۔''

''کیوں؟ تم نے ایسا کیا کیا ہے بہلول؟'' سارہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میں نے کچھ بھی نہیں کیا، اس کے باوجود اس وقت اگر تم نے پولیس یا کسی کو میری یہاں موجودگی کی خبر دی تو یہ میرے ڈیتھ وارنٹ پر دستخط کرنے کے برابر ہوگا۔''

''اس بات کا کیا مطلب ہے بہلول احمد......؟''

''وہی جو میں کہہ رہا ہوں سارہ حسن کہ تم کسی کو میری موجودگی کی اطلاع نہیں دو گی کم از کم اس وقت تک نہیں جب تک میں یہاں ہوں اور میں صبح ہونے تک یہاں سے چلا جاؤں گا۔''

''تم اس حال میں نہیں جاسکتے۔''

''تم اس کی فکر مت کرو سارہ۔'' وہ اس بار نرمی سے بولا۔ ''تم ان لوگوں کو نہیں جانتیں جو میرے پیچھے پڑے ہیں۔ اگر انہیں میری یہاں موجودگی کی خبر مل گئی تو میرے ساتھ تم بھی خطرے میں پڑ جاؤ گی...... تم میری بات سمجھ رہی ہو نا؟'' اس کا لہجہ اب لڑکھڑا رہا تھا۔

''وہ کون لوگ ہیں بہلول اور وہ تمہارے پیچھے کیوں پڑے ہیں؟''

''میں یہ سب بتا کر تمہیں خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا۔'' وہ حتمی انداز میں بولا۔

''اوکے، صبح کی صبح دیکھی جائے گی، فی الحال ہم اس بحث کو یہیں چھوڑتے ہیں، تم یہ گولیاں لو۔'' اس نے ردا کی دی ہوئی دوائیں گلاس کے ساتھ اس کی طرف بڑھائیں۔ یہ تمہارے درد کو کم کریں گی اب سو جاؤ، میں مراد کو باہر بھیج رہی ہوں۔ تمہارے کمرے کا دروازہ کھلا رہے گا۔ اگر تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے آواز دے لینا، میں تمہارے کمرے کے باہر صوفے پر سو رہی ہوں۔''

''اور یہ صوفہ میرے اور باہر کے دروازے کے درمیان ہوگا...... ہے نا؟'' وہ گولیاں نگلتے ہوئے بولا۔

''ہاں۔'' سارہ بولی۔ ''تاکہ تمہاری آواز مجھ تک پہنچ سکے اور تم باہر نہ نکل سکو۔''

''اور اگر کوئی باہر سے اندر آیا تب بھی اس کمرے میں داخلے سے قبل اسے تمہارے پاس سے گزرنا ہوگا؟'' اس نے اضطرابی انداز میں پوچھا۔

''ہاں۔'' سارہ نے ایک لمحے بعد کہا۔ ''اور اب تم سونے کی کوشش کرو۔'' وہ اس کے ہاتھ سے گلاس لیتے ہوئے بولی۔ ''میں باہر جارہی ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ لڑکھڑاتے ہوئے لہجے میں بولا۔

''سارہ میری بات کو مذاق مت سمجھو، وہ بہت زیادہ خطرناک لوگ ہیں۔'' اس نے ان جملوں کے ساتھ گویا تھک کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ چند لمحوں میں وہ گہری نیند میں ڈوب چکا تھا۔

سارہ بھی پلٹ کر باہر صوفے پر آبیٹھی۔ اس کی سماعت میں بہلول کے الفاظ گونج رہے تھے۔ چند لمحوں بعد وہ اٹھی، اپنی الماری سے پسٹل نکالا اور کشن کے نیچے رکھ کر لیٹ گئی۔

اسے سوئے شاید چند لمحے ہی گزرے تھے کہ ایک بار پھر ردا کی آواز نے اسے نیند سے جگا دیا۔

''کیا...... کیا ہوا ردا؟'' اس کی حسیات کو بیدار ہونے میں چند لمحے لگ گئے۔

''سارہ، سوری میں نے تمہیں نیند سے جگایا مگر مجبوری تھی۔ رات اشرف کی امی کی طبیعت یک دم بگڑ گئی۔ انہیں اسپتال لے جایا گیا ہے۔ مجھے ابھی وہاں جانا ہوگا۔ اشرف نے ڈرائیور بھیج دیا ہے۔'' وہ بولی۔

''اوہ، انہیں کیا ہوا ہے...... اللہ خیر کرے مگر تم آدمی

رات کو جاؤ گی؟'' وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''امی کو دل کا دورہ پڑا ہے۔'' ردا نے جواب دیا۔

''اور رات نہیں ہے سارہ صبح کے 7 بجے ہیں۔''

''اوکے...... میں تمہیں کافی بنا دوں؟'' سارہ نے کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں...... نہیں، میں بس نکل رہی ہوں۔ اصل میں مجھے بہت عجیب سا لگ رہا ہے۔ وہ بہلول یہیں ہے...... نہ جانے اس کا مسئلہ کیا ہے۔ وہ زخمی بھی ہے اور مجھے تمہیں اکیلے چھوڑ کر جانا پڑ رہا ہے پر کیا کروں دوسری طرف بھی مجبوری ہے۔'' ردا اُلجھے ہوئے انداز میں بولی۔

''ارے ردا...... کیوں پریشان ہو رہی ہو تم، کیا میں چھوٹی بچّی ہوں؟ پھر تم کون سا لندن جا رہی ہو اگر کوئی پریشانی ہوئی تو تمہیں فون کر دوں گی۔ تم مطمئن ہو کر جاؤ اور وہاں پہنچ کر مجھے فون کر دینا۔'' سارہ اسے تسلی دیتے ہوئے بولی۔

''کر دوں گی مگر تم خدارا محتاط رہنا اور ذرا بھی کوئی مسئلہ ہو تو مجھے کال کر دینا اور ہاں بہلول سے بات کے بعد اپنے آفس میں رپورٹ کرنا مت بھولنا۔'' ردا کا ہدایت نامہ گاڑی میں بیٹھنے تک جاری تھا۔ اس کے جانے کے بعد بھی وہ کافی دیر تک لان میں بیٹھی موسم کا لطف لیتی رہی تھی۔ بارش کے بعد مطلع کافی حد تک صاف ہو چکا تھا مگر فضا میں خنکی ہنوز باقی تھی۔ مراد خان اس کے لیے کافی اور سینڈوچ تیار کر کے باہر ہی لے آیا تھا۔

''مہمان جاگ گیا ہے مراد خان؟'' کافی لیتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''نہیں سارہ بی بی! ابی تو آرام سے سو رہا ہے۔'' وہ بولا۔

ناشتے کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلی گئی تھی اور جب تیار ہو کر واپس نیچے پہنچی تو ساڑھے نو بج چکے تھے۔ اس نے بہلول کو جھانکا، اس کی آنکھیں بند تھیں پھر اس کی نظر کرسی کے نیچے پڑی ٹوکری میں رکھے بہلول کے کپڑوں پر پڑی۔ اس کی قمیص اور جینز پر کیچڑ اور خون کے دھبے موجود تھے۔ اس نے کپڑوں کو اٹھایا اور مشین میں ڈالنے کے لیے کچن کاؤنٹر پر رکھا۔ اچانک اس کی جینز کی جیب سے کاغذ کا ایک ٹکڑا نکل کر زمین پر آ گرا۔ سارہ نے جھک کر اسے اٹھایا۔

وہ ایک سادہ سفید کاغذ تھا اور اس پر موٹے حروف میں ایک ٹیلی فون نمبر لکھا ہوا تھا۔

یہ ایک لینڈ لائن نمبر تھا۔ سارہ دو لمحے کاغذ کو گھورتی رہی۔ یقیناً یہاں سے اسے بہلول کے بارے میں کچھ معلوم ہو سکتا تھا، اس نے سوچا...... وہ کپڑوں کو وہیں چھوڑ کر کاؤنٹر کے سامنے لگی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کا فون اس کے سامنے رکھا ہوا تھا۔ سب سے پہلے اس نے اپنے فون پر مخصوص نمبر ملایا اب اس کی کال آسانی سے ٹریس نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے بعد اس نے کاغذ پر لکھے نمبرز دبانا شروع کیے۔ دوسری گھنٹی پر ہی کال ریسیو کر لی گئی تھی۔

''ہیلو......'' دوسری جانب ایک کھردری مردانہ آواز نے فون اٹھایا تھا۔

سارہ کو قدرے مایوسی ہوئی صرف ہیلو کسی مقام یا دفتر کی خبر کے لیے ناکافی تھا۔

''کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ یہ کہاں کا نمبر ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کو یہ نمبر کہاں سے ملا ہے؟'' دوسری جانب سے اس کے سوال کے جواب میں دوسرا سوال کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی سارہ کو بیک گراؤنڈ سے کچھ آوازیں بھی سنائی دیں۔ پھر ایک ہلکی سی کلک ابھری جیسے وہاں کسی اور ایکسٹینشن سے فون اٹھایا گیا ہو۔

''آپ کون......؟'' اس کا جملہ ادھورا رہ گیا تھا۔ بہلول اچانک اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ اس کی بھوری آنکھوں میں غصہ لہرا رہا تھا۔

''بند کرو۔'' وہ آواز دبا کر بولا۔

''کیا آپ دوبارہ کہیں گے میں سن نہیں پائی۔'' وہ بہلول کو رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

''محترمہ یہ اینٹی نارکوٹکس فورس کا بیورو ہے اور یہاں کسی کے پاس فضول باتیں کرنے کا وقت نہیں ہے۔ آپ کو یہ نمبر کہاں سے ملا ہے؟''

''اے ایس ایف...... یعنی اینٹی نارکوٹکس فورس......'' سارہ نے بہلول کی جانب دیکھتے ہوئے دہرایا۔

''بند کر دو اِسے۔'' بہلول اس بار قدرے زور سے بولا تھا۔ پھر وہ لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھا اور اس نے سارہ کے ہاتھ سے فون چھین کر اپنے کان سے لگایا اور غرایا۔ ''سکندر تم جہنم میں جاؤ۔'' اس کے بعد اس نے فون بند کر کے سامنے رکھے صوفے پر اچھال دیا۔

ایک لمحے کے لیے کمرے میں سناٹا سا چھا گیا۔ سارہ کا دل گویا حلق میں آ گیا تھا۔ ''تمہیں یہ کاغذ میرے کپڑوں

سے ملا تھا؟'' اس نے کاؤنٹر پر پڑے کاغذ کے ٹکڑے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں۔'' سارہ نے سر ہلایا۔

''یعنی اسے انہوں نے ہی میرے کپڑوں میں ڈالا ہوگا تاکہ میری لاش ملنے کی تصدیق ہوسکے۔'' وہ بڑبڑایا۔

''یہ اینٹی نارکوٹکس کے بیورو کا نمبر ہے۔''

''مجھے معلوم ہے۔'' وہ بولا۔

''بہلول تم نے کہا تھا کہ تم مجرم نہیں ہو۔''

''وہ تو میں اب بھی کہہ رہا ہوں سارہ۔'' وہ اسے گھور کر بولا۔

''پھر کیا تم اُن کے مخبر ہو......؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں۔'' بہلول نے سر ہلایا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ شاید اس کے لیے مزید کھڑا رہنا ممکن نہیں رہا تھا۔ سارہ اسے چند لمحے بے یقینی سے دیکھتی رہی پھر ڈسپنسر سے ایک گلاس پانی بھر کر بہلول کی جانب بڑھا دیا جسے اس نے فوراً منہ سے لگالیا تھا۔ سارہ اس دوران اپنے بازو کو دبا رہی تھی۔

''تمہیں یہ چوٹ کیسے لگی؟'' بہلول نے گلاس رکھتے ہوئے پوچھا۔

''کوئی خاص بات نہیں ہے، کل تمہیں گاڑی میں ڈالتے ہوئے شاید مسل پُل ہوگیا ہے، ٹھیک ہو جائے گا۔ اس وقت یہ اہم نہیں ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ اگر تم مجرم نہیں ہو، مخبر نہیں ہو تو کون ہو اور بیورو سے تمہارا کیا تعلق ہے؟ تم کیا کرتے پھر رہے ہو بہلول؟'' سارہ نے سختی سے پوچھا۔

''تو تم اس معاملے کا پیچھا نہیں چھوڑو گی؟'' وہ اسے گھورتے ہوئے بولا۔ ''جبکہ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ یہ سب جاننا تمہارے لیے خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔''

''نہیں، کیونکہ یہ جاننا میرے لیے ضروری ہے۔''

''تم ذرا بھی نہیں بدلیں سارہ، وہی ضد اور اتنی ہی احمق تم آج بھی ہو۔'' وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''اگر یہ جاننا تمہارے لیے اتنا ہی ضروری ہے تو سنو میں سینئر انسپکٹر بہلول احمد ہوں اور جہاں تم نے ابھی کال کی تھی وہ میرے دفتر کا نمبر ہے۔''

سارہ بے یقینی سے اُسے گھورتی رہ گئی تھی۔

''اگر وہ تمہارا دفتر ہے تو پھر وہ تمہاری لاش کی خبر کا انتظار کیوں کر رہے ہیں، میں سمجھ نہیں پا رہی ہوں۔''

''تم سمجھ سکتی ہو اگر ذرا غور کرو...... یہ کوئی راکٹ سائنس نہیں ہے۔'' وہ پھیکے انداز میں مسکرایا۔

عین اسی وقت باہر کسی گاڑی کے رکنے کی زوردار آواز آئی، سارہ اور بہلول نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر سارہ نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر جھانکا، باہر ایک پولیس کار موجود تھی۔ اس نے فوراً پردہ برابر کر دیا۔

''یہ...... یہ کون ہوسکتا ہے۔'' اس نے سوچا۔ ''کیا میری کال ٹریس ہوگئی ہے؟'' اس نے خود ہی فوراً اپنے اس خیال کو رد کیا۔ ''یہ اتنی جلد ممکن نہیں تھا پھر......''

''کون ہے سارہ......؟'' بہلول نے پوچھا۔

''بہلول تم کمرے میں جاؤ، باہر ایک پولیس کار ہے۔ میں دیکھتی ہوں کہ وہ کون ہے۔'' سارہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا اور دروازے کی طرف مڑ گئی۔

''سارہ......'' بہلول کی آواز نے اس کے قدم روک لیے تھے۔ اس نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔

''میں نے تم سے جھوٹ نہیں کہا ہے۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا اور کمرے کی طرف مڑ گیا۔

سارہ اسے دیکھتی رہی پھر باہر نکل گئی۔

☆☆☆

برآمدے میں قدم رکھتے ہی اُس نے اطمینان کی گہری سانس لی۔ سامنے پولیس کار کے باہر سجاد احمد کھڑا تھا۔ سجاد کئی سال اس کے ساتھ کام کر چکا تھا۔ اس وقت وہ فون پر مصروف تھا۔

''سجاد...... کیسے ہو تم؟ کافی دنوں بعد دیکھا تمہیں۔'' وہ اس کا فون بند ہوتے ہی قریب آتے ہوئے بولی۔

''ہاں، تم کیسی ہو؟ آج کل چھٹیوں پر ہو، میں نے سنا ہے کہ تم زخمی ہوگئی تھیں پھر اچانک تمہارے والدین کے حادثے کی خبر ملی، سن کر دلی افسوس ہوا۔ میں پہلے بھی آیا تھا مگر تب صرف مراد خان سے ملاقات ہوسکی تھی۔''

''ہاں، بابا اور اماں نے تو ہمیں بھی حیران کر دیا۔ وہ ساری زندگی ساتھ رہے اور ساتھ ہی چلے گئے۔'' وہ افسردگی سے بولی۔ ''تم ڈیوٹی پر ہو؟''

''ہاں، اصل میں سوچ کر تو میں یہ آیا تھا کہ ہم تھوڑی دیر ساتھ بیٹھیں گے مگر یہ ڈیوٹی...... تم جانتی ہی ہو...... ابھی تک سکون تھا اور اب اچانک ایمرجنسی آگئی ہے مگر اب یہاں ہو تو کسی دن بیٹھتے ہیں۔''

''بالکل......'' سارہ مسکرائی۔ ''ویسے کیا ایمرجنسی ہوگئی ہے؟''

''سچ ہے پولیس والا چھٹی پر ہو یا ریٹائرڈ ہو جائے رہتا پولیس والا ہی ہے۔'' وہ بھی مسکرایا۔ ''ہمیں اس علاقے

میں ایک شخص کو ڈھونڈ نا ہے۔ وہ خطرناک ہے اور شاید مسلح بھی تم بھی محتاط رہنا۔''

''وہ کون ہے؟'' سارہ نے لہجے کو بالکل نارمل رکھتے ہوئے پوچھا۔

''بہلول احمد، قد چھ فٹ ایک انچ، وزن دو سو دس پاؤنڈ، عمر چھتیس سال، بھورے بال، بھوری آنکھیں۔'' سجاد مشین کی طرح بول رہا تھا۔

''اس نے کیا کیا ہے؟''

''یہ اینٹی نارکوٹکس کا آفیسر ہے۔ سنا ہے چند دن قبل اس نے اپنے کسی ٹارگٹ کو قتل کر دیا اور پانچ ملین ڈالر لے کر فرار ہو گیا ہے۔ ہمیں اس کے بارے میں کل رات کچھ معلومات ملی تھیں اور ابھی ابھی خبر ملی ہے کہ اس نے ہمارے ایریا کوڈ سے بیورو فون کیا ہے۔ وہ نمبر ٹریس کر رہے ہیں مگر کم بخت نے کال بلاک استعمال کیا ہے اس لیے پتا لگنے میں کچھ وقت لگے گا۔''

سجاد کچھ اور بھی کہہ رہا تھا مگر سارہ اس سے آگے کچھ سن نہیں پائی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ بہلول سچ کہہ رہا تھا مگر قتل اور چوری...... وہ جانتی تھی کہ بہلول ایسا نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ سجاد کو اس کے زخمی ہونے کی خبر بھی نہیں تھی...... اس نے سجاد کی طرف دیکھا۔

''وہاں سے چند افسر بھی اسے تلاش کرنے آ رہے ہیں۔'' وہ کہہ رہا تھا۔

''تم کیا کہہ رہے تھے؟'' سارہ کی آواز قدرے تیز ہو گئی تھی۔ سجاد نے اسے حیرت سے دیکھا۔ ''میرا مطلب ہے کہ تم نے ابھی جو کہا وہ میں سن نہیں پائی۔'' وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولی۔

''میں نے کہا ہے کہ بیورو سے چند افسران اسے ڈھونڈنے میں مدد کرنے کے لیے آ رہے ہیں، یہ ہم پولیس والوں کو احمق سمجھتے ہیں۔'' وہ منہ بنا کر بولا۔

''مگر ایسا کم ہوتا ہے۔'' وہ بمشکل بولی۔ اس کی رگوں میں خون گویا جم رہا تھا۔

''ہاں تم ٹھیک کہہ رہی ہو، ایسا نہ صرف اس وقت کرتے ہیں جب انہیں اندر کی کہانی ہم سے بھی چھپانی ہو۔''

''ہاں جیسے کسی ساتھی کی لاش۔'' اس نے سوچا۔

''چلو میں چلتا ہوں جلد ملاقات ہوگی۔'' سجاد گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بولا۔

سارہ اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔ اس کے گھٹنے لرز رہے تھے۔ ذہن میں سوچوں کے جھکڑ چل رہے تھے۔

بہلول کی جان خطرے میں تھی اور وہ خود بھی ایک مجرم کے بارے میں معلومات چھپا کر قانون کی نگاہوں میں گناہ گار بن چکی تھی۔

☆☆☆

وہ لاؤنج میں داخل ہوئی، بہلول سامنے کھڑا اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''وہ تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں بہلول۔'' وہ اس کے قریب آ کر بولی۔

''میں نے تمہیں بتایا تھا۔'' بہلول سر جھٹک کر بولا۔

''مگر تم نے مجھے پوری بات نہیں بتائی تھی' پیسے کہاں ہیں؟'' اس نے یکلخت پوچھا۔

''کون سے پیسے؟'' بہلول نے حیرت زدہ ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

''تمہیں مجھ سے کچھ چھپانے کی ضرورت نہیں ہے بہلول۔''

''میں کچھ چھپا بھی نہیں رہا ہوں، تم کن پیسوں کی بات کر رہی ہو؟''

سارہ اسے دیکھتی رہی۔ وہ درجنوں مجرموں سے تفتیش کر چکی تھی۔ سچ اور جھوٹ میں فرق کرنا جانتی تھی۔ اسے نظر آ رہا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا مگر اس وقت سب کچھ اس کے خلاف تھا۔

''بہلول......'' وہ چند لمحوں بعد بولی۔ ''میں تمہارے لیے کپڑے لا رہی ہوں تم وہ پہن لو...... ہمیں یہاں سے فوراً نکلنا ہوگا۔''

''سارہ کیا ہوا ہے؟''

''وہ تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں۔ کال ابھی ٹریس نہیں ہوئی ہے مگر جلد ہی شاید وہ یہاں پہنچ جائیں۔ ہمیں اس سے قبل یہاں سے نکلنا ہوگا۔'' وہ بولی۔

''ہمیں نہیں، میں جا رہا ہوں۔ میں تمہیں اس سب میں گھسیٹ نہیں سکتا سارہ۔ وہ یہاں آئیں تو تم کچھ بھی کہہ سکتی ہو۔ تم سو رہی تھیں۔ نہا رہی تھیں تمہیں نہیں معلوم کہ میں کب یہاں گھسا...... اور تمہارا فون استعمال کیا۔'' وہ بولتے بولتے تھک گیا۔

''بہلول ہمارے پاس بحث کے لیے وقت نہیں ہے۔'' وہ کافی بناتے ہوئے بولی۔ ''ہر طرف چیکنگ ہو رہی ہے تم یہاں سے شہر تک بھی نہیں پہنچ پاؤ گے۔''

''مگر سارہ......''

''بس بہلول۔'' اس نے گویا بات تمام کردی تھی۔
جب تک وہ لباس بدل کر آیا، وہ کافی اور دوائیں تیار کرچکی تھی۔ بہلول نے دوائیں نگل کر کافی پی۔ وہ دونوں باہر نکلے تو سارہ کی کار برآمدے کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ مراد خان کو ضروری ہدایات دے چکی تھی۔ جو اب گاڑی کی ڈکی کھولے کھڑا تھا۔
''یہ کافی بڑی ہے، اندر کمبل لگا دیے ہیں تمہیں آگے کا سفر اس میں کرنا ہوگا۔'' وہ بولی۔
بہلول اسے دیکھتا رہا۔ ''سارہ میں تمہیں اس میں اُلجھانا نہیں چاہتا۔'' وہ بہت مضطرب نظر آرہا تھا۔
''اس وقت ہمارے پاس اور کوئی راستہ نہیں ہے بہلول......اور نہ ہی میں تمہیں اکیلے جانے دوں گی۔''
''ٹھیک ہے تم مجھے شہر پہنچا دو، اس کے بعد تم لوٹ آؤ گی۔'' وہ بولا اور ڈکی میں لیٹ گیا۔ سارہ نے اس کی بات کا جواب دیے بغیر اسے کمبل اوڑھایا، دواؤں کی تھیلی اور پانی کی بوتل اس کے ہاتھ میں دی اور ڈکی بند کردی۔
''آپ سب سمجھ گئے نا مراد خان؟'' اگلی نشست پر بیٹھتے ہوئے اس نے مراد سے پوچھا۔
''آپ فکر نہیں کرو سارہ بی بی، مراد خان کی زبان کوئی نہیں کھلوا سکتا۔ آپ بس اپنا خیال رکھنا اور ردا بی بی کو فون کردینا۔''
''ٹھیک ہے مراد......تم چوکنّے رہنا۔'' وہ بولی اور باہر نکلتی چلی گئی۔ اس کے اندازے کے عین مطابق ہر طرف پولیس نظر آرہی تھی۔ مین چوراہے پر باقاعدہ چیکنگ ہورہی تھی جس کی وجہ سے گاڑیوں کی قطار سی لگ گئی تھی۔
''ہیلو آفیسر۔'' اس نے چیکنگ کرنے والے افسر کو اپنا پولیس کارڈ دکھاتے ہوئے کہا۔ ''کیا ہورہا ہے؟ اُس کا کچھ پتا چلا؟''
''کس کا......؟'' افسر نے اس کے کارڈ اور پھر اسے غور سے دیکھ کر پوچھا۔
''انسپکٹر سجاد احمد نے مجھے بتایا ہے کہ آپ ایک مفرور مجرم کو تلاش کررہے ہیں...... وہ میرے ساتھ کام کرچکا ہے۔'' وہ خوش دلی سے مسکرا کر بولی۔
''اچھا...... اچھا۔'' انسپکٹر کے تنے ہوئے اعصاب پر حوالے نے اچھا اثر ڈالا تھا۔ ''آفیسر سارہ یہ سب تو چلتا رہتا ہے۔ جب تک حضرتِ انسان ہے، جرم بھی ہے اور ہماری پھٹیک بھی۔''
''سچ کہہ رہے ہیں آپ...... پھر کوئی کامیابی ملی؟'' وہ سرسری نظروں سے دیکھ رہی تھی کہ باقی گاڑیوں میں لوگوں کو اتار کر اور ڈکی وغیرہ کھلوا کر چیکنگ کی جارہی تھی۔
''ابھی نہیں، کہا جارہا ہے کہ یہاں اس کا کوئی ساتھی موجود ہے جو اُسے علاقے سے نکلنے میں مدد دے سکتا ہے۔'' اس نے تکلفاً سارہ کی گاڑی میں جھانکا اور پھر اس آگے جانے کا اشارہ دیا۔ یہی سارہ کا مقصد تھا۔ وہ آگے بڑھ گئی مگر اس کے ذہن میں گھنٹی سی بج اٹھی تھی۔ اس سے بہت بڑی غلطی ہوگئی تھی... دیر یا بہ دیر وہ اس کا نمبر ٹریس کرہی لیں گے اور پھر اس کے گھر بھی پہنچ جائیں گے۔ وہاں انہیں بہلول کے خون آلود کپڑے، کمرے میں دوائیں ڈرپس غرض تمام ثبوت مل جائیں گے۔
''اف۔'' اس نے سر پر ہاتھ مارا۔ ''سارہ بی بی بڑی پولیس وومن بنی پھرتی ہو۔'' خیر ابھی بھی اتنی دیر نہیں ہوئی تھی۔
تھوڑا آگے جاکر پہلی کال اس نے مراد خان کو کی تھی۔ اسے سب کچھ صاف اور غائب کرنے کی تفصیلی ہدایات دے کر اس نے دوسرا فون ردا کو کیا۔
''تم......تم کہاں ہو سارہ آخر؟'' اس نے پہلی گھنٹی پر ہی فون اٹھالیا تھا۔ ''میں اس قدر پریشان تھی، کب سے گھر پر فون کررہی ہوں مگر کوئی فون ریسیو نہیں کررہا۔ شہر میں ہر طرف پولیس ہی پولیس ہے اور وہ لوگ کسی مفرور کو تلاش کررہے ہیں، تم سن رہی ہونا؟''
''ہاں ردا، میں نے اسی لیے تمہیں فون کیا ہے، تم پریشان مت ہو۔''
''یار کیسے پریشان نہ ہوں، ایک منٹ ٹھہرو تم راستے میں ہو، تم کہاں جارہی ہو کہیں وہ تمہارے ساتھ تو نہیں ہے؟'' وہ اندازے لگاتے ہوئے بولی۔
''ہاں میں باہر ہوں اور بہلول ایک طرح سے میرے ساتھ ہے۔'' سارہ نے دھیرے سے کہا۔
''ایک طرح سے......؟ اس کا کیا مطلب ہے؟''
''وہ ڈکی میں ہے ردا۔'' سارہ چڑ کر بولی۔ ''تم پہلے میری پوری بات سن لو۔ وہ مجرم نہیں ہے وہ اینٹی نارکوٹکس بیورو کا افسر ہے۔''
''سارہ تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے، اس پر قتل کا الزام ہے، آخر تم اپنے ساتھ کرنا کیا چاہتی ہو؟'' ردا بولی۔
''اس نے قتل یا کچھ اور نہیں کیا، اسے پھنسایا جارہا ہے ردا۔''
''دیکھو میں یہ سب نہیں جانتی......تم یہ سوچو کہ تم نے

خود کو کتنے بڑے خطرے میں ڈال لیا ہے اگر وہ بے گناہ ہے تب بھی تم نے ایک پولیس والی ہونے کا فرض ادا نہیں کیا۔ تم سمجھ کیوں نہیں رہیں، اس کی اس طرح مدد کر کے تم اپنی پسندیدہ جاب، اب تک کی ساری محنت، نام، آزادی سب کھو سکتی ہو۔'' روا روہانسی ہو رہی تھی۔

''میں اس طرح اسے پولیس کے حوالے نہیں کر سکتی روا...... جو کچھ نظر آ رہا ہے اگر یہ سب ایسا ہی ہے تو وہ لوگ اسے قتل کر دیں گے۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔ ''مجھے یقین ہے کہ وہ سچ بول رہا ہے...... اب تم غور سے میری بات سنو تم... فی الحال گھر واپس نہیں جاؤ گی۔ اگر کوئی تم سے میرے یا بہلول کے بارے میں کچھ بھی پوچھے تو تم اسے سچ سچ بتا دینا کہ میں اسے گھر لائی تھی۔ اس سے زیادہ تم کچھ نہیں جانتیں۔''

''تم پاگل ہو گئی ہو بالکل۔''

''نہیں روا، یہ بات وہ ویسے بھی سمجھ ہی لیں گے، میں تمہیں اس مسئلے سے دور رکھنا چاہتی ہوں۔ سمجھ رہی ہو نا اور تم میری فکر مت کرو، میں تم سے رابطے میں رہوں گی۔''

''سارہ پلیز اپنا خیال رکھنا۔''

''تم بھی میری پیاری بہن، اپنی بہن پر یقین رکھو...... مجھے کچھ نہیں ہوگا۔'' سارہ اب کافی آگے نکل آئی تھی اس طرف کسی ناکے یا چیکنگ کے امکانات نہیں تھے۔ بہلول کو اب ڈکی سے نکالا جا سکتا تھا۔ اس نے سڑک کی ایک جانب کار روکی۔ پسنجر سیٹ کو حتی الامکان حد تک پیچھے دھکیلا اور راتر کر ڈکی کھولی۔ وہ سمجھ سکتی تھی کہ گولی کے زخم میں اس قسم کی ایکٹیویٹی اس کے لیے کتنی تکلیف دہ ہوگی۔ کچھ اندازہ اس کے چہرے سے بھی ہو رہا تھا۔ دس منٹ میں وہ مین شاہراہ پر پہنچ گئے تھے۔ بہلول نے بیٹھنے کے بعد درد کی دوا دوبارہ لے لی تھی۔

''تھوڑا آگے جا کر ایک چھوٹا سا ٹیک اوے ریسٹورنٹ ہے ہم وہاں رک کر ناشتا اور کافی لے سکتے ہیں۔'' سارہ بولی۔

''میرا خیال ہے کہ یہ خطرناک ہوگا۔'' وہ جلد ہی تمہارا نمبر ٹریس کر کے تمہارے گھر پہنچ جائیں گے۔''

''شاید مگر وہاں انہیں تمہاری موجودگی کے کوئی آثار نہیں ملیں گے...... یہ ---- آ گیا ریسٹورنٹ۔'' سارہ مسکرائی۔ ''تم بیٹھو میں کچھ لے کر آتی ہوں۔''

وہ اترتے ہوئے بولی۔ اسے اندازہ تھا کہ بہلول کو اس وقت کچھ کھانے کی شدید ضرورت ہوگی، رات سے تو اس نے کچھ بھی نہیں کھایا تھا اور اس سے قبل بھی نہ جانے کب اس کو کچھ کھانے کو ملا ہو۔ اس نے کچھ سینڈوچز، فرائڈ ایگ اور بسکٹ وغیرہ خریدے اور کافی کا آرڈر دے کر کار میں واپس آ بیٹھی۔

''لیجیے...... یہ آ گئی آپ کی دعوتِ شیراز کھاؤ نا...... مجھے بھی بہت بھوک لگی ہے۔''

وہ واقعی بہت بھوکا تھا۔

''شاید میں نے دو تین دن بعد کھانا کھایا ہے۔'' وہ تھوڑی دیر بعد کافی کے سپ لیتے ہوئے بولا۔

سارہ اسے دیکھتی رہی پھر چند لمحے بعد بولی۔ ''بہلول ہمیں اب بات کرنی چاہیے۔''

''تم کیا کہنا چاہتی ہو؟''

''یہ سب کیا ہے؟ تمہارے اپنے محکمے کے لوگ تمہارے پیچھے کیوں ہیں؟ تم کو کس نے اغوا کیا تھا۔ اب یہ مت کہنا کہ ایسا کچھ نہیں ہے، میں نے تمہارے ہاتھوں اور پیروں پر رسیوں کے نشان دیکھے ہیں۔ تم نشہ آور دوا کے زیرِ اثر کیوں تھے اور کس نے تمہیں گولی مار کر سڑک پر پھینک دیا تھا؟''

''میں جانتا ہوں کہ یہ سارے سوالات تمہارے دماغ میں مچل رہے ہیں سارہ اور یہ ہونا بھی چاہیے مگر پہلے تم مجھے بتاؤ کہ تم نے اس وقت چوری کا ذکر کیوں کیا تھا؟''

''صرف چوری نہیں......'' سارہ اس کی طرف دیکھے بغیر گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بولی۔ ''تم پر ایک قتل کا الزام بھی ہے۔''

''کیا......؟'' وہ تقریباً اچھل پڑا۔ ''کس کے قتل کا؟'' اس بار اس کا لہجہ بہت بہر وتھا۔

''کسی ٹارگٹ یعنی مجرم کا جس سے تم نے رقم بھی لوٹی ہے۔''

اس کے جبڑے بھنچ گئے۔ ''کتنی رقم؟''

''پانچ ملین ڈالرز۔'' سارہ نے آہستگی سے کہا۔

''حد ہے۔'' وہ سر جھٹک کر بولا۔ ''حد ہے۔'' اس نے دہرایا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر غصہ کسی طوفان کے مانند چھاتا محسوس ہو رہا تھا۔

''دیکھو تمہیں مجھے پوری بات سمجھانا ہوگی بہلول، میں جانتی ہوں کہ تم نے یہ سب نہیں کیا ہے مگر ہمیں یہ ثابت کرنا پڑے گا۔'' سارہ کھنکھارتے ہوئے بولی۔

''نہیں۔'' اس نے پتھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب؟''

''میں نے کہا ہے نہیں...... تم اس سب میں نہ تو میری مدد کرو گی اور نہ ہی میں تمہیں کچھ بتاؤں گا۔ یہ لوگ جنہوں نے میرے لیے یہ گہری کھائی تراشی ہے، میرا پیچھا نہیں چھوڑیں گے اور یہ کتنے سفاک اور وحشی ہیں، یہ میں جانتا ہوں اس لیے تم اس سارے معاملے سے دور رہو گی۔'' بہلول بمشکل پہلو بدل کر بولا۔ ڈکی میں گزرے والے وقت نے اس کے زخم میں آگ سی بھر دی تھی۔

''بہلول کیا تمہیں لگتا ہے کہ میں یوں ہی تمہیں راستے میں چھوڑ کر گھر چلی جاؤں گی؟'' سارہ نے اسے گھورا۔ ''میں پولیس وومن ہوں تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔''

''نہیں کر سکتیں۔'' وہ اس بار نرمی سے بولا۔ ''اگر تم اپنے سینئرز تک میری ساری بات پہنچا کر مدد بھی مانگتی ہو تو وہ تمہیں پہلے مجھے اُن کے حوالے کرنے کو کہیں گے۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو وہ تم پر مقدمہ بنا دیں گے اور اگر کیا تو انہیں لامحالہ تفتیش کے نام پر ہی مجھے بیورو کے حوالے کرنا پڑے گا اسی لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ تم اس سب سے الگ رہو۔''

''اوکے......'' وہ چڑ کر بولی۔ ''میں سمجھ گئی ہوں۔'' پھر ایک لمحے بعد وہ اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''کیا تمہارے پاس ان کے خلاف کوئی ثبوت ہے، کوئی ایسی چیز جو تمہاری بے گناہی ثابت کر سکے۔''

''ہاں مل سکتی ہے مگر اس کے لیے مجھے آزاد رہنا ہوگا۔''

''اور کوئی دوست، تمہارے بیورو کا کوئی آدمی جو تمہاری مدد کر سکے۔''

''سلمان عابد۔'' بہلول بے اختیار بولا۔ ''مگر نہیں، میں اس کی جان خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔ فیصل اور سکندر دونوں اسے جانتے ہیں۔ یہ میری جنگ ہے سارہ، مجھے ہی اسے لڑنا ہوگا۔ تم مجھے ایک بات بتاؤ سارہ کیا تمہیں یقین ہے کہ میں نے یہ سب کیا ہے؟'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

''میں اس کا جواب پہلے دے چکی ہوں۔'' سارہ نے نظریں چرالیں۔

''نہیں میں سننا چاہتا ہوں اگر تمہارے ذہن میں ذرہ برابر بھی شک ہے تو کہہ سکتی ہو، یہ حق ہے تمہارا۔''

''نہیں، مجھے معلوم ہے کہ تم یہ سب نہیں کر سکتے۔'' وہ بالآخر بولی۔

''بس پھر مجھ پر اعتماد کرو، میں جو تمہیں کہہ رہا ہوں وہی تمہارے لیے درست ہے۔ کسی مناسب جگہ پر مجھے پہنچا دو اور اپنی زندگی میں واپس لوٹ جاؤ۔''

سارہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی پھر بولی۔ ''مجھے سوچنے دو۔''

''اس میں سوچنے جیسا کچھ نہیں ہے۔'' وہ سرد مہری سے بولا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار نمایاں تھے۔

سارہ خاموشی سے گاڑی چلا رہی تھی۔ اس کے ذہن میں سوچوں کے جھکڑ چل رہے تھے۔ ایک طرح سے بہلول درست ہی کہہ رہا ہے، ابھی تک اس کے بارے میں کسی کو کچھ علم نہیں ہو پایا تھا وہ اسے کسی مناسب جگہ چھوڑ کر واپس جا سکتی تھی۔ دوسری صورت میں جیسے ہی یہ بات کھلتی، وہ بھی مفرور قرار دے دی جاتی۔ اس کی دس سال کی محنت اور سب کچھ ختم ہو جاتا۔ اس کے کانوں میں ردا کی آواز گونج رہی تھی مگر وہ کیا واقعی اس جان لیوا مشکل میں بہلول کو تنہا چھوڑ سکتی تھی۔ یہ سوال حقیقت، عقل، سوچ اور فائدے نقصان کی تمام انڈکسوں کے کورس سے باہر ہونے کے باوجود اس کے لیے سب سے اہم تھا۔ وہ اسے اس طرح چھوڑ کر نہیں جا سکتی تھی مگر مسئلہ وہ خود تھا جو اسے اپنے ساتھ رکھنے پر اس سے مدد لینے پر تیار نہیں تھا۔

اس نے سر جھٹکا، وہ کافی دیر خاموشی سے ڈرائیو کرتی رہی تھی۔ بہلول اس دوران میں سوتا رہا تھا۔ شہر کی طرف مڑتے ہوئے اس کی طرف دیکھا، گلا صاف کیا اور آواز دی۔ ''بہلول...... ہم پہنچنے والے ہیں۔''

بہلول نے اس کی آواز پر جنبش بھی نہیں کی تھی۔

''بہلول......'' اس نے پھر آواز دی۔ پھر ہاتھ بڑھا کر اس کے بازو کو ہلایا۔ بہلول کے بازو کو چھوتے ہی اس نے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا تھا۔ وہ بری طرح تپ رہا تھا۔ سارہ نے فوری طور پر کار کو ایک جانب کر کے روکا اور بہلول کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ اسے بہت تیز بخار تھا۔ اچانک تیز بخار نے سارہ کو حواس باختہ کر دیا۔ اس کے چھونے اور بار بار آواز دینے پر وہ کچھ کسمسایا پھر یک دم کپکپانے لگا۔ سارہ کا دل بند سا ہونے لگا تھا۔ وہ تیزی سے نیچے اتری اور ڈکی سے کمبل نکال کر لائی اور اسے اچھی طرح اوڑھا دیا۔ اس کے دانت اب تک بج رہے تھے۔

''اچانک تیز بخار۔'' وہ بڑبڑائی۔ ''اس کی وجہ انفیکشن بھی ہو سکتا ہے۔'' وہ دوبارہ ڈرائیونگ سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی۔ ''اب میں کیا کروں۔'' اس کے ذہن میں پہلا

آپشن اسپتال کا ہی آرہا تھا مگر وہ جانتی تھی کہ اسپتال کا رخ مسائل کا پنیڈورا بکس کھول دے گا۔ ''پھر......'' اس نے اضطرابی انداز میں چند لمحے سوچا پھر ایکسلریٹر پر پیر رکھ دیا۔

☆☆☆

سارہ چوکیدار کی مدد سے بہلول کو لفٹ اور پھر وہاں سے اپنے اپارٹمنٹ تک لے آئی تھی۔ وہاں سے اس کی جگہ سلمٰی خالہ نے لے لی تھی۔ بہلول غنودگی کی حالت میں لڑکھڑاتے ہوئے چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے بستر پر لٹانے کے بعد سارہ نے اس کے جوتے اتارے اسے موٹا کمبل اوڑھایا اور کمرے سے باہر نکل آئی۔ سلمٰی خالہ وہیں کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھیں۔

وہ اپنی ملازمت کی وجہ سے کئی برسوں سے شہر میں مقیم تھی۔ بابا اگرچہ اس سے قدرے ناراض تھے مگر اسے شہر کے اچھے پوش علاقے میں دو بیڈروم، ڈرائنگ، لاؤنج پر مشتمل یہ اپارٹمنٹ انہوں نے دلایا تھا۔ سلمٰی خالہ پچھلے دس سالوں سے ان کے ہاں ملازمت کر رہی تھیں۔ اماں نے انہیں اس کے ہمراہ کر دیا تھا تاکہ وہ اس کے مزاج کے مطابق اس کے کھانے پینے اور گھر کا خیال رکھ سکیں اور واقعی ان کی موجودگی سارہ کے لیے بہت سی آسانیوں کا سبب تھی۔

''سارہ بی بی سب خیر ہے نا؟ ان کو کیا ہوا ہے؟'' انہوں نے بالآخر پوچھا۔

''سلمٰی خالہ یہ میرا کلاس فیلو بھی ہے اور پولیس والا بھی...... یہ بہت بیمار ہے اور شاید دو چار دن یہاں رہے گا۔ بے چارے کے ماں باپ بھی نہیں ہیں۔ نہ ہی کوئی خاندان......'' آخری جملہ اس نے خالہ کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''آئے ہائے......اچھا کیے تم بٹیا جو اس بچے کو یہاں لے کر آئے۔'' وہ اپنے مخصوص حیدرآبادی انداز میں بولیں۔ ''کیسا شہزادے جیسا بچہ ہے۔ ہم ابھی یخنی بنا کر لاتے ہیں اور اگر تم بولو تو ماتھے پر ٹھنڈی پٹیاں رکھ لیتے تاکہ بخار کم ہو جائے؟'' وہ ہمدردی سے کہہ رہی تھیں۔ سارہ کو ان سے اسی ردِعمل کی توقع تھی۔ وہ پھیکے سے انداز میں مسکرائی اور بولی۔

''خالہ میں پہلے ردا سے بات کر لیتی ہوں پھر جیسے وہ کہے گی کر لیں گے، یہ اسی کا ہی مریض ہے۔''

''یہ تو بہت ہی صحیح بولے تم......تم ڈاکٹر بٹیا کو فون لگاؤ، ہم تمہارے لیے کافی بنا کر لاتے...... تھکے ہوئے لگ رہے تم مُنّا بہت۔'' ان کے جاتے ہی سارہ نے ردا کا نمبر ملایا۔

''سارہ، سب ٹھیک ہے نا؟'' ردا فون اٹھاتے ہی بولی۔ ''یہاں تو ابھی تک کچھ نہیں ہوا ہے نہ ہی کوئی گھر آیا ہے۔''

''گڈ......'' وہ بولی۔ ''میں ٹھیک ہوں بس ایک بات پوچھنی ہے تم سے۔'' اس کے بعد اس نے بہلول کی حالت کی مختصر تفصیل اس کے سامنے رکھ دی تھی۔

''دیکھو سارہ تمہیں وہی کرنا چاہیے جو اس وقت ضروری ہے۔ اسے اسپتال لے کر جانا، اسے مدد کی ضرورت ہے۔''

''وہ درست ہے مگر وہ اسپتال نہیں جاسکتا۔''

''اووف......کان کھول کر سن لو سارہ اگر یہ مر گیا تو اس کی ذمے دار تم ہو گی، میں نہیں۔'' وہ بگڑ کر بولی۔ ''تم نے اس کے زخم دیکھے؟''

''نہیں۔''

''تو دیکھ کر مجھے صورتِ حال بتاؤ۔''

''او کے، تم ایک منٹ ہولڈ کرو۔''

وہ کمرے میں واپس آئی تو بہلول اسی طرح لیٹا ہوا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ اب کپکپا نہیں رہا تھا۔ سارہ نے اس کی قمیص ہٹا کر بینڈیج کو نرمی سے کھولا۔

''ردا! ایک طرف سے تھوڑا لال ہو رہا ہے۔''

''او کے کیا اس پر سرخ دھاریاں سی ہیں۔ مواد یا کچھ نکلتا نظر آرہا ہے؟''

''نہیں۔'' سارہ نے اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد بتایا۔

''اس کے گھٹنے کی چوٹ بھی دیکھو۔''

سارہ نے اس کے سینے پر ڈریسنگ اور کمبل برابر کر کے شلوار کا پائنچہ چڑھایا۔ اس بار بہلول کے منہ سے کراہ نکل گئی تھی مگر وہ زخم بھی اسی طرح تھا۔

''گڈ اس کا مطلب ہے کہ اس کی باڈی انفیکشن کا مقابلہ کر رہی ہے۔ میں دواؤں کے نام اور ڈوز تمہیں ایس ایم ایس کر رہی ہوں وہ منگوا کر کھلاؤ، پانی زیادہ دینا ہے اور کچھ نہ کچھ لیکویڈ خوراک، بسکٹ وغیرہ بھی۔ اگر چوبیس گھنٹے میں انفیکشن نہ بڑھا تو سب ٹھیک ہو گا ورنہ اسے ہر حال میں اسپتال لے جانا ہو گا، سمجھ گئیں۔''

''ہاں۔'' چند لمحے کی مزید گفتگو کے بعد اس نے فون بند کر دیا۔ ردا نے اسے تنبیہ کر دی تھی کہ اسے صبح فون کر کے ساری صورتِ حال لازمی بتا دی جائے۔ ''اگر تمہارا فون

نہیں آیا تو میں خود ایمبولینس کو فون کردوں گی سارہ۔'' اس نے سخت لہجے میں کہا۔ ''میں یہاں پھنسی ہوئی ہوں ورنہ تمہیں اس حالت میں اکیلا نہیں چھوڑتی۔''

فون میز پر رکھتے ہوئے اسے ردا کا جملہ یاد کر کے ہنسی آگئی تھی بہلول اسے بھی ساتھ رکھنے پر تیار نہیں تھا اور ردا بھی اس کے ساتھ ہوتی تو وہ کیا کرتا...... یک نہ شد دو شد۔ اس نے کرسی پر بیٹھ کر آنکھیں بند کرتے ہوئے سوچا۔

☆☆☆

وہ جھاڑیوں، درختوں، پتھروں پر گرتا پڑتا بھاگ رہا تھا۔ اس کا جسم درد سے ٹوٹ رہا تھا۔ پیر زخمی ہو چکے تھے۔ بھاگتے بھاگتے اس کا پیر کسی سخت پتھر پر پڑا اور وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔ عین اسی وقت کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ بہلول تیزی سے مڑا اور اس نے حملہ آور کا ہاتھ پکڑ کر اسے جکڑ لیا۔ عجیب بات یہ تھی کہ اس عمل میں خود اسے زیادہ تکلیف ہو رہی تھی۔

''بہلول...... بہلول...... کیا کر رہے ہو تم؟'' زوردار آواز نے اسے گویا گہری نیند سے جگا دیا تھا۔ وہ کسی نرم بستر پر لیٹا ہوا تھا اس کے ہاتھ میں سارہ کا بازو تھا جو بمشکل اپنا توازن برقرار رکھے کھڑی تھی۔

''اوہ سارہ تم...... معاف کرنا آئی ایم سوری، پتا نہیں میں کیا خواب دیکھ رہا تھا۔'' اس نے گڑبڑا کر اس کا بازو چھوڑ دیا۔ پھر اٹھ کر بیٹھنا چاہا مگر اس کا سر چکرا کر رہ گیا۔

''اٹھو مت، لیٹے رہو۔'' سارہ دوسرے ہاتھ سے اپنے بازو کو دباتے ہوئے بولی۔

''آئی ایم ویری سوری۔'' وہ اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھامتے ہوئے بولا۔ 'میں ہوں کہاں؟ مجھے تو صبح گاڑی کے سفر کے بعد کچھ بھی یاد نہیں...... مجھے کیا ہوا تھا سارہ؟''

''بخار...... تمہیں تیز بخار ہو گیا تھا وہ تو خدا کا شکر ہے کہ انفیکشن اس طرح نہیں ہوا جس کا خطرہ تھا اور دواؤں نے بھی اپنا کام دکھایا۔ میں تمہیں اسپتال لے جا نہیں سکتی تھی اس لیے اپنے گھر لے آئی اور ہاں گاڑی میں ہم آج صبح نہیں کل صبح تھے۔''

''اچھا۔'' اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ''یعنی میں پورا دن اور پوری رات سوتا رہا، تم نے مجھے جگایا کیوں نہیں؟''

''کیسے...... جادو کی چھڑی سے جگاتی...... تم بے ہوش تھے اتنا تیز بخار تھا۔ اب زیادہ باتیں مت بناؤ پہلے ناشتا کرو۔'' وہ بولی۔

اتنے میں سلمیٰ خالہ بھی ٹرے لے کر اندر داخل ہو گئی تھیں۔

''اٹھ گئے بیٹا تم...... اللہ کا شکر ہے کہ وہ تم کو بہتر کیے۔ ہماری سارہ بی بی تو پوری رات جگی ہیں۔ ہر گھنٹے پر تمہارا بخار بھی چیک کرتی رہی ہیں۔''

''آپ۔'' وہ ان کو دیکھ کر اٹھنے لگا۔

''نکو، نکو...... تم ایسی اچ رکو ہم تکیہ لگاتے سرہانے تاکہ ناشتا کر پاؤ۔'' وہ سارہ کے ہاتھ میں ٹرے دیتے ہوئے بولیں۔

''یہ سلمیٰ خالہ ہیں یہاں میرے ساتھ رہتی ہیں۔'' ان کے جانے کے بعد سارہ نے اس کی سوالیہ نگاہوں کے جواب میں بتایا۔

''یہ سب کچھ غلط ہو گیا ہے سارہ۔'' ناشتے کے بعد وہ بولا۔ ''میں جتنا تمہیں اس سے دور رکھنا چاہ رہا ہوں، سب کچھ اتنا ہی گڈمڈ ہوتا جا رہا ہے۔ اب میں بہتر ہوں اور آج ہی یہاں سے چلا جاؤں گا۔''

''تمہارا دماغ درست ہے، کھڑے تم ہو نہیں سکتے، اس حالت میں کہاں جاؤ گے؟'' سارہ بگڑ کر بولی۔

''کہیں بھی...... اور میں بہتر ہوں، ایسا نہ ہو کہ فیصل یا سکندر کو اس جگہ کا یا تمہارے بارے میں علم ہو جائے، وہ یقیناً سکون سے نہیں بیٹھیں ہوں گے۔''

''ہاں تمہاری تلاش ابھی وہیں ہو رہی ہے اور میرے حوالے سے کسی کو کچھ علم نہیں ہوا ہے۔'' سارہ نے بتایا۔ ''تم کو حقیقت پسند بننے کی ضرورت ہے اور اگر تم مجھ سے ساری بات کر لو گے تو میں شاید تمہاری مدد کر سکوں گی۔''

''مگر مجھے تمہاری مدد کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے۔'' سارہ اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولی، اس کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔

''سارہ......'' بہلول کی آواز پر وہ دروازے کے پاس پہنچ کر رکی مگر اس نے اسے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔

''تم میری بات کا مطلب سمجھتی ہو۔'' اس بار اس کا لہجہ نرم تھا۔

''میں صرف یہ جانتی ہوں کہ تمہیں گولی لگی ہے اور تمہیں اس وقت آرام اور دوا کی ضرورت ہے۔ میں بھی سمجھ گئی ہوں کہ تمہیں میری مدد کی ضرورت نہیں ہے مگر تم مطمئن رہو بہلول میں تمہیں صرف چند دن کے لیے تمہاری توانائی بحال کرنے کا ایک موقع اور رکنے کی جگہ دے رہی ہوں،

اس کے علاوہ اور کچھ نہیں...... اب تم آرام کرو، تم جیسے ہی بہتر ہوگے میں تمہیں جانے سے نہیں روکوں گی۔'' وہ یہ کہہ کر کمرے سے نکل گئی تھی۔

☆☆☆

بہلول دروازے کو گھورتا رہ گیا تھا، سارہ سچ ہی کہہ رہی تھی، وہ کسی کی مدد لینے کو تیار نہیں ہوتا تھا نہ ہی وہ آسانی سے کسی پر اعتماد کر پاتا تھا...... یہ سب سچ تھا۔ وہ ایسا ہی تھا مگر وہ ایسا کیوں بن گیا تھا یہ اس کے علاوہ کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ وہ تو زندگی کو انجوائے کرنے والا نوجوان تھا۔ اس کے اردگرد سب کچھ بہت اچھا تھا۔ ماں باپ کا اکلوتا بیٹا...... ہاں ڈیڈ اور امی کی ہمیشہ ہی کم بنتی تھی معروف بھی دونوں بہت رہتے تھے۔ جتنی دیر ساتھ رہتے اس میں بھی خاموشی کے وقفے کو بس روزمرہ کے کام کاج کے حوالے سے کوئی بات ہی توڑ پاتی۔ بہلول نے انہیں کبھی ہنسی مذاق کرتے یا لڑتے جھگڑتے بھی نہیں دیکھا تھا۔ اسی لیے جب اس رات ان کے کمرے سے چیخنے کی آواز آئی تو وہ اچھل کر وہاں پہنچا، ڈیڈ کا چہرہ پیلا پڑا ہوا تھا اور امی صوفے پر بیٹھی تھیں۔

''یہ...... تمہاری ماں مجھ سے طلاق لینا چاہتی ہے جو میں اسے کبھی نہیں دوں گا۔'' بہلول کے استفسار پر انہوں نے بتایا۔ ''اگر میری زندگی میں اس کی وجہ سے کبھی کوئی خوشی نہیں آئی تو یہ بھی خوش نہیں رہے گی۔'' یہ اسے بہت بعد میں پتا چلا کہ ڈیڈ اپنی کسی کلاس میٹ سے شادی کرنا چاہتے تھے خاندان والوں نے انہیں مجبور کر کے امی سے ان کی شادی کی، انہوں نے ساری عمر امی کو ہی اس کا ذمے دار سمجھا۔ دوسری طرف امی بھی اس شادی سے کبھی خوش نہیں تھیں اور اب انہیں کسی سے محبت ہوگئی تھی۔ انہوں نے یہ بات بہلول کے سامنے بھی قبول کی تھی۔ وہ اپنے فیصلے میں اٹل تھیں مگر اس کے ڈیڈ نے بھی اپنی ہی بات پوری کر دکھائی تھی۔ ایک رات وہ ہارٹ اٹیک سے چل بسے۔ بہلول کے لیے محبت اور رشتوں پر اعتبار بھی ان کے ساتھ ہی دم توڑ گیا تھا۔ زندگی اس کے لیے گویا بے مقصد سی ہوگئی تھی۔ وہ اس گھر میں امی کے ساتھ نہیں رہ پا رہا تھا اس کا دم گھٹتا تھا اس لیے وہ شہر ہی چھوڑ گیا تھا۔ مزید ستم یہ ہوا کہ جس شخص سے شادی کے لیے امی نے اپنے گھر کو اجاڑ لیا تھا اس نے بھی ان سے شادی نہیں کی۔ ان کی عدت کے دوران ہی موقع ملنے پر وہ امریکا جا بسا تھا۔ بہلول اس کے بعد صرف ایک مرتبہ امی کی شدید بیماری کی اطلاع پر گھر گیا تھا۔ انہوں نے اس کے بازوؤں میں ہی دم توڑا تھا۔ ان سالوں نے اسے یہ سکھا دیا تھا کہ دوسروں پر کیا گیا اعتماد ہمیشہ نقصان پہنچاتا ہے۔ اس سبق کی تازہ قسط فیصل اور سکندر نے اسے دکھائی تھی۔ یہ اس کا اصول تھا۔ وہ کسی کی مدد نہیں لینا چاہتا تھا خصوصاً سارہ کی...... سارہ کی موجودگی اسے کمزور کر دیتی تھی۔ یونیورسٹی میں بھی وہ اسے اچھی لگتی تھی لیکن اب اتنے برسوں بعد اچانک ہونے والی اس ملاقات کے بعد سے وہ اسے بہت اچھی لگنے لگی تھی۔ یہ اس کے لیے خطرے کی گھنٹی تھی۔ اسے زندگی میں کوئی تعلق نہیں بنانا تھا اور وہ سارہ کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا اس لیے بہتر یہی تھا کہ وہ اس سے دور چلا جائے۔ اس کی سنہری رنگت، دمکتی آنکھیں، خوب صورت تراشیدہ بال اس پریشانی میں بھی اسے سب کچھ بھلانے کی طاقت رکھتے تھے۔ اسے اس کی مدد نہیں لینی تھی نہ ہی اسے کسی مشکل میں ڈالنا چاہتا تھا۔ وہ ابھی اسی وقت چلا جائے گا۔ اس نے سوچا اور اٹھنے کی کوشش کی۔ گھٹنے کے نیچے درد کا خنجر اور پسلی کے نیچے کی تکلیف تو وہ پھر بھی برداشت کر سکتا تھا مگر کمزوری اس کے لیے مشکل بن گئی تھی۔ بخار گویا اس کی توانائی کو پی گیا تھا۔ وہ دوبارہ بستر پر ڈھے گا۔ سارہ درست کہہ رہی تھی۔ اسے کم از کم ایک یا دو دن آرام کی ضرورت تھی۔

''بس ایک یا دو دن۔'' اس نے خود کو تنبیہ کی، اس کے بعد وہ یہاں سے چلا جائے گا۔

☆☆☆

ایک یا دو دن پھیل کر تین دن پر محیط ہو گئے تھے۔ خالہ سلمیٰ اور سارہ کی دیکھ بھال نے بہلول کو پہلے سے بہت بہتر کر دیا تھا۔ زخموں میں ہلکی پھلکی تکلیف تو تھی مگر اب وہ خود کو قدرے بہتر پا رہا تھا۔ اس کے ہوش میں آنے کے اگلے دن سارہ کی چھٹیاں ختم ہو گئی تھیں اور اس نے دفتر جانا شروع کر دیا تھا۔ ردا سے بھی ابھی تک کسی نے رابطہ نہیں کیا تھا خود اس کے دفتر میں بھی سب خیر تھی۔ اس حادثے کے بعد سے اسے یوں بھی دفتری کام دیا گیا تھا۔ اس کے کندھے کے ٹھیک ہوجانے کے بعد ہی اس کی اپنے کام پر واپسی ہونی تھی۔ پہلے دن دفتر سے واپسی پر وہ بہلول کے لیے چند جوڑے کپڑے، ایک موبائل فون اور سم خرید کر لائی تھی۔ بہلول نے کچھ اعتراضات کے بعد ان چیزوں کو ادھار کی شرط پر قبول کر لیا تھا۔ وہ اس کا خیال رکھ رہی تھی مگر زیادہ تر وقت مصروفیت کی چادر اوڑھے رہتی۔ اس دن کی گفتگو کے بعد اس کا دل کچھ بجھ سا گیا تھا۔

وہ دفتر میں اس کا دوسرا دن تھا۔ چھٹی سے کچھ دیر پہلے

اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف بہلول تھا۔
''بہلول سب خیریت ہے نا؟''
''ہاں، فی الحال تو سب ٹھیک ہے۔'' اس کی آواز میں کچھ فکر جھلک رہی تھی۔ ''میں صرف یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ تم واپس آتے ہوئے محتاط رہنا۔''
''وہ کیوں؟'' سارہ نے پوچھا۔
''پتا نہیں، یہ میرا وہم ہے یا حقیقت مگر ایک گرے کار سارا دن سامنے والی سڑک پر کھڑی رہی ہے۔ سیاہ شیشوں کی وجہ سے اندر دیکھنا ناممکن ہے۔''
''کیا تم اس کی نمبر پلیٹ دیکھ سکتے ہو؟'' سارہ نے پوچھا۔
''نہیں یہاں سے وہ نظر نہیں آرہی۔''
''اوکے میں اسے واپسی میں چیک کرتی ہوں۔''
''اپنا خیال رکھنا۔'' اس نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

بہلول فون بند کرتے ہوئے بھی پردے کی درز ہٹائے باہر دیکھ رہا تھا۔ وہ سرمئی کار ہی اس کی توجہ کا مرکز تھی۔ اسے شک تھا کہ یہ کار اس نے کل بھی کسی وقت یہاں دیکھی تھی مگر آج تو یہ یہاں سے ہلی ہی نہیں تھی۔ وہ مڑنے ہی لگا تھا کہ ایک میرون چھوٹی وین اس کار سے کچھ فاصلے پر آرکی۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک مرد اور ایک خاتون باہر آئے۔ ایک لمحے کو بہلول ساکت سا ہوگیا، ان میں سے ایک بالکل سکندر جیسا تھا۔ پھر اس نے مڑکر سر سے کیپ اتاری اور کار میں رکھ دی اس کے سفید بال دور سے صاف نظر آرہے تھے۔ بہلول نے گہری سانس لی، سکندر کے بال سیاہ تھے۔ وہ دونوں شاید کسی دکان پر کام سے آئے تھے کیونکہ چند ہی منٹوں بعد وہ واپس کار میں آبیٹھے تھے اور کار زن سے وہاں سے نکل گئی تھی۔ انہوں نے سرمئی کار کی طرف دیکھا بھی نہیں تھا۔ ''شاید میں وہمی ہوگیا ہوں۔'' اس نے کھڑکی کے پاس سے ہٹتے ہوئے سوچا۔ یہ اس کا خوف تھا جو روپ بدل بدل کر اسے پریشان کررہا تھا۔ واقعی بہت ہوگیا تھا۔ وہ کل یہاں سے چلا جائے گا، اس نے فیصلہ کیا۔ وہ سارہ کو ان کی نظروں میں نہیں آنے دے گا اور اس کا واحد راستہ یہاں سے دور جانا تھا۔

☆☆☆

''تمہیں یقین ہے کہ وہ وہم ہی تھا؟'' سارہ نے اسے غور سے دیکھا، ویسے تو مجھے بھی ایسی کوئی گڑبڑ محسوس نہیں ہوئی۔''
''ہاں، ایسا ہی لگتا ہے۔'' وہ سر جھٹک کر بولا۔
''ویسے وہ دونوں جن کا تم نام لیتے ہو دیکھنے میں ہیں کیسے؟''
''تم یہ جان کر کیا کروگی؟'' اس نے پوچھا پھر خود ہی بولا۔ ''شاید یہ جاننا تمہارے لیے بہتر ہی رہے گا۔ سکندر لمبی قامت کا دبلا پتلا انسان ہے، سیاہ بال سیاہ آنکھیں، لیے دیے رہتا ہے۔ فیصل تھوڑا موٹا ہے اس کا قد بھی 5 فٹ سے زیادہ نہیں۔ وہ گنجا ہے، گول شیشے کی عینک لگاتا ہے دیکھنے میں وہ بہت خوش مزاج لگتا ہے لیکن ایسا ہے نہیں۔ وہ بہت سفاک طبیعت کا مالک ہے۔'' وہ سانس لینے کے لیے رکا پھر بولا۔ ''میں اب پہلے سے بہت بہتر ہوں کل صبح میرا خیال ہے کہ مجھے نکلنا چاہیے۔''
''میرا تو خیال ہے کہ ہمیں آج نکلنا چاہیے۔'' وہ اس کی توقع کے خلاف مسکرا کر بولی۔ ''یہاں قریب میں ایک بڑا اچھا تھیم پارک ٹائپ کا ریسٹورنٹ ہے وہاں کافی بہت اچھی ملتی ہے۔''
''کیوں نہیں۔'' بہلول مسکرایا۔ ''تم مجھ سے جان چھوٹ جانے کی خوشی میں ٹریٹ دے رہی ہو۔'' سارہ اسے گھور کر رہ گئی۔

کافی واقعی بہت اچھی تھی۔ وہ دونوں کافی دیر تک یونیورسٹی کے دوستوں کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ واپسی سے پہلے بہلول واش روم گیا عین اسی وقت وہ اندر داخل ہوئے تھے۔ سارہ انہیں دیکھتے ہی ٹھٹک گئی تھی۔ ان دونوں کے ساتھ ایک خاتون بھی تھی۔ دونوں بہلول کے بتائے ہوئے حلیے کے عین مطابق تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ لمبے دبلے شخص کے بال سیاہ کے بجائے سفید تھے۔ انہوں نے بیرونی دروازے کے سامنے کی ٹیبل لی تھی۔ وہاں سے ان کا سارہ اور بہلول کی میز کو دیکھ پانا ناممکن تھا۔ مگر ان کی نظروں میں آئے بغیر باہر بھی نہیں نکل سکتے تھے۔ سارہ کا دل جیسے اس کے حلق میں آگیا۔ اگر یہ وہی تھے تو اس کا مطلب یہی تھا کہ انہیں بہلول کی یہاں موجودگی کا علم ہوچکا ہے، انہوں نے اسے ڈھونڈ لیا تھا اور اب سارہ کے پاس اسے بچانے کے لیے چند ہی منٹ رہ گئے تھے۔
وہ تیر کی سی تیزی سے اٹھی اور واش رومز کی جانب بڑھ گئی۔ ایک ویٹر نے درمیان میں اسے وومن واش رومز کی جانب لے جانا چاہا مگر وہ اسے نظر انداز کرتے ہوئے مردوں کے واش روم میں داخل ہوگئی۔ بہلول بیسن پر ہاتھ

دھور ہا تھا، اسے دیکھ کر اس نے ایک ابرو اچکائی۔
''کیا ہو گیا سارہ؟'' وہ اس کے انداز سے ٹھٹکا۔
''خاموش رہو۔'' وہ ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے اس کا بازو پکڑے کوریڈور کے کونے تک لے آئی۔
''وہ...... سامنے دیکھو، اس میز پر جو لوگ بیٹھے ہیں، انہیں جانتے ہو؟''
''اوہ......'' بہلول کے ہونٹوں سے گہری سانس برآمد ہوئی۔ ''فیصل اور سکندر...... شام کو میں نے اسی عورت اور سکندر کو وہاں دیکھا تھا تمہارے اپارٹمنٹ کے نیچے اس نے اپنے بال سفید کروا لیے ہیں۔ یہاں سے باہر نکلنے کا کوئی اور راستہ ہے؟'' اس نے پوچھا۔
''نہیں، دروازہ ایک ہی ہے ہاں پشت پر غالباً کچن اسٹاف کے لیے دروازہ ہے۔'' وہ بولی۔
''بس ہم وہیں سے نکلیں گے آ جاؤ۔'' وہ اس کا بازو تھامتے ہوئے بولا۔
''مگر اسٹاف کی نظروں میں آئے بغیر یہ ممکن نہیں ہے۔'' سارہ نے کہا۔
''کوئی بات نہیں۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔
''سنو۔'' اس نے ایک ویٹر کو آواز دی۔ ''دوست ہمیں ایک دوست کو سرپرائز دینا ہے، کیا ہم اس دروازے سے باہر نکل سکتے ہیں۔''
''مگر اس میں کیا سرپرائز ہے؟'' ویٹر بولا۔
''اصل میں ہم یہاں سے نکل کر باہر سے واپس آ کر انہیں حیران کریں گے۔''
''تمہیں بھی ڈبل ٹپ ملے گی، فکر نہ کرو۔'' سارہ جیب سے ایک نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

سرخ نوٹ نے اس کے اعتراضات پر پانی ڈال دیا تھا۔ وہ خود انہیں دروازہ کھول کر باہر پہنچا آیا تھا۔
''یہ بھی شکر تھا کہ رش کی وجہ سے انہیں پچھلی سڑک پر کافی فاصلے پر پارکنگ ملی تھی۔ وہ تیزی سے چلتے ہوئے کار تک آئے۔ اندر بیٹھ کر بہلول نے گہری سانس لی۔
''یہ سب میری غلطی ہے۔ میری وجہ سے تم اس سب میں پھنس گئیں۔ مجھے اتنے دن نہیں رکنا چاہیے تھا۔''
''یہ کوئی جواز نہیں ہے وہ تمہیں پھر بھی ڈھونڈ لیتے۔''
''تب تم انہیں کوئی بھی کہانی سنا سکتی تھیں مگر اب وہ تمہیں بھی اس سب کا حصہ سمجھ چکے ہیں، اب تمہاری زندگی بھی اتنے ہی خطرے میں ہے کیونکہ انہیں ڈر ہوگا کہ تم بھی وہ سب جانتی ہوگی جو میں جانتا ہوں۔''
''تو پھر......؟''
''اب ہمیں سب سے پہلے تمہارے لیے کوئی محفوظ جگہ تلاش کرنی ہے۔ تمہارا وہ گھر یا تمہاری بہن کا گھر تمہارے لیے محفوظ نہیں رہے، کیا تمہارا کوئی اور ایسا رشتے دار یا دوست ہے جہاں تم ٹھہر سکو؟ میں اس دوران تیزی سے اپنا کام کروں گا اور پھر تم سے رابطہ کرلوں گا۔''
سارہ نے سر ہلایا۔ ''تم ایک بات بھول رہے ہو میں ایک پولیس وومن ہوں اور میرے ملنے جلنے والے بھی فورسز ہی کا حصہ ہیں اس لیے میرا وہاں جانا صرف سوالوں کو جنم دے گا۔''
''اوکے جب تک میں تمہارے لیے کوئی مناسب جگہ نہیں ڈھونڈ لیتا، تم میرے ساتھ رہو گی۔'' وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ ''وہ خطرناک لوگ ہیں اور میں تمہیں کوئی نقصان پہنچنے نہیں دینا چاہتا۔''
''دیکھو بہلول تم نے کہا کہ تمہیں میری مدد کی ضرورت نہیں ہے، یہ میں نے تسلیم کرلیا۔ اگر تمہیں یہ لگتا ہے کہ میں بھی ان کا ٹارگٹ بن گئی ہوں تو پھر میں ان کا مقابلہ کروں گی دوسری بات یہ ہے کہ میں کوئی چینی کا ڈنر سیٹ نہیں ہوں جسے بحفاظت پیک کر کے کہیں سنبھال کر رکھ دیا جائے۔ میں ایک پولیس والی ہوں اور اپنے کام میں مہارت رکھتی ہوں۔ تمہیں اچھا لگے یا نہیں مگر اب میں اس سارے معاملے کو سمجھنا چاہتی ہوں۔'' وہ ہونٹ بھینچ کر بولی۔
بہلول چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ پھر گویا ہوا۔ ''یہ چھ ماہ پرانی بات ہے۔'' وہ بالآخر بولا۔ ''مجھے منشیات اور اسلحے کی ایک بڑی ڈیل کی ٹپ ملی تھی۔ عبداللہ پہلے چھوٹے موٹے سودے کرتا تھا مگر ان چند مہینوں میں اسے کوئی بڑا کلائنٹ ملا تھا اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے بڑے ڈیلرز میں شامل ہو گیا تھا۔ اس کیس میں فیصل اور سکندر میرے ساتھ کام کر رہے تھے۔ ان کا کام ڈیل بننے کے بعد شروع ہونا تھا اس طرح اس کا کلائنٹ سامنے آ جاتا مگر جب ہم اس دن عبداللہ کے پاس گئے وہاں کلائنٹ موجود نہیں تھا پھر سکندر نے میرے چہرے پر اسپرے کیا اور میں بے ہوش ہو گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہاں کیا ہوا۔ مجھے جب ہوش آیا تو میں ایک بدبودار اور گندی جگہ پر بندھا پڑا تھا۔ میں نے بمشکل اپنے جوتوں میں موجود چاقو نکالا گھٹنوں لگا کر ہاتھوں کی رسی کاٹی اور وہاں سے نکل بھاگا۔ اس رات بہت بارش ہو رہی تھی۔ درختوں کے درمیان سکندر کے بندے نے مجھ

پر دو فائر کیے جن میں سے ایک مجھے لگا جس کی وجہ سے میں گر پڑا۔ وہ دونوں میرے قریب آئے، انہوں نے فیصل سے فون پر بات کی تب تک میں تکلیف میں مگر ہوش میں تھا۔ پھر مجھے دو انجکشن لگائے گئے اور اس تکلیف اور بے ہوشی کی حالت میں سڑک پر پھینک دیا گیا۔ انہیں یقین تھا کہ اس طوفانی بارش میں کوئی نہ کوئی گاڑی مجھے ہٹ کردے گی یا پھر مسلسل بہتا خون میری موت کی وجہ بن جائے گا۔ اسی سڑک پر میں تم کو ملا۔''

''انہوں نے یہ سب پلان کیا ہوگا۔ مجھے جو معلوم ہوا تھا وہ یہ تھا کہ عبداللہ نامی ڈیلر کو قتل کیا گیا ہے اور وہاں سے 5 ملین ڈالرز غائب ہوئے ہیں اور ان دونوں کا الزام تم پر لگایا گیا ہے۔'' سارہ بولی۔ ''کیا وہاں بیورو میں ان کے خلاف کسی سے بات نہیں کی جاسکتی؟'' اس نے پوچھا۔

''مسئلہ یہ ہے کہ یہ گڑبڑ کہیں اوپر تک پہنچی ہوئی ہے۔ پچھلے سال بھر سے میں تین بڑے کیسز پر کام کرچکا ہوں۔ سب کچھ ٹھیک ہونے کے بعد آخری لمحات میں ڈیل خراب ہوجاتی ہے۔ منشیات یا اسلحہ جو بھی آخر ہورہا ہوتا ہے، وہ بھی غائب ہوجاتا ہے۔ اس ساری تفصیل کا علم بھی مجھے بیورو کے کاغذات اور فائلوں کی چھان بین سے ہوا ہے۔''

''یعنی کوئی ہے جو اندر خانے ڈیل بنا رہا ہے اور وہ بڑے افسران میں سے ایک ہوسکتا ہے۔'' سارہ نے سر ہلایا۔

''یہی وجہ ہے کہ میں بیورو پر کال نہیں کررہا کیونکہ میں نہیں جانتا کہ کس کو کال کرنا محفوظ ہے۔'' وہ کندھے اچکا کر بولا۔

اب سارہ کی سمجھ میں ساری کہانی آرہی تھی۔ اچانک اسے سلمیٰ خالہ کا خیال آیا۔ ''بہلول انہیں میرا گھر معلوم ہے اگر ہم واپس نہیں جاتے تو وہ سلمیٰ خالہ کو نقصان تو نہیں پہنچائیں گے؟''

''نہیں، اوہ، وہ کوئی ڈان ٹائپ مجرم نہیں ہیں کہ جہاں سے گزریں وہاں تین چار لاشیں ٹپکا دیں۔ میری موت ان کے لیے دہرے فائدے کا سبب ہے۔ ایک تو سیلف ڈیفنس کیونکہ میں سب کچھ جان کر ان کے لیے خطرہ بن گیا ہوں اور دوسرے انہیں ان سارے گناہوں کی گٹھری کو رکھنے کے لیے ایک کندھا درکار ہے اور تمہاری اس لیے کہ انہیں یقین ہوچکا ہوگا کہ تم بھی سب کچھ جانتی ہو، یقین کرو سارہ میں ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ تم اس مشکل میں پھنس جاؤ...... مجھے بہت افسوس ہے۔'' وہ ندامت سے کہہ رہا تھا۔

''مجھے بھی، مگر یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ یہ تمہاری غلطی نہیں ہے، میرا فیصلہ مجھے یہاں تک لایا ہے لہٰذا یہ سب سوچنا بند کرو۔'' اسی وقت اس کے فون کی گھنٹی بجی۔

''یہ عدنان کی کال تھی۔ عدنان اس کا دفتری ساتھی اور اچھا دوست تھا۔ وہ اس پر اعتماد کرتی تھی۔ اس نے ایک لمحے سوچا پھر فون کو کار سے اٹیچ کرکے بٹن دبا دیا۔

''سارہ تم اس وقت کہاں ہو؟'' اس نے ہیلو وغیرہ کے تکلف کے بغیر سوال کیا۔

''میں گاڑی چلا رہی ہوں اور ویسٹ اینڈ کے پل پر ہوں۔'' وہ بولی۔

''بہت احتیاط کرو، پولیس کا سامنا مت کرنا اور کسی ایسی سڑک سے مت گزرنا جہاں چیکنگ ہورہی ہو۔'' وہ قدرے پریشان نظر آرہا تھا۔

''کیا ہوا ہے عدنان؟''

''تمہیں معطل کرکے تمہارے وارنٹ جاری کردیے گئے ہیں۔'' اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

''کیا؟'' وہ یک دم ساکت سی ہوگئی تھی۔

''ہاں مجھے بھی اتنی ہی حیرت ہوئی تھی تم تو جانتی ہو کہ اس طرح کی کارروائیاں علی الصباح کی جاتی ہیں مگر نہ جانے انہیں کس بات کی ایسی جلدی تھی کہ انہوں نے تمہارا آرڈر آج ابھی تھوڑی دیر پہلے نکالا ہے...... سنا ہے کہ بیورو کی جانب سے محکمے پر شدید دباؤ تھا۔''

''اچھا۔'' وہ صرف اتنا کہہ پائی۔

''مجھے یقین ہے کہ تم جو کررہی ہو، اسے اچھی طرح سمجھ کر کررہی ہوگی۔'' وہ بولا۔ ''مجھے تم پر اعتماد ہے مگر یہاں یہی بات ہورہی ہے کہ تم ایک قاتل کی سہولت کاری کررہی ہو۔'' اس کے ان الفاظ کے ساتھ بہلول کا چہرہ بھنچ سا گیا۔

''عدنان وہ مجرم نہیں ہے، اسے پھنسایا جارہا ہے۔''

''ٹھیک ہے تمہیں کبھی بھی میری مدد کی ضرورت ہو تو صرف ایک فون کال کردینا۔'' وہ بولا۔

''شکریہ۔'' وہ بولی اور لائن کاٹ دی وہ تیزی سے سوچ رہی تھی پھر اس نے گاڑی کا رخ موڑا۔

''نہیں، سارہ تمہیں مزید پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم ان سے کہہ سکتی ہو کہ میں نے تمہیں یرغمال بنا لیا تھا۔'' وہ بولا۔

''اچھا اور اس دوران تم مجھے دو دن دفتر بھی جانے دیتے رہے؟'' وہ مسکرائی۔

''اوہ ہاں، ہم کچھ اور سوچ لیتے ہیں۔ سکندر اور فیصل

سے جان بچانے کے لیے بھاگنا ایک الگ بات ہے مگر اپنے ہی ڈپارٹمنٹ سے چھپنا الگ...... میں خود کو ان کے حوالے کرنے کے لیے تیار ہوں۔ ہم کوشش کریں گے کہ انہیں حقائق سمجھا سکیں۔''

''پلیز بہلول اب سچائی کو ثابت کرنا پہلے سے بھی زیادہ ضروری ہو گیا ہے، مجھے اس سب سے بچانے کا اب صرف یہی ایک طریقہ ہے۔'' وہ بولی۔ اور گاڑی روک دی۔ ''میں کارڈ کے ذریعے کچھ رقم نکلوا رہی ہوں، ہمیں اس کی ضرورت پڑے گی۔''

بینک سے نکل کر اس نے پیٹرول پمپ پر ٹینک فل کروایا تھا۔ اس دوران بہلول مسلسل کچھ سوچ رہا تھا۔

''تم کیا سوچ رہے ہو؟''

''ہمارا تعاقب ہو رہا ہے۔'' وہ چند لمحے کی خاموشی کے بعد بولا۔

''کیا؟ مجھے ایسا محسوس نہیں ہوا۔''

''جب تم بینک میں گئی تھیں تب میں نے ایک سیاہ کار کو نوٹ کیا تھا۔ وہ مسلسل ہمارے پیچھے ہے مجھے شک ہے کہ شاید ان کے بیک اپ پر ایک کار اور بھی موجود ہے۔'' وہ بھاری آواز میں بولا۔

''یعنی کھیل شروع ہو گیا ہے۔'' سارہ نے کہا۔

''شاید، یہ بیورو سے متعلق لوگ ہی ہو سکتے ہیں اگر تم بُرا نہ مانو تو میں گاڑی چلا سکتا ہوں۔'' وہ سارہ کے بازو کو دیکھتا ہوا بولا۔

''کیا تم چلا پاؤ گے میرا مطلب ہے کہ پیر میں تکلیف تو نہیں ہو گی؟''

وہ جواب میں صرف مسکرایا تھا۔

لمحہ بھر میں انہوں نے اپنی نشستیں تبدیل کر لی تھیں اور کار ٹریفک کے سمندر میں داخل ہو گئی۔ ابھی رات کے بمشکل دس ساڑھے دس بجے تھے سڑکیں کاروں اور دیگر سواریوں سے بھری ہوئی تھیں۔ بہلول نے گاڑی کو پُرہجوم سڑکوں پر گھمانا شروع کر دیا تھا۔ سیاہ کار نہایت مہارت اور چابک دستی سے ان کے پیچھے تھی۔ وہ صدر کے علاقے سے گھوم کر ایک پتلی سی گلی میں مڑا۔ سیاہ کار ان کے پیچھے تھی۔ گلیوں میں آگے پیچھے دائیں بائیں گھومتے وہ سیاہ کار سے کچھ فاصلہ بنانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس دوران ایک گلی میں مڑتے ہی انہیں ایک مکان کا گیراج کھلا نظر آیا۔ غالباً مالک مکان گاڑی نکال کر کہیں قریب گیا تھا۔ تب ہی اس نے دروازہ بند کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ اس پورے بلاک میں صرف ایک اسٹریٹ لائٹ روشن تھی۔ بہلول اس گیراج میں کار لیتا چلا گیا۔ اندر آ کر وہ تیزی سے اترا۔ اور اس نے گیراج کے دروازے کو اندر کی جانب کھینچ لیا۔ درمیان میں موجود پتلی سی درز سے وہ باہر کا منظر بہ آسانی دیکھ سکتا تھا۔ سیاہ کار نے اس گلی کے دو چکر لگائے جب وہ کافی دیر تک پلٹ کر نہیں آئی تو وہ گیراج سے باہر نکل آیا۔ چاروں جانب خاموشی اور سکون تھا۔ اس نے گیراج کا دروازہ کھولا، گاڑی میں بیٹھا اور کار زن کر کے باہر نکلتی چلی گئی۔

☆☆☆

''میرے ذہن میں ایک پلان ہے۔'' کافی دیر کی خاموشی کے بعد سارہ بولی۔ وہ ڈرائیو کرتے کرتے ہائی وے پر نکل آئے تھے۔ ''ہمیں اس سب سے باہر آنے کے لیے کسی نہ کسی کی مدد درکار ہے۔''

''متفق، مگر اس شخص کو اتنا طاقتور ہونا چاہیے کہ اثر انداز ہو بھی پائے اور اس طاقت کے باوجود کرپٹ نہ ہو۔'' بہلول مسکرایا۔ ''یہاں کچھ عرصے سے یہ دونوں چیزیں ایک ساتھ ممکن نہیں ہوتیں۔''

''میرے پاس ایک شخص ہے، اگر تم مجھ پر اعتماد کرو تو میں اس سے بات کروں۔''

''کس سے؟'' بہلول نے پوچھا۔

''تیمور شاہ سے۔'' وہ بھی مختصر جواب دے کر خاموش ہو گئی۔

''یہ کون ہے؟''

''یہ ایک طاقتور ایم پی اے ہے۔ بابا کے دوست کا بیٹا ہے اور میرا سابق منگیتر بھی۔'' آخری الفاظ پر بہلول نے اسے چونک کر دیکھا۔ اس کی سوالیہ نظروں کے جواب میں سارہ نے مختصر الفاظ میں پوری تفصیل سے آگاہ کیا۔

''تم نے اس سے منگنی توڑ دی اس کے بعد بھی وہ تمہاری مدد کیوں کرے گا؟''

''وہ میرا دوست ہے اور میں جانتی ہوں کہ اس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے...... کہو کیا کہتے ہو؟''

''مجھے سوچنے دو...... ایک سوال اور میرے ذہن کو پن کر رہا ہے آخر انہیں ہماری ایگزٹ لوکیشن کا علم کس طرح ہوا تھا کیونکہ یہ تعاقب پل سے مڑنے کے بعد ہی شروع ہوا تھا۔'' وہ بولا۔

''یہ تو میں بھی سوچ رہی تھی میں نے اس بارے میں صرف عدنان سے......'' وہ بولتے بولتے رک گئی۔ ''نہیں

عدنان ایسا نہیں کرسکتا۔''

''مجھے بھی یقین ہے کہ یہ اس نے نہیں کیا۔'' بہلول دھیرے سے بولا۔ ''کسی اور نے کیا ہے جو یہ جانتا تھا کہ وہ تمہارا دوست ہے اور اسے امید تھی کہ وہ تم سے رابطہ کرے گا یہ جو کوئی بھی ہے تمہارے محکمے کا فرد ہی ہوسکتا ہے۔''

''یعنی معاملہ صرف نارکوٹکس اینڈ ویپن بیورو تک محدود نہیں ہے۔'' سارہ نے کہا۔

''ہاں، بیورو پر فائلز کو دیکھنے کے بعد مجھے اندازہ ... ہوا تھا کہ ان کا ریکٹ بہت بڑا ہے۔ ہتھیاروں کی ڈیلز' ان کا غائب کر کے دوبارہ بیچنا یہ ایک بہت بڑا چکر ہے جس میں بہت سارے لوگ شامل ہیں۔'' بہلول بولا۔ ''تم اپنی سم نکال کر فون بند کردو۔ ارے یہ کیا ہو رہا ہے۔'' وہ اچانک بولا۔

اس کے چونکنے پر سارہ نے بھی سامنے کی طرف دیکھا۔ ان کے بالکل آگے ایک بڑے سے کنٹینر والا ٹریلر چل رہا تھا۔ ہائی وے پر یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی مگر وہ ٹریلر انہیں راستہ دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ان کے پیچھے بھی اسی قسم کا دوسرا ٹریلر چل رہا تھا جو لحہ بہ لحہ ان کے قریب آتا جا رہا تھا۔ بہلول نے ہارن بجایا، ڈمپر مارے مگر آگے والا ٹریلر اسی رفتار سے چل رہا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کے پچھلے حصے سے پھسلواں سی دراز کھل گئی۔ اس کی مدد سے کوئی بھی چیز اس پر چڑھائی جاسکتی تھی۔

''یہ کیا کر رہا ہے۔'' سارہ بے اختیار ہو کر بولی۔

''ہمارے لیے جال بُن رہا ہے۔'' بہلول نے جواب دیا۔ ''تم سیٹ بیلٹ لگالو۔'' وہ بولا۔

''اوہ......'' سارہ نے سیٹ بیلٹ کو کھینچا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ پیچھے والا ٹریلر بھی ان کا ساتھی ہے۔'' خطرے کے شدید احساس نے سارہ کی تمام حسیات کو بیدار کردیا تھا۔

''ہاں وہ ہمیں اس ٹریلر کی جانب پش کر رہا ہے جگہ نہ ملنے پر ہمارے سامنے ٹریلر پر کار چڑھانے کے سوا کوئی راستہ نہیں رہ جائے گا۔ ایک بار ٹریلر پر پہنچ جانے کے بعد ہم ان کے قیدی بن جائیں گے۔'' وہ دانت پر دانت جما کر بولا۔

''تو اب تم کیا کرو گے؟'' اس نے پوچھا۔

''وہ جو انہوں نے سوچا نہیں ہوگا۔'' وہ مسکرایا اور ایکسلیریٹر پر پیر رکھ کر گاڑی کو سڑک کے درمیان میں موجود میڈین اسٹرپ کی طرف لے جاتے ہوئے بولا۔ ''یہ موت کے کنویں جتنی گہری نہیں مگر اسی طرز کی جگہ ہوتی ہے جو درمیان سے قدرے گہری تھی۔ بہلول اس میں نہایت مہارت سے کار چلا رہا تھا۔ گاڑی یوں جھٹکے کھا رہی تھی جیسے وہ کار نہیں رولر کوسٹر ہو۔ سارہ نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے تھے اور اپنی جگہ جم کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اچانک سامنے سے آنے والی تیز روشنی نے ان کی آنکھیں چندھیا دیں۔ یہ ایک بڑی بس کی ہیڈ لائٹس تھیں جو تیزی سے ان کی جانب آرہی تھی۔ بہلول نے کار کو دوبارہ گہرائی میں غوطہ دیا۔ اور بس کے گزرتے ہی کار کو جمپ لگا کر مخالف سڑک پر لے آیا۔ ہائی وے پر یہ ایک انتہائی خطرناک اقدام تھا۔ وہ گاڑی کو پھسلاتے ہوئے دوسرے کنارے پر لے گیا اور جھاڑیوں سے ٹکراتے ہوئے بریک لگائی۔ اس کے بعد اس نے گاڑی گھمائی اور واپسی کی رو میں سڑک پر گاڑی اتار دی' وہ تیزی سے واپس شہر کی طرف جا رہے تھے۔ سارہ آنکھیں پھاڑے باہر دیکھ رہی تھی۔

اس کے بازو میں درد کی ٹیسیں بلند ہو رہی تھیں۔ چند ہی لمحوں میں ٹریلرز اور ان کا بچھایا جال ان سے بہت دور رہ گیا۔

☆☆☆

''بیورو جوائن کرنے سے پہلے کیا تم موت کے کنویں میں گاڑی بھی چلاتے رہے ہو؟'' حواس بحال ہوتے ہی سارہ کا پہلا سوال یہی تھا۔ جواب میں بہلول نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ اتنے دنوں میں اس نے پہلی بار اسے کھل کر ہنستے دیکھا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کے چہرے کو دیکھتی رہی تھی۔

''وہ بہت تیز رفتاری سے حرکت کر رہے ہیں، کیا ہم ابھی تمہارے سابق منگیتر سے مل سکتے ہیں؟'' اس نے اچانک پوچھا۔

''میں تیمور کو کال کرتی ہوں۔'' اس نے فون آن کر کے نمبر نکالتے ہوئے کہا۔

''فون تم میرے اس نمبر سے کرو اور ہاں فون کا میڈیا آف کردو اس طرح وہ تمہیں فوراً ٹریس نہیں کر پائیں گے۔''

آدھے گھنٹے میں وہ تیمور کے گھر پر بنے دفتر میں موجود تھے۔ وہ ان کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

''جو کچھ تم بتا رہے ہو، وہ کسی فوری کارروائی کے لیے ناکافی ہے۔'' بہلول سے ساری تفصیل سننے کے بعد وہ بولا۔ ''مجھے کسی سے بھی بات کرنے کے لیے ٹھوس ثبوت درکار

ہیں۔''

''تم کر نہیں سکتے یا کرنا نہیں چاہتے؟'' سارہ نے مایوسی سے پوچھا۔

''وہ درست کہہ رہا ہے۔'' بہلول نے سارہ سے کہا۔

''تم دونوں مجھے میری بات پوری کرنے دو گے؟'' تیموران کو گھورتا ہوا بولا۔ ''میں نے یہ نہیں کہا کہ میں کچھ نہیں کروں گا، میں نے یہ کہا ہے کہ میں سرکاری طور پر کچھ نہیں کر سکوں گا۔ میں اس حوالے سے خود معلومات کراؤں گا اور ذرا سی بھی کوئی چیز کوئی نکتہ ملتے ہی اسے اوپر تک لے جاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' سارہ بولی۔ ''مجھے یقین ہے کہ تمہیں اس کے ثبوت مل جائیں گے۔''

''اوکے...... بہلول اب تم مجھے بتاؤ، بیورو میں کوئی ایسا شخص جو اس سب میں تمہاری مدد کر سکے۔''

''میں کسی اور کی جان کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا اگر آپ کو اپنی تفتیش میں کچھ درست لگے ا آپ ان کا تحفظ کر پائیں تو میں آپ کو نام دے دوں گا۔'' بہلول صفائی سے بولا۔

''ٹھیک ہے مجھے چوبیس گھنٹے دو۔ کل مجھے کال کر لینا۔''

''اور ہم...... ہم ان چوبیس گھنٹوں میں کیا کریں؟'' سارہ نے پوچھا۔

''کسی ہوٹل یا خاموش جگہ پر کسی کی نظروں میں آئے بغیر رہنا ٹھیک ہوگا۔'' تیمور نے جملہ مکمل کر کے سارہ کی طرف دیکھا۔ چند لمحے بعد گہری سانس لی پھر میز پر رکھی نوٹ بک پر کچھ لکھا۔ صفحے کو پھاڑا اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

''یہ میرے ایک دوست کا مکان ہے مکمل فرنشڈ ہے۔ وہ اس وقت شہر میں نہیں ہے، تم لوگ چوبیس گھنٹے کے لیے وہاں رہ سکتے ہو۔ اس کی چابی تمہیں نیچے گارڈ سے مل جائے گی، میں اسے ابھی فون کر دیتا ہوں۔''

''بہت شکریہ تیمور۔'' سارہ کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

''ٹھیک 24 گھنٹے بعد مجھے کال کر لینا کوئی نہ کوئی راستہ نکل آئے گا۔'' وہ بولا۔ ''اور سارہ تم اپنا خیال رکھنا۔''

☆☆☆

مکان واقعی بہت آرام دہ اور پُرسکون علاقے میں واقع تھا۔ اتنی بھاگ دوڑ کے بعد وہ بستر پر گرتے ہی سو گئی تھی۔ آدھی رات کے قریب کسی نے اسے جھنجوڑ کر جگا دیا تھا۔ اپنے قریب ایک سائے کو دیکھ کر وہ اچھل کر اٹھ بیٹھی۔

''میں ہوں بہلول۔'' وہ اس کا بازو پکڑ کر بولا۔

''کیا ہوا ہے؟'' اس نے بھی سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔

''گڑبڑ۔'' وہ ایک لفظ بول کر خاموش ہو گیا۔

''کیسی گڑبڑ؟'' سارہ نے الجھ کر پوچھا۔

''آہستہ بولو...... باہر کچھ لوگ موجود ہیں' وہ ابھی یہاں پہنچے ہیں۔ اگر ہم تیزی سے حرکت کریں تو پچھلے دروازے سے نکل سکتے ہیں۔''

''اوکے۔'' اس نے تیزی سے اپنے جوتے پہنے فون اٹھایا اور کھڑی ہو گئی۔

''انہوں نے ہمیں کیسے ڈھونڈ لیا۔''

''صرف ایک شخص جانتا تھا ہم کہاں ہیں۔'' وہ اس کی طرف مڑ کر بولا۔ ''اب اس سوال کا جواب ڈھونڈنا راکٹ سائنس نہیں ہے۔''

''تیمور......؟ نہیں نہیں وہ ایسا نہیں کر سکتا۔'' وہ بولی۔ بہلول جواب میں اسے گھور کر رہ گیا۔

''ہم اس پر بعد میں بھی مناظرہ کر سکتے ہیں۔'' وہ گویا جل کر بولا تھا۔

پچھلے دروازے پر پہنچ کر وہ ایک دوسرے کو کور کرتے ہوئے باہر نکلے تھے۔ ہر طرف اندھیرا اور خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ مکان کی داہنی جانب کچی سی جگہ پر تین گاڑیاں موجود تھیں۔ یہ پولیس کاریں تھیں مگر ان کے سائرن خاموش تھے۔ اردگرد کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ شاید وہ مکان میں داخل ہو گئے تھے۔

''ہمارے پاس صرف چند سیکنڈز ہیں تم اپنی پن سے ان گاڑیوں کے ٹائرز فلیٹ کر دو، میں اس دوران گاڑی کو دھکا دے کر باہر نکالتا ہوں۔'' وہ بولا۔

چند لمحوں میں سارہ پولیس کار کے ٹائروں کی ہوا نکال کر گاڑی کی طرف آ گئی تھی جسے بہلول دھکا دے کر اس طرف لے آیا تھا۔ اس نے دروازہ کھول کر ایک پیر اندر رکھا ہی تھا کہ اسے کسی رائفل کے چیمبر چڑھنے کی صاف آواز سنائی دی، اگلے ہی لمحے ایک طاقتور فلیش لائٹ نے بہلول کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

''بس بہت ہو گیا ہے۔'' ایک تیز غراتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''میڈم آپ کار سے فاصلے پر آ جائیں اور اپنے ہاتھ اپنے سر پر رکھ لیں تاکہ میں انہیں دیکھ سکوں اور آپ بھی

ڈیئر بہلول صاحب۔'' سارہ نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ وہ گویا ساکت سی ہوگئی تھی۔ فلیش لائٹ کی روشنی میں اس کی نگاہیں بہلول پر جمی ہوئی تھیں جس نے اپنے ہاتھ سر پر رکھ لیے تھے۔

''میں نے کہا ہے کہ کار سے دور ہو جائیں۔'' وہ پھر غرایا۔ اس بار سارہ نے اسے دیکھا تھا۔ وہ اکیلا تھا اس کے ہاتھ میں رائفل تھی اور دوسرے میں فلیش لائٹ' اس کے باقی ساتھی اسے باہر چھوڑ کر اندر گئے تھے مگر یہاں اس بارھویں کھلاڑی نے میدان مار لیا تھا۔

بہلول نے اسی لمحے سارہ کو دیکھا، ان کی نگاہیں ملی تھیں۔ سارہ گاڑی سے ہٹ کر آہستہ آہستہ اس کی طرف کھسکنے لگی تھی۔

''بس اتنا دور کافی ہے۔'' وہ بولا اور خود اس کے قریب آگیا۔ ''تم ایک خوب صورت عورت ہو تمہیں اس چکر میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی۔''

جملہ ابھی اس کے ہونٹوں پر ہی تھا کہ سارہ کا سیدھا ہاتھ گھوما اور اس کی رائفل اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ اس کا گھٹنا اس دوران پوری قوت سے اس کے پیٹ میں جا گھسا تھا۔ وہ اوغ کی آواز نکال کر الٹ گیا۔ بہلول کے لیے اتنی مہلت کافی تھی۔ وہ تیر کی طرح اس پر جھپٹا اور اس کی گردن پر ناپا تلا ہاتھ مارا۔ وہ لحہ بھر میں بے ہوش ہو کر اس کے بازوؤں پر جھول گیا تھا۔

ان کے پاس صرف چند لمحے تھے۔ وہ دونوں تیزی سے کار میں بیٹھے بہلول نے اگنیشن میں چابی گھمائی ... انجن کے اسٹارٹ ہونے کی غراہٹ یقیناً مکان میں موجود افراد نے بھی سن لی تھی۔ ان کی گاڑی کے نکلتے ہی تین چار افراد پولیس کاروں میں بیٹھے تھے مگر ان کی گاڑیاں فوری طور پر چلنے کے قابل نہیں رہی تھیں۔ چھوٹی سی پن نے ان کی ساری بھاگ دوڑ پر پانی پھیر دیا تھا۔

☆☆☆

''مجھے یقین ہے کہ یہ تیمور کا کام نہیں ہے بہلول اگر اسے کچھ کرنا ہوتا تو اتنے گھماؤ پھراؤ کی ضرورت کیا تھی۔''

وہ دونوں اس وقت ایک ریسٹ ہاؤس کے کمرے میں تھے۔ بہلول وہاں کسی کو جانتا تھا یوں یہ کمرا انہیں بغیر کسی سوال جواب کے مل گیا تھا وہاں انہوں نے بکنگ مسٹر اینڈ مسز احمر کے نام سے کرائی تھی۔ کسی سامان کے بغیر آمد پر وہاں موجود ویٹر اور لوگوں کی نظروں پر سارہ جز بز ہو کر رہ گئی تھی مگر اس وقت ان کے پاس کوئی چوائس نہیں تھی۔

''ہو سکتا ہے کہ تمہارا خیال درست ہو مگر فی الحال ہمیں اپنا فوکس مسئلے کے حل پر رکھنا ہے۔'' وہ بولا۔

''تم کیا کرنے والے ہو؟''

''جیسے ہی روشنی ہوگی ہم طارق فواد سے ملنے اس کے گھر جائیں گے۔'' وہ بولا۔

''طارق فواد؟''

''وہ بیورو پر میرے لیے دو سال کام کر چکا ہے اور مجھے جس ثبوت کی ضرورت ہے وہی ان کے حصول میں میری مدد کر سکتا ہے۔'' وہ بولا۔

''کیا ہم تیمور کو فون کریں گے؟'' سارہ نے پوچھا۔

''طارق سے ملاقات کے بعد ویسے بھی اس کے 24 گھنٹے رات تک ہوں گے۔'' وہ بولا۔

صبح کے آٹھ بجے وہ شہر کے گنجان علاقے میں واقع اس عمارت کے سامنے کھڑے تھے جس میں طارق فواد کی رہائش تھی۔ گاڑی اس بار سارہ چلا رہی تھی۔ بہلول نے اترنے سے قبل اپنی گلاک پسٹل کو کمر میں لگایا۔

''تم نے کہا فلیٹ نمبر 304 میں پندرہ منٹ تمہارا انتظار کروں گی اور پھر وہاں آجاؤں گی۔'' سارہ بولی۔

''تیس منٹ...... تھوڑی دیر لگ سکتی ہے۔'' وہ بولا۔

''بیس منٹ...... بس یہ آخری آفر ہے۔'' وہ حتمی انداز میں بولی۔ ''کسی نے تو تمہیں اس چکر میں پھنسانے میں ان دونوں کی مدد کی ہے، ہم کسی پر زیادہ بھروسا نہیں کر سکتے۔''

''او کے......'' وہ اسے دیکھ کر مسکرایا اور باہر نکل گیا۔

میڑھیاں پھلانگتا ہوا وہ چند لمحے میں اس کے فلیٹ کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔

''بہلول......'' دروازہ طارق نے ہی کھولا تھا۔ ''میں تمہارا ہی منتظر تھا۔'' اس نے دروازہ کھول کر بہلول کو اندر آنے کا راستہ دیا۔

بہلول اس کے پیچھے، پیچھے لاؤنج تک آیا...... اس کے ذہن میں سوچوں کی آندھی چل رہی تھی۔ ''طارق اس کا منتظر تھا مگر کیوں؟''

''تمہیں کب ان سب باتوں کا اندازہ ہوا؟''

اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھ پاتا، طارق نے دوسرا سوال داغ دیا۔

''یہ مشکل نہیں تھا۔ گڑبڑ کا اندازہ ہونے کے بعد تو یہ دو اور دو چار کی طرح تھا۔ وہ اپنی الجھن کو چھپاتے ہوئے سادگی سے بولا۔

''میں سمجھ سکتا ہوں۔'' وہ اپنے گنجے سر کو سہلاتے ہوئے بولا۔'' میں پہلے سے ہی جانتا تھا کہ یہ بہت زیادہ عرصے نہیں چلے گا۔ اتنے بڑے معاملات زیادہ دن نہیں چلتے مگر ایک بات ہے جب تک یہ چل رہا تھا ہمارے بہت مزے تھے۔'' بہلول اسے پھر بے یقینی سے دیکھ رہا تھا۔ طارق اس کے بھروسے کا آدمی تھا مگر حقیقت اس کے برعکس نظر آرہی تھی۔

''اگر اس سے کچھ فرق پڑتا ہو تو میں تمہیں یہ بتانا چاہوں گا کہ تمہیں مارنے کا مشورہ میرا نہیں تھا۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ تم اس طرح مرنے والے آدمی نہیں ہو۔''

اس کے ان جملوں کے ساتھ ہی بہلول کا صبر جواب دے گیا۔ اس نے طارق کا گریبان پکڑ کر اسے اپنی جانب کھینچ لیا۔

''تم نمک حرام...... تم اس سب کا حصہ تھے؟''

طارق کی سیاہ چھوٹی، چھوٹی مکار آنکھیں اسے اب حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔'' ہم...... تمہیں ایک بات نہیں معلوم ہے بہلول......؟''

بہلول نے ایک جھٹکے سے اسے صوفے پر پٹخ دیا۔

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ مجھے کیا معلوم نہیں ہے کیونکہ اب تم مجھے بہت کچھ بتاؤ گے۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

سارہ نے چالیس منٹ تک اس کا انتظار کیا پھر آخر وہ گاڑی لاک کر کے عمارت کی طرف بڑھی تھی مگر وہ اسے سیڑھیوں پر ہی مل گیا تھا۔

''کیا ہو گیا بہلول......'' وہ اس کا چہرہ دیکھ کر بولی۔

''وہی...... جو ہمیشہ ہوتا آیا ہے۔'' وہ سرسراتے ہوئے لہجے میں بولا۔'' آپ کسی پر اعتماد کرتے ہیں اور وہ آپ کا یقین توڑ دیتا ہے۔'' وہ یہ کہہ کر تیزی سے آگے نکلتا چلا گیا۔ سارہ اس کے پیچھے، پیچھے گاڑی تک آئی تھی پھر خاموشی سے دروازے کھول کر کار اسٹارٹ کر دی تھی۔

''سوری......'' وہ چند لمحے بعد بولا۔ سارہ نے اس کی جانب مڑ کر دیکھا۔

''میں معذرت کرنے میں خاصا بُرا واقع ہوا ہوں ہے ناں......؟''

''نہیں، بہتر ہوتے جا رہے ہو۔'' وہ بولی۔'' اگر اسی طرح پریکٹس کرتے رہے تو......''

اس نے جواب میں کندھے اچکا دیے۔

''اب کیا تم مجھے پوری بات بتاؤ گے؟''

''تم نے سچ کہا تھا...... طارق شروع سے مجھے دھوکا دے رہا تھا۔ البتہ بقول اس کے مجھے قتل کرنے کا آئیڈیا اس کا نہیں تھا۔''

''اور ہاں تیمور کے بارے میں بھی تمہاری بات سچ ثابت ہوئی ہے، اس نے کسی کو ہمارے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ ان پولیس والوں نے ہمیں کھانا خریدتے ہوئے دیکھا تھا مشکوک سمجھ کر رپورٹ کی تھی جس کے بعد انہیں سب کچھ معلوم ہو گیا تھا۔''

''اچھا......'' وہ صرف اتنا ہی کہہ پائی۔

''میں کتنا بڑا احمق ہوں، وہ مجھے دو سال سے بے وقوف بناتا رہا۔ اس نے یہ اہتمام کیا کہ میں ان کی ہر اس ڈیل میں موجود رہوں جس سے انہیں کروڑوں کا فائدہ ہو تاکہ کسی بھی پریشانی کی صورت میں وہ سارا ملبا مجھ پر گرا سکیں۔ جیسا کہ اب انہوں نے کیا ہے۔''

''اب کیا تم اس کا الزام بھی خود اپنے آپ کو دو گے؟'' وہ بولی۔

''کیا مطلب......''

''یار ان تینوں نے اس چیز پر محنت کی تھی کہ تمہیں یہ سب معلوم نہ ہو...... یہ تمہاری غلطی کہاں سے ہوئی۔''

وہ خاموشی سے اس کی بات سن رہا تھا۔

''وہ ہماری مدد کرنے کے لیے تیار ہو گیا ہے۔'' چند لمحوں بعد وہ بولا۔'' وہ تیمور کے سامنے سب کچھ بتانے کو تیار ہے اور ثبوت بھی لا کر دینے کا وعدہ کر چکا ہے۔ آج رات وہ تمام کاغذات اور فائلیں لا دے گا۔''

''اور اس سب کے باوجود جو وہ تمہارے ساتھ کر چکا ہے، تم نے اس کی بات کا یقین کر لیا ہے؟'' سارہ نے پوچھا۔

''میرے پاس اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ اس کی مدد کے بغیر ہم کبھی کچھ ثابت نہیں کر سکیں گے۔ اس کے بدلے وہ اپنے لیے رہائی مانگ رہا ہے۔''

''او کے......'' سارہ نے سر ہلایا۔'' ہم گیسٹ ہاؤس پہنچتے ہی تیمور کو فون کر لیتے ہیں۔ تیمور نے پہلی گھنٹی پر اس کا فون اٹھا لیا تھا۔

''کہاں ہو تم؟ مجھے فون کیوں نہیں کیا، مسئلہ کیا ہوا تھا؟'' وہ الجھا ہوا لگ رہا تھا۔

''وہاں پولیس آ گئی تھی، سمجھو ہمیں وہ جگہ چھوڑنی پڑی۔''

''اوکے...... تم مجھے یہ بتاؤ کہ بہلول تمہارے ساتھ ہے......؟'' سارہ نے اسے کبھی اس طرح اونچی آواز میں بولتے نہیں سنا تھا۔

''ہاں......'' وہ بولی۔

''کیا وہ سارا وقت تمہارے ساتھ ہی رہا ہے؟'' اس نے پھر پوچھا۔

''کیا تمام وقت......؟'' اس نے پھر زور دے کر پوچھا۔

''کیا بات ہے تیمور تم یہ بار، بار کیوں پوچھ رہے ہو؟'' وہ چڑ کر بولی۔

''میری بات کا جواب دو سارہ، کیا وہ تمام وقت تمہارے ساتھ رہا ہے، ہاں یا نہ؟''

''ہاں......'' وہ بولی...... تیمور کا انداز بہت مختلف تھا۔ اس کے سامنے بیٹھا بہلول غور سے اس کی گفتگو سن رہا تھا۔

''وہ کسی سے ملنے نہیں گیا؟'' تیمور نے پوچھا۔

''ہاں ہم اس کے ایک ساتھی طارق سے ملنے گئے تھے اور اسی لیے میں نے تمہیں فون......''

''سارہ طارق فوادمر چکا ہے۔''

''کیا......'' سارہ کا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔

''اسے کچھ دیر پہلے اس کے اپنے گھر میں گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا ہے۔ پولیس کو ایک گمنام کال آئی تھی۔ جس میں بہلول کا حلیہ بتایا گیا ہے۔''

''میرے خدا......'' اس کے منہ سے نکلا۔

''اسی لیے میں نے اتنے سوال کیے ہیں، کیا تم اس کے ساتھ طارق کے گھر گئی تھیں۔ یہ ملاقات تمہارے سامنے ہوئی تھی؟''

''نہیں، نہیں...... میں کار میں اس کا انتظار کر رہی تھی۔'' وہ بہ مشکل بولی۔ اسے معلوم تھا کہ تیمور سے جھوٹ بول کر انہیں کوئی فائدہ نہیں ہونے والا تھا۔

''اس کا مطلب ہے کہ وہ اکیلا گیا تھا۔''

''ہاں مگر طارق ہماری مدد کرنے والا تھا۔ آج رات وہ ہمیں فائلیں دے رہا تھا۔''

''یہ تمہیں بہلول نے بتایا؟''

''ہاں اور تم بھی جانتے ہو کہ طارق کو قتل کرنے سے بہلول کو کوئی فائدہ حاصل نہیں ہونے والا ہے۔''

''میرے جاننے یا نہ جاننے یا ماننے یا نہ ماننے سے کوئی فرق نہیں پڑتا...... میں نے اس حوالے سے بہت تفتیش کی ہے اور میں کچھ نہیں حاصل کر پایا ہوں۔'' وہ مایوسی سے بولا۔

اچانک ایک مضبوط ہاتھ نے اس سے موبائل لے لیا تھا۔ سارہ نے بہلول کی طرف دیکھا، اس نے موبائل پر ہاتھ رکھ کر اس سے پوچھا۔

''تم اس پر اعتماد کرتی ہو؟''

سارہ کے اثبات میں سر ہلانے پر بہلول نے ہونٹ بھینچے۔ ''پھر اب ان سب کو انجام تک پہنچنا چاہیے۔'' وہ فون کو کان سے لگاتے ہوئے بولا۔ ''تیمور میں بہلول بول رہا ہوں، میں جانتا ہوں کہ ہم اس چکر کو کیسے ختم کر سکتے ہیں، مجھے تم سے ملنا ہے، کیا یہ ممکن ہے؟''

☆☆☆

''میں اب بھی یہ کہوں گی کہ یہ کوئی اچھا آئیڈیا نہیں ہے، ہم کوئی اور راستہ بھی اختیار کر سکتے ہیں۔'' سارہ بولی۔

''سارہ ہم سو بار اس پر سوچ چکے ہیں اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔'' بہلول بولا۔

''اگر تمہارے پاس کوئی تجویز ہے تو بتاؤ سارہ۔'' تیمور نے کہا۔

وہ ان دونوں کی طرف دیکھ کر رہ گئی تھی۔ وہ تین گھنٹے

ادھار

کلفٹن پر ایک صاحب بہت تیز اور اونچا گھومنے والے ایک جھولے پر بہت دیر سے بیٹھے تھے، ہر بار جھولا رکتا سب لوگ اتر جاتے لیکن وہ صاحب بیٹھے رہتے حتیٰ کہ جھولا دوبارہ چلنے لگتا۔

بہت سے جھولے لیتے لیتے ان صاحب کی حالت خراب ہو چکی تھی۔ چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں، رنگ نیلا پڑ گیا تھا اور ابکائیاں آرہی تھیں۔ دوست احباب ان کی منت کر رہے تھے لیکن وہ جھولے سے اترنے کو تیار نہیں تھے۔

''آخر بات کیا ہے تمہیں کیوں یہ جھولا اتنا پسند آگیا ہے کہ جان پر کھیل رہے ہو؟'' بالآخر ایک دوست نے زور دے کر پوچھا۔

''پسند ناپسند کو بھاڑ میں ڈالو۔ اس جھولے والے نے مجھ سے چار سو روپے ادھار لے رکھے ہیں۔ ایک سال ہو گیا دینے کا نام نہیں لے رہا مجھے اب حساب برابر کرنے کا اس کے سوا کوئی طریقہ نہیں سوجھ رہا کہ چار سو روپے کا جھولا جھول لوں۔''

عبدالجبار رومی انصاری، قصور

سے اس موضوع پر بات کر رہے تھے۔
''نہیں اس کو اس کی اجازت نہیں دینا چاہیے۔'' وہ تیمور پر پھٹ پڑی۔
''سارہ میرے خیال میں بہلول صحیح کہہ رہا ہے۔ یہ ہی اس معاملے کو ختم کرنے کا تیز ترین راستہ ہے۔''
''اس کے سوا اور کچھ ہو نہیں سکتا۔'' بہلول، سارہ کے قریب آتے ہوئے بولا۔ ''چند لمحوں کے لیے فکر کے اس طوفان سے باہر آؤ اور پولیس وومن بن کر سوچو، ہمیں اگر اس گھن چکر سے باہر آنا ہے تو فوری طور پر یہ کرنا ہوگا۔ وہ ثبوتوں کو مٹا رہے ہیں اگر ہم ان الجھنوں میں پڑے رہے تو شاید پھر کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
''تو پھر مجھے اپنے ساتھ چلنے دو۔'' وہ بولی۔
''نہیں......'' وہ حتمی انداز میں بولا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا ''میں نے پہلے جو بھی کیا ہو پر اس وقت مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔'' وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ ''میں واپس آؤں گا...... یہ میرا وعدہ ہے۔''
پھر وہ تیمور کی طرف مڑا جو میز پر موبائل لیے بیٹھا تھا۔ وہ اپنے ساتھ وہ فون لایا تھا جسے ٹریس نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس نے وہ فون بہلول کی طرف بڑھا دیا۔ بہلول نے اس پر ایک نمبر ملایا پھر سلسلہ ملتے ہی بولا۔
''فیصل یہ میں ہوں، بہلول...... مجھے تم سے کچھ بات کرنا ہے۔''
سارہ کھڑکی کے پاس کھڑی باہر بہتے ٹریفک کو دیکھنے لگی۔ وہ کچھ سننا نہیں چاہتی تھی۔ ویسے اسے معلوم ہی تھا کہ بہلول فون پر کیا کہہ رہا تھا۔
وہ فیصل کو بتا رہا تھا کہ طارق فواد اسے فائلز اور کاغذات دے چکا تھا اور وہ سارے ثبوت جو اُن دونوں اور ان کے ساتھ ان کے بے شمار ساتھیوں کو برباد کر سکتے تھے۔ اب بہلول کے پاس تھے۔ موجودہ حالات میں یہ میرے لیے بیکار ہیں۔ میں اب قانون کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتا، طارق نے مجھے بتایا ہے کہ تمہارا فائدہ کروڑوں نہیں اربوں میں ہے۔ ایک مناسب حصہ میرے سپرد کر دو، میں یہ سب تمہیں دے دوں گا اور یہاں سے کہیں دور چلا جاؤں گا۔''
چند لمحے بعد اس نے فون بند کر دیا۔
''اس نے کیا کہا۔'' تیمور نے پوچھا۔
''کل صبح گیارہ بجے اس نے اس جگہ مجھے بلایا ہے۔'' بہلول نے پیڈ پر لکھا ہوا پتا اس کی جانب بڑھایا۔

''مجھے تنہا جانا ہے، میری پوری کوشش ہوگی کہ ہم کم از کم ایسی کوئی بات حاصل کر لیں جس سے ان کے خلاف کارروائی شروع کی جائے۔''
''ہم اس کا پورا انتظام کریں گے۔'' تیمور بولا۔
''وہاں ادا ہونے والا ہر لفظ ریکارڈ ہو رہا ہوگا، ایک اسنائپر تمہاری حفاظت کے لیے موجود ہوگا۔ کسی بھی دھوکے کی صورت میں انہیں گولی مار دی جائے گی۔ ہمارے لوگ وہاں ان کی آمد سے پہلے موجود ہوں گے۔ صبح میں ایک ماہر اپنے ساتھ لاؤں گا جو تمہیں وائر اپ کر دے گا تاکہ تمہاری ہر بات ریکارڈ ہو سکے اور کسی کو شک بھی نہیں ہو۔''
تیمور کے جانے کے بعد ان دونوں کے درمیان گہری خاموشی چھا گئی تھی۔
''ہم یہ طے کرتے ہیں کہ اب سے صبح تک ہم کوئی ٹینشن والی بات نہیں کریں گے۔'' بہلول اس کی سرخ ناک ہلا کر بولا۔ ''یار ہم فورسز کے لوگ ہیں اور تم تو ریڈز میں شامل ہوتی رہی ہو۔ پھر اتنی کم ہمتی......'' وہ بولا۔
رات کھانے تک انہوں نے واقعی اگلے دن کے بارے میں ایک لفظ بات نہیں کی تھی۔

☆☆☆

تیمور وقت پر اپنے دو بندوں کے ساتھ گیسٹ ہاؤس پہنچ گیا تھا۔ انہوں نے بہلول کو تیار کر دیا تھا۔
سارہ کے لیے یہ طویل ترین گھنٹے تھے۔ بہلول نے فائلز کا ایک بیگ بھی تیار کر لیا تھا۔
جس جگہ یہ ملاقات ہونی تھی اس کے سامنے والی عمارت میں تیمور ایک اہم تفتیشی ادارے کے ارکان کے ساتھ موجود تھا۔ یہ اربوں روپے کی کرپشن کا معاملہ ہی نہیں تھا۔ ہتھیاروں اور منشیات کی خرید و فروخت نے اسے ملکی سلامتی سے منسلک کر دیا تھا۔ اگر مجرم پکڑے جاتے تو اس سے تیمور کا اگلا ایکشن اس کے لیے حلوہ ہو جانا تھا۔
سارہ ضد کر کے اس کے ساتھ یہاں آئی تھی اور اب وہ دوربین سے سامنے دیکھ رہی تھی۔ اس سے قبل ایک سیاہ لمبی کار وہاں آچکی تھی۔ جس میں فیصل، سکندر اور ایک اور شخص موجود تھے۔
''فیصل، سکندر......'' بہلول نے اندر جا کر کہا...... اس کمرے میں وہ سب موجود تھے۔ سارہ، تیمور اور باقی سب اس گفتگو کو بالکل اس طرح سن رہے تھے جیسے وہ ان کے سامنے ہو رہی ہو۔
''بہلول...... تم واقعی ایک بہادر انسان ہو...اور

احمق بھی...... یہاں اکیلے چلے آئے ہو...... اگر یہاں تمہیں کچھ ہوجائے تو؟'' ایک مردانہ آواز ابھری۔

''ہوسکتا ہے، لیکن میں جانتا ہوں کہ تم ایسا رسک نہیں لوگے، تم یقیناً یہ جاننا چاہو گے کہ میرے پاس کیا کیا ہے۔'' بہلول بولا۔

''تو پھر کام کی بات کرتے ہیں، تمہارے پاس کیا کیا ہے؟'' سکندر نے پوچھا۔

پہلے میری بات سنو، مجھے پانچ ملین ڈالر چاہیے ہیں جو تم نے آخری ڈیل میں کمائے ہیں تاکہ میں سکون سے اپنے دن گزار سکوں۔''

''اور ہمیں کیا ملے گا......؟'' ایک دوسری آواز گونجی۔

''میں تمہیں نہیں جانتا شاید......'' بہلول نے پوچھا۔

''تمہیں میرا نام جاننے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ تمہیں یہ سب چاہیے نہیں ہے۔ میں اندھے سودوں کا قائل نہیں ہوں۔''

''بہلول...... یہ جمشید احمد ہیں سیاستدان اور وزیر ہیں۔'' فیصل بولا۔ تیمور کا چہرہ جوش سے سرخ ہوگیا تھا۔

''میرے پاس تمام فائلیں ہیں جو طارق نے مجھے دی تھیں ان میں ان تمام ڈیلز کی تفصیلات ہیں جو تم لوگوں نے اس عرصے میں کی ہیں۔''

''کیا تم ہمیں احمق سمجھتے ہو بہلول......'' سکندر بولا۔ ''ہم نے چیک کیا ہے فائلیں دفتر میں موجود ہیں، طارق انہیں وہاں سے لے کر ہی نہیں گیا ہے۔''

''تو تمہارے خیال میں وہ اتنا احمق تھا کہ اصلی فائلیں لے جاتا...... اس نے ہر چیز کی کاپی کر کے بیک اپ بنایا ہوا تھا اور اس نے وہ تمام مجھے اس دن دے دی تھیں...... جب تم نے اس کا قتل کیا۔''

''تم ہمیں چکر دینے کی کوشش کر رہے ہو؟'' فیصل بولا...... اس کے لہجے میں بے یقینی تھی مگر ان میں سے کسی نے اس کے قتل کے الزام سے انکار نہیں کیا تھا۔

''بہلول میں تو شاید مان بھی لوں مگر ہمارے پارٹنر تمہیں اتنی بڑی رقم کی ادائیگی سے پہلے یہ دیکھنا چاہیں گے کہ تمہارے پاس ہے کیا؟''

''پارٹنرز......'' کے اس لفظ پر سارہ اور تیمور نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ اب تک جو گفتگو ہو چکی تھی، وہ ان کے لیے وارنٹ نکالنے کے لیے بہت کافی تھی۔ اس لفظ پارٹنر کا مطلب یہ تھا کہ اس کھیل میں اور بھی بڑے کھلاڑی شامل تھے۔

''ہم ان ثبوتوں میں سے کم از کم ایک دیکھنا چاہیں گے۔'' بالآخر فیصل کی کرخت آواز گونجی...... ''تم اپنی ساتھی سارہ سے ایک فائل منگوالو۔''

''کیا تم مجھے بے وقوف سمجھتے ہو کہ ہم دونوں ایک ساتھ خود کو تمہارے حوالے کر دیں۔ سارہ یہاں نہیں آئے گی...... میں ایک گھنٹے میں فائل لے آؤں گا۔''

''نہیں بہلول، ہمیشہ تمہاری شرائط پر کھیل تو نہیں ہو سکتا ناں...... تم مس سارہ کو فون کرو گے اور وہ فائلیں یہاں لے کر آئیں گی۔ سکندر تم ذرا سینئر انسپکٹر بہلول کو اس کرسی پر آرام سے بٹھا دو۔'' فیصل سفاکی سے بولا۔ اس کے بعد اٹھا پٹخ کی آوازیں آئی تھیں۔ سارہ کا دل گویا حلق میں آگیا تھا۔

''فیصل...... شٹ...... اس کے پاس مائیکروفونز ہیں......'' سکندر چیخ کر بولا۔

اس کے بعد دوبارہ اٹھا پٹخ کی آوازیں آئیں۔

''اسے بند کرو فوراً......'' ایک بھاری آواز نے چیخ کر کہا اور پھر مائیک بند ہوگیا تھا۔

☆☆☆

اس کے ساتھ ہی کمرے میں بھی گڑبڑ مچ گئی تھی۔ سارہ کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔

''خود کو سنبھالو سارہ، اسے کچھ نہیں ہوگا۔'' تیمور نے اسے دلاسا دیا۔ ''ہماری ٹیم باہر تیار ہے اور فوراً ہی اندر داخل ہوجائیں گے۔''

''مگر بہلول بھی اندر ہے۔'' وہ بولی اور دوڑ کر بڑی دوربین سے اس کمرے کا جائزہ لیا جہاں وہ سب موجود تھے۔ اس رخ سے اسے بہلول کا سائڈ پوز نظر آرہا تھا۔ وہ ایک کرسی پر باندھ کر بٹھا دیا گیا تھا۔

اس کے سامنے فیصل کھڑا تھا۔ دوسری جانب سکندر نظر آرہا تھا۔ باقی دو افراد دوربین کی پہنچ سے دور تھے۔

اچانک سارا منظر دھواں دھواں ہوگیا تھا۔

''یہ...... یہ کیا ہوگیا ہے......'' وہ متوحش ہوکر مڑی۔

''اسپیشل فورسز کے جوانوں کی کارروائی، انہوں نے دھوئیں اور آنسو گیس کے شیل اندر پھینکے ہیں تاکہ وہ بہلول کو کوئی نقصان ہوجانے کے بجائے اپنی جان بچانے کے لیے بھاگیں اور پکڑے جائیں بہت سی باتوں کا وہ اعتراف کر چکے ہیں۔ جو ان کی گرفتاری اور تفتیش کے لیے کافی ہے۔'' تیمور نے جواب دیا۔

سارہ چند لمحے کمرے میں بیٹھی رہی تھی۔ پھر وہ باہر نکل آئی تھی۔ بہلول ... پہلے ہی زخمی تھا۔ وہاں یقیناً اس

کے ساتھ بُرا سلوک کیا گیا تھا پھر وہ کرسی پر بندھا ہوا بھی تھا۔ فیصل اور سکندر کے بارے میں جو کچھ وہ اسے بتاتا آیا تھا اس کے بعد ناممکن تھا کہ وہ اپنا تمام کھیل اور زندگی کی بازی کو ختم شد پر لانے والے کو اتنی آسانی سے چھوڑ دیتے۔

وہ اپنی سروس پسٹل کو ہاتھ میں تھامے عمارت سے باہر نکلتی چلی گئی۔ درمیان میں جس کسی نے اسے روکا وہ انہیں پولیس کارڈ دکھا کر آگے بڑھتی گئی۔

''میڈم...... آپ اندر نہیں جاسکتیں......'' دھواں دھواں ماحول میں ایک آفیسر نے اسے روک لیا تھا۔

''میں پولیس آفیسر ہوں......'' وہ بولی۔

''بالکل ہیں مگر اندر نہیں جاسکتیں وہاں چند مجرموں نے ایک آفیسر کو یرغمال بنا رکھا ہے۔''

سارہ کا دل گویا حلق میں آگیا تھا اس کے بدترین اندیشے سچ ثابت ہوگئے تھے...... بہلول اندر ہی تھا۔

وہ سر ہلاتی ہوئی پیچھے ہٹی۔ یہ ایک زیر تعمیر عمارت تھی اس کے اندر ہی وہ ہال نما جگہ تھی جہاں اس وقت وہ لوگ موجود تھے۔ وہ سر ہلاتی ہوئی ایک طرف ہٹ گئی۔ پھر اسے جیسے ہی موقع ملا وہ دھوئیں کے بادل میں اندر داخل ہوگئی تھی۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ معدہ گویا باہر آنے کو تیار تھا مگر اس کا دل بہلول کی سلامتی کی فکر میں اپنے آپ کو بھول چکا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں اپنا پسٹل پکڑے آگے بڑھ رہی تھی۔ دوسرے ہاتھ سے وہ بار، بار اپنی آنکھوں کو مل رہی تھی۔

''رک جاؤ......'' ایک زوردار آواز پر دہ ساکت ہوگئی۔

''واہ مس سارہ......'' فیصل چھینکوں کے دوران بولا۔ ''اچھا کیا جو تم یہاں آگئیں۔ اسے بھی اس بہلول کے پاس لے چلو......'' اس نے اس کے سر پر ریوالور رکھتے ہوئے کہا۔ وہ اس ہال کے بجائے اب تہ خانے میں تھے، وہاں دھوئیں اور گیس کے اثرات بہت کم تھے۔ بہلول نے اسے دیکھ کر کرب کے عالم میں آنکھیں بند کرلی تھیں۔

''سارہ کو چھوڑ دو فیصل...... یہ تمہارا اور میرا معاملہ ہے۔ اس کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔'' بہلول بولا۔ اس کی آنکھوں کے نیچے تازہ نیل ابھرے ہوئے تھے۔ ایک ہونٹ پھٹ چکا تھا۔

''تم کہو گے اور میں مان لوں گا۔'' وہ غرایا۔ ''تم نے ہمیں برباد کردیا ہے کیا اس کے بعد بھی تم یہ سمجھتے ہو کہ میں تم دونوں کو زندہ رہنے دوں گا؟'' وہ غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ ''سب سے پہلے تو میں تمہاری آنکھوں کے سامنے تمہاری اس دل ربا کا ٹکٹ کٹاتا ہوں۔'' وہ سارہ کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔

''نہیں فیصل، تم ایسا نہیں کرو گے۔'' بہلول نے رسیاں توڑنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ مگر رسیاں تو نہیں ٹوٹیں البتہ اس کی کرسی ضرور الٹ گئی تھی اور آنے والے چند لمحوں میں یہ اس کے لیے اللہ کی مدد ثابت ہوئی تھی۔

فیصل نے مڑ کر سارہ کو دیکھا اس کی آنکھوں میں نفرت ہی نفرت تھی۔ اس کے ہاتھ میں سیاہ پسٹل تھا جس کا رخ سارہ کی طرف تھا۔ سارہ نے آنکھیں بند کرلی تھیں۔

اچانک فائر کی زوردار آواز بلند ہوئی تو پھر دھڑ کرکے کسی کے گرنے کی آواز آئی۔ سارہ چند لمحے ساکت کھڑی رہی جب اسے کہیں کسی تکلیف کا احساس نہیں ہوا تو یکا یک در آنے والے وسوسے پر اس نے تڑپ کر آنکھیں کھول دیں۔

فیصل اس کے سامنے زمین پر پڑا تھا۔ کمرا سیکیورٹی اہلکاروں سے بھرا ہوا تھا باقی کے تمام افراد گرفتار ہوچکے تھے۔

سارہ لپک کر بہلول کے پاس پہنچی اور اس کی رسیاں کھولنے لگی۔

''تم اندر کیوں آئی تھیں سارہ؟'' وہ اسی حالت میں غرایا۔

''کیا تم یہیں بندھے پڑے رہنا چاہتے ہو؟'' اس نے اپنے ہاتھ ہٹاتے ہوئے پوچھا۔

''ویسے یہ سوال تو میں بھی کرنا چاہتا ہوں۔'' سیکیورٹی اہلکاروں میں سے ایک جوان بہلول کو کھولنے میں اس کی مدد کرتے ہوئے بولا۔

''آپ کی وجہ سے ہی فوری ایکشن کا حکم ہوا، شکر ہے کہ بہلول صاحب کی کرسی گر گئی تھی ورنہ ہمارے لیے اس شخص کو گولی مارنا مشکل ہوجاتا۔'' وہ فیصل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

بہلول اب زمین سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور سینے پر دونوں ہاتھ باندھے اس کو گویا نظروں سے کہہ رہا تھا کہ اب دو جواب......

''تم ٹھیک ہو۔'' سارہ ان سب باتوں کو گویا نظرانداز کرتے ہوئے اس کی طرف بڑھ گئی۔

''ہاں، اور آج میں نے یہ جان لیا ہے کہ کم ازکم دنیا میں ایک ایسا شخص ہے جس پر میں آنکھیں بند کرکے اعتماد کرسکتا ہوں۔'' وہ اس کے قریب آکر مسکرا کر بولا۔

''اتنی سی بات تمہیں اب جاکر سمجھ آئی ہے۔'' وہ بھی مسکرائی۔

سرورق کی دوسری کہانی

ہولناک سائے

زویا اعجاز

سانحات... حادثات زندگی کا حصہ ہیں... ہر بچاؤ... ہر احتیاط کے باوجود یہ دبے پاؤں زندگی میں درّانہ وار داخل ہو جاتے ہیں... ان کے کاری وار سے بچنا ناممکن ہو جاتا ہے... ایک ایسے ہی خاندان کی کہانی... کچھ سانحات اور حسابات ان کی زندگی میں ایسے تھے... جنہوں نے عمر بھر ان کو الجھائے رکھا... ہزار ہا کوشش کے باوجود وہ ان کے سود و زیاں سے باہر نہیں نکل سکے ...اور وہ ہولناک سائے بن کے ان کی زندگی سے لپٹے رہے... کبھی نہ بے باق ہونے والے حسابات کا گوشوارہ.. تہ در تہ جمی الجھی تحریر کی پرچھائیاں...

لمحہ بہ لمحہ تجسس جگاتی ہوئی ایک پرفریب داستان

شاپنگ مال کی پارکنگ میں بہت ہجوم تھا۔ سرخ رنگ کی اسپورٹس کار وہاں آکر رکی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک خوب صورت اور طرح دار حسینہ براجمان تھی۔ اس نے انتہائی تنگ جینز پہن رکھی تھی۔ سرخ رنگ کی ٹی شرٹ بھی انتہائی چست تھی جس کا گلا خاصا کشادہ تھا۔ شرٹ کی لمبائی میں کسی خاص تردّد کا خیال نہیں رکھا گیا

تھا۔

اس کے ہاتھوں میں سیاہ و سرخ نیل پالش ایک مخصوص انداز میں لگی ہوئی تھی۔ کلائیوں میں رنگ برنگے بینڈز بندھے تھے۔ لڑکی کی عمر لگ بھگ بیس، بائیس سال تھی لیکن میک اپ زدہ چہرے پر کسی قسم کی معصومیت کا کوئی شائبہ نہ تھا۔ اس کے نقوش اور چہرے پر خاصی کرختگی اور چالاکی کا تاثر ابھرتا تھا۔

دوسری جانب سے ایک لڑکے نے دروازہ کھولا۔ اس نے پھولدار شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک جدید اور مہنگے ترین اسمارٹ فون کا شاپنگ بیگ تھا جو انہوں نے کچھ دیر قبل ہی ایک بہت بڑی موبائل مارکیٹ سے خریدا تھا۔

''اسے یہیں ڈیش بورڈ پر رکھ دو ہنی! اندر کہاں اپنے ساتھ لیے گھومتے رہو گے؟'' لڑکی نے اپنے سرخ اور سیاہ رنگے بالوں کو ایک خاص ادا سے جھٹکتے ہوئے کہا۔

لڑکا چند لمحوں کے لیے سوچ میں ڈوبا.... اور پھر مسکراتے ہوئے وہ بیگ اندر رکھ دیا۔

لڑکی ایک ادا سے مسکرائی اور اس کے بازو میں اپنا ہاتھ ڈالے نہایت استحقاق سے مال کی جانب بڑھ گئی۔ امارت، نخرہ، نزاکت اور اعتماد اس کی ہر ایک ادا سے جھلکتا تھا۔ لڑکے کا اعتماد بھی اب قدرے بحال ہو چکا تھا۔ اس نے بیش قیمت گاگلز ایک مخصوص انداز میں کالر کے عقب میں لٹکائے اور وقار سے قدم آگے بڑھا دیے۔

اس کا تعلق لوئر مڈل کلاس سے تھا اور انعم سے افیئر کو ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔

بہترین میوزک سسٹم کے باعث مدھر سُروں میں بجتی موسیقی اعصاب پر سرور طاری کر رہی تھی۔ مزاج میں خوامخواہ رومانویت طاری ہونے لگی۔ اس نے انعم کے بازو پر اپنے ہاتھ کا دباؤ بڑھایا اور چال میں تمکنت پیدا کرتے ہوئے گردن اکڑا اکڑا اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

''تو کیا خریدنا پسند کرو گے ہنی؟'' انعم نے ادائے دلربائی سے پوچھا۔

''اس سب کی کیا ضرورت ہے انو؟ موبائل گفٹ کر دیا ہے تم نے۔ میرے لیے تو وہی بہت ہے۔'' حسنین نے لہجے میں مٹھاس اور محبت سموتے ہوئے کہا۔

''مجھے انکار سننے کی عادت نہیں ہے اور یہ بات تم اچھی طرح جانتے ہو۔'' انعم نے دھونس سے جواب دیا۔

''آج تمہاری سالگرہ ہے اور میرے لیے یہ دن بہت اہم ہے۔''

''ہاں! وہ تو میں جانتا ہوں لیکن......''

''لیکن ویکن کچھ نہیں...... تم انعم چوہدری کی پسند ہو اور انعم اپنی محبت کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہے۔'' وہ ایلی ریلنگ کے پاس رک گئی اور پھر ایک توقف سے بولی ''آج تم جس چیز پر ہاتھ رکھو...... وہ تمہاری۔''

حسنین کا دل مزید شدت سے دھڑکنے لگا۔ وہ اس کی جذباتیت اور ضدی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھا۔

انعم نے ایسا ہی کیا۔ اس کو اپنی پسند کی ٹی شرٹس.. پینٹ اور نہ جانے کیا کیا دلا دیا۔

پہلے فلور سے شاپنگ مکمل کرنے کے بعد وہ برقی زینوں کی طرف بڑھ گئے۔ مال میں موجود ہر شخص کی نظریں انعم کی خوب صورتی اور بے باک انداز پر بھٹک رہی تھیں۔ لڑکیوں کی نگاہوں میں البتہ حسد و جلن نمایاں تھی حسنین کی وجاہت اور ان کی باہم کیمسٹری کسی کو بھی جلن میں مبتلا کرنے کے لیے کافی تھیں۔ وہ اس کا بازو تھامے برقی زینوں پر سوار ہو گیا۔

دوسرے فلور کی داہنی ریلنگ کے عقب سے دو پُرتپش نگاہیں انہیں نظر ہی نہ آسکیں جو پارکنگ لاٹ سے ان کا تعاقب کرتی یہاں پہنچی تھیں۔

☆☆☆

اس شاپنگ مال میں گھومتے پھرتے انہیں تین گھنٹے ہو گئے تھے۔ حسنین کو مختلف برانڈز کے جوتوں، اپرز اور ڈریس شرٹس کی خریداری کروانے کے بعد اب وہ چوتھے فلور پر آ پہنچے تھے جہاں برانڈڈ گھڑیوں اور 'کی چینز' کی بھرمار تھی۔ وہ اسے .... لیے ایک مخصوص گوشے کی طرف بڑھی۔

''میرا آرڈر تیار ہے کیا؟'' اس نے اپنے بیگ سے ایک رسید نکال کر سیلز مین کو دکھاتے ہوئے پوچھا۔

''یس میم! بالکل ریڈی!'' سیلز مین مسکرایا۔ حسنین کی آنکھوں میں اُلجھن تیرنے لگی۔

سیلز مین نے شوکیس کے ایک مخصوص خانے سے ایک سرخ مخملیں ڈبیا برآمد کی جس کی ساخت دل کے تصوراتی خاکے جیسی تھی۔ اس نے ڈبیا کھول کر انعم کے سامنے رکھ دی۔

''خوب صورت...... بہت خوب صورت!'' انعم نے توصیفی انداز میں ہونٹ سکیڑے اور بالوں کو مخصوص انداز میں جھٹکتے ہوئے حسنین کے سامنے رکھ دی۔

وہ ایک مخصوص ساخت کا 'کی چین' تھا جس پر نفیس اور مہنگی لکڑی پر لفظ 'ہنی' کندہ تھا۔ کندہ کاری میں ننھے ننھے ہیرے لگائے گئے تھے۔

''کیسا لگا!'' وہ پُرجوش تھی۔

''بہت لاجواب...... بہت خوب صورت ...... اور بہت ہی شاہکار۔'' حسنین کا لہجہ سرسراہٹ میں ڈھل گیا۔ ''لیکن......''

''فار گاڈ سیک! اب یہ مت کہنا کہ اس کی کیا ضرورت تھی؟'' انعم نے قطع کلامی کی۔

ادائیگی کے بعد وہ ریستوران میں چلے آئے۔ سیلف سروس کے تحت انہوں نے اپنی پسندیدہ چیزیں لیں اور انتہائی کونے میں ایک نشست سنبھال لی۔

''کیا ہوا؟ اتنے خاموش کیوں ہو؟'' انعم نے پوچھا۔

''سوچ رہا ہوں کہ میں نے ایسی کون سی نیکی کی تھی جس کا انعام مجھے تمہاری صورت میں ملا ہے۔'' اس کے بے ساختہ انداز پر انعم کے چہرے پر کئی رنگ بکھر گئے۔ ہر لڑکی کی طرح تعریف اس کی بھی بہت بڑی کمزوری تھی اور حسنین اسے سراہنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیتا تھا۔

''ہنی! میں جس کلاس سے تعلق رکھتی ہوں، وہاں مرد و زن کی دوستی اور رومانوی تعلقات ایک معمول ہوتے ہیں۔'' اس نے تمہیدی انداز میں کہا۔

''اور میں جس کلاس سے تعلق رکھتا ہوں وہاں آج بھی مرد و زن کی دوستی اور رومانوی تعلقات کو ایک گناہ تصور کیا جاتا ہے۔'' وہ صاف گوئی سے بولا۔

''ہاں! میں جانتی ہوں۔ اور یہ بھی جانتی ہوں کہ ہماری کلاس کے متعلق خیالات بھی بالکل نیک نہیں ہوتے۔''

''تو پھر اس رشتے کا کیا مستقبل ہو گا؟'' حسنین گڑبڑایا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ اس سونے کی چڑیا کو ہاتھ سے جانے نہیں دے سکتا تھا۔ اس سے اینٹھی گئی مختلف رقوم سے صرف اس کی ذاتی ہی نہیں بلکہ کئی خاندانی ضروریات بھی پوری ہو جاتی تھیں۔ وہ کھلے دل و دماغ کی انتہائی شاہ خرچ لڑکی تھی۔ دولت اس کے لیے ہاتھ کا میل تھی جسے وہ بے دریغ خرچ کیا کرتی تھی۔

''مستقبل...... کل کس نے دیکھا ہے ہنی! جو ہے، آج ہے...... اسی لیے میں ہر لمحہ خوب انجوائے کرتی ہوں۔''

''تم مجھ سے شادی کرو گی؟'' اس نے اچانک کہا۔

''پروپوز کر رہے ہو مجھے؟'' انعم کے لہجے میں کھنک تھی۔ اس نے حسنین کے منہ سے اس اقرار کے لیے بہت 'سرمایہ کاری' کی تھی۔ وہ اپر کلاس کی تمام عادات بد میں مبتلا رہی تھی۔ اپنے طبقے کے نوجوانوں کو آزمانے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ محبت ایک کاروبار ہے جس میں وفا اور خلوص کے سکے پرانے ہو چکے ہیں۔ محبت میں وفا اور خلوص کو صرف 'خریدا' جا سکتا ہے اور یہ خریداری اسے اپنے طبقے میں کہیں بھی نہیں مل سکتی۔ اس گوہر مقصود کے لیے اسے اپنے سے کمتر طبقے کو کھنگالنا تھا اور پھر بالآخر حسنین اس کی نظر میں آ گیا۔

حسنین بی کام پاس تھا اور انعم کے والد کے ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں ایک سیلز مین تھا۔ پوش علاقے میں واقع اس اسٹور کی گڈول بہت اچھی تھی اور اس کی روزانہ آمدنی ہی لاکھوں میں تھی۔

''ہاں! میں تمہیں پروپوز کر رہا ہوں۔'' وہ اعتماد سے بولا۔

''لیکن یہ شادی ہو گی کیسے؟''

''تم جب کہو میں چار گواہ اور ایک قاضی کے ہمراہ آ جاؤں گا۔''

''اور اسی پل میرے ڈیڈی کے گارڈز تم سب کو گولیوں سے بھون دیں گے۔'' انعم کے لہجے میں خوف تھا۔

''تو پھر کیا حل ہے اس مسئلے کا؟''

''ایک حل ہے تو سہی...... ہم کورٹ میرج کر لیتے ہیں۔ ڈیڈی کو اپنی کاروباری گڈول بہت عزیز ہے۔ وہ میری ضد سے بھی اچھی طرح واقف ہیں اس لیے جب ہم شادی ڈکلیئر کریں گے تو میڈیا میں اپنی ساکھ بچانے کے لیے وہ انکار نہیں کر سکیں گے۔''

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔''

''اوکے! آج ویک اینڈ ہے۔ پرسوں ہی یہ کام نمٹا لیتے ہیں۔'' انعم نے تجویز دی۔

''اوکے ڈن!''

کھانا اب ختم ہونے والا تھا۔ اسی پل ان کے پاس ایک اور لڑکی آ کر رکی۔

''او مائی گاڈ! انعم......'' اس کی سُریلی چیخ پر وہ بھی متوجہ ہوئی۔ سامنے اس کے کالج کی ایک دیرینہ دوست کھڑی تھی۔

''تم یہاں کیسے؟'' وہ محتاط انداز میں بولی۔

''دو روز قبل ہی پاکستان آئی ہوں۔ تمہیں کافی ٹریس کیا لیکن......''

''ہاں میرا نمبر تبدیل ہو گیا ہے اور گھر بھی کچھ عرصہ

قبل ہی نیا لیا ہے۔'' وہ بہت نپے تلے جواب دے رہی تھی۔
''یہ کون ہے بھئی؟ ان سے تو تعارف کرواؤ۔''
نو وارد نے حسنین کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔
''ہی اِز مائی فیانسی۔'' انعم نے قدرے ترشی سے کہا۔
وہ انوشہ کی نظروں میں حسنین کے لیے پسندیدگی بھانپ گئی تھی۔

''ہائے ہینڈسم! نائس ٹو میٹ یو!''

''سیم ہیئر!'' اس نے انوشہ کا مصافحہ کے لیے بڑھا ہوا ہاتھ نظرانداز کیا اور مسکراتے ہوئے موبائل فون کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''آپ کا چہرہ بہت جانا پہچانا سا کیوں لگ رہا ہے مجھے؟ کیا ہم پہلے کہیں ملے ہیں؟'' وہ اُلجھی۔

''مجھے ذرا جلدی ہے انوشہ...... پھر ملاقات ہوگی۔'' انعم نے اس کی بات مکمل نظرانداز کردی۔

''یس شیور! لیکن اپنا نمبر تو دیتی جاؤ۔'' انعم نے اسے اپنا نمبر لکھوا دیا اور انوشہ آگے بڑھ گئی۔

وہ دونوں اب واپسی کے لیے پر تول رہے تھے۔ مستقبل کے سہانے خوابوں میں کھوئے ان پنچھیوں نے غور ہی نہ کیا کہ ان پر مرکوز نگاہوں نے سرعت سے وہ نمبر اپنے موبائل میں محفوظ کرلیا تھا۔

☆☆☆

رات گہری ہوچکی تھی۔

انعم بستر پر نیم دراز تھی۔ وہ بہت پُرجوش اور خوش دکھائی دے رہی تھی۔ آنکھوں کی چمک اور چہرے کی کھلتی مسکراہٹ بتاتی تھی کہ اس نے اپنے خوابوں پر دسترس حاصل کرلی ہے۔ وہ اپنے اسمارٹ فون پر سوشل میڈیا پر چلنے والی سرگرمیوں پر اپنی رائے دینے میں مصروف تھی۔

میسج کرنے کے بعد وہ ایک انگڑائی لے کر دیوار گیر آئینے کے پاس گئی اور اپنا میک آپ اتارتے ہوئے نائٹ کریم کا مساج کرنے لگی۔ وہ اب سونا چاہتی تھی لیکن موبائل پر ہونے والی مختصر بیپ نے اسے کوفت زدہ کردیا۔

''اب کون ہے بھئی اس وقت!'' وہ بڑبڑائی اور فون کی طرف متوجہ ہوگئی۔ کسی اجنبی نمبر سے دو سطری پیغام موصول ہوا تھا۔

''میں تم سے تمہارے فیانسی کے بارے میں اہم گفتگو کرنا چاہتی ہوں...... انوشہ ہیئر!''

انعم کے چہرے پر تناؤ اور پیشانی شکن آلود ہوگئی۔
اس نے بے تابی سے اس نمبر پر فون ملایا۔ دوسری جانب سے چند گھنٹیوں کے بعد کال کاٹ دی گئی اور فوری طور
ایک اور پیغام موصول ہوا۔

''میں اس وقت ایک ایسی جگہ پر موجود ہوں جہاں
تمہاری کال ریسیو نہیں کرسکتی۔''

''کیا کہنا چاہتی ہو تم؟'' انعم نے بھی بذریعہ
جواب دیا۔

''تمہیں یاد ہے کہ میں نے آج شاپنگ مال میں ک
تھا کہ حسنین کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔''

''ہاں! آگے بتاؤ!''

''یہ شخص تمہارے ساتھ فیئر نہیں ہے۔''

''اس دعوے کی کوئی خاص وجہ؟''

''اس کا تعلق تم سے کمتر طبقے سے ہے اور وہ تمہار
فائدہ اٹھا رہا ہے۔''

''اوہ! اتنا بڑا انکشاف...... میرا تو صدمے سے ہارٹ فیل ہونے لگا ہے۔'' انعم نے تمسخر اڑایا۔

''میں سنجیدہ ہوں!''

''نہیں، تم حسد کررہی ہو۔ تم ہنی کی اسمارٹ نیس سے جلی ہوا اور اسی لیے بے پر کی ہانک رہی ہو۔''

''اچھا! تو مجھے اس کا نام کیسے پتا لگا؟ تم نے تو نہیں بتایا تھا۔''

''وہ میرے ساتھ فیئر ہے یا نہیں؟ یہ تمہارا دردِ سر نہیں۔''

''حسنین نکاح شدہ ہے انعم! منکوحہ اس کی کوئی رشتے دار ہے۔''

''میں ثبوت دیکھنا چاہتی ہوں!'' نصف گھنٹے بعد اس نے پیغام بھیجا۔

''اوکے! پُل کے پار بستی میں پہنچ جاؤ لیکن اکیلی آنا۔''

عورت خواہ کسی بھی طبقے سے ہو، اُسے اپنے استحصال کی خبر کسی دوسری عورت کی زبانی معلوم ہو تو اس سے بڑا صدمہ اور اہانت اس کے لیے کوئی نہیں ہوتی۔ وہ جلتے انگاروں کی سی تپش محسوس کرنے لگتی ہے۔ تڑپتی ہے، سلگتی ہے، جلن کا دھواں اس کے دل و دماغ میں گھٹن پیدا کرنے لگتا ہے اور ہوش و حواس گہرائی میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھو دیتے ہیں۔ یہی حال انعم کا بھی تھا۔ وہ عجلت میں اپنی گاڑی نکال کر مطلوبہ مقام کی جانب روانہ ہوگئی۔

☆☆☆

گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی اس ویران سڑک پر دوا

رہی تھی۔

عام حالات میں انعم انگریزی موسیقی بلند آواز میں سننے کی عادی تھی لیکن اس وقت اس کا ذہن تیز آندھیوں کی زد میں تھا۔ انوشہ سے اس کی ٹسل بہت پرانی تھی۔ ان دونوں کی شناسائی میٹرک میں ہوئی تھی۔ اسکول کا ماحول بہت آزاد خیال تھا۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے ملنے جلنے، بات چیت پر بھی کسی پابندی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہاں ’کپلو‘ کا نہ ہونا معیوب سمجھا جاتا تھا۔

سوئے اتفاق وہ دونوں کالج میں بھی ایک ہی کلاس میں تھیں اور بولڈ اینڈ بیوٹی فل مشہور تھیں۔ ان کا لباس، ناز و انداز اور اسٹائل دیکھنے والوں پر بجلیاں گرایا کرتا اور ’نمبرون‘ بننے کے اعزاز میں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتیں۔ شاید یہی چبھن آج بھی انوشہ کے دل میں موجود تھی۔

اسٹیئرنگ پر اس کی گرفت بہت سخت تھی۔ اسے حسنین سے ملنے والے دھوکے پر اتنا غصہ نہ تھا۔ اصل غصہ تو یہ تھا کہ وہ انوشہ کے سامنے اپنی عزت و وقار ہار رہی تھی۔ ماضی میں ہونے والی ان تمام غیر روایتی جنگوں میں اس کی جیت آج اس اہم موڑ پر بدترین شکست میں تبدیل ہونے والی تھی۔

مطلوبہ مقام پر پہنچنے کے بعد اس نے گاڑی ایک جانب پارک کی اور انوشہ کو بذریعہ ایس ایم ایس اپنی آمد کی اطلاع دی۔ اس نے گرد و پیش پر نگاہ دوڑائی۔ یہ ایک کچی بستی تھی جہاں ایک جانب کوئی حکومتی منصوبہ التوا کا شکار تھا اور اس کے عقبی جانب جرائم پیشہ افراد نے عارضی بستی تعمیر کر رکھی تھی۔

’’حسنین کا اس جگہ سے کیا تعلق ہوسکتا ہے بھلا؟‘‘ وہ بے چینی سے پہلو بدل کر رہ گئی۔

’’گاڑی سے نکل کر بستی کی طرف چلی آؤ۔ پہلی رو کے تیسرے مکان میں وہ اپنی بیوی کے ساتھ موجود ہے۔‘‘

اس پیغام نے اس کے تن بدن میں انگارے بھر دیے۔ اس نے حسنین کے نمبر پر فون کرنے کی کوشش کی لیکن اس کا نمبر بند تھا۔ ایسا ہونا خلاف معمول نہیں تھا لیکن اس وقت ’ٹائمنگ‘ بہت غلط تھی۔ انعم کو یقین ہو گیا کہ انوشہ کی اطلاع بالکل درست ہے اور وہ یہیں کہیں اپنی بیوی کے ساتھ دادِ عیش دے رہا ہوگا۔

وہ گاڑی سے نیچے اتری اور غصے میں دروازہ لاک کیے بغیر ہی بستی کی جانب چل دی۔ چند گز دور جاتے ہی اسے اپنے چہرے پر پھوار اور کسی نمی کا احساس ہوا اور وہ تیورا کر نیچے گر گئی۔ اس کی نظروں کے سامنے گہری دھند چھانے لگی۔ دھندلاتے دماغ کے ساتھ آخری منظر...... کچھ فاصلے پر چادر کی بکل مارے بستی کی طرف جاتے ایک آدمی، اپنے عقب میں کسی کی موجودگی اور پھر کسی نکیلے پتھر پر کمر کے بل گرنے کا احساس تھا۔

☆☆☆

اس کچی بستی کے جن اِکّا دُکّا گھروں میں روشنی موجود تھی، وہ گھر بھی انہی میں سے ایک تھا۔

بستی کے مکین اچھی طرح واقف تھے کہ کسی بھی وقت ان کی یہاں سے دربدری عمل میں آسکتی ہے لیکن اس کے باوجود وہ یہاں عارضی ٹھکانا قائم کیے ہوئے تھے۔ اس گھر کے ایک کمرے کی ادھ کھلی کھڑکی سے مائرہ خلاؤں میں کسی نامعلوم نکتے کو تک رہی تھی۔

یہ کیفیت اس کے لیے نئی نہیں تھی۔ وہ ہر روز ہی اس اذیت کا شکار ہوتی تھی۔ اسے اپنے آپ پر بہت غصہ آتا تھا۔ اس عذاب میں مبتلا ہوئے ایک عرصہ گزر چکا تھا لیکن وہ اب بھی روزِ اول جیسی تکلیف محسوس کرتی۔

’’مائرہ نواز! یہ طرزِ زندگی تمہاری اپنی پسند تھا۔ اب یہ فلمی ہیروئنوں جیسے نخرے تم پر سجتے نہیں۔‘‘ اس نے حسبِ عادت خود کلامی کی۔ ایسے کسی بھی موقع پر وہ لاشعوری طور پر منقسم شخصیت کا شکار ہو جاتی۔ اسے اپنے تصور میں ایک اور مائرہ مجسم نظر آتی اور پھر ان دونوں میں ایک مکالمہ بازی کا آغاز ہو جاتا۔

مائرہ کی عمر تقریباً پینتیس سال تھی۔ وہ خوب صورت اور دلکش نقش و نگار کی مالک تھی۔ اس کا چہرہ کتابی تھا اور آنکھوں میں بہت سے اسرار پوشیدہ تھے۔ زمانے کے سرد و گرم کا شکار رہنے کے باوجود اس کا سراپا بہت نازک اور دلفریب تھا۔ مجموعی طور پر وہ اب بھی توبہ شکن حسن کی مالک تھی۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر کھڑکی سے اپنا دھیان ہٹایا اور آئینے کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ اس کا میک اپ خراب ہو چکا تھا۔ متورم آنکھیں اور رنگت میں ہلکی سی سرخی دیکھ کر اسے یاد آیا کہ وہ کئی روز سے بخار میں مبتلا تھی لیکن دوا لانے کے لیے دل ہی نہیں کرتا تھا۔ کھلی کھڑکی سے آتی دسمبر کی یخ بستہ ہوا اس کے جسم میں برچھی کی طرح چبھ رہی تھی۔ وہ بے اختیار جھرجھری لے کر رہ گئی۔ اسی لمحے دروازہ کھلا اور ایک کرخت آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

’’تجھے بخار ہے کیا؟‘‘ وہ اس کے انداز.... پر حیران نہیں ہوئی۔

”بتا دیا تجھے اُس نے!“
”ہاں! اور یہ بھی بتایا کہ علاج کے لیے تجھے کچھ پیسے بھی دے کر گیا ہے۔“
”تو سیدھی طرح کہہ ناں کہ ان پیسوں کے لیے آیا ہے میرے پاس۔“ اس کے لفظوں میں کاٹ تھی۔
”لگتا ہے آج پھر دھلائی کرانے کا ارادہ ہے تیرا!“
وہ خوفناک تیور لیے اس کی طرف بڑھا اور ایک زوردار طمانچہ اس کے منہ پر مارا۔ پہلو میں کئی ٹھوکریں رسید کیں۔ مائرہ نے دکھتے وجود سے اس کے ہاتھ پر پیسے رکھ دیے۔ رقم لے کر وہ چادر کی بُکل مارے باہر نکل گیا۔

مائرہ اپنا مضروب وجود سمیٹ کر اٹھی اور چارپائی کے نیچے رکھے ایک ٹرنک سے چند پرانے کاغذ اور تصویریں نکال لیں۔ ایک تصویر کسی عورت کی تھی جس کی سیاہ آنکھوں میں کاجل نے مزید کشش پیدا کر دی تھی۔ اس کے لمبے اور گھنے بال جوڑے میں بندھے تھے۔ مانگ درمیانی تھی۔ پیشانی البتہ قدرے تنگ تھی۔ اس کی قمیص کا گلا کشادہ تھا۔ کانوں میں بالیاں اور گلے میں نازک سا نیکلس موجود تھا۔ اس عورت کے نقوش میں مائرہ کی جھلک نمایاں تھی۔ وہ کتنی ہی دیر اس تصویر کو اپنی انگلیوں کی پوروں سے ٹٹولتی رہی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی جاری تھی۔ کئی لمحے اسی خاموشی میں بیت گئے۔ بیرونی جانب آہٹ سن کر اس نے سرعت سے ٹرنک نیچے گھسیٹ دیا۔ وہ اسے اویس کی نظر سے بچانا چاہتی تھی۔ اس کی عامیانہ گفتگو اور تبصرے اس کے ذہن میں آتش فشاں برپا کرتے تو بے بسی کا احساس اپنے وجود پر مزید شرمساری پیدا کرتا۔ وہ ایک بار پھر دانستہ طور پر کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ اس کے اندازے کے عین مطابق اویس کمرے کی چوکھٹ پر چادر کی بُکل مارے موجود تھا۔

”یہ لے پکڑ! دوائی لے آیا ہوں میں تیری۔“ اس نے پلاسٹک کے ایک چند سینٹی میٹر لمبے بیگ میں موجود گولیاں اس کی طرف اچھالیں۔

مائرہ اسے دیکھے بنا ہی جانتی تھی کہ یہ نو گولیوں پر مشتمل تین وقتی خوراک ہوگی جسے صبح، دوپہر، شام کھانے کی ہدایت ملی ہوگی۔ ایک اعصابی سکون کی نیلی گولی، تکونی انداز میں بنی قدرے بڑی درد کش گولی اور سرخ و سیاہ رنگ کا کیپسول۔ اس بستی کے اختتام پر ایک عطائی ڈاکٹر کی دکان تھی جو اپنے ایک واقف کار کے میڈیکل اسٹور سے ایسی سیکڑوں دوائیں تھوک کے حساب سے خرید کر بلحاظ ضرورت پلاسٹک بیگز میں الگ کر لیتا تھا۔ ایک بیگ کی قیمت پندرہ سے بیس روپے تھی جبکہ مائرہ کو ملنے والی رقم دو یا تین ہزار روپے سے کم نہیں تھی۔ بقیہ رقم یقیناً اس نے اپنی عیاشی پر صرف کرنی تھی۔ وہ غصے، نفرت اور بے بسی سے پیچ و تاب کھا کر رہ گئی۔

☆☆☆

انسپکٹر سفیان پولیس اسٹیشن آیا تو احاطے میں ایک سرخ رنگ کی اسپورٹس کار دیکھ کر حیران رہ گیا۔
”اس کار کا نزول کب ہوا بھئی؟“ اس نے اپنے ماتحت اے ایس آئی طیب سے دریافت کیا۔
”کل رات پُل کے پار واقع کچی بستی میں لاوارث کھڑی تھی۔“ طیب نے بتایا۔
”تو یہاں تک کیسے پہنچ گئی بھئی؟“
”اس بستی میں جرائم پیشہ افراد، جوئے کے نئے ٹھکانوں اور جسم فروشی کے دھندوں کے باعث چند مخبر تعینات کیے گئے تھے۔ انہی میں سے ایک نے کل اسے وہاں دیکھا۔ ایسی بستی میں اس قسم کی کار کی موجودگی کافی حیران کن تھی سو وہ فوراً چوکنا ہوگیا۔“ طیب نے کہا۔
”تم نے چیک کی گاڑی؟“
”جی! گاڑی میں کسی قسم کی کوئی احتجاجی صورت حال کے آثار نظر نہیں آئے۔ بیگ اور موبائل کے علاوہ ڈرگز کے چند پیکٹس ملے ہیں۔“ طیب نے سب چیزیں اسے تھما دیں۔

سفیان گہری سوچتی نگاہوں سے ان کا جائزہ لینے لگا۔ بیگ میں کریڈٹ کارڈ، شناختی کارڈ کے علاوہ برانڈڈ میک اَپ کا سامان اور ہزاروں میں کیش رقم تھی۔ شناختی کارڈ پر کسی انعم چوہدری کے کوائف درج تھے۔ رہائشی پتا بھی ایک قریبی ہاؤسنگ سوسائٹی کا تھا۔

کارڈ کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد اس نے موبائل فون تھام لیا۔ وہ ایک آئی فون تھا جس کی اسکرین مقفل تھی اور چار حرفی پاس ورڈ کا مطالبہ اس کا منہ چڑا رہا تھا لیکن اگر ایک دفعہ وہ اسے کھول لیتا تو پھر مزید کسی جگہ رکاوٹ پیش نہ آتی۔ سفیان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اسے اس طرح کے معمے حل کرنے میں بہت مزہ آتا تھا۔ تیس سالہ انسپکٹر سفیان کرمنالوجی اور علم نفسیات میں ماسٹرز کے باعث لوگوں کی نفسیات اپنی ہتھیلی کی لکیروں کے مانند پرکھ لیتا تھا۔ چند لمحے سوچ بچار کرنے اور کارڈ کے کوائف کو بغور جانچنے کے بعد اس نے مسکرا کر طیب کو دیکھا

اور موبائل پر پاس ورڈ لگا کر شرارت بھرے انداز میں بولا۔
”کھل جا سم سم!“
فون کی اسکرین کھل چکی تھی۔ طیب اس شعبدے سے بالکل حیران نہ ہوا۔ اسے علم تھا کہ سفیان ان معاملات میں کافی ذہین ہے۔
سفیان نے کال ریکارڈز، میسجز اور سوشل میڈیا ایپلی کیشنز کو اچھی طرح کھنگالنا شروع کیا۔
اسی وقت فون کی گھنٹی نے اسے اپنی جانب متوجہ کر لیا۔

☆☆☆

انٹر کام کی گھنٹی بجتے ہی حبہ کا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔
وہ اس آواز سے دنیا میں سب سے زیادہ نفرت کرنے لگی تھی۔ یہ آواز جب بھی اپنی تمام تر نخوست اور کرختگی کے ساتھ اس کی سماعت میں پڑتی، اس کا دل چاہتا کہ کانوں پر ہاتھ رکھ لے اور زوردار چیخیں مارتی جنگل، بیابانوں میں گم ہو جائے اور پھر کوئی بھی اسے تلاش نہ کر سکے۔
کئی گھنٹیاں بجنے کے بعد اس نے اپنا دل مضبوط کیا اور ریسیور اٹھا کر بولی۔ ”ہے......ہیلو!“
”میرے آفس میں آؤ جلدی!“ دوسری جانب سے متوقع فقرہ سن کر اس کا جسم بے جان ہونے لگا۔
اس نے بے بسی سے اِدھر اُدھر دیکھا لیکن کہیں کوئی جائے امان نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ مریل قدموں سے چلتی دفتر کی جانب بڑھ گئی۔
”آپ نے بلایا تھا سر؟“ اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی پوچھا۔
”ہاں بھئی! آؤ بیٹھو!“ ریوالونگ چیئر پر براجمان اس جسیم اور نیم گنجے شخص نے کہا۔ اس کی رنگت تانبے جیسی تھی۔ قد بمشکل پانچ فٹ تھا جو موٹاپے کے باعث مزید چھوٹا اور مضحکہ خیز لگتا۔ چندی چندی آنکھوں میں مکاری گویا ثبت ہو چکی تھی۔
”مم...... مجھے کچھ کام ہے سر!“
”کیا تمہیں کبھی کسی نے بتایا نہیں کہ اتنے خوب صورت چہرے پر جھوٹ نہیں سجتے مائی ڈیئر!“ اس کے انداز حبہ کو مزید ہولا رہے تھے۔
”آپ نے مجھے کیوں بلوایا ہے سر؟“
”میں تمہیں ایک آفر کرنا چاہتا ہوں۔“
”کیسی آفر؟“ وہ متوحش ہوئی۔
”تم جیسی خوب صورت لڑکی ریسیپشن پر کھڑی رہ کر اپنا ٹیلنٹ ضائع کرے تو مجھ جیسا نرم دل انسان اسے کیسے برداشت کرے؟“ اس نے چہرے پر خبیثانہ مسکراہٹ سجا کر کہا۔ ”اسی لیے تمہیں ایک آفر دے رہا ہوں۔ تم مجھ سے ایک کانٹریکٹ کر لو اور بیرونِ ملک ٹورز اور بزنس پارٹیز میں میری پارٹنر بن کر رہو۔“ اس کی بات سن کر حبہ کے قدموں تلے زمین کھسک گئی لیکن فوری انکار کرنے کی حماقت بھی نہیں کر سکتی تھی۔
”مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت درکار ہے۔“ اس نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد کہا۔
”ہاں، ہاں کیوں نہیں! اگر تم اس معاہدے میں کچھ ترمیم کروانا چاہو تو بھی مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ معاوضہ تمہارے مطلب کا...... کام میرے مطلب کا۔“
”ٹھیک ہے سر!“ اس نے سر جھکا کر کہا۔
محمود کی آنکھوں کی چمک مزید گہری ہو گئی۔ اس نے ٹشو سے بہتی رال صاف کی اور اپنی نشست سے اٹھ کر اس کے پاس آ گیا۔
”مجھ سے وفادار رہو گی تو بہت فائدے میں رہو گی۔“ وہ اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔
”میں وفاداری نبھاؤں گی سر!“ حبہ نے اپنی ناگواری بمشکل ضبط کی اور جسم کی لرزش پر قابو پاتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ کمرے سے باہر نکلنے اور اپنی مخصوص نشست تک پہنچنے کے دوران میں اس نے کئی بار موت کی تمنا کی تھی۔
آفس ٹائم ختم ہونے میں ابھی نصف گھنٹا باقی تھا لیکن اس نے کاؤنٹر پر موجود اشیا سمیٹنی شروع کر دیں۔
”تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے کیا؟“ چند فٹ کے فاصلے پر بیٹھی کمپیوٹر آپریٹر نے اس کی حالت دیکھ کر پوچھا۔
”ہاں! ٹھیک ہوں میں۔“
”باس کے بلاوے سے پریشان ہو ناں؟“
”تو اور کیا ایسے مطالبے پر خوشی سے رقص کروں؟“ وہ تلخ ہوئی۔
”بے وقوف مت بنو۔ تھوڑی سی بارگیننگ کے بعد یہ معاملہ سیٹ کر لینا۔“ اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔
”میرے لیے ایسا کرنا ممکن نہیں۔“
”ممکن تو کسی کے لیے بھی نہیں ہوتا ایڈیٹ! یہ سب اپنی بقا کے لیے ضروری ہے۔ تم نہیں کرو گی تو کوئی اور کر لے

گا تو پھر تم ہی کیوں نہیں؟ دو چار سال میں اتنا مال بنا لوگی کہ آرام سے کوئی اور اچھی نوکری حاصل کرلو۔''

''تو کیا تم بھی؟'' حبہ بے ساختگی سے بولی۔

''ہاں! میں بھی...... اور ایک میں ہی نہیں، یہاں کام کرنے والی ہر لڑکی نے کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں یہ ڈیل ضرور کی ہے۔'' اس کا لہجہ اب بھی دھیما تھا۔

حبہ کے دل و دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ اس نے سامان وغیرہ سمیٹ لیا۔ آفس ٹائمنگ اب ختم ہوگئی تھی۔ اس نے بیگ کندھے پر لٹکایا اور آفس سے نکل گئی۔

ہاسٹل پہنچ کر بھی اس کے مزاج میں بیزاری اور افسردگی کے رنگ غالب تھے۔ وہ جوتے ایک جانب پھینک کر انہی کپڑوں میں بستر پر لیٹ گئی۔ آنکھوں پر بازو رکھے بے حسی سے کتنی ہی دیر اسی انداز میں لیٹے لیٹے اس کے آس پاس بہت سے جگنو چمکتے رہے لیکن وہ ان کی جانب دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

''ارے! تم ابھی تک انہی کپڑوں میں لیٹی ہو؟ طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟'' اپنے قریب اُبھرنے والی ایک صدا سے اسے اندازہ ہوا کہ نو بجے سے زائد وقت گزر چکا ہے۔

''ٹھیک ہوں۔ بس یونہی دل نہیں چاہ رہا تھا۔'' اس نے آنکھوں سے بازو ہٹایا۔ جسم شل ہو چکا تھا۔

''تو وہ کون سی نئی بات ہے! تمہارا دل تو یوں بھی سدا کا مریض ہے۔ جب بھی دیکھو چہرے پر بارہ ہی بجے ہوتے ہیں۔'' ربیعہ نے منہ بنایا۔ وہ بدتمیزی کی حد تک صاف گو اور بدلحاظ تھی۔

''میں جانتی ہوں۔ تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' حبہ چڑ گئی۔

''ہوا کیا ہے ویسے؟'' وہ اس کے انداز سے محظوظ ہوئی۔

''یہ تم نے مجھے کیسی جگہ بھیج دیا تھا ربیعہ؟ کیا میں تمہیں ایسی لگتی ہوں کہ اس قسم کی جگہ پر جا کر ایڈجسٹ ہو جاؤں گی۔'' وہ پھٹ پڑی۔

''زیادہ ہائپر ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے کب تمہیں اس جگہ کا کیریکٹر سرٹیفکیٹ تھمایا تھا؟ اور اتنی ننھی بچی تم بھی نہیں ہو کہ جان نہ سکو ورکنگ گرلز کو کن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔'' اس کی صاف گوئی پر وہ خاموش ہو گئی۔

ربیعہ کچھ دیر اس کی رونی صورت دیکھتی رہی اور پھر پوچھا۔

''اب تک کتنی جگہ سے جاب چھوڑ چکی ہو؟''

''چھ جگہ سے۔''

''اور اس سب کی وجہ؟''

''ہر جگہ گدھ بستے ہیں جو اکیلی لڑکی کو دیکھ کر نوچنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔''

''ہاں یہ تو ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔''

''میں یہ سب برداشت نہیں کر سکتی۔'' وہ روہانسی ہونے لگی۔

''تو پھر کیا ارادے ہیں؟''

''میں یہ نوکری چھوڑ دوں گی۔'' اس نے فوری کہا۔

''گڈ! تو اس کے بعد کیا کرو گی؟ اس ہاسٹل کے اخراجات کیسے پورے کروگی؟''

''نئی نوکری تلاش کرلوں گی اور اس بار خود کروں گی۔''

''ویری گڈ! چار دن بعد وہ بھی چھوڑ دینا۔ بس یہی کھیل کھیلتی رہنا۔'' ربیعہ استہزائیہ ہنسی۔

''میں ہمت نہیں ہاروں گی۔ ایک بار مزید کوشش کروں گی۔''

''بیسٹ آف لک......'' ربیعہ نے اپنے موبائل سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے مصروف سے انداز میں کہا۔

حبہ ایک بار پھر گہری سوچ میں غرق ہوگئی۔ اُسے اپنے اطراف میں اندھیروں اور گھور تاریکی کے سوا کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔

☆☆☆

کمرا انتہائی تاریک اور سرد تھا۔

وہ خالی نظروں سے خلا میں تکتی اپنے گرد و پیش کے ماحول سے شناسا ہونے کی کوشش کرتی رہی۔ کچھ لمحوں تک تو سمجھ ہی نہیں آئی کہ وہ کہاں موجود ہے؟ دماغ پر اب بھی دھند سی چھائی تھی۔ اس کی آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہوئیں تو اپنا سر زور سے دائیں بائیں جھٹکا۔ اذیت کی ایک تیز لہر اس کی رگوں میں سرایت کر گئی لیکن فی الوقت وہ اس تکلیف کے ماخذ کو سمجھنے سے قاصر تھی۔

حواس ذرا بحال ہوئے تو بے ہوشی سے پہلے کے مناظر یاد آنے لگے۔ وہ انوشہ کے کہنے پر ایک بستی میں گئی تھی۔ گاڑی سے نکلتے ہی اس کے چہرے پر پھوار پڑی تھی اور پھر اسے کچھ ہوش نہیں رہا۔ اپنی بے بسی اور اس مخدوش صورتِ حال کا اندازہ ہوتے ہی اس کے چودہ طبق روشن ہو

گئے۔ اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ ایک معمولی سے چیلنج کا بدلہ لینے کے لیے انوشہ اس حد تک بھی جاسکتی ہے۔

''کوئی ہے۔ کوئی ہے کیا یہاں؟'' وہ چلائی لیکن وہاں سرد تاریکی اور رگوں میں خون منجمد کر دینے والے سناٹے کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

''انوشہ! یہ انتہائی گھٹیا مذاق ہے۔ اس ڈرامے کو یہیں ختم کر دو اب!'' اس نے ایک بار پھر صدا لگائی مگر جواب ندارد۔ اسے اپنے آس پاس کسی کی موجودگی کا احساس ہو رہا تھا اور یہ احساس اس قدر طاقتور تھا کہ وہ اسے جھٹلا نہیں سکتی تھی۔

انوشہ شاید اسی خاموشی اور اعصابی جنگ سے اسے شکست دینا چاہتی تھی۔

اس نے ٹٹولتے ہوئے اپنے جسم کا جائزہ لیا۔ وہ ایک دیوار سے بندھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں مخصوص ساخت کے کلپ تھے جس کی وجہ سے چند میٹرز سے زیادہ ہاتھوں کو حرکت نہیں دی جاسکتی تھی۔ پاؤں البتہ آزاد تھے۔ وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اسے سنجیدگی سے اس صورتِ حال کا جائزہ لے کر انوشہ کو اپنے بل سے باہر نکالنے کی حکمتِ عملی مرتب کرنی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو جائے گی۔

☆☆☆

انسپکٹر سفیان کو یقین تھا کہ انعم کی گمشدگی پر کوئی نہ کوئی رپورٹ ضرور درج کروائی جائے گی لیکن کسی جانب سے کوئی رابطہ نہ کیا گیا۔ اس نے شناختی کارڈ پر دیے گئے پتے پر خود جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

اسے ایک ملازم نے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ گھر کی آرائش میں امارت کے باوجود ایک نفاست اور وقار کی جھلک نمایاں تھی۔ یہ بابر چوہدری کا شاندار بنگلا تھا۔

''جی فرمائیے! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' بابر نے ڈرائنگ روم میں داخل ہونے کے بعد اس سے پوچھا۔

''انعم چوہدری کے متعلق کچھ معلومات درکار ہیں۔'' اس کی بات سن کر بابر یکدم سیدھا ہوا۔

''کیوں؟ کیا ہوا؟''

''آپ واقعی انجان ہیں یا میرے سامنے ظاہر کر رہے ہیں؟''

''پہیلیاں مت بجھواؤ آفیسر! جو کہنا ہے صاف صاف کہو۔'' وہ یکدم پریشان ہوا۔

تمیز

یوں تو ذہنی طور پر مجنوں اور جرائم پیشہ لوگوں کے علاوہ سبھی مانتے ہیں کہ امن اور آزادی بہت حسین اور تابناک چیز ہے اور سبھی تصور کر سکتے ہیں کہ امن گندم کے کھیت ہیں اور سفیدے کے درخت دلہن کا آنچل ہیں اور بچوں کے ہنستے ہوئے ہاتھ شاعر کا قلم ہے اور مصور کے موئے قلم اور آزادی ان سب صفات کی ضامن اور غلامی ان سب خوبیوں کی قاتل ہے جو انسان اور حیوان میں تمیز کرتی ہے یعنی شعور اور ذہانت، انصاف اور صداقت، وقار اور شجاعت نیکی اور رواداری اسی لیے بظاہر امن اور آزادی کے حصول اور تکمیل کے متعلق ہوش مند انسانوں میں اختلاف کی گنجائش نہیں ہونی چاہیے۔

(فیض احمد فیض نسخہ ہائے وفا سے)

☆☆☆

ذرا مسکراؤ تو...!

بچے اپنی ماؤں کے بالوں پر گفتگو کر رہے تھے ایک بولا۔ ''میری مما کے بال سب سے خوب صورت ہیں ڈیڈی بھی اکثر ان کی تعریف کرتے ہیں۔''

دوسرے نے کہا۔ ''میری مما کے بال ایک دم سنہرے ہیں اتنے کہ رات کو بھی چمکتے ہیں۔''

تیسرے نے کہا۔ ''یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ میری ممی کے بال جادو کے ہیں جب جی چاہا سر پر رکھ لیے جب جی چاہا اتار کر ڈائننگ ٹیبل پر رکھ لیے۔''

☆☆☆

ڈاکٹر مریض سے

''سناؤ بھئی اب تمہاری حالت کیسی ہے؟''

مریض اکھڑی سانس لیتے ہوئے۔ ''جناب ویسے تو ٹھیک ہوں بس ذرا سانس رک رک کے آتی ہے۔''

ڈاکٹر اطمینان سے۔ ''تم فکر نہ کرو ابھی وہ بھی بند کیے دیتا ہوں۔''

عبدالجبار رومی انصاری...... قصور

''پُل کے پار بستی میں آپ کی بیٹی کی گاڑی کھڑی ملی ہے۔ موبائل فون اور دیگر شناختی اشیا بھی وہیں موجود تھیں لیکن خود مس انعم غائب ہیں۔ میں یہی جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کہاں ہیں اور ان کے پاس ڈرگز کی موجودگی کا کیا سبب ہے؟''

''کیا! ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟''

''یہ تو آپ یا آپ کی بیٹی ہی بہتر بتا سکتے ہیں۔''

''میں اپنی بیوی کے علاج کے لیے دو روز سے سنگاپور میں تھا۔ ابھی ایک گھنٹا پہلے ہی لوٹے ہیں ہم۔''

''آپ کی غیر موجودگی میں گھریلو معاملات کا ذمّے دار کون ہوتا ہے؟''

''سرونٹ ہیڈ۔ وہ ایک ادھیڑ عمر ملازمہ ہے۔ گھر کے سب اندرونی معاملات وہی دیکھتی ہے۔''

''میں اس سے ملنا چاہوں گا!'' سفیان کی فرمائش پر بابر نے ہونٹ بھینچ کر ملازمہ کو بلوا بھیجا۔

وہ چالیس سال سے متجاوز تھی۔ اس کے نقوش اور انداز میں ایک خاص قسم کی کرختگی نظر آتی تھی۔ آنکھوں میں بلا کی مکاری تھی۔

''بے بی کہاں ہے مونا؟'' بابر نے استفسار کیا۔

''وہ تو کل رات سے ہی گھر میں موجود نہیں ہیں۔''

''تم نے مجھے رپورٹ کیوں نہیں کی؟'' وہ چلایا۔

''ویری سوری سر! لیکن وہ پہلی دفعہ تو گھر سے غائب نہیں ہوئیں۔ پہلے بھی اپنے دوستوں کے ساتھ فارم ہاؤسز اور کلب پارٹیز وغیرہ کے لیے جاتی ہی رہتی ہیں۔'' اس کے جواب پر بابر جز بز ہوا۔

''عموماً کب تک لوٹ آتی ہے وہ؟'' سفیان نے پوچھا۔

''دوپہر تک لوٹ آیا کرتی ہیں۔''

بابر کے چہرے پر اُلجھن بڑھتی جارہی تھی۔

''میں نے اس کے موبائل فون کو کھنگالا ہے۔ کل وہ کسی شاپنگ مال میں خاصی مصروف رہی تھی۔ اس کے فون میں سیلفیز وغیرہ بھی موجود ہیں۔'' سفیان نے کہا۔

''وہ اپنے دوستوں کے ساتھ اکثر آؤٹنگ کرتی رہتی تھی۔ یہ کوئی ایسا بڑا ایشو تو نہیں۔''

''یقیناً نہیں ہوگا بلکہ آپ کے لیے تو یہ بھی کوئی بڑا ایشو نہیں ہوگا کہ وہ اپنے دوستوں کو ایک ہی دن میں لاکھوں کی برانڈڈ شاپنگ کروا دے۔''

''ناممکن! ایسا تو پہلے کبھی نہیں ہوا۔'' بابر بے یقین تھا۔

''آپ کی بیٹی کا کسی حسنین نامی شخص سے افیئر کنفرم چکا ہے۔ وہ کل اسی کے ساتھ تھی۔ اس کے فون کال ریکارڈ اور میسیجز سے صاف ظاہر ہے کہ ان کا تعلق کافی سنجیدہ نوعیت کا ہے۔ حسنین کا نمبر مسلسل آف ہے۔ آخری دفعہ انوشہ نا لڑکی نے انعم سے رابطہ کیا تھا۔ وہ اسے کچی بستی میں بلا کر کچھ حقائق سے آگاہ کرنا چاہتی تھی مگر وہ نمبر بھی اب آف ہے۔''

''میرا تو دماغ ماؤف ہو رہا ہے آفیسر!'' بابر کی کیفیت لحہ بہ لحہ بدل رہی تھی۔

سفیان نے انعم کا موبائل نکالا اور ایک تصویر اس کے سامنے کردی۔ ''میرا تجربہ کہتا ہے کہ اس شخص کا تعلق آپ کی کلاس سے نہیں ہے اور اب یہ بھی جان گیا ہوں کہ آپ بھی اس سے واقف نہیں ہوں گے۔''

تصویر دیکھ کر بابر کے چہرے پر اُلجھن مزید بڑھ گئی۔

''ایسا لگتا ہے کہ اسے کہیں دیکھا ہے لیکن کہاں؟ یا نہیں آرہا......'' اس نے پیشانی مسلی۔

''اوکے! اگر یاد آئے تو اطلاع دے دیجیے گا۔'' سفیان منہ بناتا ہوا اُٹھ گیا۔

اس کلاس کی اپنی اولاد کی تربیت اور ذمّے داری سے بے نیازی اس کے لیے نئی بات تو نہیں تھی لیکن بابر چوہدری کی اس قدر لاعلمی پر اسے حقیقتاً بہت غصہ آرہا تھا۔ وہ اسے اپنا موبائل نمبر دے کر وہاں سے لوٹ آیا۔

☆☆☆

مائرہ کی طبیعت پر ان سہ رنگی گولیوں سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ بخار کی شدت نے جسمانی نقاہت بھی بڑھا دی۔ چہرے کی ہڈیاں ابھرنے لگیں اور نیم بے ہوشی کی سی کیفیت طاری رہنے لگی۔

''تیری یہ ڈرامے بازیاں میرا دماغ خراب کرنے لگی ہیں۔'' اویس نے زچ ہوکر کہا۔ وہ کل سے تین کسٹمرز کو انکار کرکے آگ بگولا ہورہا تھا۔

''تیرا دماغ ٹھیک تھا ہی کب؟'' مائرہ ترشی سے بولی۔

''تجھے کئی بار کہہ چکا ہوں کہ ایک بیٹی پیدا کردے مجھے۔''

''خدا کے قہر سے ڈر اویس!'' وہ بلبلا اٹھی۔

اویس کی ہنسی اس کے لہو میں شرارے دوڑانے لگی۔

اسی لمحے موبائل کی گھنٹی نے اس بحث کو وقتی طور پر ختم کردیا

وہ چند لمحے دوسری جانب کی گفتگو سنتا رہا اور پھر فون بند کر کے معنی خیز انداز میں بولا۔

''ماجد صاحب آرہے ہیں۔ اپنا حلیہ ٹھیک کرلے فوراً ورنہ بیلٹ سے تیری چمڑی اُدھیڑ دوں گا۔''

ماجد کی آمد کا ذکر سن کر وہ اپنا غصہ بھول گئی۔ یہ واحد شخص تھا جو تیسری بار اس سے ملنے آرہا تھا۔ عجیب بات تو یہ تھی کہ وہ اس کے پاس بیٹھ کر اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد خاموشی سے چلا جاتا تھا۔ اس عجیب و غریب انسان کے متعلق سوچتے ہوئے وہ تیار ہونے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

☆☆☆

حبہ ایک مشہور شاہراہ پر کھڑی تھی۔

یہ کمرشل ایریا تھا۔ سڑک کے ایک جانب بینک، فاسٹ فوڈ کے چند ریستوران اور دو شادی ہال تھے تو دوسری جانب مختلف اسکولز کی عمارات تھیں۔

اس نے دلفریب کڑھائی اور نگینوں والا سیاہ عبایا پہن رکھا تھا، سر ایک مخصوص اسکارف سے ڈھکا تھا۔ اس کے چہرے پر قدرتی سرخی تھی جو دھوپ میں مزید نمایاں ہو جاتی۔ وہ متوازن قدموں سے چلتی ایک گیٹ کی جانب بڑھی جس پر جلی حروف میں لکھا تھا۔ ''اسٹاف کی ضرورت ہے۔''

گیٹ پر اونچا لمبا اور بھاری بھرکم جسامت والا رائفل بردار ایک گارڈ موجود تھا۔ ''جی میڈم! کس سے ملنا ہے؟''

''پرنسپل سے ملنا ہے مجھے۔'' اس نے اپنے انداز میں اعتماد پیدا کرنے کی کوشش کی۔

''کس سلسلے میں؟'' وہ اس کا حلیہ دیکھ کر مشکوک ہونے لگا۔

''اس سلسلے میں بھائی!'' اس نے بیزاری سے گیٹ پر لگے بورڈ کی طرف اشارہ کیا۔ گارڈ کے تاثرات اس کے لیے بالکل ناقابلِ فہم تھے۔

''کاریڈور سے دائیں جانب ہو جانا۔'' اس نے بالآخر دروازہ کھول دیا۔ اس لباس میں اسٹاف انٹرویو کے لیے آنے والی یہ پہلی لڑکی اسے کسی اور ہی دنیا کی مخلوق لگی تھی ورنہ اس شاہراہ کے سبھی اسکولز میں ٹیچرز کا ماڈرن اور 'اپ ٹو ڈیٹ' ہونا شرطِ اول تھا۔

حبہ نے اپنے بیزار تاثرات اور تلخی کو اعتماد و خوش خلقی کے نقاب تلے چھپایا اور مضبوط قدموں سے چلتی اندر بڑھ گئی۔ اندرونی عمارت بہت شاندار تھی۔ صحن میں دونوں جانب گملے مزاج پر بہت خوشگوار تاثر دے رہے تھے۔ کلاس رومز سے سنائی دینے والا مخصوص شور، ٹیچرز کی آوازیں سن کر اس کے کشیدہ اعصاب حیرت انگیز طور پر پُرسکون ہوتے چلے گئے۔

''میں اندر آسکتی ہوں میڈم!'' اس نے دفتر کے دروازے پر پہنچ کر کہا۔

''جی آئیں!'' چالیس سال سے متجاوز اس عورت نے خوش اخلاقی سے جواب دیا۔ اس کا چہرہ میک اپ سے سجا ہوا تھا۔ ہلکے سنہرے رنگ میں رنگے بال بڑی نفاست سے شانوں پر بکھرے تھے۔ اس نے جدید تراش خراش کا سوٹ پہن رکھا تھا۔

''میں انٹرویو کے لیے آئی ہوں میم!'' اس نے اپنی اسناد کی فائل اسے تھمائی۔

پرنسپل ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے اس کی اسناد دیکھتی رہی لیکن اس کی آنکھوں میں بدلتے رنگ حبہ کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہے۔

''آپ کا ایجوکیشن بیک گراؤنڈ بہت کمزور ہے۔ آرٹس مضامین اور وہ بھی پرائیویٹ۔''

''جی! لیکن میرا میتھس اور انگلش بہت اچھے ہیں۔'' حبہ نے فوری جواب دیا۔

''تجربہ بھی زیرو ہے بالکل!'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔

''ہر انسان کبھی نہ کبھی تو پہلی کوشش کرتا ہی ہے ناں میم!''

''ہمم...... یہ سی وی ہم رکھ لیتے ہیں۔ ابھی مزید چند ٹیچرز کا انٹرویو ہوگا۔ اس کے بعد ضرورت پڑنے پر ہم آپ کو کال کرلیں گے۔'' پرنسپل نے ایک بار پھر مسکراہٹ پیش کی۔

حبہ خاموشی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس روز اُس نے چار مزید اداروں میں انٹرویو دیا۔ ہر بار اسے اُمید ہوتی تھی کہ ٹرائل کا ایک موقع ملتے ہی وہ اپنی قابلیت ثابت کر دے گی لیکن دھیرے دھیرے اُسے علم ہونے لگا کہ وہ کھوٹے سکے لے کر خریداری کرنے نکلی ہے۔

اس کے بعد وہ شام کو کئی ایک کوچنگ سینٹرز میں بھی گئی۔ وہاں صورتِ حال قدرے بہتر تھی لیکن تنخواہ اونٹ کے منہ میں زیرہ کے مترادف تھی۔ وہ بوجھل دل لیے ہاسٹل لوٹ آئی۔ اس شام ربیعہ بھی جلد لوٹ آئی تھی۔ اس کی

مایوسی اور افسردگی اس سے چھپی نہ رہ سکی۔
''کر آئیں کوشش؟ کچھ فائدہ ہوا کیا۔'' وہ مسکرائی۔
''میری سی وی رکھ لی ہے انہوں نے۔ جلد ہی کال کر لیں گے۔'' وہ اب بھی خوش فہم تھی۔
''یہ بھی دیکھ لیتے ہیں۔ کتنے لاکھ سیلری ملے گی ویسے؟''
''شٹ اَپ ربیعہ! مجھے اکیلا چھوڑ دو پلیز!''
''او کے! یوں کہو ناں کہ اب جی بھر کے آنسو بہانے ہیں۔'' اس نے پھر طنز کیا اور کسی کام سے باہر نکل گئی۔
حبہ کمرے میں اب اکیلی تھی۔ دن بھر کی تھکاوٹ اور ناکامی آنسو بن کر اس کی آنکھوں سے بہہ نکلی۔ ایک مانوس چہرہ بار بار نظروں میں گردش کر رہا تھا۔
''اللہ کرے کہ مر جاؤ تم! تمہیں کبھی بھی خوشی نہیں ملے گی۔ کتوں سے بدتر زندگی ہوگی تمہاری۔ اگر کبھی میرے سامنے آ جاؤ تو میں خود ہی تمہیں قتل کر دوں گی۔ خدا غارت کرے گا تمہیں!'' وہ روتے ہوئے بلاتکان بولتی چلی گئی۔
اس وقت اگر اسے یہ معلوم ہوتا کہ ان بددعاؤں نے مخاطب کو اپنے حصار میں لے لیا ہے تو جلتے انگاروں کی سی تپش دل سے کچھ حد تک تو کم ہو ہی جاتی۔ ابھی تو اذیت کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا۔

☆☆☆

پولیس ٹارچر سیل سے آنے والی آوازیں نہایت اذیت ناک تھیں۔
''اللہ کا واسطہ ہے! میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں کس زبان سے یقین دلاؤں تم لوگوں کو؟'' ایک وحشت ناک صدا ابھری۔
''چپ کر اوئے۔ تیرے سب کرتوتوں کا ہمارے پاس تصویری ثبوت ہے۔ اس شاپنگ مال میں کون سی راکھی بندھوار ہا تھا تو اس لڑکی سے؟''
حسنین اس وقت شدید عتاب میں تھا۔ بابر چوہدری نے تین دن بعد بالآخر اسے پہچان لیا تھا۔ اپنے شاپنگ مال میں ملازمین کی تنخواہوں کی ادائیگی کے معاملات براہِ راست اس کے ہاتھ میں تھے۔ دسمبر میں ہمیشہ ہی ان کی ترقی اور انکریمنٹ وغیرہ کا حتمی فیصلہ کیا جاتا تھا۔ حسنین کی فائل اور تصویر دیکھ کر اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ اسے فوری طور پر شوٹ کر دینا چاہتا تھا لیکن اپنے جذبات پر بمشکل قابو پا کر اس نے سفیان کو مطلع کر دیا۔ اگلے ایک گھنٹا میں وہ گرفتار ہو چکا تھا۔ اعلیٰ افسران سے ذاتی تعلقات کی بنا پر بابر بھی اس وقت پولیس اسٹیشن میں ہی موجود تھا۔
''کچھ بتایا اُس نے؟''
''نہیں چوہدری صاحب! وہ اب بھی ایک ہی بات پر مصر ہے۔'' سفیان نے کہا۔
''بکواس کرتا ہے وہ۔ اگر تمہاری فورس میں اتنا دم نہیں ہے تو مجھے بتاؤ...... میں اس سے اپنے طور پر نمٹ لوں گا۔'' وہ بھڑک گیا۔
''آرام سے چوہدری صاحب!'' سفیان نے اسے دلاسا دیا۔
''میری بیٹی چار دن سے لاپتا ہے آفیسر! خدا جانے کس حال میں ہے؟ میرا آرام و سکون ختم ہو چکا ہے۔''
سفیان نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ ایک اہلکار کی آمد پر خاموش ہو گیا۔
''سر جی! وہ زبان نہیں کھول رہا۔ بہت پکا مجرم ہے جی وہ یا پھر بے قصور ہے۔''
''یہیں لے آؤ اسے!'' سفیان نے حکم دیا۔
تھوڑی ہی دیر بعد وہ اہلکار حسنین کو گھسیٹتا ہوا لے آیا۔ اس کا چہرہ بری طرح سوج چکا تھا۔ ٹارچر روم میں الٹا لٹکانے کے باعث اس کے جسم کا خون چہرے میں سمٹ آیا تھا۔ اسٹائلش ہیئر اسٹائل انتہائی چھوٹے بالوں میں تبدیل ہو چکا تھا۔ پاؤں پر مسلسل ضربات کے باعث نیل کے نشان تھے اور اس کے لیے کھڑا ہونا بھی دشوار تھا۔ جسم پر صرف ایک انڈرویئر تھا۔ اس شدید سردی میں برہنگی کے باعث اس کی جلد نیلگوں ہونے لگی تھی۔ بابر کو وہاں موجود دیکھ کر اس کے حواس مزید باختہ ہو گئے۔
''تمہاری یادداشت بحال ہوئی یا مزید ڈوز دی جائے۔'' سفیان نے سرد مہری سے پوچھا۔
''میں نے کچھ نہیں کیا جی! میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کے لیے تیار ہوں۔'' اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔ اس کی زندگی فلرٹ اور رومانوی معاملات سے بھرپور تھی لیکن ایسی کسی بھی صورتِ حال کا سامنا زندگی میں پہلی بار ہوا تھا۔ وہ ملک کے انہی نوے فیصد نوجوانوں میں سے تھا جو اپنی عیش پسندانہ زندگی کے باعث کسی بھی جسمانی مشقت سے دور ہوتے ہیں اور پولیس کی مار اُن کے لیے 'قہر' سے کم نہیں ہوتی۔
''ٹھیک ہے۔ اگر ہم یہ مان لیں کہ انعم کو غائب کرنے میں تمہارا ہاتھ نہیں تو پھر وہ کہاں گئی؟ اس نے آخری ملاقات تم سے کی تھی۔ خود کو بے گناہ تو کسی صورت ثابت نہیں

کر سکتے تم!'' سفیان نے کہا۔

''سر جی! وہ خود ہی میرے پیچھے پڑی تھی۔ میری جاب کے بعد ہی ہماری شناسائی ہوئی۔ اسی نے مجھے اپنا نمبر دیا تھا اور سوشل میڈیا پر ایڈ کیا تھا۔''

''سارا کچھ وہی کرتی رہی۔ تم تو کاکے تھے ناں جو اس کے کہنے پر چلتے رہے۔'' بابر مزید خاموش نہ رہ سکا۔

''باس! وہ بہت ضدی طبیعت کی ہے۔ میں نے شروع شروع میں پہلو بچانے کی کوشش کی لیکن پھر اس نے مجھے گفٹس وغیرہ دینے شروع کر دیے اور کہتی کہ یہ بس دوستی کی حد تک ہیں۔'' اس نے خون آلود ہونٹوں پر زبان پھیری۔

''اچھا پھر؟'' سفیان نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''سر جی! میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ عورت جب کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ڈولتی ہوئی آپ کی طرف آنے لگے تو کون مرد اسے لوٹنے کا موقع ضائع کرے گا؟''

''زیادہ فلسفہ نہ جھاڑ اوئے!'' بابر بے قابو ہو گیا۔ اس کی شخصیت کے رکھ رکھاؤ اور تہذیب کی قلعی اس وقت اتر چکی تھی۔

''بابر صاحب! میں کچھ وجوہات کی بنا پر آپ کا لحاظ کر رہا ہوں ورنہ اپنے تفتیشی معاملات میں کسی کو بولنے کی اجازت نہیں دیا کرتا۔'' سفیان نے اسے سختی سے ٹوکا۔

''اس سے کہو آفیسر کہ اپنی زبان بند رکھے۔ یہ فلسفے اپنے چھوٹے ذہن تک محدود رکھے۔'' بابر کف اُڑانے لگا۔

''باس! میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں انعم سے یہی کہتا تھا کہ آپ کی اپروچ اور پوزیشن میری حیثیت سے بہت بلند ہے لیکن وہ پھر بھی نہیں مانی۔ آہستہ آہستہ میرا دل بھی بے ایمان ہونے لگا۔ وہ مجھے اچھی تو لگتی تھی لیکن میرے لیے زیادہ کشش ان گفٹس وغیرہ میں تھی۔ یار دوستوں میں میری بڑی ٹور بنتی تھی کہ میری امیر کبیر گرل فرینڈ مجھ پر اتنی لٹو ہے کہ مجھے مہنگے گفٹس دیتی ہے۔''

''شاپنگ مال میں کوئی لڑائی جھگڑا تو نہیں ہوا تھا تم لوگوں کا؟'' سفیان نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھا۔ ''اور نمبر کیوں آف تھا تمہارا؟''

''میرا موبائل فون چھوٹے بھائی کو پسند آ گیا تھا سر جی! میں نے اسے تھما دیا۔ انعم سے اگر یہ کہتا کہ فون چوری ہو گیا ہے تو وہ اس سے بھی مہنگا فون خرید دیتی مجھے۔'' اس نے بابر کی طرف ڈرتے ڈرتے دیکھ کر جواب دیا۔

''شاپنگ مال میں کوئی جھگڑا نہیں ہوا تھا جی! وہ مجھے شادی کا کہہ رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند نہیں لگتا لیکن وہ بضد تھی کہ اگر ہم کورٹ میرج کر لیں تو میڈیا کے خوف سے باس اس شادی کے خلاف کچھ نہیں کر سکیں گے۔''

بابر ایک جھٹکے سے کرسی سے اُٹھا اور حسنین کے منہ پر گھونسا دے مارا۔ سفیان نے تیزی سے آگے بڑھ کر عقب سے اسے دبوچ لیا۔

''کیا کر رہے ہیں بابر صاحب؟ سنبھالیے خود کو!''

''مجھ پر کیوں غصہ ہو رہے ہیں باس؟ میں مانتا ہوں کہ کہیں نہ کہیں اس کی حوصلہ افزائی کرنے کا گناہ ضرور ہوا تھا مجھ سے لیکن اتنا بچہ میں بھی نہیں ہوں کہ سمجھ نہ سکوں کہ وہ اپنے طبقے کے برگر لڑکوں سے مایوس ہو کر ہی میری طرف بڑھی تھی۔ اسے شوہر خریدنا تھا جس کے نام کا لائسنس لے کر وہ اپنی من مانیاں کرتی پھرے۔ خدا جانے کس سابق آشنا نے اسے غائب کروا دیا اور اختیار، پیسے، طاقت کے بل بوتے پر مجھ غریب کو رگڑ رہے ہیں۔'' حسنین بھی بے قابو ہو گیا۔

سفیان کے اشارے پر طیب اُسے باہر لے گیا۔ وہ ہنوز مغلظات بک رہا تھا۔

''میری بیٹی کو کسی بھی قیمت پر ڈھونڈو انسپکٹر! کسی بھی قیمت پر...... ورنہ میں......'' وہ بات کرتے ہوئے ہانپنے لگا۔

''وہ ضرور مل جائے گی۔ اگر وہ اپنی مرضی سے کہیں نہیں گئی تو یہ اغوا برائے تاوان کا معاملہ بھی ہو سکتا ہے۔ میں آپ کے موبائل اور لینڈ لائن نمبرز پر آبزرویشن لگوا دیتا ہوں۔ ہم جلد ہی اُسے ڈھونڈ لیں گے...... آپ پریشان مت ہوں!'' سفیان نے اسے بھرپور تسلی دی۔

☆☆☆

اس تاریک کمرے میں وقت کا تصور ختم ہو چکا تھا۔ وہ چیخ چلا کر مدد کے لیے پکارتی تھی لیکن جواب ایک بار بھی نہ ملا۔ اس کے حلق میں خراشیں آ گئیں۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ اس کھیل کے پیچھے انوشہ نہیں بلکہ یہ کوئی اور ہی سلسلہ ہے۔

اس کے معدے کو بھوک نے اپنے نکیلے پنجوں سے اُدھیڑنا شروع کر دیا تھا۔ بھوک، پیاس اور نیند کی کمی نے اس کی جسمانی حالت بہت خستہ کر دی تھی۔ اس وقت بھی وہ نیند کے جھونکوں سے بے حال تھی۔ وہ ایک مخصوص انداز کے بغیر

بیٹھ سکتی تھی نہ ہی لیٹ سکتی تھی۔ اذیت ہی اذیت تھی۔

''رحم کرو مجھ پہ! میرا قصور کیا ہے؟'' اس کی آواز مدھم سسکیوں میں تبدیل ہونے لگی۔

نیم غشی کی کیفیت میں بھی بالوں اور گردن کو لگنے والے جھٹکے اور تکلیف کے لاشعوری احساس سے اس کا جسم اور اعصاب تنے ہوئے تھے۔ اسی لمحے بائیں جانب ہلکی سی روشنی اور آہٹ کا احساس ہوا۔ اس نے بے ساختہ گردن گھما کر آواز کے ماخذ کی جانب دیکھنا چاہا لیکن جھٹکا اس قدر شدید تھا کہ وہ بلبلا کر رہ گئی۔ قدموں کی آہٹ اب نزدیک آگئی تھی۔

''کون ہو تم؟ مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟'' انعم اس وقت بالکل سیدھ میں ہی دیکھ رہی تھی لیکن آنکھ کے گوشے اطراف کی ہلکی سی جھلک بہرحال دیکھ سکتے تھے۔ نووارد نے سیاہ رنگ کا ایک لبادہ پہن رکھا تھا۔ پھر اس کی سماعت میں مدھم سی ہنسی کی آواز آئی۔ اس لحاتی ہنسی سے وہ مقابل کی جنس کا اندازہ نہ لگا سکی۔ نووارد نے عقب سے ہاتھ نکالا اور ایک شاپر اس سے ذرا فاصلے پر رکھ دیا۔

''میری بات سنو! ایک بار...... پلیز ایک بار مجھ سے بات کرلو۔'' انعم نے اس کی جانب دیکھنا چاہا لیکن جھٹکوں نے اس کی یہ کوشش ناکام بنادی۔

تاریکی نے ایک بار پھر وہاں موجود ہر شے کو ڈھانپ لیا۔ اس نے ٹٹول کر شاپر کا جائزہ لیا تو اسے اندازہ ہوا کہ اس میں ایک ٹھنڈا برگر موجود تھا۔ اس کی بھوک چمک اٹھی۔ بے تابی سے لقمہ لیا تو بے بسی کے احساس سے آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ مہنگے ترین غیر ملکی ریسٹورینٹس میں ہزاروں کی مالیت کے کھانے اڑانے والی انعم چوہدری کے منہ میں چالیس روپے کا ٹھیلے سے خریدے گئے برگر کا لقمہ تھا جسے وہ بدقت تمام نگل پا رہی تھی۔ کھانا ختم کر لینے کے بعد وہ ایک بار پھر ذہن میں ادھم مچاتے سوالوں اور نیند کے جھونکوں سے بے حال ہونے لگی۔

☆☆☆

اویس نصف گھنٹے بعد ہی ماجد کو لے آیا تھا۔

یہ شخص مائرہ کی اس پیشہ ورانہ زندگی میں آنے والے تمام افراد سے مختلف تھا۔ ماجد صحت مند جسامت اور مناسب قد و قامت کا مالک تھا۔ لباس بھی ہمیشہ مہذب پہنتا۔

''لگتا ہے تمہاری طبیعت ابھی تک خراب ہے۔'' اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی بھانپ لیا۔

''میں ٹھیک ہوں لیکن بہت حیران بھی ہوں۔'' مائرہ نے گول مول جواب دیا۔

''حیران کیوں بھلا؟''

''تم یہاں کیوں آتے ہو؟''

''تمہاری کشش کھینچ لاتی ہے۔'' ماجد سادگی سے بولا۔

''فلرٹ کرنے کے لیے تمہیں کوئی اور نہیں ملا شاید۔''

''فلرٹ نہیں کر رہا...... سچ کہہ رہا ہوں۔'' اس کی بات سن کر مائرہ ہنس پڑی۔ ''تمہیں یقین کیوں نہیں آتا؟''

''میں جس راہ پر چل رہی ہوں، یہاں عورت سب سے پہلے اپنا یقین ہی تو کھوتی ہے۔'' اس کی آواز میں بوجھل پن تھا۔

''میرا اندازہ ٹھیک تھا۔ تمہاری طبیعت واقعی خراب ہے۔'' اسے تشویش ہوئی پھر وہ یکدم اٹھا اور اویس کو پکارنے لگا۔

''جی صاحب! کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟''

''اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ کوئی دوا وغیرہ لا کے دی تھی یا نہیں؟'' اس کے لہجہ کا تحکم اویس کے چھکے چھڑانے کے لیے کافی تھا۔

''لایا تھا صاحب!'' وہ منمنایا۔

''اسے فرق کیوں نہیں پڑا پھر؟''

''معلوم نہیں صاحب! میں کسی اور اچھے ڈاکٹر سے لے آؤں گا۔''

''نہیں! تم رہنے دو۔ میں خود ہی کچھ کرلوں گا۔'' اس کے لہجے میں پھر سے نرمی عود آئی۔ اس نے اپنی جیب سے نوٹوں کی ایک موٹی سی گڈی نکالی اور اویس کی طرف اچھال دی۔ ''میں ایک ماہ کے لیے اسے اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں۔ تمہیں کوئی اعتراض ہو تو بتاؤ؟''

''نہیں صاحب! اعتراض کیسا بھلا؟'' اویس کی آنکھیں اتنی رقم دیکھ کر پھٹ سی گئیں اور فدویانہ انداز میں باہر چلا گیا۔

''تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟'' وہ اس بار مائرہ سے مخاطب ہوا۔

''نہیں! مجھے بھی کوئی ایشو نہیں لیکن اس مہربانی کی وجہ ضرور جاننا چاہوں گی۔'' وہ دلکشی سے مسکرائی۔

''وجہ بھی جلد ہی جان جاؤ گی۔ بے فکر رہو، میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔''

''مجھے یقین ہے۔'' وہ ایک ادا سے بولی۔
''اچھا..... اب یہ یقین کیسے آ گیا تمہیں؟'' وہ دانستہ طور پر حیران ہوا۔
''وجہ بھی جلد ہی جان جاؤ گے۔ بے فکر رہو میں تمہارے بارے میں منفی نہیں سوچ سکتی۔'' وہ برجستہ بولی۔
ماجد بھی بے ساختہ ہنس پڑا۔
مائرہ اس کی ہنسی میں کھو گئی۔

☆☆☆

''تمہاری نوکری کا کچھ بنا کہ نہیں؟'' اگلی شام ہی ربیعہ نے اسے پھر گھیر لیا۔
''کئی جگہوں پر سی وی دے چکی ہوں مگر کہیں سے بھی کال نہیں آئی۔'' حبہ نے بتایا۔
''تم واقعی اتنی سیدھی ہو یا دنیا کو بے وقوف سمجھتی ہو؟'' ربیعہ نے طنز کیا۔
''میں نے کیا کہہ دیا اب؟ سیدھے طریقے سے باعزت نوکری ہی تو تلاش کر رہی ہوں۔''
''اس آؤٹ ڈیٹڈ تعلیم اور اس سے بھی بڑھ کر آؤٹ آف فیشن خیالات سے تمہیں نوکری کبھی نہیں مل سکتی۔ یہ بات تمہاری موٹی عقل میں کیوں نہیں آ رہی؟''
''مجھے کال آ جائے گی ایک دو دن تک۔'' وہ اب بھی پُرامید تھی۔
''اور اس شاہانہ تنخواہ سے کس سوئس بینک میں اکاؤنٹ کھلواؤ گی پھر؟'' ربیعہ کے طنز پر وہ احساسِ ذلت سے سرخ ہو گئی۔
''دیکھو حبہ! میں تمہاری دشمن نہیں ہوں لیکن زندگی کے حقائق کے متعلق تم نے جو رویہ اپنا رکھا ہے نا، وہ بوگس اور نری تباہی ہے۔ اس سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ دوسری صورت میں چند سال کی مشقت ہی اٹھانی پڑے گی پھر کوئی ایسی پروفیشنل ڈگری لے لینا جو تمہاری پسند کی نوکری دلوا دے۔''
''تو کیا کروں میں اب؟''
''میں نے تمہارا استعفا آفس میں نہیں پہنچایا تھا۔ آفیشلی تم اب بھی ان کی ورکر ہو۔ کل سے وہاں جانا شروع کر دو اور جو باس کہے مان لو۔ اس سے تمہارا ہی مستقبل محفوظ ہوگا۔'' اس نے اطمینان سے کہا۔
''یہ سب کچھ کہنا اور کرنا اس قدر آسان کیسے ہے تمہارے لیے؟'' حبہ ششدر تھی۔
''کچھ بھی آسان نہیں ہوتا حبہ! اس دنیا میں کچھ بھی تو آسان نہیں ہوتا۔ تمہیں شاید میری باتیں بُری لگ رہی ہوں گی۔''
''میں نے اپنی زندگی بہت سادی گزاری ہے ربیعہ مجھے ان باتوں کی سمجھ ہے نہ شعور۔''
''تو اب اپنی آنکھیں کھول لو۔ اور جان لو کہ کوئی بھی عورت جب معاشی جدوجہد کے لیے گھر سے باہر نکلتی ہے تو بالواسطہ یا بلاواسطہ ان مردوں کے مقابل آ جاتی ہے اور یہی چیز مخالف بن جاتی ہے۔ وہ اس کا استحصال کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ اب تمہارا قصور یہ ہے کہ تمہارے پاس اعلیٰ تعلیم کا ہتھیار ہے، نہ ہی مضبوط بیک گراؤنڈ۔ تم ان کے لیے سب سے آسان نشانہ ہو اور حقیقت پسندی سے تجزیہ کرو تو تمہیں ہر جگہ ہی اس صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔''
''لیکن کیوں؟ میں ہی کیوں؟''
''کیونکہ تم مجبور ہو... مجبور نظر بھی آتی ہو اور ایسی عورت سب سے آسان اور ترجیحی شکار ہوتی ہے۔'' ربیعہ نے ایک بار پھر صاف گوئی سے کہا۔
''آج جتنے آنسو بہانے ہیں، ایک بار ہی بہا لو اور مضبوط ذہن سے مستقبل کا فیصلہ کرو۔'' اس کے دوٹوک انداز پر حبہ کی آنکھیں اپنی بے بسی اور اہانت سے جلنے لگیں۔

شدید کرب اور اذیت میں آنکھیں بند کرتے ہوئے اس کے پردۂ تصور پر جو چہرہ سب سے پہلے نظر آیا' وہ اس کی ماں کا تھا۔ وہ نہایت خشمگیں نگاہوں سے اسے گھور رہی تھی پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر ایک زوردار طمانچہ اس کے گال پر رسید کر دیا۔ حبہ نے بے اختیار آنکھیں کھولتے ہوئے اپنا ہاتھ اسی گال پر رکھ لیا۔ اسے یاد آیا کہ ایسے طمانچے آئے روز اس کا مقدر بنا کرتے تھے۔

☆☆☆

''آج اسکول سے واپسی پر کہاں گئی تھیں تم؟'' ایک کرخت آواز نے حبہ کی سانسیں خشک کیں۔
''کہیں بھی نہیں! میں کہیں بھی نہیں گئی تھی ماما!''
''ٹائم دیکھ رہی ہو، کیا ہو رہا ہے؟'' وہ ایک بار پھر چلائی۔
حبہ نے ترچھی نظر سے دیوار پر لگے بدرنگ کلاک کی طرف دیکھا جہاں سوا تین بج رہے تھے۔ ''میں کہیں نہیں گئی تھی۔'' وہ منمنائی۔
''جھوٹ بولتی ہو میرے ساتھ؟ بکواس کرتی ہو؟'' کنول کے ہاتھ بے دریغ چلنے لگے۔ حبہ کے لیے اب مزید

برداشت کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اب اگر سچ نہ بولا تو تھپڑوں کے بعد گھریلو آلاتِ تشدد سے اس کی تواضع کا آغاز ہوجائے گا۔

''ماما! وہ وین کی لڑکیوں نے انکل سے کہہ کر وین رکوا لی تھی۔''

''کیوں؟ انہوں نے کیا اپنے پیو کے ویلیے پر جانا تھا؟'' کنول زبان و بیان میں ہمیشہ یونہی بے احتیاط ہوجایا کرتی تھی۔

''وین کی ایک لڑکی کی سالگرہ تھی۔ اس نے سب کو آئس کریم کھلائی تھی۔ وہیں دیر ہوگئی۔'' اس بار اُس نے سچ بولا۔

''میں اسکول اور وین کی فیسیں تیری ان عیاشیوں کے لیے بھرتی ہوں؟''

''سوری! آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔'' اس نے بات ختم کرنی چاہی لیکن اپنی اس معذرت کے کھوکھلے ہونے کا اسے خود بھی اندازہ تھا۔

کنول تن فن کرتی اندر کمرے میں چلی گئی اور تھوڑی ہی دیر بعد آوازیں بلند ہونے لگیں۔ وہ غیر اختیاری طور پر دروازے کے قریب چلی گئی۔

''ہاں جی ملک صاحب! کل سے حبہ کو لینے مت آیئے گا...... نہیں جی! بس اب یہ وین کے چونچلے برداشت نہیں کر سکتے ہم...... ٹھیک ہے! ٹھیک ہے! مجھے بھی یاد ہے سب...... میں کوئی بھی حساب کتاب نہیں بھولی...... اگلی پہلی پر سارا حساب کلیئر کردوں گی۔'' حبہ کے چھوٹے سے ذہن نے اس یکطرفہ سنائی دینے والی گفتگو سے جو اندازے لگائے، وہ اس کے لیے بہت ہولناک تھے۔ اسے یقیناً اب وین کی سہولت سے محروم ہونا تھا اور کئی کلومیٹر دور واقع اسکول پیدل جانے کا تصور اسے حواس باختہ کرنے کے لیے کافی تھا لیکن کنول کو ابھی اسے بہت جھٹکے دینے تھے۔

اگلی صبح وہ حسبِ معمول یونیفارم پہن کر ناشتے کی میز پر آئی تو ماں نے کہا۔ ''رہنے دے اسے! اِس کی کوئی ضرورت نہیں ہے اب!''

''کک...... کیا مطلب؟''

''تُو اس اسکول نہیں جائے گی اب!'' کنول کی بات پر غور کرنے سے حبہ کی رکی ہوئی سانسیں جزوی طور پر بحال ہونے لگیں۔ 'اس اسکول' نہ جانے کا مطلب اسے قدرے امید دلا رہا تھا۔

''کیوں ماما؟'' اس نے اپنی آس کو کنارہ دینا چاہا۔

''تین مہینے سے وین والے اور اسکول کی فیسیں رکی ہوئی ہیں۔ وین والے کا حساب تو میں کسی طرح چکتا کردوں گی لیکن اسکول کے خرچے میری برداشت سے باہر ہیں۔''
حبہ اس منطق پر گہری سانس بھر کر رہ گئی۔

اس شام نانی کی اچانک آمد ہوئی اور کنول نے ان کے سامنے اپنا مدعا بیان کیا۔

''اصل بات بتاؤ مجھے! میں یہ تسلیم نہیں کرسکتی کہ تم اتنی سی وجہ سے اسکول تبدیل کروا رہی ہو۔''

''وہ بڑی ہورہی ہے۔ اس عمر میں اسے نگرانی کی زیادہ ضرورت ہے۔ اسکول میں کوایجوکیشن ہے۔ مجھے ڈر ہی لگا رہتا ہے۔'' کنول کی آواز دھیمی ہوئی۔

''میرے پاس اتنی رقم کہاں کنول؟ ہم دونوں ہی نے ایاز کے حق میں اپنے حصے سے دستبردار ہوکر بہت بڑی حماقت کی۔ وہ پہلے ہی سرے سے حبہ کی تعلیم کے خلاف ہے اور تیرا تو نام بھی سننے کا روادار نہیں۔'' نانی کے الفاظ نے اس کا دل لہولہان کردیا اور وجود بے مول ہوگیا۔ وہ اپنی ماں کے لیے ایک 'بوجھ' اور 'بے اعتبار' تھی۔ ماموں اس کی تعلیم کے خلاف تھا اور نانی ہمیشہ اسے دیکھ کر چہرے پر خشکی طاری کرلیتی۔

اس کے ذہن میں بہت سے سوالات اُدھم مچاتے تھے لیکن جواب تو کوئی اس وقت دیتا جب کسی کو پروا یا محبت ہوتی۔ وہ ایک اَن چاہا وجود تھی۔ اس کی نفسیات میں بہت سی گرہیں تھیں جنہیں سلجھانے کے لیے کسی کے پاس وقت تھا نہ ہی کوئی ضرورت۔

اُس روز کے بعد وہ کبھی اسکول جا ہی نہ سکی۔ اسے محلے میں ایک ایم اے پاس خاتون کے پاس ٹیوشن بٹھا دیا گیا۔ ہر سال ماں نئی کلاس کی کتابیں لا دیتی۔ آمنہ باجی اسے اسکول کی طرز پر تھم پر پڑھاتیں اور گھر سے کرنے کے لیے کام بھی دیا کرتیں۔ ہر تین ماہ بعد امتحان کی طرز پر ٹیسٹ لے کر اس کی قابلیت جانچ لی جاتی۔ حبہ اسی میں بہت خوش تھی کہ پڑھائی سے اس کا ناتا برقرار ہے اور وہ کچھ دیر کے لیے ہی سہی لیکن کنول کی کرخت آواز اور عقابی نظروں سے محفوظ رہتی ہے۔ رشتے داروں کے گھر آمد و رفت ایک عرصہ ہوا موقوف ہوچکی تھی۔ ان کے گھر اگر کوئی بھولے بسرے آجاتا تو کنول اسے کسی کے سامنے آنے ہی نہ دیتی۔ ہر گزرتا دن مسائل میں اضافہ کرتا تھا۔ نانی کی وفات کے بعد یہ مصائب مزید بڑھتے چلے گئے۔ میٹرک میں آنے کے بعد وہ اپنی تاریک زندگی کے سب راز جان گئی اور اس کے

بعد رہا سہا اعتماد بھی ختم ہو گیا۔ مسلسل ذہنی تناؤ کی وجہ سے کنول ہائی بلڈ پریشر کی دائمی مریضہ بن گئی۔

کنول نے اسے میٹرک کے لیے بھی اسکول میں داخل نہ کرایا۔ بالآخر آمنہ کو ہی آگے تعلیم کا آغاز کرنا پڑا۔ دو بار فیل ہونے کے بعد وہ میٹرک پاس کر سکی۔ وہ قوتِ فیصلہ اور اعتماد سے محروم تھی۔ اسے انٹر بھی آمنہ ہی نے کروایا۔ وہ اپنی واقفیت کے باعث اس کے داخلہ فارم وغیرہ بورڈ میں جمع کروا دیا کرتی۔ اس کے ساتھ امتحانی سینٹر میں چلی جاتی لیکن وہ اس کی جگہ پرچے حل نہیں کر سکتی تھی۔ حبہ کچھ مضامین میں بلاشبہ بہت اچھی تھی لیکن اس کی سب سے بڑی کمزوری اپنی ذات پر عدم اعتماد تھا جو امتحانی کمرے میں بیٹھ کر سب کچھ بھول جاتی۔ اس کی سماعت میں زہریلے فقرات کی بازگشت بھنبھناہٹ بن کر گونجتی اور اس کا ذہن کسی صاف تختی کے مانند بن جاتا۔ انٹر پاس کرنے میں بھی اسے بہت وقت لگا۔ کنول اب بہت بیمار رہنے لگی تھی۔ وہ اس کی شادی کرنا چاہتی تھی لیکن یہاں بھی ماضی کی بازگشت اسے ناکام کرنے پر تلی تھی۔ عجیب وغریب اور بدنام پس منظر رکھنے والے لوگ رشتہ لیے چلے آتے اور کنول کا بلڈ پریشر ایک نئی بلندی تک جا پہنچتا۔ اگلے دو سال ان افراد کو جھیلنے اور بیٹی کی شادی میں ناکامی کے بعد کنول کو اپنی غلطیوں کا احساس ہونے لگا اور ماں بیٹی کے درمیان پہلی بار برف پگھلی۔

''حبہ! مجھے معاف کر دینا۔ میں نادان، کم عقل ہی رہی اسی لیے ٹھوکریں ہی میرا مقدر بنیں۔''

''میں نے کبھی آپ سے کوئی گلہ نہیں کیا ماما! اب بھی نہیں کروں گی۔'' اس نے ماں کا ہاتھ اپنے لبوں سے لگایا۔

''ایک کے بعد ایک غلط فیصلے کرتی چلی گئی۔ آج سوچتی ہوں کہ مجھے کچھ ہو گیا تو تمہارا کیا ہوگا؟ مجھے تم پر اعتبار کرنا چاہیے تھا، تمہیں مضبوط بنانا چاہیے تھا لیکن......'' وہ اپنے بال مٹھیوں میں بھینچنے لگی۔

''ایسی باتیں مت سوچیں پلیز! سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''کیسے ٹھیک ہوگا؟ میری غلطیوں نے زندگی کی ڈور اس قدر اُلجھا دی ہے کہ سلجھاتے ہوئے عمر ہی بیت جائے گی۔'' وہ بہت مایوس تھی لیکن یہ ملال اور انسردگی اب لاحاصل تھا۔ اس کی طبیعت بگڑتی چلی گئی اور پھر ایک روز اپنی کرختگی، منفی سوچوں اور غلط فیصلوں کے ساتھ قبر میں جا سوئی۔

حبہ کے لیے وہ وقت بہت کڑا تھا۔ اس کی تدفین بھی محلے داروں نے مل کر کی۔ ایاز اس کی وفات کی خبر سن کر بھی نہ آیا۔ کسی اور رشتے دار سے وہ واقف ہی نہیں تھی۔ اس لمحہ بھی آمنہ ہی اس کے کام آئی۔ وہ اسے اپنے گھر لے گئی۔ اس کا شوہر بیرونِ ملک ملازم تھا اور وہ دو بچوں اور ساس کے ساتھ اکیلی رہتی تھی۔ آمنہ نے اس کے خوف اور واہمے دور کرنے کی بہت کوششیں کی۔ وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب بھی ہو جاتی لیکن ساس کے انتقال کے بعد شوہر نے اسے اور بچوں کو باہر بلوا لیا اور حبہ ایک بار پھر لاوارث بن گئی۔ آمنہ نے روانگی سے قبل اپنی ایک دیرینہ دوست کی مدد سے اسے نجی ہاسٹل میں داخل کروا دیا۔ وہ اس کے لیے حتی الامکان آسانیاں پیدا کرتی رہی لیکن اسے اچھی قسمت نہ دے سکی۔ ہاسٹل کے سبھی واجبات اسی نے ادا کیے مگر یہ سہولت بھی کب تک کام آتی؟ اسے اپنی بقا کی جنگ خود ہی لڑنی تھی اور پہلے ہی مرحلے میں وہ بری طرح ناکام ہو گئی۔

اس ناکامی کا ماتم کرتی وہ بستر پر بے حس و حرکت لیٹی تھی۔ اس کی سماعت میں بھنبھناہٹ گونج رہی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ کمرے میں بہت سی شہد کی مکھیاں گھس آئی ہیں اور اب ان کے پروں کی بھنبھناہٹ اس کے دماغ میں ہتھوڑوں کی طرح ضرب لگا رہی ہے۔ وہ اپنا سر دائیں بائیں جھٹکنے لگی۔ آواز مزید تیز ہو گئی اور اسی کشمکش میں اس کا ذہن ایک حتمی فیصلے پر پہنچ گیا۔ وہ پُرسکون ہو گئی اور بستر سے اٹھ بیٹھی۔

''کسی فیصلے پر پہنچی ہو یا نہیں؟'' اسی پل ربیعہ کمرے میں داخل ہوئی۔

''ہاں! مشکل سے ہی سہی لیکن میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔''

''گڈ! پریشان مت ہونا اب۔''

''پریشان کیوں ہونا ہے؟ اب تو تمام مسائل حل ہونے کا وقت آیا ہے۔'' اس کا لہجہ سپاٹ اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

☆☆☆

انعم چوہدری کا کروفر اور غرور اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا۔

اس قیدِ تنہائی نے اس کے سارے کس بل نکال دیے۔ صیاد نے اس کے لیے کوئی بھی راہِ فرار نہیں چھوڑا تھا۔ اسے یقین ہونے لگا کہ وہ بابر چوہدری کی کسی کاروباری دشمنی کا نشانہ بنی ہے۔ اگلی بار جب اجنبی سیاہ پوش کے

ہاتھوں کھانا آیا تو وہ اپنے وجود کی پوری قوت سے چلّا اٹھی۔
''تمہیں کیا چاہیے آخر؟ اگر تاوان چاہیے تو میرے پاپا سے بات کرلو وہ کبھی بھی انکار نہیں کریں گے۔''
''مجھے جو چیز درکار ہے وہ تمہارا باپ کبھی نہیں دے سکتا۔'' مقابل نے کہا۔ انعم فوری طور پر آواز کے آہنگ پر غور کرنے لگی۔ وہ مقابل کی بابت کوئی بھی اندازہ لگانے میں ناکام تھی۔
''مجھے کسی اور جگہ منتقل کردو۔ کم از کم واش روم کی سہولت ہی دے دو۔'' اس نے التجا کی۔
''اتنی جلدی اکڑ ختم ہوگئی۔'' اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔
''پلیز!'' انعم کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔
سوچتے ہیں کچھ!'' اس نے پُرخیال انداز میں ٹہلنا شروع کردیا۔ وہ اس کی ہر ایک جنبش کو بغور دیکھ رہی تھی۔
''اگر میں تمہیں کہیں اور منتقل کردوں تو کیا گارنٹی ہے کہ وہاں چیخ پکار نہیں کروگی؟'' اس کے انداز سے واضح محسوس ہوتا تھا کہ اس کا مقصد محض انعم کی بے بسی سے لطف اندوز ہونا ہے۔
''پلیز! میری بات کا یقین کرلو..... تمہیں تاوان بھی مل جائے گا اور باقی مطالبات بھی پورے ہوجائیں گے۔''
سیاہ پوش نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور عقبی سمت سے آکر اس کے بال آزاد کردیے۔ وہ اس موقع پر حرکت میں آنا چاہتی تھی لیکن مقابل کی پھرتی اور ہوشیاری اس سے کئی گنا زیادہ تھی۔ اس نے نہ جانے کس وقت اپنے لباس سے ایک چھوٹا سا ریوالور برآمد کر کے انعم کی گدی پر رکھ دیا۔
''زیادہ فلمی ہیروئن بننے کی کوشش کی تو اگلا سانس بھی نہیں لے سکوگی۔'' اسلحہ کا لمس محسوس کر کے وہ منجمد ہوگئی۔
سیاہ پوش نے بڑی مہارت اور چابک دستی سے اس کے ہاتھ کھولے اور دائیں جانب بڑھنے کا اشارہ کیا۔ وہ ہنوز ریوالور کے نشانے پر تھی۔ دائیں سمت میں چند قدم کے فاصلے پر ایک اور دروازہ تھا۔ اس نے دیوار پر موجود پینل کو مخصوص انداز میں حرکت دی اور انعم کو اندر دھکیل کر دروازہ مقفل کردیا۔
اس کمرے کا ماحول نسبتاً بہتر تھا۔ مسلسل اندھیرے میں رہنے کے باعث اب روشنی اس کی آنکھوں اور اعصاب کو سکون دے رہی تھی۔ ان سہولتوں کی وجہ یقینی طور پر بابر چوہدری سے تاوان مانگنے کا چارا تھا۔ وہ قدرے مطمئن ہو گئی لیکن اگلے ہی لمحے کسی نامانوس احساس نے اسے چونکا دیا۔ اس کے حواس ایک عجیب بدبو محسوس کر رہے تھے۔ اس نے بے تابی سے نظریں گھما کر دائیں بائیں دیکھا۔ ایک کونے میں موجود ذیلی کمرے میں کموڈ کی جھلک دیکھتے ہی وہ بہت خوشی محسوس کرتی لیکن اس جھلک کے ساتھ ہی جو نظارہ اس نے دیکھا، وہ اس قدر بھیانک تھا کہ انعم اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکی اور زمین بوس ہوتے ہی دہشت سے سر اپنے گھٹنوں میں دے لیا۔
اس واش روم کی دیوار کے ساتھ چند چوبی خانے بنے تھے جس میں انسانی وجود نظر آرہے تھے۔ وہ بات الگ تھی کہ وہ بھی زندگی کی قید سے مکمل آزاد تھے اور کسی نہ کسی حد تک ادھورے بھی۔ ان کے ہاتھ، پاؤں یا انگلیاں غائب تھیں۔ تین لاشیں قدرے پرانی تھیں کیونکہ ان کے ڈی کمپوزیشن کا مرحلہ شروع ہوچکا تھا۔ دو لاشیں زیادہ پرانی نہیں تھیں۔ ان کے لباس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ایک لڑکا اور دوسری لڑکی ہے۔ لڑکے کے جسم پر تشدد کے اثرات نمایاں تھے۔ چہرہ جگہ جگہ سے کٹا پھٹا تھا۔ لڑکی کے چہرے پر البتہ وحشت منجمد تھی۔ اس کا دایاں کان غائب تھا۔ ان خوفناک نظاروں نے اسے فی الفور دو سوالوں کے جواب ازخود فراہم کیے۔
بغلی کمرے میں قید کے دوران اسے اپنے آس پاس جس نادیدہ موجودگی کا احساس ہوتا تھا اس کا مجسم جواب اس کے سامنے موجود تھا اور یہاں آمد کے ساتھ ہی اس کے حواس کو جس بے چینی نے ڈھانپا تھا، وہ ان مردہ اجسام سے اٹھنے والی بدبو تھی۔
یہ لڑکی کون تھی اب اس کے ساتھ کیا ہونا تھا؟
یہ سوچ اور تصور اس قدر وحشت ناک تھا کہ اس کے پیٹ میں یکدم بگولے اُٹھنے لگے۔ وہ دہری ہوکر قے کرتی چلی گئی۔ چند ہی لمحوں میں وہ بے ہوش ہوچکی تھی۔ اسے علم ہی نہ ہوسکا کہ بغلی دروازے سے ہاتھ میں سرنج اور فرسٹ ایڈ بکس تھامے کسی کی آمد ہوئی ہے۔
انعم کے لیے کسی جسمانی عضو سے محروم ہونے کا وقت آگیا تھا۔

☆☆☆

مائرہ اپنے اس نئے معاہدے سے بہت خوش تھی۔
ماجد کے ساتھ رہائش اور اس کے ساتھ نے اس کی بے رنگ اور اداس زندگی کو یکایک ہی بلیک اینڈ وائٹ سے رنگین کردیا۔ اس کی مسلسل توجہ اور بہترین ڈاکٹر سے علاج

نے مائرہ کی صحت بالکل بھلی چنگی کر دی۔ وہ اسے لے کر مختلف تفریحی مقامات پر جایا کرتا لیکن اس دوران وہ بے تکلف ہونے یا تنہائی میں اس کا فائدہ اٹھانے کی کبھی کوشش نہ کرتا۔ بے ضرر سی گفتگو اور موقع کی مناسبت سے کسی چھوٹی موٹی بحث کرتے ان کا وقت پَر لگائے بیت جاتا۔ آغاز میں مائرہ کو اس کے ساتھ باہر جانے میں تھوڑا تذبذب ہوا تھا اور ماجد نے یہ بات فوری طور پر محسوس بھی کر لی۔

''یہ گریز کیوں؟ کیا تم میرے ساتھ خوش نہیں ہو؟''

''نہیں! ایسی کوئی بات نہیں۔'' اس نے فوری تردید کی مبادا وہ بُرا ہی نہ مان جائے۔

''تو پھر میں جاننا چاہوں گا کہ کیا وجہ ہے اس تذبذب کی؟'' وہ مُصر ہوا۔

''میں کہیں بھی اپنی شناخت ظاہر نہیں کرنا چاہتی۔ عوامی مقامات پر میرے پہچان لیے جانے کے کافی امکانات ہیں۔''

''ہم...... بات تو ٹھیک ہے۔ ویسے اگر تم حجاب لے کر چلنا چاہو تو مجھے خوشی ہوگی۔''

''ٹھیک ہے۔ پھر مجھے بھی کوئی اعتراض نہ ہوگا۔'' مائرہ نے سکون کا سانس لیا۔ وہ اپنی اس تبدیلی پر خود بھی حیران تھی۔

وہ اپنی حقیقت بھول کر اس کی محبت میں جھولنے لگی تھی۔ محبت کی یہ بارش اس کے لیے نئی تو نہیں تھی لیکن ایسی شدت بہر حال نئی تھی اور پریشان کن بھی۔ کچی عمر کی محبت اگر تند و تیز ریلے کی طرح بہاتی ہے تو پختہ عمر میں یہ جذبات سیلابی باڑ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اسے یہ بھی علم تھا کہ ماجد ایک نہایت گہرا اور کم گو انسان ہے۔ اس کے مزاج میں کہیں نہ کہیں سفاکی اور بے رحمی بھی موجود تھی لیکن پھر بھی وہ اس کے لیے اپنے جذبات مچلنے سے روک نہیں پا رہی تھی۔

یہ کسی نئے آغاز کا شگن تھا یا پرانی زندگی کے اختتام کا بگل؟ وہ کوئی بھی نتیجہ اخذ کرنے میں ناکام تھی۔

☆☆☆

بابر چوہدری ہسٹریائی کیفیت میں مبتلا تھا۔

دو گھنٹے قبل اسے ایک پارسل موصول ہوا تھا جسے بہت سے تحفظات ہونے کے باوجود اس نے کھول لیا۔ ایک تکونی انداز کے خوب صورت ڈبے میں دو کٹی ہوئی انگلیاں موجود تھیں جنہیں دیکھ کر اسے اپنی بصارت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

انعم کی غیر موجودگی اس نے فی الحال راز ہی رکھی ہوئی تھی۔ وہ وائٹ کالر شخص تھا جس نے سخت محنت کے بعد اپنا کاروبار جمایا تھا۔ ذاتی ایمانداری اور کاروباری دیانت اس کا شیوہ تھیں اس لیے حالات تبدیل ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ انعم اس کی بڑی بیٹی تھی۔ اس سے چھوٹا ایک بیٹا تھا جو کانونٹ میں پڑھتا تھا۔ انعم کی عادات اتنی ہی بگڑی ہوئی تھیں جتنی کسی بھی خوش حال گھرانے کی اکلوتی بیٹی بگڑ سکتی ہے۔ بابر اور اس کی بیوی میں ذہنی ہم آہنگی بہت کم تھی اور یہ تفاوت حالات کے تبدیل ہونے کے بعد زیادہ بڑھ گیا تھا۔ بابر اولاد کو 'اپ ٹو ڈیٹ' دیکھنے کا قائل تھا لیکن بیوی ابھی بھی پرانے خیالات ہی کے تحت پرورش کرنا چاہتی تھی۔ جب والدین میں ذہنی ہم آہنگی صفر ہو تو نتیجہ ہمیشہ اولاد کی شدت پسندی اور بگاڑ کی صورت میں ہی نکلتا ہے اور یہاں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

انعم کی غیر موجودگی کو فی الحال راز میں رکھنے کا مقصد یہی تھا کہ بابر لاکھ روشن خیال سہی لیکن اس کی جڑوں میں اب بھی وہی خیالات پیوست تھے جن کی رُو سے شریف گھرانے کی بیٹی کا گھر سے غائب ہونا موت سے بھی بدتر سزا ہوتی ہے۔ اس کی یہ ساری احتیاط پارسل ملتے ہی ہوا ہو گئی۔ بیوی نے چیخ و پکار سے پورا گھر سر پر اٹھا لیا۔

''اسی دن کے خوف سے میں تمہیں منع کرتی تھی کہ اولاد کو اتنی آزادی نہ دو۔ اب بدنامی تو رہی ایک طرف، اس کی خیریت بھی خطرے میں ہی نظر آ رہی ہے۔''

''خود کو سنبھالو پلیز! اپنا اور میرا تماشا نہ بنواؤ۔''

''میرے کلیجے میں آگ لگی ہے اور تم کہتے ہو خود کو سنبھالوں۔'' وہ ایک بار پھر چلّائی۔

''میں بھی کم پریشان نہیں ہوں۔ باپ ہوں میں اُس کا۔ مجھے بھی اس کی سلامتی کی فکر ہے۔'' بابر نے نوکروں کی موجودگی کے خیال سے آواز دبا کر کہا لیکن اسے علم تھا کہ یہ کوشش اب بے سود ہے۔

''خدا کا واسطہ ہے مجھے میری بیٹی سے ملوا دو۔ میرا دل پھٹ جائے گا۔''

''میرا بس چلے تو میں اپنی ساری دولت دے کر اسے واپس لے آؤں...... لیکن کچھ علم بھی تو ہو کہ وہ کہاں ہے؟ کن لوگوں کے پاس ہے؟'' وہ اپنا سر تھام کر بیٹھ گیا۔

دولت، تعلقات، اثر و رسوخ اور طاقت آج بُری طرح ناکام ہو گئے تھے۔ اس نے پولیس پر ہی انحصار نہیں کیا تھا بلکہ ایک نجی سراغ رساں کی خدمات بھی حاصل کی تھیں لیکن نتیجہ ڈھاک کے تین پات تھا۔

''خدایا! میری بچی کو اپنی حفاظت میں رکھنا۔ میرا

بھرم قائم رکھنا۔'' گڑگڑا کر یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے بھی اسے علم تھا کہ بھرم، وقار اور عزت کے پردے چاک ہونے کا آغاز ہو چکا ہے۔ یہ بات اب نوکر چاکروں تک پہنچ چکی تھی اور کسی بھی گھر یا ادارے میں نچلے درجے کے اسٹاف کا جاسوسی نیٹ ورک انتہائی مضبوط ہوتا ہے۔ شام ہونے تک یہ خبر یقینی طور پر اس ہاؤسنگ سوسائٹی کے دیگر گھروں کے 'لوئر اسٹاف' میں 'گوسپ' کی طرح گردش کرنی تھی لیکن اس شام جو کچھ ہوا، وہ اس کی سوچ اور تصور سے بھی بالاتر تھا۔

☆☆☆

سفیان ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ اور ناک قدرے سرخ ہو رہے تھے۔

''کیا بات ہے سونی؟ طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟'' اس کے والد نے پوچھا۔

''جی بس موسمی اثرات ہیں۔ فلو اور گلے میں خراش ہے۔'' اس کی آواز بھی قدرے بھاری ہو رہی تھی۔

''اپنا خیال رکھو میرے بچے! اپنے لیے نہ سہی...... میرے لیے سہی۔'' اس نے افسردگی سے کہا۔ وہ ڈھلتی عمر کا ایک بوڑھا آدمی تھا۔ اس کا سر نیم شفاف تھا۔ صرف دونوں اطراف میں بالوں کی ایک جھالر موجود تھی۔ سامنے کی سمت میں بال نہ ہونے کے باعث پیشانی مزید کشادہ لگتی۔

''آپ ہی کے لیے رکھتا ہوں پاپا! فکر کیوں کرتے ہیں؟''

''فکر تو رہتی ہے میرے بیٹے! فکر تو رہتی ہے۔'' اس نے ہاتھ مسلے۔

''پاپا پلیز! میں جانتا ہوں آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔''

''تو کیا غلط کہتا ہوں میں؟''

''ایسا میں نے کب کہا؟''

''دیکھو سونی! تم نے اپنی مرضی سے یہ نوکری کی۔ میں نے کرنے دی۔ اب تمہیں بھی میری بات مان لینے میں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔'' وہ خفا ہوا۔

''ٹھیک ہے۔ چند کیسز پر کام مکمل ہو جائے تو یہ معاملہ بھی نمٹا لیں گے۔'' اس نے تسلی دی۔ وہ مطمئن ہو گیا۔

سفیان نے موقع غنیمت سمجھا اور آرام کرنے کا کہہ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ زکام اور بخار کے باعث اس کا سر شدید بھاری تھا۔ آج پولیس اسٹیشن میں بھی خاصی مغزماری کرنی پڑی تھی۔ انعم چوہدری کی گمشدگی ایک وبالِ جان بن چکی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنی مرضی ہی سے کہیں غائب ہوئی ہے۔ اس کا ارتکاز اس کیس کے حوالے سے کم ہونے لگا تھا لیکن دوپہر کو بابر چوہدری کی جانب سے نئی اطلاع نے اس کی پریشانی میں مزید اضافہ کر دیا۔ پارسل کے بارے میں اچھی طرح تحقیق کروانے کے بعد کوئی سراغ ملا نہ ہی فنگر پرنٹس۔ اس نے بابر کو خاموش رہنے کی تاکید کی تھی۔

اسے نیند کی شدید طلب ہو رہی تھی لیکن عادتاً وہ کچھ دیر ٹی وی دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کی ترجیح اسپورٹس اور نیوز چینل ہی ہوتے تھے۔ چینل سرچنگ کے دوران وہ ایک نیوز چینل پر تھوڑی دیر کے لیے رکا۔ اس کی پیشانی پر شکنوں کا جال نمودار ہو گیا۔

اس کے سبھی خدشات بدترین روپ اختیار کر چکے تھے۔ انعم کی کٹی ہوئی انگلیوں کے ملنے کی خبر نیوز چینلز والوں کو مل چکی تھی اور اب میک اپ سے لتھڑے چہروں والی اینکرز ریاستی بدامنی پر ماتم کناں تھیں۔ اس حادثے کا تعلق بھی پچھلے کچھ عرصہ میں انسانی اعضا کے اسی طرح پارسل کیے جانے اور چند افراد کی تاحال گمشدگی سے جوڑا جا رہا تھا۔ سفیان کے لیے یہ صورتِ حال بہت گمبھیر تھی۔ اس نے فوری طور پر بابر کا نمبر ملایا۔ وہ اس کی غیرذمے دارانہ روش پر اسے لتاڑنا چاہتا تھا لیکن دوسری جانب سے ملنے والی خبر اس سے بھی زیادہ سنگین تھی۔

وہ ہارٹ اٹیک کے نتیجے میں اسپتال پہنچ چکا تھا۔

سفیان ایک لمحہ کے لیے سر تھام کر رہ گیا۔ اس کی طبیعت بگڑتی ہی جا رہی تھی۔ وہ ایل ای ڈی آف کر کے اب سونا چاہتا تھا لیکن ٹیکرز میں چلنے والی ایک اور خبر نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی۔

''فارم ہاؤس میں لرزہ خیز قتل...... سیکریٹری نے چھریوں کے وار سے اپنے باس کو ہلاک کر دیا۔''

سفیان کا ماتھا ٹھنک گیا۔ یہ فارم ہاؤس بھی اسی کے پولیس اسٹیشن کی حدود میں آتا تھا۔ اس نے اپنے بوجھل سر کو مسلتے ہوئے والیم تھوڑا اور بڑھا دیا۔ ایک نمائندہ اب اس قتل کی خبر کے متعلق بریفنگ دے رہا تھا۔

''یہ حادثہ کچھ دیر پہلے ایک فارم ہاؤس میں ہوا ہے جہاں کرسمس کے سلسلے میں پارٹی ہو رہی تھی۔ اس پارٹی میں کچھ غیر ملکی افراد بھی موجود تھے۔ بتایا جا رہا ہے کہ جے اینڈ کے کمپنیز کے ایم ڈی محمود بھی اپنی سیکریٹری کے ساتھ یہاں موجود تھے جس نے موقع پاتے ہی انہیں ہلاک کر دیا۔ اس کے بعد کچھ دیگر مہمان بھی ان حملوں کی زد میں آئے

ہیں......جی!‘‘

’’کیا آپ اس خاتون کے متعلق کچھ بتائیں گے ہمیں؟‘‘ اینکر نے پوچھا۔

’’وہ ایک کم عمر لڑکی ہے جس نے کچھ عرصہ پہلے ہی فرم جوائن کی تھی۔ بظاہر یہی لگتا ہے کہ وہ کسی نفسیاتی عدم توازن کا شکار ہے۔ پولیس نے اسے گرفتار کرلیا ہے اور اب اسے حوالات میں منتقل کردیا جائے گا......جی!‘‘

’’کیا آپ ہمارے ناظرین کو اس کی کوئی تصویر یا جھلک دکھا سکتے ہیں؟‘‘

’’وہ اس وقت زیرِحراست ہے اور یہاں سے لے جائی جا چکی ہے۔ ابتدائی تفتیش سے صرف یہی معلوم ہوسکا ہے کہ اس کا نام حبہ ہے اور وہ......‘‘ سفیان نے اتنا سن کر بڑبڑاتے ہوئے ایل ای ڈی آف کردی۔ اس کی گردن اور کندھوں میں شدید کھنچاؤ تھا۔ بخار غالباً زیادہ ہوگیا تھا۔ اسی وقت اس کے موبائل پر طیب کی کال آنے لگی۔

’’ہاں بولو طیب!؟‘‘

’’آپ کی طبیعت کیا اب بھی ناساز ہے؟‘‘ وہ محتاط ہوا۔

’’ہاں یار! ناقابلِ برداشت ہے اب تو۔‘‘

’’میں آپ کو فارم ہاؤس کیس کے بارے میں بتانا چاہتا تھا۔‘‘

’’میں نے میڈیا پر دیکھ لی ہے خبر۔ تم ایف آئی آر کاٹو اور صبح پہلی فرصت میں اس کا ریمانڈ لے لینا۔‘‘

’’ٹھیک ہے! میں یہاں سب معاملات سنبھال لوں گا۔ آپ آرام کریں۔‘‘ اس نے الوداعی کلمات کے بعد فون بند کردیا۔

دوا لینے کے بعد اسے نیند اور طویل آرام کی سخت ضرورت تھی۔

☆☆☆

حبہ حوالات کے ٹھنڈے سنگی فرش پر بیٹھی تھی۔

پولیس اہلکاروں کی کھینچا تانی اور دھکم پیل میں اس کے بال اُلجھ کر گھونسلے کی شکل اختیار کر گئے تھے۔ چہرے پر بلش آن کی سرخی کے علاوہ انگلیوں کے نشان بھی تھے اور وہ دیکھے بنا بھی بتا سکتی تھی کہ دونوں اطراف میں سرخی اور سوجن ایک ہی تناسب میں ہوگی۔ اس بھاگ دوڑ میں اس کا دوپٹا بھی جانے کہاں گر گیا تھا؟ اس نے ایک نظر اپنے لباس پر ڈالی اور غصے سے بڑبڑائی۔

’’جنگلی! وحشی! بے غیرت کہیں کے! میں کون سا کہیں بھاگی جارہی تھی۔ گرفتاری بھی تو خود ہی دی تھی مگر انہوں نے تو میڈیا کے سامنے اپنے نمبر بنانے تھے۔‘‘

اس کے بالوں کی جڑیں دُکھ رہی تھیں۔ وہ اپنا سر سہلاتی دونوں بازوؤں کو باری باری دبانے لگی۔ اس کے منہ سے بے اختیار ایک کراہ برآمد ہوئی۔ وہ ٹانگیں پسار کر دیوار سے پشت ٹکا کر بیٹھ گئی۔ اپنے اس عمل پر وہ بے حد مطمئن اور سرشار تھی۔ اس نے وہی کیا تھا جو بہترین تھا اور جس بابت اُس رات آخری فیصلہ کیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک آسودہ مسکراہٹ تھی اور ذہن میں وہ قیامت خیز رات تھی جب اس نے اپنی تمام تر بزدلی اور کمزوری آنسوؤں میں بہا کر ربیعہ کی باتوں پر سنجیدگی سے غوروخوض کیا تھا۔

اس کی نظروں کے سامنے اپنے بچپن سے لے کر اس وقت تک کے تمام مناظر گردش کرتے رہے تھے۔ وہ ایک کچلی، سہمی اور دبی ہوئی شخصیت کی مالک تھی جو پتنگ پا تنگ بن کر معاشرے کے بااثر اور گدھ نما افراد کے درمیان لڑھک رہی تھی۔ اس کی زندگی ناانصافی کا شکار تھی اور ناانصافی کی کوکھ سے ہمیشہ جرم ہی جنم لیتا ہے۔

حبہ کی زندگی کو موجودہ نہج تک پہنچانے میں بھی چند ’مجرموں‘ کا ہاتھ تھا اور بے بسی تو یہ تھی کہ وہ ان مجرموں کا سراغ بھی کھو چکی تھی۔ وہ ان کے وجود کے پرخچے اُڑا کر اپنے انتقام کی تسکین کرنا چاہتی تھی لیکن بے سود! وہ صرف انہیں کوسنے اور بددعائیں ہی دے سکتی تھی اور یہ کام کسی فرض کی طرح صبح شام کیا کرتی۔ ربیعہ کی باتوں پر عمل کا فیصلہ اس نے بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ اس رات وہ اس قدر روئی تھی کہ لگتا تھا سارا وجود ہی پانی بن کر بہہ جائے گا لیکن صبح ہوتے ہی ایک سپاٹ اور بے حس کیفیت طاری ہوگئی۔ اس کے اندر ایک موت واقع ہوگئی تھی لیکن یہ میّت کسی کو نظر نہیں آرہی تھی۔ اردگرد لوگوں کو صرف ایک تبدیلی محسوس ہو رہی تھی جسے وہ خوشگوار تبدیلی قرار دے رہے تھے۔ اس بات کا اعلان سب سے پہلے ربیعہ ہی نے کیا۔

اس صبح حبہ نہایت لگن سے اپنے بال سلجھا رہی تھی۔ ربیعہ پر نظر پڑتے ہی اس نے بڑے مصروف انداز میں کہا۔

’’میرا میک اَپ تو کردینا ذرا!‘‘

’’ارے! کہیں میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہی؟‘‘ وہ حیران ہوئی۔

’’نہیں! خواب تو میں دیکھ رہی تھی کہ اپنی کم علمی کے باوجود اس معاشرے میں باعزت مقام حاصل کرلوں گی۔‘‘

''اب یہ خواب ٹوٹ گیا ہے یا اب بھی کوئی باقیات سلامت ہیں؟''

''چکنا چور ہو گیا ہے...... اور حقیقت کی دنیا میں آنکھ کھل گئی ہے کہ اگر مجھے کامیاب ہونا ہے تو اپنے پاس موجود سکے کیش کروانے پڑیں گے اور میرے پاس خوب صورتی اور جوانی کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔'' اس کے سپاٹ لہجے پر ربیعہ خاموش ہو گئی اور بڑے ماہرانہ انداز میں اس کا میک اَپ کرنے لگی۔

''اگر مناسب سمجھو تو مجھے بھی سکھا دینا۔ اپنی جنگ کے ہتھیار میں خود ہی چمکاؤں تو بہتر ہے۔''

''سکھا دوں گی۔'' ربیعہ کو کچھ انہونی کا احساس ہونے لگا لیکن اس کے ذہن میں چلنے والی کشمکش وہ کبھی بھی نہیں بھانپ سکتی تھی۔

اس روز وہ سر ڈھانپے بنا نہایت اعتماد سے دفتر گئی۔ اس کا لباس، ناز و انداز ایک ڈھکی چھپی بے حجابی ظاہر کر رہے تھے۔ دفتر میں کام کرنے والے ہر مرد کی نظر میں اس کے لیے ستائش اور تبدیلی پر کہیں نہ کہیں تمسخر تھا تو خواتین کی نظروں میں عدم تحفظ کا احساس تھا۔ حبہ کو کسی کی پروا تھی نہ فکر۔ وہ اپنے معمول کے کام میں مگن رہی۔ آج انٹر کام کی گھنٹی صور اسرافیل محسوس ہو رہی تھی اور نہ ہی بلاوے کا کوئی خوف۔ لنچ کے اوقات میں اس کی طلبی ہو گئی۔ باس کی تیوریاں کچھ چڑھی ہوئی تھیں۔ اس کی ڈانٹ ڈپٹ پر حبہ نے نادم ہونے کی بھرپور اداکاری کی اور اپنی خرابیٔ طبیعت کا عذر دے دیا۔

''تمہیں خود انفارم کرنا چاہیے تھا ہمیں!''

''میں ضرور کرتی سر! لیکن میرا فون دغا دے گیا۔'' وہ افسردہ ہوئی۔ ''آئی ایم رئیلی سوری۔'' اس کی معصومیت پر محمود ریشہ خطمی ہونے لگا۔

''میں نے کچھ دن پہلے ایک آفر کی تھی تمہیں۔ مجھے تو خدشہ تھا کہ کہیں اس وجہ سے نوکری ہی نہ چھوڑ دو تم۔''

''مجھے آپ کی آفر منظور ہے سر!'' وہ مسکرائی۔

''گڈ! گڈ! یہ ہوئی نہ بات۔'' اس کی باچھیں کھلیں۔

''آپ جب چاہیں، جیسے چاہیں ایگری منٹ بنوالیں۔ میں تو آج اور ابھی سے آپ کے ڈسپوزل پر ہوں۔''

اگلے دو روز میں معاہدے کی جزئیات طے کر لی گئیں۔ محمود نے حبہ کو ایک نوٹوں کی گڈی بطور ایڈوانس تھما دی اور ذومعنی انداز میں بولا۔

''کرسمس کی پارٹی پر تم میری پارٹنر ہو گی۔ اگر اس ٹرائل میں کامیاب ہو گئیں تو میں تمہارے لیے ایک فلیٹ بھی بک کروا دوں گا۔ ابھی اس رقم سے بہترین لباس وغیرہ کا انتظام کرو۔''

''شیور سر! آپ مجھے اس ٹرائل میں کامیاب پائیں گے۔'' حبہ نے بھرپور مسکراہٹ دی۔

پارٹی سے قبل اس نے ایک بیوٹیشن سے تیار ہونے کا فیصلہ کیا اور اس سے بھی پہلے ایک اور ضروری کام نمٹانا تھا۔ اس قیامت خیز رات میں کیے جانے والے فیصلے پر عمل کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ اسے ہتھیاروں کی کوئی پہچان تھی اور نہ ہی خریداری کا علم۔ کچھ دیر سوچ و بچار کے بعد اس کے ذہن میں ایک خیال برق کی طرح کوندا۔ بچپن کے اچھے دنوں میں اس نے اپنے گھر میں قربانی ہوتے دیکھی تھی جس کے بعد قصاب ایک 'ٹوکے' سے گوشت کے ٹکڑے کر دیتا تھا۔ حبہ کے بدن میں سنسنی پھیل گئی اور اس نے اپنے لیے وہی ہتھیار خریدنے کا ارادہ کر لیا۔

مارکیٹ میں کچھ وقت گزارنے کے بعد اسے اپنی مطلوبہ شے مناسب اور بہترین سائز میں مل گئی۔ وہ اسے بہ آسانی اپنے بڑے سے ہینڈ بیگ میں چھپا سکتی تھی اور اس نے یہی کیا۔

پارٹی کا ماحول اس کی توقع سے زیادہ رنگین اور سنگین تھا۔ غیر ملکی افراد سرِ شام ہی جام لنڈھا کر آپے سے باہر ہو رہے تھے۔ محمود نے بھی خوب مے نوشی کی۔ وہاں موجود تمام مرد و زن آدمیت کا چولا اتار کر رقصِ ابلیس میں مگن ہو گئے۔ انہیں اپنے لباس کی فکر تھی نہ دقار کی۔ محمود کے تیور بھی خطرناک نظر آنے لگے۔

''میں ذرا فریش ہو کر آتی ہوں۔'' وہ معذرت کرتی اندرونی جانب بڑھ گئی۔ اسے یقین تھا کہ وہ اس کے پیچھے ہی چلا آئے گا اور ہوا بھی یہی۔

حبہ اپنے بیگ سے ہتھیار نکال چکی تھی۔ اس نے نپے تلے انداز میں محمود کی گردن پر دار کر دیا۔ نتیجہ خاطر خواہ برآمد ہوا۔ اس کی گردن سے لہو کا فوارہ اُچھلا جسے دیکھ کر اس پر مزید دہشت طاری ہو گئی۔ یہ بڑا دہشت ناک منظر تھا۔ محمود کی گردن ایک جانب سے کٹ گئی تھی اور خون بھل بھل بہہ رہا تھا۔ اس نے اگلا وار بھرپور قوت سے کیا۔ محمود کا جسم بے جان ہو کر وہیں ڈھے گیا۔ ماربل کے چکنے فرش پر خون کا تالاب بننے لگا تھا۔ وہ پُراشتیاق نظروں سے یہ منظر دیکھتی رہی۔ اس کی سماعت میں شہد کی مکھیوں کے بھنبھنانے کی آواز

تیز ہونے لگی۔ اسی پل وہاں موجود عشرت کدوں میں ایک کمرے کا دروازہ کھلا اور بدمست جوڑا نشے میں جھومتا باہر نکلا۔ لاش اور خون دیکھ کر ان کے اوسان خطا ہو گئے اور وہ بے اختیار چیخنے لگے۔

حبہ نے نہایت اطمینان سے ویسا ہی وار دوبارہ کر دیا۔ اس بار نشانہ سینہ اور بازو تھے۔ چند ہی لمحوں میں وہاں قیامت برپا ہو چکی تھی۔ اس نے اپنا مقصد پورا کر لیا تھا اور اب اسے گرفتاری کا ڈر تھا نہ ہی سزا کا خوف۔ ہتھیار بدست ہونے کے باعث نشے میں دھت افراد میں سے کوئی بھی اس کے نزدیک آنے کی ہمت نہ کر پایا۔ وہ ان سب کو ہراساں اور چیخ وپکار کرتا چھوڑ کر واپس لان میں آ گئی اور نہایت پُرسکون انداز میں کھانا کھانے لگی۔ آلۂ قتل اب بھی اس کے بائیں ہاتھ میں موجود تھا۔

کھانا ختم ہونے تک فارم ہاؤس کی فضا میں پولیس کے مخصوص سائرن کی آوازیں سن کر اس کے ہونٹوں پر آسودہ مسکراہٹ رینگ گئی۔

☆☆☆

انعم کے دماغ پر دھند طاری تھی۔

اسے اپنا وجود پانی کی لہروں پر ہچکولے لیتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ کچھ دیر اس دھند کے پار جھانکنے کی کوشش کرتی رہی لیکن بدن میں ایک تیز سنسناہٹ اور شدید اذیت کی لہر ہر بار رکاوٹ بن جاتی۔ اس کے حلق میں کانٹے اُگ گئے تھے۔ وہ صحرا کی پیاسی تھی۔ چند لمحوں بعد ہچکولوں کی کیفیت دھیرے دھیرے کم ہونے لگی۔ دھند بھی چھٹنے لگی لیکن چبھن سنسناہٹ اور اذیت پہلے سے شدید ہو رہی تھی۔ اس نے بدقت تمام اپنے دونوں ہاتھ اُٹھا کر سر دبانا چاہا لیکن تکلیف سے جسم کو بے اختیار جھٹکا لگا۔

اس کے دائیں ہاتھ پر سفید پٹی بندھی تھی جو لہو رنگ بھی تھی۔

''یہ کیا ہے؟ یہ کیا ہوا ہے مجھے؟'' وہ ہسٹریائی انداز میں چلائی۔ بائیں ہاتھ سے ٹٹولنے پر اندازہ ہوا کہ وہ انگوٹھے سے محروم ہو چکی ہے اور ایسا یقیناً عالمِ بے ہوشی میں ہوا تھا۔

اس نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی تو کرب کی ایک اور لہر نے چیخنے پر مجبور کر دیا۔ ڈرتے ڈرتے تکلیف کے ماخذ پر نظر دوڑائی تو بائیں پاؤں کا انگوٹھا ایسی ہی بینڈیج میں موجود پا کر اس کے اعصاب بالکل جواب دے گئے۔ وہ ایک بار پھر نیم غشی کی کیفیت میں مبتلا ہونے لگی۔ بند ہوتی

آنکھوں میں آخری منظر ان دو چوبی خانوں کا تھا جو صاف ستھرے اور بالکل تیار حالت میں تھے۔

☆☆☆

مائرہ آئینے کے سامنے اپنی تیاری کو ناقدانہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

آج وہ دل لگا کر تیار ہوئی تھی۔ گہری سیاہ آنکھوں میں کاجل کی سیاہی مزید قیامت ڈھانے لگی۔ وہ گزشتہ روز ماجد کے ساتھ شاپنگ کے لیے گئی تھی اور وہاں اسے مانوس انداز کی بالیاں اور نیکلس نظر آیا تو آنکھوں میں نمی چمکنے لگی۔ ماجد سے اس کی پسندیدگی پوشیدہ نہ رہ سکی۔

''کیا بہت پسند آیا ہے یہ؟''

''بہت...... بہت زیادہ!'' اس کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی۔

''خاصا پرانا اسٹائل ہے اس کا تو!'' ماجد نے منہ بنایا۔

''اسی قدامت نے تو مجھے اسیر کیا ہے۔ کچھ یادیں وابستہ ہیں اِس سے۔''

''آہ...... یادیں...... باتیں...... ماضی...... خواب......'' ماجد کا لہجہ بھی خوابناک ہو گیا۔ ''پیک کر دیجیے اِسے۔'' وہ سیلز مین سے بولا۔

''تھینک یو ڈیئر! تھینک یو ویری مچ!'' وہ جذب سے بولی۔ اس کے انداز کی تبدیلی بہت واضح تھی۔

''تم اپنے اس مزاج سے آزاد ہوتی محسوس ہونے لگی ہو۔'' اب وہ باہر آ گئے تھے اور ایک بوتیک کی جانب گامزن تھے۔

''معلوم نہیں آزاد ہو رہی ہوں یا ایک نئی اُلجھن میں گرفتار ہو رہی ہوں۔''

''اتنی افسردہ کیوں ہو؟''

''موسم کا اثر ہے شاید۔'' مائرہ نے ایک بوجھل سانس خارج کی۔ وہ دونوں بوتیک میں داخل ہو گئے تھے۔

''اس موسم میں تو میری جان ہے۔ اس کی اداس خاموشی، دھند آلود شامیں، طویل سرد راتیں میرے وجود میں اتر کر ایک تحریک بن جاتی ہیں۔''

''تمہیں تو کوئی شاعر یا رائٹر ہونا چاہیے تھا!''

''میں رائٹر ہی ہوں محترمہ!'' اس نے اطمینان سے کہا۔ ''لوگوں میں پوشیدہ اسرار جان کر ان کا کردار اپنی مرضی سے لکھتا ہوں۔'' وہ اطمینان سے بولا۔

مائرہ ٹھٹک کر رک گئی۔ ''کیا مجھ سے بھی اسی لیے ملتے

رہے؟''

''ہاں! تم میں مجھے اپنی پہلی محبت کی جھلک نظر آئی تھی۔ میں بے اختیار تمہاری طرف کھنچتا چلا آیا اور پھر ایک اسرار نے مجھے قید کر لیا۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔

مائرہ خاموش رہی۔

''تمہیں بُرا تو نہیں لگا کہ میں نے پہلے یہ سب نہیں بتایا۔'' وہ محتاط ہوا۔

''نہیں! تمہاری کوئی بھی بات جانے کیوں مجھے بُری نہیں لگتی حالانکہ اس انکشاف پر مجھے کچھ تو محسوس ہونا چاہیے تھا۔'' وہ اُلجھی۔

''اچھا چھوڑو اِن باتوں کو۔ اپنے لیے کوئی لباس پسند کرو جلدی۔''

''میں تمہاری پسند کا لباس پہننا چاہوں گی۔''

''یہ کیا بات ہوئی بھلا؟ تم کو پہننا ہے تو تمہاری پسند کی اولیت ہونی چاہیے نا۔'' وہ حیران سا تھا۔

''میرا دل چاہتا ہے کہ تمہاری ہر بات مانوں اور تمہاری ہی پسند کے سانچے میں ڈھل جاؤں۔'' مائرہ کا انداز کھویا کھویا تھا۔

''بہت عجیب بات ہے ویسے۔'' اس نے بھویں اچکا کر کہا اور ایک لباس پسند کر کے پیکنگ کا آرڈر دے دیا۔

''ویسے یہ شاپنگ کس خوشی میں ہے؟'' مائرہ نے موضوع بدلا۔

''کل میرے لیے ایک بہت خاص دن ہے اور میں اسے یادگار بنانا چاہتا ہوں۔''

''کل...... کل تو چھبیس دسمبر ہے...... کہیں تمہاری سالگرہ تو نہیں۔''

''یہ تو وقت آنے پر علم ہوگا۔''

''پھر تو مجھے بھی تمہارے لیے کوئی تحفہ لینا چاہیے۔'' وہ بچوں کی طرح خوش ہوئی۔

''اس کی کوئی ضرورت نہیں۔'' وہ دوٹوک انداز میں بولا۔ اس کے بعد مائرہ نے بہتیری ضد کی لیکن اس کا انکار اقرار میں نہ بدلا۔

''تم جیسے شخص کی سالگرہ دسمبر میں ہی ہونی چاہیے تھی...... تم بھی سراپا دسمبر ہو...... سرد، ضدی اور دھند میں لپٹے...... کسی کو اپنی ذات میں جھانکنے نہیں دیتے۔'' مائرہ کے روٹھے انداز پر وہ بے ساختہ ہنسا۔ ''تحفہ تو میں تمہیں دے کر رہوں گی۔''

''او کے! کل دیکھیں گے۔'' اس نے گاڑی چلا دی۔ مائرہ کھڑکی سے باہر دیکھتی اپنی سوچوں میں اُلجھی رہی۔

لیکن آج اس آئینے کے سامنے نک سک سے تیار بیٹھی مائرہ کو اپنی تمام اُلجھنوں کا سِرا مل گیا تھا۔ آئینے کے ساتھ ایک ریک میں پڑے پرفیوم کا اسپرے کر کے وہ اٹھنے ہی لگی تھی کہ ایک عکس نے اسے چونکا دیا۔ وہ اس کی ہمزاد تھی جو بہت بے چینی سے اسے کچھ کہنے کے لیے متوجہ کر رہی تھی لیکن مائرہ اس وقت مزید اُلجھنوں اور سوالوں میں نہیں پڑنا چاہتی تھی۔

دروازے پر آہٹ ہوئی اور ماجد کی جھلک نے اسے اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ اس کے چہرے پر دلکش مسکراہٹ تھی۔

یہ نہایت اہم گھڑیاں تھیں۔

☆☆☆

حوالات میں بہت گھٹن اور بُو تھی۔

یہاں آمد کے بعد کچھ گھنٹے تو حبہ کے لیے بہت دشوار تھے لیکن پھر حواس عادی ہو گئے۔ اب وہ پہلے سے زیادہ پُرسکون اور اپنے گرد و پیش سے مزید لاتعلق ہو چکی تھی۔ کبھی اپنے ہاتھوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتی تو کبھی نادیدہ ہیولوں سے باتیں کرتے ہوئے مسکرانے لگتی۔ پھر وہ اپنا لباس احتیاط سے تھام کر اٹھی اور اسے ایک دائرے میں لہراتے ہوئے مترنم آواز میں بہ آواز بلند گنگنانے لگ گئی۔

''جنگل بیلز...... جنگل بیلز...... جنگل آل دا وے......!''

''حبہ! اپنی آواز بند کر لے! میرا سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔'' اس نے اپنی ماں کی نقالی کی۔

''ہر وقت اُچھل کود اور اُلٹے سیدھے گانے گاتی رہتی ہے۔ اللہ جانے اس نے کیا چاند چڑھانے ہیں اب؟'' اس بار نقالی میں آواز مختلف اور لہجہ مختلف تھا۔

''میری تو زندگی ایک عذاب بن کر رہ گئی ہے۔ ہر کوئی ایک ہی سوال کرتا ہے۔ لوگ اس حادثے کو بھولنے کے لیے تیار ہی نہیں...... میں اب یہاں نہیں رہنا چاہتا...... تم لوگ اپنا کوئی بندوبست کر لو۔'' ایک مردانہ آواز حوالات میں گونجی۔

''کیا ضرورت تھی یہ غیر مذہب کے گانے، گانے کی تجھے؟ میرا جینا حرام کر دیا ہے۔ موت بھی نہیں آتی مجھے!'' کنول کی آواز ابھری۔

''سوری ماما! اسکول میں فنکشن تھا اس لیے پریکٹس کر رہی تھی۔'' آوازیں اور صوتی آہنگ ہر فقرے کے ساتھ بدل رہا تھا۔ پھر ایک زوردار تھپڑ کے بعد کرخت آواز گونجی۔
''کسی فنکشن میں نہیں جائے گی تُو...... میں تیری جان نکال دوں گی۔''
وہ خود کو طمانچے مارتی ایک ہی فقرہ دہرا رہی تھی۔
''سوری ماما! سوری ماما!''
حوالات کے باہر اہلکار اس کی جانب پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں اور جب ان کی نظروں، تبصروں سے بے نیاز لباس وائرے میں گھماتی ایک بار پھر گنگنا رہی تھی۔
''جنگل بیلز...... جنگل بیلز...... جنگل آل دا وے......''

☆☆☆

''ارے یہ کیا؟ خالی ہاتھ کیوں چلے آئے؟ کیک کہاں ہے بھئی؟'' مائرہ نے ماجد کو خالی ہاتھ دیکھ کر کہا۔
''کیک کاٹ کر تو سبھی سیلی بریٹ کرتے ہیں۔ میں ان تکلفات میں نہیں پڑتا۔''
''عجیب منطق ہے تمہاری! کل مجھے اتنی شاپنگ کروائی اور اب کہہ رہے ہو کہ سیلی بریٹ نہیں کرتا۔''
''میں اپنی فطرت سے مجبور ہوں اور ایسا ہی ہوں اُلجھا سا...... بکھرا سا......''
''اور بہت الگ سا......'' مائرہ نے برجستہ کہا۔
''الگ تو کوئی بھی نہیں ہوتا۔ سب کا خمیر ایک سا ہوتا ہے۔'' ماجد نے جیب سے سگریٹ کیس اور لائٹر نکالا۔
''سگریٹ پیتے ہو تم؟'' وہ حیران ہوئی۔
''اس میں اتنی حیرانی کی کیا بات ہے؟'' اس نے گہرا کش لیا۔
''یہ اچھی عادت نہیں ہے...... چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟''
''کم آن! بیویوں کی طرح کیوں ری ایکٹ کر رہی ہو؟'' وہ جھلّایا۔ مائرہ کے چہرے پر زردی کھنڈ آئی۔
''میں اپنی اوقات اچھی طرح جانتی ہوں ماجد! اس طرح جتانے کی کیا ضرورت ہے؟''
''سوری! میرا مقصد تمہیں ہرٹ کرنا نہیں تھا۔'' وہ دھیرے سے بولا۔
''اِٹس او کے۔ چھوڑو اِس بات کو۔''
''اویس تمہارا شوہر ہے کیا؟'' اس نے غیر متوقع سوال کیا۔
''نہیں...... شوہر کا ایک دوست ہے۔''
''شوہر کہاں ہے تمہارا؟''
''وہ اس دنیا میں نہیں رہا۔'' مائرہ مضطرب ہوئی۔
''اوہ! کیسے؟'' اسے تاسف ہوا۔
''روڈ ایکسیڈنٹ۔''
''شوہر سے تعلقات کیسے تھے تمہارے؟''
''بہت اچھے...... بہت مثالی اور بہت یادگار۔'' اس نے جذب کے عالم میں کہا۔
''واؤ...... لگتا ہے اب بھی بہت محبت کرتی ہو اُس سے۔ وفات کب ہوئی تھی اس کی؟''
''شادی کے پانچویں سال۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو چمکے۔ ''وہ میری پہلی محبت بھی اور پہلی کچی عمر کی محبت کے نقوش کتنے طاقتور ہوتے ہیں، یہ تم بھی جانتے ہو گے۔''
''ہاں! جانتا ہوں۔ یہ ایسی محبت ہوتی ہے جو انسان کو ہر رشتے کی تمیز بھلا دیتی ہے۔ یہ طاقتور نشہ کسی پرانی شراب سے بھی زیادہ نشیلا ہوتا ہے۔''
''ٹھیک کہہ رہے ہو...... انسان سب کچھ بھول جاتا ہے...... سب کچھ۔'' وہ اپنے حواس میں نہیں تھی۔
ماجد اس سے مزید سوال پوچھنا چاہتا تھا لیکن موبائل کی گھنٹی بجنے سے اس کا ارادہ بدل گیا۔ اس نے اسکرین پر نظر دوڑائی اور عجلت میں کھڑا ہو گیا۔
''ایکسکیوزمی مائرہ! ضروری فون کال ہے...... میں ابھی آیا۔'' وہ کمرے سے باہر نکل گیا لیکن مائرہ نے اس کی بات پر غور ہی نہ کیا۔ اس کا ذہن مکمل طور پر ایک آسیب میں جکڑا ہوا تھا۔ پہلی محبت کا آسیب......
اس کے پردۂ تصور پر عثمان کی شبیہ لہرا رہی تھی۔ ان کی محبت مثالی اور دھواں دھار تھی جو شادی کے بعد بھی پوری آب و تاب سے برقرار رہی۔ مائرہ اس کے ساتھ بہت خوش تھی لیکن اس خوشی کو جانے کس کی نظر لگ گئی۔ وہ دونوں ایک پہاڑی علاقے کی سیر کے لیے گئے تھے جہاں گاڑی کے بریک فیل ہونے سے انہیں ایک جان لیوا حادثے کا سامنا کرنا پڑا۔ عثمان تو موقع پر ہی جاں بحق ہو گیا لیکن وہ کئی ماہ تک زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہی۔ اویس اسی پہاڑی علاقے کا رہائشی تھا اور وہ دونوں اس کے پاس رہائش پذیر تھے۔ عثمان کے خاک نشین ہوتے ہی وہ مارِ آستین ثابت ہوا اور مائرہ کو جسم فروشی کے دھندے سے وابستہ کر دیا۔ فرار ہونے اور خودکشی کی کئی کوششیں کرنے

کے باوجود زندگی اسے رہائی دیتی تھی، نہ ہی اویس کے چنگل سے چھٹکارا ملتا تھا۔ کچھ ماہ پہلے وہ اپنے .... کاروباری حریفوں کی وجہ سے اس شہر میں منتقل ہو گیا اور یہاں آکر بہت سے زخموں کے منہ پھر سے کھل گئے۔

اویس نے ایک کچی بستی میں قیام کیا جہاں بہت سے جرائم پیشہ افراد بستے تھے۔ اس کا کاروبار خوب چمک اُٹھا۔ پھر ایک روز ماجد اس کی زندگی میں چلا آیا۔ پہلی ملاقات میں ہی وہ اسے بہت منفرد لگا تھا۔ اس معاہدے کے بعد ساتھ گزارے گئے وقت نے تو اسے مزید اسیر کر لیا۔

ایک طویل عرصے بعد مائرہ کو عثمان کی طرح ایسا شخص ملا جو اسے محض 'عورت' نہیں سمجھتا تھا۔ ماجد نے اسے بہت توجہ دی اور بدلے میں اس سے کچھ بھی طلب نہ کیا۔ وہ پہلے اس کی تہذیب اور رکھ رکھاؤ سے متاثر ہوئی اور پھر کردار کی مضبوطی سے۔ وہ اسے سامنے اور اپنی دسترس میں پاکر بھی کبھی نہیں بہکا تھا۔ دھیرے دھیرے یہ تاثر پسندیدگی میں ڈھل گیا اور پھر پسندیدگی ایک ایسی محبت میں منتقل ہو گئی جو اس کے لیے بھی بہت انوکھی تھی۔

مائرہ ایک بار اس تجربے سے گزر چکی تھی اور کسی ماہر نفسیات کی طرح خود کو محبت کی سب باریکیوں کا عالم سمجھتی تھی، لیکن یہ جانے کیسا جذبہ تھا جو وہ ماجد کے لیے محسوس کرنے لگی تھی۔ اپنے آپ سے بہت زیادہ لڑنے اور اُلجھتے رہنے کے بعد وہ یہی نتیجہ نکالنے میں کامیاب ہوئی کہ یہ پختہ عمر کی محبت ہے جو عزت اور تحفظ کی طلبگار ہوتی ہے۔

ماجد اس کی بے حد عزت کرتا تھا اور اس سے یقیناً محبت بھی کرتا تھا جب ہی تو اس سے ایک فاصلہ برقرار رکھے ہوئے تھا لیکن شاید وہ اس کے انکار سے خائف تھا اس لیے پہل کرنے میں اب تک گریزاں تھا۔

"بے وقوف کہیں کا! میں انکار کیوں کروں گی؟ اسے کیا علم کہ عزت، محبت اور تحفظ تو ہر عورت کی چاہ ہوتی ہے...... بے وقوف کہیں کا!" وہ بڑبڑائی۔

"کون بے وقوف ہے بھئی؟ کس سے باتیں کر رہی ہو؟" ماجد یکدم کمرے میں واپس آیا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں موبائل تھا اور دایاں ہاتھ اپنے کوٹ کی جیب میں۔

مائرہ چونک گئی۔

"خاموش کیوں ہو گئی ہو اب؟"

"تمہیں بے وقوف کہہ رہی تھی میں۔" اس نے بلی چوہے کا یہ کھیل ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

"کیوں؟ میں نے کیا گناہ کر دیا؟" وہ ہنسا۔

"تم اپنی محبت کا اظہار کرنے سے ڈرتے جو ہو۔"

"کون سی محبت؟" وہ محظوظ ہوا۔

"وہی محبت جس سے مغلوب ہو کر تم مجھے یہاں لائے ہو۔ سب کی نظروں سے چھپا کر رکھا ہے اور میری فکر کرتے ہو۔" اس کی توجیہہ پر ماجد سنجیدہ ہو گیا۔

"تم اسے محبت سمجھتی ہو...... یعنی وہ جذبہ جو ایک مرد اور عورت ایک دوسرے کے لیے محسوس کرتے ہیں؟"

"ہاں بالکل!" وہ بے دھڑک بولی۔ "اور میں تمہاری ذات میں انوالو ہو چکی ہوں۔ اپنے اس جذبے کو میں مکمل طور پر تو نہیں سمجھ پائی لیکن اتنا یقین ہے کہ یہ محبت ہی ہے...... سو فیصد۔"

"میرے گھر میں ایک پالتو کتّا ہے...... دو طوطے ہیں اور ایک سدھایا ہوا بندر بھی ہے۔ میں ان کے کھانے پینے اور دیگر ضروریات کا بھی بہت خیال رکھتا ہوں، ان کی بہت فکر کرتا ہوں تو کیا وہ بھی......" ماجد نے قطع کلامی کرتے ہوئے اپنی بات بھی ادھوری چھوڑ دی۔

وہ اس کے انداز پر ششدر تھی۔

"تم جانتی ہو ابھی کس کا فون تھا؟ اور میں کہاں گیا تھا؟" وہ سرد مہری سے بولا۔

"نہیں۔"

"جانو گی بھی کیسے؟ تم تو اپنے شوہر کے خیالوں میں کھوئی مجھے اپنا شوہر بنانے کے خواب دیکھ رہی تھیں۔" اس کے الفاظ میں شعلوں کی سی تپش تھی۔ "ویسے اچھا ہی ہوا کہ وہ مر گیا ورنہ......"

"شٹ اَپ! جسٹ شٹ اَپ!" وہ چلّائی۔

"اوہ...... بُرا لگا...... اچھا سوری...... ویری سوری......" ماجد نے قہقہہ لگایا۔ "کیا جاننا نہیں چاہو گی کہ کس کا فون تھا اور میں کہاں گیا تھا؟"

مائرہ خاموش رہی۔

"اچھا چلو میں ہی بتا دیتا ہوں۔ تمہارے دلال کا فون تھا میڈم! اور اب وہ اس دنیا میں نہیں رہا...... مر چکا ہے۔" وہ سفاکی سے بولا۔

"کک...... کیسے؟ کیسے مر گیا؟" مائرہ کو خوشگوار حیرت ہوئی۔ اویس کی موت اس کے لیے آزاد زندگی کا پروانہ تھی۔

"ایسے......" ماجد نے دایاں ہاتھ کوٹ کی جیب سے نکال کر ایک تیز دھار خنجر لہرایا۔ مائرہ کی آنکھوں کے سامنے ایک برق لہرائی اور حلق پر کسی چبھن کا احساس ہوا۔

اس نے اضطراری طور پر اپنے ہاتھ حلق کی طرف بڑھائے جو لہولہان ہو چکا تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ زمین بوس تھی۔ ماجد اب نہایت اطمینان سے اس کی لاش کے آس پاس جگہ صاف کرنے لگا۔ اس کے دائیں ہاتھ پر چند خراشیں بھی نظر آ رہی تھیں جو غالباً اویس سے ٹاکرے کی نشانی تھیں۔ نصف گھنٹے میں دونوں لاشوں کو گاڑی کی ڈکی اور عقبی سیٹ میں ٹھونس چکا تھا۔ انہیں اپنے اصل مقام تک پہنچانے کا وقت ہو گیا تھا۔

دسمبر کا ٹھٹھرا ہوا سورج تیزی سے اپنی کرنیں سمیٹے مغربی کونے میں اپنا چہرہ چھپا رہا تھا۔

☆☆☆

''مجھے پانی پلا دو...... چند گھونٹ ہی سہی...... خدا کے واسطے......'' انعم کی آواز نقاہت سے ڈوب رہی تھی۔

اس کی آنکھوں میں شدید کھنچاؤ کی کیفیت تھی۔ کمرے میں اس بار تاریکی تھی۔ برگر اور جوس کی سہولت بھی اب معطل تھی۔ بھوک کے عالم میں وہ اپنی بوٹیاں تک نوچنے کے لیے تیار تھی۔ وہ اب تک اپنی اس سزا اور بے بسی کا سبب نہیں جان پائی تھی۔ اس کی صدائیں بھی دھیرے دھیرے مدھم ہونے لگی تھیں اور اب تو اسے اپنی آواز ہی بمشکل سنائی دیا کرتی۔ وہ یونہی چت لیٹی اپنا قصور... یاد کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ دروازے پر ہونے والی آہٹ نے اس کے خیالات میں تعطل پیدا کر دیا۔

صیاد کی قفس میں آمد ہو چکی تھی۔ اس نے آتے ہی کمرے میں روشنی کر دی۔ انعم کی چندھیائی نظریں اس کے ہاتھوں پر مرکوز تھیں جن میں ایک برگر، چپس اور کچھ سوفٹ ڈرنکس نظر آ رہی تھیں۔ اس کے معدے میں اینٹھن ہونے لگی۔

''یہ لو! کیا یاد کرو گی؟ آج تمہارے سارے شکوے دور ہو جائیں گے۔'' انعم نے وحشیانہ انداز میں اس شاپر کو دبوچ لیا اور اسے نظر انداز کیے کھانے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ وہ پنجوں کے بل اس کے پاس آ بیٹھا لیکن خلافِ معمول زبان طنز کے نشتر نہیں چلا رہی تھی۔ اس کا چہرہ تر و تازہ اور پُرسکون تھا تاہم دائیں ہاتھ کی پشت پر خراشوں کے چند نشان بھی تھے جن پر کوئی آئنٹمنٹ لگایا گیا تھا۔ اپنی انگلیوں سے محرومی اور اس کی آمد پر منہ نوچ لینے کا ارادہ بھوک نے فراموش کر دیا۔ اس کی خاموشی غیر معمولی تھی۔ کچھ دیر بعد اسی خاموشی سے اٹھ کر وہ دوبارہ دروازے کی طرف پلٹ گیا۔

''لائٹ بند نہ کرنا پلیز!''

''اوکے نہیں کرتا!'' وہ معنی خیز نظروں سے اُسے دیکھ کر بولا۔

انعم نے برگر کا ایک بڑا سا لقمہ لیا۔ اسی پل اس کی نظر ان چوبی خانوں پر پڑی جہاں دو نئی لاشیں موجود تھیں اور دونوں ہی کی گردن پر خنجر زنی کے نشانات تھے۔ لقمہ اس کے منہ سے نیچے گر گیا۔ لائٹ آن رکھ کر جانے کی مہربانی کی منطق اسے سمجھ آ گئی تھی۔

کچھ دیر پہلے کی بھوک اب اس منظر سے سہم کر جانے کہاں چھپ گئی تھی؟

☆☆☆

سفیان کی طبیعت تاحال نہیں سنبھلی تھی۔

بخار کی شدت نے منہ میں کڑواہٹ گھول رکھی تھی۔

وہ اگلے روز بھی ڈیوٹی پر نہ جا سکا۔ اسے ایک اطمینان بہرحال ضرور تھا کہ طیب اس کی غیر موجودگی میں انتظامی و دیگر معاملات احسن طریقے سے سنبھال لے گا۔ دوسری صبح وہ قدرے بہتر تھا لیکن نواز کے باقاعدہ چیک اَپ کے لیے ڈاکٹر سے ملنے کے بعد وہ بعد از دوپہر پولیس اسٹیشن پہنچا۔ وہاں پہنچتے ہی اس نے سب معاملات کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ طیب ایک گھنٹے تاخیر سے پہنچا۔

''آپ آ گئے سر؟ مجھے آج آپ سے رابطہ کرنا ہی تھا۔''

''انعم چوہدری کے معاملے میں کوئی پروگریس؟'' اس نے پوچھا۔

''بالکل بھی نہیں! بابر چوہدری کی بیوی پر بھی فالج کا اٹیک ہوا ہے وہ بھی ہاسپٹلائز ڈ ہو چکی ہیں۔''

''اوہ...... بہت افسوس ناک صورتِ حال ہے۔''

سفیان نے تاسف سے سر ہلایا۔

''حسنین پر نظر رکھنے سے کیا رپورٹ ملی ہے؟''

''وہ کلیئر ہے...... آخری اطلاع کے مطابق کسی خلیجی ریاست میں جانے کے لیے پر تول رہا ہے۔''

''اور فارم ہاؤس میں قتل کیس کی کیا صورتِ حال ہے؟'' سفیان کو یاد آیا۔

''وہ کیس ایک علیٰحدہ ہی موڑ لے چکا ہے۔'' طیب نے پیشانی مسلی۔

''ریمانڈ مل گیا کیا؟''

''نہیں! یہاں زنان خانہ سے اس لڑکی کی رپورٹ اچھی نہیں مل رہی تھی۔ وہ عجیب و غریب حرکات کرتی تھی لیکن

کسی نے اسے سنجیدہ نہیں لیا۔ ملزم اکثر سزا سے بچنے کے لیے اپنے دماغی توازن کی خرابی کا ناٹک کرنے لگتے ہیں۔ کل صبح اسے عدالت میں پیش کیا گیا۔ پہلے پہل وہ ٹھیک تھی۔ عدالت میں داخل ہوتے ہی اس کے حواس جواب دینے لگے۔ استغاثہ کے وکیل کو دیکھ کر اس پر تشنجی کیفیت طاری ہوئی اور مجسٹریٹ کو دیکھ کر رہی سہی کسر بھی پوری ہو گئی۔ وہ ان سے شدید خوفزدہ محسوس ہو رہی تھی اور بار بار ایک ہی بات دہرا رہی تھی 'ہم لٹ گئے۔ ہم برباد ہو گئے' حیرانی کی بات تو یہ ہے کہ اس کے حلق سے مختلف آوازیں اور لہجے اس طرح برآمد ہوتے تھے کہ سب ہی ششدر تھے۔ وہ اپنے آپ کو ٹارچر کرتی تو کبھی انگلش رائمز پڑھنے لگتی۔ اگلے ہی لمحے ذہنی رو پھر الٹ جاتی اور آوازوں، کہوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔''

''بہت گمبھیر صورتِ حال ہے یہ تو۔''

''جی ہاں! عدالت نے ریمانڈ کے بجائے اس کے چیک اپ کا حکم دیا ہے اور اسے دماغی امراض کے اسپتال بھیج دیا گیا ہے۔ رپورٹ بھی جلد ہی مل جائے گی۔'' طیب نے تفصیل بتائی۔

''مجھے اس کی فائل دکھاؤ اور انعم چوہدری کے ان کالج فرینڈز کو بھی چیک کرو جن کی لسٹ ہم نے بنائی تھی۔''

طیب نے فائل لا کر اسے تھمائی اور سلیوٹ کر کے باہر نکل گیا۔ فائل میں اس کے لیے بہت سے انکشافات تھے۔ اس نے اسپتال جانے کا فیصلہ کر لیا۔

☆☆☆

انعم چوہدری کے جسم پر لرزہ طاری تھا۔

نئی لاشوں کی موجودگی نے اس کے اعصاب شکستگی کے آخری مراحل میں پہنچا دیے۔ ایک خیال کسی برقی رو کی طرح اس کے ذہن سے گزرتا اور لرزش پہلے سے بھی زیادہ بڑھ جاتی۔ اسے یقین ہونے لگا کہ اب وہ کبھی بیرونی دنیا کا حصہ بن پائے گی نہ ہی یہاں زندہ رہ پائے گی۔ اس کا مبینہ اغوا کار کبھی بھی اسے زندہ چھوڑنے کا خطرہ مول لے ہی نہیں پائے گا۔

اس کی ذہنی رو ایک بار پھر اغوا کار کی طرف مڑ گئی جس کی آنکھوں میں ہمیشہ مسکراہٹ اور چمک نظر آتی تھی لیکن اس مسکراہٹ کے عقب میں دور، کہیں بہت دور ایک جھیل بھی تھی...... سرد پانی کی منجمد جھیل...... اس کی حرکات و سکنات میں ایک خاص قسم کا آہنگ ہوتا تھا جیسے وہ یہ سب کسی اسکرپٹ کے تحت کر رہا ہو لیکن سوال پھر وہی تھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہا تھا؟ اور انعم کے ساتھ اس سلوک کی کیا وجہ تھی؟

اس نے اپنی یادداشت کے سبھی خانے کھنگال لیے مگر کوئی دشمن یاد آتا تھا نہ ہی اپنی کوتاہی۔ وہ یقیناً کوئی سیریل کلر تھا۔ ایسے قاتل کسی مخصوص ایجنڈے کے تحت ہی قتل کیا کرتے ہیں اور انعم اس ایجنڈے سے اپنا تعلق جوڑ نہیں پا رہی تھی۔ وہ اپنی سوچوں میں الجھی بیٹھی رہی۔ ایک ہی انداز میں بیٹھے رہنے سے اس کا جسم تختہ ہو گیا تھا لیکن وہ دانستہ طور پر اِدھر اُدھر دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔ ان لاشوں کی دید ہرگز اس کے لیے خوشگوار منظر نہیں ہو سکتی تھی۔

کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز سے اس کا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔

''مجھے یقین تھا کہ تم نے کچھ نہیں کھایا ہوگا۔'' وہ ملائمت سے بولا۔ اس کا دایاں ہاتھ کوٹ کی جیب میں تھا۔

''کیسے کھاتی؟ ان ڈیڈ باڈیز کو دیکھ کر کوئی بھی انسان نارمل کیسے رہ سکتا ہے؟''

''یہاں منتقل ہونے کی ضد بھی تو تمہاری ہی تھی۔''

''کیوں کر رہے ہو میرے ساتھ ایسا؟ کیا بگاڑا ہے میں نے تمہارا؟'' اس نے ہاتھ جوڑ دیے لیکن مقابل انہی مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔ اس مسکراہٹ کے پیچھے چھپی جھیل پر برفانی تہ آج کچھ اور بھی گہری محسوس ہو رہی تھی۔ انعم کی ریڑھ کی ہڈی سنسنا اُٹھی۔

''یہ جاننا تمہارے لیے ضروری نہیں۔'' وہ اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

''یہ لوگ کون تھے؟'' انعم نے چوبی خانوں کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ...... یہ وہ لوگ تھے جو اپنی حدود کراس کرتے تھے اور ان کی غلطی سے دوسروں کی زندگیاں متاثر ہونے کا خدشہ ہوتا تھا۔ بہت ساری زندگیاں بچانے کے لیے ایک کو ختم کر دینا بہت نیک اور اچھا عمل ہے۔''

''مجھے تمہاری کسی بات کی سمجھ نہیں آ رہی۔''

''انہیں بھی نہیں آتی تھی بلکہ انہیں کسی کی بھی سمجھ نہیں آتی تھی۔'' وہ اسی اطمینان سے بولا۔ ہاتھ ہنوز جیب میں تھا۔

''تم ہو کون؟ اور کیوں کر رہے ہو یہ سب؟''

''واہ...... یہ سوال تو پہلی بار کسی نے مجھ سے کیا ہے۔'' وہ محظوظ ہوا۔

''تو جواب دو نا پھر!''

''جواب بہت مہنگا ہے۔ قیمت ادا کر پاؤ گی؟''

''تمہیں جو قیمت چاہیے لے لو...... مگر مجھے جانے دو۔''

''میرا نام سفیان ہے...... انسپکٹر سفیان...... اور اب قیمت؟''

''ان...... س...... پک...... ٹر۔'' انعم کے شدید حیرت میں ادا کیے یہ الفاظ منہ میں ہی تھے کہ سفیان کا ہاتھ برقی سرعت سے حرکت میں آیا اور اس کی شہ رگ سے خون کا فوارہ ابل پڑا۔ اس کے اطمینان میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ پُرشوق نگاہوں سے انعم کی خرخراتی آوازیں اور جھٹکے لیتا جسم دیکھتا رہا۔ اس کا وجود ساکت ہوتے ہی وہ سکون سے اُٹھا اور لاش میکانکی انداز میں ٹھکانے لگانے میں مصروف ہو گیا۔

☆☆☆

انعم کی لاش اپنے ٹھکانے پر پہنچ چکی تھی۔

سفیان دیوار سے پشت لگا کر بیٹھ گیا۔ اسے اب بھی بخار تھا لیکن وہ بے پروائی برت رہا تھا۔ اس نے دونوں بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹے اور منہ کھول کر گہری سانسیں لینے لگا۔ حلق میں آنسوؤں کا ایک پھندا تھا جو سانس لینے میں شدید دشواری پیدا کر رہا تھا۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ یہ آنسو حبہ کے لیے تھے۔ اس کی حالت اور کسمپرسی دیکھ کر آج وہ اپنی تمام تر مضبوطی بھول گیا تھا۔ ماضی کا جن ایک بار پھر بوتل سے آزاد ہو کر اس کمرے میں وحشیانہ رقص کرتا دکھائی دے رہا تھا۔ سفیان ملتجی نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رحم کی بھیک طلب کرتا رہا لیکن اس کا رقص ہر گزرتے لمحے مزید وحشت اختیار کر رہا تھا اور پھر وہ جن اس پر پوری قوت سے جھپٹ کر کئی سال پیچھے کھینچ لایا جہاں روشن سویرے اور خوشگوار شامیں تھیں، جہاں اس کے پاس بہت سے رشتے تھے اور جہاں 'سفیان نواز' بہت خوش تھا۔

☆☆☆

''واؤ! کتنی زبردست واچ ہے! کہاں سے لی؟''

''پاپا نے بھیجی ہے۔'' وہ اترایا۔ اس کے دوستوں کی نظر میں بے پناہ رشک وحسد تھا اور یہ منظر نیا ہرگز نہیں تھا۔ سفیان یہ سب بچپن ہی سے دیکھتا اور محظوظ ہوتا تھا۔ اس کے والد قطر میں ملازم تھے۔ وہ بیوی بچوں کے لیے کسی واقف کار کے ذریعے بہترین تحائف بھیجتے جو بچوں کے دل میں والد کی موجودگی اور کمی کا احساس تھوڑے دن کے لیے کم کر دیتے لیکن دوستوں اور رشتے داروں کے دلوں میں حسد اور نفرت کے جذبات ایک نئے سرے سے پیدا کرتے جو پہلے سے بھی شدید ہوتے۔

اس کا تعلق ایک لوئر مڈل کلاس طبقے سے تھا اور ان کے اردگرد ایسا معاشرہ بستا تھا جن کی ساری زندگی چادر اور پاؤں کی ازلی کشمکش میں گزرتی تھی۔ اگر کوئی پڑھ لکھ جاتا تو اچھی ملازمت حاصل کر کے گھر والوں کے حالات بدلنے کی بھرپور کوشش کرتا۔ اس سے بڑا جیک پاٹ لگتا تو بیرونِ ملک کا ویزا لگ جاتا۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ حالات میں تبدیلی کے باوجود وہ اپنی رہائش گاہ تبدیل کرنے کے لیے تیار نہ ہوتے۔ مکان میں تعمیراتی تبدیلیاں کروالی جاتیں لیکن بہتر علاقے میں منتقلی کے بارے کبھی نہ سوچا جاتا۔ ساری زندگی جن رشتے داروں اور محلے داروں کے سامنے سسک کر جیا جاتا تھا، اسی موقع پر انہیں اپنی ترقی اور حیثیت دکھا کر نفسیاتی تسکین کا کھیل بہت اہتمام سے کسی عالمی ٹورنامنٹ کی سی تیاری اور سنجیدگی سے کھیلا جاتا۔ سفیان کا گھر بھی اسی طرزِ زندگی کی بہت بڑی مثال تھا۔

اس کا گھر ایک ذیلی گلی میں واقع تھا۔ بیرونی جانب سبزی، کریانے، دھوبی اور گوالے کی دکانوں کی بھرمار تھی۔ اس جگہ کا ناسور 'بلیئرڈ' کی ایک دکان تھی جس کے باہر اس علاقے کے لوفر، آوارہ اور نشے کے عادی لڑکے سرِشام ہی اکٹھے ہونے لگتے۔ وہ چرس بھرے سگریٹ پیتے، نشے کے انجکشن استعمال کرتے، آتی جاتی لڑکیوں کے علاوہ درمیانی عمر کی عورتوں سے چھیڑخانی کرتے اور ایک دوسرے کو بے ہودہ لطائف سنا کر فحش گوئی کیا کرتے۔ سفیان کو اس کی والدہ نے بچپن ہی سے اس ماحول میں باہر نکلنے نہ دیا اور یہ شاید واحد عقلمندی تھی جو اس نے اپنی شادی شدہ زندگی میں کی تھی۔

سفیان تین بہن بھائی تھے۔ مائرہ اس سے پانچ سال بڑی تھی جس کی پیدائش کے بعد نواز علی کا سالہا سال سے رکا ویزا لگ گیا تھا۔ وہ اسے بہت لاڈ پیار کرتا۔ کنول بھی اس کی ہر بات مانتی اور ہر خواہش پوری کرتی تھی۔ نواز علی نے اسے اہلِ علاقے سے کھلنے ملنے سے سختی سے منع کر رکھا تھا۔ سفیان بڑی بہن سے بہت محبت کرتا تھا اور اس کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ وہ شکل وصورت کے اعتبار سے کنول کا عکس تھی۔ ہاں اس کی پہلی محبت تھی تو مائرہ اسی محبت کا ایک پرتو۔

اس کا بچپن شاندار تھا۔ ان کے تعلقات صرف اکلوتے ماموں سے استوار تھے۔ اس کے علاوہ وہ کسی بھی

رشتے دار کے گھر کم ہی جاتے۔ مائرہ سے بے حد محبت کرنے کے باوجود سفیان کو اس کی شخصیت میں موجود کج روی کا بچپن ہی سے اندازہ ہو گیا تھا۔ وہ خود پسند تو تھی ہی، والدین کے بے جا لاڈ پیار نے اسے خود غرض بھی بنا دیا تھا۔ وہ اپنے آپ میں ہی مگن رہتی۔ پڑھائی میں اتنی اچھی نہیں تھی لیکن اسکول کا ہر فنکشن اس کی شرکت کے بغیر ادھورا ہوتا۔ سات سال کی عمر میں اسے قدرت کی جانب سے ایک جیتا جاگتا کھلونا ملا...... حبہ نواز...... اس ننھی سی گڑیا کی پیدائش پر وہ بہت خوش تھا لیکن مائرہ کا ردِعمل غیر متوقع تھا۔ وہ افسردہ صورت لیے اسٹور روم میں جا کر چھپ گئی۔ اسے خدشہ تھا کہ حبہ کی آمد سے اس کی اہمیت اور ناز برداری کم ہو جائے گی۔ نواز اور کنول نے تلافی کے طور پر اس کے مزید لاڈ اٹھانے شروع کر دیے۔ مائرہ، سفیان اور حبہ ایک مثلث کے تین کونے تھے لیکن کنول ان میں کبھی بھی توازن قائم نہ رکھ سکی۔ مائرہ کو اہمیت دینے کے لیے وہ چھوٹے دونوں کے ساتھ کہیں نہ کہیں سختی برت جاتی۔

دس سال کی عمر میں سفیان نے ایسی باتیں محسوس کرنی شروع کر دیں جو اس کے ذہن میں میخ کی طرح گڑ جاتیں۔ اپنی محدود سوچ کے مطابق وہ انہیں نکالنے کی کوشش کرتا لیکن وہ کچھ اور مضبوطی سے گڑ جاتیں۔ اس کا ذہن شل ہو جاتا اور سوچیں لہولہان۔ وہ اپنے گھر کے عدم توازن پر بہت دلبرداشتہ رہتا۔ وہاں بہت کچھ غلط تھا لیکن قائم مقام سربراہ کو احساس نہ تھا۔

اسے سب سے پہلا اعتراض مائرہ کے لباس پر ہوتا تھا۔ اس علاقے میں کوئی بھی لڑکی ٹراؤزر، شرٹ نہیں پہنتی تھی لیکن مائرہ کے لیے یہ لباس معمول تھا۔ کنول کے کہنے پر وہ کبھی کبھی اسکارف لے لیا کرتی لیکن ٹیوشن، اکیڈمی آمدورفت کے دوران علاقے کے لوگوں کے تاثرات اس قدر بے ہودہ ہوتے کہ وہ دس سالہ بچہ بھی غصے میں آ جاتا۔ تنگ آ کر اس نے کنول سے بات کی۔

''ماما! آپی کو ایسے کپڑے پہنا کر باہر نہ بھیجا کریں۔''

''وہ ہمیشہ ہی سے ایسا لباس پہنتی ہے۔ اب کیا مسئلہ ہو گیا؟ اسکارف بھی تو لیتی ہے ساتھ۔''

''لوگ انہیں اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے۔ اشارے کرتے ہیں۔'' اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ماں کو کن الفاظ میں مدعا بیان کرے۔

کنول بہر حال سمجھ گئی تھی۔ وہ خود بھی اس حوالے سے پہلے ہی مائرہ کو سمجھاتی رہی تھی لیکن وہ بات ٹال دیا کرتی اور اس بار بھی یہی ہوا۔

''میں ہمیشہ ہی سے ایسے لباس کی عادی ہوں اور اب اچانک پہناوا، اسٹائل تبدیل کر لوں؟ میں ایسا نہیں کر سکتی۔'' وہ بھڑک اٹھی۔

کنول اس کی خودسری کے سامنے زچ ہو گئی۔ ان کی بحث جاری رہی اور بالآخر اس نکتے پر اختتام ہوا کہ حبہ بھی آئندہ ایسے کپڑے نہیں پہنے گی۔ مائرہ کی طرح وہ بھی اپنا پہناوا تبدیل کر لے گی۔ حسبِ معمول وحسبِ سابق اس کی بات مان لی گئی اور یہ پہلی ناانصافی تھی جو حبہ کی ذات کے ساتھ اس کی وجہ سے ہوئی اور اس کے بعد یہ سلسلہ تھم نہ سکا۔

سفیان اپنی والدہ اور بہن کی نفسیات سے کبھی کبھی عاجز آ جاتا۔ مائرہ کو ذہنی برتری اور اپنی خوب صورتی کا خبط تھا تو کنول بھی دانشمندی اور دوراندیشی سے بالکل عاری تھی۔ اسے بہت سال پہلے ہی بیٹی کے لاڈ پیار میں غیر محسوس طریقے سے کمی کر کے اس کی ذہنی تربیت کرنی چاہیے تھی لیکن کنول کے دماغ میں ایک ہی گرہ تھی کہ مائرہ ان کے

''وہ لاک اپ میں بند ہے۔ تمہارے گھر میں چوری کر کے فرار ہوتے ہوئے پکڑا گیا تھا۔'' پولیس افسر نے بتایا۔

''مجھے معلوم ہے۔ پولیس موبائل نے اسے پکڑا تھا...... کیا میں ذرا سی دیر کے لیے اس سے مل سکتا ہوں؟''

''کیوں...... کیا بات ہے؟'' پولیس افسر نے اسے اشتباہ آمیز نظروں سے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

''بس...... ذرا ایک ذاتی مسئلہ ہے!'' اس نے ہچکچاتے ہوئے بتایا۔

''یہ پولیس اسٹیشن ہے۔ یہاں قانون چلتا ہے...... ذاتی مسئلے نہیں نمٹائے جاتے۔''

''مہربانی ہو گی...... کوئی فیس ہے تو میں وہ بھی دینے کو تیار ہوں!'' التجا کی گئی۔

''مسئلہ بتاؤ!''

''میری بیوی کی نیند بہت کچی ہوتی ہے۔ ذرا سی آہٹ پر وہ جاگ جاتی ہے۔ چور سے پوچھنا ہے کہ وہ کس ترکیب سے میرے گھر میں گھسا کہ میری بیوی کو اس کے آنے کا پتا نہیں چلا اور وہ سوتی رہ گئی!''

ڈھاکا سے عائشہ خرم کا تعاون

لیے انتہائی خوش قسمت بچی ہے اور اس کی اہمیت کبھی کم نہیں کی جاسکتی۔ وہ محبت اور تربیت میں کبھی توازن نہ رکھ پائی اور یکے بعد دیگرے غلط فیصلے کرتی چلی گئی۔

انہی دنوں ان کے گھر کے سامنے ایک مکان کرائے کے لیے خالی ہوا۔ ایک بیوہ عورت اور اس کا بیٹا یہاں رہائش پذیر ہوگئے۔ عثمان نامی وہ لڑکا کسی بیکری میں ملازم تھا۔ صبح سے رات تک ملازمت پر رہتا۔ اہلِ علاقے کی نظر میں اس نے اپنا بہت اچھا مقام بنالیا تھا۔

مائرہ ان دنوں کالج میں پڑھتی تھی۔ اس کے طور طریقے اب بھی وہی تھے۔ کالج کی دنیا نے اس کے احساسِ برتری میں مزید اضافہ کیا۔ اسے سراہنے اور چاہنے والوں کی کوئی کمی نہ تھی اور اسی دوران میں وہ عثمان سے بھی بے تکلف ہوگئی۔ وہ دونوں نہایت محتاط کھلاڑی کی طرح یہ کھیل کھیلتے رہے۔ کالج کی آڑ میں عثمان سے ملاقاتوں کا سلسلہ بھی خوب چل نکلا۔ سفیان اس وقت کم عمر تھا اور اپنے اردگرد ہونے والی یہ تبدیلی اسے بہت ہولاتی تھی۔ اس نے ایک بار پھر ماں سے بات کرنے کی ٹھانی۔

''ماما! آپی اتنی دیر سے کیوں واپس آتی ہے؟''

''وین دیر سے آتی ہے بیٹا! ڈرائیور نے دوسری لڑکیوں کو بھی تو چھوڑنا ہوتا ہے۔'' کنول نے رسان سے جواب دیا۔

''لیکن اتنی بھی کیا دیر؟'' وہ جھنجلایا۔

''کالج میں پریکٹیکلز کی وجہ سے بھی چھٹی تاخیر سے ہوتی ہے سوفی! تم کیوں ہر وقت بہن کے پیچھے پڑے رہتے ہو؟''

''میں غلط نہیں کہہ رہا ماما! مجھے کسی چیز کے غلط ہونے کا احساس ہو رہا ہے۔ کل رات آپی چھت پر کیا کر رہی تھی؟'' اس نے ایک اور سوال اٹھایا۔

''واک کر رہی ہوگی۔ روزانہ ہی کرتی ہے۔ تم ہر بات میں نیگیٹو کیوں ہوتے ہو؟ وہ میری بیٹی ہے۔ مجھے اس پر بہت اعتبار ہے۔ وہ کبھی اپنے والدین کی محبت کو دھوکا نہیں دے گی۔''

''مجھ پر اعتبار نہیں ہے شاید آپ کو۔'' وہ افسردہ ہوا۔ کنول نے اسے اپنے گلے لگا کر خوب تسلی دی لیکن وہ مطمئن نہ ہوسکا اور کنول یہ نہ سمجھ سکی کہ جب محبت نامی آسیب لڑکی کے وجود کو جکڑتا ہے تو والدین کی محبت ہی سب سے پہلے دل و دماغ سے فراموش ہوتی ہے۔

سفیان کی چھٹی حس مسلسل کسی خطرے کا احساس دلا رہی تھی لیکن اس کے پاس اپنا دعویٰ ثابت کرنے کے لیے کوئی ثبوت نہیں تھا۔ اس نے اپنے باپ نواز سے یہ سارے معاملات شیئر کرنے کا فیصلہ کرلیا لیکن یہ تاخیر بہت مہنگی ثابت ہوئی۔

☆☆☆

نواز کی واپسی اس بار دو ماہ کے لیے ہوئی۔ وہ اپنے ساتھ کچھ طلائی زیورات وغیرہ بنوا کر لایا تھا۔ دونوں بیٹیوں کے مستقبل کے لیے یہ زیورات اگلے روز بینک میں رکھوائے جانے تھے لیکن تمام منصوبے دھرے کے دھرے رہے۔

اگلا دن ایک قیامت بن کر طلوع ہوا۔ مائرہ کالج سے واپس ہی نہ آئی۔ وین میں موجود اس کی چند کلاس فیلوز سے علم ہوا کہ وہ اکثر کالج بنک کیا کرتی تھی لیکن چھٹی سے پہلے واپس آجایا کرتی تھی۔

مائرہ کی گمشدگی سے پریشان نواز اور کنول کو دوسرا جھٹکا اس وقت لگا جب گھر میں موجود سارا کیش اور زیورات بھی غائب ملے۔ اب کسی شبے کی گنجائش نہیں تھی کہ وہ باقاعدہ منصوبہ کے تحت فرار ہوئی ہے۔

سفیان کے لیے وہ وقت بہت دردناک تھا۔ اس نے پہلی بار اپنے والدین کو سب لحاظ بالائے طاق رکھ کر لڑتے ہوئے دیکھا۔ اس حادثے کے لیے وہ ایک دوسرے کو موردِ الزام ٹھہرا رہے تھے۔ نواز، کنول کی تربیت اور پرورش پر انگلی اٹھا رہا تھا تو کنول اس کو یہ یاد دلا رہی تھی وہ کتنے برسوں سے اسے پاکستان میں سیٹل ہونے کا کہہ رہی تھی۔

''میں اکیلی عورت کیا کیا کرتی؟ کتنی بار کہا کہ واپس آجائیں۔ بچوں کو اسی عمر میں والد کی موجودگی کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن آپ کو اپنی آزادی اور عیاشی عزیز تھی۔'' وہ چلا رہی تھی۔

''کاش میں عیاشی ہی کر رہا ہوتا۔ اپنا آپ مار کر جس بیوی اور اولاد کا مستقبل سنوار تا رہا ہوں وہی میری اس کوشش کو گناہ بنانے لگے ہیں۔''

وہ چلاتے رہے، لڑتے رہے، نوبت ہاتھا پائی تک آپہنچی اور یہ صورتِ حال اس وقت مزید سنگین ہوئی جب کنول کی چیک بک بھی غائب ملی۔ وہ ہر چیک پر دستخط کر کے ہی رکھتی تھی اور مائرہ نے اسی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بینک میں موجود کیش پر بھی ہاتھ صاف کردیا۔

اس لوئر مڈل کلاس علاقے کے لوگوں کے ہاتھ ایک چٹپٹا موضوع لگ گیا اور ہر جگہ ایک ہی بازگشت تھی۔

''نواز کی بیٹی کرائے داروں کے لڑکے کے ساتھ

بھاگ گئی۔ لڑکے کی ماں بھی غائب ہے۔ خدا جانے کہاں منہ کالا کر رہے ہیں دونوں؟''

یہ فقرہ الفاظ کے ہیر پھیر کے ساتھ ہر ایک سے سننے کو ملتا۔ برسوں پرانی کدورت اور بغض نکالنے کے لیے رشتے داروں کے پاس بھی اس سے بہترین موقع کہاں تھا؟ نواز علی کی زندگی سانپ سیڑھی کا کھیل بن گئی تھی جسے عین عروج پر ننانوے پر کھڑے سانپ نے ڈسا تھا اور ڈسنے والی اس کی وہ اولاد تھی جو تمام عمر ہتھیلی کا چھالا بن کر رہی۔ اس کا لباس، تعلیم اور انداز ہمیشہ ان کے لیے باعث حسد ہوتے تھے۔ وہ ہمدردی اور اظہار افسوس کے لیے آتے اور کنول کے نامہ اعمال میں مزید گناہوں کا بوجھ بڑھا دیتے۔ نواز اس سے بری طرح برگشتہ ہو چکا تھا۔ وہ بھی زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھنے لگا کہ سارا قصور کنول ہی کی تربیت اور پرورش کا ہے۔

سفیان بھی اس حادثے کے لیے کہیں نہ کہیں ماں کو ہی ذمے دار سمجھتا تھا۔

☆☆☆

ایک ماہ کی تلاش، رابطوں اور اثر و رسوخ کے بعد مائرہ کا سراغ مل گیا۔ ان کے مردہ جسموں میں جیسے ایک بار پھر نئی زندگی دوڑ گئی۔ نواز نے اپنے تعلقات استعمال کرتے ہوئے عثمان پر اغوا کا پرچہ کٹوا کر حوالات بھیج دیا۔ مائرہ کو گھر لے آیا گیا۔ اس دن سفیان اور حبہ نے ایک اور انہونی دیکھی۔ مائرہ کو بے انتہا زدوکوب کیا گیا۔

''ہم نے نکاح کیا ہے پاپا! وہ میرا شوہر ہے۔'' وہ بےخوفی سے بولی۔

''میں تم دونوں کو جان سے مار دوں گا۔ اس کے حلق سے وہ ساری رقم اور گولڈ نکلواؤں گا۔ حرام نہیں کمایا تھا میں نے۔''

''ہم نے کچھ غلط نہیں کیا۔ اپنی پسند سے شادی کرنا ہمارا حق ہے اور ہم نے یہی حق استعمال کیا ہے۔'' وہ باپ کی دھمکی پر ذرا خائف نہ ہوئی۔

کنول پر بھی شوہر کا بہت دباؤ تھا۔ ''اسے پیار سے سمجھاؤ یا سختی سے...... اگر اس نے عدالت میں میری مرضی کا بیان نہ دیا تو تم سے میرا کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ طلاق دے دوں گا میں تمہیں بھی۔'' وہ اپنے ہوش و حواس کھو چکا تھا۔

کنول نے اسے سمجھانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اس کا اپنا گھر داؤ پر لگ چکا تھا اور اس عمر میں شوہر سے علیحدگی کا مطلب تاعمر منہ پر سیاہی ملنے کے مترادف تھا۔

''عثمان بہت اچھا ہے ماما! وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔ میں اس کے ساتھ بہت خوش ہوں۔'' وہ ماں کی ہر بات کے جواب میں کہتی۔

''آپی! اس گھر کی سلامتی اب آپ کے ہاتھ میں ہے۔ ایک محبت کے لیے اتنی زندگیاں داؤ پر مت لگائیں۔''

اس حادثے کے بعد سفیان اپنی عمر سے زیادہ باشعور ہو گیا تھا۔

''میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں مائرہ! جو تیرا باپ کہتا ہے، مان لے۔ ہم سب تباہ ہو جائیں گے۔ نواز اس لڑکے کو بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔'' مائرہ اس بار خاموش ہو گئی۔

وہ اس خاموشی کو اس کا سُدھار اور تبدیلی سمجھتے رہے لیکن اس کے ذہن میں کچھ اور ہی کھچڑی پک رہی تھی۔ مائرہ نے عدالت پہنچ کر جو کچھ کیا، وہ ان کے لیے کسی ایٹم بم کی تباہی سے بھی بڑھ کر تھا۔

''عثمان میرے شوہر ہیں۔ میں نے ان سے اپنی مرضی اور خوشی سے شادی کی ہے اور میں انہی کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ ہمیں اپنے گھر والوں سے شدید خطرہ ہے۔ وہ مجھے ٹارچر کرتے ہیں اور ہمیں جان سے مارنے کی دھمکیاں دیتے ہیں۔ ہمیں تحفظ دیا جائے۔''

مائرہ اور عثمان کی کورٹ میرج کو قانون جھٹلا نہیں سکتا تھا۔ اسے شوہر کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی گئی۔ وہ ان کی زندگی کا سیاہ ترین دن تھا۔ کنول کی طبیعت وہیں اس قدر بگڑی کہ اس کا بھائی بحالت مجبوری اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ حبہ بھی ماں کے ساتھ ہی تھی جبکہ سفیان دانستہ طور پر وہاں نہ گیا۔ مائرہ کے اس حالیہ قدم کے بعد ایک نئے سرے سے تبصروں اور تجزیوں کی بازگشت سننے کا اس میں حوصلہ نہیں تھا۔ وہ نواز کے ساتھ گھر آ گیا اور یہ حبہ سے اس کی آخری ملاقات تھی۔

☆☆☆

نواز شدید غصے اور طیش میں تھا۔

اس نے اپنی زندگی کے قیمتی سال دیارِ غیر میں محنت کرتے گزارے تھے لیکن ان کا صلہ جس شاندار طریقے سے ملا، وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو گیا۔ وہ بھی ایک روایتی مرد تھا جو اس حادثے کا ذمے دار صرف کنول ہی کو سمجھتا تھا۔ اس کی بدزبانی اور رشتے داروں کی 'ہمدردانہ باتوں' کا نتیجہ حسب توقع برآمد ہوا۔ نواز کا وکیل کنول کے گھر جا کر طلاق کے کاغذات دے آیا۔ حبہ کی کسٹڈی کنول

لیے انتہائی خوش قسمت بچی ہے اور اس کی اہمیت کبھی کم نہیں کی جا سکتی۔ وہ محبت اور تربیت میں کبھی توازن نہ رکھ پائی اور یکے بعد دیگرے غلط فیصلے کرتی چلی گئی۔

انہی دنوں ان کے گھر کے سامنے ایک مکان کرائے کے لیے خالی ہوا۔ ایک بیوہ عورت اور اس کا بیٹا یہاں رہائش پذیر ہو گئے۔ عثمان نامی وہ لڑکا کسی بیکری میں ملازم تھا۔ صبح سے رات تک ملازمت پر رہتا۔ اہلِ علاقے کی نظر میں اس نے اپنا بہت اچھا مقام بنا لیا تھا۔

مائرہ ان دنوں کالج میں پڑھتی تھی۔ اس کے طور طریقے اب بھی وہی تھے۔ کالج کی دنیا نے اس کے احساسِ برتری میں مزید اضافہ کیا۔ اسے سراہنے اور چاہنے والوں کی کوئی کمی نہ تھی اور اسی دوران میں وہ عثمان سے بھی بے تکلف ہو گئی۔ وہ دونوں نہایت محتاط کھلاڑی کی طرح یہ کھیل کھیلتے رہے۔ کالج کی آڑ میں عثمان سے ملاقاتوں کا سلسلہ بھی خوب چل نکلا۔ سفیان اس وقت کم عمر تھا اور اپنے اردگرد ہونے والی یہ تبدیلی اسے بہت ہولاتی تھی۔ اس نے ایک بار پھر ماں سے بات کرنے کی ٹھانی۔

''ماما! آپی اتنی دیر سے کیوں واپس آتی ہے؟''

''وین دیر سے آتی ہے بیٹا! ڈرائیور نے دوسری لڑکیوں کو بھی تو چھوڑنا ہوتا ہے۔'' کنول نے رسان سے جواب دیا۔

''لیکن اتنی بھی کیا دیر؟'' وہ جھنجلایا۔

''کالج میں پریکٹیکلز کی وجہ سے بھی چھٹی تاخیر سے ہوتی ہے سوفی! تم کیوں ہر وقت بہن کے پیچھے پڑے رہتے ہو؟''

''میں غلط نہیں کہہ رہا ماما! مجھے کسی چیز کے غلط ہونے کا احساس ہو رہا ہے۔ کل رات آپی چھت پر کیا کر رہی تھی؟'' اس نے ایک اور سوال اٹھایا۔

''واک کر رہی ہوگی۔ روزانہ ہی کرتی ہے۔ تم ہر بات میں نیگیٹو کیوں ہوتے ہو؟ وہ میری بیٹی ہے۔ مجھے اس پر بہت اعتبار ہے۔ وہ کبھی اپنے والدین کی محبت کو دھوکا نہیں دے گی۔''

''مجھ پر اعتبار نہیں ہے شاید آپ کو۔'' وہ افسردہ ہوا۔ کنول نے اسے اپنے گلے لگا کر خوب تسلی دی لیکن وہ مطمئن نہ ہو سکا اور کنول یہ نہ سمجھ سکی کہ جب محبت نامی آسیب لڑکی کے وجود کو جکڑتا ہے تو والدین کی محبت ہی سب سے پہلے دل و دماغ سے فراموش ہوتی ہے۔

سفیان کی چھٹی حس مسلسل کسی خطرے کا احساس دلا رہی تھی لیکن اس کے پاس اپنا دعویٰ ثابت کرنے کے لیے کوئی ثبوت نہیں تھا۔ اس نے اپنے باپ نواز سے یہ سارے معاملات شیئر کرنے کا فیصلہ کر لیا لیکن یہ تاخیر بہت مہنگی ثابت ہوئی۔

☆☆☆

نواز کی واپسی اس بار دو ماہ کے لیے ہوئی۔ وہ اپنے ساتھ کچھ طلائی زیورات وغیرہ بنوا کر لایا تھا۔ دونوں بیٹیوں کے مستقبل کے لیے یہ زیورات اگلے روز بینک میں رکھوائے جانے تھے لیکن تمام منصوبے دھرے کے دھرے رہے۔

اگلا دن ایک قیامت بن کر طلوع ہوا۔ مائرہ کالج سے واپس ہی نہ آئی۔ وین میں موجود اس کی چند کلاس فیلوز سے علم ہوا کہ وہ اکثر کالج بنک کیا کرتی تھی لیکن چھٹی سے پہلے واپس آجایا کرتی تھی۔

مائرہ کی گمشدگی سے پریشان نواز اور کنول کو دوسرا جھٹکا اس وقت لگا جب گھر میں موجود سارا کیش اور زیورات بھی غائب ملے۔ اب کسی شبے کی گنجائش نہیں تھی کہ وہ باقاعدہ منصوبہ کے تحت فرار ہوئی ہے۔

سفیان کے لیے وہ وقت بہت دردناک تھا۔ اس نے پہلی بار اپنے والدین کو سب لحاظ بالائے طاق رکھ کر لڑتے ہوئے دیکھا۔ اس حادثے کے لیے وہ ایک دوسرے کو موردِ الزام ٹھہرا رہے تھے۔ نواز، کنول کی تربیت اور پرورش پر انگلی اٹھا رہا تھا تو کنول اس کو یہ یاد دلا رہی تھی وہ کتنے برسوں سے اسے پاکستان میں سیٹل ہونے کا کہہ رہی تھی۔

''میں اکیلی عورت کیا کیا کرتی؟ کتنی بار کہا کہ واپس آجائیں۔ بچوں کو اسی عمر میں والد کی موجودگی کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن آپ کو اپنی آزادی اور عیاشی عزیز تھی۔'' وہ چلا رہی تھی۔

''کاش میں عیاشی ہی کر رہا ہوتا۔ اپنا آپ مار کر جس بیوی اور اولاد کا مستقبل سنوارتا رہا ہوں وہی میری اس کوشش کو گناہ بتانے لگے ہیں۔''

وہ چلاتے رہے، لڑتے رہے، نوبت ہاتھا پائی تک آپہنچی اور یہ صورتِ حال اس وقت مزید سنگین ہوئی جب کنول کی چیک بک بھی غائب ملی۔ وہ ہر چیک پر دستخط کر کے ہی رکھتی تھی اور مائرہ نے اسی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بینک میں موجود کیش پر بھی ہاتھ صاف کر دیا۔

اس لوئر مڈل کلاس علاقے کے لوگوں کے ہاتھ ایک چٹپٹا موضوع لگ گیا اور ہر جگہ ایک ہی بازگشت تھی۔

''نواز کی بیٹی کرائے داروں کے لڑکے کے ساتھ

بھاگ گئی۔ لڑکے کی ماں بھی غائب ہے۔ خدا جانے کہاں منہ کالا کررہے ہیں دونوں؟''

یہ فقرہ الفاظ کے ہیر پھیر کے ساتھ ہر ایک سے سننے کو ملتا۔ برسوں پرانی کدورت اور بغض نکالنے کے لیے رشتے داروں کے پاس بھی اس سے بہترین موقع کہاں تھا؟ نواز علی کی زندگی سانپ سیڑھی کا کھیل بن گئی تھی جسے عین عروج پر ننانوے پر کھڑے سانپ نے ڈسا تھا اور ڈسنے والی اس کی وہ اولاد تھی جو تمام عمر ہتھیلی کا چھالا بن کر رہی۔ اس کا لباس، تعلیم اور انداز ہمیشہ ان کے لیے باعثِ حسد ہوتے تھے۔ وہ ہمدردی اور اظہارِ افسوس کے لیے آتے اور کنول کے نامہ اعمال میں مزید گناہوں کا بوجھ بڑھا دیتے۔ نواز اس سے بری طرح برگشتہ ہو چکا تھا۔ وہ بھی زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھنے لگا کہ سارا قصور کنول ہی کی تربیت اور پرورش کا ہے۔

سفیان بھی اس حادثے کے لیے کہیں نہ کہیں ماں کو ہی ذمے دار سمجھتا تھا۔

☆☆☆

ایک ماہ کی تلاش، رابطوں اور اثرورسوخ کے بعد مائرہ کا سراغ مل گیا۔ ان کے مردہ جسموں میں جیسے ایک بار پھر نئی زندگی دوڑ گئی۔ نواز نے اپنے تعلقات استعمال کرتے ہوئے عثمان پر اغوا کا پرچہ کٹوا کر حوالات بھیج دیا۔ مائرہ کو گھر لے آیا گیا۔ اس دن سفیان اور حبہ نے ایک اور انہونی دیکھی۔ مائرہ کو بے انتہا زدوکوب کیا گیا۔

''ہم نے نکاح کیا ہے پاپا! وہ میرا شوہر ہے۔'' وہ بے خوفی سے بولی۔

''میں تم دونوں کو جان سے مار دوں گا۔ اس کے حلق سے وہ ساری رقم اور گولڈ نکلواؤں گا۔ حرام نہیں کمایا تھا میں نے۔''

''ہم نے کچھ غلط نہیں کیا۔ اپنی پسند سے شادی کرنا ہمارا حق ہے اور ہم نے یہی حق استعمال کیا ہے۔'' وہ باپ کی دھمکی پر ذرا خائف نہ ہوئی۔

کنول پر بھی شوہر کا بہت دباؤ تھا۔ ''اسے پیار سے سمجھاؤ یا سختی سے...... اگر اس نے عدالت میں میری مرضی کا بیان نہ دیا تو تم سے میرا کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ طلاق دے دوں گا میں تمہیں بھی۔'' وہ اپنے ہوش وحواس کھو چکا تھا۔

کنول نے اسے سمجھانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اس کا اپنا گھر داؤ پر لگ چکا تھا اور اس عمر میں شوہر سے علیحدگی کا مطلب تاعمر منہ پر سیاہی ملنے کے مترادف تھا۔

''عثمان بہت اچھا ہے ماما! وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔ میں اس کے ساتھ بہت خوش ہوں۔'' وہ ماں کی ہر بات کے جواب میں کہتی۔

''آپی! اس گھر کی سلامتی اب آپ کے ہاتھ میں ہے۔ ایک محبت کے لیے اتنی زندگیاں داؤ پر مت لگائیں۔'' اس حادثے کے بعد سفیان اپنی عمر سے زیادہ باشعور ہو گیا تھا۔

''میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں مائرہ! جو تیرا باپ کہتا ہے، مان لے۔ ہم سب تباہ ہو جائیں گے۔ نواز اس لڑکے کو بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔'' مائرہ اس بار خاموش ہو گئی۔

وہ اس خاموشی کو اس کا سُدھار اور تبدیلی سمجھتے رہے لیکن اس کے ذہن میں کچھ اور ہی کھچڑی پک رہی تھی۔ مائرہ نے عدالت پہنچ کر جو کچھ کیا، وہ ان کے لیے کسی ایٹم بم کی تباہی سے بھی بڑھ کر تھا۔

''عثمان میرے شوہر ہیں۔ میں نے ان سے اپنی مرضی اور خوشی سے شادی کی ہے اور میں انہی کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ ہمیں اپنے گھر والوں سے شدید خطرہ ہے۔ وہ مجھے ٹارچر کرتے ہیں اور ہمیں جان سے مارنے کی دھمکیاں دیتے ہیں۔ ہمیں تحفظ دیا جائے۔''

مائرہ اور عثمان کی کورٹ میرج کو قانون جھٹلا نہیں سکتا تھا۔ اسے شوہر کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی گئی۔ وہ ان کی زندگی کا سیاہ ترین دن تھا۔ کنول کی طبیعت وہیں اس قدر بگڑی کہ اس کا بھائی بحالتِ مجبوری اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ حبہ بھی ماں کے ساتھ ہی تھی جبکہ سفیان دانستہ طور پر وہاں نہ گیا۔ مائرہ کے اس حالیہ قدم کے بعد ایک نئے سرے سے تبصروں اور تجزیوں کی بازگشت سننے کا اس میں حوصلہ نہیں تھا۔ وہ نواز کے ساتھ گھر آ گیا اور یہ حبہ سے اس کی آخری ملاقات تھی۔

☆☆☆

نواز شدید غصے اور طیش میں تھا۔

اس نے اپنی زندگی کے قیمتی سال دیارِ غیر میں محنت کرتے گزارے تھے لیکن ان کا صلہ جس شاندار طریقے سے ملا، وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو گیا۔ وہ بھی ایک روایتی مرد تھا جو اس حادثے کا ذمے دار صرف کنول ہی کو سمجھتا تھا۔ اس کی بدزبانی اور رشتے داروں کی 'ہمدردانہ باتوں' کا نتیجہ حسبِ توقع برآمد ہوا۔ نواز کا وکیل کنول کے گھر جا کر طلاق کے کاغذات دے آیا۔ حبہ کی کسٹڈی کنول

ہی کے سپرد تھی۔ حق مہر کی رقم بھی ادا کر دی گئی۔ مائرہ کی خودغرضی اور بے راہ روی نے ان کا گھر تنکے تنکے کر دیا۔ نواز کے غصے اور نفرت نے دوسری بیٹی کے بارے کچھ بھی سوچنے ہی نہ دیا۔ اسے عورت ذات سے ہی نفرت ہو گئی۔ بیٹی اور بیوی کی صورت میں دو عورتوں نے اس کی برسوں سے کمائی عزت خواری میں بدل دی تھی۔

اس علاقے میں رہنا اب ناممکن تھا۔ اہلِ علاقہ کی باتیں، طنز ناقابلِ برداشت تھے۔ نواز نے سفیان کو اپنے بھائی کے گھر دوسرے شہر میں چھوڑا، اونے پونے داموں میں مکان فروخت کیا اور خود ایک بار پھر بیرونِ ملک جا کر اسے بھی وہاں بلوانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ حبہ اور کنول سے اس کا ہر رابطہ ختم ہو چکا تھا۔ اس وقت موبائل فون اتنے عام نہیں تھے اور بھائی کے گھر لینڈ لائن فون بھی نہ تھا۔

تایا کے گھر گزرا وہ وقت ہی اس کی ذہنی کجی میں آغاز کا سبب تھا۔ وہاں ہر ایک کے سامنے اس کی بہن کے معاشقے، ماں کی غلط تربیت، باپ کی بدقسمتی اور پھر عدالت میں مائرہ کے بیان کے قصے دن میں ہر ایک کے سامنے دہرائے جاتے اور ہر بار اسے یوں محسوس ہوتا کہ بھرے مجمع میں اسے کسی نے برہنہ کر دیا ہے۔ اسے مائرہ سے نفرت ہو گئی...... شدید نفرت۔ ماں اور حبہ سے اس دوری کے بعد اس کے وجود میں بہت سے خلا پیدا ہو گئے۔

نواز نے کچھ عرصہ کے بعد اسے اپنے پاس بلوا لیا لیکن وہ وہاں اکیلا نہیں گیا تھا۔ اس کے ساتھ ماضی کی بازگشت بھی تھی جو اسے کسی پل یہ بھولنے نہیں دیتی تھی کہ اس بکھری، الجھی زندگی کا سبب 'کورٹ میرج' ہے۔ حیرت انگیز طور پر اسے باپ سے کوئی گلہ نہیں تھا۔ نواز کے ساتھ بیرونِ ملک گزرے ایک سال نے ہی اسے احساس دلا دیا کہ یہاں کی زندگی بہت سخت تھی اور اس کی نسبت وہ لوگ پاکستان میں حقیقی معنوں میں شاہانہ زندگی بسر کرتے تھے۔

وہ انٹر میں تھا جب نواز کو شوگر کی تکلیف نے گھیر لیا۔ ایک بیٹی کی بے راہ روی اور دوسری بیٹی سے دوری نے اسے کہیں نہ کہیں شکستہ ضرور کیا تھا لیکن اپنا بھرم قائم رکھنے کے لیے وہ اس اذیت کو کسی کے سامنے ظاہر ہونے ہی نہ دیتا۔ دیارِ غیر کی سختیاں برداشت کرنا اب ممکن نہیں تھا۔ مناسب سرمایہ اکٹھا کرنے کے بعد وہ لوگ وطن واپس آ گئے اور دو کمروں کا فلیٹ خرید کر ایک بیکری کھول لی۔ زندگی ایک نئے معمول پر آ گئی۔

اپنی پڑھائی کے دوران اس نے حبہ کو ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی۔ کئی ایک اسکول کھنگالے، ایاز کا گھر تلاشا لیکن ناکامی ہر بار مقدر بنی۔ ماموں وہ گھر چھوڑ کر کراچی جا چکا تھا۔ اس کا نیا پتا کسی کے پاس بھی نہیں تھا۔ کنول اور حبہ کی الگ تلاش شروع کی تو ساعت زہریلے فقرات سے لہولہان ہونے لگی۔

''اچھا! اس کا پوچھ رہے ہو ناں جس کی بیٹی نے کورٹ میرج کر لی تھی اور شوہر نے بدکردار بیوی کو طلاق دے دی تھی...... خدا جانے کہاں گئیں؟ دوسری بیٹی بھی بھاگ گئی ہوگی کسی کے ساتھ...... ہمیں کیا علم؟''

سفیان کے جذبۂ انتقام میں یہ آخری کیل ثابت ہوئی۔ اس نے اپنے ذہن میں چند مقاصد ترتیب دیے اور ان کے حصول کے لیے جت گیا۔ اس کا پہلا مقصد 'طاقتور' بننا تھا۔

☆☆☆

''پاپا! میں پولیس فورس جوائن کرنا چاہتا ہوں۔'' اس کی بات سن کر نواز ساکت رہ گیا۔

وہ اس کے جمے جمائے کاروبار کا اکلوتا وارث تھا اور کن خطروں کو مول لینے کی بات کر رہا تھا؟

''ہرگز نہیں! ایسا نہیں ہو سکتا۔'' اس کا ردِعمل سفیان کے لیے متوقع تھا۔

سفیان کی سنجیدگی، دلائل اور ارادے کے سامنے وہ زیادہ دیر مزاحمت نہ کر پایا۔ اس نے پولیس فورس جوائن کر لی۔ طاقت ملتے ہی اس کے اندر برسوں سے پلنے والا غصہ اور نفرت آتش فشاں بن کر بہہ نکلا اور وہ ہر 'کورٹ میرج' کرنے والے کے لیے قہر بن گیا۔ اپنے اختیارات کے بل بوتے پر اس نے دو الگ تھلگ گھر کرائے پر لے رکھے تھے جہاں ایسے کسی بھی فرد کو منتقل کر کے اس کے خوف اور موت سے لطف اندوز ہوتا۔ اسے اس کھیل میں بہت مزہ آنے لگا۔ روبی، نتاشا، زبیر، ولاور اور شاز لی کے بعد انعم اس کے ہاتھ لگ گئی۔ وہ ان کے اعضا کاٹ کر گھر والوں کو روانہ کر دیتا۔ یہ ان کی اولاد کے لیے کی جانے والی کوتاہیوں کی سزا ہوتی تھی۔ کنول اور حبہ کو تلاشنے میں تو کامیابی نہ ملی لیکن ایک روز مائرہ نظر آ گئی۔

☆☆☆

اس کچی بستی پر اس کی بہت دنوں سے نظر تھی۔

وہ یہاں چند مخبر تعینات کرنے کا سوچ رہا تھا۔ جرائم

کی بڑھتی ہوئی شرح پیشہ ورانہ طور پر اس کے لیے خاصی پریشان کن تھی۔ اسی دوران اسے اپنی برباد زندگی کی سب سے بڑی وجہ مائرہ ایک ایسے شخص کے ساتھ نظر آئی جس کا ہر ایک انداز اس کے پیشے کی چغلی کھاتا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر ششدر تھا۔ وقت نے اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑا تھا۔ وہ آج بھی ویسی ہی بالکل کنول کا پرتو تھی۔

سفیان ہمیشہ یہ سوچتا تھا کہ اسے دیکھ کر نفرت سے ایک بار اس کے وجود پر ضرور تھوکے گا لیکن یہ جھلک اسے منجمد کر دے گی، اس نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔ وہ بیک وقت اس سے نفرت ومحبت کا شکار ہو گیا۔ اپنا حلیہ اور انداز بدل کر وہ اس سے ملتا رہا اور یہیں اسے اندازہ ہوا کہ وہ اپنی موجودہ زندگی سے بہت ناخوش ہے۔ وہ سامنے آتی تو ماں کی جھلک محسوس کر کے اس کا دل موم ہونے لگتا۔ وہ اس سے بے معنی باتیں کرتا اور جب واپس آتا تو اپنی بربادی یاد آنے پر ایک بار پھر اس سے نفرت کرنے لگتا۔

اس صورتِ حال سے تنگ آ کر وہ ایک ماہ کے لیے اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ اس کی خواہش تھی کہ مائرہ اسے پہچانے لیکن وہ اپنی کوتاہیوں اور ماضی کی بازگشت میں اس قدر الجھ چکی تھی کہ اسے کچھ محسوس ہی نہ ہوتا۔

کبھی کبھی سفیان کو ایسا لگتا تھا کہ وہ اس کی حقیقت بوجھ لے گی۔ اسے اس وقت کا انتظار تھا۔ وہ چھبیس دسمبر بھول چکی تھی۔ یہ وہ تاریخ تھی جب وہ ان سب کی محبتیں ٹھکرا کر عثمان کے ساتھ غائب ہوئی تھی۔ اس وقت سفیان نے فیصلہ کیا کہ وہ اسے خود ہی حقیقت بتا دے گا۔ اس نے اویس کو فون کر کے نچلی منزل پر بلوایا اور دوٹوک بات کی۔

''مائرہ تمہیں کہاں ملی تھی؟''

اویس نے آئیں بائیں شائیں کی لیکن اس کے ہتھیار اور پولیس کارڈ کے سامنے مزاحمت نہ کر سکا۔

''اس نے بھاگ کر شادی کی تھی صاحب! شوہر کے کہنے پر گھر سے زیور اور کیش بھی لے آئی تھی۔ مال جب تک رہا، عثمان باؤ اس کے ساتھ رہا۔ کچھ سال بعد جب دل بھر گیا تو سیر کے بہانے اسے پہاڑی علاقے میں لے آیا۔ مجھ سے اس کا سودا پہلے ہی طے ہو چکا تھا۔ موت نے بس اسے مہلت نہ دی ورنہ یہ ان ماں بیٹے کا بڑا پرانا دھندا ہے۔''

اس انکشاف نے سفیان کو عجیب طرح سے دکھی کیا۔

''تم نے مائرہ کو کبھی بتایا کیوں نہیں کہ عثمان کی حقیقت کیا تھی؟''

''وہ میرا دوست تھا صاحب! پھر مرنے والوں کی برائی کرنا بھی کہاں کی انسانیت ہے؟ عثمان باؤ اگر زندہ رہتا تب بھی کوئی ڈراما کر کے ہی میرے حوالے کرتا اسے۔''

''اسے آزاد کر دو!'' سفیان سرد مہری سے بولا۔

''کیا صاحب؟ اگر پسند ہے تو ویسے ہی رکھ لو۔ جب دل بھر جائے تو واپس بھیج دینا۔ میرا دھندا کاہے کو خراب کرتے ہو؟'' وہ کمینگی سے ہنسا۔

سفیان نے بے قابو ہو کر اس کے منہ پر گھونسا جڑ دیا اور پھر مارتا ہی چلا گیا۔ اویس نے بھی بھرپور مزاحمت کی جس کے نتیجے میں اس کے ہاتھ پر کچھ خراشیں بھی آئیں۔ اس کھینچا تانی میں ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ وہ چونکہ نچلی منزل پر تھے اس لیے مائرہ کے متوجہ ہونے کے امکانات کم ہی تھے تاہم سفیان کوئی بھی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ موقع ملتے ہی اس نے اپنا خنجر نکالا اور مخصوص انداز میں اویس کے گلے پر پھیر دیا۔ یہ طریقہ قتل اسے بہت سکون دیتا تھا، شکار کی تڑپ اور خرخراہٹ میں اسے اپنی برسوں کی تڑپ سے تسکین ملتی تھی۔

اویس سے نمٹنے کے بعد وہ مائرہ کے پاس چلا آیا۔ اس وقت وہ بہت تروتازہ اور خوش تھا۔ وہ اسے آزادی کی نوید اور اپنی اصل حقیقت بتانا چاہتا تھا لیکن مائرہ ایک بار پھر جلد باز، خودغرض اور کم عقل ہی ثابت ہوئی۔ اس کی باتیں اور اظہارِ محبت سن کر وہ اپنے سب ارادے اور فیصلے بھول گیا۔ وہ اس کے بارے میں الجھن میں ضرور تھی اور قدرتی طور پر ہی بہت منفرد جذبات محسوس کرتی تھی لیکن اس الجھن اور محبت کو بے ہودہ پیراہن دے کر سفیان کو آتش فشاں کے دہانے پر بٹھا دیا۔ اب معافی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ دل میں امڈتی محبت پر نفرت غالب آ گئی اور قصوروار کو اس کی سزا مل گئی۔

مہلت ہی اس کی اصل سزا تھی۔

اگلے روز حبہ کی فائل اس کے سامنے آئی تو وہ مائرہ کے قتل پر رہے سہے ملال سے بھی آزاد ہو گیا۔ اسپتال میں حبہ کی حالت اور کسمپرسی دیکھ کر وہ رونے لگا تھا۔ اس کی باتیں، ڈر، خدشے اور بیتے دنوں کی بازگشت مختلف لہجوں اور آوازوں میں خود اس کی زبان سے برآمد ہو رہے تھے۔ اس نے جہنم سے بدتر زندگی گزاری تھی اور یہ سب صرف اس لیے ہوا تھا کہ کنول نے بھی اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں سے کچھ نہیں سیکھا تھا۔

سفیان کتنی ہی دیر اس کے پاس بیٹھا اپنے اور نواز کے متعلق کئی باتیں یاد کرواتا رہا۔

''حبہ! تمہیں یاد ہے بچپن میں ہم دونوں کارٹونز کی ڈرائنگ بنا کر بہت خوش ہوتے تھے۔ تمہاری ڈرائنگ مجھ سے بہت زیادہ اچھی تھی۔''

''حبہ! اُلو کی پٹھی! میں تیری جان نکال دوں گی...... کیوں اتنے صفحے ضائع کر رہی ہے؟ نئی کاپیاں خریدنے کے لیے تیرا باپ مجھے ڈرافٹ نہیں بھیجے گا۔ وہ اپنی بان چھوڑ کر عیاشی بھری زندگی گزار رہا ہوگا۔'' اس کی زبان سے برآمد ہونے والے یہ الفاظ اور لہجہ سفیان کا دل خون کر گئے۔

''تمہیں ہمارا اسکول یاد ہے حبہ؟ چھٹی ہونے پر کتنی خوشی ہوا کرتی تھی ناں؟''

''اسے بھی اسکول بھیج کر وہی غلطی کر جو بڑی کی دفعہ کرتی رہی۔ تم ایک ناکام ماں ہو۔ اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو جو حرکت بڑی نے کی اس کے بعد اس کا بھی گلا دبا دیتا۔ تمہارے شوہر نے باہر دوسری شادی کر رکھی ہوگی اس لیے تم لوگوں سے جان چھڑوا کر یہاں سے فرار ہو گیا اور عذاب میرے گلے پڑ گیا۔ باہر نکلوں تو ہر کوئی یہی سوال کرتا ہے اس عمر میں کیوں چھوڑا بہنوئی نے تمہاری بہن کو؟'' یہ نکیلے الفاظ اور کرخت لہجہ ایاز کا تھا جو حبہ خلاؤں میں دیکھتے ہوئے من وعن دہرا رہی تھی۔

سفیان میں مزید سننے کی تاب نہ تھی۔ اس کا اضطراب شدید تر ہو گیا تھا۔ حقیقت سے نظریں چرانا اب ممکن نہیں رہا تھا اور حقیقت تو یہ تھی کہ حبہ ایک قاتلہ تھی جسے نارمل ہوتے ہی قانون کی گرفت میں آنے سے بچانا بہت مشکل تھا۔ محمود کے قتل کو اگر سیلف ڈیفنس ثابت کر دیا جاتا تو غیر ملکی افراد کا دائر کیا گیا کیس نمٹانا بے حد کٹھن تھا۔

اس رات وہ پہلی بار نواز سے اُلجھا۔

''وہ لاوارثوں کی طرح پلتی رہی۔ زندگی کی ہر بنیادی سہولت، تعلیم، خوشی سے محروم رہی اور آج نشانِ عبرت بن کر اسپتال میں پڑی ہے۔ میری ماں اگر غلط تھی، ناسمجھ تھی تو آپ ہی سمجھداری سے کام لیتے۔ رہائش تبدیل کر لیتے، شہر چھوڑ دیتے۔ طلاق دے کر بکھری ہوئی زندگیوں کو مزید تباہ ہونے کے لیے چھوڑ دیا۔ اس کی حالت دیکھیں جا کر۔'' وہ اپنے بال نوچنے لگا۔

نواز علی بالکل گنگ اور ایک نئی سزا میں مبتلا ہو گیا۔

☆☆☆

اس پبلک پارک میں منظر بہت خوب صورت تھا۔ ڈوبتے سورج کی کرنیں جھیل پر اپنا عکس بکھیر رہی تھیں۔ دسمبر کا آخری سورج سال کی تمام تر رنگینیاں اور ہنگامے دیکھ کر غروب ہو رہا تھا۔ جھیل کے پاس ایک سنگی بینچ پر نوجوان جوڑا بیٹھا تھا۔ لڑکی کے چہرے پر بہت پریشانی اور تناؤ تھا جبکہ لڑکا اسے مسلسل تسلیاں دے رہا تھا۔

''سمجھنے کی کوشش کرو فرقان! میرے والدین میری شادی کے لیے بہت سنجیدہ ہیں۔''

''میں گھر میں سب سے چھوٹا ہوں لائبہ! ابھی جاب بھی نہیں ہے میرے پاس۔ کس بل بوتے پر تمہارے والدین سے بات کروں؟'' وہ پہلو بچا رہا تھا۔

''یہ سب باتیں اس وقت تمہیں یاد نہیں تھیں جب میرے ساتھ افیئر چلا رہے تھے، گھنٹوں فون پر باتیں کرتے تھے، اکیلے فلیٹ میں ملنے کے لیے بلاتے تھے؟ اس وقت جاب اور عمر کا کیوں احساس نہیں تھا تمہیں؟'' لڑکی پھٹ پڑی۔

''میں نے یہ کب کہا کہ میں تم سے شادی نہیں کروں گا۔ میں صرف یہ بتا رہا ہوں کہ اس طرح شادی مشکل ہے۔ ہمیں کوئی اور رستہ اختیار کرنا ہوگا۔'' وہ مکاری سے بولا۔

''مجھے شادی تمہی سے کرنی ہے۔ چاہے رستہ کوئی بھی ہو۔''

''ہم کورٹ میرج کر لیتے ہیں۔ جاب ملنے تک اپنی سیونگز سے گزارہ کریں گے۔''

''ٹھیک ہے! میں بھی شادی کے بعد تمہارا ساتھ دینے کے لیے جاب کر لوں گی۔ میرا کچھ زیور اور کیش پڑا ہے وہ بھی مستقبل میں کام آئے گا۔'' لڑکی نے کچھ تذبذب سے جواب دیا۔ وہ اس وقت انتہائی دباؤ میں تھی۔

سنگی بینچ پر بیٹھے وہ دونوں اب مستقبل کے سہانے خوابوں میں مگن تھے۔ ان سے ذرا فاصلے پر سفیان نواز دسمبر کا الوداعی سورج دیکھنے بیٹھا تھا۔ اس نے آج صبح ہی اپنے باپ کے جنازے کو کندھا دیا تھا۔ حبہ کی حالت جان کر وہ دل پر بڑھتا دباؤ برداشت نہیں کر پایا تھا اور ہارٹ اٹیک کے باعث موت سے بغلگیر ہو گیا۔

سفیان کے دل میں آتش پورے جوبن پر تھی۔ اس نے اپنے کوٹ کی جیب میں خنجر کا لمس محسوس کیا۔ خنجر کی دھار انسانی لہو سے پیاس بجھانے کے لیے بے تاب لگ رہی تھی۔ اس نے دھیرے سے اسے تھپتھپایا اور اٹھ کر اس جوڑے کے پیچھے چل دیا جو اَب ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے پارک کے بیرونی گیٹ کی طرف بڑھ رہے تھے۔

Pakistanipoint
Waqar Azeem